محدث کبیر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمیؒ
کی مفصل سوانح حیات

حیاتِ ابو المآثر

ڈاکٹر مسعود احمد الاعظمی

حضرت مولانا رشید احمد صاحب الاعظمی

مدیر

مرکز تحقیقات وخدمات علمیہ
پوسٹ بکس نمبر ۱۰، مئو ۲۷۵۱۰۱ (الہند)

محدث کبیر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمیؒ کی مفصل سوانح حیات

حیاتِ ابوالمآثر

جلد اول

از: ڈاکٹر مسعود احمد اعظمی

باہتمام

حضرت مولانا رشید احمد صاحب الاعظمی

ناشر

المجمع العلمی

مرکز تحقیقات وخدمات علمیہ

پوسٹ بکس نمبر ا، مئو ۲۷۵۱۰۱ (الہند)

نام کتاب	:	حیات ابوالمآثر
ترتیب	:	ڈاکٹر مسعود احمد الاعظمی
صفحات	:	۷۳۲
سن اشاعت	:	۱۴۳۲ھ=۲۰۱۱ء
طبع ثانی	:	۵۰۰
ناشر	:	المجمع العلمی، مرکز تحقیقات وخدمات علمیہ، مئو
قیمت	:	=/۳۵۰ روپے
باہتمام	:	مولانا رشید احمد الاعظمی
طباعت	:	شیروانی آرٹ پرنٹرز، دہلی

ملنے کا پتہ:

مرکز تحقیقات وخدمات علمیہ

مرقاۃ العلوم، پوسٹ بکس نمبر۔ آ

مئوناتھ بھنجن، ۲۷۵۱۰۱ یوپی (انڈیا)

فہرست مضامین

دوسرا باب

تیسرا باب

چوتھا باب

پانچواں باب

چھٹاں باب

ساتواں باب

آٹھواں باب

نواں باب

دسواں باب

دیباچہ طبع دوم

الحمدللہ و کفی، وسلام عبادہ الذین اصطفی،

اس کتاب کا پہلا اڈیشن عرصہ ہوا ختم ہو چکا تھا، علم دوست حضرات کی طرف سے اس کی طلب بھی برابر کی جارہی تھی، اور دوسرے اڈیشن کے لئے مسلسل تقاضا ہو رہا تھا۔ راقم کا خیال تھا کہ دوسری اشاعت میں کچھ ضروری اضافہ ہو جاتا تو کتاب کی افادیت کچھ اور بڑھ جاتی، لیکن اس کے لیے فرصت درکار تھی جو اس خاکسار کو میسر نہیں تھی، جس کی وجہ سے اس کا معاملہ امروز و فردا پہ ٹلتا رہا۔ اسی اثناء میں خداوند کریم کے فضل و کرم سے اس کتاب کی دوسری جلد بھی طبع ہو کر منظر عام پر آگئی، جلد ثانی کی طباعت واشاعت کو تقریباً آٹھ مہینے کی مدت گزر چکی ہے۔ دوسری جلد کی اشاعت کے بعد اس پہلی جلد کا مطالبہ بھی پہلے کی بہ نسبت دوچند ہو گیا، اور جن قارئین کے ہاتھوں میں دوسری جلد پہنچی، اور پہلی جلد ان کی نگاہ سے نہیں گزری تھی، ان کی طرف سے جلد اول کا شدید اصرار ہونے لگا، ارباب ذوق وشوق کے اس اصرار اور تقاضے کے پیش نظر اس کی طبع ثانی ضروری اور ناگزیر محسوس کی جانے لگی، جن اضافوں کا خیال تھا، ان کے لیے تو اپنی عدیم الفرصتی مانع بنتی رہی، لیکن یہ ضروری معلوم ہوا کہ پہلے اڈیشن میں کتابت وطباعت یا دوسری نوع کی جو غلطیاں رہ گئی تھیں، کم از کم ان کی تصحیح واصلاح کا کام کیا جاسکے، چنانچہ پوری کتاب پر ایک غائر نظر ڈال کر تصحیح اغلاط کی گئی، چند مقامات پر ضروری حک واضافہ بھی کیا گیا۔ کچھ ضروری حواشی بھی بڑھائے گئے۔ اس طرح دوسرا اڈیشن پریس کے حوالے کرنے کے لیے تیار کیا گیا۔

طبع اول کی طرح طبع ثانی کے لیے بھی اہل علم ونظر کے شکریے کے سب سے زیادہ مستحق ہمارے مخدوم بزرگ، سرپرست ادارہ جگر گوشۂ محدث کبیرؒ، حضرت مولانا رشید احمد صاحب الاعظمی دامت برکاتہم ہیں، جن کی غیر معمولی عنایت وتوجہ کی برکت سے یہ کتاب دوبارہ طبع ہو کر منظر عام پر آرہی ہے۔ خدا سے دعا ہے کہ پہلے طبع کی طرح، دوسرے طبع کو بھی شرف قبول عطا فرمائے، آمین۔

وما توفیقی إلا باللہ.

مسعود احمد اعظمی

یکم ذیقعدہ ۱۴۳۲ھ = ۳۰ر ستمبر ۲۰۱۱ء

دیباچہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمدللہ وکفی وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ وبعد!

پیش نظر کتاب ایک ایسی شخصیت کے نقوش حیات ہیں، جس کی بلند قامتی کے سامنے کوہ ہمالہ کی بلندی بھی پست نظر آتی ہے، یہ اس ذات ستودہ صفات کی کتاب زندگی کے کچھ صفحات ہیں، جس کی رفعت وعظمت کا سراغ لگانے کیلئے جب لوگوں کی نگاہیں اٹھتی تھیں تو تھک کر واپس لوٹ جاتی تھیں، ان اوراق کے اندر اس مرد حق آگاہ کی زندگی کے بکھرے ہوئے واقعات کو یکجا کرنے کی کوشش کی گئی ہے، جس نے ایک چھپر میں وہ کر عرصۂ دراز تک قلمروئے علمی پر حکمرانی کی جس نے عمر تمام تر ایک گمنام اور دور افتادہ بستی میں گذاری، لیکن اس کے نام کا سکہ مصروشام کے بازار علم وادب میں چلتا رہا، اس کے علم وفضل اور کمال وعظمت کو دیکھ کر یہ محسوس ہوتا تھا کہ اس کی نشوونما بیسویں صدی عیسوی کے ہندوستان کے کسی دور افتادہ قصبے میں نہ ہوئی ہو، بلکہ وہ دوسری اور تیسری صدی ہجری کے کوفہ وبصرہ وبغداد اور سمرقند وبخارا میں پروان چڑھا ہو۔ ایسے باکمال کے سوانح تو وہ لوگ لکھ سکتے ہیں، جو علم وبصیرت والے ہیں، مطالعہ ومشاہدہ کی قوت رکھتے ہیں، جو چھان پھٹک اور جانچ پرکھ کی صلاحیت رکھتے ہیں، یہ کسی بے بضاعت طالب علم کے بس کی بات نہیں، آپ کے سامنے جو یہ چند صفحات ہیں ان کی حیثیت "جہد المقل" سے زیادہ نہیں!!!

محدث کبیر، محقق جلیل حضرۃ العلامہ مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی نور اللہ مرقدہ کی شخصیت اس قدر متنوع اور مختلف الجہات تھی کہ ان کو اپنے وقت کے ایک بڑے عالم و مؤرخ علامہ سید سلیمان ندویؒ نے ہندوستان کے دوائر علم میں شمار کیا تھا۔ علامہ اعظمیؒ نے جس عہد میں آنکھ کھولی تھی، اس وقت پورے ہندوستان میں باطل فرقے، دیوبندیت

وخفیت اور مسلک حق کے خلاف محاذ بنائے اور پر اجمائے ہوئے تھے، خود آپ کا قصبہ مئو رفتہ رفتہ ان فرقوں کی جد وجہد کا مرکز اور ان کی تگ ودو کا عرصہ گاہ بنتا جارہا تھا، مختلف فرقے اپنی اپنی جڑیں مضبوط کرنے کے لئے یہاں سرگرم عمل تھے، علامہ اعظمی نے اپنی علمی زندگی کے آغاز میں اس محاذ پر کمان سنبھالی، مخالفین سے مباحثے اور علمی معرکے کئے، ان کے خلاف قلمی وکلامی جنگیں لڑیں، تقریروں اور تحریروں کے ذریعہ ان کا بھرپور رد کیا مناظروں کی ضرورت پیش آئی تو مناظروں میں حصہ لیا، اس دور میں دیوبندیت وحنفیت کی حمایت میں شائع ہونے والے اہم مجلات ورسائل میں آپ کے بیشمار مضامین شائع ہوئے، چنانچہ النجم اور الفرقان کے علاوہ العدل (گوجرانوالہ) ضیاء الاسلام اور القاسم (امرتسر) وغیرہ کے صفحات آپ کے مضامین سے مزین رہا کرتے تھے، یہ آپ کا عہد شباب تھا اور جوانی کے اس دور میں بھی آپ کے علم وفضل کا جادو اس طرح سر چڑھ کر بولتا تھا، کہ مخالفین کے بڑے بڑے ارباب دستار اور اصحاب وجاہت کے ناطقے محض آپ کے نام سے سر بہ گریبان رہا کرتے تھے، یہ دور درس وتدریس، تصنیف وتالیف، تقریر وخطابت، بحث ومباحثہ، سوال وجواب، شعر وشاعری، معرکہ آرائی ہر طرح کی سرگرمیوں سے عبارت تھا۔

پھر ایک دور وہ آیا جب اس ہنگامہ خیز زندگی کو تیاگ کر خلوت گزینی کی زندگی اختیار کی، اور گوشۂ عافیت میں پناہ لے کر اپنے شہباز ہمت کا رخ علم وفن کے ایک دوسرے افق کی طرف موڑا، اب آپ کی توجہ کا مرکز حدیث وسنت کے وہ مخطوطات ونوادرات بنے جن کو ایک نظر دیکھنے کیلئے اہل علم کی نگاہیں ترستی رہتی تھیں، جو تدوین حدیث کے دور میں عالم وجود میں آئے تھے، پھر بتدریج اہل علم کی دسترس سے دور ہوتے چلے گئے، اور ان کی رسائی سے باہر ہونے کی وجہ سے وہ ناپید ہونے کے حکم میں تھے، علامہ اعظمی نے متعدد بیش قیمت مخطوطات کو، جن کے وجود سے بڑے بڑے باخبر علماء بے خبر تھے، گوشۂ گمنامی سے باہر نکال کر ان پر سالہاسال کی محنت صرف کر کے، ان کے لئے اپنا خون جگر جلا کر، اور

ان کو اپنے عالمانہ و محققانہ تعلیقات و حواشی سے سجا سنوار کر جب دنیائے علم کے سامنے پیش کیا تو لوگوں کی نگاہیں خیرہ ہو گئیں، اور اطراف واکناف عالم سے تحسین و آفریں کی صدائیں بلند ہونے لگیں، حدیث کے مخطوطات پر آپ کی یکے بعد دیگرے تحقیقات نے جریدۂ "علم" پر آپ کے نام کو دوام بخش دیا۔

ایسی عظیم اور عبقری شخصیت کی سوانح عمری لکھنا کوئی آسان کام نہیں، اس کے لئے کسی ایسے اہل علم اور صاحب قلم کی ضرورت ہے، جس کا حافظہ قوی، مطالعہ وسیع و عمیق اور قلم رواں دواں ہو، جس نے ان کے مختلف ادوار حیات کو قریب سے دیکھا اور ان کی کتاب زندگی کو اچھی طرح پڑھا اور اس کا مطالعہ کیا ہو، لیکن افسوس کہ ان میں سے اکثر حضرات اس دنیا سے گذر کر مغفور لھم ہو چکے ہیں، اور جو گنے چنے لوگ بقید حیات ہیں اور اس کام کو کرنے کی پوری اہلیت رکھتے ہیں ان کی حد سے بڑھی ہوئی مصروفیات اس کیلئے ان کو فرصت نکالنے کی اجازت نہیں دیتیں، یہ عاجز ونا کارہ ان تمام باتوں سے تہی مایہ تو ہے ہی، اس پر ستم یہ کہ اس نے اس آفتاب علم کو اس وقت دیکھا تھا، جب وہ غروب کے قریب تھا، اور ان کی گذشتہ زندگی سے اس کی واقفیت نہ ہونے کے درجہ میں تھی۔ لہذا یہ جو کچھ آپ کے سامنے ہے وہ "رحمٰن" کا کرم اور اس کے "حبیب" کی کرامت ہے۔

آج سے تقریباً ایک سال قبل جب اس کتاب کی ترتیب کا آغاز کیا گیا، تو سب سے اہم مسئلہ جو راقم الحروف کے سامنے تھا، وہ ان کی ان تحریروں کی تلاش و جستجو تھا جو شکستہ تسبیح کے دانوں کی طرح جہاں تہاں بکھری ہوئی تھیں، اگر چہ حضرۃ الاستاذ علیہ الرحمۃ نے اپنی حیات سے متعلق بعض بعض مواقع پر دو چار صفحات قلمبند فرمائے تھے، چنانچہ مولانا عبداللطیف صاحب نعمانیؒ کے وصال کے بعد "تذکرۂ مولانا عبداللطیف نعمانی" کیلئے جو مضمون سپرد قلم کیا تھا، اس میں صاحب تذکرہ کے ساتھ نہایت اختصار کے ساتھ اپنی زندگی کی سرگذشت تحریر فرمائی تھی، اسی طرح بعض عرب فضلاء وناشرین کی طلب پر اپنی طالب علمی اور تدریسی زندگی اور تصنیفات و تحقیقات کے متعلق کچھ موٹی موٹی باتیں لکھ

کر روانہ کی تھیں۔ آپ کی وفات کے بعد مجلہ ترجمان الاسلام بنارس کا "مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی" نمبر شائع ہوا، اس خصوصی اشاعت میں نہایت بیش قیمت اور معلومات افزا مضامین شائع ہوئے، مگر ساتھ ہی واقعہ یہ ہے کہ مضمون نگار حضرات کے فکر و قلم کی بازی گاہ زیادہ تر آپ کے علمی کارنامے تھے، اور اس کی وجہ یہ تھی کہ آپ کی علمی زندگی ہی لوگوں کے سامنے تھی، ذاتی اور نجی زندگی سے لوگوں کی واقفیت بہت اجمالی تھی، اور یہی وجہ ہے کہ ان تمام مضامین کے جمع و ترتیب کے بعد بھی ذاتی زندگی کا جو خاکہ بنتا تھا وہ بڑا مبہم اور غیر واضح تھا۔ آپ کے بارے میں بالتفصیل کچھ لکھنے سے پیشتر کسی چیز کی سب سے زیادہ ضرورت تھی، تو وہ تحریریں تھیں جو نہ یکجا تھیں نہ مربوط و مرتب، علامہ اعظمیؒ کی عادت یہ تھی کہ کبھی کسی بات کے لکھنے کا ارادہ فرماتے، تو سامنے جو کاغذ نظر آتا اسی پر نوٹ کر دیتے، یہاں تک کہ خط کے لفافے اور پوسٹ کارڈ وغیرہ کی خالی جگہوں کو بھی تصرف میں لایا کرتے تھے، لکھنے کے بعد حفاظت کا کوئی خاص اہتمام نہیں تھا، وہ کاغذ پڑا ہے تو پڑا ہے ورنہ دستبرد زمانہ کا شکار بھی ہو سکتا ہے، اس لئے نہیں کہا جا سکتا کہ آپ کے ہاتھ کی تمام تحریریں محفوظ ہوں گی، لیکن جو باقیماندہ ہیں وہ لعل و گہر کی حیثیت رکھتی ہیں، اور وہ ان صفحات کے طول و عرض میں اس طرح جا بجا بکھری ہوئی ہیں کہ قارئین کو یہ ایک خود نوشت سوانح معلوم ہوگی، اور ناظرین صاف طور پر یہ محسوس کریں گے کہ اس عاجز نے صرف اس میں ربط قائم کیا ہے۔

علامہ اعظمیؒ نے کبھی فرمایا تھا، کہ میری سوانح عمری میرے خطوط سے لکھی جا سکتی ہے، اس لئے راقم الحروف کو ان خطوط کی بھی خاص طور پر تلاش ہوئی جن سے آپ کے واقعات زندگی پر روشنی پڑتی ہے، چنانچہ انبار سے نکل کر ایسے بہت سے خطوط سامنے آتے رہے، جو اس کتاب کے اہم ترین مواد بنے، آپ کی بات اس طرح حرف بحرف صادق آئے گی، اس سے پہلے اس کا گمان بھی نہ تھا لو اقسم علی الله لأبرّہ کتابوں میں پڑھا تھا، آج حقیقت بن کر سامنے آ گئی۔ قسمت بھی یاوری کر رہی تھی اور تقدیر اس فرمایہ کی مدد

کرنے پر تلی ہوئی تھی، حسن اتفاق یہ ہوا کہ اس کام کو شروع کرنے کے کچھ ہی دنوں بعد مولانا مفتی محمد ظفیر الدین صاحب مفتاحی کی کتاب "مشاہیر علماء ہند کے علمی مراسلے" چھپ کر سامنے آئی، اس میں علامہ اعظمی کے مکاتیب کا خاصہ ذخیرہ موجود تھا، اور بہت سی کار آمد باتیں ہمیں اس کتاب میں شائع خطوط میں ملیں۔

اس کی ترتیب اور اس کے مواد کی فراہمی میں بہت سے حضرات کا اس ناچیز کو تعاون حاصل رہا ہے، جن کا شکریہ ادا کرنے سے راقم الحروف قاصر ہے، صاحبزادگان محترم حضرت مولانا رشید احمد صاحب الاعظمی زید مجدھم اور جناب الحاج سعید احمد صاحب الاعظمی مد ظلہ کا بطور خاص ممنون و مشکور ہوں، کہ ان دونوں حضرات بالخصوص اول الذکر کی مسلسل توجہ و عنایت اور ہمت افزائی کی بدولت یہ کتاب پایۂ تکمیل تک پہنچی۔ ان کے علاوہ جناب ڈاکٹر عبدالمعید صاحب اور جناب انوار الحق صاحب محشر بھی شکریہ کے مستحق ہیں کہ موقع بموقع مواد فراہم کر کے ناچیز کی اعانت فرماتے رہے، دوسرے بزرگوں میں مولانا نظام الدین اسیر صاحب ادروی استاذ جامعہ اسلامیہ بنارس و مدیر مجلّہ "ترجمان الاسلام" اور مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمی دامت برکاتھم مدیر تحریر مجلّہ "المآثر" نے دیرینہ اور بزرگانہ شفقت سے کام لے کر اپنی بے پناہ مصروفیتوں کے باوجود تقریباً پوری کتاب پر نظر ثانی فرمائی، جس کی وجہ سے یہ حقیر کاوش اس قابل ہوئی کہ اہل نظر کے سامنے پیش کی جاسکے، مولانا اسیر صاحب نے احقر کی درخواست پر بیش قیمت پیش لفظ تحریر فرما کر اسکی افادیت میں اضافہ فرمایا، اور اپنے ان اساتذہ یا مثل اساتذہ کے احسان و کرم کا شکریہ ادا کرنے کیلئے تو میرے پاس الفاظ ہی نہیں جنھوں نے اپنے تاثرات تحریر فرما کر اس کو سند اعتبار بخشی۔ اللہ تعالیٰ ان حضرات کے سائے کو دراز اور ان کی خدمات کو قبول فرمائے اور دین متین کی خدمت کی ان کو بیش از بیش توفیق عنایت فرمائے۔ آمین، وما توفیقی الا باللہ۔
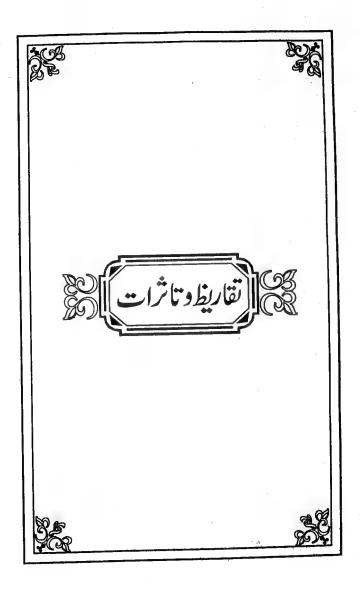
مسعود احمد الاعظمی

۲۹ ستمبر ۱۹۹۹ء

تقاریظ و تاثرات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

امیر الہند حضرت مولانا سید اسعد مدنی رحمۃ اللہ علیہ

الحمد للہ وحدہ والصلاۃ والسلام علی من لا نبی بعدہ

احقر کو یہ معلوم کر کے بڑی مسرت ہوئی کہ امیر الہند اول محدث کبیر علامہ جلیل حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی نور اللہ مرقدہ کے حالات زندگی، اور ان کی علمی و تحقیقی خدمات کا مفصل تذکرہ حضرت کے نواسے عزیزم مولوی مسعود احمد صاحب سلمہٗ نے نہایت کاوش اور تحقیق کیساتھ بہت اچھے انداز میں مرتب کیا ہے، اللہ تعالیٰ انھیں جزائے خیر عطا فرمائے۔

اس صدی میں حضرت امیر الہند قدس سرہ اہل علم کی صفوں میں اور علم و تحقیق کے میدان میں بالخصوص فن حدیث اور اس کے متعلقات میں جس درجہ اہمیت کے حامل تھے، اسے سب جانتے ہیں، شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی قدس سرہ حضرت والا کے خاص قدر دانوں میں تھے، ان کی خدمات کا دائرہ اس صدی کے تین چوتھائی حصہ پر محیط ہے، ان کی بارگاہ علم میں عرب و عجم نے زانوئے ادب تہ کیا ہے۔ اور اخیر دور میں شدید ضعف اور بڑھاپے کے باوجود، نہایت نازک حالات میں ہندوستان میں ملت اسلامیہ کی سربراہی جس طرح آپ نے فرمائی ہے ایک یادگار اور قابل فخر کارنامہ ہے۔ حضرت کی وفات کے بعد علم و دین اور ملک و ملت کے وسیع دائرہ خدمت میں بہت زیادہ خلا ہوا ہے۔

یہ ہم سب پر قرض تھا کہ حضرت کے حالات و سوانح کی اشاعت کا اہتمام کیا جاتا بہت زیادہ قابل مبارکباد ہیں برادر محترم مولانا رشید احمد صاحب، خلف اکبر حضرت اقدس نور اللہ مرقدہ کہ انھوں نے اس پر توجہ کی، اور اپنی نگرانی میں یہ بیش قیمت دستاویز مرتب

کروائی اور اس کی اشاعت کا انتظام و انصرام کیا، اور بہت ہی سعادت و خوش بختی ہے عزیزم مولوی مسعود احمد سلمہ کی کہ انھوں نے اپنے عظیم المرتبت نانا کے احوال و وقائع مرتب کئے۔

اللہ تعالیٰ اسے اپنے فضل و کرم سے قبول فرمائے، اور تمام ملت اسلامیہ کیلئے نافع اور رہنما بنائے۔ آمین، فقط

اسعد غفرلہ
(جامع) مسجد رشید، دارالعلوم دیوبند
۲۳؍ رمضان المبارک ۱۴۲۰ھ

☆☆☆☆☆

حضرت مولانا نعمت اللہ صاحب معروفی دامت برکاتہم
استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند

الحمدللہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی سید المرسلین وعلی آلہ وصحبہ أجمعین

اس ملک میں ہر دور میں نامور علماء ومشائخ پیدا ہوئے اور انھوں نے نمایاں علمی، دینی اور تعلیمی خدمات انجام دیں، ان ہی علماء کرام میں ہمارے ممدوح امیر الہند، محدث کبیر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی قدس سرہ بھی ہیں، جو اپنی علمی خدمات کی وجہ سے پورے ملک میں جانے پہچانے جاتے ہیں، عوام اور خواص نہایت عقیدت و احترام کے ساتھ آپؒ کا نام لیتے ہیں، علمی دنیا میں آپ کی شہرت و مقبولیت ہے، عجم سے لیکر عرب تک آپ کی علمی خدمات بالخصوص علم حدیث سے آپؒ کے شغف کا چرچا ہے، آپ سے استفادہ کرنے اور سند حدیث لینے کیلئے ملک اور بیرون ملک سے علماء آپؒ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے، آپ بہت خوش دلی سے ان کا استقبال کرتے اور بڑے شوق سے ان کی مہمان نوازی فرماتے اور حدیث کی سند عطا فرماتے تھے۔

حضرت مولانا فراغت کے بعد برابر درس وتدریس کی خدمت انجام دیتے رہے۔ اور دورۂ حدیث کے ساتھ دیگر علوم وفنون کی بڑی بڑی کتابیں پڑھاتے رہے، اللہ تعالیٰ نے ہر فن میں کمال عطا فرمایا تھا، علم اسماء الرجال میں امتیاز خاص حاصل تھا، اس فن میں آپ کو جو امتیازی شان حاصل تھی اس میں کوئی آپ کا ثانی نہیں تھا، راویوں کے نام میں صحت تلفظ کا بڑا اہتمام تھا، حضرت مولانا کی زبان سے جو نام جس طرح نکلتا تھا، کتابوں میں تحقیق کے بعد وہی صحیح ثابت ہوتا تھا۔

حدیث کی جو کتابیں چھپی ہوئی ملتی ہیں، اہل علم کے سامنے وہی ہوتی تھیں، حضرت مولانا کی عقابی نگاہیں ان سے بہت آگے رہا کرتی تھیں، حدیث کے قلمی ذخیرہ

پر آپ کی بڑی گہری نظر تھی اور آپ کی دلی خواہش تھی کہ وہ تمام ذخیرہ منظر عام پر آجائے، فرماتے تھے کہ احادیث کا قلمی ذخیرہ اگر چھپ جائے تو مستشرقین کے اعتراضات کا عملی جواب ہو جائے گا، اور گمراہ کرنے کا ایک بہت بڑا ذریعہ ختم ہو جائے گا، اسی طرح غیر مقلدین کے اعتراضات بھی باقی نہیں رہیں گے، اس لئے کہ اس ذخیرہ میں فتاویٰ صحابہؓ کرامؓ اور اقوال تابعینؒ کا بڑا حصہ موجود ہے، اور ساتھ ہی ساتھ علماء کرام کے سامنے بھی وہ ساری احادیث آجائیں گی جو مطبوعہ کتابوں میں نہیں ہیں۔

چنانچہ آپؒ اخیر عمر میں درس و تدریس کا کام کم کر کے قلمی کتابوں کی اشاعت کے کام میں پوری توجہ سے منہمک ہو گئے، اور اس بیش قیمت ذخیرہ کو پردۂ گمنامی سے باہر نکالنے کا عظیم الشان کارنامہ انجام دیا، عالم اسلام کے مختلف کتب خانوں میں ان کتابوں کے جو قلمی نسخے تھے ان کی نقلیں منگوائیں، اور ان کے مختلف نسخوں کا مقابلہ کر کے ان کے نصوص کی تصحیح کی اور جہاں جہاں ضرورت محسوس ہوئی اس پر تعلیق و تحشیہ کی زحمت برداشت کی، کتابوں کے شروع میں ان پر عالمانہ و فاضلانہ مقدمے لکھے اور جس طرح بن پڑا ان کتابوں کو چھپوایا۔ مصنف عبدالرزاق، مصنف ابن ابی شیبہ، مسند حمیدی، سنن سعید بن منصور، کتاب الزهد والرقائق اور حدیث کی دوسری دسیوں کتابیں آپ کی توجہ سے چھپ کر عام ہوئیں، اور علمی دنیا نے دیکھا کہ کتنا عظیم ذخیرۂ حدیث تھا جو ہماری دسترس سے باہر تھا، حضرت مولانا اعظمیؒ کا احسان عظیم ہے کہ ان قیمتی ذخائر کا پتہ لگایا، اور اپنے تعلیقات و حواشی کے ساتھ چھپوایا، اس خدمت حدیث پر موافق و مخالف سارے اہل علم نے آپؒ کو مبارکباد دی اور آپؒ کی خدمات کو خوب سراہا۔

حضرتؒ مولانا کا مطالعہ نہایت وسیع و عمیق تھا، اور کثرت مطالعہ کی وجہ سے حدیث کے سلسلے میں ذوق ایسا پختہ ہو گیا تھا کہ حضرت مولانا ایوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ سابق ناظم مدرسہ مفتاح العلوم فرماتے تھے کہ حضرت الاستاذ شاہ انور صاحب رحمۃ اللہ علیہ اگر کسی حدیث کے سلسلہ میں کوئی جملہ فرما دیتے تھے تو اس حدیث کے بارے میں تلاش و جستجو کے بعد اسی طرح کی بات ضرور ملتی تھی، یہی حال حضرت مولانا کا ہے۔

حضرت مولانا کا حافظہ پرانے زمانے کے محدثین جیسا تھا، جو چیز ایک دفعہ نظر سے گذر جاتی وہ محفوظ رہتی تھی، آپؒ اپنے زمانے کے امام ذہبیؒ اور ابن حجرؒ تھے۔ جن لوگوں نے مولانا کے ساتھ کچھ دن گذارے ہیں جانتے ہیں کہ آپ کا حافظہ کس غضب کا تھا اور کس قدر پختہ اور صحیح یادداشت تھی، اخیر عمر میں جب صحت نے تقریباً جواب دے دیا تھا، اس وقت بھی جب ہدایہ اخیرین اور مشکوٰۃ وغیرہ پڑھاتے تو کتابیں سامنے نہیں رکھتے تھے، مگر کیا مجال ہے کوئی طالب علم کوئی جملہ یا سطر ترک کردے اور مولانا نہ ٹوکیں، فوراً فرماتے تھے صحیح عبارت اس طرح ہے۔

حضرت مولانا کی جیسی نظر حدیث اور درسیات پر تھی، یہی حال عربی ادب کا تھا، اس پر بھی بڑی عمیق نظر تھی، چنانچہ جس طرح احمد محمد شاکرؒ کی مسند احمد کی شرح پر آپ نے لکھا اور انھوں نے آپؒ کے علم و فضل اور کمال کا اعتراف کیا، اسی طرح ان کے بھائی محمود محمد شاکر نے "کتاب نسب قریش" کی جب تحقیق کی، تو ان کی غلطیوں پر آپؒ نے گرفت فرمائی اور جو کمی تھی اس کو ظاہر کیا۔

عبداللہ چکڑالوی نے جب انکار حدیث کا فتنہ پیدا کیا، اور اس کے برگ وبار مقالات ورسائل کی شکل میں ظاہر ہوئے، تو اس وقت کچھ لوگوں نے حضرت مولانا کو اس طرف توجہ دلائی، مولانا نے بروقت "نصرۃ الحدیث" کے نام سے اس کا رد لکھا اور اسے شائع کیا، حکیم الامت حضرت مولانا تھانویؒ کی خدمت میں جب یہ کتاب پہنچی تو آپؒ نے اس کا مطالعہ فرمایا اور حضرت مولانا کو مبارکباد دی اور دلی خوشی کا اظہار فرمایا۔

مختصر! یہ کہ حضرت مولانا نے پوری اکیڈمی کا کام تنہا انجام دیا، جس کی تفصیل اس کتاب میں آپ ملاحظہ فرمائیں گے، مجھے توقع ہے کہ حضرت والا کے یہ سوانح حیات بعد والوں کے لئے شمع راہ ثابت ہوں گے اور اندازہ ہوگا کہ پہلے علماء کرام کتنی محنت کیا کرتے تھے اور اپنے بعد والوں کیلئے کیا کیا کام کر گئے۔

اخیر میں اس "حیات ابوالمآثر" لکھنے اور لکھوانے والے اور شائع کرنے والے کو مبارکباد پیش کرتا ہوں، یہ بہت عظیم خدمت ہے جو انجام پذیر ہوئی۔

العارض نعمت اللہ غفرلہ

مولانا مفتی محمد ظفیر الدین صاحب مفتاحی رحمۃ اللہ علیہ

مفتی دار العلوم دیوبند

الحمد لله و كفى وسلام على عباده الذين اصطفىٰ

یہ ایک حقیقت ہے کہ اس برصغیر میں بڑے بڑے جید الاستعداد علماء کرام پیدا ہوئے، اور انہوں نے اپنی زندگی میں علمی، دینی اور تعلیمی خدمات انجام دیں۔

ان ہی ممتاز و مخصوص علماء کرام میں محدث کبیر، امیر الہند حضرت الاستاذ العلام مولانا ابوالمآثر حبیب الرحمٰن الاعظمیؒ بھی تھے، جن کی پوری زندگی درس و تدریس، تصنیف و تالیف، اور خدمت حدیث و تفسیر و فقہ میں گذری، ہزاروں علماء آپ کی تعلیم و تربیت سے فیض یاب ہوئے، اللہ تعالیٰ نے آپ کو علم و عمل سے نوازا تھا، اور آپ کی ذات "دائرۃ المعارف" کی حیثیت رکھتی تھی۔

علم حدیث اور فن اسماء الرجال سے خاص شغف تھا، پوری دنیائے اسلام میں خادم حدیث کی حیثیت سے جانے پہچانے جاتے تھے، اور عرب و عجم میں جو علماء کرام حدیث سے ذوق رکھتے تھے وہ دور دراز سے سفر کی صعوبتیں برداشت کر کے آپ کی خدمت میں مئو حاضر ہوتے اور آپ سے حدیث کی اجازت و سند حاصل کرتے، اور بہت سے غیر ملکی علماء بذریعہ خط و کتابت اس شرف کو حاصل کرنے کی سعی فرماتے اور کامیاب ہوتے تھے۔

حضرت الاستاذ کی قلمی کتابوں پر بڑی گہری نظر تھی، آپ نے بہت سی کتب حدیث کا قلمی نسخہ مختلف کتب خانوں سے حاصل کیا جو گوشہ گمنامی میں پڑی تھیں، ان پر محنت کی اور اپنی تحقیق و تعلیق سے مزین فرمایا، پھر ان کو مختلف جگہوں سے شائع کرایا، جن کو دیکھ کر اور مطالعہ کر کے جلیل القدر علماء کرام کے دلوں سے آپ کے لئے دعائیں نکلیں اور آپ کو دیکھنے کا انھیں شوق پیدا ہوا، چنانچہ بہت سے علماء آئے اور مولانا سے ملے اور گفتگو کی۔

حدیث کی جو کتابیں آپ کی تحقیق و تعلیق اور تحشیہ کے ساتھ شائع ہوئیں، وہ کئی کئی ضخیم جلدوں میں ہیں، مصنف عبدالرزاق گیارہ جلدوں میں، مصنف ابن ابی شیبہ پندرہ جلدوں میں، المطالب العالیہ چار ضخیم جلدوں میں، مسند حمیدی دو جلدوں میں سوچئے! تنہا ایک شخص نے ان تمام کتابوں کی تمام جلدوں کا ایک ایک حرف پڑھا، پھر مقابلہ کیا، پھر تعلیق و تحقیق کی زحمت برداشت کی، اور ساتھ ہی ہر ایک پر مقدمہ لکھا، جو محنت ایک اکیڈمی کے بس کی نہیں تھی، حضرت الاستاذؒ نے تن تنہا وہ خدمت انجام دی، آپ نے کس قدر محنت مشقت برداشت کی ہوگی، اور دن رات لگ کر کام کیا ہوگا، اس کا اندازہ بھی مشکل ہے۔

ان کے علاوہ دسیوں دوسری کتابیں بھی آپ کی تحقیق و تعلیق کے ساتھ شائع ہوئیں، جیسے "سنن سعید بن منصور" "کتاب الزہد والرقائق" وغیرھما، اللہ تعالیٰ نے غضب کا حافظہ عطا کر رکھا تھا، ہزاروں حدیثیں نوک زبان پر تھیں، اور ہزاروں عربی اشعار حافظہ میں محفوظ تھے، اسباق پڑھاتے ہوئے طلبہ میں ذوق پیدا کرنے کیلئے کبھی اس کا ذکر فرماتے تھے اور ہم طلبہ سن کر حیرت زدہ رہتے تھے۔

مسند احمد کی شرح جب احمد محمد شاکر نے شائع کی تو اس کی جلدیں منگوائیں، ان کا بالاستیعاب مطالعہ کیا، اور پھر اس پر عالمانہ، محققانہ انداز سے استدراک و تعقبات لکھ کر ان کی خدمت میں بھیجا، جس سے وہ کافی متاثر ہوئے، اور شکریہ کا خط لکھا اور اپنی کتاب میں اس کو چھاپا، اور آپ کی تحقیق کو سراہا۔

علمی دنیا میں جب آپ کی شہرت ہوئی تو ممالک عربیہ سے بہت ساری دعوتیں آئیں کہ تشریف لائیں، ان ممالک میں مصر، مدینہ منورہ، بغداد، مراکش، شام اور قطر بھی شامل ہیں، صحت نے اجازت دی تو بعض جگہ تشریف بھی لے گئے اور بعض جگہ اپنی صحت کی کمزوری کی وجہ سے نہیں جاسکے، غیر ممالک میں جب جانا ہوا تو وہاں کے علمائے کرام آکر ملے ان سے علمی گفتگو ہوئی تو اس علمی گفتگو سے وہاں کے علماء کرام بہت زیادہ متاثر ہوئے، اور آپ کی حدیث دانی پر حیرت کا اظہار کیا۔

قدر دانی ہر طرف سے ہوئی، خود اپنے ملک کے تمام بڑے تعلیمی اداروں نے پیش کش کی کہ یہاں آکر درس و تدریس کی مسند کو زینت بخشیں، خود دارالعلوم دیوبند نے جو ایشیا کا سب سے بڑا تعلیمی اور علمی ادارہ ہے، صدارت افتاء کی دعوت دی، اس کے لئے خود شیخ الاسلام حضرت مدنیؒ اور حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب رحمہما اللہ مئو تشریف لے گئے، پھر حضرت مولانا ابراہیم صاحبؒ اور حضرت مولانا فخر الدین صاحبؒ کے بعد صدارت تدریس کے لئے دعوت دی گئی اور اصرار کے ساتھ بلایا گیا، دارالعلوم ندوۃ العلماء نے دعوت دی، اسی طرح دارالمصنفین اعظم گڑھ اور دوسرے اداروں نے بھی دعوت دی، لیکن طبیعت میں نزاکت تھی، صحت بھی زیادہ مضبوط نہیں تھی، اس لئے وطن چھوڑنے کی ہمت نہیں کی، سارا علمی کام گھر بیٹھ کر کرتے رہے، یقین کریں اپنے ان علمی کاموں میں کسی سے قطعاً کوئی مدد نہیں لیتے تھے، بلکہ تنہا کرتے تھے، لیکن کبھی طبیعت میں علمی کبر و غرور نہیں پیدا ہوا، وہی سادہ زندگی برابر رہی جو ایک قدیم عالم دین کا شیوہ تھا بلکہ دوسرے جو علماء کرام خدمت اقدس میں حاضر ہوئے ان کی تعظیم و تکریم کی اور ان کی حوصلہ افزائی فرمائی۔

پھر حالات نے مجبور کیا تو غیر مقلدین کا رد لکھا، بدعتیوں کا رد لکھا، شیعوں کا رد لکھا، اور رافضیوں کا دندان شکن جواب دیا، اور اہل قرآن کا جب فتنہ اٹھا تو آپ نے اس کے رد میں "نصرۃ الحدیث" کے نام سے کتاب لکھی، جس پر حضرت تھانویؒ نے بہت سی دعائیں دیں، اور دوسرے علماء نے بھی۔

ایک زمانہ میں جب ملک میں دعوت و تبلیغ کی ضرورت ہوئی اور لوگوں نے جلسوں میں شرکت کی دعوت دی تو ملک کے مختلف حصوں میں جاکر تقریریں بھی کیں، اور اپنے مواعظ حسنہ سے ملک وملت کو مستفید فرمایا، ضرورت پڑنے پر بہت سارے مناظرے بھی کئے، اور جو مقابل میں آئے ان کو شکست فاش دی۔ غیر مسلک والے آپ کے نام سے گھبرانے لگے تھے، اخیر زندگی میں احباب اور بزرگوں نے اصرار کیا تو ارشاد و بیعت کی خدمت بھی انجام دینی پڑی، اور بہت سے مخصوص لوگوں کو بیعت فرماکر سلسلہ

میں داخل کیا۔

آپ کی حیات میں آپ یہ بھی پڑھیں گے کہ پانچ سال کیلئے یوپی اسمبلی کے ممبر بھی منتخب ہوئے، مگر اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی، نہ ایک دن کیلئے اس سلسلہ میں کہیں گئے، اور نہ کسی سے ایک جملہ کہا، لوگوں نے اپنی پارٹی کی جیت کیلئے ایسا کیا تو پہلے انکار کیا، مگر جب وہ سب نہیں مانتے تو خاموشی اختیار کرلی، صدر جمہوریہ کی طرف سے علمی ایوارڈ بھی دیا گیا آپ نے اسے بادل نخواستہ قبول کیا۔

مختصر! یہ کہ حضرت الاستاذ قدس سرہ نے اپنی زندگی میں بہت سارے کام انجام دیئے، زیادہ وقت جامعہ مفتاح العلوم کی تدریس وتعمیر اور طلبہ کی تعلیم وتربیت پر خرچ کیا، اخیر میں "المعھد العالی" قائم فرمایا اور مدرسہ "مرقاۃ العلوم" کی داغ بیل ڈالی اور یہاں دورۂ حدیث تک کی کتابیں پڑھائیں، اور اس وقت مئو میں بس یہی ایک تعلیمی ادارہ ہے جو حکومت سے ملحق نہیں ہے، بلکہ آزاد ہے ورنہ دوسرے سارے مدارس اسلامیہ حکومت کے کنٹرول میں چلے گئے، اب حضرت کی یادگار یہی مدرسہ ہے، اللہ تعالیٰ تادیر اس کو قائم رکھے، اور یہ دینی علوم کی ترویج واشاعت میں برابر مشغول رہے۔

عزیز مکرم مولانا ڈاکٹر مسعود احمد ہم سب کے شکریہ کے مستحق ہیں جو مولانا کی وفات کے بعد آپ کی حیات مرتب کرنے میں منہمک رہے اور اسے مکمل کیا، رب العالمین ان کی اس گراں قدر محنت کو قبول فرمائے، اور اسی کے ساتھ جامعہ مرقاۃ العلوم مئو کے مہتمم حضرت مولانا رشید احمد صاحب دامت برکاتہم بھی لائق مبارکباد ہیں کہ یہ سارے کام ان کی نگرانی میں انجام پذیر ہوئے، اور وہی حیات ابوالمآثر کو چھپوا رہے ہیں۔

بس ان چند سطروں پر خاکسار اپنی یہ تحریر ختم کرتا ہے، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ زیر نظر کتاب کو قبول فرمائے اور حضرت الاستاذؒ کے درجات بلند سے بلند تر فرمائے۔ ربنا تقبل منا انك انت السميع العليم۔

محمد ظفیر الدین غفرلہ
مفتی دارالعلوم دیوبند
۱۰؍ جمادی الاخریٰ ۲۰؁ھ

محترم جناب مولانا اعجاز احمد اعظمی صاحب مدیر المآثر مئو

ایک ایسی شخصیت جس کا علم گہرا تھا اور وسیع بھی! ایک ایسا عالم جس کی نظر ثاقب تھی اور ہمہ گیر بھی! ایک ایسا شب زندہ دار، جس میں محدثین کی سی جانکاہی تھی اور صوفیاء کا ساسوز بھی! وہ علم کا طالب تھا، اور علماء کا استاذ بھی! اس کو دیکھ کر علماء حدیث کے حیرت انگیز حافظوں کی تصدیق ہوتی تھی اور ائمہ اجتہاد کی ذہانتوں کا یقین آتا تھا، اس کی ژرف نگاہی کے سامنے عقلیں ششدر رہ جاتی تھیں، اور اس کے ورع و تقویٰ کو دیکھ کر ایمان تازہ ہوتا تھا، وہ غیرت وحیا کا پتلا تھا، وہ دینی صلابت میں بے نظیر تھا، وہ صحت علم اور حسن عمل کا جامع تھا، اس کی ہیبت اور اس کے وقار کے سامنے بڑے بڑے اساطین علم کی گردنیں جھکی رہتی تھیں، وہ عرصۂ دراز تک ایک سفالہ پوش تنگ و تاریک حجرے میں رہا کیا، مگر اس کے علم کا نور چہار دانگ عالم کو روشن کرتا رہا۔

۱۴۱۲ھ میں روشنیٔ علم کا یہ پیکر اپنے خالق و مالک کے حضور پہونچ گیا، اس کے خاکی بدن نے مٹی کی چادر اوڑھ لی اور اس کی نورانی روح مرکز نور میں روپوش ہو گئی، ہمارے درمیان سے اس کا وجود ناسوتی اٹھ گیا، لیکن اس کا علم؟ سب کہاں، کچھ تلامذہ کے سینوں میں کچھ کاغذ کے سفینوں میں محفوظ ہے جس سے آنے والی نسلیں استفادہ کرتی رہیں گی، اور ہاں اس کے احوال و سوانح کی یاد دلوں میں؟ وہ بھی سب کہاں؟ قدرے قلیل باقی رہ گئی، اس کے بھی محو ہو جانے کا اندیشہ لگا رہا۔

علم کے ہر حلقے سے تجویزیں آئیں کہ احوال و سوانح کا جو کچھ حصہ لوگوں کی یادداشت میں اور مختلف اوراق میں محفوظ اور بکھرا ہوا ہے، اسے جمع کر کے مرتب کر دیا جائے، تاکہ اس عظیم شخصیت کا مجموعی خاکہ نگاہوں میں آجائے۔

یہ تجویز واجب التعمیل تھی، اس کیلئے قرعۂ فال اسی دیوانے کے نام نکلا گیا، جو یہ سطریں اس وقت لکھ رہا ہے، اے کاش کہ اس قاصر القلم سے یہ کام بن پڑتا۔ لیکن قرعۂ فال جس دیوانے کے نام نکلا تھا، جب وہ کچھ لکھنے کا ارادہ کرتا تو اس کا قلم تھرا جاتا، موضوع کی اہمیت اور خود اس کی بے لیاقتی دامن گیر ہوتی۔ اسی کش مکش میں دن گذرتے گئے، اچانک معلوم ہوا کہ حضرت اقدس کے اہل بیت ہی میں سے ایک ذہین وفطین صاحب علم وقلم، جو حضرت ہی کے شاگرد ہیں، چپکے چپکے حضرت کی سوانح حیات عربی میں مرتب کر چکے ہیں۔ ایک حیرت آمیز خوشی ہوئی، حیرت اس پر کہ کتنی خاموشی سے کام شروع ہوا اور پایۂ تکمیل کو پہونچ بھی گیا۔ اور خوشی اس پر کہ حضرت کی اولاد ہی نے یہ فریضہ انجام دیا، یہ ہیں حضرت کے نواسے، مولانا رشید احمد الاعظمی مد ظلہ کے بھانجے اور حاجی سعید احمد صاحب (کشمیر ٹیکسٹائلس) کے فرزند گرامی مولانا مسعود احمد صاحب! جو المآثر کے صفحات میں ڈاکٹر مسعود احمد صاحب کے عنوان سے جلوہ گر ہوتے رہتے ہیں۔

دل میں خیال آیا کہ ماشاءاللہ نوجوانی ہی میں قلم پختہ ہے، انھیں کے قلم سے اردو میں بھی سوانح آجاتی تو "حق بحقدار رسید" کا مصداق ہوتا۔ کچھ دنوں کے بعد معلوم ہوا کہ اردو سوانح کا بھی سفر تقریباً آدھا طے ہو چکا ہے، پھر جو ان کا کام دیکھا تو تلاش وجستجو تحقیق و تفتیش، اقتباس وترتیب اور نادر معلومات کا ایک مرقع نظر آیا۔ یہ خاموش کاوش بہت قابل قدر ہے، اللہ تعالیٰ اسے قبول فرمائے، کتاب کی تعریف وتوصیف پر کچھ نہیں عرض کرنا ہے۔ "ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے" پڑھئے اور خود فیصلہ کیجئے، حضرت اقدس کی برکت سے انکے حالات کا مرقع کتنا دل آویز ہے۔

حضرت اقدس نور اللہ مرقدہ کی وفات کے بعد سے مسلسل حضرت کے علوم اور ان کے تذکرے کی خدمت ہو رہی ہے، ترجمان الاسلام بنارس نے محدث اعظمی نمبر شائع کیا، مدرسہ مرقاۃ العلوم مئو سے المآثر کا اجرا عمل میں آیا، جو بحمد اللہ اب تک اس خدمت میں سرگرم ہے۔ حضرت کے نام پر عظیم الشان مکتبہ تعمیر ہوا، جس میں حضرت کا سارا علمی

سرمایہ محفوظ کردیا گیا ہے۔ یہ سب کچھ اس ایک شخص کی خاموش کاوش اور لگن اور اس کے حسن نیت کا ثمرہ ہے جسے حضرت اقدس کیساتھ فرزندی کا شرف حاصل ہے، اور تلمذ کا بھی! یہ ہیں حضرت اقدس کے خلف الرشید حضرت مولانا رشید احمد الاعظمی دامت برکاتھم۔

مولانا موصوف حضرت کے سفر وحضر کے رفیق اور کاتب رہے ہیں، اور حضرت کے علمی کارناموں میں شریک رہے ہیں۔ چونکہ مولانا کا خط پاکیزہ ہے، اور طبیعت میں احتیاط بہت زیادہ ہے، اس لئے مسودہ تیار کرنا، اس کو آخری شکل دینا، عموماً مولانا رشید احمد صاحب کی ذمہ داری ہوا کرتی تھی، اس باب میں حضرت اقدس کو ان پر بڑا اعتماد تھا، انتظامی سلیقہ کی بنا پر حضرت نے انھیں کو مدرسہ مرقاۃ العلوم کا ناظم بھی منتخب فرمایا تھا جو بفضل خدا اب تک انھیں کی نظامت میں سرگرم عمل ہے۔

غیرت وخودداری اور خاموش کارگذاری میں مولانا موصوف ٹھیک اپنے والد گرامی کے نقش قدم پر ہیں، ان کی نگرانی اور اہتمام میں کتنے اہم کام انجام پاگئے، لیکن نہ کوئی اعلان ہے نہ اشتہار!

مولانا موصوف جامعہ مفتاح العلوم مئو کے فارغ التحصیل ہیں، اجازت حدیث انھیں اپنے والد محترم رحمہ اللہ کے علاوہ عالم اسلام کے مشہور بزرگ محدث حضرت علامہ زاہد الکوثری نور اللہ مرقدہ سے بھی حاصل ہے۔

یہ حقیر وخاکسار رسمی طالب علمی سے فراغت کے بعد سے مسلسل تدریس کی خدمت میں لگا ہوا ہے۔ باقاعدہ مضامین لکھنے کا اتفاق بہت کم ہوا تھا۔ اکا دکا کتابیں اس کے قلم سے نکلی تھیں۔ لیکن تحریر وقلم سے کچھ زیادہ مناسبت نہ تھی۔ اصل ذوق تدریس ہی کا تھا، اور اب بھی ہے، تدریس کیساتھ تحریر وقلم کے میدان میں کھینچ لانا، یہ مولانا موصوف ہی کے حکم اور محبت کا نتیجہ ہے۔ المآثر کا اجرا طے ہوا، تو اس کوتاہ قلم کو اس کا مدیر مقرر فرمایا، جس کے نتیجے میں مسلسل مضامین لکھنے کا اتفاق ہوا، اور علمی حلقوں میں ایک نئے اہل

قلم کا تعارف ہوا۔

غرض مولانا کی لگن یہ ہے کہ حضرت کے علمی و تحقیقی کاموں کو زندہ رکھا جائے، اس پر اضمحلال طاری نہ ہونے پائے۔ اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی یہ بھی ہے، کہ حضرت کا مفصل تذکرہ لکھوانے کا شدید داعیہ ان کے قلب میں پیدا ہوا، ان کا فیصلہ یہ تھا کہ اسی قاصرالقلم سے لکھوائیں گے۔ میرے قصور ہمت کے باوجود ان کے اس جذبہ میں کوئی کمی نہیں آئی، تو اللہ تعالیٰ نے گھر ہی کے ایک باصلاحیت عالم کو اس کام کیلئے مستعد فرمادیا، جنھوں نے دوسری مشغولیتوں کے ساتھ بہت کم مدت میں ایک مستند، معیاری اور محققانہ تذکرہ مرتب فرمادیا۔

حضرت کی ان علمی یادگاروں کے بقاء و تحفظ میں مولانا رشید احمد صاحب کے صاحبزادگان، بالخصوص مولانا ازہر رشید صاحب اور مولانا انور رشید صاحب بھی بہت دلچسپی لیتے ہیں، بحمد اللہ حضرت اقدس کی نسل اور خاندان میں دین اور علم کا ذوق زندہ ہے، حضرت کے پوتوں اور نواسوں میں بہت کثرت سے اصحاب علم ہیں۔

حضرت کے دوسرے صاحبزادے حاجی سعید احمد صاحب اپنی صحت کی خرابی کی وجہ سے تحصیل علم کی تکمیل تو نہیں کر سکے، تاہم ان کے صاحبزادگان میں اصحاب فراغت موجود ہیں، حضرت کی علمی یادگاروں کے سلسلے میں بڑے بھائی کی معیت میں انھیں بھی بہت دلچسپی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس گھرانے کو علم و فضل سے اور دین و تقویٰ سے ہمیشہ آباد وشاداب رکھے۔ آمین

اعجاز احمد اعظمی

۵؍ رمضان المبارک ۱۴۲۰ھ

xxxxxxxxxxx

مولانا حکیم عزیز الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ

یہ ہمیشہ سے دستور چلا آرہا ہے کہ سلاطین نے جس جگہ کو اپنا مرکز بنایا وہاں ہر علم وفن کے لوگ بھی دھیرے دھیرے جمع ہوتے چلے گئے ۔اور ملک کے چیدہ پسندیدہ دل و دماغ کا مستقر یہ راجدھانیاں بنتی گئیں، لیکن سلاطین کی ایک دوسرے سے آویزش جنگ و محاربہ بھی تاریخ کا ایک بڑا حصہ ہے، ایسی صورت میں راجدھانی کا سکون ختم ہو جانا، اہل علم و نظر کا انتشار کا شکار ہو جانا بھی إن الملوك إذا دخلوا قرية أفسدوها وجعلوا اعزة أهلها أذلة وكذلك يفعلون، کی روشنی میں ایک حقیقت ہے۔

اس آیت میں قرآن کریم نے اسی فلسفۂ ملوکیت کا ذکر فرمایا ہے، آویزش و بدامنی میں سب سے زیادہ اضطراب اہل علم کا جو علمی کاموں میں لگے رہتے ہیں، ہوتا ہے، نتیجۃً عالی دماغ اور علمی استحضار کے لوگ راجدھانی کو چھوڑ کر نواحی کی طرف منتقل ہو جاتے، تاکہ اس بے ثباتی سے ان کے کام کو نقصان نہ پہونچے۔

دہلی ہندو پیریڈ سے لے کر انگریزوں کے عہد تک دار السلطنت رہا کیا اور وہ، خواہ وہ ہستنا پور ہو یا شاہجہاں آباد یا کسی اور نام سے اسے یاد کیا گیا ہو، ہر زمانے میں راجدھانی رہا کیا، ظاہر ہیکہ ان تمام ادوار میں بدامنی، قتل و غارت کے واقعات وحادثات پیش آتے رہے، نتیجۃً دہلی کے اطراف میں فکر بلیغ، طبع بلند، راسخ العلم اذکیا و عقلاء کی بڑی تعداد سکونت پذیر ہوتی گئی، خود انگریز جیسے جہاں گرد وجہاں دید قوم نے کلکتہ میں وہ بات نہیں پائی اور دہلی کو اپنا مستقر بنایا، آج بھی ملک کی راجدھانی وہی ہے، اس طرح دہلی اور اس کے قریبی علاقوں میں اہل علم وتدبیر وتدبر کا حلقہ بڑھتا گیا، رامپور کو دیکھئے روہیلہ خاندان کے حکمرانوں سے بریلی واطراف بریلی کو جو منافع نصیب ہوئے وہ آپ کے سامنے ہے۔

اسی طرح جونپور کم و بیش ایک صدی تک مختلف سلاطین کا دار السلطنت رہا، اگر شیر شاہ سوری نے اسے آباد کیا، اہل کمال کا مجمع اس کے گرد جمع ہو گیا تو ہمایوں کی واپسی سے اس پر منفی اثر پڑا، لوگوں نے جونپور کو خیر باد کہا، مونگیر کے جونپوری شیخان اسی زمانے کی دین ہیں، بہر حال ان سلاطین جونپور کے زمانے میں جونپور کے اطراف میں راجدھانی کے ناسازگار حالات پر لوگوں نے پناہ لی، اعظم گڈھ چونکہ جونپور ہی کا ایک پرگنہ تھا اور زیادہ دور بھی نہیں تھا، اس لئے اہل کمال خود اور ان کے خاندان نے اعظم گڈھ کو اپنا مسکن و مستقر بنایا، چریا کوٹ کا ذکر آپ کو آئین اکبری میں نظر آئیگا، وہاں مولانا فاروق چریا کوٹی، غلام مخدوم چریا کوٹی جیسی شخصیات پیدا ہوئیں، سر شاہ سلیمان انگریزوں کے دور کے پہلے چیف جسٹس پھر دی فیڈرل کورٹ، جو بعد میں سپریم کورٹ کہلانے لگی کے پہلے چیف جسٹس بھی رہے، شبلی نعمانی جیسا ہمہ جہت باکمال اسی اعظم گڈھ نے پیدا کیا، عبد السلام ندوی جیسا برجستہ نگار جن کے مسودہ کی کبھی تبییض نہیں کرنی پڑی، حافظ حمید الدین فراہی جیسا عالم علوم قرآن جن کے حادثۂ مرگ کی اطلاع سید سلیمان ندوی نے عبد الماجد دریابادی کو ان لفظوں میں دی کہ: "آج آفتاب اسلام متھرا کے ظلمتکدہ میں ڈوب گیا" سہیل اعظمی جیساذکی وذہین بدیہہ گو شاعر جس نے کم سے کم ۲۵ ہزار اشعار اردو فارسی میں کہے ہوں گے، گو زمانہ نے صرف دو ہزار اشعار محفوظ رکھے، جنھوں نے اپنے ایک مصرع میں اعظم گڈھ کی علمی تاریخ مرتب کردی ہے، اسی اعظم گڈھ نے پیدا کیا ع

جو ذرہ یہاں سے اٹھتا ہے وہ نیر اعظم ہوتا ہے

اعظم گڈھ نے صرف علوم ظاہری کے ماہرین ہی پیدا نہیں کئے، بلکہ یہاں اہل اللہ اور خدا رسیدہ بزرگوں کا ایک بڑا طبقہ بھی پیدا ہوا، مولانا شاہ عبد الغنی، مولانا شاہ وصی اللہ ان کے سرخیل ہیں، جن کے بارے میں علامہ ابراہیم بلیاوی صدر المدرسین نے فرمایا کہ یہ دونوں بزرگ اس دور کے حاجی امداد اللہ ہیں، اور مؤخر الذکر سے خود علامہ نے باوجود شاگرد ہونے کے بیعت کی اور خلعت خلافت سے نوازے گئے، مولانا عبد الرحمن

مبارکپوری، حافظ عبداللہ غازیپوری، مصطفیٰ اعظمی جیسے محدثین بھی یہیں پیدا ہوئے۔

وہ آفتاب علم و آگہی بھی اسی زمین سے طلوع ہوا (جس کو دنیا محدث کبیر علامہ حبیب الرحمٰن الاعظمی کے نام سے جانتی ہے) جس کی تیز کرنوں سے علم حدیث کے مخفی گوشے منور ہو گئے، جس سے رجال حدیث کی دو صدی کی تاریخ آئینہ بن کر سامنے آ گئی، نام، زمانہ، ولدیت، لقاء، معاصرت، وطنیت، احتیاط و تورع پر سیر حاصل بحث کر کے رجال کا مقام ان کی حیثیت واضح فرمادی، اس سلسلے میں مولانا کا سب سے بڑا کارنامہ "الحاوی لرجال الطحاوی" ہے جو زیور طبع سے آراستہ ہو کر اہل علم کے سامنے آ رہی ہے، اس کے مطالعہ سے مولانا کی عبقریت، زیرکی، دانائی، باریک بینی اہل علم کے سامنے مجسم ہو کر آ جائے گی۔

اس وقت مولانا کی سوانح حیات کے پروف کا کچھ حصہ میرے سامنے ہے، اس کے مطالعہ سے جو باتیں میرے سامنے آئیں، اسے بے دریغ لکھ رہا ہوں۔

(۱) اگر مولانا علم حدیث کے امیر المؤمنین نہ ہوں ممکن ہے، مگر آپ رجال حدیث کے امیر المؤمنین بلا شک وشبہ ہیں، اس درجہ کا عالم رجال اخلاف میں کہیں نظر نہیں آتا، اسلاف میں بھی معدودے چند ہیں۔

مولانا اعظمی مخطوطات حدیث نبوی کے سب سے بڑے عالم تھے، آپ اس سلسلہ میں اس بات کی سعی فرماتے کہ قدیم سے قدیم تر مخطوطہ سامنے آ جائے، اس لئے کہ دور نبوت سے قرب کی وجہ سے ان میں صیانت ودیانت کا عنصر غالب رہتا ہے، بہ نسبت بعد کے مخطوطات کے کہ اس میں متاخرین نے متقدمین کی طرح احتیاط نہیں برتی، چنانچہ ان کی بالغ نگاہی کا ثبوت جامع عبدالرزاق کے مخطوطہ کے سلسلہ میں ڈاکٹر حمید اللہ جیسے کثیر المطالعہ مخطوطات پر نظر رکھنے والے عالم اور حضرت مولانا کے درمیان جو استدراکی مکاتبت ہوئی اور اس کے جامع معمر بن راشد ہونے کی تردید مولانا نے فرمائی، اس سلسلہ میں طویل مکاتبت کے بعد ڈاکٹر صاحب نے مولانا کی تحقیق کو تسلیم کر لیا

یہی نہیں۔ بلکہ ان کو شاہ ولی اللہ ثانی کے لقب سے یاد فرمایا۔

(۲) مولانا کی حدیثی خدمات جو سامنے آئی ہیں وہ ایسی ہیں کہ ان پر صدیوں تک لوگ ریسرچ کر کے ڈاکٹریٹ حاصل کرتے رہیں گے۔

(۳) آپ نے حدیثی خدمات کے علاوہ فرق باطلہ کے سلسلہ میں جو سرمایہ چھوڑا ہے اس کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کا ذہن کس قدر ثاقب اور طبیعت کس قدر حاضر تھی، چنانچہ نصرۃ الحدیث جو اہل قرآن کے رد میں آپ نے لکھی اس پر مقدمہ لکھنے کی پیش کش مولانا مناظر احسن گیلانی نے فرمائی، اور حضرت تھانوی نے لکھا کہ اگر میں کوشش کرتا تو ایسی پر تحقیق کتاب نہ لکھ پاتا۔

(۴) آپ نے شیعیت جو یہودیت کی ردیف ہے، اور اموی و عباسی دور کے خلفاء کے آل رسول پر مظالم اور اس طبقہ کی نام نہاد حب آل رسول کے نتیجہ میں فروغ ہوا، بعد کو سلاطین نے بھی سرپرستی کی اور ہندوستان میں تو تیمور کے بعد اکثر سلاطین نے اس کی ہمنوائی کی، پھر نوابین اودھ کا دوران کے لئے فصل بہار ثابت ہوا، رد شیعیت میں مولانا عبدالشکور نے وہ کام کیا کہ سابقین میں سے بھی کسی نے نہیں کیا، مولانا اعظمی جو خود کو نمایاں نہ کرنے کا مزاج رکھتے تھے، اس تحریک رد شیعیت میں برابر کے شریک رہے، آپ کے تین رسالے بھی اس سلسلہ میں مطبوع ہیں، مگر حقیقت یہ ہے کہ دارالمبلغین کے قیام کے زمانے میں آپ کی وجہ سے اس تحریک میں جان آگئی۔

داستاں ان کے اداؤں کی ہے رنگیں لیکن
اس میں کچھ خون تمنا بھی ہے شامل میرا

(۵) غیر مقلدیت جو اعتزال کی ایک شاخ ہے، آپ نے اس کے رد میں بھی وہ نمایاں خدمات انجام دیں کہ ان کے علماء و اساطین قبروں میں بھی بے چین نظر آتے ہیں، مولانا کی وہ تقریر جو آپ نے علامہ ثناء اللہ امرتسری کی موجودگی میں ضلع گونڈہ میں رد قراءت خلف الامام پر کی تھی، اگر ٹیپ ریکارڈ میں ٹیپ ہوتی تو آج قراءۃ خلف الامام پر

اس سے بہتر کوئی رسالہ نہ پہلوں کا ہوتا نہ پچھلوں کا، مولانا امرتسری کے تقلید کی تعریف پر جو سوالیہ اخبار میں نکلا، جس کا مسکت جواب مولانا نے دے کر مولانا امرتسری کو ان کے علمی مقام کی سیر کرادی، مولانا نے "الاعلام المرفوعہ فی حکم الطلقات المجموعۃ" میں طلاق کے بارے میں جو تحریر فرمایا اس کے جواب کیلئے بناسپتی محدثین کی ایک ٹولی مبارکپور میں جمع ہوئی اور ان کی کاوش سے الآثار المتبوعۃ سامنے آئی، جس کا جواب مولانا نے الازھار المربوعۃ میں دیا، اس پر تبصرہ کرتے ہوئے سید سلیمان ندوی نے معارف مئی ۱۹۳ء میں جو لکھا ہے، وہ پڑھنے کے لائق ہے، اس مسئلہ پر عامر عثمانی نے مولانا کی تائید ہی نہیں کی بلکہ تجلی کا مستقل نمبر نکال کر اس بحث کیلئے گفتگو کا دروازہ بند کر دیا، اگرچہ غیر مقلدین تنویر الآفاق کے نام پر تسوید الآفاق کرتے رہ گئے۔

مولانا نے رکعات تراویح کا تعین اور حنفیہ کا عمل بیس رکعات کا ثبوت جناب نبی کریم ﷺ سے اور حضرت فاروق اعظم کے زمانے سے آج تک بیس پر اجماع امت کا ثبوت تحریر فرمایا، اس کا جواب انوار المصابیح کے نام سے شائع ہوا، پھر مولانا کے شاگرد مولانا عبدالباری کے قلم سے مذیل رکعات تراویح کے نام سے شائع ہوا جس نے غیر مقلدین کو خاموش کر دیا (۱)

البانی جو عربی دنیا میں اپنی حدیث دانی کی دھاک بٹھائے ہوئے تھے، ہندوستان کے غیر مقلدین بھی اس پر ناز کرتے تھے، حضرت مولانا نے چار جز میں الالبانی شذوذہ وأخطاءہ کے نام سے ایسا تعاقب کیا کہ حدیث کے اس بحر بیکراں کو ذرا سی آب جو ثابت کر دیا، جس میں چند چلو پانی ہو، عربی دنیا میں سب سے زیادہ اشاعت پذیر یہ کتاب ہوئی اور پھر دوسرے علماء عرب کا بھی ہیاؤ کھل گیا، انہوں نے بھی البانی کی تردید و تعاقب کیا۔

---

(۱) یہاں یہ واضح کر دینا مناسب ہوگا کہ رکعات تراویح مذیل بھی علامہ اعظمی ہی کی تصنیف ہے، جو مولانا عبدالباری صاحب کے نام سے شائع ہوئی تھی (مسعود الاعظمی)

ہر مدعی کے واسطے علم سخن کہاں
یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا

التنقید السدید علی التفسیر الجدید کے نام سے خواجہ عبدالحیٔ پروفیسر جامعہ ملیہ کا رد کیا، جس پر مولانا تھانوی نے مبارکباد دی اور دعائے برکت سے نوازا۔

رضاخانیت جو حقیقت میں سلاطین وامراء کی پیداوار ہے، انھوں نے اپنے سجدۂ تعظیمی، آداب وکورنش کے جواز کے لئے علماء سوء کی ایک ٹولی کو قبروں پر کھڑا کردیا، اور اس طرح کے لوگوں نے اس جماعت کی سرپرستی کی، ان میں کوئی بالغ نگاہ عالم پیدا نہیں ہوا، ابوالفضل فیضی کی طرح دنیادار علماء ہمیشہ اس جماعت سے وابستہ رہے، لے دیکے ان میں مولانا احمد رضا خانصاحب کی ایک شخصیت نظر آتی ہے، جو پہلے اعلیٰ حضرت تھے، اب امام احمد رضا ہوگئے ہیں، انھوں نے اپنے طریقہ کی تائید میں بہت کچھ لکھا، مگر مولانا عبدالحیٔ حسنی نے ان کی خوبیاں گنانے کے بعد کثیرا لشتم علی معاصریہ وشدید التکفیر لکھ کر ان کی پوری تاریخ لیاقت، علم وہنر سامنے کردیا، اس لئے مولانا نے ان کے خلاف بہت کم لکھا کہ یہ لوگ مخاطبت کے لائق ہی نہیں تھے، پھر بھی مولانا نے دو رسالے شارع حقیقی اور احکام النذر لاولیاء اللہ تصنیف فرمائے، خود احقر نے اپنی کمسنی کے زمانے میں ادری کے مناظرہ میں علماء رضاخانی مولانا حشمت علی وغیرہ کو دیکھا کہ دونوں ہاتھ میں تسبیح اور منہ میں بدگوئی وسب وشتم کے سوا کچھ نہ تھا۔

(۶) مولانا کا ادب بھی غیر معمولی تھا، اس سلسلہ میں عربی مراثی اور دوسرے کلام سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ صرف نثر ہی نہیں نظم پر بھی یکساں قادر ہیں۔

(۷) مولانا عربی اردو فارسی زبان پر یکساں کمان رکھتے تھے۔

(۸) مولانا کا حافظہ سابقین اولین کی طرح تھا، اس کا ثبوت ان کتابوں کے علاوہ اس بیت بازی سے، جو مولانا عبدالرحیم فاروقی اور مولانا کے مابین جب کبھی وہ مئو آتے، کئی کئی رات صبح تک جاری رہتی، ہوتا ہے۔

(۹) مولانا ذکاوت کے اعتبار سے بھی عبقری تھے، ان کی ذکاوت، اصابت رائے کا اندازہ ان کی تصانیف سے کیا جاسکتا ہے۔

(۱۰) مولانا نے مفتاح العلوم مئو میں صدر مدرسی کیلئے مولانا ابوالحسن عراقی، جو مولانا کے استاذ بھی ہیں، کی پیشکش کو قبول کیا، پھر اسی مدرسہ کے ہو کر رہ گئے، تا آنکہ سیاست حاضرہ کے بعض افراد کی ناشائستگی، جو علمی ماحول و مزاج کے بالکل خلاف ہے، سامنے آنے سے مولانا کی بددلی کا سبب بنی۔ اور مولانا نے اپنے ہی ہاتھوں سے سینچے ہوئے اس باغ کو ہمیشہ کیلئے خیرباد کہدیا، اناللہ وانا الیہ راجعون

(۱۱) مرقاۃ العلوم کا قیام آپ کی حیات میں ہو گیا، اس کی عمارت کا بیشتر حصہ آپ کے دور حیات میں تعمیر ہو گیا، آپ کے صاحبزادے مولانا رشید احمد اعظمی اسے پروان چڑھا رہے ہیں۔

مولانا کو دنیاوی وجاہت و مناصب میں سے بھی بے منت غیرے بہت سے مناصب و مراتب نصیب ہوئے، آپ نے دارالعلوم دیوبند کے صدر الافتاء و صدر مدرسی کو قبول نہیں کیا، دارالعلوم ندوۃ العلماء کے شیخ الحدیث رہے، اس کی عاملہ کے ممبر اور دارالعلوم کے شوریٰ کے ممبر رہے، یوپی اسمبلی کے ممبر رہے، اسی زمانہ میں سمپورنانند جو وزیراعلیٰ اور پارٹی کے لیڈر تھے مولانا کو کسی بزرگ کے مکتوب پر کسی کام کے انجام نہ دینے کو لکھا، جب سمپورنانند نے اس کا ذکر کیا تو مولانا نے ان سے بے نیازانہ بیباکانہ فرمایا کہ میں نے آپ سے ٹکٹ طلب کیا تھا؟ کوئی وعدہ کیا تھا؟ آپ کی کانگریس کو دو سیٹیں جیتنی تھیں اور وہ کام میرے بغیر نہ ہوتا، اس لئے آپ نے ٹکٹ دیا تھا، وہ کام ہو گیا، میں نہیں سمجھ سکتا کہ آپ کو مجھ سے اس سوال کی کیسے ہمت ہوئی، اس پر وزیراعلیٰ خاموش ہو گئے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا میں دنیاوی اعزاز واحترام سے بے رغبتی غیر معمولی طور سے تھی، مزید روشنی کیلئے منتخب ہونے کے بعد جو مکتوب مفتی ظفیر الدین کے نام لکھا ہے، معلوم ہوگا، ان سب کے باوجود دوبارہ آپ ہی کو کانگریس نے نامزد کیا، آپ کے انکار پر

مولانا(عبداللطیف) نعمانی کے حصہ میں یہ اعزاز آیا۔

(۱۳) صدر جمہوریہ نے آپ کو عربیت کی سند افتخار پیش کی۔

(۱۴) آپ کو امیر الہند کا خطاب دیا گیا، یہ وہ خطاب ہے جو مولانا آزاد کو بھی علماء ہند لاہور میں پیش نہ کر سکے تھے۔

(۱۵) مولانا مختلف یونیورسٹیوں کے ممتحن رہا کئے، اور بعض کے ایکزیکیٹو کے ممبر بھی رہے۔

(۱۶) سید سلیمان ندوی آپ سے حدیث اور فقہ کے مسائل میں بلا تکلف رجوع کرتے اور آپ کی اصابت رائے پر عمل کرتے، سید صاحب نے میرے سامنے والد صاحبؒ سے یہ بات کہی کہ فقہی مسائل میں ان کی نظر دقیق ہے، اس لئے ان سے رجوع کرتا ہوں۔

میرے والد گرامی باوجود معاصر ہونے کے مجھ سے فرمایا کرتے تھے کہ مولانا حبیب الرحمٰن کی نظر حدیث پر شاہ انور کشمیری کی طرح ہے۔

مسند احمد جس کی تحقیق علامہ احمد محمد شاکر نے کی اس پر ان کے ملاحظات دیکھنے کے بعد مولانا کو جو مکتوب انھوں نے بھیجا اس سے اندازہ کیجئے کہ مولانا کا علمی مقام اور احترام ان کے دل میں کس قدر تھا، ان کے خط کے ایک حصہ کا ترجمہ حسب ذیل ہے۔

آپ کا عمدہ گرامہ نامہ ملا، آپ کی ہر گرفت قابل قدر لائق تسلیم ہے، میں یہ آپ کی دلجوئی اور مدارات کے طور پر نہیں کہہ رہا ہوں، بلکہ اعتراف حقیقت کے طور پر کہہ رہا ہوں، اس گراں بہا عنایت پر دل کی گہرائیوں سے مشکور ہوں، امید کہ آپ سنت مطہرہ نبوی کی خدمت کے جذبے میں اپنی رہنمائی اور ملاحظات سے مزید نوازیں گے، آپ کے ان ملاحظات کو دیکھ کر میں نے یہ جان لیا کہ آپ اس دور کے عظیم ترین علماء حدیث میں سے ایک ہیں۔

مولانا کو جو قبول عام حاصل ہوا، مئو کی پوری تاریخ میں کسی کو نہیں ملا، نہ کسی عالم کو نہ صوفی کو نہ شاعر کو، لوگ مولانا پر پروانہ وار گرتے تھے، آپ کے چند کلمات سننے

کو اپنی سعادت جانتے، ان کے ہاں نشست برکت مانتے، چنانچہ ان کی موت کے بعد رمضان کے مہینہ میں مارچ کی کھلی دھوپ میں تقریباً دو لاکھ عوام شریک نماز جنازہ ہوئے، عمل تدفین افطارِ صوم کے بعد تک جاری رہا، رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ و مغفرۃ تامۃ

سوانح نگار عزیز گرامی ڈاکٹر مسعود احمد مولانا کے نبیرہ ہیں، ابھی کم عمر ہیں، اور یہ عمر کمتر بعلم برتر کی بہترین مثال ہیں، ماشاء اللہ انھوں نے سوانح کے تمام ہی گوشے کو بہت سلیقے سے جمع کیا، پھر شگفتہ اردو میں منتقل کیا، عربی زبان پر تو وہ قادر تھے ہی، انگریزی عبارتوں کے ترجمہ سے جو نہایت درجہ شگفتہ و شائستہ ہیں، ان کی قدر و منزلت میرے دل میں اور بڑھ گئی ہے، مولانا کی "نصرۃ الحدیث" کا عربی ترجمہ جو زیر طباعت ہے، پھر المآثر کا استدراک والا حصہ ان کے ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات کی شہادت ہیں۔ دعا ہے اللہ کرے زور قلم اور زیادہ، اگر قلم کے بجائے رقم کر دیا جائے تو ذو معنی ہو جائے گا۔

میں یہ مضمون اپنے ایک شعر پر ختم کرتا ہوں ؎

باد بہار گلشن علمت چناں وزید
کز وے ہزار باغ بہ ہندوستاں دمید

مکتوب

حضرت مولانا سعید الرحمٰن صاحب الاعظمی الندوی مدظلہ العالی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۲۹ جمادی الاولی ۱۴۲۰ھ

محب عزیز ڈاکٹر مسعود احمد اعظمی علیگ زاد مجد کم السامی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ   مزاج شریف،

عنایت نامہ مورخہ ۲۰/ اگست کافی تاخیر سے موصول ہوا، "حیات ابوالمآثر" کا کام آپ نے جس خوش اسلوبی اور سلیقے سے انجام دیا ہے وہ ہم وابستگان دامن ابوالمآثر کے لئے باعث فخر وسعادت ہے، فہرست پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ نے اس عظیم انسان کے خط وخال کو کس دقت نظر اور مہارت سے مرتب کیا ہے، اور ایک بے مثال شخصیت کا کتنی خوبی سے تعارف کرایا ہے، اس زندگی میں نہ صرف عام لوگوں یا طلبائے علوم اسلامیہ کیلئے بہت سے دروس وعبر ہیں، بلکہ اہل علم ونظر کیلئے خاص طور سے اس میں بڑا ذخیرہ موجود ہے، اور تاریخ کے علمائے متقدمین اور محدثین عظام کے نمونے اور مثالی تذکرے اس زندگی کی زینت ہیں۔

حضرت مرحوم نوراللہ مرقدہ، دراصل اسلام کے اس زریں دور اور اس عظیم صدی کی نمائندگی کررہے تھے جو تدوین حدیث اور رجال ورواۃ سنت کے ابھرنے اور تاریخ کی زینت بننے کا دور ہے، وہ اپنے زمانے کے خلاف دور اول کے محدثین وعلمائے اصول کا زندہ نمونہ تھے، ان کا تبحر علمی اور تعمق وبصیرت ہندوستان کی علمی تاریخ میں ایک زبردست اضافہ خیال کیا جاتا ہے۔

ان شاء اللہ تعالیٰ اس کتاب کے محتویات اور ان کی تاریخی حیثیت ہندوستان کے

اسلامی کتب خانہ میں اور فن تراجم میں ایک خاص اہمیت کا مقام رکھتے ہیں، اللہ تعالیٰ آپ کی مخلصانہ جدوجہد کو قبول فرمائیں اور کتاب شائع ہو کر تمام علمی حلقوں میں قبول عام حاصل کرے، آمین

نیک تمناؤں اور مخلصانہ دعاؤں کے ساتھ آپ کو دلی مبارکباد دیتا ہوں۔

ماموں جان مدظلہ اور اپنے والد صاحب مدظلہ اور سبھی حضرات کی خدمت میں سلام مسنون پیش کردیں، ممنون ہوں گا۔

بقیہ الحمدللہ سب خیریت ہے،

والسلام
مخلص
سعیدالرحمٰن الاعظمی
مدیر البعث الاسلامی
۱۱ر ستمبر ۹۹ء
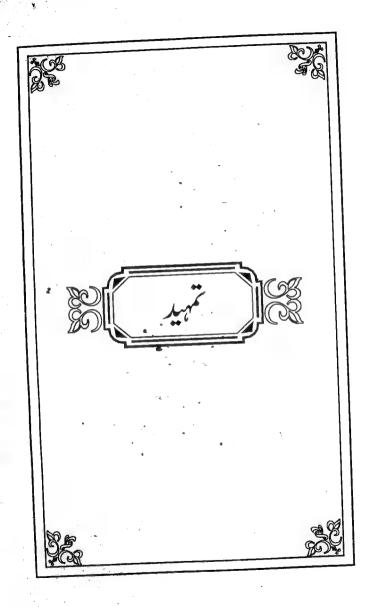
☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆
☆☆☆☆☆☆☆☆

تمہید

تمہید

از

صاحب زادۂ محترم مولانا رشید احمد الاعظمی مدظلہ

والد محترم امام العصر محدث جلیل، ابوالمآثر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی نور اللہ مرقدہ کی وفات کو تقریباً آٹھ سال کا عرصہ گذر رہا ہے، ان نابغۂ روزگار اور عبقری ہستیوں میں تھے، جو علم و عمل اور سلوک و عرفان کی پیکر جمیل ہوا کرتی تھیں، ایسی ہستیاں مدتوں میں کبھی عرصۂ عالم میں جلوہ گر ہوا کرتی ہیں، حضرت کی حیات میں بھی لوگوں کو، بالخصوص ممتاز اہل علم حضرات کو اس کا احساس تھا کہ یہ گدڑی میں خود کو چھپائے ہوئے ایک لعل بے بہا ہے، اجمالاً اتنا سب کو معلوم تھا کہ حضرت اقدس علیہ الرحمہ ''بڑے مولانا'' ہیں، صرف مئو اور اعظم گڈھ کے پیمانے پر نہیں، بلکہ ہندوستان گیر پیمانے پر، بلکہ اور زیادہ واقفیت رکھنے والے دنیا کے پیمانے پر آپ کو ''بڑے مولانا'' مانتے تھے، لیکن یہ واقفیت زیادہ تر اجمالاً تھی، اس ''بڑے مولانا'' کے تحت کیا کیا تفصیلات پنہاں تھیں، اسے قریب والوں نے تو کچھ ضرور جانا، اور انھوں نے قدر کی، لیکن واقعہ یہ ہے کہ جاننے والوں کی تعداد، نہ جاننے والوں کے مقابلے میں کم، بہت کم تھی۔

جب تک کوئی بڑی ہستی موجود ہوتی ہے، اس سے لوگ اپنے مسائل و معاملات میں فائدہ تو اٹھاتے ہیں، لیکن اس کے رتبہ کی بلندی اور اس کی شان کی اہمیت سے غافل

رہتے ہیں، اپنے قریب پاتے ہیں، اپنے درمیان دیکھتے ہیں۔ بشریت کے تمام تقاضوں اور لوازم کے ساتھ دیکھتے ہیں تو یہ خیال اکثر دھندلا دھندلا سا رہتا ہے کہ ہمارے بیچ رہنے والی یہ شخصیت ہم سے کتنا فاصلہ رکھتی ہے۔

کسی چھوٹے بڑے صاحب علم و تحقیق کو کوئی علمی ضرورت پیش آتی، تو بے تکلف اس کا ذہن مئو کے اسی بوریہ نشین پر پہونچتا تھا اور وہاں اس مسئلہ کی گتھی سلجھ ہی جاتی تھی، اور اس طرح سلجھ جاتی تھی، جیسے اس میں کوئی الجھاؤ تھا ہی نہیں۔

لیکن یہی شخصیت جب اپنا وقت پورا کر کے اٹھ گئی، تو اصحاب علم کو یتیمی کا احساس ہونے لگا سوالات اب بھی پیدا ہوتے ہیں، مگر جواب دینے والی زبان خاموش ہو گئی، گتھیاں اب بھی الجھتی ہیں، مگر سلجھانے والی انگلیاں ساکن ہو گئیں، اشکالات اب بھی ہوتے ہیں، لیکن انھیں حل کرنے والا دماغ ہم سے دور ہو چکا، کتاب اور مقالے اب بھی نظر ثانی کے محتاج ہوتے ہیں، مگر ان کی اصلاح کرنے والا قلم رک گیا۔ اب شدت سے احساس ہونے لگا کہ مولانا کیا چیز تھے؟ اب مولانا کو نہیں دیکھ سکتے، ان سے ملاقات نہیں کر سکتے، ان کے پاس خط نہیں لکھ سکتے، تو جنھوں نے انھیں نہیں دیکھا ہے اور جن لوگوں کو ان کی دید و زیارت سے محرومی رہی ہے، سب کو جستجو ہوئی کہ اس صاحب عظمت کی عظمت تفصیل سے جانی جائے۔ عرصہ تک علم و فضل کے قلمرو میں ان کی تحقیق و رہنمائی کا سکہ رواں رہا ہے، اب ان کی پوری زندگی اپنے تمام علمی کمالات کے ساتھ ماضی بن چکی ہے، اور ماضی ایک ایسا پردہ ہے جو وقت گذرنے کے ساتھ دبیز اور تہدار ہوتا جائے گا۔ دیکھنے والوں کا حافظہ بھی بہت کچھ ضائع کر دے گا، اور جنھوں نے نہیں دیکھا ہے وہ دیکھنے والوں سے کتنا سن پائیں گے؟

پس ضرورت تھی ابھی جب کہ ماضی کا پردہ دبیز نہیں ہوا ہے، اسے چاک کر کے اس صاحب عظمت اور باکمال شخصیت کو علم و معرفت کی روشنی میں لایا جائے۔ اس سلسلہ میں پہل کرنے والے، ہم سب کے شکریے کے مستحق، مولانا اسیر ادروی ہیں۔ انھوں نے ترجمان الاسلام کا خصوصی نمبر حضرت مولانا پر شائع کیا، اس میں مختلف اصحاب تحقیق اور

ارباب قلم نے حضرت کی زندگی کے بہت سے گوشوں پر روشنی ڈالی۔ ان مضامین میں ایک اہم مضمون مسند احمد بن حنبل کی تحقیقات و تعلیقات پر حضرت کے استدراکات کے متعلق ہے، یہ تحقیقات مصر کے نامور محدث علامہ احمد محمد شاکر علیہ الرحمۃ کے محققانہ قلم سے شائع ہوئے تھے، انھوں نے دعوت دی تھی کہ اہل علم حضرات اس کا بغور مطالعہ کر کے اس کے بیش وکم کا جائزہ لیں، اور کسی نے تو نہیں، حضرت مولانا نے ان تحقیقات پر مفصل نقد لکھا تھا، اس نقد کو محدث مصر نے نہایت خوشی اور کشادہ دلی کے ساتھ قبول کر کے اپنے تعلیقات کے ساتھ شائع کیا تھا۔ انھیں استدراکات کی روشنی میں مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمی نے مذکورہ مضمون مرتب کیا تھا، اس مضمون سے جہاں حضرت محدث جلیل نور اللہ مرقدہ کی وسعت مطالعہ، قوت گرفت، ذہانت و فطانت اور ژرف نگاہی کا اندازہ ہوتا ہے، وہیں یہ بھی احساس ہوا کہ مولانا اعجاز احمد صاحب میں ماشاء اللہ تحریر و قلم کی صلاحیت اور زبان و بیان کا ملکہ ہے، اور اس کے ساتھ ساتھ حضرت اقدس کے علوم و معارف کے سمجھنے اور اسے سمجھانے کا عمدہ سلیقہ ہے، انھوں نے یہ مضمون مئو میں مدرسہ مرقاۃ العلوم میں رہ کر مرتب کیا تھا۔ کئی دن کی باہمی ملاقات اور ہم نشینی اور مشوروں کے نتیجے میں مجلہ "المآثر" کا اجراء طے پا گیا اور پھر اس میں حضرت اقدس کے تحقیقات و تعلیقات اور نقد و استدراک کا تعارف مسلسل مولانا کے قلم سے نکلتا رہا، اس کے بعد عزیزم مولوی مسعود احمد سلمہ نے "استدراکات محدث کبیر" کے عنوان سے لکھنا شروع کیا، اور یہ سلسلہ تاہنوز جاری ہے، اور اب وہ عنوان المآثر کا ایک مستقل کالم کی حیثیت اختیار کر گیا ہے، ان مضامین کو پڑھ کر عام طور سے اہل علم کا یہ تاثر سننے میں آیا کہ حضرت اقدس نور اللہ مرقدہ کو، ان کے علم کی وسعت و گیرائی کو، اور ان کے کمال کی بلندیوں کو جیسے ہم نے جانا ہی نہ تھا، ان مضامین سے ان کے جمال و کمال کا علم ہو رہا ہے۔

مجلہ تسلسل کے ساتھ نکلتا رہا۔۔۔ اور الحمد للہ اب بھی نکل رہا ہے۔۔۔ لیکن اسی کے ساتھ یہ احساس بھی بڑھتا رہا کہ حضرت اقدس کی مستقل سوانح عمری لکھی جانی چاہئے۔ جس سے بیک وقت اور ایک تسلسل کے ساتھ حضرت کی زندگی اور کارنامے، نیز آپ کے

فضل و کمال اور خصائص و امتیازات پڑھنے والوں کے سامنے آجائیں۔

لیکن یہ کام کچھ ایسا نہ تھا کہ سرسری طور پر انجام دے لیا جائے، حضرت ایک زبردست محدث تھے، محقق تھے، فقیہ تھے اور بھی بہت کچھ تھے، ان سب امتیازات و خصوصیات اور زندگی کے احوال کو سمیٹ کر اکٹھا کرنا، ایک دشوار گذار امر تھا، اس کے لئے ایک ایسے شخص کی ضرورت تھی جو حضرت کی زندگی --- جو ماشاء اللہ تقریباً ایک صدی کو محیط تھی --- کے احوال کو جانتا ہو، یا جاننے کی استعداد رکھتا ہو، مطالعہ و مشاہدہ کی قوت بھی رکھتا ہو، علوم حدیث و فقہ سے اسے مناسبت بھی ہو، پھر زبان و بیان کی قدرت بھی رکھتا ہو، اور وہ اس کام کے لئے یکسو بھی ہو، کیونکہ حضرت کے وہ احوال و سوانح جن کا تحریر میں لانا ضروری ہے، ان کا حصول زیادہ تر ان بوسیدہ اوراق، پرانے خطوط، منتشر تحریروں اور چھوٹی بڑی ان پرچیوں سے ہو سکتا ہے، جن پر حضرت نے کچھ یادداشتیں، کچھ تاریخیں اور کچھ وقائع و حوادث لکھ رکھے ہیں، اور خوش قسمتی سے ان کا بڑا حصہ محفوظ ہے، لیکن بے ترتیب! ان سب کو جمع کرنے، انھیں الٹنے پلٹنے اور الٹ پلٹ کر پڑھنے میں جہاں بڑی دیدہ وری کی ضرورت ہے، وہیں طویل فرصت بھی درکار ہے۔

ماشاء اللہ مولانا اعجاز احمد صاحب میں یہ سب صلاحیتیں موجود ہیں، لیکن چونکہ وہ ایک مدرسہ میں مدرس ہیں، صرف مدرس ہی نہیں، ذمہ دار مدرس ہیں، علاوہ ازیں ان کے ساتھ اور بھی کئی مشاغل لگے ہوئے ہیں، جن میں وہ ہر وقت گھرے رہتے ہیں، اس کے باوجود انھیں کو مکلف کیا گیا کہ وہ یہ کام انجام دیں۔ چنانچہ انھوں نے اس کا آغاز بھی کر دیا، لیکن سوانح لکھنے کے لئے ضروری تھا کہ وہ یہاں حضرت کے کتب خانہ میں مقیم ہوتے اور تمام منتشر تحریروں اور حضرت کے مسودات وغیرہ کو جمع کرتے، انھیں پڑھتے، مگر بُعد مسافت اور ایک مدرسہ کی ذمہ داری کی وجہ سے وہ اس کا موقع نہیں نکال پاتے تھے، اس لئے کام کی رفتار سست بلکہ معدوم تھی، لیکن اللہ کو جس سے جو کام لینا ہوتا ہے اس کے اسباب پیدا ہو جاتے ہیں۔

حضرت کی حیات مبارکہ میں ان کی تمام کتابیں ایک بڑے ہال میں رکھی ہوئی

تھیں، لیکن کتابوں کی وہ کثرت تھی کہ ہال میں داخل ہوتے ہی باوجود وسعت کے اس کی تنگ دامانی کا احساس ہونے لگتا تھا، نیچے اوپر کتابوں کا انبار تھا، قدرے ترتیب ان کتابوں میں تھی تو ضرور، مگر ان سے استفادہ بہت مشکل تھا، احباب کے مشوروں سے طے کیا گیا کہ ایک بڑی لائبریری حضرت کے نام پر بنوائی جائے، چنانچہ اس کی تعمیر شروع کر دی گئی، جیسے ہی اس کی تکمیل ہوئی، اور منصوبہ بنا کہ حضرت کی کتابیں، ترتیب کے ساتھ اس میں منتقل کر دی جائیں، اسی وقت حضرت کے عزیز نواسے اور شاگرد مولوی مسعود احمد سلمہ جو مدرسہ مرقاۃ العلوم اور دار العلوم دیوبند سے فراغت کے بعد مسلم یونیورسٹی علی گڈھ میں پی ایچ ڈی کر رہے تھے وہاں سے فارغ ہو کر گھر آگئے ، کتابوں کی منتقلی اور ترتیب وتہذیب کے کام میں برخورداران عزیز مولوی ازہر اور مولوی انور سلمہما کے ساتھ مولوی مسعود احمد سلمہ بھی شریک ہوگئے ، اس دوران انھیں کاغذات اور مسودات اور حضرت کی منتشر تحریرات اور بہت سے خطوط پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ انھوں نے کتب خانہ کے کام کے ساتھ ساتھ حضرت کا تذکرہ عربی زبان میں لکھنا شروع کر دیا، یہ کام انھوں نے اس خاموشی سے کیا کہ شاید ہی چند لوگوں کو اس کا علم ہوا ہو، یہ تذکرہ مکمل کر کے انھوں نے بعض اصحاب نظر، جن کو عربی تحریر پر دسترس حاصل ہے، کے سامنے پیش کیا، جس نے پڑھا اس کی تحسین کی۔

پھر جس خاموشی سے انھوں نے عربی زبان میں تذکرہ لکھا، اسی خاموشی سے اردو میں سوانح کا کام شروع کر دیا، چونکہ حضرت کی تمام تحریریں، خطوط اور مختلف یادداشتیں نگاہ سے گذر چکی تھیں، ماشاء اللہ ذہن بہت اخاذ پایا ہے ، حضرت کی شاگردی کے ساتھ نسبی قرابت بھی ہے، اس لئے مناسبت پوری موجود ہے ، ذہانت وذکاوت سے بہرۂ وافر پایا ہے، اللہ کی طرف سے یہ سعادت ان کے لئے مقدر تھی، ضرورت کے تمام معلومات مہیا ہوتے گئے ، اور ان کا قلم رواں دواں رہا۔

کتاب مکمل ہونے کے بعد جب نظر کے سامنے آئی تو نہایت مسرت کے ساتھ حیرت بھی ہوئی کہ ایک نو آموز نے کس طرح پرزے پرزے سے معلومات جمع کئے ۔

پھر انھیں ترتیب دیا، اور مرصع کر کے پیش کیا، مولانا اعجاز احمد صاحب اور بعض دوسرے اہل علم نے دیکھا تو بیحد پسند کیا، اور عزیزم موصوف کی تحقیق و تفتیش اور ان کی جدوجہد وکاوش اور ان کی قلمی اور علمی صلاحیت کی داد دی۔

المآثر میں شائع شدہ ان کے استدراکات سے اہل علم کی نگاہ میں وہ پہلے ہی ایک مقام پیدا کر چکے تھے۔ اب اس سوانح حیات کی ترتیب و تبویب جب ان کے قلم سے ان اہل علم کے سامنے آئی تو مزید ان کی صلاحیت اور ان کے فضل کا انھیں معترف ہونا پڑا۔

ہمارے دیار بلکہ ملک کے مشہور اہل قلم اور بہت سی کتابوں کے مصنف مولانا نظام الدین صاحب اسیر ادروی نے عزیز موصوف سلمہ کی لکھی ہوئی اس سوانح کا مسودہ ملاحظہ فرمایا تو انھوں نے بھی اسے بیحد پسند کیا، چونکہ مولانا اسیر صاحب ایک منجھے ہوئے صاحب قلم اور حضرت محدث کبیرؒ کے شاگرد اور ان سے گہری عقیدت رکھتے ہیں، اس وجہ سے ان سے گذارش کی گئی کہ اس سوانح پر وہ اپنا مقدمہ تحریر فرمادیں، مولانا نے اسے بڑی خوشی سے قبول کیا اور انھوں نے اپنے مخصوص انداز میں اس پر مقدمہ لکھا۔

اس کتاب سے حضرت کے حالات ضروری تفصیلات کے ساتھ سامنے آگئے، اس طرح اس صدی کی ایک نہایت باوقار علمی شخصیت کی زندگی آئندہ نسلوں کے لئے محفوظ ہو گئی، جس سے رہ نوردان علم و فضل کو ہمیشہ روشنی ملتی رہے گی، اور بزرگان پیشین کی یاد تازہ ہوتی رہے گی، ان شاء اللہ۔

اللہ تعالیٰ خواہرزادۂ عزیز مولوی ڈاکٹر مسعود احمد سلمہ کو جزائے خیر عطا فرمائے، کہ اس طرح انھوں نے نانا کی شاگردی کا حق ادا کرنے کی سعی مشکور کی، اور اہل علم اور طلبہ کیلئے روشنی کا ایک خزانہ مہیا کر دیا، اللہ تعالیٰ اسے قبول فرمائیں، اور اسے نافع بنائیں۔

مولف سلمہ حضرت کے علمی کمالات اور آپ کی تصنیفات پر مستقل ایک کتاب مرتب کر رہے ہیں جسے سوانح کا دوسرا حصہ قرار دے لیجئے، یا مستقل علیحدہ کتاب تصور فرمایئے، ان شاء اللہ اس کے بعد جلد ہی بھی منظر عام پر آئے گی۔

پیش لفظ
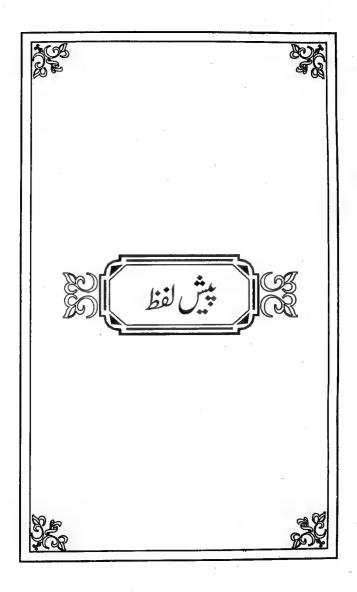
پیش لفظ

جناب مولانا نظام الدین اسیر ادروی صاحب مدظلہ

پہاڑیوں پر اگنے والے پودے اپنی کوتاہ قامتی کے باوجود دور سے نظر آتے ہیں، اونچے اور بلند معلوم ہوتے ہیں، اور پہاڑیوں کے دامن میں پنپنے والے درخت جب اپنی فطری نشو ونما اور اپنی مضبوط جڑوں کی طاقت سے تناور درخت بن جاتے ہیں اور ان کی گھنی شاخوں کا سایہ ان پہاڑیوں کے پودوں پر چھا جاتا ہے اور ان کی نشو ونما رک جاتی ہے تب کہیں جا کر پہاڑیوں پر رہنے والے لوگوں کی نگاہوں میں آتے ہیں، اور ان کی بلند قامتی کا اعتراف کیا جاتا ہے۔

کچھ ایسا ہی حال مرکزی مقامات جیسے دہلی وغیرہ اور اس کے مضافات اور قرب و جوار کے اضلاع میں اہل علم اور صاحب فضل و کمال کا ہوتا ہے، وہ بہت جلد ملک و قوم میں روشناس ہو جاتے ہیں، مرکزی تنظیموں سے وابستگی اور علمی مراکز سے روابط کیوجہ سے اخباروں اور رسالوں میں ان کا ذکر آنے لگتا ہے، وقت، حالات، ماحول اور عوامی سرگرمیوں کے بہاؤ میں ان کی عظمت و شہرت کا سفینہ اس ساحل سے اس ساحل تک پہونچ جاتا ہے۔

اس کے برخلاف مرکزی مقامات سے دور دراز کے علاقوں کی قد آور سے قد آور شخصیتوں کی عظمت و سربلندی کا اعتراف بہت بعد میں ہوتا ہے اور اس وقت ہوتا ہے جب وہ اپنے فضل و کمال اور علمی کارناموں کی وجہ سے اہل علم کے دل و دماغ پر مرعوب کن حد تک چھا جاتی ہیں، ان کی باتوں میں وزن، ان کی رایوں میں بے پناہ گہرائی، ان کی تحریروں میں ژرف بینی دقیقہ رسی اور نکتہ شناسی کا وہ جوہر ہوتا ہے جس کی آب و تاب، چمک دمک دوسروں کی نگاہوں کو خیرہ کرنے لگتی ہے، یعنی علمی کمال حاصل کرنے کے لئے جب وہ اپنی پوری زندگی تج دیتی ہیں تب کہیں جا کر لوگ ان کو پہچانتے ہیں اور سر عقیدت خم کرتے ہیں۔

ضلع اعظم گڈھ جو اتر پردیش کے ایک دم مشرقی کنارے پر واقع ہے، دہلی سے آٹھ سو کیلو میٹر دور ہے، اس مردم خیز دور افتادہ خطے میں جو ہمالیائی شخصیتیں پیدا ہوئیں وہ انھیں حالات سے گذری ہیں، ان پر اہل علم اور دانشوروں کی نگاہیں اس وقت پڑیں جب وہ اپنی بے پناہ قوت پرواز سے کام لیکر اتنی بلندیوں پر پہونچ گئیں کہ ان کی طرف نگاہیں اٹھانے والوں کے سروں سے دستار فضیلت گر گر گئی، انھوں نے بر صغیر ہی کے اہل علم سے نہیں خراج تحسین حاصل کیا بلکہ پورے عالم اسلام کی علمی دنیا کو متاثر کیا، عرب و عجم دونوں نے ان کے فضل و کمال کا صدق دلی سے اعتراف کیا اور ان کی عبقریت کو تسلیم کیا اور ان کے علمی کارناموں کو اپنے لئے دلیل راہ بنایا۔ انھیں ہمالیائی شخصیتوں کی پر شکوہ فہرست میں محدث جلیل ابوالمآثر حضرت علامہ مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی نور اللہ مرقدہ کا نام نامی و اسم گرامی جلی حروف میں لکھا ہوا ہے، جو ۱۶ر مارچ ۱۹۹۲ء کو سفر آخرت پر روانہ ہو گئے۔

علمی دنیا میں آپ کا نام انتہائی ادب و احترام سے لیا جاتا ہے، ان کے علمی و تحقیقی کارناموں نے پوری دنیاے اسلام کو متاثر کیا اور بر صغیر کی عظیم ترین شخصیتوں میں ان کو شمار کیا گیا، آپ کی ذات میں موجود خداداد اور وہبی صلاحیتوں کا کرشمہ تھا کہ ہمیشہ ایک طرح کی خلوت نشینی اور تنہائی کی زندگی گذاری لیکن ان کی علمی عظمت و شہرت ہر سمت از خود پھیلتی چلی گئی، علم حدیث، اسماء الرجال اور فقہ کی دقیق سے دقیق ترین بحثوں میں آپ کی رائے قول فیصل کا درجہ اختیار کر گئی۔

آپ کی دینی خدمات اور علمی سرگرمیوں کا آغاز تو اس وقت ہوا جب بیسویں صدی کا ربع اول ختم ہو رہا تھا، اس سے پہلے انیسویں صدی کے نصف آخر میں اسلام اور مسلمان دونوں کا وجود خطروں میں گھرا ہوا تھا، کیوں کہ ۱۸۵۷ء کی ہمہ گیر بغاوت کے بعد برطانوی استعمار کی انتقامی کارروائیوں نے مسلمانوں پر جو قیامت توڑی وہ انتہائی ہولناک تھی، اس تباہی و بربادی میں جہاں مسلمانوں کا ہزار سالہ اقتدار افسانۂ ماضی بن گیا وہیں اسلام پر کاری ضرب لگائی گئی، خانقاہیں ویران اور مدارس اسلامیہ کھنڈر بن گئے جس کی وجہ سے

سب سے اہم اور نازک مسئلہ ہندوستان میں اسلام کے تحفظ وبقا کا پیدا ہوگیا۔

حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی پر اللہ تعالیٰ ہزاروں رحمتیں نازل کرے کہ اسلام کے تحفظ وبقاء کے لئے انھوں نے انتہائی خطرناک حالات اور نازک ترین ماحول میں ایک گمنام بستی دیوبند میں دارالعلوم قائم کیا جو مایوسیوں کے گھنے اندھیرے میں ایک ننھا سا چراغ تھا جو بعد میں چل کر آفتاب وماہتاب بنا، دارالعلوم دیوبند کا قیام در حقیقت اس ملک میں اسلام کی حفاظت کے لئے تعمیر کئے جانے والے قلعوں کی پہلی بنیادی اینٹ تھا اور مذہبی حصار بندی کی مہم کا نقطۂ آغاز تھا، یہ اسلام کے تحفظ وبقا کے لئے چلائی جانے والی ایک خاموش تحریک تھی اور مسلمانان ہند کے لئے بانگ جرس، جس نے شکست خوردہ تھکے ہارے قافلے کو اذن سفر دیا اور سمت سفر متعین کردی، پھر پورے ملک میں بیداری کی ایک لہر اٹھی اور ہر طرف زندگی کے آثار نظر آنے لگے، جس طرح تالاب کے ساکن پانی میں ایک چھوٹا سا پتھر پھینک دیا جاتا ہے تو اس سے جو لہریں پیدا ہوتی ہیں وہ تالاب کی سطح پر کروٹیں لیتی ہوئی دوسرے کنارے تک پہونچ کر ہی رکتی ہیں، بالکل یہی حال دیوبند میں دارالعلوم کے قیام کا ہوا، وہاں سے تحفظ اسلام کے جذبے سے قیام مدارس کی شکل میں جو لہر اٹھی تو ضلع اعظم گڈھ تک اس کو پہونچنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ ۱۸۶۶ء میں دارالعلوم قائم ہوا، ابھی انیسویں صدی ختم بھی نہیں ہوئی کہ دارالعلوم دیوبند کے نہج پر ضلع اعظم گڈھ میں کئی چھوٹے بڑے مدارس قائم ہوگئے اور دینی تعلیم کے زمزمے گونجنے لگے۔

محدث کبیر مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی قدس سرہ کے والد محترم مولانا محمد صابر صاحبؒ نے اسی دور میں علم حاصل کیا اور مختلف اساتذہ سے حدیث کی کتابیں پڑھ کر سند فراغت حاصل کی، مئو شہر کی یہ خوش قسمتی تھی کہ اس چونتیس سالہ تاریک ترین دور میں اس کو دو روشن چراغ مل گئے، ایک مولانا امام الدین پنجابیؒ جو مولانا احمد علی محدث سہارنپوری کے شاگرد اور مولانا شاہ فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی کے خلیفہ اور ان کے اصلاحی مشن کے نمائندہ تھے، مئو میں مستقل قیام کیا جب کہ ان کا وطن ثانی موضع ادری تھا ان کی

آل اولاد یہیں قیام پذیر رہی، لیکن وہ زندگی کے آخری لمحہ تک مئو میں اصلاح وتزکیۂ نفس کے فرائض انجام دیتے رہے اور تعلیم وتدریس کا بھی ہمیشہ مشغلہ رکھا، مئو کی کئی مشہور علمی شخصیتوں کو ان سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ دوسری شخصیت مولانا عبدالغفار صاحبؒ کی تھی جو دارالعلوم دیوبند کے سرپرست مشہور محدث اور شیخ طریقت حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے شاگرد رشید تھے، انھیں سے علم حدیث حاصل کیا تھا، انھوں نے مئو اور دوسرے مختلف مقامات پر مسند تدریس بچھائی اور علوم اسلامی کی تعلیم و تدریس میں پوری زندگی گذاری ان کے مشہور و ممتاز تلامذہ میں سب سے ممتاز اور عالمی شہرت کے مالک محدث جلیل حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی قدس سرہ ہوئے۔

محدث اعظمی قدس سرہ بیسویں صدی کے آغاز میں پیدا ہوئے، مختلف مقامات میں جاکر تعلیم حاصل کی، دورۂ حدیث دارالعلوم دیوبند اور دارالعلوم مئو میں رہ کر مکمل کیا اور فوراً ہی درس و تدریس شروع کر دی، فطری اور خداداد صلاحیتوں کا یہ کرشمہ تھا کہ آپ کے علم و فضل اور کمال فن نے بالکل ابتدائی دور ہی میں پورے ضلع کو متاثر کیا اور اس کا ظہور اس شان سے ہوا کہ عوام و خواص ہی نہیں مشاہیر اہل علم کے دل و دماغ پر چھا گئے، اسی علمی کمال کا فیض تھا کہ احیاء اسلام کی جو تحریک دارالعلوم دیوبند نے چلائی تھی اس میں اہم رول ادا کیا اور اسلام کی صحیح تعلیمات و روایات کی روشنی میں اصلاح و تبلیغ کے مشن میں کامیاب ہوئے۔

جب آپ تعلیم سے فارغ ہوئے تو ضلع اعظم گڈھ مذہبی گروہ بندیوں کی تیز آندھی کے جھونکے میں آچکا تھا اور صحیح اسلامی تعلیمات کی راہ میں تین سمتوں سے تاریکی کے مہیب سائے لہرانے لگے تھے، اس کی مختصر تاریخ یہ ہے کہ بہار کے ایک طالب علم مولانا شاہ نذیر حسین صاحب شاہ اسحاق محدث دہلوی کے حلقۂ درس سے فیضیاب ہو کر نکلے تو انھوں نے دہلی کی ایک مسجد میں قیام کر کے چند ہی برسوں میں ایک نئے فرقہ کی بنیاد ڈال دی ان کا حلقۂ درس قائم تھا انھوں نے اپنے شاگردوں کو اپنے نئے مسلک کی ترویج اور

نشرواشاعت میں جوش وجذبہ سے بھر دیا، ضلع اعظم گڈھ میں ان کے دو شاگرد انتہائی پر جوش تھے اور اپنے استاد کے مسلک کو پھیلانے میں اپنی ہر امکانی جدوجہد صرف کر دی، ایک حافظ عبداللہ مئوی ثم غازیپوری جنھوں نے اپنی سرگرمیوں کا مرکز مئو شہر کو بنایا دوسرے مولانا سلامت اللہ جیراجپوری تھے جو مولانا اسلم جیراج پوری استاد جامعہ ملیہ دہلی کے والد تھے۔

میاں شاہ نذیر صاحب کے یہ دونوں شاگرد اپنے عقیدہ و مسلک میں نہایت متشدد اور اس کے پر جوش مبلغ تھے، مولانا سلامت اللہ جیراجپوری کے جارحانہ انداز بیان کی تردید کے لئے علامہ شبلی نعمانی کو میدان میں آنا پڑا، ان سے مباحثے بھی کئے اور ان کے مسلک کی تردید میں کتاب بھی لکھی، مئو شہر میں یہ مسلک اپنے مخصوص طرز عمل اور ایک خاص حکمت عملی کی وجہ سے فروغ پاتا رہا، بیسویں صدی کے آغاز میں وہ ایک طاقتور حلقہ بن چکا تھا، اس فتنہ کو اس کے خول میں بند کرنے کے لئے علامہ اعظمی اپنے رفقاء کے ساتھ میدان عمل میں آئے اور تقریر و تحریر کے ذریعہ اس فتنہ پر قابو پایا اور اس کا آگے بڑھتا ہوا قدم رک گیا۔

دوسرا فتنہ بریلی سے سیلاب کی طرح امنڈتا ہوا چلا اور ضلع اعظم گڈھ کی سرحدوں تک آپہونچا اور مئو سے قریب قصبہ ادری میں ایک ہندوستان گیر شہرت کا مناظرہ ہوا جس میں اصل مناظر تو علامہ اعظمی کے شاگرد مولانا محمد منظور نعمانی سنبھلی تھے، لیکن علامہ اعظمی نے مناظرہ میں اہم کردار انجام دیا، اس مناظرہ میں کامیابی کا اثر یہ ہوا کہ پورا ضلع بدعات و خرافات کی لعنتوں سے ... صرف چند آبادیاں سمندر میں جزیرہ کی حیثیت میں رہ گئیں اور وہ اصلاح پذیر نہیں ہوئیں۔

تیسرا فتنہ جس کا مرکز تو لکھنؤ تھا لیکن اس کے مسموم اثرات بہت دور تک تھے، وہ شیعیت کا فتنہ تھا، علامہ اعظمی کے روابط امام اہل سنت مولانا عبدالشکور لکھنوی سے بہت مستحکم تھے اس لئے امام اہل سنت نے شیعہ مجتہدین کی اہم ترین کتابوں کی تردید کے لئے علامہ اعظمی کو منتخب فرمایا، آپ نے شیعہ مجتہدین کی کتابوں کے جواب میں انتہائی معرکۃ الآراء رسالے اور کتابیں لکھیں جو اسی زمانہ میں شائع ہوئیں اور پھر اس محاذ پر کچھ

دنوں کے لئے سناٹا چھا گیا۔

غرضیکہ ان تینوں محاذوں پر علامہ اعظمی نے اپنے علمی فضل و کمال اور وسعت مطالعہ کیوجہ سے کامیاب جنگ کی اور فریق مخالف کی زبان بند کر دی، ان تینوں فتنوں کے رد میں آپ نے جتنی کتابیں اور رسالے لکھے اگرچہ ان کا لب ولہجہ مناظرانہ ضرور تھا لیکن کبھی کوئی جواب الزامی اور سطحی نہیں دیا، ہر فرقہ اور ہر فتنہ کے رد میں آپ کا انداز تحریر ہمیشہ عالمانہ اور محدثانہ رہا، جو تحریر فرمادیا حرف آخر بن گیا، ان کے رد میں جو دلائل و براہین دیئے وہ پتھر کی لکیر بن گئے اور آج تک ان کتابوں اور رسالوں کی یہ حیثیت قائم ہے، یہ علامہ اعظمی کے نوجوانی کا دور تھا ابھی آپ کی تدریسی زندگی کا آغاز ہوا تھا، معرکہ آرائی، بحث و مباحثہ عمر کا تقاضا تھا، ٹھوس علمی کاموں کی بنیاد تو بعد میں پڑی، جب آپ جامعہ مفتاح العلوم کے شیخ الحدیث ہوئے۔

ان علمی سرگرمیوں کیوجہ سے ہندوستان کے مشاہیر علماء کی نگاہیں علامہ اعظمی پر پڑنے لگی تھیں، جوہر کی قدر و قیمت جوہری پہچاننے لگے تھے، امام اہلسنت مولانا عبدالشکور لکھنوی نے سب سے پہلے آپ کے علمی مقام و مرتبہ کو پہچانا، اس دور کی ایک دوسری اہم علمی شخصیت علامہ سید سلیمان ندوی کی تھی وہ ان دنوں دارالمصنفین اعظم گڈھ میں قیام پذیر تھے، اور علامہ شبلی کی سیرۃ النبی کی مزید جلدیں مرتب کر رہے تھے، علامہ اعظمی بغرض مطالعہ دارالمصنفین جایا کرتے تھے، علامہ ندوی سے تعارف ہوا انھوں نے گفتگو سے اندازہ لگایا کہ فن حدیث اور اسماء الرجال میں ان کا مطالعہ بہت وسیع ہے، اس تاثر کا نتیجہ یہ ہوا کہ جن روایتوں کے بارے میں سید صاحب کو شبہہ ہوتا تو علامہ اعظمی سے استصواب کرتے، بحث کرتے ان کے دلائل سنتے اور پھر انھیں کی رائے کو ترجیح دیتے۔

اسی دور میں علامہ اعظمی نے رجال طحاوی پر کام شروع کیا اور ایک ضخیم کتاب مرتب فرمائی، جس کے کچھ حصے کو دیکھ کر علامہ انور شاہ کشمیریؒ نے حیرت و استعجاب کا اظہار فرمایا اور کہا کہ اس کم عمری میں اتنی اہم ترین کتاب کی تصنیف؟ لیکن کتاب کی ترتیب کے

بعد مسودہ علامہ اعظمی کے کاغذات کے انبار میں پڑا رہا اور طباعت کی نوبت نہیں آئی اب مستقبل قریب میں اس کے شائع ہونے کے کچھ آثار نظر آرہے ہیں، خدا کرے کہ یہ کتاب جلد از جلد شائع ہو جائے۔

اسی دور میں مصر کے مشہور محدث احمد محمد شاکر کی مسند احمد کی شرح شائع ہو رہی تھی اور علامہ اعظمی کے مطالعہ میں تھی، آپ نے شرح میں کئی غلطیاں، خامیاں، سہو قلم اور لغزشیں پائیں، آپ نے اپنی رائے مصنف کو لکھے گئے اپنے خط میں ظاہر فرمائی اور اپنی رائے کے بارے میں ثبوت و شہادت بھی پیش کی، جب یہ مفصل خط احمد محمد شاکر مصنف کتاب کو ملا تو ان کی حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہی کہ ہندوستان جیسے غیر اسلامی ملک میں اتنا بڑا محدث اور علوم نبوت کا مزج داں موجود ہے۔ انھوں نے پورے ادب و احترام کے ساتھ اپنی غلطیوں کو تسلیم ہی نہیں کیا بلکہ اپنی کتاب کی پندرھوں جلد میں اپنی غلطی پر انتباہ کا پورا واقعہ لکھ دیا اور علامہ اعظمی کے شکریہ کے ساتھ ساتھ بہت سی دعائیں دیں، یہ مصنف کے ظرف اور بلند اخلاق کی بات تھی کہ انھوں نے برملا اپنی غلطیوں کا اعتراف کیا اور خود اپنی تصنیف میں اس کا ذکر کر کے اس واقعہ کو سند دوام بھی دیدی۔

اسی دور میں مصر کے ایک محقق عالم حنفیت کی زبردست وکالت کرنے والے علامہ زاہد الکوثری کا علمی تعاون کیا تو اس کا ذکر نہایت شاندار الفاظ میں علامہ کوثری نے اپنی کتاب میں کیا، اسی واقعہ کے بعد شام کے مشہور حنفی عالم جو اصول حدیث پر عبور کی وجہ سے اس فن میں ابو عبداللہ الحاکم نیساپوری سے کسی طرح کم نہیں تھے، انھوں نے علامہ اعظمی سے عقیدتمندانہ تعلق قائم کیا آپ سے اجازت حدیث لے کر اپنا استاد اور شیخ تسلیم کر لیا۔

علامہ اعظمی کا خاص موضوع حدیث اور فن اسماء الرجال تھا اور ان میں آپ کو درجۂ کمال حاصل تھا اور جب کسی اہل علم کو کسی خاص موضوع سے دلچسپی بڑھ جاتی ہے تو اس کا قدم کسی منزل پر نہیں رکتا، غور و فکر، تلاش و جستجو، تحقیق و تفتیش کی تمام راہوں میں تگ و دو بڑھ جاتی ہے تاکہ اس فن کی تمام جزئیات پر اس کو مکمل عبور حاصل ہو جائے،

رطب ویابس کے پرکھنے کا اسکو ملکہ ہو جائے، کھرے کھوٹے کی شناخت میں اس کو کمال حاصل ہو جائے، اس لئے اس فن کے تمام ذخیرۂ علمی تک رسائی کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے، بالکل یہی حال علامہ اعظمی کا تھا۔

اس سلسلہ میں آپ کی دلچسپی اس حد تک بڑھی کہ تدریسی زندگی ان کی علمی تشنگی کو بجھانے میں حارج نظر آنے لگی، اس لئے آپ نے اس سے کنارہ کشی اختیار کرلی اور اپنے خام سفالہ پوش مکان کی ایک چھوٹی سی کوٹھری تک اپنے کو محدود کرلیا، جب کہ آپ کو مرکزی اداروں میں بڑے بڑے منصبوں اور بڑی بڑی تنخواہوں کی پیشکش کی گئی، لیکن آپ نے ان کی طرف نگاہ غلط انداز بھی نہیں ڈالی، وہ اس معاملہ میں علامہ سیوطی کے ذہن و مزاج کے بن گئے، جنھوں نے آبادی چھوڑ کر ایک باغ میں سکونت اختیار کرلی کیونکہ وہ اپنی علمی سرگرمیوں کے لئے عوامی رابطہ کو سخت مضر سمجھتے تھے، اپنے جھونپڑے سے باہر کی دنیا سے بے خبر اور بے تعلق ہو گئے، وہ صرف اپنے علمی کاموں کے ہو کر رہ گئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اسلامی علوم وفنون کی تاریخ میں زندۂ جاوید ہو گئے اور پوری علمی دنیا میں شہرت دوام کے مالک ہو گئے، جب کہ انھوں نے طائر شہرت کے سارے پر کتر دیئے تھے، لیکن آج ان کے ذکر خیر سے تمام اسلامی علوم کے مراکز گونج رہے ہیں، اور ان کی کتابوں کے حوالے دیئے جا رہے ہیں۔

اس کے برخلاف بعض شخصیتیں شہرت وناموری کے وسائل اختیار کرتی ہیں، لیکن ان کی یہ شہرت وناموری کسی علمی کارنامے کی وجہ سے نہیں ہوتی، اس لئے ان کی شہرت وناموری، عزت واحترام اعزاز واکرام کی حیثیت ایک تیز آندھی کی ہوتی ہے، جو آئی اور گذر گئی، ان کا شور وغوغا ان کی زندگی تک ہے ان کی آنکھیں بند ہوئیں اور شہرت کے نقارے خاموش ہوئے۔

علامہ اعظمی اول الذکر ذہن ومزاج کے علماء کی صف میں تھے، انھوں نے شہرت وناموری کے سارے دروازے از خود بند کر دیئے تھے، لیکن ان کے عظیم علمی کارناموں

نے ان کو پوری اسلامی دنیا میں روشناس کرادیا اور آج تصنیف و تالیف کے میدان میں کام کرنے والے علامہ اعظمی کے حوالے دینے میں فخر محسوس کرتے ہیں، اور ہمیں یقین ہے کہ آئندہ علم و تحقیق کا معیار بلند سے بلند تر ہو جائے گا تو علامہ اعظمی کے افکار و خیالات اور آپ کی علمی تحقیقات کو بطور سند پیش کیا جائے گا۔

علامہ اعظمی کی شہرت کا راز ان کے عظیم الشان علمی کارناموں میں پوشیدہ ہے جو مسلسل عالمی پیمانے پر شائع ہوتے رہے، بر صغیر ہی نہیں عرب ممالک حجاز شام اور مصر سے لے کر یورپ کے دانشکدوں تک آپ کی کتابیں پہونچیں عظمت واحترام کے ہاتھوں لی گئیں اور پڑھی گئیں۔

آپ نے اپنی زیادہ توجہ حدیث کے ان مخطوطات کی طرف فرمائی جو صحاح ستہ سے پہلے عالم وجود میں آئیں، اب تک مستشرقین صحاح ستہ کو پیش نظر رکھ کر احادیث کی صحت سے انکار کرتے تھے، کیوں کہ یہ سارے احادیث کے مجموعے تیسری صدی میں مرتب ہوئے، جب ان کتابوں سے پہلے کے مجموعے دریافت ہو گئے اور صحاح ستہ کی سندوں کی تصدیق و تائید ہو گئی تو بڑی حد تک ان کی زبانیں بند ہوئیں اور منکرین حدیث کا زور ٹوٹا، محدث اعظمی نے احادیث کے جن مخطوطات کو اپنی تصحیح اور تعلیق و تحشیہ کے ساتھ شائع کیا اس کا اجمالی تعارف یہاں دیا جارہا ہے۔

مسند حمیدی : (الامام الحافظ ابو بکر عبد اللہ بن زبیر الحمیدی المتوفی ۲۱۹ھ)

حمیدی امام بخاری کے استاذ ہیں ان کا مرتب کردہ مجموعہ حدیث مسند حمیدی کے نام سے اہل علم میں معروف ہے، مسند حمیدی کے تین مخطوطے ہندوستان کے کتب خانوں میں تھے، چوتھا مخطوطہ دمشق کے کتب خانہ ظاہریہ میں تھا ان کے علاوہ اور کہیں کسی نسخے کا پتہ نہیں تھا آپ نے ہندوستان کے تینوں مخطوطات کو پیش نظر رکھ کر کام شروع کردیا اور جب کتاب پریس میں چلی گئی تو چوتھا مخطوطہ حاصل ہوا جس سے مسند حمیدی کے نصف آخر میں استفادہ کیا گیا، علامہ اعظمی نے مسند میں مذکور حدیثوں کو دوسرے مجموعہائے حدیث میں

تلاش کراکے ان کے حوالے دیئے، اگر اس کے متعدد طرق ہیں تو اس کی بھی نشاندہی کر دی گئی، تصحیح متن کے ساتھ ساتھ الفاظ غریبہ کا معنی و مفہوم بھی بتادیا ہے، اور جہاں جہاں ضرورت محسوس ہوئی وہاں حدیث کی تشریح و توضیح اس کے حقیقی مفہوم و مراد کی بھی تعیین فرمادی ہے، تعلیقات و تحشیہ اور توضیحات نے کتاب کی ضخامت کو تقریباً دوگنا کر دیا ہے، جہاں کوئی ایسی روایت ہے جو مسند حمیدی کے علاوہ دوسرے مجموعوں میں نہیں ہے اس پر محققانہ کلام کیا گیا ہے۔ جیسا کہ رفع یدین کی روایت کے سلسلہ میں کیا گیا ہے چونکہ یہ کتاب مسانید کے اصول پر ہے اس لئے کسی خاص مسئلہ سے متعلق حدیث کی تلاش دشوار تھی، آپ نے ابواب فقہیہ کے انداز پر اس کی ایک فہرست مرتب فرما کر اس مشکل کو آسان کر دیا ہے، کتاب ۱۹۶۳ء میں پہلی بار شائع ہوئی۔

کتاب الزہد والرقائق: (الامام شیخ الاسلام عبداللہ بن مبارک المروزی المتوفی ۱۸۱ھ)

عبداللہ بن مبارک دوسری صدی ہجری کے محدث ہیں، آپ کی کتاب کا نمونہ شاہ قطر نے علامہ اعظمی کو بطور ہدیہ بھیجا تھا، آپ نے اپنے ذرائع سے کتاب کے دوسرے مخطوطوں کا پتہ چلایا تو معلوم ہوا کہ مصر میں اس کے تین مخطوطے ہیں، اس کی مائیکرو فلم منگوائی، ان چاروں مخطوطوں کو پیش نظر رکھ کر تصحیح متن کی گئی، تمام روایتوں کی تخریج کی گئی اور بتایا گیا کہ محدثین و مفسرین نے کہاں کہاں ان کا ذکر کیا ہے، حوالے مستند دیئے گئے ہیں اور کمزور حوالوں سے صرف نظر کیا گیا ہے، دقیق الفاظ کی تشریح کر دی گئی ہے، مختصر لفظوں میں کہیں کہیں حدیث کی تشریح بھی کی گئی ہے۔ تمام غلطیوں کی نشاندہی کر کے ان کی تصحیح کی گئی، مرسل، معضل روایتیں جن راویوں کی ہیں ان کی فہرست مرتب کر دی گئی ہے، اسی طرح مقطوع اور موقوف روایتوں کے راویوں کی بھی فہرست دی گئی ہے، محقق نے اصل کتاب سے پہلے ۶۳ صفحات کا ایک مقالہ سپرد قلم کیا ہے، جس میں آپ نے بتایا ہے کہ اسلام میں زہد و رقائق کی حقیقت کیا ہے؟ اس کے بعد آپ نے اس موضوع پر مرتب کی جانے والی اٹھارہ کتابوں کی نشاندہی کی ہے، کتاب پہلی بار ۱۳۸۵ھ میں شائع ہوئی۔

سنن سعید بن منصور: (الامام الحافظ سعید بن منصور بن شعبۃ الخراسانی المکی المتوفی ۲۲۷ھ) سعید بن منصور المکی امام احمد بن حنبل، امام مسلم اور امام ابوداؤد جیسے اکابر محدثین کے شیخ اور استاد ہیں، اور خود انھوں نے امام مالک اور حماد بن زید سے روایت کی ہے، محدثین ان کی کتاب السنن سے واقف تھے، جو صحاح ستہ سے بہت پہلے مرتب ہوئی تھی، لیکن متاخرین کو اس کے کسی نسخہ کا پتہ نہ چل سکا تھا، خدا اجزائے خیر دے ڈاکٹر حمید اللہ مقیم پیرس (فرانس) کو انھوں نے اس مخطوطہ کو ڈھونڈھ نکالا جو ترکی کے مشہور کتبخانہ کوبریلی میں تھا، لیکن پوری کتاب کے بجائے صرف اس کی تیسری جلد کا مخطوطہ ملا، وہی مخطوطہ محقق علام علامہ اعظمی کے پاس آیا اور آپ کی تصحیح اور تعلیق و تحشیہ کے بعد کتاب منظر عام پر آئی، کسی کتاب کا اگر ایک ہی مخطوطہ ہو تو اس کی تصحیح و تحقیق ایک دقت طلب امر بن جاتی ہے، نصوص کے ایک ایک لفظ کی تصحیح و تحقیق اسی وقت ممکن ہے جب احادیث کے دوسرے مجموعوں پر محقق کی پوری نظر ہو، علامہ اعظمی نے اپنے وسعت مطالعہ کی بنا پر مخطوطہ کی ہر ہر روایت کی تحقیق و تصحیح کی، جہاں کہیں سہو یا کتابت کی غلطی نظر آئی اس کی نشاندہی فرمائی اور تصحیح کر کے مستند حوالہ دیدیا، غریب الفاظ کے معانی و مفہوم اور کہیں کہیں روایت کی توضیح بھی فرمادی ہے، کتاب دو جلدوں میں شائع ہوئی اس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۶۷ء میں اشاعت پذیر ہوا۔

المصنف: (الامام الحافظ ابو بکر عبدالرزاق بن ہمام الصنعانی المتوفی ۲۱۱ھ)

مصنف عبدالرزاق احادیث و آثار کا ایک نہایت عظیم الشان ذخیرہ ہے جس سے امام احمد ابن حنبل، اسحاق بن راہویہ، امام بخاری، امام مسلم جیسے جلیل القدر محدثین اور اساطین امت نے استفادہ کیا ہے، لیکن اس کا کوئی مکمل نسخہ دنیا کے سامنے نہیں آسکا تھا، اس کتاب کے اجزا دنیا کے مختلف کتب خانوں میں بکھرے ہوئے تھے، ضرورت تھی ان تمام اجزاء کو جمع کر کے تصحیح، تعلیق و تحشیہ سے مزین کر کے علمی دنیا کے سامنے پیش کیا جائے اور مکمل کتاب اہل علم کے سامنے آجائے، لیکن دنیا بھر میں بکھرے ہوئے ان اجزاء کا اکٹھا کرنا، ساڑھے چھ ہزار صفحات کی کتاب اور اکیس ہزار احادیث پر مشتمل اس مجموعہ حدیث کے

مخطوطے کو حرفاً حرفاً پڑھنا، ہر حدیث کی تخریج کرنا حدیث کے دوسرے متداول مجموعوں کو پیش نظر رکھ کر متن کی تصحیح کرنا، پورے ایک ادارہ کا کام تھا، اس امر عظیم کو علامہ اعظمی نے تن تنہا انجام دیا اور آج وہ علمی دنیا کے سامنے پوری تحقیق اور تحشیہ کے ساتھ طبع ہو کر آچکی ہے، جس نے پوری علمی دنیا کو علامہ اعظمی کے فضل و کمال کو تسلیم کرنے پر مجبور کر دیا، آپ نے متن کی تصحیح پر پوری توجہ فرمائی، ایک ایک لفظ کو جانچا، پرکھا ہے، حتی کہ سہو کتابت سے بھی کسی لفظ کی کمی و بیشی ہو گئی ہے تو اس کو بھی حوالوں کے ساتھ درست کر دیا ہے، مصنف کی روایتوں کو حدیث کے دوسرے مجموعوں میں تلاش کر کے اس کے حوالے دیدیئے ہیں، نصوص کی تصحیح کے وقت تقریباً پینتیس مجموعہائے حدیث کو پیش نظر رکھا گیا ہے، ہر ایک کے حوالے حواشی میں موجود ہیں، کتاب گیارہ ضخیم جلدوں میں ہے، پہلا ایڈیشن ۱۹۷۰ء میں شائع ہوا، اس کے بعد اس کا دوسرا ایڈیشن بیروت سے شائع ہو کر علمی دنیا میں پہونچا۔(۱)

المطالب العالية بزوائد (حافظ ابن حجر عسقلانی متوفی ۸۵۲ھ)

المسانيد الثمانية : حافظ ابن حجر عسقلانی نے آٹھ مسندوں کی روایتوں کو ابواب فقہیہ کی ترتیب پر جمع کیا ہے، یہ کتاب مخطوطہ کی شکل میں تھی، علامہ اعظمی کو اس کی تلاش تھی، سعیدیہ لائبریری حیدر آباد میں اس کا ایک نسخہ تھا مگر وہ ناقص تھا، مکتبہ علمیہ کے مدیر شیخ محمد سلطان نمنکانی نے ترکی کے کتب خانوں سے اس کو ڈھونڈھ نکالا، وہاں ان کو کتاب کے دو مخطوطے ملے، دونوں کے فوٹو لیکر علامہ اعظمی کو ارسال کر دیئے، آپ نے متن کی تصحیح کی اور موجودہ طرز کے مطابق علامتوں اور نشانوں کے ساتھ نقل کرایا اور اضافہ کی عبارت کو قوسین کے درمیان رکھا تاکہ اصل کتاب سے امتیاز باقی رہے، روایتوں پر نمبر شمار ڈالے، تصحیح میں کمال احتیاط کے پیش نظر اس موضوع پر مرتب کی جانے والی ایک اور کتاب حافظ شہاب بوصیری کی " مختصر اتحاف السادة المهرة في

(۱) پہلا ایڈیشن بھی بیروت ہی سے شائع ہوا تھا۔(مسعود)

زوائد المسانید العشرة'' کو سامنے رکھا۔ روایتوں کے بارے میں آپ نے اپنی رائے بھی دی ہے، حدیث کے مرفوع، موقوف، مرسل یا موصول ہونے کی وضاحت کی، سند کے رجال پر بھی کلام کیا ہے اور اس سلسلہ میں آپ نے اپنی دوٹوک رائے دی ہے، کتاب کویت کے مطبعہ عصریہ (۱) سے ۱۹۷۰ء میں چار جلدوں میں شائع ہوئی۔

مختصر الترغیب والترهیب: (حافظ ابن حجر عسقلانی متوفی ۸۵۲ھ)

یہ کتاب مشہور محدث حافظ منذری کی کتاب کی تلخیص ہے، کتاب میں ہر طرح کی روایتیں تھیں، حافظ ابن حجر نے تلخیص میں صحیح روایتوں کو لیا اور کمزور روایتوں کو ترک کردیا، کتاب مختصر ہو گئی اور مستند بھی۔ کتاب اب تک شائع نہیں ہوئی تھی، علامہ اعظمی کو ہندوستان کے کتب خانوں میں اس کے تین مخطوطے ملے، آپ نے ان کو سامنے رکھ کر متن کی تصحیح کی، راویوں کے ناموں میں کہیں کہیں فرق تھا اس کی وضاحت فرمائی کتاب مکتبہ الغزالی دمشق سے شائع ہوئی۔ (۲)

المصنف لابن ابی شیبة : (عبداللہ بن محمد بن ابی شیبۃ العبسی التوفی ۲۳۵ھ)

مصنف ابن ابی شیبہ احادیث کا ایک ضخیم مجموعہ ہے، علامہ اعظمی نے تصحیح متن کے ساتھ تعلیق و تحشیہ میں بڑی عرق ریزی سے کام لیا ہے، کتاب کا مکمل مسودہ تیار ہے، بہت پہلے مجھے معلوم ہوا تھا کہ اس کی پانچ جلدیں شائع ہو چکی ہیں، میرا خیال ہے کہ اب اس کی ساری جلدیں شائع ہو چکی ہوں گی۔ (۳)

علامہ اعظمی کے ان کے علاوہ بھی کئی دوسرے علمی شاہکار ہیں جیسے تلخیص

(۱) یہ کتاب مطبعہ عصریہ سے چھپ کر کویت کی وزارت اوقاف کی طرف سے شائع ہوئی ہے۔

(۲) یہ کتاب پہلی دفعہ مجلس احیاء المعارف مالیگاؤں سے شائع ہوئی، دوبارہ اس کو مکتبۃ الغزالی دمشق نے شائع کیا۔

(۳) علامہ اعظمی کی حیات میں اس کی چار جلدیں شائع ہوئی تھیں، آپ کی وفات کے بعد سارا مسودہ ناشرین کے پاس چلا گیا، اب معلوم نہیں وہ کس مرحلہ میں ہے (مسعود)

خواتم جامع الأصول، کشف الاستار، تکمیل الاذهان ، وغیرہ وغیرہ شائع ہو کر اہل علم سے خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ علامہ اعظمی کا پہلا علمی شاہکار الحاوی لرجال الطحاوی کا مکمل مسودہ طباعت کے لئے بالکل تیار ہے، اب تک یہ کتاب شائع نہیں ہو سکی ہے۔" الاتحافات السنیة بذکر محدثی الحنفیة" بھی مکمل ہے، طباعت کے انتظار میں ہے، ان کے علاوہ آپ کی اٹھارہ کتابیں مختلف موضوعات پر اردو زبان میں ہیں۔

یہ علامہ اعظمی کے حالات وواقعات اور علمی کارناموں کی مختصر اور ایک اجمالی فہرست ہے، اسی اجمال کی تفصیل آپ کو اس کتاب میں ملے گی جو اس وقت آپ کے ہاتھوں میں ہے، کتاب کے مصنف ایک نوجوان اور ذہین وفطین عالم ڈاکٹر مسعود احمد الاعظمی ہیں جو جدید وقدیم دونوں طرز کے علمی مراکز کے فیض یافتہ ہیں، اور تصنیف و تالیف کا اچھا ذوق رکھتے ہیں، مصنف نے کتاب کی ترتیب، میٹر اور مواد کی تلاش وجستجو میں محنت اور بڑی عرق ریزی سے کام لیا ہے، علامہ اعظمی کی ستر سالہ علمی زندگی کی تحریروں، مسودوں، مخطوطات ومکتوبات اور دوسرے بہت سے کاغذات کے انبار کو گرد وغبار سے صاف کیا، کاغذات کے ہر چھوٹے بڑے ٹکڑوں کو ہیرے جواہرات کی طرح سنبھال کر رکھا ان کو پڑھا اور ان کا بارک بینی سے جائزہ لیا اور ان سے جو معلومات حاصل کیں، ان کو بڑے سلیقہ سے اس کتاب میں پیش کر دیا ہے، کتاب مکمل طور پر محدث اعظمی کی تحریروں کی روشنی میں مرتب کی گئی ہے، ذاتی معلومات اور غیر مستند روایتوں کا کتاب میں کوئی دخل نہیں، اس لئے کتاب ہر طرح اور ہر اعتبار سے مستند اور قابل اعتبار ہے۔ مجھے یقین ہے کہ کتاب عوام وخواص کے ہر طبقہ میں اور بالخصوص اہل علم کے ہر حلقہ میں شرف پذیرائی حاصل کرے گی۔

اسیر ادروی

مدیر ترجمان الاسلام بنارس

پہلا باب
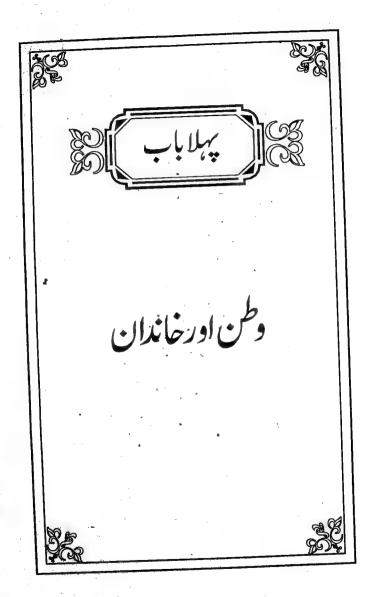
وطن اور خاندان

پہلا باب

وطن اور خاندان

وطن اصلی | مئوناتھ بھنجن سے سات آٹھ کلو میٹر کے فاصلہ پر شمال مشرق کی سمت "ادری" نام کا ایک مشہور قصبہ ہے، علامہ اعظمی کا خاندان وہیں آباد تھا، آپ کے پردادا جن کا نام "خوشحال" تھا، ترک وطن کر کے مئو آئے اور دریائے ٹونس کے کنارے محلہ پٹھان ٹولہ میں فروکش ہوئے، علامہ اعظمی نے خود لکھا ہے:

"خوشحال جد پدر من از ادری انتقال مکان کردہ بمئو آمدہ در محلہ پٹھان ٹولہ اقامت کرد"
(میرے پدر بزرگوار کے دادا خوشحال ادری سے نقل مکان کر کے مئو آئے اور محلہ پٹھان ٹولہ میں اقامت اختیار کی)

نسب | خوشحال تک آپ کا نسب یہ ہے: "حبیب الرحمٰن بن محمد صابر بن عنایت اللہ بن خوشحال"۔ چند پشتوں کا یہ مختصر نسب نامہ آپ نے اپنی یادداشت اور متفرق اوراق پر تحریر فرمایا ہے، اس کے بعد خوشحال کی ولدیت ایک جگہ سلطان اور دوسری جگہ فخر الدین لکھی ہے، لیکن اس میں کوئی تعارض نہیں قرار دیا جا سکتا، اس لئے کہ ممکن ہے ایک ہی شخصیت کے دو نام ہوں، یا ایک لقب یا عرفی نام ہو اور دوسرا اصلی نام۔ خوشحال کا انتقال ۱۲۹۲ھ کے لگ بھگ ہوا۔

خوشحال کے کئی ایک اولاد ہوئی، جن میں ایک علامہ اعظمی کے جد امجد "عنایت اللہ" تھے۔

عنایت اللہ کے حالات زندگی تمام تر پردۂ خفا میں ہیں، ان کی نسبت سوائے اس کے کچھ اور نہیں معلوم کہ ۱۳۱۰ھ تک وہ بقید حیات تھے، لیکن ان کے صاحبزادے اور علامہ اعظمی کے والد محترم کے متعلق جو واقعات اور تصریحات ملتی ہیں، وہ ان کے ورع و تقوی کی شہادت دیتی ہیں، اس سے کم از کم اتنا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اولاد کی تعلیم و تربیت میں ان کا لازمی طور پر اہم اور بڑا حصہ رہا ہوگا، اور زیادہ امکان اسی بات کا ہے کہ ان کے صاحبزادے مولانا محمد صابر صاحب انھیں کا اثر قبول کر کے اس درجہ تک پہونچے ہوں گے۔ جس کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

والد ماجد مولانا محمد صابر صاحب: عنایت اللہ مرحوم کی صلب سے مولانا محمد صابر صاحب پیدا ہوئے، تاریخ ولادت کا بتصریح علم نہیں، لیکن چونکہ خود علامہ اعظمی نے ان کی عمر وفات کے وقت تہتر یا پچہتر برس لکھی ہے، اس حساب سے ان کا سال پیدائش ۱۲۹۰ھ یا ۱۲۹۲ھ ہو سکتا ہے۔

مولانا محمد صابر صاحب نے مولانا عبد الغفار صاحب عراقی مئوی اور ان کے بھائی مولانا ابوالبرکات صاحب اور مولانا ابوالحسن صاحب کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا، درسیات کی بیشتر کتابیں اسی خانوادۂ علم و ادب کے بزرگوں سے پڑھ کر علوم مروجہ کی تحصیل کی، اور مولانا ابوالحسن صاحب کی خدمت میں صحاح ستہ پڑھ کر ۱۳۲۹ھ میں سند فراغ حاصل کی۔

مولانا محمد صابر صاحب گوناگوں اوصاف کے حامل تھے، علم کی لگن اور تعلیم و تدریس کی اس قدر تڑپ تھی کہ عمر عزیز کا تقریباً نصف حصہ محلہ کی مسجد میں بڑی عمر والوں کو تعلیم دینے میں گذار دیا، تذکرۂ علماء اعظم گڈھ کے مصنف لکھتے ہیں:

"اور تقریباً ۳۶ سال تک اپنے محلے کی مسجد میں بڑی عمر والوں کو فارسی اور دینیات کی تعلیم دیتے رہے۔ اس طویل مدت میں ایک کثیر جماعت نے آپ سے استفادہ کیا۔" (۱)

(۱) دیکھئے ضمیمہ تذکرۂ علماء اعظم گڈھ

ان کے استاد مولانا ابوالحسن عراقی مئوی کے ہاتھوں جب مدرسہ مفتاح العلوم کا قیام عمل میں آیا، تو بیک وقت ان کو نائب ناظم اور خزانچی کا عہدہ تفویض کیا گیا، جس کو ایک مدت تک وہ نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیتے رہے، اور کام کی نزاکت کے باوجود ان کی امانت و دیانت کی بدولت دامن ہمیشہ بے داغ اور شک وشبہہ سے پاک رہا۔

مولانا اپنے وقت کے کاملین میں تھے ، نہایت متقی و پاکباز، عابد و زاہد، متواضع اور خاکسار، اور مکارم اخلاق کے پیکر تھے ، قناعت و استغناء ان کی طبیعت کا خاصہ تھا ، علامہ اعظمی اپنی بیاض میں تحریر فرماتے ہیں:

"پدر بزرگوار وولی نعمت ایں فقیر عالم باسند و تلمیذ مولانا عبدالغفار و اُخویہ و در طریقہ چشتیہ مرید حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی ،بغایت متشرع و متقی وزاہد و تہجد گذار و مہمان نواز و بے نفس و خوش اخلاق بود، وكان أواها تلاء أ للقرآن..."

(اس فقیر کے پدر بزرگوار اور ولی نعمت سند یافتہ عالم اور مولانا عبدالغفار صاحب اور ان کے دونوں بھائیوں کے شاگرد اور سلسلۂ چشتیہ میں حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی کے مرید تھے، حد درجہ پابند شریعت، خداترس، دنیا بیزار، تہجد گذار، مہمان نواز اور خوش اخلاق تھے، بہت زیادہ گریہ وزاری اور قرآن کی تلاوت کرنے والے تھے۔)

تھوڑے فرق کے ساتھ ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں:

" كان والدى من عباد الله الصالحين والعلماء العاملين ، معروفا بصلاحه وتقواه وملازمة التلاوة والذكر بين العامة والخاصة ، مرموقاً اليه بنظر الإجلال، معتقداً بين المسلمين وغيرهم، اشتغل بالفقه والتفسير على الشيخ أبى الحسن المئوى وقرأ عليه الكتب الستة من الصحاح حرفاً حرفاً وتلقن الذكر من العارف بالله الشيخ أشرف على التهانوى الفقيه المحدث المفسر"(١)

(۱) المآثر ج۱۴ ش ۳ ص ۹۱۔

(میرے والد اللہ کے نیک بندوں اور باعمل علماء میں تھے، اپنی نیکی و پارسائی، پابندیٔ تلاوت اور ذکرواذکار کے باعث عوام وخواص سب میں مشہور تھے، عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے، مسلم اور غیر مسلم سب ان کے عقید تمند تھے، فقہ و تفسیر کا درس مولانا ابوالحسن مئوی کی خدمت مین حاصل کیا اور انھیں کے پاس صحاح ستہ حرفاً حرفاً پڑھی اور محدث ومفسر وفقیہ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ سے ذکر سیکھا۔)

معاملات کے کھرے اور صاف ستھرے تھے، اجیر کو اس کی اجرت اور مزدور کو مزدوری پسینہ خشک ہونے سے پہلے دیدیتے تھے، مزدور نے اپنا کام ختم کیا نہیں کہ مزدوری اس کے ہاتھ میں ہوتی، چنانچہ ان کے بارے میں مولانا رشید احمد صاحب کی روایت ہے:

"وہ اپنے یہاں جب مزدور کو کام پر لگاتے تھے، تو ان کا کام اور وقت پورا ہونے سے پہلے ہی ہر ایک مزدور کی اجرت الگ ہاتھ میں لے کر کھڑے ہو جاتے، اور جونہی مزدور اپنے کام سے فارغ ہوتا اسے فوراً مزدوری دیدیتے۔" (۱)

اسلامی آداب، اخلاقی اقدار اور انسانی اخوت وہمدردی کے بڑے قائل تھے، اونچ نیچ ذات پات کا کوئی امتیاز نہیں تھا، ان کے نزدیک بڑا وہی تھا جسے شریعت نے بڑا قرار دیا ہو، بالادستی یا زیردستی ان کے یہاں بڑائی کا معیار اور امتیاز کا پیمانہ نہیں تھی، ان کی نگاہ میں ہر شخص عزت و احترام کا مستحق تھا جس کی توقیر کا اسلام نے حکم دیا ہے، یہ عزت وتوقیر اس حد تک تھی کہ:

"گھر پر جو مزدور کام کرتے تھے، گھر کے بچوں کو حکم تھا کہ ہر ایک کی عمر کے لحاظ سے اس کے تعظیمی خطاب کے ساتھ نام لیں، خواہ وہ کسی طبقہ سے تعلق رکھتا ہو، مثلاً فلاں بھیا، فلاں چچا، فلاں بابو وغیرہ۔" (۲)

سلام کرنے میں بہت پیش تھے، آشنا ہو یا غیر آشنا جہاں کوئی مسلمان صورت شخص نظر آتا فوراً سلام کرتے، مولانا کا یہ ایسا وصف تھا کہ اس میں کوئی ان سے آگے نہیں بڑھ سکتا تھا، ہمیشہ سلام کرنے میں پہل کرتے اور سامنے والا کوشش کے باوصف ان پر سبقت نہیں کر سکتا تھا۔

(۱) المآثر ج ۴ ش ۳ ص ۸۷ (۲) ایضاً

بڑے علم دوست، غریب پرور، سیر چشم اور مہمان نواز تھے، مہمانوں کی خاطر داری بڑی فراخ دلی اور کشادہ جبینی سے کرتے، طلبہ کی خوب مدارات کرتے اور ان میں سے کچھ کے قیام و طعام اور دیگر ضروریات کی کفالت بھی کرتے تھے، مولانا اعجاز احمد صاحب، مولانا رشید احمد صاحب اور حاجی سعید احمد صاحب کے حوالہ سے نقل کرتے ہیں:

"ہمیشہ اپنے گھر پر مدرسہ کے چند غریب طلبہ کو رکھتے تھے، جو دن کو مدرسہ میں تعلیم حاصل کرتے اور رات میں مولانا کے یہاں مقیم ہوتے، کھانا ناشتہ سب یہیں ہوتا، راقم الحروف جس گاؤں کا رہنے والا ہے، وہاں کے کئی طلبہ مولانا مرحوم کی اس فیاضی اور کشادہ دستی سے مستفید ہوتے رہے ہیں۔"(۱)

مطالعہ کے شوقین اور کتابوں کے دلدادہ تھے، ذکر و شغل کیساتھ مطالعہ و کتب بینی میں بھی وقت صرف کرتے۔ بہت سی کتابیں جو ان کی خرید کردہ اور مملوکہ رہ چکی ہیں، علامہ اعظمی کے کتب خانے میں اب بھی محفوظ ہیں، جو عربی فارسی اردو ہر قسم کی کتابوں پر مشتمل ہیں۔اور موضوع کے تنوع کی وجہ سے ان کے ذوق سلیم اور کثرت مطالعہ کا پتہ دیتی ہیں۔

امانت و دیانت کے ساتھ انتظامی صلاحیت، سلیقہ مندی نظافت اور لطافت و پاکیزگی بھی بدرجہ کمال تھی، چھوٹے چھوٹے کام میں بھی حسن انتظام نمایاں طور پر نظر آتا تھا۔

ان کے اخلاق فاضلہ اور صفات حمیدہ نے ان کو خاص و عام، صغیر و کبیر یہاں تک کہ بزرگوں کی نگاہ میں بڑا اور معزز و مکرم بنادیا تھا، حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ سے بیعت تھے، مگر خود شیخ کے نزدیک مرید کی قدر کس قدر تھی اس کے لئے مولانا حبیب الرحمٰن جگدیش پوری کے درج ذیل الفاظ پڑھئے:

"ان کے شیخ و مرشد حضرت تھانویؒ انھیں بڑی وقعت کی نگاہ سے دیکھتے اور ان کے ساتھ بڑا حسن ظن رکھتے تھے، جس کا اندازہ حضرت محدث اعظمی کی اس روایت سے ہوتا ہے کہ ایک مرتبہ مولانا نے ان کے ذریعہ ایک رومال حضرت

(۱) المآثر ص۸۹

تھانویؒ کی خدمت میں بھیجا، حضرت مولانا حبیب الرحمٰن دامت برکاتھم نے حضرت تھانوی سے عرض کیا کہ والد صاحب نے یہ ہدیہ میں پیش کیا ہے تو حضرت تھانوی نے اس کو سر پر رکھ کر فرمایا، یہ آپ کے والد صاحب کا ہدیہ نہیں تبرک ہے۔"(۱)

والدہ ماجدہ علامہ اعظمی کی والدہ کا نام کلثوم تھا، جو عبدالرحیم صاحب ساکن قاسم پورہ مئو کی صاحبزادی تھیں، عبدالرحیم صاحب کے ایک بھائی حافظ قطب الدین نے ترک وطن کر کے مالیگاؤں میں سکونت اختیار کی، اور دوسرے بھائی ولی اللہ بمبئی میں جاں بحق ہوئے۔

آپ کی والدہ مرحومہ بھی نہایت نیک نفس، خوش خلق، پاکباز، عبادت گذار اور وفا شعار خاتون تھیں، کم گوئی اور خاموش طبعی ان کا وصف خاص تھا، ان کی نسبت خود علامہ اعظمی کے یہ الفاظ پڑھیے:

" كانت رحمها الله حلس بيتها ، لا تخرج من البيت إلا لحاجة كعيادة إحدى النساء في المحلة أو من أهل قرابتها أو زيارة إحدى بنتيها أو أخيها، بغایت پابند نماز وروزہ بود، وکم سخن وخاموش طبع۔"

(مرحومہ خاتون خانہ تھیں، صرف ضرورت کے بقدر گھر سے نکلتی تھیں، جیسے بستی یا رشتہ داری کی کسی عورت کی عیادت کرنی ہو یا اپنے بھائی یا اپنی دونوں لڑکیوں میں سے کسی سے ملنے کیلئے جانا ہوا، نماز روزہ کی نہایت پابند اور کم گو خاموش طبع تھیں۔)

۶/رجب ۱۳۱۷ھ بروز یکشنبہ ظہر کے وقت اس جہان فانی سے رحلت فرما گئیں، اور دریائے ٹونس کے کنارے اپنے مرحوم شوہر کے پہلو میں مدفون ہوئیں، اللہ ان نیک روحوں پر اپنی رحمت ورضوان کی بارش فرمائے۔ آمین

اس نخل کمال سے حبیب الرحمٰن الاعظمی جیسا نونہال وجود میں آیا۔ ان کے علاوہ اس شجرۂ مبارکہ سے جو شاخیں نکلیں ان میں تین صاحبزادے اور چار صاحبزادیاں تھیں، صاحبزادوں کے نام ہیں (۱) محمد (۲) احمد (۳) محمد، ان میں سے پہلے دونوں صاحبزادے بہت

(۱) ضمیمہ تذکرہ علماء اعظم گڈھ

پہلے انتقال کر چکے تھے، آخری لڑکے مولوی محمد صاحب نے طویل زندگی پائی، اور مفتاح العلوم سے فارغ بھی ہوئے، ۲۲؍شوال بروز بدھ ۱۴۱۱ھ مطابق ۸؍مئی ۱۹۹۱ء کو ان کی وفات ہوئی۔

صاحبزادیوں کے نام یہ ہیں: مریم، فاطمہ، رقیہ، میمونہ۔

☆☆☆

علامہ اعظمی نے فرمایا:

آپ کا اور ہمارا اس بات پر ایمان ہے، اور اگر کسی کا ایمان نہیں ہے تو ہونا چاہئے کہ دنیا چاہے جتنی آگے بڑھ جائے، سائنس چاہے جس قدر ترقی کر جائے، اور لوگوں کی نگاہ میں لوگوں کی زبان پر چڑھا ہو الفظ یعنی روشن خیالی، جتنا بھی زیادہ پھیل جائے، آج کل ترقی یافتہ لوگ اپنے لئے عربی زبان میں "متنور" کا لفظ استعمال کرتے ہیں، یعنی نئی روشنی کے لوگ، یہ نئی روشنی جس قدر بھی تیز ہو جائے، بہر حال اسلام کے جو احکام ہیں، قرآن کی جو تعلیم ہے اور محمد رسول اللہ ﷺ کی جو ہدایات ہیں وہ آج بھی اسی طرح رہیں گی، جس طرح آج سے تقریباً چودہ سو برس پہلے تھیں اور قیامت تک اسی طرح رہیں گی، وہی احکام رہیں گے، وہی تعلیمات رہیں گی، وہی ہدایات رہیں گی، اسلام کا وہی نظریہ رہے گا، اسلام کی وہی ساری حقیقتیں رہیں گی، جو اسلام نے ہمارے سامنے کھول کر رکھ دی ہیں، قرآن کریم جن سے مملو ہے، بھرا ہوا ہے، وہ ساری حقیقتیں اپنی جگہ پر رہیں گی، اس نئی روشنی کو اسلام کی روشنی کے سامنے ماند ہونا پڑے گا، اس کے سامنے اسلام کی روشنی ماند نہیں ہو سکتی، اس روشنی کے جو تقاضے ہیں، اسلام کے تقاضوں کے آگے انھیں دبنا پڑے گا اور اسلام ان کے نیچے نہیں دبے گا، اسلام ہمیشہ کے لئے ایک ابدی تعلیم ہے، وہ قیامت تک کے لئے ایک نہ مٹنے والی اور نہ دبنے والی تعلیم اور ہدایت ہے، اس ہدایت کے اندر کوئی تحریف نہیں ہو سکتی، کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی، وہ کوئی تغیر پذیر چیز نہیں ہے۔ اس بات کے اوپر ہمارا ایمان ہے اور اگر کسی کا نہیں ہے تو اس کو ایمان لانا چاہئے، وہ مومن اسی وقت ہوگا جب کہ اس بات کے اوپر وہ یقین رکھے۔

المآثر ج ۳ ش ا ص ۸۴

☆☆☆☆☆☆☆☆

دوسرا باب

ولادت سے تکمیلِ تعلیم تک

دوسرا باب

ولادت سے تکمیل تعلیم تک

ولادت اور نشو ونما بیسویں صدی عیسوی کے آغاز اور چودھویں صدی ہجری کے عشرۂ ثانیہ کے آخر میں ہندوستان کے مردم خیز صوبہ اتر پردیش کے مشرقی افق سے علم وفضل کا ایک آفتاب طلوع ہوا، ۱۹۰۱ء مطابق ۱۳۱۹ھ - غالباً جمادی الاخری - کا کوئی وقتِ مسعود اور ساعتِ مبارکہ تھی، جب ضلع اعظم گڈھ کے قدیم اور مشہور قصبہ مئو میں محدّث جلیل حضرت مولانا ابوالمآثر حبیب الرحمان الاعظمی کی ولادت باسعادت ہوئی۔
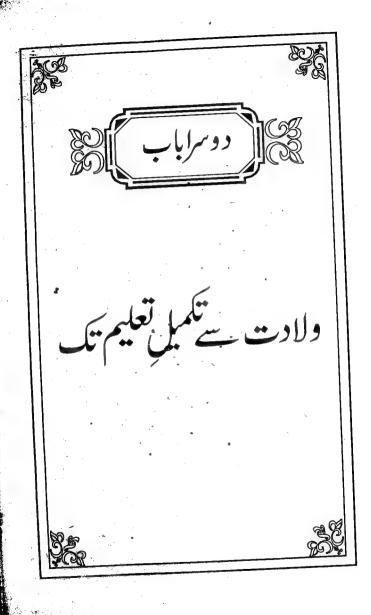
مولانا عبدالغفار صاحب مئوی عراقیؒ کے والد بزرگوار شیخ عبداللہ عراقیؒ نے تاریخی نام ''اختر حسن'' تجویز فرمایا، دوسرا نام یا - شاید - لقب ''حبیب الرحمان'' رکھا گیا، جس سے مملکت علم میں شہرت دوام حاصل ہوئی۔ اپنے لیے جس کنیت کا انتخاب فرمایا، اس میں بھی امتیازی شان جلوہ گر رہی، اور ''ابوالمآثر''[1] کا لفظ آپ کی ذات والا صفات پر کچھ یوں منطبق ہوا کہ زندگی عظیم الشان اور قابل صد رشک کارناموں سے عبارت ہوگئی۔ خلق خدا نے ارادت وعقیدت اور فرطِ ادب سے ''بڑے مولانا'' کا خطاب بخشا، جو آپ کا علامتی نام بن گیا، اور آپ کے لیے ایسا خاص ہوا کہ اس فضل وشرف میں آپ کا کوئی اور شریک وسہیم نہ ہوسکا۔ امام اعظم - حضرت امام ابوحنیفہؒ - کی طرف منسوب ہوکر اپنے لیے ''الاعظمی'' کی نسبت اختیار فرمائی[2]۔

علامہ اعظمیؒ نے جس خاندان اور جس ماحول میں آنکھیں کھولیں، وہ سامان عیش و

---

(۱) زمانۂ طالب علمی کے ایک خط میں خودکو ''ابوالفیض'' لکھا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتداءً اپنی کنیت ابوالفیض رکھی تھی، لیکن بعد میں اس کو چھوڑ کر ''ابوالمآثر'' اختیار کیا۔

(۲) علامہ اعظمیؒ نے مفتی محمد ظفیر الدین صاحب کو حدیث کی جو سند دی ہے، اس میں لکھا ہے: أبو المآثر حبيب الرحمان الأعظمي مذهباً. (المآثر جلد ۱، شمارہ ۳، ص: ۲۸) لیکن اپنی اس نسبت کا نہایت خوبصورت سبب مولانا ابوالوفا افغانیؒ کو لکھے ہوئے ایک خط میں بیان کیا ہے، لکھا ہے:

''اعظمی اسی طرح کی نسبت ہے، جس طرح کی عارف جامی کی نسبت ہے، فرماتے ہیں:

مولدم جام و رشحۂ قلمم — جرعۂ جام شیخ الاسلامی ست
زاں سبب در جریدۂ اشعار — بدو معنی تخلصم جامی ست

میرا بھی مولد تابع اعظم گڈھ میں ہے، اور امام اعظم رحمہ اللہ کا متبع ومقلد ہوں، اس لیے بدو معنی اعظمی ہوں''۔

راحت سے محروم، مال ومتاع اور مادی دولت سے خالی اور عاری تھا، سر چھپانے کو معمولی سا سفالہ پوش، خام اور نیم تاریک مکان تھا، اور دن بھر کی محنت ومشقت کے بعد کسی طرح نانِ شبینہ کا انتظام ہو جاتا، مگر اسی کے ساتھ اللہ نے ایک دوسری لیکن اس سے بڑی نعمت سے نوازا تھا، وہ دولت تھی خشیت الٰہی، خوف خدا، زہد وورع اور طہارت وتقویٰ، گھر کی پوری فضا دینداری، راستبازی اور مکارمِ اخلاق میں رچی بسی تھی۔ والد اور والدہ دونوں شریعت کے پابند، اتباع سنت میں طاق اور عبادت وطاعت میں فائق تھے۔ خاص کر والد کے متعلق تو یہ پڑھ ہی چکے ہیں کہ تعلیم وتربیت میں اپنے زمانہ میں فرد تھے۔ ان تمام عوامل نے ان کے نوخیز ذہن پر گہری چھاپ چھوڑی اور شخصیت کی تعمیر وتشکیل میں زبردست اور موثر کردار ادا کیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کوچۂ علم میں قدم رکھنے سے پہلے ہی دین ومذہب اور شریعت مطہرہ کی عظمت دل ودماغ میں بیٹھ چکی تھی، یہ نقش اولؔ تھا اس کے بعد جتنے نقوش مرتسم ہوئے ان کی حیثیت ثانوی تھی۔

بزرگوں کی دعائیں اور بشارتیں | علامہ اعظمیؒ کو اللہ رب العزت نے جو ذہانت وفطانت فطرتاً ودیعت فرمائی تھی، اس کے آثار وعلامات چہرے وبشرے سے بچپن میں ہی ہویدا تھے، جو لوگ قیافہ شناس تھے اور نگاہِ دوررس رکھتے تھے، انھوں نے پوشیدہ صلاحیتوں اور روشن وتابناک مستقبل کو کم سنی ہی میں بھانپ لیا تھا، انھوں نے دعائیں دیں اور سر پر شفقت کا ہاتھ پھیرا، چنانچہ اس قسم کے کچھ واقعات علامہ اعظمی نے اپنے قلم ایجاز رقم سے خود تحریر فرمائے ہیں، لکھتے ہیں:

"وقد شهد عظماء العلماء بجودة قريحتي والبراعة على أقراني في صغري، منهم: الشيخ ابوالبركات(١) بن عبدالله العراقي شيخ أبي، فانه كان

(۱) مولانا ابوالبرکات مئوی ۱۲۹۳ھ میں مئو میں پیدا ہوئے، مولانا عبدالغفار صاحب عراقیؒ کے چھوٹے اور مولانا ابوالحسن عراقیؒ بانی مدرسہ مفتاح العلوم کے بڑے بھائی تھے، ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی اس کے بعد نوانگر بلیا میں اپنے برادر بزرگ مولانا عبدالغفار صاحب سے مختلف علوم وفنون=

اذا رآنی یتمثل بقول الشاعر: اگر پدر نتواند پسر تمام کند ۰۰۰ ومنهم الشیخ عبد الحق البیلی بهیتی (۱)، فانه لما رأی خزانة کتب والدی سلمه الله، قال: هذا الصبی سیقدر هذه الکتب حق قدرها، ودعا لی الشیخ مولانا أشرف علی(۲) بالبرکة ومسح یده علی راسی وکنت اذ ذاك ابن خمس أو ست،

کی کتابیں پڑھیں اور بالآخر قطب العالم حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس سرہ کی خدمت میں حاضر ہو کر تکمیل علم کی، اس کے بعد درس و تدریس کا آغاز کیا، لیکن عمر نے زیادہ وفا نہ کی اور ۳۹ برس کے سن میں ۱۳۳۲ھ میں طاعون کی وباء میں وفات پائی۔

(۱) ان کا تذکرہ کہیں نہیں مل سکا، علامہ اعظمی کے اساتذہ میں تھے، آپ نے ان سے علم تجوید حاصل کیا تھا۔

(۲) حکیم الامت، مجدد طریقت و تصوف حضرت مولانا اشرف علی تھانوی ۱۲۸۰ھ (۱۸۶۲ء) میں تھانہ بھون میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم کے بعد ۱۲۹۵ھ میں دارالعلوم میں داخل ہوئے، اس وقت سے لے کر ۱۳۰۱ھ تک مسلسل دارالعلوم دیوبند میں رہ کر حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند اور دیگر اساتذہ دارالعلوم سے تعلیم حاصل کر کے فارغ ہوئے، فراغت کے بعد آپ کانپور کے مدرسہ میں مدرس مقرر ہوئے، وہاں چودہ سال تک درس و تدریس، وعظ و تقریر اور فتاویٰ کے ذریعہ علم و دین کی خدمت سر انجام دیتے رہے۔ ۱۳۱۵ھ میں کانپور سے ترک تعلق کر کے متوکلا علی اللہ خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون میں اقامت فرمائی اور اسی خانقاہ میں بیٹھ کر اصلاح امت اور تجدید دین کا عظیم ترین کارنامہ انجام دیا، مرشد کامل مرجع علماء و مشائخ حاجی امداد اللہ تھانوی مہاجر مکی سے بیعت ہوئے اور پھر خلیفہ بنائے گئے، اس راہ سے بے شمار افراد کی دینی رہنمائی فرمائی اور ان کو صراط مستقیم پر لگایا، آپ سے بیعت ہونے والوں کی صحیح تعداد کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا تصنیف و تالیف شب و روز کا مشغلہ تھا، قرآن پاک کا اردو میں ترجمہ کیا، بیان القرآن کے نام سے عالمانہ تفسیر لکھی، بدعات و خرافات اور مشرکانہ رسم و رواج کی دنیا میں آپ کے نام سے ہمیشہ زلزلہ برپا رہا، بہت سی بدعات و خرافات سے مسلمانوں کو نجات دلائی، ۱۶ رجب ۱۳۶۲ھ ۲۰ جولائی ۱۹۴۳ء کو ۸۲ سال کی عمر میں تھانہ بھون میں وفات پائی۔ (کاروانِ رفتہ ص ۳۵۔۳۴)

ومنهم : الشيخ عبدالغفار ،(۱) والشيخ الهمش كريم بخش السنبلي (۱) وأثنى على شيوخي بما في إجازاتهم فلتراجع."

(متعدد اہل علم نے میرے بچپن میں میری جودت طبع اور میرے ہمسروں پر میرے تفوق وبرتری کی شہادت دی ہے، جن میں میرے والد کے استاذ مولانا ابوالبرکات بن عبداللہ عراقی ہیں، وہ جب مجھے دیکھتے تو یہ مصرعہ پڑھتے ع

اگر پدر نتواند پسر تمام کند

انھیں میں مولانا عبدالحق پیلی بھیتی بھی ہیں، انھوں نے جب میرے والد کے کتب خانہ کو دیکھا تو فرمایا: یہ بچہ ان کتابوں کا پورا پورا حق ادا کرے گا۔ اور جس وقت میں پانچ سال کا تھا حضرت مولانا اشرف علی تھانوی نے میرے سر پر دست شفقت پھیر کر برکت کی دعا فرمائی، میری جودت طبع کی شہادت دینے والوں میں مولانا عبدالغفار صاحب اور مولانا کریم بخش صاحب سنبھلی بھی ہیں، اسی طرح میرے اساتذہ نے مجھے جو سندیں عطا فرمائی ہیں ان میں میری تعریف کی ہے)

ابتدائی تعلیم ہمارے پاس موجود تحریروں سے یہ گمان ہوتا ہے کہ آپ کی رسم بسم اللہ نسبتاً تاخیر سے شروع ہوئی تھی، خود آپ کی تحریروں سے پتہ چلتا ہے کہ ۱۳۲۸ھ یا ۱۳۲۹ھ میں مولانا ابوالحسن صاحب عراقی کے پاس قرآن کریم شروع کیا۔ والد ماجد چونکہ اعلیٰ درجہ کے تجربہ کار معلم اور بلند پایہ مربی تھے، لہذا تعلیم وتربیت کی ذمہ داری انھوں نے خود سنبھالی، اور ان کے پاس نیز حافظ عبداللہ عرف دُولہ کے پاس قرآن کریم پڑھا اور تقریباً ایک سال کی مدت (۱۳۲۹ھ) میں ختم کیا، تجوید کا ایک منظوم رسالہ مولانا عبدالحق پیلی بھیتی سے پڑھا اور اس کو زبانی یاد کیا۔ اردو اور فارسی کی ابتدائی کتابیں پند نامہ عطار تک والد محترم کے پاس پڑھیں، غالباً ۱۳۳۱ھ میں مولانا عبدالرحمن صاحب

(۱) ان حضرات کا ذکر آگے اساتذہ کے ذیل میں آئے گا۔

اورنگ آبادی کے پاس گلستان و بوستاں وغیرہ پڑھی۔ اس کے بعد دارالعلوم مئو میں داخل ہوئے اور وہاں فارسی کتابوں میں یوسف زلیخا، اخلاق محسنی اور سکندر نامہ وغیرہ کا درس لیا، عربی کی بعض ابتدائی کتابوں کا سبق مولانا عبدالعزیز مئوی اور مولانا محمد صابر مئوی (بلاقی پورہ) سے حاصل کیا۔ اس کے بعد مولانا ابوالحسن صاحب مئوی عراقی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا اور ان سے متعدد کتابیں مثلاً کافیہ، شرح جامی اور فصول اکبری وغیرہ پڑھی۔

علامہ اعظمی کے باقیات صالحات میں ایک نہایت بوسیدہ اور سال خوردہ کتاب ان کے ہاتھ کی نقل کی ہوئی ہے، اس پر لکھی ہوئی ایک عبارت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کچھ دنوں مولانا ابوالحسن صاحب کے پاس بہادر گنج میں بھی تعلیم حاصل کی، مذکورہ بالا تحریر کا جو فقرہ اس مقام سے متعلق ہے وہ یہ ہے:

"إني اذ كنت ببهادر گنج طالب العلم بها عندالمولوی اليلمعی مولانا وأستاذنا محمد ابوالحسن فی سلخ جمادی الأولیٰ سنة ۱۳۳٤ھ"

(یعنی جمادی الاولیٰ ۱۳۳۴ھ میں جس وقت میں اپنے استاد مولانا ابوالحسن صاحب کے پاس بہادر گنج میں طالب علمی کی زندگی گذار رہا تھا)

میرا خیال ہے کہ علم کی راہ میں گھر سے باہر نکلنے کا یہ پہلا موقع رہا ہوگا۔ مولانا ابوالحسن صاحب کے پاس صرف و نحو کی مشق و مزاولت، شوق و لگن کے ساتھ کر کے ٹھوس صلاحیت بہم پہنچائی، خود لکھتے ہیں: " وأتقن علم النحوو الصرف عند مولانا ابی الحسن السابق الذکر."

مدرسہ انجمن اسلامیہ گورکھپور میں | مولانا ابوالحسن صاحب عراقیؒ کے بڑے بھائی مولانا عبدالغفار صاحب عراقی مئوی اپنے وقت کے جلیل القدر عالم اور یکتا مدرس و مربی تھے، ان کو تربیت اور مردم سازی میں کمال حاصل تھا، علم و فضل کی شہرت تھی اور درس و تدریس کا آوازہ دور دور گونجتا تھا، ان کے زمرۂ تلامذہ میں بعض بڑی نامور شخصیتوں کے نام آتے ہیں، تقریباً دو دہائیوں تک بلیا کے قصبہ نوانگر کو علم کی روشنی سے منور رکھنے کے

بعد گورکھپور کے مدرسہ انجمن اسلامیہ میں ملازمت اختیار کرلی تھی، یہ مدرسہ خونی محلہ میں واقع تھا، یہاں آپ کے سرچشمۂ علم سے کسب فیض کرنے آپ کا وہ شاگرد پہنچا جس نے علم وادب کی تاریخ میں آپ کا نام زندہ جاوید کردیا، شاگرد کا خود بیان ہے:

"۱۹۱۶ء میں مولوی عبدالحی مرحوم(۱)، مولوی فاروق(۲)، مولوی

(۱) مولانا عبدالحی مرحوم کے والد کا نام سلامت اللہ تھا، جو اولیا سے مشہور تھے، مئو کے محلہ بھکاری پورہ کے باشندہ تھے، علامہ اعظمی کے ہم سبقوں میں تھے، مئو کے علاوہ دیوبند میں بھی کچھ مدت تک آپ کے ہم درس رہے، دیوبند کے علاوہ مینڈھو میں بھی تعلیم حاصل کی، مگر سند فراغت دارالعلوم مئو سے مولانا کریم بخش صاحب کے پاس کتب حدیث پڑھ کر ۱۳۴۱ھ میں حاصل کی۔ فراغت کے بعد ۱۳۴۳ھ میں پورہ معروف کے مدرسہ معروفیہ میں صدر مدرس مقرر ہوگئے اور ۱۳۵۵ھ تک لگاتار تیرہ سال مشکوٰۃ وجلالین وغیرہ کا درس دیتے رہے، پھر اس سے علحدہ ہوگئے اور ۱۳۵۶ھ میں اشاعت العلوم پورہ معروف کا قیام عمل میں آیا تو اس سے وابستہ ہوگئے اور سات برس یعنی ۶۳ھ تک اس میں درس وتدریس کا کام انجام دیتے رہے، ذی قعدہ ۱۳۶۳ھ میں وفات پائی، شوال ۱۳۵۲ھ سے ۱۳۵۵ھ تک مدرسہ معروفیہ سے آپ کی زیر ادارت ایک ماہنامہ المعروف بھی نکلا۔ پورہ معروف کے متعدد اہل علم ان کے شاگردوں میں ہیں (دیکھئے تذکرۂ علماء اعظم گڈھ ص ۱۳۹-۱۳۸ ماہنامہ ترجمان دارالعلوم اکتوبر ۹۶ء ص ۲۷)

(۲) مولوی محمد فاروق بن عصمت اللہ بن عبدالغفور بن منور ۱۳۱۸ھ میں پیدا ہوئے، ۲۷ھ میں قرآن شریف پڑھنا شروع کیا، ابتدائی تعلیم قدیم طرز پر گھریلو معلموں کے پاس حاصل کی اردو فارسی کتابیں دارالعلوم مئو اور بمبئی میں پڑھیں، بمبئی سے مئو واپس آئے اور دارالعلوم مئو میں دوبارہ داخل ہوکر گلستاں بوستاں پڑھنے کے بعد عربی پڑھنا شروع کی اور ملا تک کا نصاب وہیں پورا کیا، پھر کچھ دن الہ آباد میں رہے اور وہاں سے واپس پھر مئو آئے، علامہ اعظمی اور دیگر ہم سبقوں کے ساتھ دیوبند گئے، اور بیمار ہوکر واپس آئے، اور بالآخر دارالعلوم مئو سے ۱۳۴۱ھ میں فارغ ہوئے۔ فراغت کے بعد درس۔ تدریس شروع کی مگر چار پانچ مہینوں بعد یہ مشغلہ ترک کردیا، کچھ دنوں بعد طب کی =

عبداللطیف اور میں نے- ملا کا امتحان دینے کیلئے اس کا کورس پڑھنا شروع کیا، مگر چند ہی دنوں میں ان لوگوں کا ساتھ چھوڑ کر میں حضرت مولانا عبدالغفار صاحب عراقی مئوی کے ساتھ گورکھپور چلا گیا، اور اپنے مناسب حال درس نظامی کی کتابوں میں شریک ہو گیا۔"(۱)

گورکھپور ۱۳۳۴ھ مطابق ۱۹۱۶ء کے اواخر، یا ۱۳۳۵ھ کے اوائل میں پہنچے، والد محترم بذریعہ خط خبر گیری فرماتے رہتے، چنانچہ ایک خط میں، جو ۴ر صفر ۱۳۳۵ھ بروز جمعہ کا مکتوب ہے، لکھا ہے:

"بعد دعوات مزید حیات وترقی درجات کے واضح ہو کہ یہاں بفضلہٖ تعالیٰ خیریت ہے، صحتوری آں عزیز از بارگاہ رب العزت مطلوب۔ پوسٹ کارڈ آں عزیز باعث طمانینت و مسرت ہوا، حالات مندرجہ سے واقفیت ہوئی، ۰۰۰۰۰ دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ تم کو امتحان میں کامیاب کرے۔"

باپ کو بیٹے اور جگر پارے کی کس قدر فکر دامن گیر رہتی تھی اور ان کو تحصیل علم کی خاطر محنت و مشقت اور جد وجہد کیلئے کس طرح ترغیب دیتے رہتے تھے، اس کا نمونہ ایک دوسرے مکتوب میں ملاحظہ ہو:

"۰۰۰ پوسٹ کارڈ تمہارا آیا، حال معلوم ہوا، دنیا دار المحن ہے، مصائب خواہ بواسطۂ خلق، یا بے واسطہ منجانب اللہ ہوں اوس پر صبر کرنا چاہئے:

وانی لصبار علی ما ینوبنی و حسبك أن الله قد أثنی علی الصبر

= طرف میلان ہوا اور لکھنؤ جاکر تکمیل الطب کا کورس کیا، اور مشغلۂ طبابت عمر بھر جاری رکھا۔

مولانا نہایت خوشحال اور فارغ البال گھرانے کے چشم وچراغ تھے، کپڑے کی تجارت تھی اور کاروبار وسیع پیمانے پر پھیلا ہوا تھا، بمبئی و کلکتہ میں ان کی دوکانیں تھیں۔ مگر اس دولت فراواں کے باوجود بڑے علم دوست، سادہ لوح اور خدا ترس تھے، علامہ اعظمی کے بڑے شیدائی تھے۔ اگست ۱۹۸۳ء میں وفات پائی۔

(۱) تذکرہ مولانا عبداللطیف نعمانی ص۹

اللہ تعالیٰ استقلال اور تحمل عنایت کرے۔ تم اپنے کام میں چست رہو، علم کا شوق ولذت حاصل کرو سب آسان ہو جائے گا:

وسھری لتنقیح العلوم ألذ لی　　من صوت غانیة و طیب غنائی
و صریر اقلامی علی صفحاتھا　　أشھی من الدوکاہ و العشاق

”جو اپنے کام میں پوری طرح مشغول ہوتا ہے اوسے دوسری جانب التفات برا معلوم ہوتا ہے....“

مذکورہ بالا خط ۱۵ ربیع الآخر ۱۳۳۵ھ کا نوشتہ ہے، اس پر ڈاکخانے کی جو مہر ثبت ہے وہ فروری ۱۹۱۷ء کی کسی تاریخ کی ہے جو نہایت مبہم اور ناصاف ہے۔

مولانا محمد صابر صاحب کا ایک اور مکتوب ملاحظہ ہو جو مولانا عبد الغفار صاحب کے نام انجمن اسلامیہ گورکھپور ہی کے پتہ پر روانہ کیا گیا ہے، لیکن تاریخ سے عاری ہے، لکھتے ہیں:

”ہر حال میں اللہ تعالیٰ کا شکر ہے، ہم لوگ مع الخیر ہیں، صحتوری مزاج وہاج کے طالب ہیں۔ مدعائے ضروری یہ کہ برخوردار حبیب الرحمٰن سلمہ کا خط آج آیا ہے، لکھا ہے مجھ کو بخار آتا ہے، طبیعت گھبراتی ہے، شہر میں طاعون ہے۔ جب سے یہ خط آیا ہے دل کو سخت تشویش ہے، جی چاہتا ہے دوڑا چلا آؤں اور حبیب الرحمٰن کو مکان پر لاؤں آج کل بیماری کے سبب سے دل بہت چھوٹا ہو رہا ہے، ابھی خط لکھا ہی جا رہا ہے کہ جناب حضرت مولانا ابوالفضل امام الدین پنجابی(۱) صاحب کے رحلت کی خبر آگئی، تجہیز و تکفین کی غرض سے جا رہا ہوں، دل مشوش ہے، لکھا نہیں جاتا ہے، عرض یہ ہے کہ حبیب الرحمٰن کو جلد مکان پر بھیج دیجئے، اگر آنے میں توقف ہو تو جوابی کارڈ ارسال ہے، جواب سے مشرف کیا جاؤں۔“

(۱) مولانا ابوالفضل امام الدین پنجابیؒ ایک جہانگرد مجذوب صفت بزرگ تھے، مشہور محدث مولانا =

اغلب یہ ہے کہ یہ خط ۲/ جمادی الاخری ۱۳۳۵ھ کا تحریر کردہ ہے، کیونکہ جس

= احمد علی سہارنپوری کے شاگرد تھے، گھومتے پھرتے مئو پہنچے اور یہیں کے ہو رہے ،ان کے بارے میں صاحب تذکرۂ علماء حال نے لکھا ہے "آپ کا وطن اصلی تو پنجاب ہے لیکن بالفعل، آپ قصبہ مئو ضلع اعظم گڈھ میں مقیم ہیں، آپ شاگرد جناب مولانا احمد علی صاحب سہارنپوری ہیں" (ص ۱۵) مئو کے بہت سے اہل علم نے آپ سے اکتساب کیا جن میں مولانا عبدالغفار صاحب عراقی اور مولانا سلطان احمد صاحب مشہور ہیں، آپ نے شہر کی شاہی جامع مسجد میں کچھ دنوں درس دیا جس سے لوگوں نے ان کو بانی مدرسہ مفتاح العلوم سمجھ لیا، اس کی تحقیق آگے مفتاح العلوم کے تذکرے میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے ۔ علامہ اعظمی نے نزہۃ الخواطر (۸/ ۶۷) کے حاشیہ پر استدراکا لکھا ہے : " مولانا امام الدين الفنجابي : هاجر من بلاده و توطن أدري، تلمذ عليه شيخنا عبدالغفار العراقي و كثيرون من علماء مئو ، درس في اله داد پوره وجامع (كتره) زرته مراراً، وكان يتمنطق برداء أو كساء ، ولا تزال في يده عكازة كبيرة ، وكان يفترش كساءه في المسجد تحت الساعة ويصلي عليه، وكان لا يقيم اللغة الأردية، ولا ياكل من طعام احد إلا نادراً وكانت فيه حدة، واعتراه يبس في دماغه في أخرة، وكان يجوب البلاد، زار النواب صديق حسن فظنه مسكينا سائلا ، فعين له سبع ربابي(جمع ربية) شهريا ، كان يانس الى ابي وربما أتى بيتنا ."

یعنی مولانا امام الدین پنجابی نے اپنے وطن سے ہجرت کی اور ادری کے قریب مقیم ہوگئے، آپ کے پاس ہمارے استاد مولانا عبدالغفار عراقی اور مئو کے بہت سے علماء نے زانوئے تلمذ تہ کیا، الہ داد پورہ اور جامع مسجد کٹرہ میں درس دیا، میں نے ان کی بارہا زیارت کی ہے، کسی کپڑے یا چادر کو کمر کے گرد لپیٹے رہتے تھے ان کے ہاتھ میں ہر وقت ایک بڑی سی چھڑی رہتی، اپنی چادر مسجد میں گھڑی کے نیچے بچھالیتے اور اس پر نماز پڑھتے، اردو زبان صحیح نہیں بول پاتے تھے ،اور شاذ و نادر کسی کا کھانا کھاتے، مزاج میں تیزی تھی اور اخیر عمر میں دماغ میں خشکی پیدا ہو چلی تھی، شہر شہر گھومتے، نواب صدیق حسن خاں صاحب سے ملاقات کی تو انھوں نے ان کو مسکین اور سائل سمجھ کر ۷/ روپے ماہوار وظیفہ مقرر کردیا، میرے والد سے مانوس تھے ،اور کبھی کبھی ہمارے گھر بھی تشریف لاتے۔"

دن یہ خط لکھا گیا ہے اس دن مولانا امام الدین پنجابی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات ہوئی ہے، اور علامہ اعظمی نے "وفیات الاعیان" پر مشتمل اپنی بیاض میں ان کی تاریخ وفات بھی تحریر فرمائی ہے، لکھا ہے:

"مولانا امام الدین پنجابی ۲ر جمادی الاخری ۱۳۳۵ھ قبر در احاطہ مسجد پورہ الہ داد"

مدرسہ مظہر العلوم بنارس میں علامہ اعظمیؒ کو اپنے استاد سے بڑا گہرا تعلق اور بھرپور قلبی لگاؤ تھا، آپ قدم بہ قدم حق شاگردی ادا کرنے کی کوشش کرتے، خدمت کرتے اور شراب علم کشید کرتے۔ شدہ شدہ ایک سال کا عرصہ گورکھپور میں گذارا، دوسرے سال مولانا عبدالغفار صاحبؒ گورکھپور چھوڑ کر بنارس چلے گئے اور وہاں کے قدیم مدرسہ مظہر العلوم میں بصیغۂ تدریس ملازم ہو گئے، کچھ ہی دنوں کے بعد شاگرد رشید بھی پہونچے، اور طالب علموں کی صف میں شامل ہو گئے، علامہ اعظمیؒ خود رقمطراز ہیں:

"لیکن جب گورکھپور سے (غالباً) ۱۹۱۷ء کے اواخر میں مولانا عبدالغفار صاحب بنارس منتقل ہو گئے تو میں بھی ان کی خدمت میں پہنچا اور مدرسہ مظہر العلوم سے ۱۹۱۸ء میں "ملا" کا اور مارچ ۱۹۱۹ء میں "ملا فاضل" کا امتحان دیا" (۱)

علامہ اعظمیؒ کے والد محترم کو مولانا عبدالغفار صاحب کی ذاتِ گرامی پر مکمل اعتماد تھا، اور ان کے طریقۂ تعلیم و طرز تربیت سے پوری طرح مطمئن اور خوش تھے، اور اپنے فرزند کو اس طرح ان کے سپرد کیا گویا وہ انھیں کے ہو رہے:

سپردم بتو مایۂ خویش را — تو دانی حساب کم و بیش را

چنانچہ ۱۷ر ستمبر ۱۹۱۷ء کو بنارس کے پتے پر صاحبزادے سلمہ کو لکھتے ہیں:

"دیگر احوال یہ ہے کہ خط آیا حال معلوم ہوا، پڑھنے کے باب میں جو مولانا کی رائے ہو وہ کرو، اور آنے کے باب میں میری طرف سے اجازت ہے مگر اس میں بھی مولانا کی رائے ضروری ہے..."

(۱) تذکرۂ مولانا عبداللطیف نعمانی ص ۱۰

والد محترم کی تنبیہ و تاکید اور توجیہ و تربیت کا انداز ایک اور خط میں ملاحظہ فرمائیں:

"مدعا ضروری یہ کہ دو تین روز سے بندہ کی طبیعت کسی قدر ناساز ہے، بخار اور درد اعضاء میں مبتلا ہوں، آج بفضلہ تعالیٰ طبیعت اور دنوں سے اچھی ہے۔ اس کی وجہ معلوم نہیں ہوئی کہ جب سے تم گئے ہو کوئی خط کیوں نہیں لکھا؟ شاید تم کو خیال میری باتوں کا ہے، لڑکوں کو ایسا خیال کرنا دلیل ہے اونکی کم فہمی کی، والد واستاد کی خفگی لڑکوں اور شاگردوں کے حق میں رحمت ہے، " ضرب الصبیان کالماء فی البستان" تو مثل مشہور ہی ہے، حدیث شریف میں بھی وارد ہے: " لا ترفع عصاك عنهم" یعنی چھڑی اولاد سے الگ نہیں رکھنا چاہئے، ہر وقت تنبیہ کرتے رہنا چاہئے۔ جب خود شارع علیہ السلام کا حکم ہے تو یہ نہیں ہوسکتا کہ اولاد کو تنبیہ نہ کیا جائے، اب اگر اولاد فہیم ہوں تو سمجھیں ورنہ وہ جانیں انکا کام جانے، دیکھو جن لوگوں کے والدین اولاد کی تنبیہ سے غافل ہیں اونکی کیا حالت ہے! اور جن کی تنبیہ ہوتی رہتی ہے وہ کیسے ہیں!"

علامہ اعظمیؒ جس طرح خود طلب علم میں محنت و مشقت برداشت کرتے، آبلہ پائی و بادیہ پیمائی کرتے، اسی طرح دوسروں کو بھی اس بات کی ترغیب دیتے رہتے، اور اسی ترغیب و تحریک کے جواب میں قصبہ بہادر گنج کے مولوی عبدالرشید صاحب نے ۱۷ صفر ۱۳۳۶ھ کو علامہ اعظمیؒ کے پاس بنارس کے پتہ پر درج ذیل خط لکھا:

"برخوردار من! نصیحت گری کچھ عمر پر مبنی نہیں، لیاقت اور علم و عمل کے اعتبار سے ہوتی ہے، پھر تمہاری یہ تحریر کہ اپنے اصلی وطن کو چھوڑو تو البتہ علم کی بہار دیکھو! تو ہم نے تمہاری نصیحت بسر و چشم قبول کیا، بایں شرط کہ اپنے مدرسہ میں ہم لوگ کے جاگیر کا انتظام کرو، شاید بوجہ تمہاری طبیعت لگ جائے...."

امتحان ملا و ملا فاضل | مدرسہ مظہر العلوم بنارس کے اندر آپ کی مدت طالب علمی دو

سال رہی، اس دوران آپ ملا (۱۹۱۸ء) اور مُلا فاضل (۱۹۱۹ء) کے امتحانات میں شریک ہوئے، اس وقت کے امتحانات آج کل کی طرح محض خانہ پری کیلئے نہیں ہوا کرتے تھے، اور نہ ہی اتنے سہل اور آسان ہوتے کہ ہر کس وناکس بلا تامل وتردد شریک ہو جاتا، بلکہ اس کے برعکس اتنے سخت اور حوصلہ شکن ہوتے کہ طالب علم کو سوچ کر ہی پسینہ آجاتا، اور ہمت اس کا ساتھ چھوڑ بیٹھتی، جس سال علامہ اعظمیؒ ملا فاضل کے امتحان میں شریک ہوئے اس سال پورے یوپی میں صرف تین طالب علم سیکنڈ ڈویژن سے کامیاب ہوئے، چنانچہ آپ کے ایک دوست مولانا بشیر احمد صاحب مئویؒ ۷ر مئی ۱۹۱۹ء مطابق ۶ر شعبان ۱۳۳۷ھ کو یہ خط لکھتے ہیں:

"... گزارش یہ ہے کہ عرصہ سے نہ تو کوئی آپ کا سرفراز نامہ آیا، نہ میں ہی نے کوئی خط لکھا، شکایت کس طرف سے ہو؟ عوض معاوضہ گلہ ندارد، ہمارے جناب ماسٹر صاحب پاس ہوگئے۔ شاید فیض الحسن (۱) نے لکھا بھی ہوگا اور

(۱) مولانا فیض الحسن فیض ۱۸۹۶ء میں پیدا ہوئے۔ تعلیم دارالعلوم مئو اور مدرسہ سبحانیہ الہ آباد میں حاصل کی، فراغت کے بعد ۱۹۲۱ء میں درس وتدریس کا آغاز کیا، اور متعدد مقامات مثلا بون پور، سہارنپور، فرخ آباد، غازی آباد، اور مرزاپور کے سرکاری اسکولوں میں تدریسی خدمات انجام دیں، ۱۹۵۵ء میں ملازمت سے ریٹائر ہوئے۔ شاعر تھے، فیض تخلص تھا اور وسیم خیر آبادی و نواب جعفر علی خاں اثر لکھنوی سے مشورۂ سخن کرتے تھے۔ (تذکرہ سخنوران مئو ص ۱۳۔ ۱۲)

مولانا فیض الحسن علامہ اعظمی کے خاص احباب میں تھے، غالباً ان کے ہم درس بھی تھے، دونوں بزرگوں میں مضبوط دوستانہ روابط تھے، خط وکتابت کا سلسلہ زمانۂ طالب علمی ہی سے قائم تھا۔ طالب علمی میں ایک دوسرے کو زیادہ تر خطوط عربی میں لکھا کرتے تھے، چنانچہ اس زمانے کے بعض یادگار خط اب بھی بحمد اللہ محفوظ ہیں، شاعری بہت عمدہ کرتے تھے، انکے اس وقت کے خطوط جب وہ بسلسلۂ ملازمت متعدد مقامات پر مقیم رہے زیادہ تر شعروں اور غزلوں پر مشتمل ہیں، بلکہ بعض خط تو ایسے ہیں جس میں غزل یا نظم کے علاوہ نثر کا ایک لفظ بھی نہیں، خطوط کے مطالعہ سے ان کی سخن سنجی و سخن فہمی کے علاوہ طبیعت کی روانی اور دراکی کا بھی پتہ چلتا ہے۔ ۱۹۷۱ء میں وفات پائی۔

شاید ہم سے پہلے ہی آپ کو اس بات کی خبر ہوئی ہو گی کہ آپ فاضل میں سیکنڈ پاس ہوئے ہیں، اور عبدالحی بھی سیکنڈ پاس ہوئے ہیں، بڑی خوشی کی بات ہے، کل سیکنڈ تین ہیں، جس میں دو مئو کے ایک لکھنؤ کا طالب علم ہوا ہے ع

رہے گا خلد میں بھی یاد اب مئو برسوں

یہاں پھر مشاعرہ شروع ہو گیا، پہلے مشاعرہ میں یہ طرح تھی:

روئے روشن کا کسی کے انتظار ان کو بھی ہے

اور اب کی جو مشاعرہ کل ہونے والا ہے اوسکی طرح یہ ہے:

نہ یہ غرض تھی کہ جینا حرام ہو جائے

اور اس کے بعد والے مشاعرہ میں جو طرح مقرر ہو گی انشاء اللہ اس کو لکھوں گا، امید کہ آپ بھی کہہ کر مشاعرہ کے وقت پر ارسال فرمادیں گے، اور کیا عجب کہ آپ آئندہ مشاعرہ میں رونق افروز ہی ہوں، آپ کب تک تشریف فرما ہوں گے؟"

مدرسہ مظہر العلوم بنارس میں آپ کے دور طالب علمی کے یادگار تبرکات میں نحو کی ایک کتاب أوضح المسالك الى الفية ابن مالك پر آپ کے جابجا تحریر کردہ حواشی ہیں، مولانا مجیب الغفار صاحب استاذ مدرسہ مظہر العلوم اپنے ایک مضمون میں فرماتے ہیں:

حضرت ابوالمآثر رحمۃ اللہ علیہ کے مظہر العلوم کے ساتھ گوناگوں قلبی تعلقات کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ نے ان کے کچھ مآثر علمیہ اور یادگاروں سے بھی جامعہ کو نوازا ہے، ان میں سب سے زیادہ اہم "أوضح المسالک الی ألفیۃ ابن مالک" تالیف العالم الشہیر جمال الدین أبی محمد عبداللہ بن یوسف بن ھشام الأنصاری ہے، جو ان کی مفید تعلیقات سے مزین ہے اور جامعہ مظہر العلوم کے کتب خانہ کی زینت بنی ہوئی ہے، یہ تعلیقات سرورق سے لیکر کتاب کے صفحہ ۱۸۶ تک نہایت جلی اور عمدہ خط میں پھیلی ہوئی ہیں، ہر تعلیق کے بعد ان کا دستخط موجود ہے، کہیں حبیب بن الصابر تو کہیں حبیب الرحمٰن، اور کسی جگہ

حبیب الرحمٰن الاعظمی، حبیب الرحمٰن المئوی ہے تو دوسری جگہ حبیب بن المولوی محمد صابر ثبت ہے۔ مولانا کی تعلیقات کے ساتھ مزین یہ گرانمایہ کتاب فن نحو کے رجسٹر کے اندر ۳/۷ میں درج ہے۔ مولانا کی یہ تعلیقات ان کے طالب علمی یا مدرسی کے دور کی معلوم ہوتی ہیں، میرا رجحان دور طالب علمی ہی کی طرف ہے اس لئے کہ ۳۰؍ جنوری ۱۹۱۹ء جیسا کہ نیچے آرہا ہے ان کی طالب علمی ہی کا دور ہے۔ واللہ اعلم

کتاب کے آخر میں بانسی کاغذ پر ان کے دو شعر بھی مع ان کے دستخط کے مرقوم ہیں، لکھتے ہیں۔ لأختر من سکنة منو

ے مرے نصیب کہ وہ خود ہی حال دل پوچھیں
اثر ضرور ہے کچھ نالۂ سحر میں بھی

ایضاً اس آسمان کا رخ پھیر دوں جدھر چاہوں
دیا ہے یہ طپش دل نے اختیار مجھے" (۱)

دار العلوم دیوبند میں | غالباً بنارس میں دور طالب علمی کے یہ آخری ایام رہے ہوں گے۔ اس کے بعد مدارس دینیہ کے دستور کے مطابق تعطیل کلاں ہوئی ہو گی، ایک ڈیڑھ مہینہ کا عرصہ والدین کے سایۂ لطف و کرم میں گھر کی تربیت گاہ پر گذرا ہو گا، ہندوستان کے دینی مدارس کے طلبہ کیلئے عمر کا یہ وہ مخصوص مرحلہ ہوتا ہے، جب دیوبند کا شوق طاری ہوتا ہے، اور ہر طالب علم کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اس کا داخلہ دار العلوم دیوبند میں ہو اور وہ اپنی زندگی کے کچھ ایام وہاں کی روح پرور اور ایمان افروز فضا میں گذارے، اور وہاں کے علمی سوتوں سے بقدر توفیق الٰہی اپنی روح کو سیراب کرے۔ جاذبۂ شوق نے علامہ اعظمی کو بھی کھینچا اور وہ رخت سفر باندھ کر دیوبند کیلئے نکل کھڑے ہوئے، فرماتے ہیں:

(۱) ترجمان الاسلام ص ۶۲۔۶۱ جنوری۔ مارچ ۹۳ء

"شوال ۱۳۳۷ھ غالباً جولائی ۱۹۱۹ء میں، میں نے دارالعلوم دیوبند میں پہلی دفعہ داخلہ لیا" (۱)

دیوبند آپ دسویں شوال کی شب میں پہنچے، جولائی کی غالباً ۹؍ تاریخ تھی، کیونکہ ایک خط میں جسے اپنے رفیق عزیز مولوی فیض الحسن صاحب مئویؒ کے نام تحریر فرمایا ہے، مؤرخہ ۱۹؍ شوال مطابق ۱۸؍ جولائی ۱۹۱۹ء کو ارقام فرماتے ہیں:

ثم لا يخفى عليك أيها الحبيب اللبيب أن أخاك قد وصل الى دارالعلوم الواقعة في ديوبند في الليلة العاشرة من شهر شوال"

ترجمہ: اے میرے دانا دوست تجھے یہ بات معلوم ہونی چاہئے کہ تیرا رفیق دس شوال کی شب میں دیوبند پہنچا۔

امتحان داخلہ حضرت مولانا رسول حسن خاں صاحبؒ نے لیا، اور جن کتابوں کا امتحان ہوا، ان میں ہدایہ اور شرح سلم تھی، جیسا کہ مولانا فیض الحسن صاحب کے خط میں مذکورہ بالا عبارت کے بعد معاً تحریر فرماتے ہیں:

"فامتحنه المولوى رسول خان الفنجابى فى الهداية وفى شرح سلم لملا حسن ففاز أخوك"

یعنی تیرے اس دوست کا امتحان ہدایہ اور شرح سلم کا مولوی رسول خاں صاحب پنجابی نے لیا، اور وہ کامیاب ٹھہرا۔

یہ خط مولوی عین الحق صاحب سیوانی کی معرفت ارسال کیا گیا، اور مذکورہ بالا دونوں خطوط پر مرسِل اور مرسَل الیہ کا جو پتہ درج ہے وہ حجرہ نمبر ۳۹ کا ہے، اس کے بعد آپ کو جو خطوط لکھے گئے ■ حجرہ نمبر ۹۵ کے پتہ پر روانہ کئے گئے۔ غالباً آپ کا قیام عارضی طور پر مولوی عین الحق صاحب سیوانی کے پاس رہا ہوگا اور کمرے کا تعین آپ کیلئے بعد میں ہوا ہوگا۔

---

(۱) تذکرۂ مولانا عبداللطیف نعمانی ص ۱۰

آپ کے ہمعصروں اور ہم عمروں میں جو لوگ اس وقت زیر تعلیم تھے، ان میں مئو کے جن حضرات کا ذکر ہے وہ یہ ہیں:

"وههنا من معارفك المولوی عبدالحی، والمولوی محمد فاروق، والمولوی نثار الدین، والمولوی عبداللطیف وأیوب ....."

یعنی جو لوگ یہاں آپ کے شناسا ہیں ان میں مولوی عبدالحی، مولوی محمد فاروق، مولوی نثار الدین، مولوی عبداللطیف اور مولوی ایوب ہیں۔

جو کتابیں اس وقت آپ کے شامل درس تھیں ان کے بارے میں لکھا ہے:

"والآن تحت تدرسی کتب الذیل: الهدایة، وملا حسن، والمیبذی، والمقامات الحریریة، والجلالین."

یعنی جو کتابیں میں اس وقت پڑھ رہا ہوں وہ ہیں: ہدایہ، ملا حسن، میبذی، مقامات حریری اور جلالین۔

فصلی بیماری دیوبند میں اس سال فصلی بیماری چلی، اور یہ وبا اتنی متعدی ثابت ہوئی کہ اس کی زد میں مئو کے کئی احباب آگئے اور ان کو مجبوراً مئو واپس آنا پڑا، اس کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں:

"اسی سال مولوی عبداللطیف بھی دیوبند گئے تھے، مگر وہ میرے بعد پہونچے تھے، ان کا داخلہ ہو گیا تھا، اسباق ہو رہے تھے کہ مدرسہ میں فصلی بیماری پھوٹ پڑی، اور مولوی عبداللطیف اور ان کے رفقاء مولوی عبدالحی اور مولوی فاروق تینوں زد میں آگئے، مجبوراً تینوں کو گھر واپس ہونا پڑا۔"(۱)

دیوبند کی آب وہوا علامہ اعظمی کو بھی راس نہیں آرہی تھی، اور وہاں پہونچ کر بھی شروع ہی سے مختلف عوارض میں مبتلا رہے، علم کا ذوق اور آگہی کی طلب تھی جو ان کو

(۱) تذکرۂ مولانا عبداللطیف نعمانی ص۔۱۰

پابہ رکاب رکھتی تھی، ورنہ گھر کے حالات بھی کچھ اطمینان بخش نہیں تھے، نہ صرف یہ کہ اطمینان بخش نہیں تھے، بلکہ تشویشناک بھی تھے، جیسا کہ والد محترم ۱۷ ذی قعدہ ۱۳۳۷ھ مطابق ۱۷/ اگست ۱۹۱۹ء کو لکھتے ہیں:

"بخار آنے پھر شفا پانے کا حال معلوم ہوا، اللہ کا ہر حال میں شکر ہے ..
بندہ کو بھی بخار آگیا تھا، دو تین ہفتہ مبتلا رہا، اب بفضلہ تعالیٰ شفا نصیب ہوئی، کئی جمعہ کے بعد آج جمعہ پڑھنے گیا تھا، ورنہ ضعف سے جانا دشوار تھا، بہر کیف خدا کا شکر ہے کہ اب اچھی طبیعت ہے، البتہ ضعف باقی ہے۔
.... مریم کی حالت سابق دستور ہے، جب اوٹھایا جاتا ہے تو اٹھتی ہے، اللہ تعالیٰ شفا بخشے، باقی سب لوگ مع الخیر ہیں ..."

تھانہ بھون حاضری اور حضرت تھانوی سے بیعت اس سال غالباً ذی الحجہ کی تعطیل میں علامہ اعظمی نے تھانہ بھون کا سفر کیا، تھانہ بھون حاضری کا مقصد محض حضرت تھانوی سے ملاقات اور ان کی زیارت تھا، لیکن وہاں جاکر بیعت جیسی نعمت کبریٰ سے شرفیاب ہوئے، جس کی تفصیل تصوف کے باب میں آئے گی۔

بیماری کی شدت اور وطن واپسی بیماری کا زور، روز بروز بڑھتا گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے تشویشناک صورت اختیار کر گئی (۱) والد محترم بھی اس صورتحال سے متفکر اور پریشان خاطر تھے، اپنی بے چینی کا اظہار انھوں نے ۱۴ محرم ۱۳۳۸ھ م ۱۰/ اکتوبر ۱۹۱۹ء کے ایک مکتوب میں اس طرح کیا:

"دستی خط و پوسٹ کارڈ دونوں پہونچے، حالات دریافت ہوئے " لکل شئی آفة

(۱) یہ فصلی بیماری اس قدر شدید تھی کہ اس کا شکار ہو کر کئی طالب علم اور دار العلوم کے ایک استاذ مولانا غلام رسول ہزاروی اس بیماری میں جاں بحق ہو گئے۔ سید محبوب رضوی تاریخ دار العلوم (۱/ ۲۵۲) میں ۱۳۳۷ھ کے حادثات میں لکھتے ہیں: "دیوبند میں اس سال انفلوئنزا کی بڑی شدت تھی، ایک مہینہ سے زیادہ دار العلوم بند رہا، آٹھ دس طالب علم انفلوئنزا کی نذر ہو گئے"

وللعلم آفات" کا مضمون ہے، دیکھئے اللہ تعالیٰ کو کیا منظور ہے۔ فاروق و عبدالحی وغیرہ کے آنے سے دل کو تشویش ہوئی، جس سے معلوم ہوا کہ بیماری کی کثرت ہے، اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے رحم فرماویں اور ہر پریشانی رفع کریں اور علم کی ترقی کی صورت پیدا کریں۔"

وہی ہوا جس کا ڈر تھا، چند ہی دنوں بعد خود علامہ اعظمی بھی بیماری کی لپیٹ میں آگئے، علالت شدید تر ہوتی گئی، اور وطن واپسی کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا، لکھا ہے:

"اس سال بیماری کا بہت زور تھا، ان لوگوں کے جانے کے ایک ماہ بعد میں بھی سخت بخار میں مبتلا ہوا، میری حالت تشویشناک دیکھ کر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی (۱) نائب مہتمم (دارالعلوم دیوبند) نے مولوی یعقوب سکروری کے ساتھ مجھے گھر بھیج دیا، کرایہ کے پیسے پاس میں نہیں تھے، تو مہتمم صاحب نے دفتر سے قرض دلوا دیا جس کو آنے کے بعد والد صاحب نے ادا کیا" (۲)

(۱) مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی، مولانا فضل الرحمٰن عثمانی کے خلف الرشید تھے، تعلیم تمام تر دارالعلوم میں حاصل کی، اور وہیں سے ۱۳۰۰ھ میں سند فراغت حاصل کی اور علم و عمل کی دنیا میں باکمال بن کر چمکے متبحر عالم اور عربی زبان وادب کے اداشناس ادیب تھے۔ آپ کی شخصیت ہمہ جہت اور علم و فضل مسلم تھا، وفور علم کے ساتھ انتظام وانصرام اور نظم و نسق کا ملکہ بھی بدرجہ اتم تھا، ۱۳۲۵ھ م ۱۹۰۷ء میں آپ نے دارالعلوم دیوبند کے نیابت اہتمام کا عہدہ سنبھالا، بلکہ یہ منصب مجبور کرکے آپ کے سپرد کیا گیا، اور آپ نے بھی اس ذمہ داری کو اس خوبی سے نبھایا کہ نیابت اہتمام کا آپ کا دور مثالی دور مانا گیا، سیاست میں بھی ثاقب نظر رکھتے تھے، صاحب تصنیف تھے اور تصانیف میں "اشاعت اسلام" معروف بہ "دنیا میں اسلام کیوں کر پھیلا؟" اپنے موضوع پر معرکۃ الآراء خیال کی جاتی ہے۔ ۴؍رجب ۱۳۴۸ھ م ۱۹۲۹ء کی شب میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ (دیکھئے تاریخ دارالعلوم ۲: ۶۰-۵۸)

(۲) تذکرۂ مولانا عبداللطیف نعمانی ص ۱۱

مدرسہ مظہر العلوم بنارس میں بحیثیت مدرس وطن واپسی کے بعد جب صحتیاب ہوئے ہیں تو ابھی تعلیمی سال کے کئی مہینے باقی تھے، اور آپ بے سبب یہ سال ضائع نہیں کرنا چاہتے تھے، اس لئے مظہر العلوم بنارس کے ارباب بست وکشاد سے بغرض تدریس سلسلہ جنبانی کی، منتظمین مدرسہ نے، جو آپ کی صلاحیتوں سے بخوبی واقف تھے، اس پیشکش کا خوشی سے خیر مقدم کیا اور آپ کی درخواست منظور کرتے ہوئے ناظم مدرسہ جناب مولوی صفی الرحمٰن صاحب نے آپ کے پاس ۲۲ر جنوری ۱۹۲۰ء کو یہ خط روانہ کیا:

”آپ کے اس ارادہ سے میں بہت خوش ہوا، آپ مدرسہ میں تشریف لاکر طلبہ کو تعلیم دیجئے وخود بھی مولانا عبدالرشید صاحب سے تکمیل فرمایئے۔۔۔“

کچھ پس وپیش کے بعد فروری ۱۹۲۰ء سے تدریس کا آغاز کردیا، خود فرماتے ہیں:

”بیماری کی وجہ سے اور اس لئے کہ میں نے فروری ۱۹۲۰ء میں مدرسہ مظہر العلوم بنارس میں پڑھانے کیلئے ۱۵ ماہوار اور کھانے پر ملازمت کرلی تھی (اس وقت مدرس عربی سوم کی تنخواہ پندرہ روپئے خشک ہوا کرتی تھی)“(۱)

ایک عجیب خواب اگرچہ انسان کی زندگی میں خواب کی کوئی خاص حقیقت نہیں ہوتی اور اکثر خواب ایسے ہوتے ہیں جو ”اضغاث احلام“ کی قسم کے ہوتے ہیں، کہ حالت بیداری میں ان کا خیال بھی نہیں آسکتا، لیکن یہ بھی مسلّم ہے کہ بعض خواب آدمی کی زندگی میں پیش آنے والے حادثات وواقعات کے پیش نظر سچے ثابت ہوتے ہیں، ان کی حیثیت رویائے صالحہ کی ہوتی ہے، بنارس کے زمانۂ قیام میں علامہ اعظمیؒ نے بھی ایک خواب دیکھا تھا، جس کو انھوں نے خود ہی ایک جگہ قلمبند فرمایا ہے، مگر اس کے وقت کی تحدید نہیں کی ہے کہ زمانۂ طالب علمی میں دیکھا، یا دور تدریس میں، بہر حال اس کو ان ہی کے الفاظ میں ہم یہاں نقل کر رہے ہیں:

”ولما كنت مقيما في بنارس رأيت ذات ليلة فيما يرى النائم

(۱) تذکرہ مولانا عبداللطیف نعمانی، ص ۱۱

أنی عند المولوی عبدالحی (۱) فی لکنؤ. والشیخ متزی بازار اسود وعلیه قمیص ابیض، ربعة کث اللحیة کاحسن ما یکون الرجال، فامرنی فجلست علی سریر فی بیته وامر زوجته، وهی جالسة علی السریرالذی أنا علیه ، باحضار ورق التنبول الماکول فی اکناف الهند ۔ و جعل الشیخ یظهر البشاشة والانبساط بمکانی عنده فسررت بغایة شفقته علیّ ۔ و محبته ایای، فلما استیقظت بقیت متحیراً لا ادری ماذا یکون تأویله ،فلما الهمنی الله تعالیٰ جمع تراجم محدثی الحنفیة بدأت بانتخاب الرجال علی شرطی من "الفوائد البهیة "وزدت علیها رجالاً کثیرین ، خطر ببالی أن هذا هو تأویل الرؤیا التی رأیتها فی بنارس "

(۱) فقیہ و محدث شیخ المعقول والمنقول مولانا محمد عبدالحی بن عبدالحلیم انصاری لکھنوی فرنگی محلیؒ ۱۲۶۴ھ میں باندہ میں پیدا ہوئے، حفظ قرآن کے بعد اپنے والد کے پاس معقولات و منقولات کی متعدد درسی کتابیں پڑھیں، پھر اپنے ماموں مفتی مولانا نعمت اللہ لکھنوی سے ہیئت کی کتابیں پڑھیں، اور سترہ سال کی عمر میں تحصیل علم سے فارغ ہو گئے، مگر اسی عمر میں تقریباً تمام اسلامی علوم و فنون میں دستگاہ بہم پہنچائی تھی۔ فراغت کے بعد ایک عرصہ تک حیدر آباد میں درس و تدریس کی خدمت انجام دیتے رہے، اور اسی دوران سعادت حج سے بھی بہرہ مند ہوئے، ۱۲۷۹ھ میں پہلا حج والد ماجد کی حیات میں ان کے ساتھ ادا کیا، اور دوسرا ان کی وفات کے بعد ۱۲۹۳ھ میں ادا کیا۔ قیام حجاز کے دوران حرمین شریفین کے بہت سے علماء سے ملاقات کر کے ان سے حدیث کی اجازت و سند حاصل کی، پھر حیدر آباد سے رخصت لے لی اور لکھنو میں درس وافادہ کی مجلس سجائی، اور وہیں ۲۹ ربیع الاول ۱۳۰۴ھ کو چالیس سال سے بھی کم عمر میں وفات پائی۔ (نزھۃ الخواطر ۲۳۹/۸-۲۴۴)

مولانا عبدالحی فرنگی محلی چودھویں صدی کے اجلہ علماء میں تھے ، معقولات و منقولات دونوں میں آپ کا تبحر علمی اور فضل و کمال مسلم تھا، حدیث و فقہ میں نادرۃ العصر اور یگانۂ روزگار تھے، آپ نے پوری عمر درس و تدریس، تصنیف و تالیف اور وعظ و تذکیر میں صرف کی، اللہ رب العزت نے آپ کے وقت میں بڑی برکت عطا فرمائی تھی، اس کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ کچھ کم چالیس سال کی عمر پائی لیکن بشمول حواشی و تعلیقات کے سو سے زائد کتابیں تصنیف فرمائیں۔

(جب میں بنارس میں مقیم تھا تو ایک رات میں نے خواب دیکھا کہ میں لکھنو میں مولانا عبدالحی صاحب کے پاس ہوں، مولانا عبدالحی صاحب سیاہ تہ بند اور سفید کرتے میں ملبوس ہیں۔ میانہ قد، گھنی داڑھی، غرض بہترین آپ کا حلیہ تھا، انھوں نے مجھے حکم دیا تو میں ان کے گھر میں موجود ایک چارپائی پر بیٹھ گیا، اور انھوں نے اپنی بیوی کو جو اسی چارپائی پر جس پر میں بیٹھا تھا، بیٹھی ہوئی تھیں، پان لانے کا حکم دیا، مولانا میری حاضری کی وجہ سے فرحت وانبساط کا اظہار فرماتے رہے، ان کی اس شفقت اور اپنے ساتھ اس محبت کی وجہ سے مجھے بھی بڑی خوشی حاصل ہوئی۔ پھر جب میں بیدار ہوا تو حیران رہ گیا اور اس کی کوئی تاویل نہ کر سکا، پھر جب اللہ جل شانہٗ نے محدثین احناف کے تذکروں کو جمع کرنے کی میرے دل میں بات ڈالی اور میں "فوائد بھیۃ" سے اپنی شرط کے مطابق افراد کا انتخاب کرنے لگا اور اس پر بہت سے دوسرے لوگوں کا بھی اضافہ کیا، تو اس وقت میرے دل میں خیال گذرا کہ یہ میرے بنارس کے خواب کی تاویل ہے)

مدرسہ مظہر العلوم بنارس کیلئے یہ بڑے فخر واعزاز کی بات ہے کہ آپ نے وہاں سے مشغلۂ تدریس کا آغاز کیا اور ایک سال سے زائد تقریباً ڈیڑھ سال کی مدت تک نہایت خوش اسلوبی سے اس اہم فریضہ کو انجام دیتے رہے۔ مولانا مجیب الغفار صاحب اعظمی شیخ الحدیث مدرسہ مظہر العلوم بنارس اپنے ایک مضمون میں تحریر فرماتے ہیں:

"آپ کا دوسرا دور مظہر العلوم میں مدرسی کا ہے، آپ نے تدریس کی مبارک خدمات کا آغاز یہیں سے فرمایا ہے، اس سے قبل آپ نے کسی ادارہ میں تدریس کی خدمت انجام نہیں دی تھی، حضرت حق نے یہ اولیت مظہر العلوم ہی کیلئے مقدر فرمائی تھی"(۱)

مظہر العلوم بنارس کے زمانۂ تدریس ہی میں غالباً آپ نے فاضل ادب

(۱) مجلہ ترجمان الاسلام ص ۵۴۔ جنوری تا مارچ ۱۹۹۳ء

پنجاب یونیورسٹی کا امتحان پاس کیا، جو اس زمانے میں بڑا اہم اور مشکل امتحان سمجھا جاتا تھا(۱)
دارالعلوم دیوبند میں دوبارہ داخلہ علامہ اعظمی تذکرہ مولانا عبداللطیف نعمانی میں تحریر فرماتے ہیں:

"شوال ۱۳۳۸ھ میں دیوبند نہیں جاسکا۔"(۲)

اب یہ بات قطعی طور پر نہیں معلوم کہ بنارس میں بغرض تدریس کتنے دنوں قیام فرمارہے، شوال ۱۳۳۸ھ سے قبل اور اس کے بعد مجموعی طور پر تقریباً ڈیڑھ سال کی

---

(۱) یہاں اس بات کی وضاحت کردوں کہ فاضل ادب کے اس امتحان کا علم مولانا عبدالحفیظ رحمانی لوہرسن کے ذریعہ ہوا، علامہ اعظمیؒ ایک مرتبہ (غالباً ۱۹۸۵ء میں) لوہرسن تشریف لے گئے تھے (خوش قسمتی سے اس سفر میں راقم الحروف بھی بطور خدمتگار حضرت کے ساتھ تھا) اس وقت مولانا عبدالحفیظ صاحب نے ایک مختصر سا انٹرویو آپ سے لیا تھا، اس سوانح کی ترتیب کے وقت میں نے خط لکھ کر مولانا رحمانی سے اس سلسلے میں دریافت کیا تو انھوں نے ازراہ مہربانی اپنی یادداشت سے نقل کرکے میرے پاس ایک مفصل جواب لکھا جس میں موضوع زیر بحث سے متعلق ان کے الفاظ یہ ہیں:
"حضرت محدث جلیل مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی نوراللہ مرقدہ سے لوہرسن تشریف آوری کے موقع پر راقم الحروف نے چند سوالات کئے تھے، ان میں پہلا سوال یہ تھا کہ کتنی تعلیم حاصل کرنے کے بعد دیوبند دارالعلوم میں داخلہ کیلئے تشریف لے گئے؟ محدث اعظمی نے فرمایا کہ میں فاضل کرنے کے بعد دیوبند گیا تھا۔ میں نے کہا یعنی پنجاب یونیورسٹی کا امتحان فاضل ادب پاس کرنے کے بعد؟ فرمایا: جی ہاں۔ عرض کیا کہ یہ امتحان تو اس زمانہ میں بہت اہم سمجھا جاتا تھا؟ فرمایا: جی ہاں! اس قدر مشکل تھا کہ اجازت کی سہولت کے باوجود کوئی ہمت نہیں کرتا تھا، عرض کیا: جب ہی تو مولانا ثناءاللہ امرتسری مرحوم فاضل ادب پنجاب لکھنے میں بہت فخر محسوس کرتے تھے؟ فرمایا: مجھے تو اس پر کوئی فخر وناز نہیں ہے اور اس وقت بھی نہیں تھا جب امتحان میں کامیابی حاصل کی تھی ۔ مقصد یہ دکھانا تھا کہ درس نظامی کے اچھے طلبہ ہر نصاب پر حاوی ہونے کی استعداد رکھتے ہیں اور وہ میں نے کرکے دکھادیا۔"

---

(۲) تذکرہ مولانا عبداللطیف نعمانی ص ۱۲

مدت پوری کی پوری آپ نے بنارس ہی میں گذاری یا کہیں اور۔

جب شوال ۱۳۳۹ھ میں نئے تعلیمی سال کا آغاز ہوا تو شوق دیوبند نے ایک بار پھر مہمیز لگائی، روانگی سے پیشتر علامہ ابراہیم بلیاوی (۱) سے رابطہ قائم کیا، علامہ بلیاوی کا ایک مکتوب جو جون ۱۹۲۱ء کا تحریر کردہ ہے اور علامہ اعظمی کے گھر کے پتہ پر روانہ کیا گیا ہے، ان کے خطوط کے ڈھیر میں موجود ہے اس خط کی عبارت یہ ہے:

"مکرمی جناب مولوی صاحب! السلام علیکم

نوازش نامہ آیا، حالات معلوم ہوئے، احقر ۲؍ شوال سے بخار جاڑہ میں مبتلا ہے۔ لہٰذا دیوبند کے جانے میں تاخیر ہوگی، آپ لوگ دیوبند چلے جائیں، اور مولوی عبدالسمیع صاحب سے مل کر اپنا داخلہ کرالیں۔"

اب پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے دارالعلوم دیوبند میں داخلہ کے سلسلے میں ایک نہایت اہم واقعہ پیش آیا، جس سے علامہ اعظمی کی لیاقت اور استعداد و صلاحیت کا اندازہ ہوتا ہے، اس واقعہ کا ذکر مولانا حبیب الرحمٰن صاحب جگدیش پوری یوں فرماتے ہیں:

(۱) شیخ المعقول والمنقول علامہ ابراہیم بلیاوی ۱۳۰۴ھ میں بلیا کے ایک علمی گھرانے میں پیدا ہوئے، تاریخی نام غلام کبریا رکھا گیا۔ مولانا حکیم جمیل الدین نگینوی، مولانا فاروق احمد چریاکوٹی اور مولانا ہدایت اللہ خان کے علاوہ مولانا عبدالغفار صاحب عراقی مئوی سے بھی شرف تلمذ حاصل رہا، ۱۳۲۷ھ میں دارالعلوم دیوبند سے فارغ ہوئے۔ فراغت کے بعد مختلف مدارس میں مثلاً مدرسہ عالیہ فتحپوری، عمری ضلع مراد آباد، دارالعلوم مئو، مدرسہ امدادیہ دربھنگہ، اور جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل وغیرہ میں درس و تدریس کے فرائض انجام دیے، ۱۳۷۷ھ میں حضرت مولانا مدنیؒ کے انتقال کے بعد دارالعلوم دیوبند کے صدر مدرس مقرر ہوئے، اور تادم واپسیں اس منصب پر متمکن رہے، ۲۴؍ رمضان ۱۳۸۷ھ کو آپ کی وفات ہوئی اور قبرستان قاسمی میں مدفون ہوئے۔

(دیکھئے تاریخ دارالعلوم دیوبند ۲: ۱۰۵-۱۰۳)

"علم وفن کی تحصیل وتکمیل کے بعد شوال ۱۳۳۷ھ م ۱۹۱۷ء (۱)
میں آپ دارالعلوم دیوبند پہنچے اور داخلہ کا امتحان دیا تو اس میں امتیازی نمبرات حاصل ہوئے، حضرت مہتمم صاحب کو اس غیر معمولی کامیابی پر استعجاب ہوا اور اطمئنان خاطر کے لئے دوبارہ شیخ الادب والفقہ مولانا اعزاز علی (۲) کے پاس امتحان بھیج دیا، مولانا موصوف امتحان میں بہت سخت گیر تھے، طلبہ عام طور پر ان کے پاس امتحان سے گھبراتے تھے، حضرت شیخ الادب نے دیوان متنبی اور حماسہ کا دوبارہ امتحان لیا جس میں آپ کو پہلی بار سے زیادہ نمبرات ملے۔" (۳)

اس واقعہ کو مولانا جگدیش پوری صاحب نے ۱۳۳۷ھ کا قرار دیا ہے، لیکن اغلب یہ ہے کہ یہ واقعہ پہلے سفر (۱۳۳۷ھ) کا نہیں، بلکہ دوسرے سفر (۱۳۳۹ھ) کا ہے، کیونکہ ۳۷ھ کے بارے میں خود علامہ اعظمیؒ کی تحریر سے واضح ہو چکا ہے کہ آپ کا امتحان مولانا رسول خاں صاحب نے لیا تھا، مولانا اعزاز علیؒ کا اس میں کوئی تذکرہ نہیں ہے، دوسری بات یہ کہ واقعہ کی نوعیت بھی ذرا مختلف ہے، اصل قصہ وہ ہے جو مولانا عبدالحفیظ رحمانی لوہرسن نے خود علامہ اعظمی کی زبان سے سن کر اپنی یادداشت میں قلم بند کیا ہے کہ:

(۱) یہ سنہ غلط ہے، ۱۳۳۷ھ کی مطابقت ۱۹۱۷ء سے نہیں بلکہ ۱۹۱۹ء سے ہے۔

(۲) شیخ الادب والفقہ مولانا اعزاز علی رحمۃ اللہ علیہ امروہہ کے باشندے تھے ۱۳۲۱ھ میں دارالعلوم دیوبند سے فراغت حاصل کی، ابتداءً آپ نے حضرت شیخ الھندؒ کے ایماء پر مدرسہ نعمانیہ پورینی ضلع بھاگلپور میں تعلیم دی، بعد ازاں شاہجہاں پور منتقل ہو گئے اور وہاں ایک مدرسہ افضل المدارس کے نام سے قائم کیا، ۱۳۳۰ھ میں دارالعلوم دیوبند میں مدرس ہوئے، اور وہاں تاحیات تدریسی وانتظامی امور انجام دیتے رہے، آپ ایک جامع الفنون شخصیت کے مالک تھے، لیکن عربی ادب اور فقہ میں ید طولیٰ حاصل تھا، جس کی وجہ سے "شیخ الادب والفقہ" کے خطاب سے متعارف ہوئے۔ ۱۳۷۴ھ میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا، (دیکھئے تاریخ دارالعلوم ۲:۹۶-۹۳)

(۳) ماہنامہ دارالعلوم وفیات نمبر ص ۱۵۲

"میں نے (مولانا عبدالحفیظ رحمانی نے) عرض کیا کہ داخلہ کا امتحان کس مدرس کو دینا پڑا تھا؟ فرمایا کہ میرے داخلہ کا امتحان مفتی محمد شفیع صاحب (١) نے لیا جو اس وقت معین المدرسین تھے، انھوں نے مجھے مشورہ دیا کہ عربی ادب کی کوئی کتاب ضرور پڑھ لو، میں نے کہا کہ مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔ مفتی صاحب کو حیرت ہوئی اور انھوں نے مقامات حریری میرے سامنے کھول کر رکھ دیا اور ترجمہ کرنے کا حکم دیا۔ میں نے کتاب بند کر کے وہ مقامہ زبانی سنا دیا۔ مفتی صاحب نے آفریں کہنے کے بعد اپنا یہ تاثر کہ " ان کو ادب پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے آپ مزید اطمئنان حاصل کرلیں " لکھ کر مولانا اعزاز علی صاحب کے پاس بھیج دیا۔

مولانا اعزاز علی صاحب نے مقامات حریری دے کر فرمایا کہ کوئی مقامہ پڑھو اور ترجمہ کرو، میں نے ایک مقامہ زبانی سنانا شروع کیا، مولانا نے روک کر دو تین الفاظ کے نحوی صرفی تحلیل کیساتھ معنی پوچھے جو میں نے ضروری تفصیل کیساتھ بتا دئے۔ اس کے بعد مولانا اعزاز علی صاحب نے فرمایا: "ہاں مولوی صاحب تم کو مزید عربی ادب پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے، تم اپنے لئے جو مناسب سمجھو وہ پڑھو۔" اس طرح ان دونوں بزرگوں نے میری حوصلہ افزائی کی۔"

تھانہ بھون میں دوبارہ حاضری عید الاضحیٰ کی تعطیل میں اس بار پھر آپ نے موقع سے فائدہ اٹھایا، اور تھانہ بھون کا قصد کیا، اپنے ہم سبق مولوی عبدالمجید صاحب کو ایک خط

(١) ١٣١٤ھ میں پیدا ہوئے، دیوبند آپ کا وطن اصلی تھا، دارالعلوم میں تعلیم حاصل کی اور ١٣٣٦ھ میں وہیں سے فارغ ہوئے، ١٣٣٧ھ میں دارالعلوم میں ابتدائی درجات کے مدرس مقرر ہوئے، اور اپنی ذہانت وفطانت اور استعداد کی بدولت بہت جلد ترقی کر کے علیا کے اساتذہ میں شامل ہو گئے، ١٣٥٠ھ میں منصب افتاء پر فائز ہوئے، تقسیم وطن کے کچھ عرصہ بعد ١٩٤٩ء میں پاکستان چلے گئے، اور وہیں شوال ١٣٩٦ھ (٦/ اکتوبر ١٩٧٦ء) میں آپ کی وفات ہوئی (تاریخ دارالعلوم ٢: ١٣١-١٣٠)

میں ۶/ ذی الحجہ ۱۳۳۹ھ مطابق اگست ۱۹۲۱ء کو لکھتے ہیں:

"آج شام کی ٹرین سے میں تھانہ بھون حضرت مولانا اشرف علی صاحب سے ملنے جارہا ہوں"

دیوبند سے واپسی دیوبند کی آب وہوا آپ کے حق میں سازگار نہیں تھی اور نہ ہی وہاں کی سند فراغت مقدر تھی، مثل مشہور ہے: "تجری الریاح بما لا تشتھی السفن" اس بار بھی بیماری کے علاوہ کچھ دیگر مشکلات ومصائب سے دوچار ہوئے اور بتقاضائے مشیت الٰہی آپ کو گھر واپس آنا پڑا، خود فرماتے ہیں:

"۱۳۳۹ھ اور ۱۳۴۰ھ کا زمانہ بڑا ہنگامہ خیز زمانہ تھا، تحریک ترک موالات بہت شدت اختیار کر چکی تھی، دوسرے شہروں کی طرح دیوبند میں طلباء کے سروں سے بدیسی کپڑے کی ٹوپیاں اتاری اور جلائی جاتی تھیں، انھیں ایام میں حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ دیوبند میں گرفتار ہوئے، عصر کے بعد "دوش" آئی، مگر ایسا ہنگامہ پیدا ہوا، اور آدمیوں کا اتنا ہجوم وازدحام ہوا کہ اس وقت گرفتاری عمل میں نہ آسکی، مولانا محترم کا قیام حضرت شیخ الہند کے نئے مکان میں اور میرا اور میرے چند ساتھیوں کا قیام حضرت شیخ الہند کے پرانے مکان میں تھا، مولانا کے ساتھ ساتھ ہم سب رات بھر پولیس اور فوج کے گھیرے میں رہے، اس دن ہم بہت دیر میں سوئے تھے، صبح کو اٹھے تو معلوم ہوا کہ بہت رات گئے نئے مکان سے مولانا کو گرفتار کر کے لے گئے۔

ان حالات سے والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ بہت مشوش اور پریشان تھے، چاہتے تھے کہ وطن واپس ہو جاؤں، اسی اثناء میں مجھے اس سال بھی بخار آگیا، والد صاحب نے اطلاع ملتے ہی لکھ بھیجا کہ تم مہتمم صاحب سے رخصت لے کر مکان چلے آؤ، چنانچہ صفر یا ربیع الاول ۱۳۴۰ھ میں، میں مئو چلا آیا۔"(۱)

(۱) تذکرۂ مولانا عبداللطیف نعمانی ص ۱۵-۱۴

دیوبند میں اس دفعہ آپ نے جن اساتذہ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا، ان میں امام العصر علامہ انور شاہ کشمیری، علامہ شبیر احمد عثمانی اور مولانا سید اصغر حسین میاں دیوبندی تھے۔ ان حضرات کے پاس آپ نے بالترتیب جامع ترمذی، صحیح مسلم اور سنن ابی داؤد پڑھی۔

دار العلوم مئو میں داخلہ اور فراغت دیوبند سے واپسی کے بعد جب شفایاب ہو کر بستر علالت سے اٹھے ہیں تو ناچار مئو کے قدیم مدرسہ دار العلوم میں داخلہ لیا اور مولانا کریم بخش صاحب سنبھلی، تلمیذ رشید حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب دیوبندیؒ، کے پاس صحاح ستہ پڑھ کر دورۂ حدیث کی باقاعدہ تکمیل کی اور سند فراغت ودستار فضیلت حاصل کی، ان کے پاس معقولات کی باقی ماندہ کتابوں اور توضیح و تلویح واقلیدس وغیرہ کا درس بھی لیا۔ علامہ اعظمیؒ دار العلوم مئو سے اپنی فراغت کا حال یوں بیان فرماتے ہیں:

> ”صحت یابی کے بعد اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا کہ دار العلوم مئو میں دورے کی کتابیں تمام کرلوں، خوش قسمتی سے مولانا کریم بخش صاحب سنبھلی دار العلوم مئو میں تشریف لا چکے تھے، اور ان کے پاس ہمارے صرف ایک رفیق مولوی عبد المجید صاحب دورہ پڑھ رہے تھے، میں بھی ان کے ساتھ شریک ہو گیا، شعبان ۱۳۴۰ھ میں دورۂ حدیث ختم ہوا، اور شوال ۱۳۴۰ھ میں بصیغۂ مدرسی وہیں میرا تقرر ہو گیا۔“

دستار فضیلت میرا گمان ہے کہ فراغت کے سال ہی آپ کے سر پر دستار فضیلت باندھ دی گئی، دستار فضیلت پانے کا ذکر آپ کے تذکروں میں سوائے ایک جگہ کے کہیں اور مجھے صراحۃً نہیں مل سکا، انھوں نے اپنی دستار بندی کی طرف ایک جگہ اشارہ کیا ہے، اور وہ ”نزھۃ الخواطر“ (۲۶۷/۸) کا ایک حاشیہ ہے، جس میں مولانا عبد العلیم رسولپوری کے تذکرہ سے نزھۃ الخواطر پر استدراک کیا گیا ہے، وہ حاشیہ یہ ہے:

” مولانا عبدالعلیم (المعروف بلعل محمد) الرسولپوری

المبارکپوری، کان فاضلاجلیلاً من تلامذة الشیخ عبدالحی اللکنوی، تلمذ علیه کثیرون ، منهم:المولوی عبدالمجید المئوی وابنه المولوی عبدالباقی المحامی ، جرت بینه و بین الحافظ عبدالله الغازی فوری مناظرة، وله فی الرد علی المولوی أحمد رضا وتلمیذه رسالة" درة التاج الأنور فی أذان الخطبة عندالمنبر" وله غیر ذلك ، درس العلم فی چشمهٔ رحمت (بغازی پور) زماناً ، و خلفه بعده ابنه المولوی محمد شعیب ، وهو الذی ألبسنی العمامة حین تخرجت من دارالعلوم(بمئو)،مات فی حادثة اصطدام قطار بآخرفی سنة"

(مولانا عبدالعلیم رسولپوری مبارکپوری معروف بہ لعل محمد مولانا عبدالحی لکھنوی کے بڑے فاضل شاگردوں میں تھے، بہت سے لوگوں نے آپ کے پاس علم حاصل کیا، انھیں میں مولوی عبدالمجید مئوی اور ان کے (مولانا عبدالعلیم کے) لڑکے مولوی عبدالباقی وکیل ہیں،ان کے اور حافظ عبداللہ غازیپوری کے درمیان مناظرہ ہوا، مولوی احمد رضا اور ان کے شاگرد کے رد میں ایک رسالہ "درۃ التاج الانور فی اذان الخطبۃ عند المنبر" کے نام سے تصنیف فرمایا،ان کی اس کے علاوہ بھی کتابیں ہیں، چشمۂ رحمت غازیپور میں ایک مدت تک درس دیا،ان کے بعد ان کے صاحبزادے مولوی محمد شعیب ان کے جانشین ہوئے،دارالعلوم مئو سے جب میں فارغ ہوا تو ان ہی نے میری دستار باندھی،ٹرین کے ٹکراؤ کے ایک حادثہ میں ـــــہ میں آپ کی وفات واقع ہوئی۔)

مندرجہ بالا تحریر میں ـــــہ وفات کا ذکر نہیں ہے ،شاید اس وقت آپ کے ذہن میں تاریخ وفات نہ رہی ہو، صاحب تذکرۂ علماء اعظم گڈھ نے ان کی تاریخ وفات ۲۲/ اپریل ۱۹۲۲ء مطابق ۱۳۴۱ھ لکھی ہے ، اور تفصیل سے اس حادثہ کا ذکر بھی کیا ہے۔(۱)

(۱) دیکھئے تذکرۂ علماء اعظم گڈھ ص ۱۷۰۔۱۶۷

سند فراغت تحصیل علم سے فراغت اور تکمیل علم وفن کے بعد مدرسہ دارالعلوم کی جانب سے جو سند آپ کو پیش کی گئی، اس کا ایک حصہ ہدیۂ ناظرین ہے:

"فإن الأخ الصالح البار المولوی حبیب الرحمن بن المولوی محمد صابر المتوطن مئو من مضافات أعظم گڈه قد وصل هذه المدرسة العربية العالية الاسلامية الكائنة بمئو بعد ما حضر مجالس دروس الأفاضل و الأكارم والأماثل ، وأخذ عنهم مختصرات العلوم و مطولاتها غير ما ذكر في هذه الورقة من العلوم العربية و متعلقاتها، فقرأ من علم التفسير الجلالين ، ومن علم الحديث صحيحى الإمامين الهمامين البخارى ومسلم وسنن أبى داؤد، و النسائى، والترمذى، وابن ماجه ، والمؤطاين للإمامين القدوتين مالك و محمد ، وشرح معانى الآثار للطحاوى، ومن علم اصول الفقه التوضيح والتلويح، ومن علم المعقول شرح السلم لمولانا حمد الله، والقاضى، ومير زاهد رساله مع غلام يحيىٰ ، ومير زاهد ملا جلال و حواشيه لبحر العلوم ، ومن علم الفلسفة الميبذى و صدرا، ومن علم الرياضى المقالة الأولى من اقليدس، ومن علم الصرف الشافية، وبقى مدة ما قرأ على طريقة حسنة، رضى عنه الأساتذة و أركان المدرسة، وهو عندنا جيد الفكر سليم الطبع، متوقد الذهن ذو استعداد مناسب وقابلية تامة قادر على الدرس والإفادة . . . ."

(یعنی برادر نیک وصالح مولوی حبیب الرحمٰن بن مولوی محمد صابر ساکن مئو ضلع اعظم گڈھ نے مئو میں واقع اس اعلیٰ اسلامی عربی درسگاہ میں داخلہ لیا، اس سے قبل انھوں نے مختلف اہل فضل وکمال کے درس میں شرکت کی، اور اس کاغذ پر مذکور علوم عربیت اور اس کے متعلقات کے علاوہ علم وفن کی چھوٹی بڑی کتابیں پڑھیں، تفسیر میں جلالین ، حدیث میں صحاح ستہ، امام مالک وامام محمد کی موطا،

امام طحاوی کی شرح معانی الآثار۔ اصول فقہ میں توضیح و تلویح، معقولات میں مولانا حمد اللہ کی شرح سلم اور قاضی، حاشیہ غلام یحییٰ بر میر زاہد(۱)، میر زاہد ملا جلال اور ملا بحر العلوم کے اس پر حواشی، فلسفہ میں میبذی اور صدرا، ریاضی میں اقلیدس کا پہلا مقالہ، اور صرف میں شافیہ پڑھی۔ مدت تعلیم کے دوران حسن سیرت کے حامل رہے، ان سے اساتذہ اور اراکین مدرسہ خوش رہے۔ ہمارے نزدیک وہ فکر صائب، طبیعت سلیمہ، ذہن رسا، درس و افادہ کی بھرپور قوت و صلاحیت اور مناسب استعداد کے مالک ہیں۔)

مولانا کریم بخش صاحب سنبھلی کی بخشی ہوئی سند

مذکورہ بالا عبارت اس سند کا اقتباس ہے جو رسمی طور پر علامہ اعظمی کو مدرسہ دار العلوم کی طرف سے عطا کی گئی تھی، اس کے علاوہ جن لوگوں نے آپ کو انفرادی طور پر سندوں سے سرفراز کیا ان میں سے آپ کے استاد مولانا کریم بخش صاحب سنبھلی اور مولانا عبدالغفار صاحب عراقی، اور دار العلوم مئو کے اس وقت کے ناظم مولانا عبدالمجید صاحب مئوی ہیں، ان حضرات نے آپ کو جو سندیں دی ہیں ان میں علامہ اعظمیؒ کے علم و ادب، فہم و فراست اور سلوک و سیرت کی جس طرح تعریف و توصیف کی ہے اس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ اسناد عطا فرما کر علامہ اعظمیؒ کی تعظیم و تکریم نہ فرما رہے ہوں بلکہ ایسے لائق اور ہونہار شاگرد کو سند دینا وہ اپنے لئے باعث اعزاز سمجھ رہے ہوں، جی چاہتا ہے کہ ان تینوں سندوں کا بھی اس جگہ ذکر کر دیا جائے، سب سے پہلے مولانا کریم بخش صاحب سنبھلی کی سند ملاحظہ ہو:

" أما بعد! فيقول احقر عباد الله ذى العرش، عبده الشهير بمحمد كريم بخش ، عصمه الله يوم الأخذ والبطش ،ان الفاضل اللبيب

(۱) علامہ سید سلیمان ندوی اس کتاب کی نسبت حیات شبلی ص ۲۲ میں لکھتے ہیں: "حاشیہ غلام یحییٰ بر میر زاہد درس نظامی میں لیاقت کی آخری منزل ہے۔"

والأديب الأريب العالم اليلمعي، المولوى حبيب الرحمن الأعظمى سلمه الله العلى ، المئوى موطنا والحنفى مذهبا، قد تردّد الىّ و حضر بين يدىّ ، و أخذ من كتب الحديث الصحاح الست، بعضها قراء ة بنفسه و بعضها بقراء ة غيره علىّ وهو يسمع، والمؤطاين للإمامين الهمامين مالك بن أنس الأصبحى ومحمد بن الحسن الشيبانى حتى عبر عليها و أتى على آخرها ، فطلب منى الإجازة فاجبته لذلك . . . "

(اللہ کا یہ حقیر بندہ محمد کریم بخش اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کو اپنی گرفت سے محفوظ رکھیں، کہتا ہے کہ فاضل دانا، ادیب اریب، عالم ذکی مولوی حبیب الرحمٰن الاعظمی مئوی حنفی سلمہ اللہ میرے پاس آتے جاتے اور میرے درس میں شریک ہوتے رہے ، میرے پاس کتب حدیث میں صحاح ستہ کا کچھ حصہ انھوں نے خود پڑھا اور کچھ حصہ دوسرے نے پڑھا اور انھوں نے سنا، اس کے علاوہ میرے پاس امام مالک بن انس اصبحی اور امام محمد بن الحسن الشیبانی کی موطا پڑھی اور ان کتابوں کو پوری پڑھ کر انھیں ختم کیا۔ پھر مجھ سے ان کی اجازت مانگی تو میں نے ان کی اس درخواست کو قبول کر لیا۔)

حضرت مولانا عبدالغفار صاحب کی عطا کردہ سند آپ کے استاد محترم و مکرم حضرت مولانا عبدالغفار صاحب نے، جن کو اپنے شاگرد کی ذہانت و فطانت، لیاقت و قابلیت اور طلب و جستجو کا سب سے زیادہ اندازہ تھا، یہ سند عطا فرمائی:

" ان العزيز الحفى المجتنى من أزهار البستان ، بستان العلوم والفنون والراغب اليها بالجنان ، هو مع حداثة سنه و غضاضة غصنه قد هز الدوحة المورقة ، والشجرة المثمرة، حتى فاق فى العلوم والفنون على الأقران ، بإنعام جيبه منها والأدران، حبى و فلذة كبدى، أعنى المولوى حبيب الرحمن بن المولوى محمد صابر المئوى

الأعظمی ۔۔۔"

(خرمن علم وفن سے خوشہ چینی کرنے والے اور دل سے اس کی طرف راغب رہنے والے، عزیز مکرم نے اپنی کم عمری اور صغر سنی کے باوجود علم کے شاداب و پھلدار درخت کو حرکت دی، یہاں تک کی علم وفن میں اپنے ہمسروں پر فائق وبرتر ہوگئے، اور اپنے جیب ودامن کو اس سے اچھی طرح بھر لیا، میرا محبوب اور میرے جگر کا ٹکڑا، مولوی حبیب الرحمٰن بن مولوی محمد صابر مئوی الاعظمی ۔۔۔)

حضرت مولانا عبدالمجید صاحب ناظم مدرسہ کی سند

ناظم مدرسہ مولانا عبدالمجید (۱) صاحب نے بھی اپنی طرف سے ایک سند عطا فرما کر گویا خلعت فاخرہ سے نوازا انھوں نے اپنی عطا کردہ سند میں اس بات کی طرف بھی واضح طور پر اشارہ کیا کہ علامہ اعظمی نے اپنی طالب علمی کے زمانہ میں تعلیم بھی دی، مولانا عبدالمجید صاحب کی عطا کردہ سند کا ایک حصہ ملاحظہ ہو:

" إنی اصدق أن الفاضل الأدیب والفارغ الأریب قد حضر

(۱) مولانا شاہ عبدالمجید بن شاہ مولوی کریم بخش بن مولوی محمد قائم بن مولوی شاہ کمال مئوی تقریباً ۱۲۷۴ھ میں مئو میں پیدا ہوئے، جن اساتذہ سے علم حاصل کیا ان میں مولانا امام الدین پنجابیؒ، مولانا عبدالعلیم رسولپوری اور مولانا محمد فاروق چریاکوٹی قابل ذکر ہیں، مولانا عبدالحی فرنگی محلی سے حدیث کی کتابیں پڑھیں، اس کے بعد طبابت کی طرف متوجہ ہوئے اور طب کا پیشہ اختیار کیا۔ مولانا نے درس و تدریس کا مشغلہ رکھا، اور عرصۂ دراز تک مظہر العلوم بنارس میں خدمت تدریس کے علاوہ صدارت کے عہدہ پر بھی فائز رہے، وہاں سے علیحدگی کے بعد دارالعلوم مئو کے ناظم منتخب ہوئے، دینی ودنیاوی وجاہت کے مالک تھے، تادم مرگ جامع مسجد شاہی کے امام بھی رہے، ۷۷ برس کی عمر میں ۱۳۵۱ھ میں وفات پائی، اور آبائی قبرستان میں مدفون ہوئے۔

(تذکرہ علماء اعظم گڈھ ص ۲۱۰۔۲۰۸)

هذه المدرسة حين نظامي فيها، فقرأ ما في هذا القرطاس من الكتب الدرسية والفنون الرسمية مع تنقيح الرموز المخفية و توضيح النكات الخفية وعلمها طالبيها و نفع كما انتفع فصار خير الأماثل وبلغ الى ما يبلغ اليه الأفاضل على أن الفاضل السميدع المجاز قد فاز في امتحان الملا والفاضل و أنا منه على ثقة أنه قابل للتدريس والتعليم لأنه بذل جهده حق الجهد في التفهم والتفهيم ۰۰۰)

(میں تصدیق کرتا ہوں کہ فاضل ادیب اور فارغ اریب اس مدرسہ میں میری نظامت کے وقت داخل ہوئے اور انھوں نے اس سند کے اندر مذکور درسی کتابوں اور رسمی فنون کو مخفی اسرار اور پوشیدہ نکات کی تنقیح و توضیح کے ساتھ پڑھا، اور طالب علموں کو ان کی تعلیم دی، اور اس طرح استفادہ کے ساتھ افادہ بھی کیا، یہاں تک کہ وہ منتخب ترین لوگوں کی صف میں کھڑے ہوگئے، اور فاضل ترین افراد کے درجہ تک پہنچ گئے۔ اس پر مستزاد یہ کہ اس فاضل برتر نے ملا اور فاضل کا امتحان پاس کیا، مجھے ان پر پورا اعتماد ہے کہ وہ تدریس و تعلیم کے قابل ہیں، کیونکہ انھوں نے فہم و تفہیم میں پوری پوری کوشش صرف کی ہے۔)

طالب علمی کے زمانے میں علامہ اعظمی کے تعلیم دینے کے ذکر پر مجھے مولانا محمد منظور نعمانی رحمۃ اللہ علیہ کی ایک بات یاد آگئی جو انھوں نے ایک ملاقات کے دوران خود راقم الحروف سے فرمائی تھی، انھوں نے اس ناچیز سے فرمایا تھا کہ میں نے مولانا (مولانا اعظمیؒ) سے متعدد کتابیں اس وقت پڑھی تھیں جب وہ دارالعلوم مئو میں طالب علم تھے۔

قارئین اوپر ذکر کی گئی ان اسناد کو غور سے پڑھیں اور الفاضل اللبيب ، الأديب الأريب، العالم اليلمعي، الفاضل الأديب ، الفارغ الأريب ،اور الفاضل السميدع، جیسے خطابات کو دیکھیں کہ وہ علامہ اعظمیؒ کو اس وقت نوازے جارہے ہیں کہ ابھی ان کی عمر صرف ۲۱؍ برس ہے، اور ان خطابات کو عطا کرنے والے ان کے وہ اساتذہ یا مثل اساتذہ

ہیں جنھوں نے ان کی زندگی کے ہر ہر پہلو کا بغور جائزہ لیا ہے، اور ان کی استعداد و صلاحیت کو خوب خوب پرکھا ہے، بالخصوص مولانا عبدالغفار صاحب عراقیؒ سے علامہ اعظمیؒ کو جو ملازمت رہی ہے، اس کی روشنی میں استاذ نے شاگرد کے نشست و برخاست، رفتار و گفتار، نوشت و خواند، سلوک و سیرت، ادب و سلیقہ، مواظبت درس، فہم و فراست، رسائی فکر و ذہن اور جدوجہد گویا ہر ایک عمل کا بنظر غائر مطالعہ کیا ہوگا، تب جاکر تعریف و توصیف کے یہ بلند آہنگ کلمات ان کے نوک قلم پر آئے ہوں گے۔

اسناد حدیث: علوم عربیہ و اسلامیہ میں بالعموم، اور علم حدیث کے اندر بالخصوص سند کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ رجال یا رواۃ کا وہ سلسلہ جو متن تک پہنچائے اس کو سند کہتے ہیں، ابتدائے اسلام سے لیکر زمانۂ تدوین تک سند کی اہمیت اس درجہ رہی ہے کہ اس کو کسی بھی علم و فن کا اہم ترین عنصر مانا جاتا رہا، یہی وجہ ہے کہ علم و فن کی قدیم کتابوں کا اگر آپ مطالعہ کریں تو علم حدیث کو تو چھوڑ دیجئے ادب عربی و علوم عربیت کی کتابوں میں بھی اسانید کا ایک سیل رواں نظر آئے گا، عربی ادب یا علوم عربیہ کی قدیم تصانیف مثلاً جاحظ کی البیان والتبیین، ابوالفرج اصفہانی کی الاغانی، ابوعلی قالی کی الامالی یا اس قسم کی دیگر تصنیفات کا مطالعہ کرنے سے یہ بات بداہۃً معلوم ہو جاتی ہے کہ مصنف بسا اوقات ایک جملہ، بلکہ صرف ایک لفظ، یا ایک کلمہ کو نقل کرنے کیلئے ایک نہیں کئی سلسلہ اسناد ذکر کر جاتا ہے، اور اس چیز کا اس قدر اہتمام اس لئے کیا جاتا تھا کہ جو بھی بات ہو محقق، مدلل اور مضبوط ہو۔ پھر یہی چیز محرک بنی طبقات کی کتابوں کی تالیف کا، مثلاً ادباء کے طبقات، نحویوں کے طبقات، لغویوں کے طبقات۔

جہاں تک فن حدیث کا سوال ہے تو اس میں سند کو بنیاد اور اساس تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس میں سند کے بغیر کوئی بات قابل قبول ہی نہیں سمجھی جاتی۔ سند یا اسناد ہی علم حدیث کا عماد اور ستون ہے، اسی وجہ سے حضرت عبداللہ بن مبارکؒ (متوفی ۱۸۱ھ) نے (جو امام بخاری کے استاذ الاساتذہ تھے) فرمایا: "الإسناد من الدین فلولا الاسناد لقال

من شاء ما شاء "عبداللہ بن مبارکؒ کے اس تاریخی جملہ کا مطلب یہ ہے کہ سند دین کا جزو ہے، اگر سند نہ ہوتی تو جس کا جو جی چاہتا کہہ دیتا۔ امام مسلمؒ نے یہ اور اس قسم کے دیگر بہت سے اقوال صحیح مسلم کے مقدمہ میں ذکر فرمائے ہیں، جن سے سند کی اہمیت و فضیلت پر روشنی پڑتی ہے، اور جن سے یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ کتنا مہتم بالشان علم ہے۔

چونکہ فن حدیث علامہ اعظمیؒ کی علمی جولانگاہ رہا ہے، اس میں انھوں نے عبقریت و امامت کے جوہر دکھائے ہیں، ان کے بیشتر تحقیقی و تصنیفی کارنامے فن حدیث ہی سے متعلق رہے ہیں، اور انھوں نے قدماء محدثین کے طرز پر اسناد حدیث کے حصول کا اہتمام برتا ہے، اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آگے بڑھنے سے پیشتر ایک نظر علامہ اعظمیؒ کی ان سندوں پر ڈال لیں جو انھوں نے متعدد اساتذہ کے واسطے سے مختلف طرق سے حاصل کی ہیں۔

علامہ اعظمیؒ کو جن اساتذہ سے سند و اجازت حاصل ہوئی، ان میں سب سے پہلا نام مولانا عبدالغفار صاحب مئوی عراقیؒ کا ہے، ان کے پاس مشکوٰۃ المصابیح اور ترمذی حصہ اول پڑھی، مولانا عبدالغفار صاحب شاگرد تھے امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد (۱) گنگوہی قدس سرہ کے۔

---

(۱) حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس سرہ کے والد کا نام ہدایت احمد بن پیر بخش بن غلام حسن بن غلام علی بن علی اکبر بن قاضی محمد اکبر انصاری تھا (نزہۃ الخواطر ۱۴۸/۸) آپ کا وطن اصلی رام پور تھا، ۱۲۴۴ھ م ۱۸۲۹ء میں نانہالی وطن گنگوہ میں پیدا ہوئے، اور وہیں نشو و نما پائی، فارسی اور عربی کی ابتدائی تعلیم گنگوہ میں ہی اپنے ماموں اور دوسرے لوگوں سے حاصل کی، اس کے بعد دہلی کا سفر کیا اور وہاں مفتی صدر الدین دہلوی اور استاذ العلماء مولانا مملوک علی نانوتوی کے حلقۂ تلمذ میں داخل ہوئے، سند و اجازت مولانا عبدالغنی مجددی سے اور خرقۂ خلافت حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی سے حاصل ہوا، حضرت حاجی صاحب کو اپنے اس مرید پر بڑا فخر و ناز تھا۔ مولانا رشید احمد صاحب کی عمر ابھی ۲۷ برس تھی کہ ۱۸۵۷ء کا وہ روح فرسا اور خوں چکاں حادثہ پیش آیا جس سے مسلمانوں کے آٹھ سو سالہ عروج =

دوسرے استاد جن سے صحاح ستہ کی اکثر کتابوں کا درس لیا، مولانا کریم بخش صاحب سنبھلی مراد آبادیؒ ہیں، وہ شاگرد تھے، شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب دیو بندیؒ کے۔

شارح مسلم مولانا شبیر احمد صاحب عثمانیؒ دیو بندی سے صحیح مسلم از اول تا کتاب الزکوۃ پڑھی، وہ بھی حضرت شیخ الہندؒ کے شاگرد تھے۔

آپ کے اساتذہ میں مولانا اصغر حسین صاحب دیو بندیؒ بھی تھے، ان کے پاس سنن ابو داؤد شروع سے کتاب الصلوٰۃ کے آخر تک پڑھی، یہ بھی حضرت شیخ الہند کے شاگرد تھے۔

امام العصر مولانا انور شاہ کشمیریؒ کے پاس جامع ترمذی از ابتدا تا کتاب الحج پڑھی دیو بند کے دوسرے اساتذہ کی طرح شاہ صاحبؒ بھی حضرت شیخ الہند کے ہی شاگرد تھے۔ شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیو بندی(۱) کو شرف تلمذ حاصل تھا قاسم العلوم والخیرات،

=واقتدار کی فلک بوس عمارت زمین بوس ہو گئی، اور جس کے نتیجہ میں ہندوستانی مسلمانوں پر ذلت و ادبار کی مہر لگ گئی، حضرت گنگوہی نے اس وقت حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کی قیادت میں شاملی کا معرکہ لڑا، جس کے بعد انگریزوں کی دارو گیر کا شکار بھی ہوئے، لیکن قدرت کو ان سے ہندوستانی مسلمانوں کے دین وملت کی حفاظت کیلئے کام لینا تھا اس لئے جان سے بچ گئے۔ حضرت گنگوہی کا خاص کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے مسلمانوں میں بڑھتی ہوئی بدعت پر کاری ضرب لگائی اور اس کے زور کو توڑا، جزاہ اللہ عن جمیع المسلمین خیرا، بیعت وارشاد کے ساتھ درس و تدریس کا سلسلہ بھی جاری رہا، ہندوستان کے بڑے بڑے نامور علماء آپ کے چشمۂ فیض سے فیضیاب ہوئے، اور نہ صرف ہندوستان بلکہ عالم اسلام میں پھیل کر اس سلسلہ کو مزید آگے بڑھایا، اسی طرح بے شمار لوگ آپ کے ہاتھوں پر تائب ہو کر از سر نو حظیرۂ اسلام میں داخل ہوئے، ۹ر جمادی الثانیہ ۱۳۲۳ھ م ۱۱ر اگست ۱۹۰۵ء کو رشد وہدایت کا یہ آفتاب ۷۸ سال کی ضیا پاشی کے بعد غروب ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون (مولانا رشید احمد گنگوہی حیات اور کارنامے، نزہۃ الخواطر، تذکرۂ علماء حال)

(۱) شیخ الہند مولانا محمود حسن دیو بندی ۱۲۶۸ھ م ۱۸۵۱ء میں بریلی میں پیدا ہوئے، جہاں ان کے والد=

بانئ دار العلوم حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ (۱) اور امام ربانی مولانا رشید احمد گنگوہیؒ

= مولانا ذوالفقار علی دیوبندی محکمۂ تعلیم میں ڈپٹی انسپکٹر تھے، دیوبند میں نشوونما حاصل ہوئی، اور اپنے چچا مولانا مہتاب عالم دیوبندی کے پاس ابتدائی کتابیں پڑھیں، ۱۲۸۳ھ م ۱۸۶۶ء میں مسجد چھتہ سے جب دار العلوم دیوبند کا آغاز ہوا، تو آج کے ازہر ایشیا کے وہ اکیلے طالب علم تھے جنھوں نے اپنے ہی نام کے ایک مخلص و ماہر استاد اور بلند پایہ عالم دین ملا محمود دیوبندی کے پاس انار کے سن رسیدہ درخت کے نیچے کتاب کھول کر پہلا سبق حاصل کیا، ان کے والد مولانا ذوالفقار صاحب خود بھی علم و ادب میں بڑے باکمال تھے، چنانچہ بہت سی کتابیں انھوں نے اپنے والد ماجد سے بھی پڑھیں، مولانا محمد قاسم نانوتوی اور مولانا رشید احمد گنگوہی سے حدیث کی کتابیں پڑھیں، حضرت نانا توی کے سامنے اس وقت زانوئے تلمذ تہ کیا جب حضرت نانوتوی میرٹھ میں تصحیح کتب کی خدمت انجام دے رہے تھے، خلافت حضرت گنگوہی سے حاصل ہوئی۔ وہ دار العلوم دیوبند کے شیخ الحدیث، صدر المدرسین، بڑے بڑے ارباب علم و ہنر اور عبقری شخصیتوں کے استاذ و مربی تھے، ان کے شاگردوں میں ایک سے بڑھ کر ایک آفتاب و ماہتاب تھے، آزادئ وطن کے لئے عمر بھر انگریزوں کے خلاف برسرپیکار رہے، آزادی کی خاطر انھوں نے کئی ایک تحریکیں بھی چلائیں، جس میں تحریک ریشمی رومال بہت مشہور ہوئی، حصول آزادی کے لئے انھوں نے قید و بند کی صعوبت بھی برداشت کی اور ساڑھے تین سال جزیرۂ مالٹا میں اسیر فرنگ بن کر رہے، جامعہ ملیہ اسلامیہ کی بنیاد آپ ہی کے دست مبارک سے رکھی گئی، تصانیف میں ترجمۂ قرآن کو بے مثل شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی، ۳۰؍ نومبر ۱۹۲۰ء مطابق ۱۳۳۹ھ کو اس جہان فانی سے رخت سفر باندھا، اور قبرستان قاسمی میں مدفون ہوئے۔ (نزہۃ الخواطر، تاریخ دار العلوم دیوبند، تذکرۂ علماء حال)

(۱) حضرت نانوتویؒ کی ولادت ضلع سہارنپور کے مردم خیز قصبہ نانوتہ میں ۱۲۴۸ھ م ۱۹۳۳ء میں ہوئی، والد کا نام شیخ اسد علی تھا، قرآن کریم اور فارسی کی ابتدائی کتابیں نانوتہ میں پڑھیں، دیوبند میں آپ کی قرابتداری تھی، فارسی وغیرہ پڑھنے کے بعد دیوبند آپ کو منتقل کر دیا گیا، جہاں مولوی مہتاب علی سے عربی پڑھنا شروع کی۔ لیکن جلد ہی وہاں سے اٹھا کر آپ کو سہارنپور بھیج دیا گیا، کچھ مدت تک وہاں بھی پڑھتے رہے، پھر جاذبۂ توفیق دہلی لے گیا، اس وقت دہلی کے عربک کالج میں آپ کے ہم وطن =

=مولانا مملوک علی نانوتویؒ درس و تدریس کی خدمت انجام دے رہے تھے، وہ ایک جلیل القدر عالم اور بڑے پایہ کے مربی تھے، ان کے درس کی شہرت دور دور پھیلی ہوئی تھی، حضرت نانوتوی بارہ سال کی عمر میں ۱۲۶۰ھ مطابق ۱۸۴۴ء میں عربک کالج میں داخل ہوئے اور پانچ سال کے بعد علم و فن کی تکمیل کر کے باہر نکلے، دوران تعلیم آپ کی ذہانت و فطانت کا پورے کالج میں چرچا رہا، عمر کی ابھی ۲۴ منزلیں ہی طے کی تھیں کہ ہندوستان کی تاریخ میں وہ زلزلہ خیز انقلاب آیا، جس نے اس ملک کی چولیں ہلا کر رکھ دیں، پورے ہندوستان پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا، اور بڑے پیمانے پر قتل و غارتگری اور خونریزی ہوئی، جس میں مسلمانوں کو خاص طور سے اور اہل علم کو علی وجہ الاخص نشانہ بنایا گیا، انگریزوں کے اس ظلم و ستم اور قتل و خونریزی کے خلاف جگہ جگہ بغاوتیں اور معرکے ہوئے، جس میں شاملی کے معرکے کو خاص شہرت حاصل ہوئی، اس معرکے میں حضرت نانوتوی نے شجاعت کے وہ جوہر دکھائے کہ انگریزوں کے ہوش اڑ گئے، ہنگامۂ جنگ کے فرو ہونے کے بعد انگریزی پولیس انھیں مدت تک تلاش کرتی رہی لیکن اسے ناکامی رہی، خون کے دریا بہانے کے بعد بھی جب اسلام اور مسلمان اپنی سخت جانی کی وجہ سے زندہ بچ گئے تو اسلام کے قلعہ پر بمباری کے لئے انگریزوں نے دوسرا طریقہ اختیار کیا جو پہلے سے کہیں زیادہ خطرناک تھا اور وہ تھی عیسائیت کی تبلیغ اور مسلمانوں کو اسلام سے بیزار کرنے کی تحریک، یہ وہ میدان تھا جس میں حضرت نانوتوی کے جوہر زیادہ کھلے اور انھوں نے اسلام کی بھرپور مدافعت کی، عیسائیوں سے مناظرے اور آریوں سے مباحثے ہوئے اور اسلام ہر مرتبہ سربلند رہا، اسی طرح شیعیت کے بڑھتے ہوئے دھارے کو بھی روکا، ان کی اس جد و جہد کے نتیجہ میں جدید علم کلام وجود میں آیا، جس کے وہ بانی تھے، لیکن آپ کا سب سے روشن کارنامہ تحریک دیوبندیت ہے جو دارالعلوم کی صورت میں جلوہ گر ہوئی، علمی کارناموں میں تصنیفات کے علاوہ تصحیح کتب کا کام بھی ہے، جس کے لئے متعدد مطبعوں میں ملازمت کی، ایسی ہی ایک ملازمت کے دوران انھوں نے صحیح بخاری کے آخری پانچ پاروں کے حواشی تحریر فرمائے، آپ کی طبیعت میں سادگی اور انکسار و تواضع حد درجہ تھا، رہن سہن عام آدمیوں کا سا تھا، رکھ رکھاؤ بالکل نہیں تھا، جس کی وجہ سے وہ شخص جو آپ سے واقف نہ ہوتا دیکھ کر عالم ہی نہ سمجھتا، ۴ر جمادی الاولی ۱۲۹۷ھ م ۱۸۷۹ء میں اپنے رب کی پکار پر لبیک کہا اور عالم آخرت کو سدھارے۔

(تاریخ دارالعلوم، مولانا محمد قاسم نانوتوی حیات اور کارنامے)

سے، یہ دونوں بزرگ حضرت مولانا عبدالغنی دہلوی(۱) مہاجر مکی کے شاگرد تھے، شاہ عبدالغنی صاحبؒ کو اجازت حاصل تھی مسند الآفاق مولانا شاہ محمد اسحاق صاحب دہلویؒ(۲)

(۱) امام محدث مولانا عبدالغنی بن ابی سعید دہلوی، مجدد الف ثانی سید احمد سرہندی کی اولاد میں تھے، شعبان ۱۲۳۵ھ میں دہلی میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم کے بعد اپنے والد سے مؤطا امام محمد اور شاہ مخصوص اللہ بن رفیع الدین دہلوی سے مشکوٰۃ پڑھی اور شاہ اسحاق صاحب دہلوی سے حدیث کی دیگر کتابیں پڑھیں، اپنے والد کے ہاتھ پر بیعت ہوئے اور ان کے ہمراہ ۱۲۴۹ھ میں حج و زیارت کے لئے حرمین گئے، وہاں شیخ عابد سندھی اور بعض دیگر اہل علم سے حدیث کی سند حاصل کی اور خود بھی درس وافادہ کی مجلس جمائی۔ ۱۸۵۷ء (۱۲۷۳ھ) کے ہنگامۂ رستاخیز کے بعد اپنے اہل و عیال کے ساتھ حرمین ہجرت فرماگئے، اور پہلے مکہ گئے پھر مدینہ جاکر حدیث کے درس و تدریس میں مشغول ہوگئے۔ علم و عمل، زہد و تقوی، حلم و وقار، پرہیزگاری، تواضع وانکسار اور حسن اخلاق میں یگانۂ روزگار تھے، ۱۶ر محرم ۱۲۹۶ھ کو مدینہ منورہ میں وفات پائی۔ (نزھۃ الخواطر ۷/۲۹۰-۲۸۹)

(۲) حضرت مولانا شاہ اسحاق بن محمد افضل دہلوی مہاجر مکی، شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کے نواسے اور ان کے علم کے وارث تھے، ۸ر ذی الحجہ ۱۱۹۶ھ یا ۱۱۹۷ھ کو دہلی میں پیدا ہوئے، اپنے نانا کے آغوش تربیت میں نشو و نما پائی، اکثر درسی کتابیں شاہ عبدالقادر دہلویؒ کی خدمت میں پڑھیں، فقہ و حدیث میں مہارت شاہ عبدالعزیزؒ کی خدمت میں رہ کر بہم پہنچائی، اور ان کے علم کے حامل اور سچے جانشین ہوئے، اور درس وافادہ کا سلسلہ شروع کیا، ۱۲۴۰ھ میں حرمین شریفین کی زیارت سے مشرف ہوئے، وہاں شیخ عمر بن عبدالکریم سے حدیث کی سند حاصل کی، اور ہندوستان لوٹ کر سولہ سال تک حدیث کا درس دیتے رہے، ۱۲۵۸ھ میں دوبارہ حجاز تشریف لے گئے اور مکہ میں مقیم ہوگئے۔ آپ سے ایک زمانہ نے فیض پایا، ہندوستان کے اسناد حدیث کے سلسلے چاہے وہ غیر مقلدین کے ہوں یا احناف کے آپ کی ذات پر جاکر مل جاتے ہیں۔ ۲۷ر رجب ۱۲۶۲ھ کو مکہ میں فوت ہوئے اور قبر معلی میں مدفون ہوئے (نزھۃ الخواطر ۷/۵۲-۵۱)

سے، اور ان کو اپنے نانا مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب دہلوی سے، شاہ عبدالعزیز صاحب (۱) کو سعادت حاصل تھی اپنے والد ماجد مولانا شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی (۲) سے حدیث پڑھنے کی، اور شاہ صاحب نے اپنے تمام سلسلوں کو اپنی کتاب "الیانع الجنی" میں نقل کر دیا ہے جو وہاں دیکھے جاسکتے ہیں۔

(۱) حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز بن ولی اللہ بن عبدالرحیم دہلوی ۲۵ رمضان المبارک ۱۱۵۹ھ کو پیدا ہوئے، اپنے والد کے پاس قرآن حفظ کیا اور انھیں کے سایۂ تربیت میں تعلیم پائی، آپ کی عمر ابھی سولہ سال تھی کہ والد کا انتقال ہو گیا، لہذا بقیہ کتابیں دوسرے اہل علم سے پڑھیں، علم و فضل، عقل و فہم، سرعت ادارک، قوت حافظہ اور طہارت و تقویٰ میں نادرۂ روزگار تھے، پندرہ سال کی عمر میں مشغلۂ درس و تدریس میں مشغول ہو گئے، پچیس برس کی عمر سے متعدد خطرناک امراض سے دوچار ہوئے، مگر اس کے باوجود درس و افتاء کا سلسلہ جاری رکھا، حتی کہ آپ کے حلقۂ درس سے بے شمار افراد باکمال بن کر چمکے۔ تبحر علمی، تصنیف و تالیف، تحریر و تقریر، قوت بیان اور بداہت و استحضار میں آپ کے پایہ کو بہت کم لوگ پہنچ سکے، تفسیر، حدیث، فقہ، کلام، بلاغت اور منطق و فلسفہ وغیرہ پر بہت سی بیش قیمت کتابیں تصنیف فرمائی ہیں۔ ۷ر شوال ۱۲۳۹ھ کو اسی سال کی عمر میں وفات پائی اور دہلی میں اپنے والد کے جوار میں مدفون ہوئے۔ (نزہۃ الخواطر ۷/ ۲۶۷۔۲۶۸)

(۲) ہندوستان میں اسلامی علوم و فنون کو نشأۃ ثانیہ عطا کرنے والے امام الائمہ مولانا شاہ ولی اللہ احمد بن عبدالرحیم دہلوی ۱۴ر شوال ۱۱۱۴ھ دارالحکومت دہلی میں پیدا ہوئے، شاہ صاحب اس علمی سلسلہ کے طلائے ناب تھے جو پورے ہندوستان میں پھیلا ہوا ہے، اکثر کتابیں اپنے والد کے پاس پڑھیں، آپ کا سینہ علم و عرفان سے منور اور دل تجلیات ربانی کا مظہر تھا، آج ہندوستان میں علم دین کی جو بہار نظر آ رہی ہے وہ انھیں کے فیضان کا اثر ہے، ۱۱۴۳ھ میں حجاز کا سفر فرمایا اور دو سال حرمین میں قیام فرما کر وہاں کے علماء خاص کر شیخ ابو طاہر محمد بن ابراہیم کردی سے حدیث کی کتابیں پڑھ کر سند و اجازت حاصل کی، شاہ صاحب کے اوپر اللہ کے انعامات بارش کی طرح برستے تھے، علم و معرفت اور حکمت الٰہیہ کا اللہ نے ان کے اوپر دروازہ کھول رکھا تھا، شاہ صاحب کی تصنیفات شمار سے باہر ہیں۔ ۱۱۷۶ھ میں ۶۲ برس کی عمر میں وفات پائی اور دہلی کے مقبرہ مہدیان میں مدفون ہوئے۔

علامہ اعظمی نے مذکورہ بالا سندوں کے علاوہ اپنے استاذ مولانا عبدالغفار صاحب کے پاس رسالۃ الاوائل پڑھ کر اس کی تمام حدیثوں کی اجازت حاصل کی، مولانا عبدالغفار صاحب کو رسالۃ الاوائل کی اجازت مولانا عبدالحق الہ آبادی مہاجر مکی (۱) سے حاصل تھی، اور ان کو اجازت تھی نواب مولانا قطب الدین صاحب دہلوی (۲) سے، نواب قطب الدین صاحب کو اجازت شاہ محمد اسحاق صاحب سے حاصل تھی، ان کو شیخ عمر بن عبدالکریم مکی سے، وہ شاگرد تھے شیخ محمد طاہر پسر شیخ محمد سعید بن سنبل کے، انھوں نے حدیث پڑھی تھی اپنے والد بزرگوار علامہ شیخ محمد سعید سنبل (۳) سے، اور شیخ سعید سنبل نے رسالۃ الاوائل میں اس کے بعد کے تمام طرق کو ذکر کر دیا ہے۔

(۱) شیخ الدلائل مولانا عبدالحق الہ آبادی مہاجر مکی، الہ آباد کے قریب ایک گاؤں میں پیدا ہوئے، ابتدائی نشو و نما کے بعد دہلی کا سفر کیا اور مولانا قطب الدین دہلوی وغیرہ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا، ۱۲۸۳ھ میں مکہ مکرمہ ہجرت فرما گئے اور وہاں شاہ عبدالغنی دہلویؒ سے حدیث کی سند و اجازت حاصل کی، پچاس سال تک مکہ مکرمہ میں مقیم رہ کر مصروف درس و افادہ رہے، ان سے اپنے وقت کے بڑے بڑے اہل علم نے کسب فیض کیا، تصانیف کے اندر "الاکلیل" کو بہت شہرت حاصل ہوئی، ۱۹؍ شوال ۱۳۳۳ھ کو مکہ ہی میں فوت ہوئے اور جنت المعلیٰ میں مدفون ہوئے۔ (نزهۃ الخواطر ۸/۲۲۱-۲۲۰)

(۲) حضرت مولانا قطب الدین بن محی الدین حنفی دہلوی کا شمار اپنے وقت کے بڑے فقہاء و محدثین میں ہوتا تھا، مولانا شاہ اسحاق صاحب دہلوی کی خدمت میں رہ کر فقہ و حدیث کا درس لیا، بڑے عابد و زاہد اور متقی تھے، تصنیف و تالیف کا اعلیٰ ذوق رکھتے تھے، فقہ حنفی کی حمایت و مدافعت میں پیش پیش رہتے، شیخ نذیر حسین دہلوی کے رد میں انھوں نے کئی کتابیں لکھیں، اخیر عمر میں حجاز چلے گئے تھے، اور ۶۵ سال کی عمر میں ۱۲۸۹ھ میں مکہ مکرمہ میں وفات پائی۔ (نزهۃ الخواطر ۷/۳۸۸-۳۸۷)

(۳) محمد سعید بن محمد سنبل مجلائی شافعی مکہ کے باشندہ تھے اور مسجد حرام میں درس و افتاء کی خدمت انجام دیتے تھے، طائف میں ۱۱۷۵ھ م ۱۷۶۱ء میں فوت ہوئے۔ تصانیف میں رسالۃ الاوائل کے علاوہ دیگر کتابیں بھی ہیں۔ (الاعلام ۶/۱۴۰)

حضرت محدث کبیرؒ کی ایک اور سند مولانا عبدالرحمٰن صاحب بھوپالی کے واسطہ سے ہے، مولانا عبدالرحمٰن صاحب شاگرد مولانا عبدالقیوم صاحبؒ(۱) کے تھے، اور مولانا عبدالقیوم صاحب داماد حضرت شاہ اسحاق صاحب دہلویؒ کے تھے، اور شاہ صاحب سے ان کو شرف مصاہرت کے علاوہ شرف تلمذ اور اجازت حدیث بھی حاصل تھی۔

اسناد عالی و اسناد نازل سند کی اہمیت اور حضرت محدث کبیرؒ کے سلسلۂ اسانید کے ذکر کے بعد ایک بات اور عرض کر دینا مناسب ہوگا کہ سند کی دو قسمیں ہوتی ہیں: ایک عالی اور دوسری نازل۔ عالی اس سند کو کہتے ہیں جس کے سلسلہ میں راویوں کی تعداد کم ہو، اور نازل اس سند کو کہتے ہیں جس میں راویوں کی تعداد زیادہ ہو، اس کو یوں سمجھئے کہ مذکورہ بالا تمام سندیں حضرت شاہ اسحاق صاحبؒ کے واسطے سے ہیں، گویا ان کی حیثیت واسطۃ العقد کی ہے لیکن آخری سند میں علامہ اعظمی اور شاہ صاحب کے درمیان صرف دو واسطے ہیں، ایک مولانا عبدالرحمٰن بھوپالی، دوسرے مولانا عبدالقیوم صاحب، لہٰذا یہ سند عالی ہوئی، اسی طرح مولانا عبدالغفار صاحب کے طریق سے جو دونوں سندیں ہیں ان میں تین تین واسطے ہیں، اول میں مولانا عبدالغفار صاحب، مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی اور مولانا عبدالغنی صاحب مجددی۔ ثانی میں مولانا عبدالغفار صاحب کے بعد مولانا عبدالحق صاحب الہ آبادی اور ان کے بعد نواب قطب الدین صاحب، یہ دونوں سندیں پہلی سند کے مقابلہ میں نازل ہوئیں۔ ان کے علاوہ باقی جو سندیں ہیں ان سب میں آپ کے اور شاہ صاحب کے درمیان چار چار واسطے ہیں تو وہ ان سب سے نازل ہوئیں۔

(۱) حضرت مولانا عبدالقیوم بن عبدالحی بڈھانوی ۱۲۳۱ھ میں پیدا ہوئے، حضرت سید احمد شہیدؒ کے پاس قرآن حفظ کیا اور انھیں کے دست حق پرست پر بیعت کی، اپنے وقت کے ممتاز اہل علم سے علم حاصل کیا، اور شاہ اسحاق صاحب دہلوی سے فقہ وحدیث کی کتابیں پڑھ کر اجازت حاصل کی، ان کا شمار اپنے وقت کے علماء وفقہاء وکاملین میں ہوتا تھا، بڑی تعداد میں لوگوں نے ان سے استفادہ کیا، ۱۲۹۹ھ میں ستر سال کی عمر میں فوت ہوئے۔ (نزہۃ الخواطر ۷/۲۹۸-۲۹۷)
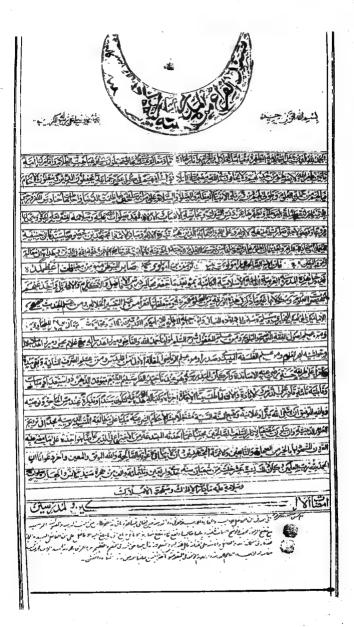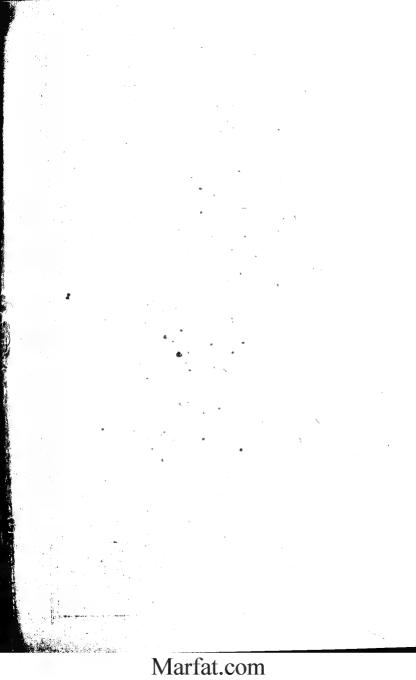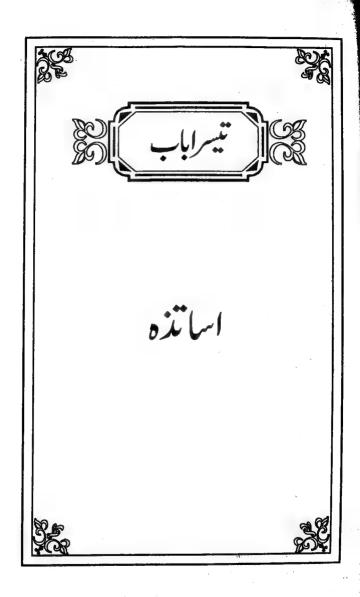
تیسرا باب

اساتذہ

تیسرا باب

اساتذہ

یہ علامہ اعظمی کی خوش نصیبی تھی کہ ان کو اپنے وقت کی بلند پایہ اور گرانمایہ علمی شخصیتوں کے خرمن علم سے خوشہ چینی کی سعادت نصیب ہوئی، آپ کو جن اصحاب فضل و کمال کے دامن فضل سے وابستگی اور سرچشمۂ علم و فن سے کسب فیض اور اکتساب علم کا شرف حاصل ہوا ان میں کئی ایک اس زمانہ کے عبقری اور علم و فن کی آبرو تھے، بلکہ ان میں چند ایسے بھی تھے کہ ان جیسے صدیوں میں بہ مشکل پیدا ہوتے ہیں۔

آپ نے جن اساتذہ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا ان میں زمانہ کے ایسے نابغہ و یکتا ہیں، جن کی نسبت کچھ عرض کرنا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہوگا، مگر چونکہ صاحب سوانح کے سوانح حیات اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتے، جب تک ان کا تذکرہ نہ ہو جن کے فیوض تعلیم و تربیت صاحب سوانح کے کردار و شخصیت کی تکمیل میں ممد و معاون رہے ہیں، اس لئے ذیل میں ہم مختصراً آپ کے ان اساتذہ کا ذکر کر رہے ہیں جن سے آپ کو باقاعدہ شرف تلمذ حاصل رہا۔

مولانا عبدالغفار صاحب عراقی مئوی استاذ العلماء مولانا عبدالغفار بن شیخ عبداللہ بن شیخ تراب علی بن شیخ میہان بن شیخ ہمت علی عراقی مئوی حنفی کی ولادت ۲ صفر ۱۲۸۳ھ کو آپ کے آبائی مکان واقع محلہ اورنگ آباد قصبہ مئو میں ہوئی (۱) نزھۃ الخواطر

(۱) تذکرۂ علماء اعظم گڈھ ص ۱۷۱

میں آپ کے بارے میں یہ الفاظ مذکور ہیں: "الشیخ الفاضل عبدالغفار ابن عبدالله المئوی الأعظم گڈھی أحد العلماء المشهورین ۰۰۰"(۱)

(یعنی شیخ فاضل عبدالغفار بن عبداللہ مئوی اعظم گڈھی مشہور علماء میں سے ایک ۰۰۰) والد محترم نے تاریخی نام ظہور السنان تجویز کیا، تعلیم وتربیت کی ابتدا گھر سے ہوئی، قرآن کریم اور فارسی کی ابتدائی کتابیں اپنے والد کے پاس پڑھیں، فارسی زبان سیکھنے کے بعد مولانا جمال الدین مئوی اور مولانا فیض اللہ مئوی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا، اور ان سے نحو وصرف، حدیث وفقہ اور منطق کی ابتدائی کتابیں پڑھیں، اسی اثنا میں مولانا امام الدین پنجابیؒ نے جہاں گردی کرتے ہوئے مئو وارد ہو کر رخت سفر کھولا، مولانا عبدالغفار صاحب نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور ایک عرصہ تک ان کی تعلیم وتربیت سے بہرہ مند ہوتے رہے، اس کے بعد تحصیل وتکمیل کے لئے گھر سے باہر قدم نکالا، راستہ میں جو منزل سب سے پہلے آئی وہ ضلع بلیا کا قصبہ نوانگر تھا، وہاں کے مدرسہ انوار العلوم میں شاہ عبدالغنی مجددی کے شاگرد رشید مولانا حکیم عبداللہ مجددی مصروف درس وافادہ تھے، ان سے استفادہ کے بعد مرزاپور کا رخ کیا، وہاں ایک دوسرے فاضل بزرگ مولانا عبدالاحد الہ آبادی تلمیذ مولانا عبدالحی فرنگی محلی نے درس وتدریس کا بازار گرم کر رکھا تھا، ان سے بہت ساری کتابیں پڑھنے کے بعد سند یافتہ ہو کر گھر لوٹے، یہ ۱۸۸۶ء م ۱۳۰۴ھ کا سال تھا اور مولانا کی عمر ابھی ۲۱ سال سے کچھ اوپر تھی۔

یہ وہ زمانہ تھا جب مولانا عبدالحی فرنگی محلی کے علم وفضل کی شہرت نصف النہار پر تھی، مولانا عبدالغفار صاحب نے علم کے اس مہر درخشاں سے بھی اپنے سینہ کو منور کرنا چاہا عالم اشتیاق میں لکھنو پہنچے۔ مگر وہ وہاں پہنچے تو مولانا عبدالحی صاحب کی زندگی کی شام ہو چلی تھی، اور آپ کے پہنچنے کے چند ہی دنوں کے بعد علم وفضل کا وہ نیر تاباں غروب ہو گیا۔

مولانا عبدالغفار صاحب کو مولانا عبدالحی فرنگی محلی کی مرگ ناگہانی کا سخت صدمہ پہنچا

(۱) نزھۃ الخواطر ۸: ۲۶۹

اور اپنی محرومی پر بہت شکستہ دل اور آزردہ خاطر ہوئے، لیکن رحمت رب سے مایوس نہیں ہوئے، اور لکھنؤ ہی میں قیام کر کے اپنی عنان توجہ ایک دوسرے علم کی طرف مبذول کی، یعنی لکھنؤ کے مشہور و معروف حکماء سے طب کی تعلیم حاصل کی۔

لکھنؤ میں ایک سال قیام رہا، دوسرے سال یعنی ۱۳۰۵ھ میں گنگوہ کا رخ کیا اور تقریباً ۹ مہینے (ذی قعدہ ۱۳۰۵ھ سے شعبان ۱۳۰۵ھ تک) حضرت گنگوہی قدس سرہ کی خدمت میں گذار کر صحاح ستہ پڑھی اور سند و اجازت حدیث سے سرفراز اور حضرت گنگوہیؒ کے ارشد و نامور تلامذہ میں شمار ہوئے۔

فراغت کے بعد وطن تشریف لائے اور درس و تدریس کی بساط بچھائی، چند سال جامع مسجد شاہی میں تعلیم دی، لیکن کچھ ہی مدت بعد یہ سلسلہ ختم کر کے ۱۳۰۸ھ میں مہاراج گنج گئے، دو تین سال تک وہاں تدریسی خدمت انجام دی، ۱۳۱۱ھ میں مدرسہ انوار العلوم نوانگر بلیا کے اہل حل و عقد کے اصرار پر وہاں منتقل ہوگئے، اور مدت مدید تک اس سے وابستہ رہے، اس دوران بے شمار طلبگاران علم نے آپ سے کسب فیض کیا، اور درس کی مقبولیت کے ساتھ ساتھ علم و فضل کا شہرہ بھی عام ہوگیا۔

۱۳۲۱ھ میں حج کی سعادت سے مشرف ہوئے، اور وہاں شیخ الدلائل مولانا عبدالحق صاحب الہ آبادی مہاجر مکی (متوفی ۱۳۳۳ھ) سے حدیث کی اجازت و سند حاصل کی۔

انوار العلوم نوانگر میں تقریباً اٹھارہ سال تک فریضۂ تدریس انجام دینے کے بعد ایک بار پھر مہاراج گنج گئے، لیکن دو ہی سال کا عرصہ گذرا تھا کہ ۱۳۳۱ھ میں گورکھپور کے مدرسۂ اسلامیہ میں بحیثیت صدر مدرس تشریف لے گئے، اور یہیں آپ کے تلمیذ ارشد حضرت علامہ اعظمی نے آپ کے سامنے غالباً پہلی بار جبین عقیدت خم اور زانوئے تلمذ تہ کیا، ۱۳۳۴ھ میں مدرسہ مظہر العلوم بنارس کی صدارت تدریس کو بھی رونق بخشی لیکن چند سال بعد دوبارہ گورکھپور چلے گئے، اور آخر تک وہاں تدریسی خدمت انجام دیتے رہے۔

عظیم الشان تدریسی اور تصنیفی و تالیفی خدمات کی انجام دہی کے بعد ۱۳۴۱ھ میں جان جان آفریں کے سپرد کردی۔ عیدگاہ اورنگ آباد مئو کے جانب جنوب نیاپورہ جانے والے راستہ کے بالکل قریب مزار ہے۔ رحمه الله رحمة واسعة.

مولانا عبدالغفار صاحبؒ سے بیشمار طلباء علم نے علم پڑھا، آپ کے بہت سے شاگرد نامور ہوئے، لیکن آپ کے جس شاگرد کو آفاقی شہرت و ناموری حاصل ہوئی وہ مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمیؒ ہیں۔ علامہ اعظمیؒ نے اپنے استاذ کو ان بلند آہنگ الفاظ سے یاد فرمایا ہے: "... العلامة الفهامة الفقيه النبيه الشيخ ابى الانوار عبدالغفار بن عبدالله العراقى"

علامہ اعظمیؒ نے مولانا عبدالغفار صاحبؒ سے گورکھپور کے زمانہ طالب علمی میں "نورالانوار" اور "شرح وقایہ" وغیرہ کتابیں پڑھیں، پھر جب بنارس پہنچے ہیں تو وہاں درس نظامی میں داخل عربی ادب کی جملہ کتابوں کے علاوہ بدیع الزماں ہمدانی کی مقامات، زمخشری کی "اطواق الذہب" ابن قتیبہ کی "الشعر والشعراء" کا کچھ حصہ، قصیدہ بانت سعاد، دیوان ابوالعتاھیہ، اور کتب بیان و معانی، منطق میں ملاحسن کی شرح سلم اور حدیث و اصول حدیث میں مشکوٰۃ شریف، شرح نخبہ کا کچھ حصہ اور جامع ترمذی جلد اول تقریباً مکمل پڑھی۔ علامہ اعظمیؒ فرماتے ہیں:

> "وواعدنى الشيخ مراراً بكتب إجازة علم الأدب لكن اخترمته المنية دون ايفاء وعده ، فلم يفرد لى إجازة الأدب ، لكنه أجازنى بجميع ما أجازه شيوخه فد خلت فى تلك الاجازة العامة "
>
> (حضرت استاد نے بارہا مجھ سے علم ادب کی اجازت کو لکھ کر دینے کا وعدہ کیا، لیکن ایفاء عہد سے پہلے ہی داعیٔ اجل آپہنچا، جس کی وجہ سے وہ مجھے ادب کی خصوصی اجازت نہیں دے سکے، مگر انھوں نے مجھے ان تمام چیزوں کی اجازت عطا کی ہے جن کی ان کے اساتذہ نے انھیں دی ہے، لہذا اس عام اجازت میں میں داخل ہوں)

اور اعیان الحجاج (۲ر۳۸۳) میں فرماتے ہیں:

"آپ حضرت گنگوہی کے ارشد تلامذہ میں تھے۔ آپ کے تلامذہ میں مولانا محمد ابراہیم صاحب بلیاوی صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند تھے، ناچیز کو بھی آپ ہی کی خدمت میں کچھ شُدبُد حاصل ہوئی ہے۔"

مولانا مرحوم کی جلالت شان اس درجہ پہنچی ہوئی تھی کہ ان کو علم میں حضرت تھانویؒ کے ہم پایہ شمار کیا جاتا تھا، مولانا عثمان صاحب معروفی استاذ مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور تحریر فرماتے ہیں:

"مولانا عبدالغفار صاحب کو علم میں حضرت تھانوی م ۱۳۶۲ھ ر ۱۹۴۳ء کا ہم پایہ کہا جاتا تھا"(۱)

اللہ تعالیٰ نے آپ کو تعلیم وتربیت اور مردم سازی کی استعداد کے ساتھ تصنیف وتالیف کے ملکۂ تامہ سے بھی نوازا تھا، چنانچہ آپ نے متعدد موضوعات پر گرانقدر تصنیفات یادگار چھوڑیں۔ شاعر بھی تھے اور ضیا تخلص کرتے تھے، ایک مجموعۂ کلام "تحفۂ ضیائی" مطبوع ہے۔ سلوک وتصوف میں حضرت چاند شاہ ٹانڈوی سے مجاز بیعت تھے۔

مولانا کریم بخش صاحب سنبھلی مولانا کریم بخش صاحب سنبھلی کی تاریخ ومقام ولادت کا علم نہیں ہو سکا، تیرہویں صدی کے اواخر یا چودہویں صدی کے اوائل میں غالباً سنبھل میں آپ کی ولادت ہوئی، ابتدائی تعلیم سنبھل ہی میں حاصل کی اور متوسطات تک پڑھنے کے بعد امروہہ گئے، کچھ دنوں تک وہاں زیر تعلیم رہنے کے بعد دیوبند روانہ ہوئے اور دارالعلوم میں داخلہ لیا، حضرت شیخ الہندؒ کے پاس صحاح ستہ پڑھ کر ۱۳۱۷ھ میں دورۂ حدیث کی تکمیل کی اور سند حدیث حاصل کی۔

ہاپوڑ اور کانپور کے مدرسہ جامع العلوم میں تدریسی خدمات انجام دیں، جامع العلوم میں منصب صدارت پر بھی فائز رہے، غالباً ۱۳۴۰ھ میں مئو آئے اور مدرسہ دارالعلوم میں

(۱) ترجمان دارالعلوم اکتوبر ۱۹۹۶ء ص ۳۱

شیخ الحدیث وصدر مدرس ہوئے،اور کئی سال تک درس وافادہ کی مجلس سجائے رکھی، یہاں آپ کے خرمن علم سے خوشہ چینی کرنے والوں میں علامہ اعظمی اور مولانا عبداللطیف نعمانی جیسے جلیل القدر اہل علم تھے،اور یہیں رئیس المناظرین مولانا محمد منظور نعمانی بھی آپ کے دامن تربیت سے وابستہ رہے۔ آپ کے شاگردوں میں ان حضرات کے علاوہ مولانا سید فخر الدین احمد مراد آبادی (سابق شیخ الحدیث شاہی مراد آباد ودارالعلوم دیوبند) تھے،جنھوں نے ہاپوڑ کے زمانۂ قیام میں آپ سے علم حاصل کیا تھا۔اس طرح ان کے متعدد شاگرد فخر روزگار ہوئے۔

آپ کا شمار جید الاستعداد علماء میں ہوتا تھا،علم وعمل میں ممتاز اور درس وتدریس میں طاق تھے، تلامذہ کی عظمت وبلندی کو دیکھ کر کہا جاسکتا ہے کہ مردم سازی میں فرد اور باکمال تھے۔بالخصوص مولانا محمد منظور نعمانیؒ توانھیں کے تربیت یافتوں میں شمار ہوتے تھے ۔علامہ اعظمی سے ان کی مراسلت بھی تھی اور ان کے متعدد مکاتیب علامہ اعظمی کے نام پائے جاتے ہیں۔

سن وفات تاریخ دارالعلوم (۸۶/۲)اور کاروان رفتہ (ص ۲۱۶) میں ۱۳۶۲ھ مکتوب ہے، جب کہ علامہ اعظمی نے اپنی بیاض میں ۱۷ر شوال ۱۳۶۱ھ ارقام فرمایا ہے(۱) وفات سنبھل (مراد آباد) میں ہوئی۔

امام العصر علامہ انور شاہ کشمیری

امام العصر علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کشمیر کے ایک گاؤں دودھ وان میں ۲۷ر شوال ۱۲۹۲ھ کو پیدا ہوئے، قرآن کریم اور ابتدائی تعلیم اپنے والد محترم مولانا سید معظم شاہ سے حاصل کی،۱۳۱۰ھ میں دیوبند پہنچے،وہاں چار سال رہ کر حدیث وتفسیر کے علاوہ مختلف علوم وفنون کی تکمیل کی اور ۱۳۱۴ھ میں سند فراغ حاصل کی،اس کے بعد ایک دوسرے منبع علم وعرفان گنگوہ تشریف لے گئے اور مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس سرہ سے سند واجازت حدیث کے علاوہ خرقۂ خلافت پایا اور اس

(۱) الفرقان کی اشاعت خاص ۱۹۹۸ء "بانیٔ الفرقان نمبر" (ص ۶۰۶) پر بھی سن وفات ۱۳۶۱ھ درج ہے۔

طرح ظاہر کے ساتھ باطن کو بھی منور کرنے کا سامان بہم پہنچایا۔

دہلی کے مدرسہ امینیہ سے درس و تدریس کا آغاز کیا، وہاں کئی برس تک اس خدمت کو انجام دینے کے بعد ۱۳۲۰ھ م ۱۹۰۳ء میں کشمیر چلے گئے اور اپنے وطن اور علاقہ میں علم کا نور پھیلانے کے لئے ایک مدرسہ فیض عام کے نام سے قائم کیا۔ ۱۳۲۳ھ مطابق ۱۹۰۵ء میں حج بیت اللہ کے ارادے سے حجاز تشریف لے گئے اور سعادت حج کے علاوہ کچھ مدت تک حجاز میں قیام فرما کر وہاں کے کتب خانوں سے استفادہ فرمایا، اور شیخ حسین بن محمد جسر طرابلسی سے حدیث کی سند حاصل کی۔

۱۳۲۷ھ مطابق ۱۹۰۹ء میں دارالعلوم دیوبند تشریف لے گئے اور کئی سال تک بلا معاوضہ و مشاہرہ دارالعلوم میں تدریسی امور انجام دیتے رہے، ۱۳۳۳ھ میں جب شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحب عازم حجاز ہوئے تو شاہ صاحب کو اپنا جانشین بنا کر مسند صدارت پر بٹھایا۔۔۔۔۔۔ آپ اس منصب پر تقریباً بارہ سال متمکن رہے اور اس اثنا میں بخاری اور ترمذی کا درس نہایت تحقیق و تدقیق اور کمال و مہارت کے ساتھ دیتے رہے تا آنکہ ۱۳۴۶ھ کے اوائل میں دارالعلوم کے ارباب اہتمام سے آپ کے کچھ اختلافات ہو گئے۔ جس کی وجہ سے دارالعلوم کو خیر باد کہہ دیا، اور ڈابھیل تشریف لے گئے، ڈابھیل کے لوگوں نے شاہ صاحب کے لئے دیدہ و دل فرش راہ کئے اور جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین میں جب آپ نے نزول اجلال فرمایا تو آپ کے نور علم سے وہاں کا ذرہ ذرہ چمک اٹھا، وہ اپنے درس و افادہ سے پانچ سال تک رزم میں بزم کا سمان پیدا کرتے رہے، لیکن اسی دوران بواسیر جیسے مہلک مرض کا شکار ہو گئے، امراض کی شدت سے مجبور ہو کر دیوبند آئے اور وہیں ۳/ صفر ۱۳۵۲ھ مطابق ۱۹۳۳ء کو آپ نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا اور ساٹھ سال کی عمر میں علم و فضل کا یہ نیر تاباں اس عالم آب و گل سے روپوش ہو گیا۔

شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ ذہانت و فطانت، فہم و ذکاوت، جودت طبع، وفور علم، وسعت مطالعہ اور دیگر بہت سی خصوصیات کے لحاظ سے نادرۂ عصر اور نابغۂ روزگار اور درس و تدریس، بالخصوص تدریس حدیث میں یگانہ و یکتا تھے، نہ جانے کتنے تشنگان علم و طلبگاران فضل آپ

کے فیض سے مستفیض ہوئے۔ برصغیر کی بساط درس و تدریس پر نظر آنے والے بیشتر اصحاب فضل و کمال شاہ صاحب ہی کے فیض یافتہ تھے۔

شاہ صاحب کی عبقریت اور وفور علم کا اعتراف بڑے بڑے معاصر اہل علم و فضل نے کیا ہے، ۱۳۳۰ھ میں مصر کے مشہور عالم سید رشید رضا صاحب ہندوستان تشریف لائے تو اپنی سیاحت کے دوران وہ دارالعلوم کے معائنہ کے لئے دیوبند تشریف لے گئے، علامہ رشید رضا کے استقبال میں دارالعلوم میں جو تقریب ہوئی اس میں شاہ صاحب نے عربی زبان میں نہایت فصیح و بلیغ اور برجستہ تقریر کی، سید رشید رضا شاہ صاحب کی شخصیت سے اس قدر متاثر ہوئے کہ فرمایا:

والله ما رأيت مثل هذا العالم الجليل قط۔ میں نے اس جلیل القدر عالم جیسا آدمی نہیں دیکھا

شاہ صاحب کی متعدد تصانیف ان کی یادگار ہیں، جن میں کچھ تو ایسی ہیں جو ان کے درسی افادات ہیں جس کو ان کے شاگردوں نے مرتب کیا ہے، انھیں میں صحیح بخاری پر آپ کی تقریر ہے جو فیض الباری کے نام سے مولانا بدر عالم صاحب میرٹھی کی ترتیب سے چار جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔

مولانا شبیر احمد عثمانی بانیان دارالعلوم دیوبند میں ایک مشہور بزرگ مولانا فضل الرحمٰن عثمانیؒ (متوفی ۱۳۲۵ھ م ۱۹۰۷ء) تھے، ان کے تین صاحبزادے بڑے صاحب علم و فضل ہوئے، جن کے وجود سے مولانا فضل الرحمٰن صاحب کا گھرانہ "ایں خانہ ہمہ آفتاب است" کا مصداق بن گیا تھا، ان کے اخلاف میں مفتی عزیز الرحمٰن صاحب عثمانی سابق مفتی دارالعلوم دیوبند تھے، جن کا ذکر اسی باب میں آئے گا۔ دوسرے مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی دیوبندی (متوفی ۱۳۴۸ھ م ۱۹۲۹ء) تھے، آپ دارالعلوم دیوبند کے مہتمم تھے، آپ کا قلمی شاہکار اور معرکۃ الآراء تصنیف "دنیا میں اسلام کیوں کر پھیلا" ہے۔ اور تیسرے مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی جن کا ذکر درج ذیل ہے۔

علامہ شبیر احمدؒ عثمانی مذکورہ بالا عثمانی خانوادے کے گل سرسبد تھے، اس خانوادے

کا نام سب سے زیادہ آپ ہی کے نام سے روشن ہوا۔ وہ ۱۳۰۵ھ م ۱۸۸۷ء میں بمقام بجنور پیدا ہوئے (۱)۔ بچپن ہی میں قرآن حفظ کر لیا تھا، اس کے بعد مزید تعلیم کے لئے دارالعلوم میں داخل کر دیئے گئے، اور ۲۰/بیس سال کی عمر میں ۱۳۲۵ھ م ۱۹۰۷ء میں دارالعلوم ہی میں علم وفن کی تکمیل کی۔ (۱)

فراغت کے بعد فروغ کا دور شروع ہوا اور پہلی منزل جو سامنے آئی وہ دہلی کا مدرسہ امینیہ تھا، جس کے وہ صدر مدرس مقرر ہوئے، مدرسہ امینیہ میں آپ نے تقریباً تین سال تدریس وصدارت تدریس کا منصب سنبھالے رکھا، ۱۳۲۸ھ م ۱۹۱۰ء میں دارالعلوم دیوبند کے ارباب بست وکشاد نے ان کے لئے دارالعلوم میں مناسب جگہ تجویز کی اور ان کو دہلی سے دیوبند بلا لیا گیا۔ وہاں سالہا سال تک درس وتدریس کی خدمت انجام دی، بالخصوص درس حدیث کی شہرت دور دور پہنچی۔ ۱۳۴۶ھ م ۱۹۲۸ء میں جب دارالعلوم دیوبند میں کچھ اختلافات ظہور میں آئے تو شاہ صاحب کے ساتھ آپ بھی دارالعلوم چھوڑ کر جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل تشریف لے گئے اور اس کی ترقی اور فروغ کے لئے شاہ صاحبؒ کے سہیم وشریک ہوئے۔

۱۳۵۲ھ کے اوائل میں شاہ صاحبؒ کے وصال کے بعد آپ کو شیخ الحدیث کا منصب سپرد کیا گیا، اس منصب کو سنبھالے ہوئے ابھی دو ہی سال گذرے تھے کہ دارالعلوم دیوبند کے ارباب اہتمام سے مفاہمت عمل میں آگئی اور ۱۳۵۴ھ م ۱۹۳۵ء میں دارالعلوم تشریف لائے اور ۱۳۶۲ھ م ۱۹۴۴ء تک بحیثیت صدر مدرس دارالعلوم کی خدمات انجام دیتے رہے (۲)

تقسیم ہند سے کچھ پہلے پاکستان ہجرت کر گئے اور قیام پاکستان کے بعد وہاں بہت سی سیاسی، ملی اور دینی خدمات انجام دیں، سیاست سے ان کا تعلق پاکستان ہجرت کرنے سے قبل بھی رہا، اور بعض اہم سیاسی امور میں انھوں نے سرگرم حصہ بھی لیا۔

(۱) تاریخ دارالعلوم دیوبند ۲:۹۸

(۲) تاریخ دارالعلوم دیوبند ۲:۹۹، ۲۴۰

وفات پاکستان کی ریاست بھاولپور میں ۲۱؍صفر ۱۳۶۹ھ مطابق ۱۳؍دسمبر ۱۹۴۹ء کو چند گھنٹے کی علالت کے بعد ہوئی اور پاکستان کے مشہور شہر کراچی میں مدفون ہوئے۔

علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کے مسلم شریف کے درس کو آفاقی شہرت حاصل تھی، اور اس درس سے استفادہ کی نعمت بہت کچھ علامہ اعظمیؒ کے حصہ میں بھی آئی، صحیح مسلم آپ نے ان سے اس وقت پڑھی جب تحصیل علم کی غرض سے دوبارہ ۱۳۳۹ھ میں دیوبند تشریف لے گئے تھے (۱)۔ علامہ عثمانیؒ کے دل میں آپ کی حد درجہ قدر و منزلت تھی اور ایک عرصے تک ان سے سلسلۂ مراسلت بھی رہا، علامہ عثمانیؒ نے شاگرد رشید علامہ اعظمیؒ کو جو خطوط لکھے ہیں وہ علامہ اعظمی کی یادگار میں شائع ہونے والے مجلہ "المآثر" جلد نمبر ۷ شمارہ نمبر ۱ میں صفحہ ۸۲ تا ۹۲ شائع ہو چکے ہیں، جن سے استاذ و شاگرد کے تعلقات پر بہت حد تک روشنی پڑتی ہے۔

علامہ اعظمی کا اپنے استاذ علامہ عثمانیؒ سے اس درجہ تعلق خاطر تھا کہ جب علامہ عثمانی مرحوم ہندوستان سے پاکستان ہجرت فرما گئے تو علامہ اعظمیؒ نے اپنے شاگرد مفتی محمد ظفیر الدین صاحب کو ایک خط میں اس پر اس طرح اظہار تاسف کیا:

> "مجھ کو بھی کسی کے پاکستان جانے کا کوئی رنج نہیں، لیکن حضرت مولانا شبیر احمد (عثمانی) رحمۃ اللہ علیہ اور سید صاحب کے پاکستان منتقل ہو جانے کا صدمہ دل سے کبھی نہیں جا سکتا"۔ (۲)

علامہ عثمانی کی وفات پر علامہ اعظمیؒ نے عربی زبان میں ۱۳۷ اشعار پر مشتمل ایک زبردست مرثیہ لکھا، جس کے چند اشعار یہ ہیں:

أراني و قلبي دائما يتوجع ولست أرى دمعي عن العين يقلع

يفجعني دهري فلا يكتفي بوا حد بل بحبر بعد آخر يفجع

(۱) علامہ اعظمی نے علامہ عثمانی سے صحیح مسلم جلد اول تا کتاب الزکوۃ پڑھی تھی۔ دیکھئے المآثر جلد نمبر ۷ شمارہ نمبر ۱ صفحہ ۸۳۔

(۲) مشاہیر علماء ہند کے علمی مراسلے ص ۱۶۰

خليل و محمود ، عزيز و أنور و أشرف ، كانوا بيننا ثم أقشعوا
ومن بعدهم مولاى شبير أحمد الإمام الهمام القرم أمسى يودع

یہ پورا مرثیہ برہان ج ۲۰ ش ۳ میں شائع ہوا ہے۔

مولانا اصغر حسین دیوبندی مولانا اصغر حسین دیوبندی کی ۱۲۹۴ھ میں دیوبند میں ولادت ہوئی(۱)، قرآن کریم اور فارسی کی ابتدائی تعلیم والد ماجد شاہ محمد حسن (متوفی ۱۳۱۲ھ) کے پاس حاصل کی، بعد ازاں دار العلوم (دیوبند) میں داخل ہوئے اور ۱۳۲۰ھ میں فراغت پائی۔

تکمیل کے بعد حضرت شیخ الہندؒ کے ارشاد پر جونپور کی اٹالہ مسجد کے مدرسہ میں صدارت تدریس کا عہدہ سنبھالا اور سات سال تک درس و تدریس کی خدمت انجام دیتے رہے، جونپور کے زمانۂ قیام میں آپ کے علم و فضل کے ساتھ زہد و تقویٰ اور ورع و تدین کی بھی بڑی شہرت ہوئی، چنانچہ ۱۳۲۶ھ م ۱۹۰۹ء میں جب مدرسۃ الاصلاح سرائے میر کا قیام عمل آیا تو آپ ہی کے ہاتھوں سے اس کا افتتاح ہوا، اس واقعہ کا ذکر علامہ سید سلیمان ندویؒ نے حیات شبلی میں کیا ہے، لیکن اس مقام پر مصنف علیہ الرحمہ سے ایک عجیب و غریب سہو ہوا ہے، وہ فرماتے ہیں:

> "اس زمانہ میں مولانا سید اصغر حسین صاحب جواب دیوبند کے مدرسہ میں ہیں، اور نہایت مقدس بزرگ ہیں، اٹالہ کی جامع مسجد جونپور میں پچیس ۲۵ برس سے مدرس تھے، وہ تشریف لائے اور ان کے ہاتھوں سے مدرسہ کا افتتاح ہوا"۔(۲)

غالباً سبقت قلم کی وجہ سے پانچ برس کا پچیس برس ہو گیا ہے۔

مولانا اصغر حسین صاحب نے ۷/ سال تک جونپور میں درس و افادہ کا سلسلہ جاری رکھا، ۱۳۲۸ھ میں آپ کو دیوبند طلب کیا گیا جہاں رسالہ "القاسم" کے ادارتی امور

(۱) تاریخ دار العلوم دیوبند ۲: ۹۰
(۲) حیات شبلی ص ۶۸۲

اور ساتھ ہی مختلف کتابوں کے اسباق بھی آپ کے سپرد ہوئے۔(۱) پوری زندگی "در کفے جام شریعت در کفے سندان عشق" کا نمونہ رہی، چنانچہ شریعت و طریقت دونوں کو متوازن طور پر قائم رکھا، وفور علم اور عمق فہم اس پر مستزاد، اجازت و خلافت شیخ المشائخ سید الطائفہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی سے حاصل تھی۔

شاہ صاحب علیہ الرحمۃ کی جب وفات واقع ہوئی تو متعدد اہل علم اور اکابر کی موجودگی کے باوجود نماز جنازہ کی امامت آپ نے فرمائی

۱۳۶۴ھ میں وفات پائی آپ کی وفات کا قصہ تاریخ دارالعلوم میں یوں مذکور ہے:

"۱۳۶۳ھ کے اواخر میں اپنے متوسلین کی دعوت پر گجرات تشریف لے گئے، راندیر میں قیام تھا کہ اچانک حرکت قلب بند ہوگئی اور ۲۲ر محرم الحرام ۱۳۶۴ھ بروز دوشنبہ داعی اجل کو لبیک کہا وہیں دفن ہیں (۲)

دیوبند کے خاندان سادات میں ایک مشہور صاحب دل تھے، جن کی سادگی اور سادہ لوحی کے عجیب و غریب واقعات لوگوں نے لکھے ہیں، میاں جی منے شاہؒ کے نام سے معروف تھے، مولانا اصغر حسین صاحب کو ان سے شرف بیعت بھی حاصل تھا، ان کے بارے میں سید محبوب رضوی نے "تاریخ دارالعلوم دیوبند" میں لکھا ہے کہ وہ مولانا اصغر حسین کے ماموں تھے (۳) جبکہ مولانا انظر شاہ صاحب نے حضرت شاہ صاحبؒ کی سوانح حیات "نقش دوام" کے حاشیہ میں مولانا اصغر حسین کو ان کا نواسہ لکھا ہے (۴)

بہر حال حقیقت کچھ بھی ہو مولانا اصغر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا علم و فضل مسلم تھا، ان کے علم کی یادگار ان کی وہ تصنیفات ہیں جن کی تعداد کم و بیش ۳۵ر ہے، جو

---

(۱) تاریخ دارالعلوم ۲: ۹۰

(۲) تاریخ دارالعلوم دیوبند ص ۹۱

(۳) تاریخ دارالعلوم دیوبند ص ۹۱

(۴) نقش دوام ص ۵۳

فقہ و فرائض اور تاریخ وغیرہ کے موضوعات پر تصنیف کی گئی ہیں (۱)

علامہ اعظمیؒ کو میاں صاحب سے شرف تلمذ اس وقت حاصل ہوا جب وہ طلب علم کے لئے دوبارہ دیوبند تشریف لے گئے، ان سے آپ نے سنن ابی داؤد جلد اول تا کتاب الصلوٰۃ پڑھی تھی۔

مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی | مولانا فضل الرحمٰن صاحب عثمانی کے صاحبزادے اور علامہ شبیر احمد عثمانی کے برادر بزرگ تھے، ۱۲۷۵ھ میں دیوبند میں ولادت ہوئی، علوم وفنون کی تکمیل دارالعلوم دیوبند میں کی، تاریخ دارالعلوم میں ان کا سال فراغت ۱۲۹۵ھ درج ہے (۲) مگر نزہۃ الخواطر (۸/۳۲۰) اور اسی کی متابعت میں تذکرہ علماء اعظم گڈھ (ص ۶۹) کے حاشیہ میں ان کا سال فراغ ۱۲۹۸ھ مذکور ہے۔ تاریخ دارالعلوم کا بیان قرین صواب معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس میں اس کے بعد تحریر ہے: "۱۲۹۸ھ کے جلسۂ دستار بندی میں آپ کو سند و دستار حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کے دست مبارک سے عطا ہوئی" (۳) بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صاحب نزہۃ الخواطر کو سال فراغت اور سن دستار بندی میں اشتباہ ہو گیا ہے۔ واللہ اعلم

فراغت کے بعد کچھ دنوں تک معین المدرسین کی حیثیت سے دارالعلوم کی خدمت انجام دیتے رہے، اور اس دوران فتویٰ نویسی کی مشق بھی کرتے رہے، پھر آپ کا تقرر میرٹھ کے کسی مدرسہ میں ہوا اور ایک مدت تک وہاں درس و تدریس کے بعد ۱۳۰۹ھ میں دارالعلوم کے ارباب حل و عقد کی نظر انتخاب پڑی اور دارالعلوم کی نیابت اہتمام کے لئے آپ کو منتخب کیا گیا، پھر ایک سال بعد شعبۂ افتاء کی خدمت سپرد کر دی گئی، اس کے علاوہ درس و تدریس کے فرائض بھی باحسن وجہ انجام دیتے رہے۔ ۱۳۴۶ھ میں جب شاہ صاحبؒ اور مولانا شبیر احمد عثمانی نے بعض وجوہ سے دارالعلوم چھوڑا تو آپ

(۱) تاریخ دارالعلوم ص ۹۱

(۲) تاریخ دار لعلوم ۲: ۴۵ و ۲۴۷

(۳) تاریخ دار لعلوم ۲: ۴۵ و ۲۴۷

بھی اپنے فرائض سے مستعفی ہوگئے، ۱۳۴۶ھ میں شاہ صاحبؒ کے زمانۂ علالت میں جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل میں شاہ صاحب کی جگہ پر بخاری شریف کا درس دیا۔ ۱۷/ جمادی الثانیہ ۱۳۴۷ کی شب میں مختصر سی علالت کے بعد داعی اجل کو لبیک کہا۔

مفتی صاحب کے زمانہ میں دار العلوم دیوبند کے شعبۂ افتاء کو غیر معمولی وسعت و ترقی حاصل ہوئی، انھوں نے اپنے تفقہ، فہم و بصیرت، قوت استدلال اور بداہت و استحضار کی بدولت اس شعبہ کو شہرت کے آسمان پر پہنچادیا، تقریباً چالیس سال تک انھوں نے دار العلوم کے شعبۂ افتاء کی خدمت انجام دی اور اس مدت میں آپ کے فتویٰ نویسی کی شہرت پورے ملک میں پھیل گئی، صاحب نزہۃ الخواطر نے آپ کی نسبت "احد فقهاء الحنفية"(۱) یعنی فقہائے حنفیہ میں سے ایک لکھاہے۔ پھر آگے فرماتے ہیں:

"وكانت له ملكة راسخة في الإفتاء و خبرة تامة بالفقه، واستحضار لمتونه و جزئياته، يكتب الجواب عفو الساعة فيض الخاطر، ولا يحتاج الى المراجعة أو التغيير في اكثر الاحيان، هذا مع تحر للصواب، و دقة في تحرير المسائل. والمام بالحوادث والنوازل، وقد داوم على ذلك أربعين سنة، وكتب من الاجوبة و أصدر من الفتاوى ما يملأ بطون الدفاتر"(۲)

یعنی ان کو فتویٰ نویسی میں پورا ملکہ اور فقہ میں مہارت تامہ حاصل تھی، فقہ کے متن اور جزئیات کا پوری طرح استحضار تھا، جواب بلا تکلف اور برجستہ لکھتے تھے، اور اکثر وبیشتر ان میں ترمیم یا کتابوں سے مراجعت کی ضرورت نہیں پیش آتی تھی، صحت کا قصد، فتویٰ نویسی میں دقت رسی اور حوادث وواقعات کا علم اس پر مستزاد تھا، چالیس سال کی مدت تک آپ نے فتویٰ نویسی کی اور اتنے سارے جوابات اور فتوے لکھے جن کے لئے کئی دفاتر درکار ہیں۔

(۱) نزہۃ الخواطر ۸: ۳۲۰
(۲) ایضاً ۸: ۳۲۱

شریعت کے ان اہم امور کی انجام دہی کے ساتھ طریقت وتصوف کے بھی ذوق آشنا تھے، چنانچہ آپ کو مولانا رفیع الدین دیوبندی سے بیعت اور حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی سے اجازت حاصل تھی، اس رتبہ تک رسائی کے لئے تقریباً ڈیڑھ سال حرمین شریفین میں قیام کر کے حضرت حاجی صاحب کی خدمت گذاری کی تھی۔

آپ کے مزاج میں غایت درجہ انکسار و تواضع تھا، اخلاق وعادات نہایت کریمانہ تھے، مجبور و بے سہارا افراد کی امداد واعانت اور ان کی حاجت بر آری روزمرہ کے مشاغل و لوازم میں سے تھی۔

مفتی صاحب علامہ اعظمیؒ کے استاذ تھے، علامہ اعظمیؒ نے ان سے دیوبند کے پہلے سفر میں فیض حاصل کیا تھا، اس وقت آپ نے ان سے تفسیر قرآن میں جلالین پڑھی تھی۔

مولانا رسول خاں ہزاروی پاکستان میں واقع ضلع ہزارہ کے اچھڑیاں نامی گاؤں میں ۱۲۸۸ھ م ۱۸۷۱ء میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم ہزارہ ہی میں حاصل کی، ۱۳۲۰ھ میں دیوبند کا قصد کیا اور دارالعلوم میں داخلہ لے کر علم وفن کی تکمیل کی اور ۱۳۲۳ھ میں سند فراغت حاصل کی۔(۱)

فراغت کے بعد تدریسی زندگی شروع کی اور سب سے پہلے مدرسہ دارالاسلام میرٹھ میں صدر مدرسی کا عہدہ سنبھالا، ایک مدت تک تعلیم و تدریس اور صدارت کے فرائض انجام دینے کے بعد ۱۳۳۳ھ میں دارالعلوم کے لئے بحیثیت مدرس ان کا تقرر ہوا، تقریباً بیس سال یعنی ۱۳۵۳ھ تک دارالعلوم میں حدیث و تفسیر اور منطق و فلسفہ کا درس دیتے رہے، ۱۳۵۳ھ میں لاہور چلے گئے اور اورینٹل کالج لاہور میں شعبۂ عربی کے استاد مقرر ہو کر وہیں مقیم ہو گئے۔ ۱۳۷۰ھ میں وہاں سے ریٹائر ہوئے، اس کے بعد جامعہ اشرفیہ لاہور کے صدر مدرس ہوئے، اور تادم مرگ اسی کی خاک سے جڑے رہے۔ ۲۳ر رمضان المبارک ۱۳۹۱ھ کو ۱۰۳ سال کی عمر میں اپنے وطن مالوف اچھڑیاں میں وفات پائی اور وہیں مدفون ہوئے(۲)

(۱) تاریخ دارالعلوم دیوبند ۲:۹۷ (۲) ایضاً ۲:۹۸-۹۷

تاریخ دار العلوم دیوبند میں ان کے بارے تحریر ہے:

"حضرت مولانا رسول خاں صاحب معقولات کے ساتھ منقولات میں بھی دستگاہ کامل رکھتے تھے، علوم نقلیہ وعقلیہ کو طالب علم کی استعداد کے مطابق اس طرح سمجھاتے تھے کہ مسئلہ شاگرد کے ذہن نشین ہو جاتا تھا، ان کا درس تفہیم کے لحاظ سے ممتاز سمجھا جاتا تھا، درسی تقریر جامع اور پر مغز ہوتی تھی، وجیہ اور پر وقار تھے تقریر کے وقت چہرے پر وقار برستا تھا، طرز بیان صاف اور مؤثر ہوتا تھا، ہر علم وفن کی کتابیں انھیں گویا ازبر تھیں، طلباء ذوق وشوق سے ان کے درس میں شریک ہوتے تھے، دار العلوم دیوبند کے ممتاز اساتذہ میں ان کا شمار ہوتا تھا، ان کی عمر کے تقریباً ۷۰ سال درس وتدریس میں گذرے"(۱)

مولانا موصوف بھی علامہ اعظمیؒ کے اساتذہ میں تھے، آپ نے ان سے بیضاوی شریف پڑھی تھی۔

مولانا حکیم محمد حسن دیوبندی شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ کے چھوٹے بھائی تھے، تعلیم تمام تر دیوبند میں حاصل کی، ۱۲۹۵ھ میں فراغت پائی۔ فراغت کے بعد طب کی تعلیم حاصل کی، ۱۳۰۲ھ میں ان کا تقرر دار العلوم میں بحیثیت مدرس عربی وطبیب ہوا، طب کی تعلیم کے ساتھ طلباء کے علاج ومعالجے کی خدمت بھی انجام دیتے تھے، اور بایں ہمہ حدیث، تفسیر اور فقہ وغیرہ کی کتابیں بھی پڑھایا کرتے تھے، عمر عزیز کا بیشتر حصہ دار العلوم کی خدمت کی نذر کیا، اور اس خدمت کو ہی اپنا فرض اولین اور سعادت کبریٰ سمجھ کر زندگی بتادی، بالآخر ۱۵ ربیع الاول ۱۳۴۵ھ کو ایک مدت کی خدمت گذاری کے بعد جان جانِ آفریں کے سپرد کی، اور قبرستان قاسمی میں پیوند خاک ہوئے ان تمام اوصاف وخصائل کے ساتھ سالک طریقت بھی تھے، اور عالم ربانی مرشد کامل مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہ کی بیعت سے مشرف تھے، ان کی نسبت تاریخ دار العلوم میں روداد دار العلوم کے حوالہ سے مذکور ہے:

(۱) تاریخ دار العلوم دیوبند ۲:۹۸

"آپ حضرت مولانا گنگوہی قدس سرہ کے اصحاب وخدام خاص میں سے ہیں، اور طریقہ سلف پر علماً و عملاً قائم ہیں، کتب طب کی تعلیم اور مداراتِ طلباء آپ کا مستقل کام ہے، مگر اس کے ساتھ ہی علم حدیث و فقہ و تفسیر کی کئی بڑی جماعتوں کا درس بھی آپ کے متعلق رہتا ہے۔"(۱)

تذکرہ علماء حال، مصنفہ مولانا محمد ادریس نگرامی، میں ان کی بابت تحریر ہے:

"مدرسہ دیوبند میں آپ مدرس ہیں، کتب طبیہ کا درس بہت اچھا دیتے ہیں"(۲)

علامہ اعظمی ان کے شاگردوں اور فیض یافتوں میں تھے، اور ان کے پاس آپ نے ہدایہ جلد ثالث کے کچھ حصے پڑھے تھے۔

مولانا ابوالحسن مئویؒ مولانا ابوالحسن صاحب عراقی مئوی، مولانا عبدالغفار صاحب مئوی کے چھوٹے بھائی تھے، ۱۲۹۶ھ میں مئو میں پیدا ہوئے، چونکہ علمی و دینی خانوادے کے چشم و چراغ تھے، اس لئے ابتدائی تعلیم و تربیت کا انتظام گھر میں ہوا، پھر اپنے برادر بزرگ مولانا عبدالغفار صاحب کے دامن تربیت سے وابستہ ہو کر نوانگر بلیا گئے، اور مدرسہ انوار العلوم میں زیر تعلیم رہ کر جملہ علوم و فنون کی کتابیں پڑھیں، اس کے بعد جاذبہ توفیق نے آستانہ حضرت گنگوہیؒ تک پہنچایا، چنانچہ حضرت گنگوہیؒ کی خدمت میں ہی آپ نے صحاح وغیرہ کی کتابیں پڑھ کر دورہ حدیث کی تکمیل اور سند فراغ حاصل کی، اس کے کچھ سال بعد جب کہ امام العصر علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے درس کی شہرت سنی تو دیوبند کا شوق دامنگیر ہوا، وہاں حضرت شاہ صاحب کے حلقہ درس میں حاضر ہو کر ان کے فیضان علم سے مستفیض ہوئے۔(۳)

مولانا ابوالحسن نے فراغت کے بعد درس و تدریس کا مشغلہ اختیار کیا، حضرت مولانا گنگوہیؒ کے ہاتھوں فراغت کے بعد ہی تدریسی مہم شروع کر دی تھی، مفتاح العلوم

---

(۱) تاریخ دار العلوم ۲:۴۹
(۲) تذکرہ علمائے حال ص ۷۵
(۳) تذکرہ علماء اعظم گڈھ ۳۷-۳۶

کی تاریخ میں آگے آئے گا، کہ مولانا ابوالحسن صاحب نے ہی ۱۳۲۷ھ میں جامع مسجد شاہی کٹرہ (مئو) میں مدرسہ مفتاح العلوم قائم کیا، آپ کے ہاتھ پر وہیں علامہ اعظمی کے والد ماجد نے ۱۳۲۹ھ میں صحاح ستہ پڑھ کر فراغت پائی، تقریباً دو دہائیوں تک اس کے ناظم رہے، اور ۱۳۴۸ھ میں تمام کاروبار مدرسہ اپنے شاگرد رشید علامہ اعظمی کے سپرد کر دیا۔

درس و تدریس کیساتھ وعظ و تذکیر کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ احسان و سلوک سے بھی خاص تعلق تھا، اور حضرت تھانوی کے ہاتھوں بیعت اور خرقۂ خلافت سے سرفراز ہوئے تھے۔

مولانا تین دفعہ سعادت حج و زیارت سے بھی مشرف ہوئے تھے، پہلا حج ۱۳۲۵ھ میں ۲۹ سال کی عمر میں کیا تھا۔ فتویٰ نویسی میں اونچا پایہ رکھتے تھے، مصنف تھے اور کئی تصنیفات یادگار بھی چھوڑی ہیں۔ ۱۳۶۱ھ میں وفات پائی، اور محلہ اورنگ آباد میں عید گاہ کے پیچھے مدفون ہوئے۔

علامہ اعظمی کے اساتذہ میں تھے اور آپ نے ان کے پاس کافیہ و شرح جامی وغیرہ کتابیں پڑھی تھیں اور انھیں کے پاس خط کی مشق بھی بہم پہنچائی تھی۔(۱)

مولانا محمد صابر مئوی ۱۸۶۶ء کے حدود میں مئو کے محلہ بلاقی پورہ میں پیدا ہوئے، والد کا نام حافظ محمد اسمٰعیل تھا۔ مولانا سلطان احمد صاحب مئوی کے پاس متوسطات تک کی کتابیں پڑھیں، اس کے بعد کانپور گئے اور مولانا احمد حسن صاحب کانپوریؒ کے پاس بقیہ کتب درس کی تحصیل کی اور سند فراغ پائی۔

حصول علم سے فارغ ہونے کے بعد درس و تدریس کا مشغلہ اختیار کیا، اولاً آپ مدرسہ دارالعلوم مئو میں مدرس مقرر ہوئے اور عرصۂ دراز تک اس میں تدریسی خدمت انجام دیتے رہے، اس کے بعد یہاں سے علیحدہ ہو کر مظہر العلوم بنارس چلے گئے اور کچھ دنوں وہاں تدریسی خدمات انجام دیں۔ یکم نومبر ۱۹۴۹ء کو داعیٔ اجل کو لبیک کہا اور آبائی قبرستان میں مدفون ہوئے۔

---

(۱) اعیان الحجاج ۲:۲۸۵

مولانا مرحوم درس و تدریس کے ساتھ تصنیف و تالیف کا بھی ذوق رکھتے تھے، چنانچہ فارسی قواعد پر انھوں نے ایک کتاب "نظام الفوائد" کے نام سے دو حصوں میں تصنیف فرمائی، جس میں فارسی قواعد کی نہایت آسان اور سہل زبان میں توضیح و تشریح کی گئی ہے۔ (تذکرۂ علماء اعظم گڈھ ۲۷۸۔۲۷۹)

آپ کے زمرۂ تلامذہ میں علامہ اعظمی بھی تھے۔ چنانچہ انھوں نے خود اپنے استاد کے بارے میں تحریر فرمایا ہے:

"مولانا محمد صابر بن حافظ اسمٰعیل (بلاقی پورہ مئو) شاگرد مولانا احمد حسن کانپوری و مرید شاہ وارث حسن و استاد ایں فقیر بود، بدار العلوم مئو و مظہر العلوم بنارس درس داد، بعارضۂ وجع قلب در اواخر ذی الحجہ ۱۳۶۷ھ وفات یافت اولئك لھم الخیرات۔"

یعنی مولانا محمد صابر بن حافظ اسمٰعیل (بلاقی پورہ مئو) مولانا احمد حسن کانپوری کے شاگرد، شاہ وارث حسن کے مرید اور اس غریب کے استاد تھے، دار العلوم مئو اور مظہر العلوم بنارس میں درس دیا، آخر ذی الحجہ ۱۳۶۷ھ میں دل کی بیماری میں انتقال ہوا۔ تاریخ وفات "اولئك لھم الخیرات" ہے۔

☆☆☆

علامہ اعظمی "حسن ادب" میں نقل فرماتے ہیں:

لازم ہے کہ شاگرد اپنے جملہ امور میں اپنے استاذ کا مطیع و منقاد رہے، اس کی رائے و تدبیر سے باہر نہ ہو، جس طرح بیمار حکیم حاذق کے ہاتھ میں ہوتا ہے، اسی طرح اپنے کو اس کے ہاتھ میں دیدے، جس بات کا قصد کرے اس میں اس سے مشورہ کرے اور اس کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش کرے، اس کے احترام میں مبالغہ کرے، اور اس کی خدمت کو قرب خداوندی کا موجب جانے، اور یقین کرے کہ استاذ کے سامنے ذلیل ہونا عزت ہے، اس کے لئے جھکنا فخر ہے، اور اس کے لئے تواضع سربلندی۔

[illegible]

چوتھا باب

تدریسی و تصنیفی سرگرمیاں اور دیگر حالات

چوتھا باب
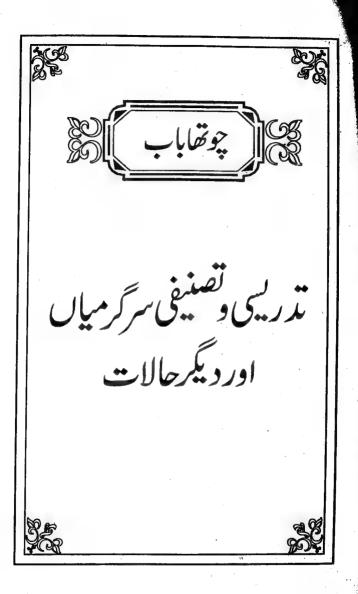
تدریسی و تصنیفی سرگرمیاں اور دیگر حالات

دار العلوم مئو کی مدرسی زمانۂ طالب علمی کی اگر بنارس کی مدرسی کو چھوڑ دیا جائے، تو علامہ اعظمی کی تدریسی زندگی کا باقاعدہ آغاز شوال ۱۳۴۰ھ سے ہوتا ہے، شعبان ۱۳۴۰ھ میں مدرسہ دار العلوم مئو سے فراغت پائی، اور اسی مدرسہ سے شوال سے درس و تدریس کی ابتدا فرمائی۔ آپ کی پوری عمر تدریسی مہمات سے عبارت تھی، کم و بیش ستر سال کی طویل مدت تک اس اہم خدمت کو ایک مقدس فریضے کی طرح انجام دیتے رہے، اس دوران آپ کی زندگی میں بہت سے نشیب و فراز اور حالات میں مدوجزر آئے، تلخیٔ ایام اور زمانہ کے مصائب و آلام سے بھی دوچار ہوئے، کچھ ایسے موڑ بھی آئے کہ تصنیفی، تالیفی اور تحقیقی مشغولیات کے سبب یا کسی اور وجہ سے درس و تدریس کی سرگرمی متروک رہی، لیکن یہ تعطل زیادہ دنوں تک باقی نہ رہتا، اور تعلیم و تربیت کی ضرورت کا شدید ترین احساس ان کو مسند درس پر لا بٹھاتا کہ:

نوا را تلخ تر می زن چوں ذوق نغمہ کم یابی : حدی را تیز تر می خواں چوں محمل را گراں بینی

چنانچہ آپ زندگی کے آخری ایام تک دورۂ حدیث اور اعلیٰ درجات کی کتابوں کے ساتھ ابتدائی جماعتوں کے طلبہ کے ابجد درست کراتے رہے۔

اوپر گذر چکا ہے کہ درس و تدریس کا باقاعدہ آغاز دار العلوم مئو سے کیا، بابت ۱۹۱۸ء لغایۃ ۱۹۲۴ء مطابق ۱۳۴۲ھ مدرسہ دار العلوم کی جو روداد شائع ہوئی ہے۔ اس میں مدرسہ مذکورہ کے فارغ التحصیل طلبہ میں جو وہاں یا کسی دوسرے مقام پر تدریسی خدمات

انجام دیتے ہیں، علامہ اعظمی کا نام سر فہرست ہے۔

علامہ اعظمی کا طغرائے امتیاز یہ بھی تھا کہ ابتداء ہی میں دورۂ حدیث کی کتابیں پڑھائیں، دار العلوم کی تدریسی زندگی کے دوران صحاح ستہ کی کوئی نہ کوئی کتاب آپ کے زیر درس رہی، ذاتی کتب خانہ میں سنن ابو داؤد کا جو قدیم نسخہ ہے اس پر آپ ہی کے دست مبارک سے یہ تحریر درج ہے:

"قد شرعت في اقراء أبي داؤد سنة ۱۳۴۱ھ ثم في سنة ۴۳ ھ في شوال "

(شوال ۴۳۔۱۳۴۱ھ میں میں نے ابوداود پڑھانا شروع کیا)

اس دور میں جن لوگوں کو آپ کی شاگردی کا شرف حاصل ہوا، ان میں سلطان المناظرین مولانا محمد منظور نعمانی، دار العلوم دیوبند کے سابق استاد مولانا محمد حسین بہاری اور آپ کے تلمیذ اعز مولانا عبدالجبار صاحب مئوی تھے، یہیں سے آپ کے شاگردوں کی پہلی کھیپ فارغ ہو کر نکلی، جن میں سے اکثر آپ کے ہم عمر و ہم عصر تھے، بلکہ ان میں سے بیشتر اپنی عمر طبعی بسر کر کے آپ کی حیات میں ہی اس جہان فانی سے کوچ کر گئے۔

دار العلوم مئو میں تدریسی سلسلہ چند سال سے زیادہ قائم نہ رہ سکا، اور تین سال یا کچھ زیادہ مدت ہوئی ہوگی کہ بعض اسباب کی بنا پر آپ وہاں کے منصب تدریس سے مستعفی ہو گئے۔

ابتدائی تصنیفات علامہ اعظمی کی ذات مدرسہ دار العلوم کے لئے قابل فخر اور باعث ناز تھی، درس و تدریس میں تو جو کمال حاصل تھا وہ تھا ہی، اس کے علاوہ آپ کے اندر اور کتنی صلاحیتیں مضمر تھیں، اس کا اندازہ اسی روداد سے ہوتا ہے۔ اس کے صفحہ ۷ پر تحریر ہے:

"تصنیف و تالیف کے میدان میں دار العلوم کا قدم اگرچہ ابھی تک پیچھے ہے، لیکن دار العلوم نے اس خدمت کو بالکل نظر انداز نہیں کیا ہے، بلکہ اس میدان میں بھی زور آزمائی کی ہے، اور اپنے جوہر دکھائے ہیں، چنانچہ جناب

۱۳۹۲ھ

مولوی ابوالمآثر حبیب الرحمٰن صاحب مدرس مدرسہ دارالعلوم جو بحالت عدم موجودگی صدر مدرس صاحب صیغۂ تعلیم کے نگراں و ذمہ دار ہیں جنھوں نے اس میں تکمیل بھی کی ہے، حسب ذیل رسائل تالیف کئے ہیں۔"

اس کے نیچے آپ کی تصنیفات کے نام ذکر کئے گئے ہیں، جن کی تعداد ۱۲ ہے، ان میں تین کتابیں ایسی ہیں جن کے نام کے ساتھ قوسین میں (عربی) لکھا ہوا ہے۔ اس سے اس جوہر قابل کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ۱۳۴۲ھ میں آپ کا سن تیئیس (۲۳) برس سے زیادہ نہیں تھا، اور اس کمسنی میں ایک درجن رسائل تالیف کر چکے تھے، ملاحظہ ہو:

"النجح القویۃ، السیر الحثیث، التوصیۃ بأسرار التسمیۃ (عربی) حدر اللثام عن وجہ القراءۃ خلف الامام، معجزات و کرامات، اسلام اور صنف نازک، کشف المعضلات فی رد حل المغلقات، القول المختار فی الترّی بزیّ الکفار، الروض المجود فی تقدیم الرکبتین عند السجود، توطین الجائشۃ بشرح البناء بعائشۃ، تذکرۃ أدباء الھند (عربی) الاتحافات السنیۃ بذکر محدثی الحنفیۃ (عربی)."

اس فہرست پر ایک نگاہ ڈالنے سے مضامین کے تنوع کا اندازہ ہوتا ہے، اس میں پہلا رسالہ مطبوع ہے، اور "کشف المعضلات ..." ایک مجلس کی تین طلاق کے اثبات میں قسط وار الفقیہ فروری مارچ اپریل ۱۹۲۴ء میں چھپا ہے۔

اہل علم سے تعلقات اسی زمانہ میں آپ کے ہندوستان کے بعض نامور اہل علم سے تعلقات قائم ہوئے، جن میں امام اہلسنت مولانا عبدالشکور لکھنوی کاکوروی (۱) اور

(۱) مولانا عبدالشکور بن ناظر علی بن فضل علی ۲۴ رذی الحجہ ۱۲۹۳ھ کو کاکوری میں پیدا ہوئے، نشو و نما اور ابتدائی تعلیم فتح پور میں پائی، اس کے بعد لکھنؤ گئے۔ اور مولانا عین القضاۃ حیدر آبادی سے درس نظامی کی تکمیل کی، اور حکیم عبدالولی مرحوم سے فن طب پڑھا، دارالعلوم ندوہ اور مدرسہ فرقانیہ لکھنؤ میں درس و تدریس کے علاوہ دہلی میں مرزا حیرت دہلوی کے پریس میں ایک مدت تک ملازمت کی =

علامہ سید سلیمان ندوی (۱) کے اسماء گرامی سر فہرست ہیں ، ان کے علاوہ

= اور مرزا حیرت کے ایماء پر قرآن کریم اور صحیح بخاری کا اردو میں ترجمہ کیا، ۱۳۵۱ھ میں لکھنؤ میں دارالمبلغین کے نام سے ایک مدرسہ قائم کیا جو ملک گیر شہرت کا حامل ہوا۔ مولانا عبدالشکور صاحب ایک شعلہ بیان خطیب ومقرر، بلند پایہ مناظر اور صاحب علم وعمل مبلغ تھے۔ شیعیت، بدعت اور اباحیت سے پوری عمر برسرپیکار رہے۔ بالخصوص شیعیت کے لئے ان کی ذات شمشیر برہنہ تھی، جس کی وجہ سے وہ امام اہلسنت کے لقب سے ملقب ہوئے، متعدد کتابیں تصنیف فرمائیں، جن میں علم الفقہ کو زیادہ شہرت حاصل ہوئی، ۱۷ر ذیقعدہ ۱۳۸۱ھ کو وفات پائی، علامہ اعظمی کا آپ سے خاص تعلق تھا، آپ کے سیکڑوں خطوط علامہ اعظمی کے پاس محفوظ تھے، جو مجلّہ "المآثر" میں قسط وار شائع ہو رہے ہیں، علامہ اعظمی سے آپ کے تعلق کی تفصیل "المآثر" ج ۷ ش ۲ و ۳ میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔

(۱) علامہ سید سلیمان ندوی ۲۲ر نومبر ۱۸۸۴ء مطابق ۲۳ر صفر ۱۳۰۲ھ کو جمعہ کے دن صوبہ بہار کے مردم خیز گاؤں دیسنہ ضلع پٹنہ میں پیدا ہوئے، ان کے والد ریاست اسلام پور کے شاہی طبیب تھے، سید صاحب نے تعلیم کا آغاز گھریلو طرز پر کیا اور فارسی وعربی کی ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں میں حاصل کی، اس کے بعد اپنے والد کے پاس اسلام پور چلے گئے، وہاں سے پھلواری شریف پٹنہ آئے، پٹنہ سے دربھنگہ گئے، وہاں سے ۱۹۰۱ء میں لکھنؤ منتقل ہو گئے، اور دارالعلوم ندوہ میں داخلہ لیا، ندوہ میں پانچ سال زیر تعلیم رہ کر ۱۹۰۶ء میں فراغت پائی۔ قیام ندوہ کے دوران ہی علامہ شبلی نعمانی کے دامن تربیت سے وابستہ ہو گئے تھے، علامہ شبلی نے ان کو اس طرح صیقل کیا کہ وہ بہت جلد علم وفضل کی دنیا کے آفتاب بن گئے، اور شبلی نعمانی نے جو کام ادھورے چھوڑے ان کو کمال وتمام تک پہنچایا، علامہ شبلی نے دارالمصنفین کا جو خاکہ تیار کیا تھا اس میں رنگ بھرا، سیرت النبی کی باقیماندہ جلدوں کی تکمیل کی، سید صاحب نے ۱۹۱۵ء میں دارالمصنفین کی بنیاد ڈالی، اس کے بعد پوری عمر اس کی تعمیر وترقی کے لئے کوشاں رہے۔ ۱۹۱۶ء میں رسالہ "معارف" جاری کیا۔ مدت مدید تک وہ ندوہ کے معتمد تعلیم رہے۔ ۱۹۴۶ء میں نواب حمید اللہ خاں والیٔ بھوپال کی دعوت پر بھوپال کے قاضی القضاۃ مقرر ہوئے، جون ۱۹۵۰ء میں پاکستان منتقل ہو گئے اور اس کے ساڑھے تین سال بعد ۲۲ر نومبر ۱۹۵۳ء م ۱۴ر ربیع الاول ۱۳۷۳ھ کو کراچی میں وفات پائی۔

مولانا مرتضی حسن چاندپوری(۱) وغیرہ سے خط و کتابت رہی۔

مدرسہ مظہر العلوم میں بحیثیت صدر مدرس | مدرسہ مظہر العلوم بنارس کے ساتھ آپ کا تعلق زمانۂ طالب علمی ہی سے تھا، فراغت سے قبل عمر عزیز کا خاصا حصہ یہاں صرف کیا تھا، پہلے تو دو سال مولانا عبدالغفار صاحب کے زیر سایہ طالب علمی کے زمانے میں گذارے، دوبارہ اس وقت جب دیوبند کے پہلے سفر سے واپسی کے بعد یہاں تدریسی خدمت انجام دی، ان سابقہ تعلقات کی بنا پر اس سے یک گونہ تعلق ہو چکا ہوگا، اور یہاں کی آب و ہوا اور فضا سے ایک حد تک مانوس رہے ہوں گے۔ جاذبۂ توفیق ایک بار پھر اسی کاشی نگری کی طرف لے چلا اور دار العلوم مئو سے کنارہ کشی کے بعد دوسرا پڑاؤ بنارس کا یہی مدرسہ ہوا، بنارس والے گویا سراپا اشتیاق تھے، انھوں نے آپ کی آمد کو نعمت غیر مترقبہ سمجھا، ان کے لئے دیدہ و دل فرش راہ کیے، اور ان کے سپرد مسند صدارت کی، وہاں وہ تین سال (۱۳۴۴ھ سے ۱۳۴۷ھ تک) صدارت تدریس کے عہدہ پر قائم رہے، اور تدریسی امور کے ساتھ فرائض صدارت بھی باحسن وجوہ انجام دیتے رہے۔

پٹنہ و مرزاپور کا سفر اور خدابخش لائبریری کی زیارت | بنارس میں قیام کے اسی زمانہ میں آپ نے پٹنہ کا سفر کیا، اور پہلی بار خدابخش لائبریری (بانکی پور۔ پٹنہ) کی زیارت کی، آپ کے ذخیرۂ مکتوبات میں ایک خط ۲۵؍ شعبان ۱۳۴۴ھ کا مرزاپور سے لکھا ہوا ہے، اس خط کو آپ نے والد محترم کے نام تحریر فرمایا تھا، اس کی عبارت یہ ہے:

(۱) مولانا مرتضی حسن چاندپوری، چاندپور ضلع بجنور کے باشندہ تھے۔ ۱۳۰۴ھ میں دار العلوم دیوبند سے فارغ ہوئے، مراد آباد اور دربھنگہ وغیرہ کے مدارس میں درس و تدریس کے فرائض انجام دئے۔ پھر دار العلوم دیوبند پہنچے اور وہاں شعبۂ تعلیم اور شعبۂ تبلیغ کی نظامت کے علاوہ درس و تدریس کی خدمت بھی انجام دی۔ اپنے زمانہ کے بلند پایہ خطیب اور بے نظیر مناظر تھے، بدعات اور قادیانیت کے خلاف انھوں نے بہت سے معرکے سر کئے، ۱۳۷۱ھ م ۱۹۵۱ء میں وطن مالوف میں وفات پائی۔

"۰۰۰ کمترین آج داناپور سے چل کر ۱۲ بجے مرزاپور پہنچا، یہاں مولانا عبدالشکور صاحب مرزاپوری (۱) کے یہاں اترا۔ کل شاید یہاں وعظ ہوگا ۰۰۰ عبدالجبار پہونچ گئے ہوں گے، ان سے سفر کے حالات معلوم ہو سکتے ہیں ۰۰۰"

اس کے علاوہ اپنی یادداشت میں ایک جگہ تحریر فرمایا ہے:

"۲۴؍ شعبان ۱۳۴۴ھ مطابق ۱۰؍ مارچ ۱۹۲۶ء کو پہلی بار کتب خانہ بانکی پور کی سیر کی اور حسب ذیل کتابیں دیکھیں۔"

مظہر العلوم سے استعفا بنارس میں کوئی تین سال کی مدت گذری ہوگی کہ کچھ ایسے حالات پیش آگئے جن سے مجبور ہو کر وہاں سے دستبرداری کا فیصلہ کرنا پڑا، (۲) اور انجام کار کاروبار مدرسہ سے سبکدوش ہو کر ۱۳۴۴ھ کے وسط میں گھر کی راہ لی، اس کا

(۱) مولانا عبدالشکور مرزاپوری کے حالات معلوم نہیں ہو سکے، غالباً جونپور کے باشندہ تھے اور مرزاپور میں مطب کرتے تھے، حیات شبلی کے صفحہ آخر کے ایک حاشیہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۹۱۰ء میں کانپور کے مدرسہ الٰہیات میں زیر تعلیم تھے، اور یہ ان کی تکمیل کا سال تھا، ممکن ہے اسی کی طرف منسوب کر کے اپنے کو الٰہی لکھتے رہے ہوں، بڑے پایہ کے عالم و مصنف تھے، متعدد کتابیں ان کی یادگار ہیں، طبیعت ظریف اور بذلہ سنج پائی تھی، علامہ اعظمی سے آپ کے بڑے مضبوط روابط تھے ایک دفعہ ان کے بارے میں علامہ اعظمی سے ڈاکٹر عبدالمعید صاحب نے پوچھا تو آپ نے فرمایا کہ میری ان سے دوستی تھی اور میں ان سے ملنے کے لئے تاؤ پر بیٹھ کر مرزاپور جاتا تھا۔ ان کے متعدد خطوط علامہ اعظمی کے نام موجود ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ دوستی ہی نہیں بے تکلفی بھی تھی۔

(۲) مولانا عبدالعلیم صاحب مئوی (استاذ جامعہ مظہر العلوم بنارس) سے یہ معلوم ہوا کہ علامہ اعظمی نے ان سے کبھی فرمایا تھا کہ بنارس چھوڑنے کا سبب یہ تھا کہ اس وقت کے ناظم مدرسہ "حی علی الصلوٰۃ" پر کھڑے ہونے کے فتویٰ پر آپ سے دستخط کرانا چاہتے تھے، چونکہ یہ بدعت ہے، اس لئے آپ نے اس پر تعاون کرنے کے بجائے مدرسہ ہی چھوڑ دینا مناسب سمجھا۔

تذکرہ مولانا محفوظ الرحمٰن نامی کے ایک خط میں جو یکم رجب ۱۳۴۷ھ کا تحریر فرمودہ ہے، یوں ہے:

"عزیزم سلمہ! وعلیکم السلام

آپ کے دو خط مجھے ملے، آپ کی یہ شکایت ایک حد تک بجا ہے کہ جواب میں تاخیر ہوئی، مگر اس کا جو سبب آپ نے تجویز کیا ہے وہ نہیں ہے، اصل یہ ہے کہ بنارس میں بعض ارکان مدرسہ کی بعض حرکتیں مجھے ایسی ناپسند ہوئیں کہ میں نے وہاں اپنا قیام کسی طرح مناسب نہیں سمجھا، میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ مکان جاکر استعفا روانہ کردوں کہ چھوٹے بھائی محمد کی علالت کی خبر پہنچی، میں نے دو روز کی رخصت لی اور مکان پہونچ گیا اور دوسرے دن استعفا روانہ کردیا، اس وقت سے اب تک لکھنے پڑھنے کے کاموں سے اتنی بیگانگی ہے کہ احباب سے خط و کتابت تک بند ہو گئی ہے۔"

دفع المجادلہ: بمبئی کے روافض نے عید مباہلہ کے نام سے ایک قبیح رسم ایجاد کی تھی، اور اسے سال بسال منعقد کیا کرتے تھے اور بھولے بھالے سنیوں کو اس میں شریک کرکے حضرت علیؓ کا افضل الصحابہ اور خلیفہ بلا فصل ہونا سمجھایا کرتے تھے، امام اہلسنت مولانا عبدالشکور فاروقی نے "آیت مباہلہ" کے نام سے ایک کتاب لکھ کر اس رسم کا ابطال کیا، امام اہلسنت کی کتاب کے جواب میں ایک شیعہ مولوی اعجاز حسین بدایونی نے "برہان مجادلہ" لکھی، شیعہ مولوی کی کتاب کا جواب علامہ اعظمی نے "دفع المجادلہ" کے نام سے اسی زمانہ میں تصنیف فرمایا، جس میں آیت مباہلہ کی تفسیر بیان فرمائی اور شیعوں کی اس سے متعلق گمراہی کا پرزور رد کیا۔ آگے چل کر علامہ اعظمی نے شیعوں کے رد و ابطال میں جو عظیم الشان کارنامے انجام دئے، یہ کتاب گویا اس کا دیباچہ تھی، اس کے بعد حضرت امام اہلسنت کے نزدیک آپ کی قدر و منزلت اور بڑھ گئی۔

علامہ اعظمی اور مدرسہ مفتاح العلوم | مدرسہ مفتاح العلوم کے لئے اس کے یوم تاسیس ہی سے علامہ اعظمیؒ کی خاندانی خدمات رہی ہیں۔ آپ سے پہلے آپ کے والد مرحوم ومغفور اس کی خدمت کرتے رہے، پھر آپ کی مدرسہ سے وابستگی کے بعد بھی والد محترم مختلف ذمہ داریاں سرانجام دیتے رہے، اور جہاں تک خود علامہ اعظمیؒ کی ذات کا تعلق ہے، تو انھوں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ اس کی نذر اور اس کے بال و پر سنوارنے میں صرف کیا، علامہ اعظمی نے زمانۂ طالب علمی کے کچھ ایام بھی اس میں گذارے، چنانچہ "روداد مدرسہ عربیہ مفتاح العلوم بابت ۱۳۴۶ھ لغایت ماہ ربیع الثانی ۱۳۴۷ھ" میں صفحہ ۲ پر کچھ فضلاء کے نام ذکر کئے گئے ہیں، جنھوں نے مفتاح العلوم میں تعلیم حاصل کی اس کے بعد دوسری جگہوں پر تدریسی خدمات انجام دیں، ان میں علامہ اعظمی کا نام بھی درج ہے۔ مفتاح العلوم کی نشو ونما، اس کی توسیع وترقی، اور اس کے فروغ میں ان کے دوسرے احباب ورفقاء کار بھی شریک وسہیم رہے ہیں، لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی ایک ناقابل انکار حقیقت ہے، کہ مدرسہ مفتاح العلوم کو نہ صرف برصغیر بلکہ عالم اسلام میں متعارف کرانے میں اور اس کی توسیع وترقی میں سب سے اہم اور نمایاں کارنامے علامہ اعظمیؒ کے رہے ہیں، بلکہ کچھ گوشے اور پہلو تو ایسے ہیں جس میں علامہ اعظمیؒ کا کوئی دوسرا سہیم و شریک نہیں ع

کون ہوتا ہے حریف مئے مرد افگن عشق

مفتاح العلوم کی اجمالی تاریخ | مدرسہ مفتاح العلوم کا قیام ۱۳۲۷ھ میں مولانا ابوالحسن صاحبؒ مئوی عراقی کے دستِ مبارک پر عمل میں آیا، اور اس کا تاریخی نام شمس الفیوض رکھا گیا (۱) مولانا ابوالحسن صاحب نور اللہ مرقدہ نے ابتداءً جامع مسجد شاہی میں بیٹھ کر درس دیا، مولانا موصوف ۱۳۴۱ھ تک تقریباً چودہ سال نہایت خاموشی، سادگی اور توکل کے ساتھ اس خدمت کو انجام دیتے رہے، درمیان میں ایک صاحب اور، آپ کے معاون اور رفیق کار ہوئے، اور وہ تھے جناب حافظ محمد عثمان صاحب مرحوم۔ روداد مدرسہ

(۱) روداد مدرسہ عربیہ مفتاح العلوم بابت ۱۳۴۶ھ لغایت ربیع الثانی ۱۳۴۷ھ

سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ۱۳۴۱ھ میں حافظ محمد عثمان صاحب کی وفات واقع ہوگئی جس کی وجہ سے مدرسہ کے تدریسی کام کو روک دینا پڑا، اور پھر تقریباً تین سال بعد یعنی صفر ۱۳۴۴ھ میں دوبارہ اس سلسلہ کا آغاز کیا گیا، اور اس دفعہ اس کی جگہ محلہ الہ داد پورہ کی مسجد تجویز کی گئی، اور کچھ سالوں تک تدریسی امور وہیں انجام پاتے رہے، روداد میں مدرسہ مفتاح العلوم کی اس وقت کی جو صورتحال درج ہے، اس کا ایک نمونہ پیش خدمت ہے:

"جب محلہ الہ داد پورہ میں تعلیم و تعلم کا سلسلہ شروع ہوا اور بطریقۂ ماضیہ مولوی ابوالحسن (۱) صاحب درس دینے لگے تو جناب حکیم مولوی محمد صابر (۲) صاحب ساکن محلہ الہ داد پورہ نے اپنے محلہ کے باشندگان سے چندہ کی تحریک کی محلہ کے حضرات نے باوجود غربت کے مختصر ساماہوار چندہ کا اقرار کیا مگر اس مختصر چندہ کی وصولی بھی چند ہی روز رہی۔ پس حکیم صاحب موصوف نے سفیروں کے ذریعہ سے کچھ آمدنی کی صورت نکالی جس سے کسی طرح کام نکلتا گیا۔ اگرچہ بعض وقت مشکلات پیش آتے تھے۔ مگر تعلیمی کام کی انجام دہی میں کوتاہی نہیں ہوئی، بعدہٗ مولوی صاحب موصوف نے حکیم صاحب موصوف کو ناظم مدرسہ قرار دیا۔ اور کچھ اشتہارات طبع کرائے جس سے مدرسہ کی آمدنی میں اضافہ ہوا اور جو کچھ رقم آتی تھی ناظم موصوف کے پاس جمع ہوتی تھی۔ پھر ناظم صاحب موصوف کو سفر

---

(۱) حالات کے لئے اساتذۂ علامہ اعظمی کا باب ملاحظہ فرمایئے۔

(۲) حکیم محمد صابر صاحبؒ کے بارے میں علامہ اعظمیؒ نے اپنی بیاض میں لکھا ہے: "مولوی حکیم محمد صابر پسر حافظ عثمان، تلمیذ استاذی مولانا عبدالغفار ساکن الہ داد پورہ مئو۔ کان یحبنی و یجلنی. توفی ۶۔ج ۲۔ ۱۳۶۳ھ" یعنی مولوی حکیم محمد صابر، حافظ عثمان صاحب کے فرزند اور میرے استاذ مولانا عبدالغفار صاحب کے شاگرد الہ داد پورہ کے باشندے تھے۔ مجھ سے محبت اور میرا اکرام کیا کرتے تھے۔ ۶ / جمادی الاخری ۱۳۶۳ھ میں وفات پائی۔

حرمین شریفین پیش ہوا، بعد واپسی ناظم صاحب موصوف بینائی سے بالکل معذور ہوگئے اس لئے بعد میں جو رقوم مدرسہ میں آئیں مولوی صاحب موصوف کے پاس رکھی گئیں اور بجائے مولوی صاحب کے تعلیمی کام کے لئے ایک مدرس کا اضافہ کیا گیا اور مولوی صاحب نائب ناظم سمجھے گئے۔ اب چونکہ حکیم صاحب ناظم اول معذور ہیں اس لئے اس سے دستبردار ہوگئے اور نظامت کا کام بذمہ نائب ہے۔" (۱)

روداد مذکورہ بالا میں صفحہ نمبر ۵ پر "مدرسہ ہذا کے تعلیمی حالات" کے تحت ۱۰ دفعات درج ہیں، جس میں نمبر ۲ کے ذیل میں لکھا ہے:

"اس مدرسہ میں فارسی، عربی، صرف، نحو، منطق، حکمت، فلسفہ، بلاغت، عقائد، فقہ، اصول فقہ، حدیث، تفسیر کی موافق درس نظامیہ کے تعلیم ہوتی ہے، اور اکثر منتہی طلبہ دارالعلوم دیوبند بھیج دئے جاتے ہیں، گویا یہ مدرسہ دارالعلوم دیوبند کی ایک شاخ ہے یا اس کی مشین تعلیمی کا ایک پرزہ ہے۔ مگر دینیات کی طرف طلبہ کو زیادہ رغبت دلائی جاتی ہے، اس لئے منہاج العابدین امام غزالی و ترجمہ قرآن مجید وغیرہ بھی پڑھایا جاتا ہے۔"

اسی روداد مذکورہ بالا میں ص ۶ پر عہدہ داران واراکین مجلس انتظامی مدرسہ مفتاح العلوم کا ایک نقشہ درج ہے جس کے صدر ہیں مولانا حکیم شاہ محمد عمر صاحب (۲) محلہ

(۱) روداد مذکورہ بالا ۳۔۴

(۲) ان کی نسبت علامہ اعظمی ایک جگہ لکھتے ہیں: "مولوی شاہ محمد عمر اورنگ آبادی قرأ اکثر الکتب عندالمولوی امام الدین الفنجابی نزیل مئو۔ وبعضها علی ابی الحسنات مولانا عبدالحی اللکنوی وبایع علی ید الشاہ فضل رحمن الگنج مرادآبادی۔ کان یحبنی محبة الولد توفی ۱۳۵۸ھ (رحلت نمود شہ عمر)"

(مولوی شاہ محمد عمر اورنگ آبادی نے اکثر کتابیں مولوی امام الدین پنجابی نزیل مئو اور کچھ ابوالحسنات مولانا عبدالحی لکھنوی سے پڑھیں، اور شاہ فضل رحمن گنج مراد آبادی کے ہاتھ پر بیعت کی۔ مجھ سے اولاد کی طرح محبت کرتے تھے۔ ۱۳۵۸ھ میں فوت ہوئے (رحلت نمود شہ عمر) مادۂ تاریخ ہے)

نورنگ آباد، مئو۔نائب صدر ہیں جناب حکیم مولوی شاہ عبدالعزیز صاحب (۱) نورنگ آباد مئو، اور دوسرے نائب صدر ہیں جناب حاجی ولی محمد میانجی صاحب (۲) ناظم ہیں جناب مولوی ابوالحسن صاحب نائب ناظم ہیں جناب مولوی محمد صابر صاحب (پدر بزرگوار علامہ اعظمیؒ) اور وہی خازن بھی ہیں، اور دوسرے نمبر کے نائب ناظم ہیں جناب مولوی فیاض احمد صاحب نورنگ آباد مئو۔ ان حضرات کے علاوہ دیگر ممبران کی تعداد ۱۰ ہے۔ علامہ اعظمیؒ کے والد محترم پر گویا دوہری ذمہ داری تھی، ایک نائب ناظم ہونیکی اور دوسرے خازن ہونے کی۔

اس وقت جس روداد کے حوالے سے ہم بات کر رہے ہیں، اغلب یہ ہے کہ اس زمانہ کی ترتیب ہے جب علامہ اعظمی بنارس میں تدریسی امور سرانجام دے رہے تھے۔ اس کے مرتب مولانا ابوالحسن صاحب ہیں اور تصدیق کنندگان میں جن حضرات کے اسماء گرامی درج ہیں وہ ہیں جناب حکیم مولوی شاہ عبدالعزیز صاحب نائب صدر، وجناب مولوی محمد صابر صاحب نائب ناظم مدرسہ ہو جناب قاری مولوی محمد صاحب مدرس اول مئوی اعظم گڈھی۔ روداد مطبع حکیم گورکھپور کی مطبوعہ ہے۔

اس وقت جو مجلس تعلیمی تشکیل دی گئی تھی، اس کے بارے میں صفحہ نمبر ۷ پر "موجودہ اراکین مجلس تعلیمی" کے عنوان کے ذیل میں کل آٹھ ارکان کے اسماء گرامی درج ہیں جو حسب ذیل ہیں:

---

(۱) علامہ اعظمی کے استاذ اور خسر تھے۔ ان کی تاریخ وفات معلوم نہ ہو سکی۔

(۲) علامہ اعظمی نے اپنی بیاض میں ان کے بارے میں لکھا ہے: "میانصاحب ولی محمد اورنك آبادی كان فی سنة ۱۳۵۷ھ ابن ۹۵ سنة ... كان یاتینی كثیراً و توفی رمضان من تلك السنة المذكورة مبطونا."

علامہ اعظمی فرماتے ہیں: میانصاحب ولی محمد اورنگ آبادی ۱۳۵۷ھ میں ۹۵ برس کے تھے، میرے پاس بہ کثرت آتے تھے، اسی سال (۱۳۵۷ھ) میں شکم کی بیماری میں وفات پائی۔

۱۔ جناب مولوی ابوالحسن صاحب ۲۔ جناب مولوی محمد صابر صاحب۔ ۳۔ جناب مولوی محمد صاحب ۴۔ جناب مولوی فیاض احمد صاحب ۵۔ جناب مولوی شاہ محمد عمر صاحب ۶۔ جناب مولوی حبیب الرحمٰن صاحب ۷۔ جناب حکیم مولوی محمد سعد اللہ صاحب ۸۔ جناب مولوی ابوالہاشم صاحب۔

صفحہ نمبر ۱۲ پر ایک گوشے میں ایک چھوٹے سے کالم کے اندر ایک اطلاع درج ہے جو مناسب معلوم ہوتا ہے کہ قارئین کے گوش گذار کردی جائے۔ وہ اطلاع یہ ہے:

"واضح ہو کہ ناظم موجودہ بوقت قیام مدرسہ لڑکوں کو تعلیم دیتے ہیں اور بوقت ضرورت مدرسہ سفر کی صعوبت بھی اختیار کرتے ہیں اور مدرسہ کی آمدنی و خرچ کا حساب بھی درست کردیا کرتے ہیں مگر فقط سہ ماہوار نفقۂ عیال کیلئے وظیفہ کے طور پر لیتے ہیں۔ اس لئے سفر وغیرہ میں مدرسہ کی رقم سے علاوہ تنخواہ کے کچھ اعانت کردی جاتی ہے۔ اور آئندہ بھی بغرض بہبودیٔ مدرسہ ہر بہی خواہِ مدرسہ کیلئے خواہ ناظم یا غیر ناظم اس کا لحاظ کیا جائیگا۔"

یہ امر قابل لحاظ ہے کہ ناظم ہو یا غیر ناظم اس کے لئے اتنی ہی رقم لینا روا ہے، جو نفقۂ عیال کیلئے کافی ہو سکے، اس سے زیادہ کی گنجائش نہیں رکھی گئی ہے۔ اس سے زیادہ لینا گویا بانیان مدرسہ کے وضع کردہ اصول و ضوابط سے انحراف ہے۔

صفحہ ۳۰ پر جو نقشۂ امتحان مدرسہ اور طلباء کے حاصل کردہ نمبرات درج ہیں، ان سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ عربی جماعتوں میں کل چھ طالب علم تھے، جن میں دو مشکوٰۃ اور شرح وقایہ پڑھنے والے تھے، دو شرح جامی اور قطبی پڑھنے والے، ایک طالب علم کافیہ اور علم الصیغہ پڑھنے والا، اور ایک طالب علم میزان و منشعب، شرح مائۃ عامل اور ہدایۃ النحو پڑھنے والا تھا، یہ عربی درجات کی صورتحال تھی، اور بیس پچیس طلبہ فارسی اور پرائمری کے درجات میں تھے۔

اور ص ۳۲ پر جو روداد کا آخری صفحہ بھی ہے، ۹۔ اشعار پر مشتمل ایک نظم

بعنوان "مدح مدرسہ مفتاح العلوم مع تاریخ" اور "قطعہ تاریخ طبع روداد" چھپا ہوا ہے۔
مدرسہ سے متعلق جو نظم ہے اس کا ایک شعر نذر قارئین ہے:

کیوں نہ اس کا نام ہو شمس الفیوض　　نور الانواری ہے مفتاح العلوم
۱۳۲۷ھ

یہ مدرسہ مفتاح العلوم کے قیام کی ایک اجمالی تاریخ تھی، اس سے ناظرین اندازہ لگا سکتے ہیں کہ مدرسہ کی نشو و نما میں علامہ اعظمیؒ کے والد ماجد مرحوم کا کیا عمل دخل رہا ہے، اور وہ انتظامی امور سے لے کر تعلیمی معاملات تک کس طرح ہر کام میں پیش پیش رہے اور اپنی خدمات اس کے لئے وقف کرتے رہے اور اس کی توسیع و ترقی میں علامہ اعظمی کا کیا حصہ رہا ہے، اس کا اندازہ اس سے لگائیں کہ ۱۳۴۶ھ کا جو نقشہ ہم نے پیش کیا ہے، اس میں جو سب سے اونچی جماعت ہے، وہ مشکوٰۃ شریف اور شرح وقایہ پڑھنے والوں کی ہے، اس میں کل دو طالب علم ہیں۔ مشکوٰۃ شریف کے لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو یہ جماعت آج کے اعتبار سے موقوف علیہ کی ہوگی، اور شرح وقایہ کے حساب سے۔ دیکھا جائے تو درجۂ چہارم کی۔ اگر ہم اس جماعت کو موقوف علیہ کی بھی مان لیں، تو اگلے سال یعنی ۱۳۴۷ھ میں جب علامہ اعظمی نے دورۂ حدیث کا درس دے کر اس کی نشاۃ ثانیہ کی ہے تو دو طالب علموں کی یہ جماعت بڑھ کر آٹھ طلباء کی ہوئی۔ چنانچہ فضلاء مدرسہ کا جو پہلا بیچ (Batch) فارغ التحصیل ہو کر نکلا ہے ان کی تعداد آٹھ تھی، جن میں کئی ایک بیرون مئو کے بھی تھے۔

بانی کون ہے؟ مدرسہ مفتاح العلوم کی جو تاریخ ہم نے اجمالاً ذکر کی ہے، اس کے تناظر میں یہ بات بلا خوف لومۃ لائم کہی جا سکتی ہے، کہ مدرسہ کے قیام کا جو رشتہ حضرت مولانا امام الدین صاحب پنجابی قدس سرہ العزیز سے جوڑا جاتا ہے وہ بات خلاف تحقیق ہے، اور تاریخی لحاظ سے اس کی کوئی اصلیت نہیں ہے، ہاں اتنا ضرور ہے کہ مولانا امام الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے جامع مسجد کٹرہ میں کچھ عرصہ تک درس دیا تھا، اور اسی عرصہ میں

مولانا عبدالغفار صاحب عراقیؒ مئوی اور مولانا سلطان احمد صاحب (۱) مئوی وغیرہ نے آپ کے سامنے زانوئے تلمذتہ کیا تھا، اور علوم وفنون کی مختلف کتابوں کا آپ سے درس لیا تھا، لیکن یہ باقاعدہ مدرسہ کا قیام نہیں تھا اور نہ ہی مولانا امام الدین صاحبؒ کے ذہن میں اس کے قیام کا کوئی تصور رہا ہوگا، بس ایسے ہی تھا جیسے آج بھی ہوتا چلا آرہا ہے کہ کسی محلے کے کوئی مولوی یا عالم کسی مسجد میں بیٹھ کر دو چار طالب علموں کو چھوٹی بڑی کتابیں پڑھادیا کرتے ہیں، اس سے نہ وہ مسجد موجودہ اصطلاح میں مدرسہ ہو جاتی ہے، اور نہ ہی وہ پڑھانے والے بانیان مدرسہ کہے جاتے ہیں۔

مفتاح العلوم کی تاریخ علامہ اعظمی کے قلم سے مفتاح العلوم کی تاریخ سے متعلق یہاں میں علامہ اعظمیؒ کی ایک تحریر نقل کردوں، جس سے مدرسہ کا قیام اور اس کی تاریخ بالکل واضح اور بے غبار ہو جاتی ہے، آپ تحریر فرماتے ہیں:

"یہ مدرسہ ۱۳۲۷ھ میں قائم ہوا، جیسا کہ اس کی پہلی مہر میں کندہ ہے، اس کا افتتاح جامع مسجد کٹرہ میں ہوا، لیکن نہ اس کا کوئی باضابطہ نظام تھا، نہ اس کی اپنی عمارت تھی، نہ سرمایہ۔ اس لئے اس کے بانی مولانا ابوالحسن عراقی کبھی اس کو جامع مسجد کٹرہ میں چلاتے تھے اور کبھی احاطہ شاہ محمد عمر میں۔

---

(۱) مولانا سلطان احمد مئوی شعبان ۱۲۸۵ھ میں مئو میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم قصبہ مئو کے دیگر اساتذہ کے علاوہ مولانا امام الدین پنجابی سے حاصل کی، اس کے بعد غازیپور چلے گئے، اور وہاں کے مدرسہ چشمۂ رحمت میں مولانا محمد فاروق چریاکوٹی اور حافظ عبداللہ غازیپوری وغیرہما کے حلقۂ درس میں شریک ہوئے، اور وہیں سے ۱۳۰۹ھ میں سند فراغ حاصل کی۔ فراغت کے بعد وطن میں آکر درس وتدریس کا آغاز کیا، مدرسہ دارالعلوم مئو کا قیام وبنا ان ہی کی طرف منسوب اور مشہور ہے، مولانا بے پناہ صلاحیت واستعداد اور بہت علم وفضل کے مالک تھے لیکن عمر نے زیادہ وفا نہ کی اور چالیس برس کے سن میں ۱۳۲۵ھ میں اس دنیا سے رحلت فرماگئے۔ (تذکرہ علماء اعظم گڑھ ص ۱۰۰)

۱۳۲۰ھ سے پہلے مفتاح العلوم کا وجود نہ تھا، نہ کسی دوسرے نام سے یہاں کوئی مدرسہ قائم ہوا تھا۔ البتہ تیرہویں صدی کے اخیر میں علاقۂ سورت سے ایک عالم مولانا امام الدین نامی سیاحت کرتے ہوئے وارد مئو ہوئے، اور یہاں کی خاک ان کی دامنگیر ہو گئی، انھوں نے بطور خود کبھی جامع مسجد میں اور کبھی الہ داد پورہ کی مسجد میں درس دینا شروع کر دیا، ان درسوں میں اس عہد کے تمام ہونہار طلبہ شریک ہوتے تھے، جو بعد میں بہت بلند پایہ عالم و فاضل، مدرس و مصنف اور خطیب و واعظ ہوئے، لیکن مولانا امام الدین نے جو عام طور پر پنجابی کے نام سے مشہور تھے، کوئی مدرسہ قائم نہیں کیا تھا، وہ ذاتی حیثیت سے نجی طور پر درس دیتے تھے، ان کی نہ تو تنخواہ تھی، نہ وہ کسی نظام کے ماتحت درس دیتے تھے۔

ان کے درس میں تسلسل بھی نہ تھا، کبھی کسی سال پڑھا رہے ہیں تو پڑھا رہے ہیں، دوسرے سال نہیں، جی چاہا یا کسی وجہ سے متوحش ہوئے تو قرب و جوار کے مواضع اور اضلاع میں سیاحی کرنے لگے، اور ادھر ۱۳۲۰ھ سے دس بارہ سال پہلے سے تو انھوں نے درس کا سلسلہ بالکل ہی ختم کر دیا تھا، اور اس سے بھی پہلے انھوں نے شاہ پور (ادری) میں نکاح کر کے وہیں رہنا شروع کر دیا تھا، اور وہیں سے سیاحت کو نکل جایا کرتے تھے۔ بہر حال ۱۳۲۰ھ سے پہلے بیسیوں سال بلکہ زیادہ تک جامع مسجد میں درس و تدریس کا کوئی منظم یا غیر منظم سلسلہ قائم نہیں تھا۔ اسی طرح اس مدت میں موجودہ دار العلوم کا بھی وجود نہ تھا۔ (۱) البتہ مولانا سلطان احمد مرحوم نے قاسم پورہ چوپال کی مسجد میں بغیر کسی نظام کے درس

---

(۱) یہ بات خلاف واقعہ اور حقیقت سے دور ہے کہ مولانا سلطان احمد نے ۱۲۹۳ھ میں دار العلوم قائم کیا اس وقت تو مولانا کی عمر ابھی گیارہ سال کی تھی، وہ پڑھ کر فارغ بھی نہیں ہوئے تھے، ۱۳۰۹ھ ان کی طالب علمی کا دور تھا، اس سال عالم و فاضل ہوئے، ظاہر ہے کہ مدرسہ انھوں نے ۱۳۰۹ھ کے بعد ہی قائم کیا ہوگا۔ (علامہ اعظمی)

دینا شروع کر دیا تھا، مولانا سلطان احمد مرحوم کے بعد اسی سلسلۂ درس و تدریس کو اس جگہ منتقل کر دیا گیا جہاں آج دار العلوم ہے، اور اس کو ایک نظام کے ماتحت دار العلوم کے نام سے جاری کیا گیا۔

۱۳۲۷ھ اور اس کے کئی سال بعد تک دار العلوم مئو میں فوقانی درجات نہیں تھے، نہ دورۂ حدیث کا انتظام تھا، اور مولانا ابوالحسن کے پاس بعض ایسے طلبہ تھے جن کے لئے ممکن نہ تھا کہ کہیں باہر جا کر اپنی تعلیم پوری کر سکیں، شاید اسی لئے مولانا نے جامع مسجد شاہی کٹرہ میں مفتاح العلوم کی بنیاد ڈالی، جہاں مولانا علی احمد کوئیریاپاری، مولانا حبیب الرحمٰن عراقی، مولانا ابوالخیر پسر مولانا شاہ محمد عمر وغیرہ نے اونچی کتابوں کا درس لے کر تکمیل کے لئے دار العلوم دیوبند میں داخلہ لیا، اور لوگ مثلاً مولانا محمد صابر (پٹھان ٹولہ) نے اونچی کتابوں کے علاوہ صحاح ستہ کا درس لے کر مفتاح العلوم سے سند فراغ حاصل کی، مولانا محمد صابر کا سال فراغ ۱۳۲۹ھ ہے اور ان کی سند جو مدرسہ کی مہر کے علاوہ مولانا عبد الغفار اور مولانا شاہ محمد عمر کی مہروں سے بھی مزین ہے، میرے پاس موجود ہے۔

۱۳۲۹ھ میں اور اس کے بعد اکثر و بیشتر یہ مدرسہ احاطۂ شاہ محمد عمر میں جاری رہا اور ۱۳۲۹ھ و ۱۳۴۴ھ کے درمیان اس سلسلہ کا انقطاع بھی اس طرح ہو گیا کہ مولانا ابوالحسن عراقی نے لار ضلع گورکھپور (حال ضلع دیوریا) میں مفیض العلوم کے نام سے ایک مدرسہ قائم کر لیا، پھر ۱۳۴۴ھ (میں) دوبارہ منظم شکل میں مفتاح العلوم کی تاسیس ہوئی ...

۱۳۴۶ھ میں مدرسہ کے صدر انجمن شاہ محمد عمر صاحب تھے، اور ناظم مولوی ابوالحسن صاحب، نائب ناظم مولوی محمد صابر صاحب (پٹھان ٹولہ) اور میں اس کی مجلس تعلیمی کا رکن تھا (دیکھئے روئداد مدرسہ ۱۳۴۶ھ تا ۱۳۴۷ھ)۔

شوال ۱۳۴۷ھ سے مدرسہ نے ترقی کی طرف دوسرا قدم اٹھایا، جس

کی تفصیل یہ ہے کہ: "اب بحمد اللہ! اس مدرسہ میں عربی کی مکمل تعلیم کا انتظام ہو گیا، چار مستقل تنخواہ دار مدرسین اور تین اعزازی مدرسین بڑی خوبی و خوش اسلوبی سے فرائض تعلیم انجام دینے لگے۔ انتہائی خوشی کی بات ہے کہ اس سال ۱۱ لڑکے حدیث شریف کے دورہ میں شریک ہیں" (اشتہار مدرسہ ذی الحجہ ۱۳۴۶ھ)۔ یہ وہ دور ہے جب میں نے مدرسہ کی طرف توجہ کی اور اس کا انتظام عملاً میں نے سنبھالا، یہ اشتہار بھی میرا ہی شائع کیا ہوا ہے۔ اس لئے کہ مولوی ابوالحسن صاحب اس وقت حج کیلئے حجاز چلے گئے تھے۔"

مفتاح العلوم کی نشأۃ ثانیہ

پنجاہ سال خدمت ایں خانہ کردہ ام   وامروز نیست ہمرہ من جز فسانہ ہیچ

۱۳۴۶ھ میں علامہ اعظمی مدرسہ مظہر العلوم سے مستعفی ہوگئے، اور گھر کا قصد کیا، اور پھر گھر ہی کے ہو کر رہ گئے:

فالقت عصاها واستقر بها النوى   كما قرّ عينا بالإياب المسافر

(اس نے اقامت اختیار کی اور اسے قرار حاصل ہوا، جس طرح گھر لوٹ کر مسافر کی آنکھ ٹھنڈی ہو جاتی ہے)

اس وقت مدرسہ مفتاح العلوم چراغ سحری ہو رہا تھا اور قریب تھا کہ ہوا کا کوئی معمولی سا جھونکا اس ٹمٹماتے ہوئے چراغ کو گل کر دے، آپ کے استاذ محترم مولانا ابوالحسن صاحب" اس مدرسہ کے ناظم تھے، اور بڑی مشکل سے اس جھلملاتے ہوئے چراغ کو سنبھالے ہوئے تھے، والد محترم کا بھی اس ادارہ سے گہرا تعلق تھا، لیکن ضعف اور پیرانہ سالی کے باعث ان حضرات کے قوی مضمحل اور اعصاب کمزور ہو چکے تھے، ایسی حالت میں اس ادارہ کی ترقی کے بارے میں تو کیا سوچتے اس کے وجود کو باقی رکھنا ان لوگوں کیلئے دشوار ہو رہا تھا۔ اس کی حالت اس مریض کی سی ہو چکی تھی جس کا کوئی بھی دم دمِ واپسیں ہو سکتا ہے، اور اسے کسی مسیحا نفس کا انتظار تھا جو اپنے نفس کی گرمی سے اس میں دوبارہ جان ڈالتا۔

علامہ اعظمی" جب بنارس سے مستعفی ہو کر مئو تشریف لائے تو استاذ محترم

مولانا ابوالحسن صاحب عراقی نے اس موقع کو غنیمت بار دہ جانا، اور شاگرد عزیز کے سامنے یہ تجویز رکھ دی کہ وہ مدرسہ مفتاح العلوم سے وابستہ ہو جائیں، آپ استاد کی حکم عدولی نہیں کر سکتے تھے، اس لئے مجبوراً یا بطیب خاطر اس پیش کش کو قبول کر لیا، استاد جوہر شناس تھے، وہ اپنے شاگرد کی علمی، درسی و تدریسی، تحریری و تقریری اور نظم و نسق کی صلاحیتوں سے بخوبی واقف تھے، ع "قدر جوہر شاہ داند یا بداند جوہری" ان کی عقابی اور دور رس نگاہ نے شاگرد کے اندر مضمر قوتوں اور پوشیدہ توانائیوں کو دیکھا ہو گا، علم اور دین کیلئے وہ ان کی تڑپ، لگن اور دھن، صبر و استقلال، ثابت قدمی و پامردی اور اخلاص و للّٰہیت کے سچے جذبوں سے یقینی طور پر باخبر رہے ہوں گے، جن کی کسی ادارہ کو ترقی کی راہ میں سب سے زیادہ ضرورت پڑتی ہے علامہ اعظمی نے استاد کے اصرار کو دیکھا تو اس سے وابستگی کیلئے اپنی آمادگی ظاہر فرمادی:

ایک اک کر کے ہوئے جاتے ہیں تارے روشن

میری منزل کی طرف ان کے قدم آتے ہیں

علامہ اعظمی نے مفتاح العلوم میں قدم کیا رکھا، مدرسہ کے دن پھر گئے، جس دن آپ مدرسہ میں داخل ہوئے ہیں، اس دن آپ کے جلو میں مدرسہ کی شہرت و ناموری بھی داخل ہوئی، مفتاح العلوم کے اندر آپ کے نزول اجلال کا پہلا دن اس کی تعمیر و ترقی اور عروج و بلندی کا نقطۂ آغاز ثابت ہوا، وہی مدرسہ جو اپنے وجود و بقا کیلئے جد و جہد کر رہا تھا، اور جس کیلئے اپنے وجود کو باقی رکھنا مشکل ہو رہا تھا، دیکھتے ہی دیکھتے اس تیزی سے آگے بڑھا کہ معمولی سی مدت میں شہرت کے آسمان پر پہنچ گیا۔

دو معتبر شہادتیں اوپر ص ۱۶۳ پر علامہ اعظمی کی جو تحریر نقل ہوئی ہے، اس سے آگے آپ حصلا فرماتے ہیں:

"مدرسہ کا یہی وہ دور ہے جس کے بارے میں مولانا عبداللطیف صاحب

"مفتاحی ڈائری" ۱۳۸۷ھ میں رقمطراز ہیں:

"۱۳۴۴ھ میں جب شیخ الحدیث حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی نے اس طرف اپنی توجہ مبذول کی اور مدرسہ کو دوبارہ اس کے اصلی گھر (شاہی مسجد) منتقل کر کے (۱) ایک نئی زندگی دینے کی کوشش کی، تو یہ مدرسہ بہت جلد ترقی کر گیا... آپ نے ۱۳۴۴ھ سے ۱۳۶۰ تک مفتاح العلوم میں صدر مدرسی کے فرائض انجام دیے اور ۱۳۶۶ سے ۱۳۷۱ تک نظامت کا عہدہ بھی سنبھالا۔"

"اور مولانا ایوب صاحب ناظم مفتاح العلوم، روئداد مدرسہ از شوال ۱۳۴۷ تا ذی الحجہ ۱۳۴۸ھ میں اس زریں دور کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"۱۳۴۴ھ سے پہلے کا جو زمانہ گذرا ہے وہ قابل اعتبار نہیں، ۱۳۴۴ھ میں اس مدرسہ کے نظم و نسق کی دوبارہ تجدید ہوئی اس وقت سے مدرسہ نے ترقی کرنی شروع کی اور بجائے ایک مدرس عربی و ایک حافظ کے دو مدرس و ایک حافظ، اور حساب و ریاضی کے لئے ایک ٹرینڈ مدرس کا تقرر رہوا...

پھر ۱۳۴۷ میں سہ بارہ نظم و نسق کی تجدید نے مدرسہ کو بڑی بڑی شاندار درسگاہوں کے دوش بدوش لا کھڑا کر دیا اور اب یہ مدرسہ خالص اسلامی علوم کا مرکز، دینی تعلیم کا سرچشمہ او ر مذہب کا گہوارہ بن گیا ہے (ص ۲)۔"

علامہ اعظمی کا ذاتی بیان مذکورہ بالا اقتباس نے آگے کی تحریر اس تفصیل کا اجمال ہے جو آئندہ صفحات میں آرہی ہے، اس لئے مناسب ہوگا کہ یہیں آپ کا وہ بیان بھی نقل کر دیا جائے، جو مذکورہ بالا تحریر کے معاً بعد ہے فرماتے ہیں:

جیسا کہ اوپر معلوم ہو چکا ہے (۲) مدرسہ کا صدر مدرس ۲۳ برس تک یہ ناچیز رہا۔

---

(۱) ۱۳۴۴ میں مدرسہ کی ابتداء محلہ الہ داد پورہ میں کی گئی تھی (دیکھو روئداد ۱۳۴۶ ص ۳) (علامہ اعظمی)

(۲) مولانا عبداللطیف صاحب کی تحریر کی طرف اشارہ ہے (مسعود)

اور تقریباً ۶ برس صدر مدرس و ناظم دونوں کے عہدے میرے ہی پاس تھے، اس طرح تقریباً ۲۹ برس تک میں نے مدرسہ کی خدمت اس ایثار و قربانی کے ساتھ انجام دی کہ اس کے مقابل میں ڈابھیل، عالیہ کلکتہ اور دارالعلوم دیوبند کی پیشکش اور اونچی تنخواہوں کو قبول نہیں کیا۔ حتی کہ دارالعلوم دیوبند سے شیخ الاسلام مولانا حسین احمد اور مولانا قاری طیب صاحب نے مئو کا سفر صرف اس مقصد سے کیا کہ مجھ کو دیوبند لے جائیں، مگر نہ مدرسہ مجھ کو چھوڑ سکا نہ میں مدرسہ کو۔"

کاروان بنتا رہا علامہ اعظمیؒ جانب منزل چلے تو اکیلے، لیکن لوگ آتے رہے، ساتھ ہوتے رہے اور کاروان بنتا رہا، چنانچہ آپ کی وابستگی کے کچھ عرصہ بعد مولانا عبداللطیف صاحب نعمانیؒ اور پھر مولانا محمد ایوب صاحب اعظمیؒ (۱) بھی آپ کے شریک سفر ہو گئے، علامہ اعظمیؒ خود فرماتے ہیں:

"جب میں بنارس چھوڑ کر مئو آیا تو مولانا ابوالحسن صاحبؒ نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور مجھے باصرار تمام مفتاح العلوم میں لاکر بٹھادیا، دو ماہ کے بعد مولانا عبداللطیف صاحب عیدالضحیٰ کی تعطیل میں مئو آئے تو میں نے ان کو بھی روک لیا، مفتاح العلوم جو چراغ سحری ہو رہا تھا، اس کو اس طرح حیات نو ملی، اور اس کی نشاۃ ثانیہ کا دور شروع ہوا، تھوڑے ہی دنوں کے بعد مولانا ایوب صاحب کو دیوریا سے بلاکر نظامت کا عہدہ ان کو تفویض کر دیا گیا۔

زمانہ کروٹیں لیتا رہا اور مفتاح العلوم سال بسال ترقی کرتا رہا، مختلف اوقات اور حالات میں ہم تینوں نے مدرسہ کی صدارت اور نظامت کی ذمہ داریوں کو سنبھالا۔" (۲)

(۱) مولانا محمد ایوب صاحب اور مولانا عبداللطیف صاحب کے حالات جستہ جستہ اس کتاب میں آپ پڑھیں گے، مولانا ایوب صاحب نے (جیسا کہ آگے آئیگا) بعض ناخوشگوار حالات کے سبب مفتاح العلوم سے علیحدگی اختیار کرلی تھی، اور کئی سال تک جامعہ تعلیم الدین ڈابھیل میں شیخ الحدیث کے منصب پر فائز رہے، ۶؍ شوال ۱۴۰۴ھ مطابق ۱۹۸۴ء کو مئو میں وفات واقع ہوئی۔

(۲) تذکرہ مولانا عبداللطیف نعمانی ص ۱۵

اور پھر اس قافلۂ اہل جنوں میں ایک اور فرد کا اضافہ ہوا، جس کا اندازہ ایک ایسی تحریر سے ہوتا ہے جو علامہ اعظمیؒ کے منتشر اوراق میں دستیاب ہوئی، یہ تحریر ہے تو کسی اور کے قلم سے لیکن اغلب یہ ہے کہ علامہ اعظمیؒ کے ایماء یا املاء سے لکھی گئی ہے۔ تحریر یہ ہے:

"شوال ۱۳۴۷ھ میں مولانا ابوالحسن نے اپنا قائم کیا ہوا مدرسہ مولانا کے سپرد کردیا، اور خود حج کو چلے گئے، اس سال مولانا نے تن تنہا جامع مسجد کے فرش پر پہلی بار دورۂ حدیث کی تعلیم دی، اور مدرسہ کا پورا نظام اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ ڈھائی ماہ کے بعد مولانا عبداللطیف کو جو سنبھل میں مدرس تھے شریک کرلیا۔ پھر کئی ماہ بعد مولانا محمد ایوب مرحوم کو جو دیوریا کی جامع مسجد میں پڑھاتے تھے، دیوریا سے بلا کر ناظم کے عہدہ پر فائز کردیا، اور کچھ دنوں کے بعد مولانا شمس الدین صاحب (کیاری ٹولہ پرشین ٹیچر جیون رام ہائی اسکول)(۱) کو نائب ناظم اور معین مدرس کی خدمت سپرد کی۔"

تیز رفتار ترقی یہ چاروں حضرات، بالخصوص عناصر ثلاثہ مدرسہ مفتاح العلوم کی تعمیر و ترقی کیلئے کس طرح مصروف کار اور کوشاں رہے، اور اس کیلئے کس عمل پیہم، جہد مسلسل، اتحاد واتفاق اور ہم آہنگی کا مظاہرہ کرتے رہے، اور کس طرح قدم بقدم اور شانہ بشانہ چلتے اور بڑھتے رہے، اور اس کو بام عروج تک پہنچانے میں ان کو کیسی تند و تیز ہواؤں، اور ناخوشگوار، حوصلہ شکن و صبر آزما حالات کا مقابلہ کرنا پڑا ہے، اس کیلئے مولانا محمد ایوب صاحبؒ کی یہ تحریر ملاحظہ فرمایئے:

---

(۱) کچھ کتابوں میں علامہ اعظمی کے ہم سبق تھے، لیکن فراغت آپ کے ایک سال بعد ۱۳۴۱ھ میں دارالعلوم مئو سے پائی، جیون رام ہائی اسکول میں فارسی کے ٹیچر تھے، مفتاح العلوم میں آنے کے بعد مدت العمر اس سے وابستہ رہے، اور نظم و نسق کی ذمہ داری کے ساتھ درس و تدریس کی خدمت بھی آخر وقت تک انجام دیتے رہے، جمادی الاولی ۱۳۹۲ھ میں سفر آخرت فرمایا۔

"مدرسہ پہلے الہ داد پورہ کی مسجد میں تھا، مگر طلبہ کی کثرت وہجوم کی وجہ سے جامع مسجد شاہی کٹرہ میں منتقل کر دیا گیا، جامع شاہی کا وسیع صحن وسائبان درسگاہوں کا کام دینے لگا، اس وقت مدرسہ کی مخصوص عمارت نہیں تھی، بیرونی طلبہ شہر کی مختلف مساجد کے کمروں میں ٹھہرائے جاتے تھے، ان دونوں حضرات یعنی حضرت مولانا اعظمی (مدظلہ) وحضرت مولانا نعمانیؒ نے درس وتدریس کی خدمت سنبھالی اور اس حقیر کو انتظام واہتمام کی خدمت سپرد ہوئی، ہم میں سے ہر ایک نے اپنی پوری و بھرپور صلاحیت واستعداد سے کام لیا، اور سرگرم عمل ہو گئے، حالانکہ اس وقت مدرسہ کو ترقی دینا تو درکنار اس کی بقا بھی مشکل تھی، اس لئے کہ مدرسہ دارالعلوم جو شہر کا پرانا مدرسہ تھا اور اس نے ملک میں کافی شہرت و مقبولیت حاصل کر لی تھی، اس کے اراکین د ممبران شہر کے متمول ترین لوگ تھے، اور ان کو عوام میں کافی اثر ورسوخ حاصل تھا، وہ لوگ مدرسہ مفتاح العلوم کے سخت مخالف تھے، وہ کسی قیمت پر مفتاح العلوم کی بقا کے روادار نہ تھے، مگر چونکہ پڑھانے والے حضرات اعلیٰ قابلیت کے مالک اور درس وتدریس میں یکتائے روزگار سمجھے جاتے تھے، درس جمتا گیا اور علمی حلقہ میں کافی شہرت و مقبولیت حاصل ہو گئی، دور دور سے تشنگان علم کھنچے چلے آتے تھے، اور چند ہی سالوں میں بیرونی طلبہ سے مدرسہ بھر گیا۔"(۱)

اس طرح مختصر سی مدت میں مدرسہ مفتاح العلوم کا نام ملک کے طول وعرض میں پھیل گیا، حضرت علامہ اعظمیؒ اور مولانا عبداللطیف نعمانیؒ کے درس کی شہرت سن سن کر دور دراز مقامات سے شائقین علم آتے، سرچشمۂ حبیب ولطیف سے اپنی تشنہ کامی کا علاج کرتے اور شاد کام واپس جاتے، مدرسہ کی روداد بابت شوال ۱۳۴۷ھ لغایۃ ذی الحجہ ۱۳۴۸ھ میں لکھا ہے:

(۱) تذکرۂ مولانا عبداللطیف نعمانی ۴۶-۴۵

"مفتاح العلوم میں درس نظامیہ کے موافق تمام علم و فن کی کتابیں، مثلاً تفسیر و حدیث، اصول حدیث، اصول فقہ، معقول و فلسفہ، صرف و نحو، حساب و ریاضی وغیرہ وغیرہ پڑھائی جاتی ہیں، اور ہر ایک فن کیلئے نہایت قابل اور ذی استعداد مدرس رکھے گئے ہیں۔ جن کے حسن تعلیم و بے نظیر قابلیت کا نتیجہ ہے کہ اطراف و اکناف ہند سے مثلاً اعظم گڈھ، غازیپور، جون پور، مظفرپور، لکھنؤ، دربھنگہ، بہار، چمپارن، بتیا، بنارس وغیرہ وغیرہ، جوق در جوق شائقین و تشنگان علم چلے آتے ہیں۔"(۱)

مولانا ظفیر الدین صاحب مفتاحی تحریر فرماتے ہیں:

"اس ضمن میں مئو کے مدارس کا تذکرہ بھی آیا، مرحوم عبدالعزیز مئوی نے بتایا کہ مفتاح العلوم مئو میں تعلیم بہت عمدہ ہوتی ہے اور اس مدرسہ میں دو مدرس بڑی شہرت کے مالک ہیں، ایک مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی اور دوسرے مولانا عبداللطیف نعمانی، یہ مناظر بھی ہیں، اور علم فقہ اور حدیث کے ماہر اور بالغ النظر استاذ بھی، بلکہ معقولات میں بھی یہ حضرات اپنا ثانی نہیں رکھتے..."(۲)

ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں:

"مفتاح العلوم میں میری حاضری دو شخصیتوں کی علمی شہرت کی وجہ سے ہوئی تھی... مگر عجیب اتفاق، جن دو شخصیتوں کا نام سن کر مفتاح العلوم آیا تھا، ان میں سے کسی کے پاس میرا سبق اس پہلے سال نہیں گیا۔ اس کا بے انتہا غم ہوا، ،اساتذہ میں ان دو کے بے پناہ اثرات تھے..."(۳)

---

(۱) ص ۵

(۲) ترجمان الاسلام ۱۱۔۱۲ ص ۱۳۶

(۳) تذکرۂ مولانا عبداللطیف نعمانی ص ۱۰۱

شیخ الحدیث بھی اور صدر المدرسین بھی اس میں کوئی شک نہیں کہ مدرسہ مفتاح العلوم کی تعمیر وترقی اور ایک مکتب نما سے جامعہ تک کے تمام تدریجی مراحل کو طے کرانے میں تینوں ارباب فضل وکمال (علامہ حبیب الرحمٰن اعظمی، مولانا عبداللطیف نعمانی اور مولانا محمد ایوب اعظمی رحمھم اللہ) کی سہ طرفہ کوششیں کارفرما رہی ہیں، اور یہ تینوں حضرات جس حسن انتظام واتفاق وانسجام، ہم نفسی اور ہم آہنگی کے ساتھ اس کی توسیع کیلئے سعی مسلسل کرتے رہے، اس کی مثال مشکل سے ملے گی، تاہم اس سے انکار کی گنجائش نہیں کہ ان میں علامہ اعظمیؒ کی حیثیت سالار قافلہ، میر کارواں اور سید الطائفہ کی تھی، اور آپ کی ذات کو وہی مقام ومرتبہ حاصل تھا جو ستاروں کے درمیان ماہ چہاردہ کا شب کا ہوا کرتا ہے۔

ھوالبدر والناس الکواکب حولہ وھل یشبہ البدر المضئی الکواکب

(وہ چودھویں کا چاند ہے اور لوگ اس کے گرد ستاروں کے مانند ہیں۔ اور کیا ستارے چودھویں رات کے روشن چاند کی طرح ہو سکتے ہیں)

علامہ اعظمی نے مدرسہ مفتاح العلوم میں تعلیم وتدریس ہی نہیں، بلکہ اس کی ہمہ جہتی ترقی کا آغاز کس شان اور کس آن بان سے کیا؟ ادارہ کی پوری تاریخ شاہد ہے، مدرسہ میں اپنے ورود مبارک کے دن سے لے کر ۲۲ر سال تک متواتر شیخ الحدیث اور صدر مدرس کے فرائض انجام دیتے رہے، مولانا مفتی ظفیر الدین صاحب مفتاحی مرتب فتاویٰ دارالعلوم دیوبند تحریر فرماتے ہیں:

> "اس وقت (۱۳۴۷ھ) سے لے کر ۱۳۶۹ھ تک برابر مفتاح العلوم کے شیخ الحدیث اور صدر مدرس رہے، اور بلاناغہ ہر سال یہاں دوسری کتابوں کے ساتھ دورۂ حدیث کی کتابیں بھی پڑھاتے رہے۔ عام طور پر آپ کے یہاں بخاری شریف مکمل اور ترمذی شریف مکمل ہوا کرتی تھی۔"(۱)

(۱) ترجمان الاسلام ۱۱۔۱۲ ص ۱۴۴

ایک دوسرے مضمون میں لکھتے ہیں:

"مولانا اعظمیؒ صدر المدرسین اور شیخ الحدیث تھے اور مولانا نعمانی نائب الصدر، دورہ کے اسباق میں بخاری و ترمذی صدر المدرسین کے یہاں ہوتی تھی اور مسلم و ابو داؤد نائب الصدر کے پاس، ان اسباق کے علاوہ بھی تین تین اسباق ان حضرات کے پاس مزید ہوتے تھے۔"(۱)

مولانا کریم بخش سنبھلی کے تاثرات ۱۳۴۷ھ لغایت ۱۳۴۸ھ کی جس رو داد کا اوپر ذکر کیا گیا ہے اس کے صفحہ ۱۲ پر مولانا کریم بخش صاحبؒ (استاذ علامہ اعظمی) صدر مدرس مدرسۃ الشرع سنبھل کے تاثرات یوں منقول ہیں:

"خاکسار نے امسال مدرسہ مفتاح العلوم واقع جامع شاہی مئو کا امتحان تحریری کتب احادیث و دیگر فنون میں لیا۔ الحمد للہ طلبہ نے اچھے خاصے اور اعلیٰ درجہ کے نمبر حاصل کئے، بلکہ بعض طلبہ نمبر انعامی کے بھی مستحق ہوئے، اور ان کو انعامی نمبر بھی عطا کئے گئے۔ اس سے طلبہ کی محنت اور جانفشانی کا اچھی طرح اندازہ ہوتا ہے، اور در حقیقت یہ مولوی فاضل مولوی حبیب الرحمٰن صاحب سلمہ صدر مدرس و مولوی عبد اللطیف صاحب سلمہ کی قابلیت اور حسن تعلیم کا ثمرہ اور اراکین مدرسہ کے حسن انتظام کا نتیجہ ہے۔ مدرسہ کی حالت بہت زیادہ قابل تحسین ہے۔"

تعلیمی شباب کا زمانہ اور اس حالت کو بہت زیادہ قابل تحسین بنانے میں علامہ اعظمی قدس سرہ العزیز نے کیا خدمات اور کیسے کارنامے انجام دیئے تھے، اس کے لئے بھی مولانا مفتی ظفیر الدین صاحب کی طرف رجوع کریں، جنھوں نے اس حالت کا بہت قریب سے مشاہدہ کیا تھا، وہ فرماتے ہیں:

---

(۱) تذکرہ مولانا عبد اللطیف نعمانی ص ۱۰۱

"مفتاح العلوم کا یہ دور کہنا چاہئے تعلیمی شباب کا زمانہ تھا، ہر درجہ میں کافی طلبہ تھے اور اساتذہ اسباق و مطالعہ کے باب میں بہت سخت۔ یوں سمجھئے کہ بد محنت کی اسباق میں اچھی خاصی پٹائی بھی ہوتی تھی، حضرت مولانا مد ظلہ اور مولانا نعمانیؒ دونوں عبارت خوانی میں ایک زیر زبر کی غلطی برداشت نہیں کرتے تھے، ترجمہ میں مولانا نعمانی ایک حد تک نرم تھے، مگر حضرت مولانا اعظمی مد ظلہ ترجمہ میں بھی اتنے ہی سخت تھے جس قدر عبارت کی صحت میں، کیا مجال کہ کوئی غلط ترجمہ کر کے نکل جائے۔ ہمارے بہت کم ساتھی تھے جنھوں نے عبارت خوانی یا ترجمہ میں مار نہ کھائی ہو۔(۱)

اور عربی زبان کے کہنہ مشق ادیب، اور علامہ اعظمی کے شاگرد رشید مولانا سعید الرحمٰن صاحب اعظمی اپنے بچپن کے نقوش و تاثرات میں لکھتے ہیں:

"ایک دن ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے میرے ننھے سے دل و دماغ میں رعب و خوف کا ایک طوفان برپا کر دیا۔ قاری صاحب (۲) کی زبان سے اچانک نکلا "بڑے مولانا" اور دیکھا تو ایک وجیہ اور بہت رعب دار و پر وقار بزرگ جامع مسجد کے مشرقی دروازہ پر بے تکلف دیوار کا سہارا لئے ہوئے کھڑے ہیں۔ لوگوں نے [illegible]یا کہ یہ بڑے مولانا ہیں جو مدرسہ کے سب سے بڑے عالم اور سب کے بزرگ ہیں۔ اس دن سے میں نے بڑے مولانا کی عزت و عظمت کو جو لوگوں کے دلوں میں پنہاں تھی سمجھا۔ یہ اپنی کم عمری میں عظمت و رعب کا سب سے پہلا نقش تھا جو میرے دل پر مرتسم ہوا اور آج تک وہ نقش قائم ہے۔"(۳)

(۱) تذکرۂ مولانا عبد اللطیف نعمانی ۱۰۲-۱۰۱

(۲) قاری صاحب سے مراد قاری عبد المنان صاحب ہیں، جو مفتاح العلوم کے شعبۂ تجوید میں قراءت کے قدیم ترین استاد تھے۔ محلہ پٹھان ٹولہ کے باشندہ تھے۔ ۱۸ر جمادی الاولی ۱۴۱۴ھ مطابق ۴ر نومبر ۱۹۹۳ء کو وفات پائی (المآثر ج ۲ ش ۲ ص ۲۹)

(۳) تذکرۂ مولانا عبد اللطیف ۱۰۹-۱۰۸

مفتاح العلوم کا عہد زریں ترقی کی دو قسمیں ہوتی ہیں : ایک عمودی (Vertical) دوسرے افقی (Horizontal) پہلی قسم کا تعلق کیفیت سے ہوتا ہے، جس کا مطلب ہوتا ہے کہ اچھی استعداد اور بہتر صلاحیت کے اساتذہ کی خدمات بہم پہنچائی جائیں، اور ہونہار، زیرک اور محنت وجانفشانی کا مظاہرہ کرنے والے طلبہ داخل کئے جائیں۔ دوسری قسم میں کمیت کا اعتبار کیا جاتا ہے، جو اساتذہ اور طلبہ کی تعداد، عمارتوں کی توسیع، درسگاہوں اور رہائش گاہوں کی کثرت وقلت سے متعلق ہوتی ہے۔ علامہ اعظمی اور ان کے رفقاء شروع ہی سے دونوں نہج پر زور صرف کرتے رہے، اور مدرسہ کی توسیع وترقی کیلئے اپنی تمام تر ظاہری وباطنی توانائیوں کو کام میں لاتے رہے، حکومت کے تعاون یا سرکاری امداد کا تو کوئی چکر نہیں تھا، عوام کے چھوٹے چھوٹے عطیوں کے ذریعہ ایک ایسا عظیم ادارہ تعمیر کیا، جس کی حدود اگرچہ وسیع نہ تھیں، لیکن فیض رسانی کے لحاظ سے اس وقت کے ملک کے اہم تعلیمی اداروں مثلاً دارالعلوم دیوبند، مظاہر علوم سہارنپور، مدرسہ شاہی مرادآباد اور دارالعلوم ندوۃ العلماء کی صفوں میں شامل تھا۔

وقت گذرتا رہا، شب وروز کی جدوجہد کے ثمرات ظاہر ہوتے رہے، تشنگان علم وفن کا ورود وصدور ہوتا رہا، اور اس کی علمی چہل پہل میں روز افزوں اضافہ ہوتا رہا، مختلف ادارے، مدارس اور مراکز کے اہل علم وفن اور اصحاب فضل وکمال بھی موقع بموقع اپنی تشریف آوری سے مشرف فرماتے، بسا اوقات ارباب علم وفضل کا اچھا خاصا اجتماع ہو جاتا، کبھی سالانہ امتحان کے بہانے، کبھی کسی جلسہ کے موقع پر، اور کبھی کسی اور تقریب کے طفیل اہل بصیرت اور ارباب فکرونظر آتے، طلبہ کے طور طریقے، ان کی خوش اطواری وسلیقہ شعاری اور نظام تعلیم وتربیت کا بغور اور بنظر غائر جائزہ لیتے، اور مسرور ومطمئن ہوکر ستائش آمیز اور تعریفی کلمات کہتے ہوئے واپس تشریف لے جاتے۔

معیار تعلیم اتنا بلند تھا کہ امتحان کے پرچے ملک کے مشہور ومعروف اہل علم وفن بناتے، اوپر گذر چکا ہے کہ نشاۃ ثانیہ کے بعد پہلے سال کا امتحان تحریری مولانا کریم بخش

صاحب سنبھلی صدر مدرس مدرسۃ الشرع سنبھل نے لیا تھا، اور ۵۴-۱۳۵۳ھ کی روداد میں ص ۴ پر درج ہے:

"امسال دورۂ حدیث کے پرچوں میں صحیح بخاری، و ترمذی شریف کے سوالات حضرت حجۃ الاسلام علامۃ العصر سیدی مولانا شبیر احمد عثمانی مدظلہ العالی نے منتخب فرمائے تھے۔"

اور یہ بات بھی آپ کے علم میں آچکی ہے کہ یہ دونوں کتابیں (بخاری و ترمذی) حضرت علامہ اعظمی کے زیر درس رہا کرتی تھیں۔

۵۴-۱۳۵۳ھ کا زمانہ ایک لحاظ سے ابھی مدرسہ کا عہد اول تھا، کسمپرسی اور بے سروسامانی کا وقت تھا، مال و زر کی افراط اور فراوانی نہیں تھی، اور نہ ہی وسیع و عریض اور بلند و بالا عمارتیں تھیں، اور بے سروسامانی کے اس زمانہ میں علامہ اعظمیؒ کا مدرسہ کے مفاد کیلئے کیا حصہ (Contribution) رہا ہے، وہ بھی اس محولہ بالا روداد میں مندرج ہے، "شعبہ تصنیف و تالیف" کے عنوان کے تحت صفحہ نمبر ۵ پر لکھا ہے:

"افسوس اس شعبہ کی تکمیل کیلئے جن اسباب و مواد کی ضرورت ہے وہ ہمارے پاس نہایت کمزور ہیں، جس سے ہم میدان ترقی میں تیز روی کے ساتھ نہیں چل سکتے، مثلاً کتب خانہ، مستقل عمارت کا ہونا تو از بس ضروری و لازمی چیز ہے، مگر ہم اس سے بھی محروم ہیں، اور یہ تمام تر تصنیفیں جناب مولانا ابوالمآثر حبیب الرحمٰن صاحب صدر مدرس (جن کی قابلیت علمی دنیا میں محتاج تعارف نہیں) کے قلم فیض رقم کی رہین منت ہیں۔"

اخلاص اور ایثار و قربانی اخلاص اور للّٰہیت دینی مدارس کی سب سے بڑی دولت اور عظیم ترین متاع ہے، بلکہ کہنا چاہئے کہ یہی رأس الشئی ہے، اور جہاں سے یہ چیز اٹھی وہاں سے ساری پونجی ختم ہوئی۔ دنیوی جاہ و حشمت اور مال و زر کی خواہش سے اگر قلب پاک و صاف ہو، نفس حرص و آز اور ہوی و ہوس کا بندۂ بے دام نہ ہو، اور دل کے اندر ایثار و قربانی

کا جذبہ موجود ہو تو کوئی بھی مدرسہ یا ادارہ کم سے کم مدت میں بلندی کے مدارج طے کر سکتا ہے۔ مدرسہ مفتاح العلوم اس وقت ایسے پاک طینت اور صاف باطن افراد سے معمور تھا جس کی شہادت ہندوستان کے ایک بلند پایہ عالم نے دی ہے، روداد مذکورہ بالا میں ص ۱۲۔۱۳ پر مولانا محمد منظور صاحب نعمانیؒ کے یہ تاثرات مذکور ہیں:

"یہ مدرسہ ہندوستان کے ان چند مخصوص مدارس میں سے ہے جن میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے میں طلبہ کو مخلصانہ مشورہ دیا کرتا ہوں، کیونکہ یہاں کے نظام پر مجھے خاص اعتماد ہے، مدرسہ کو خوش قسمتی سے مدرسین بھی غیر معمولی قابلیت کے میسر آگئے ہیں، جو نہایت قلیل مشاہروں پر انتہائی ایثار کے ساتھ مدرسہ کی تعلیمی خدمات انجام دے رہے ہیں، مجھے بلاواسطہ معلوم ہوا ہے کہ ان میں سے بعض مدرسین کو دوسری جگہ سے بڑے بڑے مشاہروں پر طلب فرمایا گیا لیکن ان کے اخلاق نے مدرسہ ھذا کی موجودہ قلیل رقم کو ترجیح دی اور وہ یہیں مقیم ہیں۔"

"بعض مدرسین" سے اشارہ کس شخصیت کی طرف ہو سکتا ہے! اہل نظر اور انصاف پسند قارئین کے لئے اس کا اندازہ کرنا کچھ مشکل نہیں۔ عقلمنداں را اشارہ کافی ست۔

شعبۂ تصنیف و تالیف اور تصنیفی سرگرمیاں اس چمنستان علمی کی تزئین و آرائش میں علامہ اعظمی کا کتنا عظیم الشان حصہ رہا ہے، اس کا کچھ اندازہ قارئین کو مندرجہ بالا سطروں سے ہوا ہوگا، اب ایک اور اقتباس آپ کے تبحر علمی اور جلالت فن سے متعلق پڑھئے جو روداد مذکورہ بالا میں درج ہے:

"اس مدرسہ میں تصنیف و تالیف کا بھی ایک شعبہ ہے اور شعبہ میں بحمد اللہ خاطر خواہ اور امید سے زیادہ کام بھی ہو رہا ہے، چنانچہ آپ یہ سن کر بہت خوش ہوں گے کہ جناب مولانا ابوالمآثر حبیب الرحمٰن صاحب صدر مدرس نے جن کی قابلیت علمی دنیا میں محتاج تعارف نہیں۔ حال ہی میں ایک کتاب "الحاوی"

لرجال الطحاوی نہایت ہی مفید ونادر تصنیف فرمائی ہے۔"(۱)

یہ زبردست تصنیفی کارنامہ اس وقت کا ہے جب کہ عمر کے تیس سال بھی پورے نہیں ہوئے تھے، اور آپ کی شناخت علمی دنیا میں اس طرح ہو چکی تھی کہ آپ کی ذات محتاج تعارف نہیں تھی بقول مجاز:

اس محفل کیف و مستی میں، اس انجمن عرفانی میں
سب جام بکف بیٹھے ہی رہے، ہم پی بھی گئے چھلکا بھی گئے

روداد مدرسہ بابت ۱۳۷۷ھ میں مرقوم ہے:

"جامعہ میں تصنیف کا بھی ایک مستقل شعبہ قائم ہے اور مقام مسرت ہے کہ اس شعبہ کو ملک کے مشہور محدث اور زبردست اہل قلم حضرت العلامہ جناب مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی مدظلہ کی مستقل سرپرستی حاصل ہے"۔(۲)

علامہ اعظمی علیہ الرحمہ نے مفتاح العلوم میں عمر عزیز کا جو حصہ گذارا وہ آپ کا عہد شباب تھا، اس وقت آپ کے دست و بازو قوتوں اور توانائیوں سے بھرپور تھے، بائیس سال کی مدت کچھ کم نہیں ہوتی (بائیس سال باقاعدہ تدریس اور صدارت و مشیخت کے، ورنہ آپ کے دست مبارک نے پچاس سال تک اس کی چمن بندی اور بہار آفرینی میں اہم کردار انجام دیا) یہ دور مفتاح العلوم کا بھی عہد زریں تھا، اس اثناء میں ملک کے اطراف وجوانب، بلکہ بسا اوقات بیرون ملک سے بھی نہ جانے کتنے طالبان گوہر علم آئے، آئے تو تہی دست اور خالی دامن، لیکن جب لوٹے تو علم و ادب کے لعل و گوہر اور یاقوت و جوہر سے جیب و دامن کو بھر کے گئے:

فعاجوا فأثنوا بالذی أنت اهله ولو سکتوا أثنت علیك الحقائب

علامہ اعظمی کا اپنے ہم عصروں اور ہم نفسوں کے درمیان جو نمایاں اور ممتاز مقام

(۱) ص ۵ (۲) ص ۷

تھا، اس کیلئے مثالاً عرض ہے:

"مولانا اعظمی مدظلہ کا پہلا گھنٹہ تصنیف و تالیف کیلئے خالی رہتا، عموماً دوسرے گھنٹہ میں تشریف لاتے، پہلے آکر جامع شاہی کے دروازے پر کھڑے ہوتے۔ آپ کے آتے ہی پورے مدرسہ میں اساتذہ سے لے کر طلبہ تک سب ہوشیار ہو جاتے، پھر مولانا مدظلہ اپنی درسگاہ دارالحدیث میں جو مسجد سے باہر کچے مکان میں تھی جا کر پڑھانے بیٹھ جاتے، اور جس درجہ کا سبق ہوتا اس کے طلبہ پہنچ جاتے، مولانا مدظلہ کے سوا سارے مدرسین کی درسگاہیں جامع شاہی میں تھیں۔ حضرت الاستاذ مولانا عبداللطیف نعمانیؒ بھی جامع شاہی کے فرش پر ہی بیٹھ کر درس دیا کرتے تھے۔"(۱)

بڑھنی کا مناظرہ بڑھنی نیپال کی سرحد پر بستی کا ایک گاؤں ہے ۱۹۲۹ء میں یہاں غیر مقلدوں سے ایک مناظرہ ہوا، اس وقت اس گاؤں کی آبادی مذہب اور تعلیم سے قریب قریب بے بہرہ تھی، غیر مقلدین نے یہاں کی فضا کو ہموار اور اپنے مناسب حال دیکھ کر غیر مقلدیت کی تبلیغ شروع کی، اور یہاں کے ناخواندہ لوگوں میں سے چند افراد کو حرف شناس بنا کر درجۂ اجتہاد تک پہنچا دیا، دیکھتے ہی دیکھتے یہ سیلاب بلا بہت سے خانوادوں کو بہا لے گیا، لیکن قدرت کا یہ عجیب کرشمہ کہ غیر مقلدین کے تربیت یافتوں میں ایک نوجوان مدارج تعلیم طے کرنے کے بعد غیر مقلدیت کے بڑھتے ہوئے دھارے کے لئے سد راہ بن گیا، چنانچہ اس نوجوان فاضل نے ایک جلسہ منعقد کر کے علماء احناف میں سے بعض بلند پایہ ہستیوں کو دعوت دی، جن میں امام اہلسنت مولانا عبدالشکور فاروقی لکھنوی، مولانا عبدالشکور مرزاپوری، علامہ اعظمی، مولانا عبداللطیف نعمانی، اور مولانا محمد ایوب مئوی وغیرہ حضرات تھے، اس جلسہ کی نمایاں کامیابی یہ رہی کہ تین اشخاص نے عین جلسہ

(۱) تذکرۂ مولانا عبداللطیف نعمانی ص ۱۰۲

میں تبدیل مسلک کا اعلان کیا۔

احناف کی یہ کامیابی غیر مقلدوں کیلئے بہت دلآزار ثابت ہوئی، اور انھوں نے اپنی سرگرمیاں اور تیز کردیں، یہاں تک کہ احناف کو مناظرہ کا چیلنج دیدیا۔ اور ۸/ جون ۱۹۲۹ء مناظرہ کی تاریخ متعین کردی، اس چیلنج کا مقابلہ کرنے کیلئے علامہ اعظمی، مولانا عبداللطیف صاحب نعمانی کو ساتھ لیکر بستی پہنچے، شرائط مناظرہ طے کرنے میں کئی روز تک مسلسل ردوکد ہوتی رہی، علامہ اعظمی اور مولانا نعمانی نے ہر ممکن کوشش کی کہ حق وناحق کا فیصلہ ہو جائے، لیکن مخالفین کسی شرط پر بھی آمادہ نہیں ہوئے، اور شرائط مناظرہ طے کرنے میں ہی راہ فرار اختیار کرگئے، اور علامہ اعظمی اور مولانا نعمانی اپنی فتحمندی پر خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے مئو واپس ہوگئے۔(۱)

الحاوی کی تصنیف ایک اہم علمی کارنامہ اس زمانے میں آپ نے جو ایک بڑا اہم اور ممتاز علمی کارنامہ انجام دیا وہ "الحاوی لرجال الطحاوی" کی تصنیف ہے، حافظ ابو جعفر احمد بن محمد بن سلامہ (متوفی ۳۲۱ھ) ایک جلیل القدر حنفی محدث گذرے ہیں، ان کی دو کتابیں ۔۱۔ "شرح معانی الآثار" اور ۲۔ "شرح مشکل الآثار" بہت شہرت اور اہمیت کی حامل ہیں، مسلک حنفی کے نقطۂ نظر سے یہ دونوں کتابیں نہایت بلند پایہ اور معرکۃ الآراء خیال کی جاتی ہیں۔ علامہ اعظمی نے ان دونوں کتابوں کے رجال ورواۃ کو جمع کرکے ان کے حالات قلمبند کیے، اس کے جمع وترتیب سے آپ جمادی الاولیٰ ۱۳۴۸ھ میں فارغ ہوئے، جیسا کہ آپ نے اپنی اس کتاب کے آخر میں ذکر فرمایا ہے اور " انه والله تصنيف شريف" اس کا مادۂ تاریخ نکالا ہے، جس کے اعداد ۱۳۴۸ برآمد ہوتے ہیں، یہ علامہ اعظمی کا وہ عظیم الشان کارنامہ ہے جس میں کوئی ان کا ثانی نہیں، کیونکہ "شرح معانی الآثار" کے رجال پر تو متعدد اہل علم نے کام کیا، لیکن "شرح مشکل الآثار" کی خدمت آپ کی بے نظیر

(۱) اس مناظرہ کی تفصیل علامہ اعظمی نے اپنے قلم سے کئی صفحوں میں لکھی ہے، جس کو راقم نے نہایت اختصار کے ساتھ ذکر کیا ہے اور صرف اس کا خلاصہ بیان کیا ہے۔

انفرادیت ہے، "الحاوی" کی قدر و قیمت کیلئے اتنا ہی عرض کر دینا کافی ہے کہ علامہ انور شاہ کشمیری اور علامہ شبیر احمد عثمانی جیسے جہابذۂ فن نے اس کی تحسین و ستائش کی ہے، اس کتاب کی تصنیف کے وقت آپ کی عمر محض انتیس سال تھی۔

دار المطالعہ والتصنیف کا قیام اور تذکرہ کا اجرا ان ہی ایام میں آپ نے دار المطالعہ والتصنیف کے نام سے ایک ادارہ کی داغ بیل ڈالی، بلکہ غالباً مفتاح العلوم ہی کے اندر اس کا ایک باقاعدہ شعبہ قائم کیا، اس دار المطالعہ کا تذکرہ اس زمانے کی بعض تحریروں میں بھی ملتا ہے۔ یہاں سے ربیع الاول ۱۳۴۹ھ میں آپ نے "تذکرہ" کے نام سے ایک علمی و دینی مجلہ جاری کیا، آپ خود ہی اس کے ایڈیٹر تھے، لیکن اس کا صرف ایک ہی شمارہ نکل سکا، اس کا آپ نے خاکہ یہ بنایا تھا کہ اس کے اندر قرآن، حدیث، علم کلام جدید، اخلاق و تصوف، تاریخ و سیر، ادب و تنقید اور تراجم وغیرہ سے متعلق علمی و فکری مقالات و مضامین شائع کیے جاتے (۱)

التنقید السدید علی التفسیر الجدید اسی دور میں آپ نے "التنقید السدید علی التفسیر الجدید" نامی رسالہ تصنیف فرمایا، جو مولوی عبدالحی پروفیسر جامعہ ملیہ کی کتاب "التفسیر الجدید" کی تفسیری تحریفات کا پرزور رد ہے، علامہ اعظمی کا یہ رسالہ "النجم" لکھنؤ میں ذی قعدہ ۱۳۴۹ھ میں ۴۸ صفحات میں شائع ہوا، یہ رسالہ علمی حلقوں میں نہایت مقبول ہوا، چنانچہ حکیم الامت حضرت تھانویؒ نے اس کی تعریف و توصیف اس طرح فرمائی:

"احقر اشرف علی تھانوی عفی عنہ نے اس تنقیدی مضمون کو غایت شوق سے حرفاً حرفاً دیکھا اور اس حدیث کا مصداق پایا، قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم : یحمل ھذا العلم من کل خلف عدولہ ، ینفون عنہ تحریف الغالین وانتحال المبطلین و تاویل الجاھلین (مشکوۃ عن البیہقی)

(۱) راقم السطور کو تذکرہ کے جاری ہونے کے متعلق کوئی بات معلوم نہیں تھی، اس سلسلے میں شکر گذار ہوں اپنے بزرگ کرم فرما جناب مولانا حکیم عزیز الرحمن صاحب کا کہ انھوں نے ان کی طرف توجہ دلائی۔

ماشاء اللہ قوت استدلال، حسن ادا، دفع شبہات، لین کلام غرض ہر پہلو سے بے تکلف اس شعر کا نمونہ ہے۔

زفرق تابقدم ہر کجا کہ می نگرم کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

بارك الله تعالى فى إفادات المصنف وإفاضاته"

اور حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ نے ۲۸/رجب ۱۳۵۰ھ کے ایک خط میں یہ توصیفی کلمات تحریر فرمائے:

"سبحان اللہ عنوان اور معنون، تعبیر اور معبر عنہ کے لحاظ سے یہ بے نظیر رسالہ ہے ... رسالہ کا موضوع باوجودیکہ تنقید و مناظرہ ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ جس متانت و تہذیب اور انصاف و حق گوئی کا ثبوت اس تحریر میں دیا گیا ہے، عموماً مناظرانہ تحریریں اس سے خالی دیکھی گئی ہیں ... بہر حال رسالہ ہر حیثیت سے اپنے موضوع میں جامع اور متین و معقول ہے ..."

ہمشیرہ کی وفات ۶/جمادی الثانیہ ۱۳۵۱ھ مطابق ۷/اکتوبر ۱۹۳۲ء کو آپ کو ایک دلگداز حادثہ سے دوچار ہونا پڑا، یعنی آپ کی ایک ہمشیرہ طویل علالت کے بعد اس دنیا سے فوت ہو گئیں، ان کی وفات کی خبر ۱۸/جمادی الثانیہ ۱۳۵۱ھ ۱۹/اکتوبر ۱۹۳۲ء کے "العدل" گوجرانوالہ میں شائع ہوئی:

"حضرت ابوالمآثر مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی (مد ظلہ) کی ہمشیرہ صاحبہ نو ماہ سے بعارضہ دق مبتلا تھیں، افسوس ہے کہ ۶/جمادی الثانیہ ۵۱ھ کو دس بجے دن میں ان کا انتقال ہو گیا۔"

الاعلام المرفوعة فى حكم الطلقات المجموعة تین طلاق کا مسئلہ ایک معرکۃ الآراء مسئلہ ہے، ایک مجلس کی تین طلاقیں ایک ہی شمار ہوں گی یا تین طلاق شمار ہوں گی، یہ اہل سنت کا تقریباً اجماعی مسئلہ ہے کہ ایک مجلس کی تین طلاقیں تین ہی شمار ہوں گی، علامہ اعظمی نے اہلسنت کے موقف کی حمایت میں تینوں کے وقوع اور اثبات پر ایک نہایت محقق

کتاب "الاعلام المرفوعۃ فی حکم الطلقات المجموعۃ" اسی عہد میں تصنیف فرمائی، یہ کتاب اتنی محقق ومدلل اور اپنے فن پر اس قدر حاوی اور جامع ہے کہ علامہ شبیر احمد عثمانی جیسے اہل علم اپنے تلامذہ کو اس کے مطالعہ کی تاکید فرمایا کرتے تھے۔

تنبیہ الکاذبین امام اہلسنت مولانا عبدالشکور صاحب لکھنوی نے ایک کتاب "تنبیہ الحائرین" تصنیف فرمائی تھی، ایک شیعی مصنف مولوی اعجاز حسن بدایونی نے اس کا جواب "تنبیہ الناصبین" کے نام سے لکھا تھا، مولوی اعجاز حسن بدایونی کے اس رسالہ کا جواب علامہ اعظمی نے "تنبیہ الکاذبین" کے نام سے تحریر فرمایا، علامہ اعظمی کا یہ جواب "النجم" لکھنؤ ج ۱۱ ش ۱-۵-۶، ۱۳۵۲ھ میں شائع ہوا، اس میں شیعوں کے عقیدۂ تحریف قرآن کا مسکت جواب دیا گیا ہے۔

ادری کا مناظرہ اور علامہ اعظمی کی سرپرستی وسط اکتوبر ۱۹۳۳ء (۱۳۵۲ھ) ضلع اعظم گڈھ کے قصبہ ادری میں ایک زبردست اور ہنگامہ خیز مناظرہ ہوا، مناظرہ کا پس منظر یہ تھا کہ بریلوی حضرات نے قصبہ کے اندر بریلویت کی طرف دعوت کی نہایت سرگرمی کے ساتھ مہم چلا رکھی تھی، آئے دن ان کی تقریریں ہوتیں جن میں علماء دیوبند کی شان میں گستاخیاں اور دشنام طرازیاں کی جاتیں، یہاں تک کہ خاص اسی دعوت و تبلیغ کیلئے دو بریلوی عالم مولوی نعیم الدین مرادآبادی اور مولوی حشمت علی خاں کو ادری بلایا گیا، جن کی زہر افشانیوں سے ادری کی پوری فضا مسموم ہوگئی، ان کی زباں بندی کیلئے مجبور ہوکر علماء دیوبند کو پیش قدمی کرنی پڑی، چنانچہ ان کے مقابلہ کیلئے علامہ اعظمی، مولانا عبداللطیف نعمانی، مولانا منظور نعمانی اور غالباً مولانا ایوب اعظمی ادری پہنچے، ان حضرات کو دیکھ کر ہی بریلوی علماء کے ہوش اڑ گئے، اور دیوبندیوں کی دعوت مبارزت کے باوجود بریلوی مولویوں نے فرار کی ہر ممکن کوشش کی، مگر ان کی ایک نہ چلی، بالآخر مناظرہ ہوا اور بریلویوں کو اس میں شرمناک شکست کا سامنا کرنا پڑا۔

اس مناظرہ میں علامہ اعظمی کی حیثیت ایک سرپرست اور سالار کی تھی، جن کی

زیر قیادت دیوبندیوں نے یہ میدان فتح کیا، اس کے اندر آپ مرجع کا کام کرتے تھے، مولانا نظام الدین اسیر ادروی فرماتے ہیں:

"۱۳۵۲ھ میں قصبہ ادری ضلع اعظم گڈھ کے ہنگامہ خیز مناظرہ نے پورے ضلع کو متاثر کیا، مجھے یاد ہے یہ مناظرہ مولانا اعظمی کی بروقت مداخلت اور پیش قدمی کی وجہ سے ہوا۔

اس کا آغاز مولانا عبداللطیف نعمانی نے کیا اور خاتمہ مولانا محمد منظور نعمانی نے، مولانا اعظمی بحیثیت سرپرست ہر نشست میں اسٹیج پر بروقت رہنمائی کیلئے موجود رہتے اور دلائل اور جوابات کی نشاندہی اور ہدایت کا فریضہ انجام دیتے تھے"(۱)

الازہار المربوعہ آپ کی کتاب الاعلام المرفوعۃ کا جواب ایک غیر مقلد عالم مولانا عبداللہ شائق نے " الآثار المتبوعة" کے نام سے لکھا، علامہ اعظمی نے اس کا نہایت مفصل رد" الأزهار المربوعة" کے نام سے دو جلدوں میں تصنیف فرمایا، اس کا ایک حصہ تصنیف کے بعد فوراً شائع بھی ہوا تھا، لیکن دوسرا حصہ حلیہ طباعت سے آراستہ نہیں ہو سکا، طلاق ثلاثہ کے مسئلے پر اعلام اور ازہار یہ دونوں ایسی کتابیں ہیں، جن کی نظیر احادیث و آثار قوت استدلال اور زور بیان کے لحاظ سے اردو زبان کے اندر کوئی دوسری موجود نہیں۔

اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے علامہ سید سلیمان ندوی فرماتے ہیں:"اس بحث میں ہمارے ہندی دوست مصر کے مشہور حنفی مصری عالم شیخ نجیب سابق شیخ ازہر سے بہت آگے نکل گئے ہیں، جنھوں نے اسی بحث پر ایک رسالہ الابحاث فی التطلیقات الثلاث لکھا ہے، اس سے ثابت ہوتا ہے، کہ عقلیات کے علاوہ نقلیات میں بھی ہندوستان کا علم بحمد اللہ مصر سے زیادہ ہے۔"(۲)

نصرۃ الحدیث "حق گو" کے نام سے کسی منکر حدیث نے ایک کتاب "میں منکر حدیث کیوں ہوا؟" کے نام سے لکھی، یہ کتاب مشہور اہل حدیث مولانا ثناء اللہ امرتسری کے

---

(۱) ترجمان الاسلام شمارہ ۱۳ ص ۳۱

(۲) معارف ص ۳۹۶ صفر ۱۳۵۶ھ مئی ۱۹۳۷ء

پریس ثنائی برقی پریس امرتسر سے شائع ہوئی تھی، اس کے اندر نہایت سوقیانہ اور بیہودہ انداز میں سلف صالحین، ائمہ و محدثین حتی کہ صحابۂ کرامؓ تک پر بہتان طرازی وافتراء پردازی کی گئی تھی، اور انکار حدیث کے بھونڈے اور مضحکانہ اسباب پیش کئے گئے تھے، اس کتاب کا رد لکھنے کیلئے مولانا محمد بہاء الحق قاسمی امرتسری نے علامہ اعظمی سے درخواست کی، یہ ۱۳۵۳ھ مطابق ۱۹۳۴ء کا واقعہ ہے، علامہ اعظمی نے "نصرۃ الحدیث" کے نام سے اس کا نہایت عالمانہ اور محققانہ جواب لکھ کر مولانا بہاء الحق صاحب کی تحریر کے مطابق دو مہینے میں ان کے پاس بھیج دیا، اس کا پہلا ایڈیشن آفتاب برقی پریس امرتسر سے مولانا قاسمی ہی کے اہتمام سے شائع ہوا۔

چند سال کے عرصے میں علامہ اعظمی کے یہ ایسے شاندار علمی کارنامے تھے، جن کے ذریعہ آپ کا نام پورے برصغیر کے علمی حلقوں میں روشن ہو گیا۔

مئو آئمہ کے جلسہ میں شرکت کے لئے دعوت | علامہ اعظمی کو عہد شباب ہی میں ہندوستان گیر شہرت حاصل ہو گئی تھی، آپ کا نام ملک کے دور دراز علاقوں میں پھیل چکا تھا، سن کی کمی کے باوجود علمی حلقوں میں پوری طرح مقبول ہو چکے تھے، آپ کو اہم تقاریب میں مدعو اور پیچیدہ اور نازک ترین مواقع پر یاد کیا جاتا، آپ کی ذات مجلسوں اور جلسوں کی زینت ہوتی، ملک کے طول و عرض میں ہونے والے بہت کم ایسے جلسے ہوتے جن میں اجلۂ علماء کے ساتھ آپ کی شرکت کو بھی ضروری نہ خیال کیا جاتا ہو، اس جگہ ہم صرف چند مثالوں پر اکتفا کریں گے۔ اکتوبر ۱۹۳۶ء میں مئو آئمہ الہ آباد میں کسی جلسے کا انعقاد طے پایا، جس میں شرکت کیلئے ہندوستان کی مشہور و معروف شخصیتوں کے ساتھ علامہ اعظمی کو بھی دعوت دی گئی، چنانچہ ۲۱/ ستمبر ۱۹۳۶ء کو مئو آئمہ سے مولانا محمد حسن صاحب ناظم مدرسہ انوار العلوم نے علامہ اعظمی کے پاس درج ذیل خط لکھا:

"...گرامی نامہ باعث تشکر و امتنان ہوا، جلسہ کی تاریخیں ۲۹/ ۳۰/ رجب مطابق ۱۶/ ۱۷/ اکتوبر ۳۶ء یوم جمعہ شنبہ مقرر ہو چکی ہیں، اطلاعاً عرض ہے

امید کہ جناب والا ان تاریخوں کو محفوظ رکھیں گے، مولانا عبدالوہاب(۱) صاحب دربھنگہ، مولانا سید حسین احمد(۲) صاحب مدنی صدر المدرسین دیوبند، حضرت مولانا سید مرتضٰی حسن صاحب وغیرہ کی تشریف آوری کی امید ہے۔"

(۱) ۱۲۹۰ھ م ۱۸۷۳ء میں بلاسپور حیاگھاٹ ضلع دربھنگہ میں پیدا ہوئے، حضرت شیخ الہند کے خاص شاگردوں میں تھے، مڈل کلاس تک انگریزی پڑھی، اس کے بعد مدرسہ امدادیہ دربھنگہ میں عربی پڑھنا شروع کیا، اس کے بعد دیوبند گئے، اور وہاں سے ۱۳۲۳ھ میں فراغت حاصل کی، فارغ ہونے کے بعد ان کو انھیں کی مادر علمی مدرسہ امدادیہ دربھنگہ میں صدر المدرسین بنایا گیا، یہیں ساری زندگی تعلیم و تدریس میں گذاردی ان کی ذات سے بہار میں کافی فیض پہونچا اور بہار میں دینی تعلیم کو فروغ حاصل ہوا، دربھنگہ ہی میں ۱۳۶۷ھ م ۱۹۴۷ء میں ۷۷ سال کی عمر میں وفات پائی۔ (کاروان رفتہ ص ۱۸۸)

(۲) مولانا مدنی کا وطن اصلی ٹانڈہ ضلع فیض آباد ہے، ۱۹ر شوال ۱۲۹۶ھ م ۱۸۷۹ء کو قصبہ بانگر مئو ضلع اناؤ میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم پرائمری اسکول میں حاصل کی، ۱۳۰۹ھ م ۱۸۹۱ء میں دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا، اور ۱۳۱۵ھ میں فارغ التحصیل ہوئے، تکمیل علم کے بعد والدین کے ہمراہ حجاز روانہ ہوگئے۔ اور مدینہ منورہ میں اقامت گزیں ہوئے، حجاز کیلئے روانگی سے پہلے حضرت گنگوہی سے بیعت ہو چکے تھے، مکہ مکرمہ پہنچ کر حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کی صحبت سے بھی فیض اٹھایا، مدینہ منورہ میں قیام کے دوران ۱۰ر سال تک مسجد نبوی میں حدیث کا درس دیا، اس اثنا میں کئی دفعہ ہندوستان کا قصد کیا، ساتھ ہی تحریک آزادی میں بھی حصہ لیتے رہے، جس کی پاداش میں ۱۳۳۵ھ میں انگریزوں کے ہاتھوں گرفتار ہو کر حضرت شیخ الہند اور ان کے رفقاء کے ہمراہ جزیرہ مالٹا میں قید کئے گئے، جس سے ۱۳۳۸ھ میں رہائی ملی ۱۵ر محرم ۱۳۴۰ھ م ۱۸ر ستمبر ۱۹۲۱ء کو دیوبند سے گرفتاری ہوئی جس کے بعد کراچی کا مشہور مقدمہ پیش آیا اور دو سال پھر قید میں گذارے، ۱۳۴۶ھ میں شاہ صاحب اور ان کے رفقاء کی علیحدگی کے بعد دارالعلوم کے صدر منتخب ہوئے، اس طرح آپ کی پوری زندگی سیاسی، سماجی، علمی اور درسی و تدریسی سرگرمیوں سے معمور رہی، متعدد بار آپ نے قید فرنگ میں اسارت کی زندگی گذاری، لیکن کبھی پائے استقلال میں ذرا بھی لغزش نہیں آئی، علم کا فیضان ہر جگہ جاری رہا یہاں تک کہ قید خانے میں بھی مولانا محمد علی جوہر نے ان سے ترجمۂ قرآن پڑھا، آپ کی ذات بے پناہ صلاحیتوں کا مجموعہ تھی، علم و فضل، زہد و تقویٰ، عبادت و ریاضت، فہم و فراست، تفکر و تدبر، اتباع سنت اور سعی و عمل میں ان کی نظیر بہت کم ملے گی۔ ۱۲ر جمادی الاولیٰ ۱۳۷۶ھ م ۵ر دسمبر ۱۹۵۷ء کو یہ آفتاب جہانتاب غروب ہو گیا۔

سیوہارہ کے جلسے کے لئے مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی کی دعوت

سیوہارہ یا امروہہ کے کسی اور قصبہ میں انصاری برادری کے کسی شیعہ مولوی نے ہنگامہ برپا کر رکھا تھا، عوام میں علانیہ شیعیت کی تبلیغ اور اس کی طرف لوگوں کو دعوت دیا کرتا تھا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے سنی حضرات اس کے دام فریب میں آکر شیعیت کی دلدل میں پھنس گئے، اس فتنہ کے مقابلہ کے لئے مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی(۱) کی نظر انتخاب علامہ اعظمی پر پڑی، وہ ۲۹/اپریل تہ ۱۹۳ء کے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

"اگر چہ بندہ کو جناب والا کے ساتھ براہ راست ہم مجلسی کا شرف حاصل نہیں ہے، تاہم غائبانہ کافی تعارف حاصل ہے، اور اسی جرأت پر یہ عریضہ ارسال ہے یہاں شیعہ آبادی بہت ہے اور عرصہ سے ایک شخص بشیر احمد، انصاری برادری کا آتا ہے اور چہلم کے موقع پر سخت اشتعال انگیز تقریریں کرتا ہے، یہاں کی انصاری برادری پر بہت برا اثر پڑ رہا ہے۔ اہل سنت اس امر کے خواہش مند ہیں کہ امسال اگر یکم ربیع الاول سے وسط ربیع الاول کی تاریخوں میں سے دو تین تاریخوں کے لئے یہاں کوئی خوش بیان مقرر انصاری برادری کے تشریف لا سکیں جو اپنے انصاری برادری کے فرد ہونے کا اعلان بھی کرتے ہوں، تو یہاں کے ماحول کے لئے بیحد ضروری ہے اور بہت مفید۔ براہ کرم جواب باصواب سے فوراً مطلع فرمائیے۔

(۱) مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی ۱۳۱۸ھ میں سیوہارہ ضلع بجنور میں پیدا ہوئے، تعلیم سیوہارہ کے علاوہ مدرسہ شاہی مراد آباد میں پائی، ۱۳۴۲ھ میں دارالعلوم دیوبند سے فارغ ہوئے، مدراس، دیوبند، ڈابھیل اور کلکتہ وغیرہ میں تدریسی خدمات انجام دی، ندوۃ المصنفین کے بانیوں میں تھے، ۱۹۴۲ء میں جمعیۃ علماء ہند کے ناظم اعلیٰ منتخب ہوئے، آزادی کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کے اکھڑے ہوئے قدم کو جمانے کے لئے جو انتھک جدوجہد کی وہ یاد رکھنے کے قابل ہے، بڑے شعلہ بیان مقرر اور بلند پایہ مصنف تھے، سرگرم سیاست میں حصہ لینے کے باوجود متعدد بیش قیمت کتابیں لکھیں، ۱۳۸۲ھ مطابق ۱۹۶۲ء میں داعی اجل کو لبیک کہا۔

اس خط کے تقریباً پندرہ دن بعد ۱۳ ربیع الاول ۱۳۵۶ھ مطابق ۱۵ مئی ۱۹۳۷ء کے ایک دوسرے مکتوب میں یوں تحریر فرماتے ہیں:

"گرامی نامہ چند روز ہوئے موصول ہو کر باعث عزت ہوا تھا، مگر میں مسلسل بارہ روز سے سفر میں تھا، اس لئے جواب نہ دے سکا، معافی کا خواستگار ہوں حضرت والا کو دراصل یہاں کی سیرت کمیٹی دعوت دینا چاہتی ہے اور مجھ کو سفیر بنایا ہے، شکر ہے کہ حضرت نے وعدہ فرمالیا۔ اب ایک اور ایسے مقرر کا انتخاب فرمالیجئے جو آپ کے علاوہ خوش تقریر اور حسن بیان کا حامل ہو، غالباً جلسے وسط ربیع الاول ہی میں ہوں گے، جب ہر دو حضرات کی جانب سے حتمی منظوری ہو جائے گی، تب سفر خرچ روانہ کیا جائے گا، آج بھی چند روز کے لئے میں باہر جارہا ہوں۔ مہتمم صاحب کی خدمت میں سلام مسنون۔

انصاری برادری کی شرط اس لئے لگائی گئی ہے، کہ لکھنؤ کا بشیر احمد شیعی یہاں کی انصاری برادری کو محض برادری کے نام پر تبلیغ کرتا ہے اور بعض افراد پر محض اسکے انصاری ہونے کی وجہ سے اس قدر اثر پڑا ہے کہ وہ نیم شیعی ہو گئے ہیں بقیہ کے لئے خطرہ ہے۔"

یہ چند خطوط یہاں صرف اس لئے ذکر کر دئے گئے، تاکہ ان کے ذریعہ اہل علم اور طبقۂ علماء میں علامہ اعظمی کی شہرت و مقبولیت، ان کے مقام و مرتبہ اور قدر و منزلت کا کسی حد تک اندازہ لگایا جاسکے، اس زمانہ کے خطوط کا احصاء و احاطہ نہیں کیا جاسکتا، اور نہ ہی ان کا احاطہ مقصود ہے، ورنہ یہ داستان بہت طولانی ہو گی۔ ان خطوط کے لئے ایک علحدہ اور ضخیم دفتر کی ضرورت ہے، اس جگہ صرف نمونہ کے طور پر چند گرامی ناموں کا ذکر کر دیا گیا ہے۔

مہوا بسم اللہ کا مناظرہ غالباً یہ بھی اسی زمانے کا واقعہ ہے کہ "مہوا بسم اللہ خاں" میں اہلحدیث اور احناف کے درمیان ایک زبردست مناظرہ ہوا، بلکہ مناظرہ کی نوبت ہی نہیں آئی، اور یک طرفہ تقریر پر حق وناحق کا فیصلہ ہو گیا، اس مناظرہ کی ضرورت اس طرح پیش آئی کہ کنٹروبوڑیہار اور مہوا بسم اللہ خان ضلع گونڈہ کے دو قریبی مواضعات ہیں، اور دونوں کے درمیان صرف ایک کیلومیٹر کا فاصلہ ہے، کنٹروبوڑیہار میں غیر مقلدین آباد ہیں اور مہوا بسم اللہ میں احناف۔ یہاں غیر مقلدوں نے جارحانہ انداز میں غیر مقلدیت کی ترویج واشاعت شروع کی، اس بڑھتے ہوئے فتنہ کو روکنے کیلئے، امام اہلسنت حضرت مولانا عبدالشکور فاروقیؒ نے ایک نوجوان عالم مولانا حفیظ اللہ خان کو ایک جلسہ کے انعقاد کا مشورہ دیا۔ احناف کے جلسے کے انعقاد کی تاریخ متعین ہوئی اور انھیں تاریخوں میں غیر مقلدین نے بھی اپنے جلسے کا اعلان کر دیا اور اس کے لئے غیر مقلد عالم مولانا ثناء اللہ امرتسری کو بلایا، ادھر احناف کی طرف سے مولانا عبدالشکور صاحبؒ، علامہ اعظمی کو لے کر پہونچے، اس کی روداد مولانا عبدالحفیظ رحمانی کی زبانی سنئے، جسے انھوں نے مولانا حفیظ اللہ خان سے سن کر قلمبند کیا ہے:

> "بالآخر جلسے کی تاریخ آئی اور پورے اہتمام سے ایک ہی باغ میں دونوں جماعتوں کے جلسے کا انتظام کیا گیا، اسٹیج آمنے سامنے لگا، امام اہلسنت نے اپنے جلسے کا آغاز کرتے ہوئے مولانا ثناء اللہ امرتسری کو مخاطب فرمایا اور کہا کہ آپ پہلے تقریر کریں گے یا میں اپنے کسی مقرر کو تقریر کیلئے کھڑا کر دوں، مولانا امرتسری نے قرأت خلف الامام کا موضوع پیش کرتے ہوئے کہا کہ پہلے اپنے مقرر سے آپ اس پر بحث کرائیں اور یہ ثابت کریں کہ امام کے پیچھے سورہ فاتحہ پڑھنا ناجائز ہے ... امام اہلسنت نے ایک نوجوان عالم مولانا حبیب الرحمن اعظمی کے نام کا اعلان کیا اور اس موضوع پر تقریر کرنے کا حکم صادر فرمایا۔
>
> مولانا اعظمی جب تقریر کیلئے کھڑے ہوئے تو ان کو دیکھ کر ہم لوگوں کو

حیرت بھی ہوئی اور چہرے بھی اتر گئے کہ غیر مقلدوں کے پہاڑ سے مقابلہ کیلئے امام اہلسنت نے ایک نوجوان کو اکھاڑے میں اتار دیا ہے، اللہ ہی خیر کرے۰۰۰ لیکن مولانا حفیظ اللہ خان مرحوم نے نہایت جذباتی اور خوشی و مسرت کے لہجے میں بتایا کہ مولانا اعظمی نے خطبہ ماثورہ کے بعد فرمایا کہ قرأت خلف الامام جس کو غیر مقلدین سب سے اہم اور اپنا مضبوط اور مدلل مسئلہ سمجھتے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ ان کے استدلال میں مکڑی کے جالوں کے تاروں سے بھی زیادہ ضعف اور کمزوری ہے۔ اور میں نہیں سمجھتا کہ مولانا ثناء اللہ امرتسری نے کیا سوچ کر تقریر کیلئے اس موضوع کو پیش کیا ہے، ان جملوں کے بعد مولانا اعظمی نے غیر مقلدین کے تمام دلائل کا محدثانہ اسلوب میں تجزیہ شروع کیا اور بحث و نظر کا وہ باب کھولا کہ پورے مجمع پر سناٹا چھا گیا، اور اہل علم دم بخود تھے کہ فاضل مقرر سراپا کتب خانہ ہے یا کوئی تحریر اشاراتی سامنے رکھ کر بحث کر رہا ہے، اور یہ سلسلہ فجر کی اذان تک جاری رہا اور یہ طویل ترین بحث ساری رات جاری رہنے کے باوجود بقول فاضل مقرر نامکمل ہی رہی، تکمیل کیلئے آئندہ نشست کا اعلان فرمایا، دوسری رات حضرت مولانا اعظمی نے پھر اسی موضوع کو پایہ تکمیل تک پہونچانے کیلئے تقریر شروع فرمائی اور یہ رات بھی اسی موضوع پر بحث کرتے ہوئے گذر گئی۔ مولوی حفیظ اللہ خان مرحوم نے بتایا کہ ہم تو حیرت زدہ تھے ہی غیر مقلدین اس قدر مبہوت ہوئے کہ کوئی جواب دینے پر آمادہ نہیں ہوا، چنانچہ تیسری رات امام اہلسنت نے مولانا ثناء اللہ امرتسری مرحوم کو مخاطب کرتے ہوئے دعوت دی کہ آپ خود یا اپنے کسی منتخب عالم کو جواب دینے کیلئے کھڑا کریں، لیکن بحث کا انداز وہی ہوگا جس محدثانہ اسلوب میں مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی نے پیش کیا ہے، لیکن غیر مقلدین کی صفیں درہم برہم ہو گئیں اور کوئی جوابی تقریر کیلئے آمادہ نہیں ہوا۰۰۰"(۱)۔

---

(۱) المآثر، ج۸ ش۱ص ۱۰۲-۱۰۱

شارع حقیقی بریلیوں اور بدعتیوں نے، رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو مقام الوہیت تک پہنچانے کیلئے مختلف مشرکانہ عقائد گھڑ لئے تھے، اور عوام میں ان کی تدسیس کیلئے ہر ممکن کوشش کیا کرتے تھے، اسی قسم کی ایک کوشش مولوی سید محمد کچھوچھوی کی کتاب "التحقیق البارع فی حقوق الشارع" تھی، جس کے اندر مصنف نے رسول خدا (صلی اللہ علیہ وسلم) کو احکام شرع دینے میں مختار مطلق قرار دیا تھا کہ وہ جس چیز کو چاہتے بلا حکم الٰہی اپنی طرف سے حلال یا حرام کر سکتے تھے۔ علامہ اعظمی نے اس کا رد "شارع حقیقی" کے نام سے کیا۔ جو ماہنامہ الفرقان (بریلی) ۵۷ـ۱۳۵۶ھ میں قسط وار شائع ہوا۔

دار العلوم ندوۃ العلماء کے لئے سید سلیمان ندوی کی پیشکش علامہ اعظمیؒ کی شہرت کو شہپر جبریل ملا تھا، مختصر سی مدت میں ان کا نام اور ان کے علم و فضل کا آوازہ علمی دنیا میں اس طرح گونجا کہ ہندوستان کے ہر اہم اور مؤقر ادارے میں ان کی ضرورت محسوس کی جانے لگی۔ اور ہندوستان کے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک تمام اہم تعلیمی ادارے ان کے لئے دیدہ و دل فرش راہ کرنے لگے۔ ان تعلیمی اداروں اور اہل علم کی ایک طویل فہرست ہے جنھوں نے مختلف اوقات میں آپ کو اپنے یہاں بلانے کی کوشش کی اور دعوت نامے بھیجے۔ اس میں سب سے پہلا نام علامہ سید سلیمان ندویؒ کا ہے۔

علامہ سید سلیمان ندویؒ سے علامہ اعظمی کا تعلق تحصیل علم سے فراغت کے بعد ہی قائم ہو چکا تھا، سید صاحب اپنے تجربہ کی روشنی میں علامہ اعظمی کے ایسے قائل تھے کہ بہت کم کسی کے ہوئے (۱)، اسی بنا پر انھوں نے دار العلوم ندوہ اور دار المصنفین اعظم گڈھ

(۱) سید صاحب کے علامہ اعظمی سے جو تعلقات تھے ان کی نسبت ہم آگے تفصیل سے عرض کریں گے، اس وقت ہم یہاں ایک عینی شاہد کی بات نقل کر رہے ہیں، مولانا عبد الباری آثری ۲۲ر فروری ۱۹۵۶ کے ایک خط میں علامہ اعظمی کو لکھتے ہیں: "سید صاحب آپ کو پا کر اور دیکھ کر کتنا خوش ہوتے تھے۔ وہ منظر اب تک میری آنکھوں کے سامنے گھوم رہا ہے۔" سید صاحب علامہ اعظمی کے علو درجہ =

میں علامہ اعظمی کو بلانے کی بھرپور کوشش کی، اور بارہا اس کے لئے پیشکش کی، سید صاحب نے اسی قسم کی ایک کوشش ۱۳۵۸ھ مطابق ۱۹۳۹ء میں ندوہ میں آپ کے تقرر کیلئے کی، اس سلسلے میں تین خطوط قابل ذکر ہیں، سب سے پہلا خط مولانا ڈاکٹر سید عبد العلی مرحوم (۱) کا ہے جو سید صاحب کے نام ہے اور ۱۶؍اکتوبر ۱۹۳۹ء کو لکھنؤ سے لکھا گیا ہے، اس میں لکھتے ہیں:

= معترف تھے اور اس علمی اعتراف کی وجہ سے وہ دار المصنفین چھوڑنے سے قبل علامہ اعظمی کو اپنا جانشین بنانا چاہتے تھے، چنانچہ مولانا عبد الباری اثری ہی ۱۲؍جولائی ۸۶ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں: "اعظم گڈھ میں سید صاحب علیہ الرحمہ کے تنہا آپ ہی دوست تھے، اور آپ کو بہت ہی عزیز رکھتے تھے، جب آپ دار المصنفین تشریف لاتے تھے، تو آپ کو دیکھ کر باغ باغ ہو جاتے تھے، اور باصرار آپ کو روک لیتے تھے، اور جب تک آپ رہتے تھے آپ ہی کے ساتھ مشغول رہتے تھے، انھوں نے جب نواب حمید اللہ والی بھوپال کی دعوت پر بھوپال جانے کا فیصلہ کر لیا۔ تو آپ ہی کو اپنا قائم مقام اور یہاں کے رفقاء اور مصنفین کا نگراں بنانا چاہتے تھے، مگر افسوس کہ ... کسی قیمت پر آپ کی سیادت و بالا دستی قبول کرنے کیلئے تیار نہیں ہوئے اور سید صاحب کی یہ خواہش پوری نہ ہو سکی، جس کا مجھ کو بھی بہت افسوس ہوا۔"

(۱) مولانا حکیم عبد العلی لکھنوی ۱۳۱۱ھ میں رائے بریلی میں پیدا ہوئے، دار العلوم ندوہ میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد دیوبند گئے، اور وہاں سے ۱۳۲۹ھ میں فراغت پائی، فراغت کے بعد انگریزی تعلیم کی جانب متوجہ ہوئے، اور ۱۳۳۷ھ میں بی، ایس، سی کا امتحان دیا جس میں فرسٹ آئے، ۱۳۴۴ھ میں لکھنؤ میڈیکل کالج سے ڈاکٹری کا امتحان پاس کیا۔ مولانا مدنی سے بیعت تھے اور ڈاکٹر ہونے کے باوجود بہت سادہ، متواضع اور متقی وعبادت گذار تھے، مغربی تہذیب وثقافت کے سخت ناقد تھے، ۱۳۵۰ھ میں ندوہ کے مہتمم مقرر ہوئے، اور تادم واپسیں یہ فریضہ انجام دیتے رہے، ۳؍ذی قعدہ ۱۳۸۰ھ م ۱۹۶۱ء میں لکھنؤ میں وفات پائی، (تاریخ دار العلوم دیوبند ۲: ۱۱۴۔۱۱۳، کاروان رفتہ ص ۱۷۳)

"مولانا عبدالشکور صاحب سے خط لکھوا کر بھجوا رہا ہوں، امید ہے کہ مولوی حبیب الرحمٰن صاحب سے ملے فرماکر مجھے مطلع فرمائیں گے تاکہ... صاحب کو سبکدوشی کی اطلاع دی جائے..."

اس کے بعد سید صاحب علامہ اعظمی کے پاس تحریر فرماتے ہیں:

"مکرمی مولوی حبیب الرحمٰن صاحب زادلطفہ!

السلام علیکم۔ میں نے آپ کے سامنے ندوہ کی تجویز پیش کی تھی، اس کے متعلق ڈاکٹر عبدالعلی اور مولوی مسعود علی (۱) صاحب سے گفتگو ہوئی سب نے پسند کیا۔ آپ نے مولوی عبدالشکور صاحب کا خیال لکھا تھا تو ان سے بھی ذکر کیا گیا، انھوں نے آپ کو خط لکھ کر ڈاکٹر صاحب کو دیا ہے وہ ملفوف ہے۔

تنخواہ بالفعل ... ہو سکتی ہے، امید ہے کہ آپ کمی بیشی کا خیال نہ فرمائیں گے، آپ کا جواب آئے تو ڈاکٹر صاحب کو مطلع کروں"۔

والسلام

۹؍ رمضان ۱۳۵۸ھ ابوسید سلیمان

اس جگہ امام اہلسنت حضرت مولانا عبدالشکور صاحب لکھنوی کا مکتوب بھی ذکر کر دینا بے موقع نہ ہوگا، ان کے خط کی تاریخ یکم رمضان ہے، لکھتے ہیں:

(۱) مولانا مسعود علی ندوی بھیارہ ضلع بارہ بنکی میں ۱۸۸۴ء میں پیدا ہوئے، دارالمصنفین اعظم گڈھ کے ناظم تھے، علامہ شبلی نعمانی کے انتقال کے بعد دارالمصنفین کے انتظام کو سنبھالنے، درست کرنے میں اہم رول ادا کیا، تعمیرات کا کام بہت حسن وخوبی سے کیا، تعمیری ذوق بہت اچھا تھا، ادارہ کی بیشتر عمارتیں انھیں کی جدوجہد کی یادگار ہیں، تحریک خلافت میں حصہ لیا، ساری عمر دارالمصنفین کے لئے وسائل فراہم کرنے میں صرف کردی۔ ۲۷؍ اگست ۱۹۶۷ء (۱۳۸۷ھ) کو اعظم گڈھ میں وفات پائی۔ (کاروان رفتہ ص ۲۴۰)

"جامع الفضائل مولانا حبیب الرحمٰن صاحب زیدت حسناتکم!

بعد سلام مسنون آنکہ یہ سن کر کہ آپ دارالعلوم کے لئے بلائے گئے ہیں، بہت مسرت ہوئی، اللہ مبارک کرے..."

پھر علامہ سید سلیمان ندوی علیہ الرحمہ نے اپنے مذکورہ بالا خط کا حوالہ دیتے ہوئے ۳۰/نومبر ۱۹۳۹ء کو لکھا:

"میں نے رمضان المبارک میں آپ کو خط لکھا تھا، لیکن آپ کا جواب نہیں آیا، پھر ڈاکٹر عبدالعلی صاحب سے معلوم ہوا کہ آپ بغرض علاج دہلی گئے تھے، اور اب واپس آئے ہیں، تب خیال ہوا کہ اب آپ کا جواب آئے گا، مگر ہنوز محرومی رہی، آپ کے اس خط میں بھی اس کا ذکر نہیں، اس سے معلوم ہوا کہ وہ خط شاید نہیں ملا، وہی ندوہ میں آجانے کی تحریک تھی۔"

کھانسی کی شکایت اور علاج کیلئے دہلی کا سفر علامہ اعظمی تقریباً پوری عمر امراض و عوارض سے دوچار رہے، بیماری زندگی کے ہر دور میں ان کے ساتھ ساتھ رہی، بسا اوقات بعض بڑے خطرناک امراض آپ پر حملہ آور ہوئے، چنانچہ اوپر پڑھ چکے ہیں کہ زمانۂ طالب علمی میں کئی بار بیمار اور صاحب فراش ہوئے، اور دو دفعہ دیوبند سے بیماری کی وجہ سے واپس آئے۔ اسی طرح سید سلیمان ندوی کے خط سے چند سطر پیشتر معلوم ہو چکا ہے کہ علاج کے واسطے دہلی بھی تشریف لے گئے تھے، یہ ۱۳۵۸-۱۳۵۷ھ کی بات ہے کہ کھانسی کی شکایت ہوئی، بہت دوا علاج کیا مگر کچھ فائدہ نہ ہوا، بالآخر علاج کیلئے دہلی کا سفر کرنا پڑا، ۱۸/ذی قعدہ ۱۳۵۸ھ کے ایک خط میں حکیم الامت حضرت تھانوی کی خدمت میں لکھتے ہیں:

"...گذشتہ سال جاڑوں میں کھانسی کی سخت شکایت پیدا ہو گئی، جس میں مہینوں تک پریشان رہا، کسی علاج سے فائدہ نہیں ہوا، جب موسم بدلا تو خود بخود یہ شکایت جاتی رہی، اس سال پھر اواخر رجب ہی میں یہ شکایت عود کر آئی،

اور برابر علاج کرتا رہا، لیکن کچھ نفع نہیں ہوا، رات کے وقت اتنا پریشان ہوتا تھا کہ سونا دشوار ہو جاتا تھا، گھنٹوں تک مسلسل کھانستا رہتا تھا، جس کی وجہ سے سر اور سارے بدن میں سخت درد پیدا ہو جاتا تھا، پھر بعض اطباء نے یہ بھی کہا کہ اندر بخار بھی رہا کرتا ہے، اس لئے والد صاحب کے اشارہ سے اواخر شعبان میں بغرض علاج دہلی گیا، اور تقریباً بیس دن وہاں قیام کر کے علاج کیا، وہاں بھی نفع نہیں معلوم ہوا۔ دہلی سے چلتے ہوئے اپنی طبیعت سے تھوڑا کشتۂ مرجان لے لیا تھا، مکان پہونچ کر اسی کا استعمال شروع کیا، دوسری تیسری شوال سے کھانسی میں بہت کمی معلوم ہوئی اور رفتہ رفتہ یہ شکایت جاتی رہی، والحمد للہ، اب خدا کے فضل واحسان سے بالکل یہ شکایت نہیں ہے، دوا کا استعمال جاری ہے۔

البتہ کھانسی کے ساتھ درد کمر میں بھی مبتلا ہو گیا تھا، وہ اب بھی باقی ہے، اس کیلئے دعا کا خواستگار ہوں ...“

احکام النذر لاولیاء اللہ | اولیاء اللہ کے لئے جو نذریں مانی جاتی ہیں، اور اس سلسلے میں جو بدعات وخرافات اور مشرکانہ رسوم ادا کی جاتی ہیں، ان کی حقیقت وحرمت کے بیان کے لئے آپ نے رسالہ ”احکام النذر لاولیاء اللہ وتفسیر ما اھل بہ لغیر اللہ“ تحریر فرمایا، یہ رسالہ الفرقان (بریلی) میں شوال۔ ذیقعدہ ۱۳۵۸ھ میں شائع ہوا۔

ارشاد الثقلین | یہ رسالہ آپ نے شیعیت کے رد میں تصنیف فرمایا، شیعوں کے ایک رسالہ ”اتحاد الفریقین“ کا مسکت اور دندان شکن جواب دیا، اور حضرت علی اور خلفاء ثلاثہؓ کے درمیان باہمی اتحاد اور حضرت علی کی نگاہ میں ان کے پیش رو خلفاؓ کی عظمت کو ناقابل انکار دلائل سے ثابت کیا، یہ رسالہ الداعی (لکھنؤ) میں شوال۔ ذیقعدہ۔ ذی الحجہ ۱۳۵۹ھ کے شماروں میں شائع ہوا۔

اہل دل کی دلآویز باتیں | صوفیائے کرام اور بزرگان دین کے واقعات پر مشتمل دو حصوں میں یہ ایک مختصر سی اصلاحی کتاب ہے، اس کے اندر آپ نے بہت سے سبق آموز

واقعات جمع کر دیے ہیں، جن سے آپ کے ذوق تصوف کا اندازہ ہوتا ہے، یہ کتاب ۱۳۶۰ھ میں معارف پریس اعظم گڈھ سے شائع ہوئی، اس کے متعلق حضرت تھانویؒ نے یہ کلمات ارشاد فرمائے:

"رسالہ کی زیارت سے دل خوش ہوا، اللہ تعالیٰ طالبین علم و عمل کیلئے نافع فرمائے، و سیفعل ان شاء اللہ تعالیٰ، طالب علموں اور مبتدیان طریق کیلئے بہت مفید ہے۔"(۱)

تعزیہ داری اور دیگر مراسم عزاداری سنی نقطۂ نظر سے اس رسالہ میں تعزیہ داری اور عزاداری کے دیگر مراسم پر سنی نقطۂ نظر سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ رسالہ ربیع الاول۔ ربیع الثانی اور جمادی الاولیٰ ۱۳۶۱ھ میں الفرقان (بریلی) میں قسط وار شائع ہوا۔

ابطال عزاداری ردّ شیعیت ہی کے سلسلے میں آپ نے اسی سال ایک اور رسالہ تحریر فرمایا، جو "ابطال عزاداری" کے عنوان سے جمادی الآخرہ تا ذیقعدہ ۱۳۶۱ھ میں الداعی (لکھنؤ) میں شائع ہوا، یہ رسالہ آپ نے علامہ سید سلیمان ندویؒ کی فرمائش پر تحریر فرمایا تھا

تحقیق اہل حدیث اپریل ۱۹۴۳ء میں مئو آئمہ ضلع الہ آباد میں اہل حدیث کانفرنس مولانا ابوالقاسم سیف بنارسی کی زیر صدارت ہوئی، اس کانفرنس کے جواب میں اکتوبر ۱۹۴۳ء (غالباً ۱۳۶۲ھ) کو مئو آئمہ ہی میں احناف کانفرنس زیر صدارت مولانا قاری محمد طیب صاحب ہوئی، اس کے آخری اجلاس میں علامہ اعظمی نے ایک مفصل تقریر فرمائی، جس میں مولانا ابوالقاسم بنارسی کے اپریل والے خطبۂ صدارت کا تاریخی لحاظ سے تجزیہ کر کے اس کا جواب دیا، علامہ اعظمی کی یہ تقریر اتنی پسند کی گئی کہ لوگوں کے شدید اصرار پر اس کے مباحث کو اور پھیلا کر آپ نے "تحقیق اہلحدیث" کے نام سے شائع کیا،

(۱) اہل دل کی دلآویز باتیں ص ۴"

۱۹۴۳ء میں ہی یہ کتاب اکبر پریس الہ آباد سے طبع ہوئی۔

تدریسی مشغلہ سے استعفا مولانا ظفیر الدین صاحب تذکرۂ مولانا عبداللطیف نعمانی (ص ۱۰۳) میں لکھتے ہیں:

"میری طالب علمی کے اخیر سال میں حضرت الاستاد مولانا اعظمی مدظلہ کو ارباب مدرسہ کی طرف سے کوئی تکلیف پہونچی، اس کے نتیجہ میں مولانا نے مدرسہ آنا بند کردیا۔"

علامہ اعظمی کیلئے یہ بڑا صبر آزما اور ابتلاء کا دور تھا، مدرسہ مفتاح العلوم سے آپ کو جو بے پناہ محبت تھی اور جو والہانہ شغف تھا، اس کی وجہ سے اس سے علٰحدگی کسی صورت سے آپ کو گوارا نہ تھی، ہر چند کہ ہندوستان کے اہم اور مرکزی تعلیمی ادارے آپ کیلئے ہمہ وقت چشم براہ بلکہ دیدہ و دل فرش راہ کئے ہوئے تھے، لیکن ان کی جانب کبھی توجہ نہیں فرمائی، محض اس لئے کہ اپنے ہاتھ سے آراستہ کئے ہوئے چمن کو چھوڑنا آپ کو منظور نہ تھا، مگر جب انتظامیہ کے بعض افراد کے رویے سے آپ کی خودداری کو ٹھیس پہنچی تو آپ نے ایک نہایت اہم فیصلہ کیا، وہ فیصلہ آپ کا استعفا تھا، جس کی اصل کاپی ہمارے پاس موجود ہے اور ہم اس کو بعینہ قارئین کے سامنے پیش کردینا چاہتے ہیں، یہ استعفانامہ ۲ رمضان المبارک ۱۳۶۳ھ کا نوشتہ ہے اور اس کی عبارت یہ ہے:

"بخدمت اراکین انتظامیہ مفتاح العلوم مئو

بعد سلام مسنون آنکہ

آپ لوگ جانتے ہیں کہ میں بعض سخت امراض میں مبتلا ہو گیا ہوں، جس کے دورے پڑتے رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ دماغ اور دوسرے قویٰ بھی پہلے سے کمزور ہو گئے ہیں۔ اب تک تو میں نے کامل پندرہ سال تک جس طرح ممکن ہوا

قیام، پھر بقا، پھر ترقی کے لئے اپنے آپ کو قربان کیا، لیکن اب درس وتدریس کے ساتھ دوسری دماغی محنتوں کا تحمل مجھ سے نہیں ہو سکتا، علاوہ بریں مدرسہ کے حالات بھی اب پہلے سے بہت مختلف ہیں، میں پہلے دن جب مدرسہ میں بالکل تن تنہا بیٹھا تھا، اس دن صرف میرا اور میرے سات آٹھ شاگردوں کا نام مدرسہ مفتاح العلوم تھا، اور آج اللہ کے فضل سے اس دن کے شاگردوں کی تعداد سے زیادہ مدرسین کی تعداد ہے۔ اس دن بجز تھوڑے سے غریب عوام اور تین چار موجودہ اراکین کے کوئی اس مدرسہ کا نہ ہمدرد تھا نہ ہمنوا۔ کام کرنے والوں اور ساتھ دینے والوں کی اتنی کمی تھی کہ جب مدرسہ قائم ہونے کے ساتھ ہی اس وقت کے ناظم صاحب حج کو چلے گئے تو ناچیز ہی مدرس بھی تھا اور فرائض نظامت کی انجام دہی بھی تمام تر اسی کے ذمہ تھی، لیکن آج خدا کا شکر ہے کہ مدرسہ کے ہمدردوں کا شمار ممکن نہیں، کام کرنے والے بھی بکثرت پیدا ہو گئے ہیں، اس دن مدرسہ کی تحویل میں ایک پیسہ بھی نہ تھا اور آج خدا کی مہربانی سے کئی ہزار نقد موجود ہیں، اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ آج میری کمی سے مدرسہ کو کوئی نقصان نہیں پہونچ سکتا، اور آج مدرسہ کو اس بات پر پورا قابو حاصل ہے کہ وہ جس طرح چاہے اس جگہ کا انتظام نہایت سہولت سے کرلے۔ پس اراکین انتظامیہ کو میں اطلاع دیتا ہوں کہ وہ اگر ضرورت سمجھیں تو میری جگہ کا انتظام یکم شوال تک کرلیں، یکم شوال سے میں مدرسہ کی ملازمت سے سبکدوش ہو جاؤں گا۔ ہاں اگر یکم شوال تک وہ انتظام نہ کر پائیں تو زیادہ سے زیادہ یکم ذی قعدہ تک میں اور موقع دے سکتا ہوں، اگر چہ اتنا موقع پانے کا بھی محتاج نہیں ہو سکتا، تاہم مجھے اپنی طرف سے صاف صاف بات کہنی چاہئے کہ اس کے بعد میری طرف سے کوئی گنجائش نہیں۔"

(نوٹ) ا۔ میں نے یکم شوال کی میعاد اراکین کی آسانی کیلئے مقرر کی ہے، اگر وہ اس کو نہ چاہتے ہوں تو مجھے آج ہی سے سبکدوش ہونا منظور ہے۔

۲۔ میری یہ سبکدوشی صرف ملازمت سے ہے، بلا ملازمت اپنی خوشی سے جو جو خدمتیں بآسانی میرے لئے ممکن ہوں گی ان کے لئے میں ہمہ تن مستعد ہوں"۔

والسلام

محمد حبیب الرحمٰن الاعظمی صدر المدرسین

مفتاح العلوم مئو۔ اعظم گڈھ

۲؍رمضان المبارک ۱۳۶۳ھ"

مذکورہ بالا تحریر کا طرز نگارش صاف بتارہا ہے کہ کسی بات سے آپ کو سخت تکلیف پہونچی تھی، جس کی وجہ سے بہت دل برداشتہ تھے، اور ملازمت سے سبکدوشی کا تہیہ کر لیا تھا، اور اس تمام صورتحال کے باوجود مفتاح العلوم کی خدمت کیلئے ہر طرح تیار اور کمر بستہ تھے۔ مگر صورتحال کا ذہن پر اس قدر اثر ہوا کہ بہت دنوں تک مسلسل الجھنوں میں مبتلا رہے، ۲۶؍ذی الحجہ ۱۳۶۳ھ مطابق ۱۲؍دسمبر ۱۹۴۴ء کو مفتی ظفیر الدین صاحب کے ایک خط میں لکھتے ہیں:

"سلام مسنون ودعائے عافیت کے بعد معلوم ہو کہ رمضان سے لے کر اب تک ایسی الجھنوں میں تھا کہ تم کو بلاواسطہ خط لکھنے کی نوبت نہیں آئی۔۔۔(۱)

بہر حال علامہ اعظمیؒ کم از کم ۶۳۔۱۳۶۴ھ کا پورا سال بغیر معاوضہ کے، ملازمت سے بے نیاز ہو کر، مفتاح العلوم کی خدمت سرانجام دیتے رہے، اور اس خدمت میں ذرہ برابر کمزوری اور کوتاہی نہیں آنے دی۔ مفتی ظفیر الدین صاحب ہی کو ۳؍ستمبر ۱۹۴۵ء مطابق ۲۵؍شعبان ۱۳۶۴ھ کے ایک خط میں لکھتے ہیں:

(۱) مشاہیر علماء ہند کے علمی مراسلے ص ۱۴۵۔

"۔۔۔میرا معاملہ یہ ہے کہ میں نے اب تک قبول ملازمت سے انکار کیا ہے۔اب وہ لوگ شاید پھر جلسۂ عام کر کے مجھ کو مجبور کرنے کی کوشش کریں۔ نتیجہ کا علم اللہ تعالیٰ کو ہے، مگر ارادہ تب بھی نہیں ہے۔"(۱)

فقہی مسائل میں علامہ اعظمی سے استصواب کی مولانا مدنی کی تجویز

مولانا نظام الدین اسیر ادروی ترجمان الاسلام (ش ۱۴۳ص ۵۔۶) میں لکھتے ہیں:

"۱۹۴۵ء میں جمعیۃ علماء ہند کا کل ہند سالانہ اجلاس سہارنپور میں ہوا، اس میں دوسرے مسائل کے ساتھ امارت شرعیہ کا نظام قائم کرنے کا مسئلہ در پیش ہوا، ورکنگ کمیٹی ایک مسئلہ پر متفق ہو گئی، مگر علماء سہارنپور کو دلائل کی بنیاد پر اس سے اختلاف تھا، اور یہ اختلاف تحریری طور پر ورکنگ کمیٹی کے سامنے پیش بھی کر دیا گیا، ارکان عاملہ میں برہمی پیدا ہو گئی، علماء سہارنپور اور مجلس عاملہ دونوں کو اپنے اپنے نقطۂ نگاہ پر اصرار تھا، اور محاذ آرائی کی شکل اختیار کرتا جارہا تھا، جلسہ کی صدارت دنیائے اسلام کی ایک مقتدر شخصیت انجام دے رہی تھی، وہ شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی ذات گرامی تھی، صدر نے اپنے اختیارات خصوصی سے اس فیصلہ کو کالعدم قرار دے کر آئندہ کیلئے ملتوی کرنے کا حکم دیا اور یہ تجویز متفقہ طور پر منظور کرائی کہ جمعیۃ علماء کی ورکنگ کمیٹی کے سامنے جب بھی کوئی فقہی مسئلہ پیش ہو تو محدث جلیل حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی سے استصواب کیئے بغیر کوئی فیصلہ نہیں کیا جائے گا۔ یہ تجویز پوری مجلس عاملہ نے متفقہ طور پر منظور کی جب کہ مولانا اعظمی اجلاس میں موجود بھی نہیں تھے۔ یہ مولانا اعظمی کی فقہی بصیرت پر کلی اعتماد اور ان کے فضل و کمال کا اعتراف کئی درجن عظیم المرتبت علماء و مشائخ کی مجلس میں کیا جارہا ہے اور کسی کو اس سے مجال اختلاف نہیں تھا۔"

(۱) مشاہیر علماء ہند کے علمی مراسلے ص ۱۴۶

دارالعلوم دیوبند سے صدارت افتاء کی پیشکش | علامہ اعظمی کو مختصر سی عمر میں جو ہندوستان گیر شہرت حاصل ہو چکی تھی، اور علمی و فقہی لحاظ سے آپ کا تفوق و کمال اور فضیلت و برتری جس طرح تسلیم کی جا چکی تھی، اس کے گوناگوں شواہد موجود ہیں نہ صرف ہندوستان بلکہ بیرون ملک میں بھی جب کسی اہم علمی منصب کیلئے کسی جید الاستعداد اور صاحب نظر عالم کی تلاش ہوتی تو بسا اوقات سب سے پہلے علامہ اعظمی ہی پر نگاہ ٹکتی، لیکن ان تمام مواقع پر آپ کا معاملہ ہمیشہ استغناء اور بے نیازی کا رہا اور فرق مراتب ملحوظ رکھتے ہوئے پوری انکساری کے ساتھ ان عہدوں کو قبول کرنے سے انکار یا معذرت فرماتے رہے۔

اسی قسم کا ایک واقعہ اس وقت پیش آیا جب ۱۳۶۴ھ مطابق ۱۹۴۵ء میں ازہر ایشیا دارالعلوم دیوبند کی صدارت افتاء کے لئے ایک ماہر فقہ و افتاء کی ضرورت و تلاش ہوئی، یہ وہ دور تھا جب آج کل کی طرح قحط الرجال کی صورتحال نہیں تھی، ابھی ملک تقسیم نہیں ہوا تھا، اور ہندوپاک اور بنگلہ دیش کی تفریق نہیں ہوئی تھی، اس غیر منقسم ہندوستان میں ایک سے بڑھ کر ایک عباقرۂ علم و فضل موجود تھے، اور خود دیوبند بڑے بڑے اصحاب فضل و کمال سے معمور تھا، لیکن ارباب حل و عقد کو اس منصب کے شایان شان کوئی شخصیت نظر آئی تو وہ مئو کی اس دور افتادہ بستی میں تھی۔

مولانا منظور صاحب نعمانی ۱۳۶۳ھ میں دارالعلوم کی مجلس شوری کے رکن منتخب ہوئے، اس سال کے اواخر میں شوری کی نشست میں صدر مفتی کے نام پر غور و خوض کیا گیا تو اپنے استاد علامہ اعظمی کا نام اس منصب کیلئے ان ہی نے پیش کیا، جسے تمام ارکان مجلس نے نہ صرف یہ کہ بلا تامل و تردد کے قبول فرمایا بلکہ اس تجویز پر مسرت و ابتہاج کا اظہار بھی کیا، اور اسی نشست میں یہ بات طے پائی کہ علامہ اعظمی کی منظوری حاصل کرنے

کیلئے شیخ الاسلام حضرت مولانا مدنیؒ اور حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ مئو تشریف فرما ہو کر ان کو اس پر آمادہ کرنے کی کوشش کریں، ان تمام باتوں کی اطلاع خود مولانا منظور صاحب نعمانیؒ نے ۷ / محرم الحرام ۱۳۶۴ھ کے لکھے ہوئے ایک خط کے ذریعہ دی، جس کے کچھ حصے حسب ذیل ہیں:

"...شاید علم ہو کہ اس سال سے میں دار العلوم دیوبند کی مجلس شوری میں لے لیا گیا ہوں، ۲۸۔۲۹ ذی الحجہ کو مجلس کا انعقاد ہوا تھا، وہاں ایک چیز یہ طے کی گئی تھی کہ اپنے حلقہ کے جو ممتاز اہل علم ہیں ان کو زیادہ سے زیادہ دار العلوم میں جمع کرنے کی کوشش کی جائے۔ اور حتی الوسع انھیں سے دار العلوم کو بھرا جائے۔ اس سلسلہ میں میں نے مجلس کی جناب کی طرف توجہ دلائی اور یہ طے کر لیا گیا کہ ضرور لانے کی سعی کی جائے۔

... بہر حال میری گذارش پر مجلس نے بالاتفاق یہ طے کر دیا کہ "صدر مفتی" کی جگہ کیلئے جناب کو جلد از جلد بلانے کی کوش کی جائے۔ اور طے یہ ہوا کہ چونکہ مفتاح العلوم کو چھوڑنا بھی آپ کیلئے آسان نہ ہوگا، اس لئے ان مشکلات پر قابو پانے کے واسطے بجائے خط کتابت کے خود حضرت مولانا حسین احمد مدظلہ اور مولانا محمد طیب صاحب مئو کا سفر کریں، بلکہ یہ تجویز خود حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدظلہ کی طرف سے آئی جو منظور ہوئی، اب مجھے معلوم نہیں کہ آیا یہ حضرات ابھی مئو کیلئے گئے یا نہیں، یا اگر ابھی نہیں جا سکے ہیں تو مراسلت ہی کے ذریعہ اس بارہ میں کوئی سلسلہ جنبانی ہوئی ہے یا نہیں۔....

مجلس شوری اس وقت الحمد للہ غالباً ہر دور سے اچھی اور نفع دینی کی حامل ہے اور جو ان میں زیادہ باثر حضرات ہیں وہ سب آپ سے خاص تعلق رکھنے

والے ہیں۔ میری تجویز کا حضرت مفتی صاحب(۱)، حضرت مولانا حسین احمد صاحب، مولانا حفظ الرحمٰن صاحب، مولانا بشیر احمد صاحب (۲)، مولانا خیر محمد صاحب (۳)

(۱) حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب مراد ہیں، جو ۱۲۹۲ھ میں شاہجہاں پور میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم وطن مالوف میں حاصل کی، اس کے بعد مراد آباد گئے جہاں مولانا عبد العلی میرٹھی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا، اور آخر میں ۱۳۱۳ھ میں دار العلوم دیوبند سے فراغت پائی، فراغت کے بعد مدرسہ عین العلم شاہجہاں پور میں مدرس مقرر ہوئے اور وہیں سے فتویٰ نویسی کا آغاز بھی کیا، ۱۳۲۱ھ کے اواخر میں باصرار مدرسہ امینیہ دہلی کی صدارت تدریس کی مسند تفویض کی گئی، جسے نہایت عمدگی اور ذمہ داری سے تاحیات نبھاتے رہے، ۱۳۵۵ھ سے ۱۳۷۲ھ تک دار العلوم کی مجلس شوریٰ کے رکن رہے، سیاست سے بھی بڑا گہرا تعلق تھا، تحریک آزادی کے سلسلے میں کئی دفعہ قید بھی ہوئے۔ ایک مدت تک جمعیۃ علماء ہند کے صدر بھی رہے، مفتی صاحب کو یوںؒ تو تمام علوم اسلامیہ پر دستگاہ حاصل تھی، لیکن فقہ و فتوی میں ان کی نگاہ نہایت دور رس تھی، اپنے وقت کے اجلۂ علماء میں ان کا شمار ہوتا تھا، حدیث و فقہ ہو یا شعر و ادب ہر ایک میں ان کا کمال و تفوق مسلم تھا۔ ذکاوت و ذہانت اور فہم و فراست میں ضرب المثل تھے، ۱۳؍ ربیع الثانی ۱۳۷۲ھ کو سفر آخرت پر روانہ ہوئے۔ (تاریخ دار العلوم دیوبند ۲؍ ۸۱۔۷۹)

(۲) آپ کے حالات مجھ کو نہیں ملے۔

(۳) پنجاب کے ضلع جالندھر کے باشندہ تھے۔ ۱۸۹۵ء م ۱۳۱۳ھ میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم جالندھر کے علاوہ گلاؤٹھی میں حاصل کی، اور بریلی سے مولانا محمد یسین صاحب کے ہاتھوں سند فراغ حاصل کی، ذہنی اور فکری طور پر آپ کی وابستگی دار العلوم دیوبند سے رہی، اور ایک مدت تک اس کی مجلس شوریٰ کے رکن رکین رہے، جالندھر میں ۱۳۴۹ھ م ۱۹۳۲ء میں خیر المدارس کے نام سے ایک مدرسہ جاری کیا، ملک کی تقسیم کے وقت پاکستان ہجرت کر گئے اور ملتان میں مقیم ہوئے، وہاں خیر المدارس ہی کے نام سے ایک مدرسہ قائم کیا، حضرت تھانویؒ سے بیعت و خلافت حاصل تھی، علم و فضل اور زہد و تقویٰ میں بڑے کامل تھے۔ ۲۰؍ شعبان ۱۳۹۰ھ کو ملتان میں وفات پائی۔ (تاریخ دار العلوم دیوبند ۲؍ ۱۲۳۔۱۲۲)

مولانا محمد طیب صاحب (۱) سب ہی نے نہایت گرمجوشی سے استقبال کیا اور بالخصوص حضرت مولانا مدنی، مفتی صاحب اور مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے تو میرے اندازوں سے زیادہ آپ کی مدح اور اعتماد کا اظہار کیا۔۔۔''

یہ خط بہت طویل ہے جس کو ہم نے اختصار کے ساتھ ذکر کیا ہے، اور صرف انھیں باتوں کو نقل کیا ہے جو اس مقام سے متعلق ہیں۔ بہر حال مجلس شوری کی تجویز کے مطابق مولانا مدنیؒ اور قاری طیب صاحبؒ مئو تشریف لائے اور اصرار کے ساتھ اس عظیم الشان منصب کے لئے آمادہ کرنے کی کوشش کی، مولانا حبیب الرحمٰن جگدیش پوری لکھتے ہیں:

''۱۳۶۴ھ م ۱۹۴۵ء میں جب کہ محدث عصر مفتاح العلوم مئو میں شیخ الحدیث کی حیثیت سے تدریسی و تعلیمی خدمات انجام دے رہے تھے، حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند اور اور حضرت مولانا قاری محمد طیب قاسمی مہتمم دارالعلوم دیوبند نے مئو آکر بیک زبان صدارت افتاء کا

---

(۱) مولانا قاری محمد طیب صاحب محرم ۱۳۱۵ھ جون ۱۸۹۷ء میں پیدا ہوئے، ۷؍ سال کی عمر میں دارالعلوم میں داخل کردیا گیا، دارالعلوم کا شعبۂ قرأت جب شروع ہوا تو آپ اس کے سب سے پہلے طالب علم تھے، ۱۳۳۷ھ م ۱۹۱۸ء میں فراغت پائی، تعلیم و تربیت، نشو نما اور تحصیل و تکمیل سب کچھ دارالعلوم ہی میں عمل میں آیا، تکمیل کے بعد دارالعلوم ہی میں درس و تدریس کا آغاز کیا اور یہ سلسلہ زندگی کے آخری ایام تک جاری رہا، ۱۳۴۳ھ م ۱۹۲۴ء میں دارالعلوم کے نائب مہتمم مقرر ہوئے اور پانچ سال بعد ۱۳۴۸ھ م ۱۹۲۹ء میں اس وقت کے مہتمم مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی کا انتقال ہوگیا، تو اہتمام کا بار قاری صاحب کے اوپر ڈال دیا گیا، اس وقت سے لیکر پچاس سال تک آپ دارالعلوم کے مہتمم رہے، اور پوری عمر دارالعلوم ہی کی خدمت میں گذاروی، آپ کے دور اہتمام میں دارالعلوم نے بہت زیادہ ترقی کی، وہ بہت سی صلاحیتوں اور گوناگون اوصاف و کمالات کے مالک تھے، ۶؍ شوال ۱۴۰۳ھ ۱۷؍ جولائی ۱۹۸۳ء کو وفات پائی اور قبرستان قاسمی میں اپنے جد امجد حجۃ الاسلام حضرت نانوتویؒ کے پہلو میں مدفون ہوئے۔

اہم ترین منصب پیش کیا مگر اہل مئو بالخصوص جامعہ مفتاح العلوم کے ارباب بست وکشاد کسی طرح سے مفارقت پر راضی نہیں ہوئے۔"(۱)

علامہ اعظمی ان دونوں حضرات بالخصوص مولانا مدنی کی شخصیت، ان کے مرتبہ و مقام، ان کے ساتھ گہرے روابط اور ادب واحترام کی وجہ سے ان کی تشریف آوری اور اصرار سے ایک قسم کا بوجھ محسوس کرنے لگے تھے، جس کے باعث ان کی اس پیشکش سے انکار نہیں کر سکے، اور بجبر واکراہ اپنی آمادگی ظاہر کردی، لیکن ارباب مدرسہ کو جب ان کی اس آمادگی کا علم ہوا تو وہ کسی صورت سے بھی اس بات پر راضی اور تیار نہ ہوئے کہ علامہ اعظمی مفتاح العلوم چھوڑ کر جائیں۔

دارالمبلغین (لکھنؤ) کی طرف سے پیشکش علمی حلقوں میں جب یہ خبر پھیلی کہ علامہ اعظمی مدرسہ مفتاح العلوم کی ملازمت سے دستبردار ہوگئے ہیں تو بہت سے حضرات کو، جن کو آپ سے ربط و تعلق تھا، اپنی مراد پوری ہوتی دکھائی دینے لگی ایک اندازے کے مطابق ۱۳۶۴ھ کا پورا سال ملازمت کی حدود وقیود سے آزاد ہوکر مفتاح العلوم کی خدمت سرانجام دی، ناممکن تھا کہ اہل علم کو اس واقعہ کی خبر نہ لگے، چنانچہ جب ان کو اس کی اطلاع ملی تو لوگوں نے آپ کو بلانے کی اپنے اپنے طور پر کوشش کی، اسی سلسلے کا ایک مکتوب مولانا عبدالرحیم صاحب لکھنوی برادر خورد مولانا عبدالشکور فاروقی لکھنوی کا ہے، جو ۲۶؍شعبان ۱۳۶۴ھ کا نوشتہ ہے، اس کا مضمون یہ ہے:

"...بخدمت محترم مجمع الفضائل مولانا حبیب الرحمن صاحب زید مجدہم
السلام علیکم
آپ کی برداشتگیٔ قلب اور مدرسہ سے قطع تعلق کی خبر تو معلوم ہوئی تھی اور اس خبر سے کچھ قلق بھی ہوا تھا کیونکہ میرا یقین ہے کہ آپ بانی مدرسہ ہیں، لیکن مفصل حال مولوی عبدالستار صاحب پورہ معروف کی زبانی معلوم ہوا،

(۱) دارالعلوم وفیات نمبر ص ۱۵۵۔۱۵۴

ماشاءاللہ کان وماشاء یکون۔اب تو مجھے حق حاصل ہے کہ عرض کروں،جب آپ کا تعلق مدرسہ سے تھا تواس وقت آپ کو مجبور سمجھنا ضروری تھا، لیکن اب تو نہ آپ کو کوئی عذر ہو سکتا ہے اور نہ دارالمبلغین کسی عذر کے قبول کرنے کو تیار ہو سکتا ہے، دارالمبلغین کے حقوق آپ پر کئی اعتبار سے ہیں، لہٰذا التماس ہے کہ بعد رمضان آپ قیام دارالمبلغین منظور فرمائیں۔"

سید سلیمان ندوی کی پیشکش دارالمصنفین کیلئے ندوہ کیلئے سید صاحب کی دعوت کا ذکر اوپر گذر چکا ہے، اس کے کوئی ۶؍سال بعد ۱۳۶۴ھ میں سید صاحب نے ایک دفعہ پھر آپ کو دارالمصنفین میں لانے کی کوشش کی، ۲۱؍رمضان ۱۳۶۴ھ کے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

"... میں نے زبانی اشارہ بھی کیا اور آپ کا اشارۂ قبول بھی سمجھا کہ آپ ہمارے مہمان ہو جائیں، یعنی دارالمصنفین آکر قیام فرمائیں، جو نذرانہ وہاں ملتا ہے وہی یہاں بھی حاضر رہے گا، سیرت و تالیفات میں میری مدد فرمائیں، فتاوی کا کام کریں اور جو مناسب موضوع نظر آئے تحقیقات کے لئے اور جو علمی کام مشورہ سے طے پائے، ہو سکتا ہے کہ بعض طالب العلم درجۂ تکمیل پڑھیں بھی ..."

والد کی وفات ۱۳۶۵ھ کے آخر میں ایک ڈیڑھ مہینے کی علالت کے بعد آپ کے والد ماجد وفات پاگئے۔وفات کا اثر علامہ اعظمی کی ذات پر جو پڑا وہ ان کی اس تحریر سے ظاہر ہے:

"از وفات او آنچہ بر من گذشت از حد بیان بیرون است" (ان کی وفات سے مجھ پر جو گذری وہ حد بیان سے باہر ہے)

والد محترم کی وفات کا اندوہناک حادثہ ۲۱؍ذی الحجہ ۱۳۶۵ھ کو پیش آیا، آپ نے خود تحریر فرمایا ہے:

"توفی بذات الرية فی الساعة الثانية نهاراً يوم السبت فی

إحدى وعشرين من ذى الحجة سنة ١٣٦٥ وكان ابن خمس وسبعين او ثلث و سبعين ...

(یعنی آپ کی وفات ۲۱/ ذی الحجہ ۱۳۶۵ھ بروز سنیچر دو بجے دن میں گردہ کی بیماری میں ہوئی، وفات کے وقت عمر ۷۵ یا ۷۳ سال تھی)

والد کی وفات کے ایک ہفتہ بعد ۲۸/ ذی الحجہ ۱۳۶۵ھ کو شاگرد عزیز مفتی محمد ظفیر الدین مفتاحی کو یہ خط لکھا:

"ایک ڈیڑھ ماہ سے رشید احمد بھی بیمار ہے اور اسی کے ساتھ سیدی و وسیلۃ یومی وغدی حضرت پدر بزرگوار بھی بیمار ہوئے، عیدالضحی کے ایک دن پہلے مسجد آنے جانے لگے اور عید میں بھی گئے، وہ دن عافیت سے گذرا، رات گذرنے نہیں پائی تھی کہ قے دست کے بعد جاڑا بخار شروع ہو گیا، تین چار دن کے بعد نمونیہ ہو گیا، بالآخر ۲۱/ ذی الحجہ ۱۳۶۵ھ کو پونے دو بجے دن میں ان کا وصال ہو گیا، اس وقت سے میرا جو حال ہے اللہ ہی بہتر جانتا ہے، والد صاحب کی نسبت کچھ لکھنا پدرم سلطان بود کا مصداق ہوگا۔" (۱)

سید سلیمان ندوی کو، جو اس وقت بھوپال میں مقیم تھے، جب اس حادثہ کی خبر ملی تو انھوں نے ایک خط میں جو ۳/ دسمبر ۱۹۴۶ء کا مؤرخ ہے تعزیتی کلمات لکھنے کے بعد فرمایا:

"اگر کبھی مئو سے ہٹ کر اگر کہیں چند روزہ دل بہلانے کو جی چاہے تو غریب خانہ حاضر ہے۔"

اس حادثہ سے علامہ اعظمی کی زندگی کس حد تک متاثر ہوئی تھی، اس کو جاننے کیلئے ایک خط پڑھئے جسے تقریباً پونے دو سال بعد مفتی ظفیر الدین صاحب کے پاس لکھا ہے، یہ خط ۲۲/ رمضان ۱۳۶۷ھ کو لکھا گیا ہے، فرماتے ہیں:

(۱) ترجمان الاسلام ش ۱۱۔۱۲ ص ۱۴۶

"میں چاہتا ہوں کہ باہر نکلوں، مگر والد صاحب کی وفات اور بھائی کی علحدگی کی وجہ سے گھر کی فکر میں ایسا مبتلا ہوں کہ دو دن کے لئے بھی کہیں جانا مشکل ہو رہا ہے۔"(۱)

مفتاح العلوم کی نظامت مدرسہ مفتاح العلوم کی نشاۃ ثانیہ سے لے کر دو دہائیوں سے زیادہ تک متواتر آپ صدر المدرسین اور شیخ الحدیث رہے، اور اس اثناء میں مولانا محمد ایوب صاحب نظامت کے فرائض انجام دیتے رہے، ۱۳۶۶ھ میں مولانا ایوب صاحب عہدۂ نظامت سے سبکدوش ہو گئے، لہٰذا ارباب حل و عقد اور منتظمین نے یہ چاہا کہ علامہ اعظمی ہی اب نظامت کے فرائض بھی انجام دیں، ان کی شخصیت چونکہ خالص علمی، تصنیفی اور تحقیقی تھی، اس لئے اس قسم کے انتظامی امور سے فطرتاً اباء کرتے تھے، ہمیشہ یہی چاہتے اور خواہش کرتے رہے کہ مالیاتی عہدوں اور انتظامی امور میں بنفس نفیس مبتلا نہ ہوں اور خود کو ان سے دور رکھیں، کیونکہ اس بات کا پورا امکان تھا کہ یہ ذمہ داریاں آپ کی علمی اور تصنیفی و تحقیقی زندگی کو متاثر کر دیتیں، لیکن جب ارباب مدرسہ کا اصرار بڑھا تو زیادہ انکار کی گنجائش نہ رہی اور مدرسہ سے تعلق خاطر کی وجہ سے اس بار گراں کو بھی سر پر اٹھانا پڑا۔

اپنی اس ذمہ داری کے بارے میں مولانا ظفیر الدین مفتاحی کو ۲۸/ ذی قعدہ ۱۳۶۶ھ مطابق ۱۴/ اکتوبر ۱۹۴۷ء کے ایک خط میں اطلاع دیتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

"آج کل بے حد عدیم الفرصۃ ہوں، ناظم صاحب نے اپنے عہدے سے سبکدوشی حاصل کر لی ہے، عارضی طور پر یہ بار بھی مجھے ہی اٹھانا پڑا، تعمیر کا کام بہت تیزی سے جاری ہے، اس کے ساتھ دورہ (حدیث) کے اسباق کی تعلیم بھی جاری ہے..."(۲)

---

(۱) ترجمان الاسلام ش ۱۱۔ ۱۲ ص ۱۴۶

(۲) مشاہیر علماء ہند کے علمی مراسلے ص ۱۵۲

نظامت کا عہدہ آپ نے ذی قعدہ ۱۳۶۶ھ میں سنبھالا، اور اس طرح کئی سال تک نظامت، صدارت اور شیخ الحدیث کے منصب پر آپ فائز رہے، اور اس مدت میں درس و تدریس کے ساتھ مدرسہ کی تعمیر و ترقی کا کام بھی پوری سرگرمی سے جاری رہا، مفتی ظفیر الدین صاحب مفتاحی تحریر فرماتے ہیں:

"۱۳۶۶ھ میں احباب اور اہل شہر کے اصرار پر آپ کو مفتاح العلوم کی نظامت کا عہدہ بھی قبول کرنا پڑا، اور ۱۳۷۱ھ تک اس عہدہ کے فرائض انجام دیتے رہے، تعمیرات پر اس زمانہ میں خصوصی توجہ دی اور بہت سارے کمرے تعمیر کرادئے۔"(۱)

علامہ اعظمی نے مفتاح العلوم کی تعمیر و ترقی کیلئے اپنے آپ کو کس طرح مٹایا اور جب جب موقع آیا اس کیلئے اپنے جسم و جان کو کیسے کیسے قربان کیا، اور اس کے فروغ و ارتقاء کیلئے اپنی تمام تر قوتوں اور توانائیوں کو کس طرح صرف کیا اس کو اس ایک مثال سے سمجھا جا سکتا ہے۔ ۵/ ربیع الثانی ۱۳۶۷ھ م ۶/ فروری ۱۹۴۸ء کو ایک خط میں مفتی ظفیر الدین صاحب کو لکھتے ہیں:

"صبح کو ناشتہ کے بعد مدرسہ جاتا ہوں، ساڑھے بارہ یا ایک ڈیڑھ بجے واپس آتا ہوں، نماز پڑھتا ہوں، پھر مدرسہ جاتا ہوں تو ساڑھے سات آٹھ بجے شب میں واپس آتا ہوں، بتاؤ "نظام مساجد" (۲) کب دیکھوں۔"(۳)

---

(۱) ترجمان الاسلام ش ۱۱۔۱۲ ص ۱۴۵

(۲) مفتی ظفیر الدین صاحب کی کتاب کا نام ہے، غالباً ان کی سب سے پہلی تصنیف ہے، جس پر علامہ اعظمی سے نظر ثانی کرانا چاہتے تھے۔

(۳) مشاہیر علماء ہند کے علمی مراسلے ص ۱۵۲

امور مدرسہ سے سبکدوشی ۲۲ برس کی طویل مدت تک صدارت تدریس و مشیخت حدیث اور وقتاً فوقتاً نظامت کے فرائض کی انجام دہی کے بعد ۱۳۶۹ھ میں ان تمام گراں باریوں سے سبکدوشی حاصل کرنی چاہی، اور یہ ارادہ کیا کہ یکسوئی اور پوری توجہ اور تندہی کے ساتھ تحقیقی و تصنیفی مہمات میں مشغول ہو جائیں، لکھتے ہیں:

"بالآخر غالباً ۱۳۶۹ھ میں مختلف اسباب کی بنا پر میں نے علٰحدگی اختیار کرلی، جس کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ میرے پیش نظر بعض بہت اہم تصنیفی خدمتیں تھیں، جن کیلئے کامل یکسوئی درکار تھی۔" (۱)

اسی سال (۱۳۶۹ھ) آپ پہلی دفعہ سعادت حج سے بہرہ مند ہوئے تھے، اور حج پر روانہ ہونے سے قبل ان تمام عہدوں سے سبکدوشی حاصل کرنے کے لئے انتظامی کمیٹی کو اپنا استعفا سپرد کر دیا تھا، مگر نظامت سے استعفا انتظامیہ نے منظور نہیں کیا، جس کی وجہ سے دو سال اور آپ مدرسہ کی نظامت فرماتے رہے۔

لیکن اس کنارہ کشی کے بعد بھی مدرسہ مفتاح العلوم ہمہ وقت آپ کا محتاج رہا، اور یہ احتیاج جب بھی بڑھ جاتا تو بغیر کسی پس وپیش کے تدریسی عمل کیلئے آمادہ ہو جاتے، مفتی ظفیر الدین مفتاحی صاحب فرماتے ہیں:

"مفتاح العلوم کی ذمہ داری برابر قبول کرتے رہے، مفتاح العلوم سے علٰحدگی کے باوجود جب ضرورت ہوئی بلا معاوضہ اسباق بھی پڑھاتے رہے" (۲)

اس صورت میں کبھی آپ کے پاس صحاح ستہ میں سے کوئی کتاب ہوتی، کبھی حدیث کی کوئی دوسری کتاب، اور کبھی ادب یا کسی اور فن سے متعلق کوئی کتاب اپنے درس میں رکھ لیتے، چنانچہ مفتی ظفیر الدین صاحب کو ۱۱ ربیع الثانی ۱۳۷۰ھ کو لکھے گئے ایک مکتوب مین تحریر فرماتے ہیں:

---

(۱) تذکرۂ مولانا عبداللطیف نعمانی ص ۱۵

(۲) ترجمان الاسلام ش ۱۱۔ ۱۲ ص ۱۴۵

"چند دنوں سے میں نے حماسہ اور ابن ماجہ پڑھانا شروع کردیا ہے۔"(۱)

ایک دوسرے مکتوب میں جو ۲۸ر فروری ۱۹۷۳ء کا نوشتہ ہے فرماتے ہیں:

"میں روزانہ مفتاح العلوم جاتا ہوں، ایک گھنٹہ بخاری پڑھاتا ہوں اور ایک ڈیڑھ گھنٹہ انتظامات کی دیکھ بھال کرتا ہوں، میں نے بلا معاوضہ یہ بوجھ اٹھالیا ہے، صرف اس لئے کہ طلباء کا نقصان نہ ہو، اور مدرسہ کے ہمدرد لوگ بددل اور مایوس نہ ہوں، لیکن ہر وقت یہ فکر دامنگیر ہے کہ ہر ضروری شعبہ کی ذمہ داری سنبھالنے کیلئے ایک ایک موزوں آدمی مل جائے یا تیار ہو جائے۔"(۲)

مولانا عبداللطیف صاحب مفتاحی ڈائری ۱۳۸۶ھ (ص۸) میں فرماتے ہیں:

"آپ کا (علامہ اعظمی کا) شمار علم حدیث کے ایک متبحر عالم کی حیثیت سے آج علمی دنیا کی چند مقتدر ہستیوں میں ہوتا ہے، آپ نے ۱۳۴۷ھ سے ۱۳۵۷ھ تک مفتاح العلوم کی صدر مدرسی کے فرائض انجام دئے اور ۱۳۶۶ھ سے ۱۳۷۱ھ تک نظامت کا عہدہ بھی سنبھالا۔ اب اگرچہ آپ نے پڑھنے پڑھانے کا یہ سلسلہ ختم کردیا ہے، لیکن ایک مربی اور سرپرست کی حیثیت سے مدرسہ کو اب بھی آپ سے پورا فیض پہنچ رہا ہے۔"

یہاں تک کہ ایک زمانہ ایسا آیا جب تحقیقی مشاغل میں مصروفیت حد سے زیادہ بڑھ گئی، اور روزانہ صرف پڑھانے کے واسطے مدرسہ جانا ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہو گیا تھا، اور دوسری طرف شرف تلمذ اور حصول برکت کیلئے طلبہ کا شوق بھی بڑھا ہوا تھا، تو محلہ کی مسجد میں طلبہ کو بلا کر طحاوی شریف وغیرہ کا درس دیا، مفتاح العلوم اور اس کے طالب علموں کے ساتھ علامہ اعظمی کا حد درجہ شغف و تعلق اور غایت درجہ شفقت تھی کہ انتہائی مصروفیت کے وقت بھی بقدر استطاعت خدمت کرتے رہے، اور طالبان علم حدیث و

---

(۱) ترجمان الاسلام ش ۱۱۔ ۱۲ ص ۴۵

(۲) مشاہیر علماء ہند کے علمی مراسلے ص ۱۸۸

تشنگان علم وفن کی حاجت بر آری فرماتے رہے۔

پہلا سفر حج | شوال ۱۳۶۹ھ م اگست ۱۹۵۰ء میں کسی کام کیلئے آپ بمبئی تشریف لے گئے، بمبئی کے مشہور اردو روزنامہ "جمہوریت" نے ۲۸ر شوال ۱۳۶۹ھ مطابق ۱۳ر اگست کو یہ خبر شائع کی:

"آج روزنامہ جمہوریت کے دفتر میں ہندوستان کے مشہور عالم دین حضرت علامہ مولانا ابوالمآثر حبیب الرحمٰن الاعظمی صاحب مدظلہم تشریف لائے ۔۔۔"

اس وقت بمبئی کے واقف کاروں اور شناساؤں نے اصرار کیا کہ آپ اس سال فریضۂ حج ادا کرلیں لیکن کچھ طبعی موانع کی وجہ سے برابر پس وپیش میں تھے، بمبئی سے ۱۵ر اگست ۱۹۵۰ء کو مولانا عبدالجبار صاحب مولوی مختار احمد صاحب اور صاحبزادے مولوی رشید احمد صاحب کو ایک مشترکہ خط میں لکھتے ہیں:

"۔۔۔ محمدی سے مولوی یوسف صاحب بنوری بھی حج کیلئے روانہ ہوگئے، اس سال حضرۃ شیخ مولانا حسین احمد صاحب بھی تشریف لے جانے والے ہیں، مولوی قاسم شاہجہاں پوری[1] ابھی بمبئی میں مقیم ہیں اور ممکن ہے آخری جہاز کی روانگی تک مقیم رہیں، شیخ انجینئر بھی زور دے رہے ہیں کہ تم بھی چلے جاؤ، میں نے ابھی کوئی قطعی فیصلہ نہیں کیا، مگر بہر حال دو تین دن میں مجھے کوئی قطعی

---

(۱) مولانا ابوالقاسم شاہجہاں پوری نے دارالعلوم دیوبند میں تعلیم حاصل کی، عوامی تحریکات میں پیش پیش رہا کرتے تھے اپنی پوری زندگی قومی اور ملی خدمات کے لئے وقف کر رکھی تھی، انتہائی جری بہادر اور نڈر تھے، بڑے سے بڑے خطرات کا مردانہ وار مقابلہ کرتے تھے، ہندستان کی تحریک آزادی میں بھرپور حصہ لیا۔ جمعیۃ علمائے اتر پردیش کے ایک عرصہ تک ناظم اعلیٰ رہے، جس کی وجہ سے مستقل لکھنؤ میں سکونت رہا کرتی تھی، آخر عمر میں لکھنؤ کی سکونت ترک کرکے فتح پور اپنی بیٹی کے پاس چلے گئے تھے اور وہیں وفات واقع ہوئی۔ (رفتگان رفتہ ص ۱۵)

فیصلہ کرلینا ہے، یہ بات ابھی تم تین شخصوں سے کہہ رہا ہوں، جب علانیہ کہنے کا وقت آجائے گا اس وقت علانیہ بھی کہوں گا، میں ابھی یہ بھی نہیں چاہتا کہ اس مسئلہ پر غور کرنے کی خبر بھی لوگوں کو دوں•••"

اسی طرح ۱۹ راگست کے ایک خط میں فرماتے ہیں:

"•••میں شیخ انجینئر کے یہاں سوتا ہوں، ان کا بھی بے حد اصرار ہے کہ میں بغیر حج کیے واپس نہ جاؤں، آج مولوی عبدالرحیم لکھنوی ملے ان کا بھی اصرار ہے لیکن میں ابھی مذبذب ہوں، سید(۱) سے پوچھ کر لکھو کہ کیا کیا جائے، اگر دل مطمئن ہو تو خیر ورنہ سال آئندہ ان کو بھی حق رفاقت ادا کرنا پڑیگا، مولانا عبدالشکور لکھنوی یکم ستمبر کو ۹ ربجے صبح لکھنؤ سے روانہ ہوں گے، ان کے ساتھ پچاس آدمیوں کا قافلہ ہے، آج شفیق جونپوری بھی حج کو جارہے ہیں •••"

بہر حال کئی روز کے پس وپیش اور غور وفکر کے بعد اس مقدس فریضہ کی ادائگی کیلئے عزم مصمم فرمایا، اور رفاقت کیلئے آپ کے تلمیذ ورفیق مولانا عبدالجبار صاحب نہایت خوشی اور سعادتمندی کے ساتھ تیار ہوگئے، اور وہ بھی اس سفر پر ساتھ روانہ ہوئے، بمبئی سے ہی ۵ ر ستمبر کے ایک خط میں اپنے بھائی، صاحبزادوں اور مولوی مختار احمد صاحب کو لکھتے ہیں:

"•••آج بفضلہ تعالیٰ کرایہ کا روپیہ جمع ہوگیا دونوں آدمیوں کا، اور پاسپورٹ بھی بن گیا، صرف سید کے برٹیفکٹوں کی تصدیق باقی ہے، جو انشاءاللہ کل ہو جائے گی اور سعودی ٹیکس بھی کل جمع ہوگا۔ حضرت مولانا لکھنوی پہلے آگئے، مولانا حفظ الرحمٰن سے بھی آج ملاقات ہوئی، •• صرف دیکھ بھال کیلئے آئے ہیں، اب جہاز ۸ ر ستمبر کو بعد نماز جمعہ روانہ ہوگا اور انشاءاللہ قران کا احرام باندھا جائے گا•••"

---

(۱) مولانا عبدالجبار صاحب مراد ہیں

علامہ اعظمی کا معمول یہ تھا کہ جب سفر میں ہوتے تو اپنی کیفیت سے باخبر رکھنے کیلئے بہت کم وقفہ سے خط لکھتے، اور گھر کے حالات سے واقف رہنے کیلئے اہل خانہ کو اس بات کی تاکید کرتے کہ جلد جلد وہ خط لکھا کریں، اس طرح کہ ہر دن کی خیر وعافیت علم میں آتی رہے، یہی وجہ ہے کہ ان کے مکاتیب میں بہت کم مدت کا وقفہ نظر آتا ہے، بمشکل ایک دو یوم کا خلا ہوتا ہے، مثلاً ۵/ ستمبر کے بعد ۷/ ستمبر کو روانگی سے ایک روز پیشتر مذکورہ بالا حضرات کو لکھتے ہیں:

"آج غالباً بمبئی سے یہ آخری خط ہے، اس لئے کہ کل جمعہ کی نماز کے بعد روانگی ہے، آج پاسپورٹ وغیرہ اور خریداری اشیاء سے فراغت ہو گئی، کل حمید زائر حرم سے بھی ملاقات ہوئی.. بھی جارہے ہیں، آج معلوم ہوا کہ راجہ سلیم پور وجہانگیر آباد وغیرہ بھی اس جہاز میں ہیں، غرضیکہ اکابر دین ودنیا کے اس ہجوم میں ایک فقیر بے نوا بھی ہے..."

۳/ ذی الحجہ ۱۳۶۹ھ مطابق ۱۶/ ستمبر ۱۹۵۰ء کو دخانی جہاز سے جب وہ مقام یلملم کے قریب پہونچے تو اپنے صاحبزادوں اور بھائی کے نام لکھا:

"لبيك اللهم لبيك لبيك لا شريك لك لبيك ان الحمد والنعمة لك والملك لا شريك لك . آج شام کے قریب جہاز یلملم کی محاذات میں پہونچے گا، اس وقت ہم احرام کی تیاری میں ہیں، بہت سے لوگوں نے کل ہی سے احرام باندھ رکھا ہے، کل ۸۔بجے ان شاء اللہ تعالیٰ ہم جدہ پہونچ جائیں گے، اور جدہ سے یہ خط روانہ کریں گے، پہلے طبیعت کچھ بدمزہ تھی، لیکن اب بحمدہ تعالیٰ بہت اچھی ہے، مسائل کے بیان اور تحقیق میں وقت کٹ رہا ہے، وعظ کے لئے بھی اصرار ہوا مگر میں نے قبول نہیں کیا، علمائے کرام بڑی ہمت افزائی فرمارہے ہیں، بلکہ مسائل میں رجوع کرتے ہیں فالحمد للہ وحدہ، خصوصاً مولانا لکھنوی بہت مہربان ہیں، دل چاہتا ہے کہ خداوند تعالیٰ تم لوگوں کو علم کا شوق عطا فرمائے اور تم لوگوں کو بھی علمائے وقت کا یہی اعتماد وقبول نصیب ہو..."

مکہ پہونچنے کے بعد کئی دن تک اشغال و مصروفیات کی وجہ سے خط لکھنے کی نوبت نہیں آئی، ۷ر ذی الحجہ بروز سہ شنبہ ذرا سی فرصت ملی تو اس کا فائدہ اٹھایا اور حرم شریف۔ زادہ اللہ حرمۃً وشرفاً۔ میں بیٹھ کر خط یہ لکھا:

''عزیزانم! السلام علیکم۔ جدہ سے ایک خط روانہ ہو چکا ہے، جدہ سے ہم لوگ اسی دن بعد عشاء روانہ ہو گئے، اور مکہ مکرمہ پہونچتے ہی راتوں رات طواف وسعی سے فراغت حاصل کی، اس کے ۱۵ر منٹ کے بعد اذان فجر ہو گئی، ہم لوگوں نے تھوڑی سی سہولت کے لحاظ سے تمتع کیا، آج بعد عشاء ان شاء اللہ منی کو اونٹ کی سواری سے روانگی ہے، سنت تو ۸ کو ہے مگر اس میں بڑی دشواری معلوم ہو رہی ہے اور یہ بھی اندیشہ ہے کہ اس صورت میں دوسری سنت چھوٹ جائے گی، بہر حال اب ۱۳۔ سے پہلے خط لکھنے کی نوبت نہیں آسکتی، الحمد للہ ہم لوگ بخیر ہیں، سید عمر مدنی کے پاس ہیں، سلطان وغیرہ کی قیام گاہ پر ٹھہرے ہیں، مولوی عبد اللہ (۱) صاحب رات بھر ہمارے ساتھ جاگتے رہے سڑک پر آدھی رات

(۱) مولانا عبد اللہ زمزمی مراد ہیں، والد کا نام غلام محمدؐ تھا، وطن اصلی غالباً لاہور تھا۔ ان کے والد (غلام محمد) صغر سنی ہی میں مکہ پہنچ گئے، مکہ کے کسی شیخ نے ان کو اپنا مولیٰ بنالیا، بڑے ہو کر انھوں نے وہیں شادی کی جن کی صلب سے مولانا عبد اللہ زمزمی جیسا عابد وزاہد اور دانا و فرزانہ بیٹا تولد ہوا، مولانا زمزمی باب ابراہیم کے قریب رباط ابی نمی کے کسی خلوہ میں رہا کرتے تھے، بعد میں یہ رباط منہدم کر دی گئی تو شارع المنصور پر منتقل ہو گئے، صاحب علم و فضل ہونے کے ساتھ ساتھ نہایت عابد وزاہد، متقی و متقشف، پاکباز و شب زندہ دار اور صاف دل، سیر چشم اور فیاض طبع تھے، علماء ہند کے بڑے قدرداں تھے، اور علامہ اعظمی کے تو عاشق زار تھے، ان کے عشق و شیفتگی کیلئے یہی کافی ہے کہ ان کے انتظار میں آدھی رات سڑک پر گزار دی، حج کے اسی سفر میں علامہ اعظمی کی ان سے پہلی دفعہ ملاقات ہوئی تھی، اور اس ملاقات کے بعد آپ کی محبت اور بڑھ گئی، شوال ۱۳۸۶ھ میں جان جان آفریں کے سپرد کی، ان کی نسبت علامہ اعظمی کے تاثرات آگے کہیں نقل کیے جائیں گے۔

تک ہماری راہ دیکھتے رہے، ہدیوں سے ابھی انھوں نے لاد دیا ہے، بار بار ہاتھ چھوتے ہیں، پیر پکڑتے ہیں، سر کا بوسہ دیتے ہیں، الحاصل اللہ کی بڑی عنایات ہیں ... یہ خط مصلی حنفی سے ذرا فاصلہ پر بیٹھ کر لکھ رہا ہوں۔ اور اس طرح کہ درمیان میں بار بار کعبہ مشرفہ کی طرف نگاہ اٹھ رہی ہے، ساتھ ہی سید صاحب بھی بیٹھے ہوئے ہیں، خدا یہ دن تم سب کو بھی نصیب فرمائے ...“

علامہ اعظمی کے خطوط کسی سفر نامہ سے کم نہیں ہوتے ،اگر صرف ان کے تمام خطوط مرتب کر دیئے جائیں تو ایک اچھا خاصا سفر نامہ تیار ہو جائیگا، خط لکھنے کا ان کو بہت اہتمام تھا، اور چھوٹی چھوٹی چیز بھی وہ خط میں لکھ جاتے تھے۔ ۱۴/ ذی الحجہ ۱۳۷۰ھ م ۲۶/ ستمبر ۱۹۵۰ء کو مولوی رشید احمد و مولوی مختار احمد صاحب کو لکھتے ہیں:

”آج یہاں ۱۴/ ذی الحجہ اور ۲۶ ستمبر ہے، ہم لوگ ۷/ ذی الحجہ کو بعد عشاء بسواری شغدف منیٰ روانہ ہوئے اور فجر سے پہلے منیٰ پہونچ کر ہم نے فجر کی نماز مسجد خیف میں ادا کی۔ مکہ سے منیٰ کو روانگی آٹھ کو چاہئے تھی مگر اونٹ کی سواری سے آٹھ کو جانا سخت دشوار نیز مخل بالمقصود تھا، اس لئے مذکورہ بالا صورت اختیار کی گئی، منیٰ سے نویں کو آٹھ بجے صبح عرفات روانہ ہوئے، عرفات روانگی سے گھنٹہ بھر پہلے پانی برسا اور بہت اولے گرے، ہم لوگ ایک چھپر کے نیچے چھتری اوڑھے ہوئے تھے، اس وجہ سے کسی کو کوئی نقصان نہیں پہونچا، ہمارے علم میں اس کی وجہ سے کوئی جانی نقصان نہیں ہوا، عشاء کے قریب وہاں سے موٹر سے مزدلفہ روانہ ہوئے اور یہاں مغرب و عشاء میں جمع کیا، بارش کی وجہ سے سردی ہو گئی تھی اس لئے کمل اوڑھ کر لیٹے، سحر سے بہت پہلے جاگے، پھر غلس میں نماز فجر پڑھی لیکن طلوع سے پہلے روانگی ممکن نہ ہوئی۔ مجبوراً دن نکلنے کے بعد موٹر سے منیٰ آئے اور رمی کے بعد اپنا اپنا دم تمتع دیا اور اپنے اپنے والد کی جانب سے قربانی کی، گیارہ ذی الحجہ کو موٹر سے مکہ آئے اور طواف زیارت سے

سبکدوشی حاصل کی اور ظہر کی نماز حرم میں پڑھ کر پھر منیٰ چلے گئے، اس کے بعد ۱۲/ ذی الحجہ کو بعد مغرب وہاں سے مکہ واپس ہوئے، کل یعنی ۱۳/ کو کچھ زکامی شکایت ہو گئی، سر میں گرانی تھی اس لئے خط لکھنے پر طبیعت آمادہ نہ تھی .... مولوی عبداللہ صاحب زمزمی حد سے زیادہ محبت فرماتے ہیں ...“

مکہ مکرمہ سے ایک اور خط میں ۲۲/ ذی الحجہ مطابق ۴/ اکتوبر چہار شنبہ کے روز مولانا رشید احمد صاحب کو لکھتے ہیں:

”... نئی بات یہ ہے کہ مئو سے جو لوگ پہلے آئے ہیں سرکاری اعلان میں ان کی روانگی مدینہ کی تاریخ ۵ محرم ہے، میں کوشش کر رہا ہوں کہ انھیں کے ساتھ مجھ کو بھی اجازت ہو جائے بلکہ یہ بھی کوشش کر رہا ہوں کہ ان سے پہلے ہی ہو جائے، کوشش (کے بعد) جو نتیجہ برآمد ہوگا فوراً مطلع کروں گا، مجھ کو تو آج ہی موقع مل گیا تھا مگر وہ اجازت تنہا میرے لئے ہوتی اس لئے سید کے خیال سے میں نے مسترد کر دیا، اس سال مصر جانے کا خیال اب نہیں ہے، اب حجاج بہت سے نکل گئے، رات کو بڑے اطمئنان سے طواف و استلام، دعاء عند الملتزم، صلاۃ تحت المیزاب کا موقع مل جاتا ہے ...“

اس خط کے بعد کا کوئی خط یا اس سفر سے متعلق تفصیل ہمیں دستیاب نہیں ہو سکی، جبکہ اس کے بعد تقریباً ایک مہینہ تک مسلسل سفر جاری رہا، کیونکہ پاسپورٹ پر بمبئی پہنچنے کی جو تاریخ درج ہے وہ ۳/ نومبر ۱۹۵۰ء ہے، یعنی یہ مدت سفر لگ بھگ دو مہینے رہی۔

علامہ اعظمیؒ کے خطوط میں متعدد ایسے حضرات کے نام آپ پڑھ چکے ہیں جو اس سال سفر حج پر روانہ ہوئے۔ ۱۲/ ستمبر ۱۹۵۰ء مطابق ۲۶/ ذی قعدہ ۱۳۶۹ھ کے اخبار ”الجمعیۃ“ میں ”افکار و مطالعات“ کے کالم میں ”علماء ہند کا سفر حج“ کے عنوان سے بعض اہل علم کے نام شائع ہوئے جو اس سال اس سعادت بیش بہا سے مشرف ہوئے، اور ان کے نام کے بعد ان کا مختصر تعارف درج ہے، اس فہرست میں جو نام سب سے پہلا اور سر فہرست

ہے، اس کا عنوان ہے "مولانا ابوالمآثر حبیب الرحمٰن الاعظمی" اور اس کے ذیل میں تحریر ہے:

"حضرت مولانا ابوالمآثر حبیب الرحمٰن الاعظمی موجودہ دور میں علماء سلف کی زندہ یادگار ہیں، سینہ علوم وفنون کا سمندر ہے، اور چہرہ مہرہ اسلامی اخلاق کا نمونہ یا علم و فضل کے اعتبار سے اپنی مثال آپ، علم و فضل کے مالک ہیں اور ہر علم میں کمال حاصل ہے،

مدرسہ مفتاح العلوم مئو اعظم گڈھ کے شیخ الحدیث ہیں، دار العلوم دیوبند کے مرکزی دار الافتاء میں جہاں ہر سال پچیس ہزار فتاوی کا جواب دیا جاتا ہے، حضرت مولانائے محترم کی فقہی رائے خاص طور پر مستند اور معتبر سمجھی جاتی ہے۔

مولانا ایک درجن سے زائد تحقیقی کتابوں کے مصنف ہیں، جن میں حنفی قانون واحکام کی تائید کی گئی ہے، طحاوی شریف کی عربی شرح (۱) الحاوی کے نام سے ایک جلیل القدر کتاب لکھی ہے، اس کتاب کی بنا پر مولانا بین الاسلامی علمی حلقوں میں مستند تسلیم کئے جاتے ہیں، مصر، شام اور حجاز کے علماء کے حلقوں میں آپ کی خاص قدر کی جاتی ہے•••

حضرت مولانا محمدی جہاز سے حجاز تشریف لے گئے ہیں، امید ہے کہ حجاز کے علمی حلقے مولانائے محترم کو صمیم قلب سے خوش آمدید کہیں گے۔"

علامہ اعظمیؒ اور امام اہلسنت مولانا عبدالشکور فاروقیؒ کے علاوہ اس سال جن اہل علم کے حج پر جانے کا "الجمعیۃ" کے اس شمارے میں ذکر ہے، ان میں قابل ذکر مولانا عبدالحق صاحب مدنی (۲) اور مولانا فخر الدین احمد صاحب شیخ الحدیث مدرسہ شاہی

(۱) "الحاوی" طحاوی شریف کی شرح نہیں ہے، بلکہ طحاوی کے رجال ورواۃ اور ان کے حالات پر مشتمل ہے۔

(۲) مولانا عبدالحق صاحب مدنیؒ کا شمار جلیل القدر اور ممتاز اہل علم میں ہوتا تھا، آبائی وطن دیوبند تھا، والد فوجی سرجن تھے اور ترکی حکومت کی طرف سے مدینہ میں مقرر تھے، مدینہ منورہ ہی میں آپ کی پیدائش اور حرم نبوی میں تعلیم ہوئی، اس وقت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ مسجد نبوی =

مراد آباد ہیں، آخر الذکر کی نسبت علامہ اعظمی نے خود اپنی بیاض میں لکھا ہے: "بار اول کہ حج کردیم ما و او در باخرہ ہم سفر بودیم" (جب میں نے پہلی دفعہ حج کیا تو دخانی کشتی میں میرا اور ان کا ساتھ تھا)

علامہ قاسم بن قطلوبغا کے استدراک کی تحقیق واشاعت

حافظ ابن حجرؒ (متوفی ۸۵۲ھ) نے ہدایہ کی احادیث کی تخریج "الدرایۃ" کے نام سے کی تھی، لیکن اس کے اندر ان سے بہت سی احادیث کی تخریج رہ گئی تھی جو ان کو مل نہیں سکی تھیں، علامہ حافظ قاسم ابن قطلوبغا (متوفی ۸۷۹ھ) نے ان احادیث کو دریافت کیا اور ان کو درایہ کے حاشیہ پر تحریر فرمایا، خوش قسمتی سے علامہ اعظمی کو وہ اصل نسخہ ہاتھ آگیا جس پر علامہ قاسم بن قطلوبغا نے حافظ ابن حجرؒ کا استدراک کیا تھا، علامہ اعظمیؒ نے ان استدراکات کو نقل کر کے اپنی تعلیقات کے ساتھ مزین کیا اور اس کو علامہ زاہد کوثری کے پاس مصر بھیج دیا، جو "منية الألمعي فيما فات الزيلعي" کے ساتھ ۱۳۶۹ھ م ۱۹۵۰ء میں شائع ہوا، علامہ اعظمی کے اس کام کی اتنی اہمیت تھی کہ علامہ زاہد کوثری نے منية الالمعي کے مقدمہ میں اس کا نہایت بلند آہنگ الفاظ میں ذکر کیا، اور تشکر آمیز انداز میں اس کو سراہا۔

= میں درس حدیث کی مسند سجائے ہوئے تھے، اسی زمانہ میں مولانا عبدالحق مدنی نے بھی ان سے کسب فیض کیا اور ان کے ممتاز تلامذہ میں شمار ہوئے، مولانا نے مختلف مقاموں میں کام کیا اور مختلف ملکوں میں تدریسی خدمات انجام دیں، چنانچہ وہ مدینہ سے سفر کر کے ہندوستان آئے اور کراچی میں مسند درس بچھائی، اس کے بعد مدرسہ امدادیہ مراد آباد میں شیخ الحدیث بنائے گئے، پھر اس سے قطع تعلق کر کے مدرسہ قاسمیہ شاہی مراد آباد کا عہدۂ اہتمام سنبھالا، اور اس کی تعمیر و ترقی کیلئے انتھک کوشش کر کے پورے ملک میں اس کو روشناس کرایا، ۱۳۷۳ھ مطابق (۱۹۵۴ء) میں دیوبند میں وفات پائی، اور وہیں مزار قاسمی میں مدفون ہوئے۔ (مولانا محمد قاسم نانوتوی حاشیہ ص ۱۵۴۔۱۵۳) علامہ اعظمی نے ان کا ذکر اپنے مضمون (الجمعیۃ شیخ الاسلام نمبر، ص ۱۲۹) میں کیا ہے اور ان کو "ممتاز عالم، ادیب اور مفسر" لکھا ہے۔

اسمبلی کی رکنیت علامہ اعظمی اگرچہ خالص علمی آدمی تھے، بھیڑ بھاڑ، شور وغل اور ازدحام کی جگہوں سے وہ فطرتاً گریز اور اباء کرتے تھے، یکسوئی کیساتھ کنج تنہائی میں بیٹھ کر لکھنا پڑھنا اور علم دین کی خدمت کرنا آپ کا بہترین مشغلہ اور محبوب عمل تھا، اسی میں آپ کو ہر چیز سے زیادہ راحت اور دل ودماغ کو سکون حاصل ہوتا تھا، بقول حافظ شیراز ع

فراغتے وکتابے وگوشۂ چمنے

اس کے باوجود سیاسی مسائل سے بالکلیہ لاتعلقی اور چشم پوشی نہیں برت سکتے تھے، یہ سچ ہے کہ سیاست سے کوئی خاص سروکار نہیں تھا، اور انھوں نے اپنے دامن کو سرگرم سیاست سے ہمیشہ بچائے رکھا، لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ سیاسی معاملات اور ملکی حالات کو یکسر نظرانداز کرتے رہے ہوں، بلکہ وہ بے پناہ سیاسی بصیرت کے حامل تھے اور گوشۂ عافیت میں بیٹھ کر بھی نہ صرف ہندوستان بلکہ عالم اسلام اور عالم انسانیت میں پیش آنے والے واقعات پر گہری نظر رکھتے تھے، مولانا علی میاں ندوی مدظلہ اپنے تعزیتی مکتوب میں فرماتے ہیں:

> "اس علمی تفرد وامتیاز کے علاوہ مولانا کے اخلاق، فہم وفراست، ملت کے مسائل سے واقفیت وفکر مزید برآں ہے، اس لئے نہ صرف علمی حلقہ میں ایک عظیم خلا پیدا ہوا ہے، بلکہ ملت کی صف قیادت میں بھی ایک بڑی جگہ خالی ہوگئی ہے، جس کا پر ہونا بظاہر اسباب بہت دشوار معلوم ہوتا ہے۔"(۱)

آزادی سے پہلے برطانوی سامراج کے زمانے میں انگریزوں کے خلاف محاذ آرائی میں بھی شریک رہے، اور وقت پڑنے پر محفل درس سے باہر آکر رزمگاہ آزادی میں حصہ لیا، اپنی اس سرگرمی کی نسبت ایک جگہ خود لکھا ہے:

(۱) ترجمان الاسلام ش ۱۱۔۱۲ ص ۲۰

"جنگ آزادی میں تقریر و تحریر کے ذریعہ حصہ لیا۔اور اپنے شاگردوں کو جیل بھجوا کر ان کے بال بچوں کی کفالت کی۔"

۱۹۴۷ء میں ملک انگریزوں کے پنجۂ اقتدار سے آزاد ہوا، اس کے بعد مسلمانوں پر جو گذری وہ ایک دردناک داستان ہے، جس کو بیان کرنے کی یہاں حاجت نہیں، آزادی وطن کے تقریباً ساڑھے چار سال بعد فروری ۱۹۵۲ء (غالباً ۱۳۷۱ھ) میں آزاد ہندوستان کا پہلا عام انتخاب (General Election) ہوا، اس وقت ملک کے اکابر اہل علم انڈین نیشنل کانگریس کے ساتھ تھے۔ مئو کے حلقۂ انتخاب میں دو ہی پارٹیاں سرگرم تھیں، ایک کانگریس دوسرے کمیونسٹ، بلکہ ایک تیسری پارٹی ہندو مہاسبھا بھی میدان میں تھی، صورت حال کچھ ایسی نازک تھی کہ کانگریس کا پلڑا ان میں سب سے کمزور نظر آرہا تھا، اور کمیونسٹ امیدوار کے جیتنے کے امکانات زیادہ واضح نظر آرہے تھے، اس صورت میں کمیونسٹوں اور کمیونزم کی جڑیں نہ صرف مئو بلکہ اس کے اطراف میں بھی کافی مضبوط ہو جاتیں، جو فی الواقع ایک تشویشناک اور فکر انگیز کیفیت ہو سکتی تھی، آزادی کے بعد یہ پہلا عام انتخاب تھا اور جو طاقت فتح حاصل کرتی اس کی قوت میں اضافہ ہوتا اور اس کے گہرے اثرات پڑتے، ان وجوہ سے ارباب بصیرت و سربراہان ملت ایک قسم کے مخمصہ کی کیفیت سے دوچار تھے، سربرآوردہ لیڈروں میں کوئی شخصیت ایسی جاذب نہ تھی، جسے قبول عام حاصل ہو اور جو صرف اپنے شخصی اور انفرادی مقام و مرتبہ کے سبب کانگریس کی فتح اور فریق مخالف کی شکست کا باعث بن سکے، بصورت دیگر مئو کا حلقہ انتخاب ہمیشہ کیلئے کمیونسٹ یا ہندو مہاسبھا کا مرکز و مستقر بن جاتا۔

یہ تشویشناک حالات علامہ اعظمی کیلئے بھی کچھ کم فکر انگیز نہ رہے ہوں گے، اس پوری صورتحال کے پیش نظر ان کی یا دوسرے لوگوں کی نگاہ مولانا عبداللطیف صاحب نعمانی کی طرف اٹھتی تھی، اس موقع پر علامہ اعظمی نے اپنے اثرات کے استعمال سے بھی دریغ نہیں کیا، اور مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی کے پاس، جو اس وقت کانگریس کے سرکردہ

لیڈروں اور مسلمانوں کے مؤقر رہنماؤں میں تھے، ۲۳/اکتوبر ۱۹۵۱ء کو ایک خط اس بابت لکھا کہ آئندہ ہونے والے جنرل الیکشن کیلئے مولانا عبداللطیف نعمانی کو ٹکٹ دیدیا جائے، وہ خط بعینہٖ ملاحظہ ہو:

"مئو۔۔۔اعظم گڈھ

۲۳/اکتوبر ۱۹۵۱ء

محترم جناب مولانا حفظ الرحمٰن صاحب زید مجدکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

غالباً جناب کو معلوم ہوگا کہ مئو کے حلقہ سے مولوی عبداللطیف صاحب نے کانگریس کے ٹکٹ کے لئے درخواست دی ہے، اس حلقہ سے اور بھی درخواستیں ہوں گی، لیکن مجھ کو امید ہے کہ آپ مولوی عبداللطیف صاحب کی درخواست پر خاص توجہ مبذول فرمائیں گے، اور اس باب میں امکانی کوشش سے دریغ نہیں کریں گے، درخواستیں اب مرکز میں پہونچ چکی ہوں گی، اس لئے اس موقع پر یاددہانی مناسب معلوم ہوئی،

والسلام

حبیب الرحمٰن الاعظمی

۲۰/محرم ۱۳۷۱ھ"

علامہ اعظمی نے مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کے پاس یہ خط لکھا اور یہ سوچا بھی نہیں کہ ع

زمانہ چال قیامت کی چل گیا

یہ بات ان کے وہم وگمان میں بھی نہ تھی کہ دلی کے سیاسی پنڈت حلقۂ مئو کی ناؤ کو پار لگانے کیلئے ان کے اپنے نام کی مالا جپ رہے ہیں، وہاں جو کچھ فیصلہ ہوا وہ خود ان کے اور

دوسروں کیلئے غیر متوقع اور متحیر کن تھا، کانگریس کے ٹکٹ کے اس وقت جتنے امیدوار تھے، سب کی جیت کانگریس ہائی کمان کو موہوم سی نظر آرہی تھی، اور جو نام پارٹی کیلئے تقریباً یقینی جیت کا ضامن بن سکتا اس کا سیاست سے کوئی عملاً تعلق ہی نہیں تھا، بہرحال کانگریس کے مرکزی پارلیمنٹری بورڈ نے پارٹی کے ٹکٹ کے لئے علامہ اعظمی کے نام کا انتخاب کیا، اور کانگریس کے اعلیٰ عہدیداروں نے علامہ اعظمی کو آمادہ کرنے کے لئے الگو رائے شاستری کو بطور خاص مئو بھیجا، ہر چند کہ آپ اس نامزدگی سے مسلسل انکار اور اس سے بیزاری کا اظہار کرتے رہے، لیکن آپ کی ایک نہ چلی اور بجبر واکراہ آپ کے نام سے پرچہ داخل کر دیا گیا۔

یہ بات بطور خاص قابل ذکر ہے کہ پوری انتخابی مہم کے دوران علامہ اعظمی نے الیکشن سے متعلق کسی بھی معاملے میں کوئی حصہ نہیں لیا، نہ جلوسوں اور جلسہ گاہوں میں گئے، نہ تقریروں اور اسپیچوں میں شرکت کی اور نہ ہی کنویسنگ (Canvassing) کی غرض سے کسی کے دروازے یا گھر پہ گئے، گھر کے ایک کونے میں بیٹھے پوری خاموشی سے اس تماشائے رستاخیز کو دیکھتے رہے، چونکہ آپ سیاسی آدمی تھے نہ سیاست آپ کا میدان، قومی مفاد اور ملی ہمدردی کے جذبوں کے تحت گاہے ماہے جمعیۃ علماء ہند وغیرہ کے جلسوں میں شریک ہو جایا کرتے تھے لیکن طبعی اور عملی طور پر وہ سیاست سے دور، کوسوں دور تھے۔ سیاست سے دوری اور خالص علمی طبیعت، انتخابی مہم سے یکسر لا تعلق کئے ہوئے تھی، اور لوگوں کے ہزار اصرار کے باوجود کسی قسم کی بھی شرکت کے لئے وہ خود کو آمادہ نہ کر سکے، اس موقع کی پوری تفصیل علامہ اعظمی نے اپنے شاگرد مفتی محمد ظفیر الدین مفتاحی کو ۲۱ر فروری ۱۹۵۲ء کے ایک خط میں یوں لکھی:

"عزیزم سلمہ اللہ!

سلام مسنون۔ بحمدہ تعالیٰ بخیریت ہوں، اس دفعہ جواب میں تاخیر

قصداً ہوئی۔ دو ماہ سے سخت الجھن میں تھا، حادثہ یہ پیش آیا کہ میرے طلب یا خواہش بلکہ وہم وگمان کے بغیر مرکزی پارلیمنٹری بورڈ نے مجھے کانگریس کی طرف سے اسمبلی کا امیدوار نامزد کردیا، اور میری ہر طرح کی بیزاری وکنارہ کشی کے باوجود امیدوار رہنا پڑا اور ہر چند کہ میں اس کام کے لئے نہ ایک قدم چلا، نہ کسی سے اس کیلیئے ایک لفظ کہا، پھر بھی زبردستی کانگریسی امیدوار کی حیثیت سے نو دوسرے امیدواروں کے مقابلہ میں کھڑا رکھا گیا، پرسوں خدا خدا کرکے ۰۰۰ ۶ ہزار ووٹوں کی اکثریت سے میری کامیابی کی خبر مجھ کو سنائی گئی، اس بات کی خوشی تو ضرور ہے کہ ناکامی کی رسوائی سے اللہ تعالیٰ نے بچالیا، لیکن ممبری کا سودا نہ پہلے تھا، نہ اس کامیابی کے بعد ہی اس سے کوئی انس ہے، خدا ہی کو بہتر معلوم ہے کہ آگے کیا ہوگا، انتظار تھا کہ نتیجہ معلوم ہوجائے تو پورا قصہ ایک دفعہ سنادیا جائے، میں نے اس سلسلہ میں پہلی بار آج صرف تین جگہ دوستوں کو خط لکھا ہے، سید صاحب کو باوجودیکہ ادھر میں نے دو خط لکھے، لیکن واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بھی شرم محسوس ہوئی(۱)، باوجودیکہ پوری داستان معلوم ہونے کے بعد میرا کوئی عمل دخل اس کاروبار میں ثابت نہیں ہوتا، پھر بھی میں اس چیز کے فکر سے شرمندگی محسوس کرتا ہوں،

والسلام

حبیب الرحمٰن الاعظمی"

دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کی رکنیت دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کی

(۱) علامہ سید سلیمان ندویؒ کو جب علامہ اعظمی کی یوپی اسمبلی کی رکنیت کی اطلاع ملی تو انھوں نے ۱۱ر فروری ۱۹۵۳ء کو کراچی سے تبریک وتہنیت کے ایک خط میں لکھا: "۰۰۰ سب سے پہلے تو آپ کو دعائے ربنا آتنا فی الدنیا حسنة وفی الآخرة حسنة کی مقبولیت پر مبارکباد دینی ہے کہ ماشاءاللہ حج وزیارت سے بھی فراغت ملی اور یوپی اسمبلی کی رکنیت سے بھی سرفرازی ہوئی، [illegible] ۰۰۰"

رکنیت ایک اہم منصب اور قابل قدر اعزاز تھا، اب سے پہلے یہ اعزاز اسی کو بخشا جاتا تھا جو دور اندیشی، فراست و بصیرت اور اصابت رائے کے علاوہ علم و عمل کے لحاظ سے بھی امتیاز و تفوق کا حامل ہوتا تھا، دارالعلوم کا نظام شروع سے ہی شورائی رہا ہے، جس کے اصول قاسم العلوم والخیرات حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور دیگر بانیان دارالعلوم نے وضع کئے تھے، اور جس کی رکنیت کا شرف ہر دور میں اکابر علماء ہند کو حاصل رہا ہے۔ ۱۳۷۱ھ (۱) میں علامہ اعظمیؒ کا بھی اس منصب کیلئے انتخاب عمل میں آیا، اور تادم واپسیں یہ رکنیت برقرار رہی۔

مدرسہ عالیہ کلکتہ کے لئے مولانا سعید احمد اکبر آبادی کی کوشش

کلکتہ کے مدرسہ عالیہ کا شمار علوم عربیہ اور اسلامی علوم وفنون کی تعلیم دینے والے ملک کے نہایت اہم اداروں میں ہوتا ہے، یہ ادارہ ایک جامعہ کی حیثیت رکھتا ہے، اور گذشتہ زمانے میں اس میں تدریس اور اس کی لیکچر رشپ اہم اعزاز سمجھا جاتا تھا، اور یہی وجہ ہے کہ ملک کی بعض گرانقدر اور مؤقر علمی شخصیتیں اس میں تدریس و تعلیم کی خدمت انجام دے چکی ہیں ۱۹۵۲ء میں وہاں پروفیسر حدیث و تفسیر (ہیڈ مولانا) کی ایک جگہ خالی ہوئی اس وقت مولانا سعید احمد اکبر آبادی (۲) اس مدرسہ کے پرنسپل تھے، اس خالی شدہ جگہ

(۱) علامہ اعظمیؒ نے اپنے کاغذات میں کہیں کہیں زندگی کے بعض واقعات کی طرف اشارہ کیا ہے، چنانچہ ایک کاغذ پر دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کی رکنیت کا سال آپ نے ۱۳۷۱ھ لکھا ہے، لیکن تاریخ دارالعلوم دیوبند (۲/۱۲۶) میں ۱۳۷۳ھ مذکور ہے۔

(۲) مولانا سعید احمد اکبر آبادی تقریباً ۱۳۲۵ھ م ۱۹۰۷ء میں آگرہ میں پیدا ہوئے، آبائی وطن بچھرایوں ضلع مراد آباد تھا، لیکن پیدائش اور نشو ونما آگرہ میں ہوئی اس لئے اکبر آبادی کی نسبت سے مشہور ہوئے، ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی، بعد ازاں مدرسہ شاہی مراد آباد میں داخل ہوگئے، آخر میں دارالعلوم دیوبند سے سند فراغ حاصل کی، فراغت کے بعد اورینٹل کالج لاہور سے =

کا اشتہار ملک کے اہم اردو اور انگریزی اخباروں میں شائع ہوا، لیکن مولانا اکبر آبادی اس سے واقف تھے کہ کون سی شخصیت اس جگہ کی زینت اور قدر و منزلت میں اضافہ کا سبب بن سکتی ہے، چنانچہ انھوں نے اس کے لئے علامہ اعظمی کے پاس ۲۱ر مئی ۱۹۵۲ء کو ایک خط لکھا، جس کا کچھ حصہ حسب ذیل ہے:

"اب ضروری بات یہ ہے کہ مدرسۂ عالیہ میں پروفیسر حدیث و تفسیر یعنی ہیڈ مولانا کی جگہ جس پر مولانا عبدالحلیم صاحب صدیقی کام کر رہے تھے، خالی ہوئی ہے دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا جناب والا اس کو قبول فرما سکتے ہیں؟ اگر ایسا ہو سکے تو میرے لئے اس سے زیادہ خوشی کی کوئی اور بات نہیں ہو سکتی! اگر آپ اس کو قبول فرمانے پر آمادہ ہوں تو پھر یہ تحریر فرمائیں کہ اس سلسلہ میں آپ کی طرف سے

= مولوی فاضل کا امتحان پاس کیا، اس کے بعد درس و تدریس کا آغاز کیا اور جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں مدرس مقرر ہوئے، دو سال کے بعد دہلی چلے گئے اور مدرسہ عالیہ فتحپوری میں السنۂ شرقیہ کے استاذ مقرر ہوئے، اسی زمانہ میں دہلی کے سینٹ اسٹیفن کالج سے ایم اے کیا اور پھر اسی کالج میں لیکچرار ہو گئے ۱۳۶۸ھ م ۱۹۴۸ء میں مدرسہ عالیہ کلکتہ کے پرنسپل منتخب ہوئے، ۱۳۷۸ھ م ۱۹۵۸ء میں علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ دینیات (فیکلٹی آف تھیالوجی) کے ڈین مقرر ہوئے، دارالعلوم دیوبند سے ان کا بڑا گہرا تعلق تھا، جس کی مجلس شوریٰ کے وہ ممبر بھی تھے، ۱۴۰۲ھ میں جب دارالعلوم میں شیخ الہند اکیڈمی قائم ہوئی تو وہ اس کے صدر منتخب ہوئے، اس کے علاوہ ۱۳۵۷ھ م ۱۹۳۸ء سے ندوۃ المصنفین دہلی سے شائع ہونے والے بلند پایہ علمی ماہنامہ "برہان" کے تادم مرگ مدیر رہے، علی گڈھ کے زمانۂ قیام میں کناڈا کی شہرۂ آفاق میک گل یونیورسٹی میں وزیٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے بھی جا چکے تھے، اور دنیا کے بہت سارے ممالک کے دورے بھی کئے، مولانا بڑے صاحب علم و فضل اور باکمال شخص تھے، تصنیف و تالیف اور بحث و تحقیق میں ان کو ملکہ حاصل تھا، انھوں نے کئی ایک بلند پایہ اور محققانہ کتابیں تصنیف فرمائیں، جو بحث و تحقیق کا شاہکار ہیں، علامہ اعظمی کے علم و فضل کے بڑے قائل تھے، ان کے علم و تحقیق پر اعتماد کرتے تھے اور مشکل مسائل میں ان کی طرف رجوع کرتے تھے، علاج و معالجہ کی غرض سے پاکستان گئے ہوئے تھے کہ وہیں ۲۴ر رمضان المبارک ۱۴۰۵ھ مطابق ۱۹۸۵ء کو سفر آخرت پر روانہ ہو گئے۔

شرائط کیا ہوں گی! اور آپ کے ایم ایل اے ہونے کا کیا ہوگا، ایک سرکاری افسر تو ایم ایل اے نہیں ہو سکتا۔

کلکتہ میں آپ کو اپنے علمی مشاغل میں یکسوئی کے ساتھ مصروف رہنے کا کافی موقع ملے گا۔

امید ہے کہ جواب باصواب سے جلد مطلع فرمائیں گے۔"

مولانا اکبر آبادی کا یہ خط پرنسپل کلکتہ مدرسہ کے لیٹر پیڈ پر دہلی سے لکھا گیا ہے، اس خط کے پانے کے بعد علامہ اعظمیؒ نے غالباً گریڈ اور اس سے حاصل شدہ سہولیات کی نسبت دریافت فرمایا ہوگا، تو اس کے جواب میں مولانا اکبر آبادیؒ نے ایک دوسرا خط ۱۷ر جون ۱۹۵۲ء کو مراد آباد سے لکھا، جس میں درج ذیل تفصیلات تحریر فرمائیں:

"اس پوسٹ کا اعلان گورنمنٹ مغربی بنگال کی طرف سے انگریزی اور اردو کے اخبارات میں حال ہی میں ہو چکا ہے، الجمعیۃ، مدینہ اور قومی آواز میں غالباً آپ کی نظر سے بھی گذرا ہو، اب آپ کے مستفسرہ امور کی نسبت عرض کرتا ہوں۔

۱۔ گریڈ اگرچہ ڈھائی سو سے شروع ہوتا اور سات سو پچاس تک جاتا ہے، لیکن آپ جیسے حضرات کو خاص گریڈ بھی دیا جا سکتا ہے، یعنی آغاز میں تین سو یا ساڑھے تین سو سے ہو سکتا ہے، مہنگائی وغیرہ الاؤنس مل کر ۵۰۰ روپیہ کے قریب پڑیں گے۔

۲۔ بہتر یہ ہے کہ آپ معاملہ ... تین سال کیلئے یا پانچ سال کیلئے اس میں آپ کو سہولت ہے ورنہ اگر آپ چاہیں تو معاملہ باقاعدہ بھی ہو سکتا ہے۔

۳۔ یہ جگہ پروفیسر حدیث و تفسیر کی ہے، گزیٹڈ آفیسر کی پوسٹ ہے، آپ ہیڈ مولوی بھی ہوں گے یعنی صدر الاساتذہ۔ کلکتہ مدرسہ کے دو شعبے ہیں ایک ہائی اسکول، اور دوسرا عربی ڈیپارٹمنٹ، ہائی اسکول کا ہیڈ، ہیڈ ماسٹر ہوتا ہے اور

عربی ڈیپارٹمنٹ جو کالج کی حیثیت رکھتا ہے اس کا ہیڈ ہیڈ مولوی ہوتا ہے اور پرنسپل ان دونوں کا افسر اعلیٰ ہوتا ہے، ہیڈ مولوی بالفاظ دیگر وائس پرنسپل بھی ہوتا ہے۔"

پھر دو اور جزئیات لکھنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں:

"میرا خیال ہے کہ یہ پوسٹ آپ کے مذاق کے مطابق ہوگی، مدرسہ عالیہ کلکتہ ایک تاریخی ادارہ ہے اور اس کا مستقبل بہت شاندار ہے، اگر مدرسہ آپ کی خدمات حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تو مدرسہ کی خوش قسمتی ہوگی اور آپ بھی بے کیف نہیں ہوں گے۔ اوقات مدرسہ کے بعد آپ کو تحقیق و مطالعہ کیلئے کافی موقع ملے گا۔ اگر آپ اس کے لئے آمادہ ہوں تو از راہ کرم "مسٹر اے پی۔ نیوگی ڈپٹی سکریٹری وزارت تعلیم" گورنمنٹ مغربی بنگال، کلکتہ کے نام فوراً درخواست بھیج دیجئے، رسمی طور پر ایسا کرنا ضروری ہے، باقی معاملات تو میں خود دیکھ لوں گا۔"

بعض اور خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی طرف علامہ اعظمی کا کچھ رجحان تھا، لیکن اس کے باوجود آپ نے اس پیشکش کو قبول نہیں کیا، جس کے بعد ۱۳ر مئی ۱۹۵۵ء کو مولانا اکبر آبادی نے ایک خط میں لکھا: "محض یہی جذبہ تھا جس کی وجہ سے میں ڈرتے ڈرتے اپنی خواہش کا اظہار کیا تھا ورنہ میں جانتا تھا کہ آپ کا اس کو قبول کرنا آسان نہیں ہے۔"

دوسرا سفر حج | یہ سفر دو سال بعد ۱۳۷۱ھ مطابق ۱۹۵۲ء میں ہوا، اس میں بھی مولانا عبدالجبار صاحب ہمراہ تھے، کاغذ کے ایک ٹکڑے پر لکھا ہے:

"احقر نے پہلا حج ۱۳۶۹ھ میں، اور دوسرا ۱۳۷۱ھ میں کیا، ان دونوں سفروں میں مولوی عبدالجبار سلمہ ساتھ تھے۔"

اس سفر میں بمبئی پہنچنے سے ایک روز پہلے ۱۰ر اگست بروز یکشنبہ اخبار جمہوریت میں اس سال پھر یہ خبر شائع ہوئی۔

"اسلامی ہند کے جلیل القدر عالم اور محدث حضرت مولانا الحاج مفتی حبیب الرحمٰن صاحب ایم ایل اے (مئو اعظم گڈھ) ۱۰ر اگست بروز اتوار بمبئی تشریف لا رہے ہیں۔ آپ مغل سرائے بمبئی اکسپریس (الہ آباد اکسپریس) سے

۴ ر بجے صبح بمبئی پہونچیں گے اور جناب محترم اے اے شیخ انجینئر کے مکان ڈنکن روڈ پر قیام فرماہوں گے۔ مولانا موصوف اس دور کے صف اول کے علماء میں شمار ہوتے ہیں اور اسلامی فقہ کے رموز واسرار پر خاص دستگاہ رکھتے ہیں۔"

اس سفر کی خاص بات یہ ہے کہ اس کی روداد ایک روزنامچہ کی صورت میں آپ نے قلمبند کی ہے، اگرچہ اس میں روانگی سے لے کر ارکان ومناسک کی ادائگی تک تمام تفصیل آگئی ہے، مگر پھر بھی یہ نامکمل ہے، باوجودیکہ یہ داستان بہت طویل ہے، لیکن کافی دلچسپ ہے، اس لئے پورا روزنامچہ انھیں کے الفاظ میں نقل کرتا ہوں:

"۱۷۔ ذی قعدہ ۱۳۷۱ھ مطابق ۹/ اگست ۱۹۵۲ء کو مولوی عبدالجبار صاحب مئوی کو ساتھ لے کر ۱۱ ر بجے رات کو گھر سے بلا اطلاع نکلا اور رات کے ڈھائی بجے کی ٹرین سے بنارس اور بنارس سے ۶ ر بجے صبح کو مغل سرائے اور وہاں سے ۹ ر بجے بمبئی میل پر سوار ہو کر بمبئی روانہ ہوا، اور ۱۱/ اگست (مطابق ۱۹/ ذی قعدہ) کو ۲ بجے دن میں بمبئی پہونچا۔ اسٹیشن سے سیدھا اپنے مخلص کرم فرما جناب شیخ سعید صاحب انجینئر کے مکان پر پہونچا اور ۲۲/ ذی قعدہ تک ہم دونوں وہیں مقیم رہے، انجینئر صاحب کے یہاں پہونچ کر کھانا کھایا اور کچھ دیر ستائے اس کے بعد مئو کے حجاج سے ملنے کیلئے مسافر خانہ آئے، دوسرے دن ٹکٹ لینے پھر مسافر خانہ جانا ہوا، چیچک اور کالرا کے انجکشن کے سرٹیفکٹ حاصل کئے بغیر چونکہ ٹکٹ نہیں ملتا، اس لئے ہم نے دونوں سرٹیفکٹ مئو سے لے لئے تھے، مگر چیچک کا نشان بمبئی کے ڈاکٹر کو مشکوک معلوم ہوا اس لئے اس نے دوبارہ ٹیکہ لگایا، اور سرٹیفکٹ پر تصدیق کرکے سرٹیفکٹ دیدیا۔ اب ۳ر سال سے حجاج کو اپنے پاسپورٹ پر اپنا فوٹو چسپاں کرنا حکومت کی طرف سے لازم قرار دیا گیا ہے، اس کے بغیر پاسپورٹ نہیں مل سکتا اسلئے مجبوراً فوٹو بھی کھنچوایا اس کے بعد پاسپورٹ ملنے میں کوئی دشواری بھی نہیں، چنانچہ وہ بآسانی مل گیا، ہاں مئو کے بعض حجاج کا

پاسپورٹ حاصل کرنے میں بڑی زحمت پیش آئی، اس لئے کہ ان کے پاس چیچک کے ٹیکہ اور کالرا کے انجکشن لینے کے سرٹیفکٹ نہیں تھے اور قانون کے مطابق کالرا کے دوا انجکشن اس طرح لینے چاہئیں کہ ایک ہفتہ کے بعد دوسرا لیا جائے اور اس کو بھی ایک ہفتہ ہو جائے تب جہاز پر سوار ہونے کی اجازت ہوگی، ایسا کرنے سے وہ حاجی صاحب ساتھ نہیں جاسکتے تھے، اور بمبئی میں ساتھیوں سے چھوٹ جانے کے بعد ۱۵ر دن کا قیام ان کیلئے کم مصیبت نہ تھا، بہر حال کسی طرح خدا خدا کر کے ان کا پاسپورٹ بن گیا اور ہم لوگوں کے ساتھ وہ بھی رذانہ ہوگئے، اس سال مئو سے حاجی سلطان (قاسم پورہ) حاجی ولی محمد خیاط (پٹھان ٹولہ) حاجی محمد سلیم کوٹھا (قاسم پورہ) وغیرہ ہم سے ہفتہ عشرہ پہلے اور کوپا گنج سے مولوی اسلام الحق صاحب اور عبدالسلام خان بھی ہم سے کئی دن پہلے بارادۂ حج بمبئی پہونچ چکے تھے، مگر جہاز میں ہم سب ایک ساتھ روانہ ہوئے۔

اسی سال رمضان سے پہلے حاجی محمد شفیع (جہانگیر) مئوی اور حاجی عبدالحکیم مئوی مکہ معظمہ پہونچ چکے تھے، اور شوال میں حافظ محمد یوسف (پہاڑ پورہ مئو) مکہ معظمہ پہونچے تھے، چونکہ یہ تینوں صاحب حج سے پہلے مدینہ کی زیارت سے فارغ ہو چکے تھے اس لئے بعد حج بہت جلد وطن واپس ہوگئے، ایام حج میں مکہ، منیٰ، عرفات وغیرہ میں یہ لوگ بھی ہم لوگوں کے ساتھ تھے، وطنی ہونے کے علاوہ ساتھ ہونے کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ ہم سب کا معلم ایک تھا، یعنی حسن اکبر، اور ہم سب معلم کے ایک ہی مکان واقع صفا میں ٹھہرے بھی تھے، یہ مکان اس لحاظ سے بہت اچھا تھا کہ حرم اور ہمارے مکان کے درمیان صرف سڑک حائل تھی۔

۱۴ر اگست ۱۹۵۲ء مطابق ۲۲ر ذی قعدہ ۱۳۷۱ھ، آج سوا پانچ بجے شام کو ایس ایس اسلامی نے جس پر ہم سوار تھے ساحل بمبئی کو خیر باد کہا، ۱۰ر بجے دن میں نوجوان صالح ولی عمر بھروچہ اپنی کار شیخ صاحب کے مکان پر لائے، اور

وہاں سے مجھ کو اور مولوی عبدالجبار و مولوی اسحاق بنارسی کو اس میں بٹھا کر گودی پہونچا دیا، گودی میں مالیگاؤں کے عبدالرزاق سیٹھ، ماسٹر عبدالرحمٰن، مولوی الیاس صاحب اور ان کے بھائی وکیل صاحب کے علاوہ مولوی عبدالستار معروفی وغیرہ سے دیر تک ملاقات اور بات چیت رہی، جہاز میں شیخ صاحب، حکیم اعظمی، حاجی تجمل حسین، مولانا منظور نعمانی، حامد میاں غازی انصاری ایڈیٹر جمہوریت اور طاہر انصاری وغیرہ حضرات ملنے آئے۔ اس جہاز سے مولانا مہدی حسن صاحب مفتی دارالعلوم دیوبند، مولانا نقی صاحب مالیگاؤں، مولانا اختر حسین صاحب خلف رشید حضرت میاں صاحب مولانا اصغر حسین دیوبندی، سید عبدالرب صاحب صوفی ایم اے وابستہ دامن حضرت تھانوی، خان بہادر محمد احمد صاحب ریٹائرڈ کلکٹر (رائے بریلی) اور حکیم شریف الدین صاحب بقائی (دہلی) بھی سفر کر رہے ہیں، میرے کیبن میں پختونستان تحریک کے علمبردار مولوی محمد اکبر خانصاحب پشاوری دوسری سیٹ پر تشریف فرما ہیں، گورے چٹے نوجوان جوشیلے پٹھان ہیں، مفتی صاحب سے خط و کتابت کا سلسلہ تو مدتوں پہلے سے جاری تھا، لیکن ملاقات کی نوبت آج بعد مغرب آئی جب کہ ان کے صاحبزادے محمد میاں نے ان کو بتایا کہ یہ حقیر ان کے قریب ہی بیٹھا ہوا ہے، یہ سن کر مفتی صاحب اٹھے اور بڑے تپاک سے آکر ملے پھر بڑی دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔

۱۵/ اگست ۱۹۵۲ء مطابق ۲۳/ ذی قعدہ ۱۳۷۱ھ آج صبح کو بہت دیر تک صوفی عبدالرب صاحب سے باتیں ہوئیں، ان کو میری طرف سے کچھ بے رخی کا احساس ہوا تھا، جو بحمداللہ زائل ہو گیا، ان سے گفتگو ہی کے دوران میں مولوی محمد ہاشم فرنگی محلی خلف الرشید مولوی صبغۃ اللہ شہید سے تعارف ہوا، ان کو اس جہاز کے امیر الحج نے اپنا نائب مقرر کیا ہے۔ آج تمام جہاز میں سناٹا چھایا ہوا ہے، لوگ کہتے ہیں روپیہ میں چودہ آنے لوگ دوران سر، متلی اور چکر میں مبتلا ہیں جو جہاں پڑا

ہے، پڑا ہے، چند ہی آدمی چل پھر رہے ہیں، کل بعد مغرب میں، مولوی عبدالجبار اور حاجی ولی محمد کیبن کے باہر بینچ میں بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے، عشاء سے پہلے میں نے حاجی ولی محمد سے کہا کہ تم اپنا اور مولوی عبدالجبار کا کمبل تکیہ نیچے سے یہاں لیتے آؤ اور یہیں سوؤ، کھانا بھی میرے ساتھ کھالینا، بیچارے نیچے گئے تو لوٹے ہی نہیں، صبح کو جب حاجی سلطان آئے تو معلوم ہوا کہ حاجی ولی محمد سامان لے کر آہی رہے تھے کہ ان کو چکر آنے شروع ہو گئے اور وہ اور باقی تمام لوگ مولوی اسلام الحق صاحب کوپا گنجی، عبدالسلام خاں، حاجی محمد سلیم دلال، حاجی سلامت اللہ اور ساتھ کی تینوں عورتیں سب اسی حالت میں ہیں، سارے کے سارے پڑے ہوئے ہیں، کسی سے سر نہیں اٹھایا جاتا۔ ہم لوگ بحمد اللہ اس حال میں تو نہیں ہیں، مگر طبیعت بے حد بدمزہ اور کھانے سے متنفر ہے، میں نے دن میں کھانا بالکل نہیں کھایا، رات میں بھی فاقہ ہی رہا۔ مولوی عبدالجبار کی بھی یہی حالت ہے، میں نے آج رات بینچ میں کاٹی، کیبن میں گرمی تھی، مفتی صاحب بھی باہر لیٹے تھے، مفتی صاحب پر بہت کم اثر ہے، صوفی عبدالرب صاحب بالکل چہ غم ہیں، مولوی نقی بہت متاثر ہیں، حاجی سلطان پر کوئی اثر نہیں ہے۔

آج جمعہ تھا جہاز میں جمعہ نہیں ہوتا، ظہر کی نماز کے وقت جب مولوی ہاشم نے اوقات نماز کا اعلان کیا تو ایک صاحب بڑی برہمی سے بولے کہ امیر الحج متشرع نہیں ہے، اور حج کمیٹی کو انتخاب امیر کا کوئی حق نہیں، ہم خود امیر منتخب کریں گے، مولوی ہاشم صاحب میرے پاس بھاگے ہوئے آئے کہ جلدی وہاں پہونچئے اور ہنگامہ فرو کرائیے، میں فوراً گیا تو دیکھا کہ صوفی عبدالرب صاحب کھڑے ہو چکے ہیں، بحمد اللہ ان کی تقریر سے ہنگامہ فرو ہو گیا اور ان صاحب نے اعلان کر دیا کہ میں نے اپنی تحریک واپس لی، اس کے بعد صوفی صاحب نے میرا تعارف کرایا اور امامت کیلئے اصرار کیا، مگر میں نے خود ان کو امامت پر مجبور کیا۔

۱۶/ اگست ۱۹۵۲ء م ۲۴/ ذی قعدہ ۱۳۷۱ھ آج پریشانی کل سے زیادہ ہے، میں اور میرے رفیق مولوی عبدالجبار دن بھر کیبن سے باہر نہیں نکلے، نماز بھی کیبن ہی میں پڑھتے ہیں، نیچے کے رفقائے وطن کا حال بالکل ویسا ہی ہے، حاجی ولی محمد جب سے پڑے ہیں اب تک اٹھے نہیں، حاجی سلطان چند بار اوپر آئے۔

۱۷/ اگست ۱۹۵۲ء م ۲۵/ ذی قعدہ ۱۳۷۱ھ یوم یکشنبہ، آج مفتی صاحب میری عیادت کو آئے اور بہت دیر تک بیٹھے رہے، میرے کیبن میں مولوی اکبر خاں بھی بہت متاثر ہیں اور چل پھر نہیں سکتے، دریا میں تلاطم بہت زیادہ ہے، ہوا بھی تیز ہے، جہاز فٹ بال بنا ہوا ہے۔ اس جہاز کا انتظام محمدی سے خراب ہے، ہماری غذا بالکل بند ہے، آج ایک ابلا ہوا انڈا میں نے اور ایک مولوی عبدالجبار نے کھایا، پان کب چھوٹنے والا ہے مگر مزہ اس میں بھی نہیں آتا، قبض کی شکایت ہے ایک دن کے ناغے سے اجابت ہوتی ہے اور بہت خشک۔

۱۸/ اگست م ۲۶/ ذی قعدہ، آج میں خود ذرا دیر کیلئے مفتی صاحب کے کیبن میں جو بالکل متصل ہے گیا اور وہاں لیٹا بیٹھا رہا، مفتی صاحب نے نمکین بسکٹ، چٹنی اور کافی سے تواضع کی، میرا جی بہلانے کیلئے دارالعلوم دیوبند کے دفتر محاسبی کے ایک ملازم کے کئی دلچسپ قصے سنائے، نماز مغرب کے وقت وہاں سے اپنے کمرہ مین آیا۔ آج کئی دنوں کے بعد ہم دونوں نے کھچڑی کھائی جو فرمائش دیکر بالکل سادی پکوائی گئی تھی، اس وقت جو بدمزگی ہے اس میں سوائے سرخ مرچوں کے اچار کے اور کوئی ترکاری یا سالن یا دال مرغوب نہیں ہے، تلاطم شاید دن بدن بڑھتا ہی جارہا ہے، درمیان میں کسی منزل کا نشان ہی نہیں ملتا، جی بالکل ڈوب گیا ہے، جہاز ۲۴/ گھنٹے میں زیادہ سے زیادہ ۱۸۶ میل کی رفتار سے چلتا ہے، میں جب سے کیبن میں آیا ہوں یعنی ۱۶/ سے اب تک سوائے قضائے حاجت کے باہر نہیں نکلا۔ بس آج تھوڑی دیر کیلئے مفتی صاحب کے پاس گیا ہوں۔

۱۹/ اگست ۱۹۵۲ء م ۲۷ ذی قعدہ ۱۳۷۱ھ سہ شنبہ، آج بھی ہوا اور تلاطم کا وہی حال ہے، آج میں ذرا دیر کیلئے جہاز کے اس حصہ تک گیا جس کو مسجد بنا رکھا گیا ہے، وہاں صوفی عبدالرب بستر ڈالے ہوئے تھے، کئی دنوں کے بعد آج ان سے ملاقات ہوئی، میری صورت دیکھ کر اور حال معلوم کر کے نھوں نے بڑی معذرت کی اور نہ ملنے کا افسوس ظاہر کیا اور ملتے رہنے کا عہد کیا، چنانچہ وہاں سے اٹھنے کے بعد جلد ہی میرے کمرہ میں آئے، اور بہت دیر تک باتیں کرتے رہے۔ کچھ دیر کے بعد خان بہادر صاحب بھی تشریف لائے، عیادت نہ کر سکنے کی معذرت پیش کی۔ آج مفتی صاحب بھی میرے دیکھنے کو آئے اور دیر تک بیٹھے رہے، ان کی موجودگی ہی میں پروفیسر عبدالمنان صاحب بیدل پٹنہ اور صالح سنبل صاحب ملنے آئے، بیدل صاحب بہت دیر تک گفتگو فرماتے رہے اور انھوں نے تفصیل سے اپنی اس خط و کتابت کا حال سنایا جو وہ مسلسل کئی سال سے حجاج کی آسانیوں کیلئے گورنمنٹ آف انڈیا وغیرہ سے کر رہے ہیں، آج صوفی صاحب کئی بار تشریف لائے، بعض مسائل بھی دریافت کئے، رات میں خان بہادر صاحب نے ایک تکیہ استعمال کرنے کو دی اور اس کیلئے خود ہی انھوں نے زحمت فرمائی، جزاہ اللہ خیراً، خان بہادر صاحب بانس بریلی کے باشندہ ہیں، اور اس وقت مولانا وصی اللہ صاحب فتحپوری سے بیعت ہو گئے ہیں، اور اس جہاز میں اپنی اہلیہ کے ساتھ عازم حج ہیں، صوفی صاحب کو بھی وہی لئے جا رہے ہیں۔ آج بارہ بجے تک جہاز نے ۹۴۹ میل کی مسافت طے کی۔

۲۰/ اگست م ۲۸ ذی قعدہ، آج بارہ بجے تک ہم بمبئی سے ۱۱۷۵ میل دور نکل آئے، اب جہاز کی رفتار تیز کر دی گئی ہے، خیال کیا جاتا ہے کہ رفتار اور تیز ہو گی۔ اور امید ہے کہ جہاز انشاء اللہ ۲۴/ اگست کی صبح تک جدہ پہونچ جائے گا۔ آج مفتی صاحب پھر تشریف لائے اور کئی گھنٹے بیٹھے رہے، مولوی تقی صاحب

بھی بعض مسائل میں گفتگو کرنے کیلئے آگئے، بعض مسائل میں ان سے اور مفتی صاحب سے کچھ نوک جھونک بھی ہوئی، مجھ سے انھوں نے حضرت عمرؓ کے اس اثر کا حوالہ پوچھا جس سے غیر مقلدین تنفیذ طلاق ثلاث سے ان کا رجوع ثابت کرتے ہیں، میں نے عرض کیا کہ اس کو ابن القیم نے اغاثۃ اللھفان میں اسماعیلی کے حوالہ سے نقل کیا ہے جس کے ابتدائی الفاظ یہ ہیں: " ما ندمت علی شئی ندامتی علی ثلاث أن لا أکون حرمت الطلاق " میں نے عرض کیا ان الفاظ سے تنفیذ طلاق سے رجوع کیونکر ثابت ہوتا ہے، مفتی صاحب نے بھی میری تائید کی، اس کے بعد دوسرے مسائل پر گفتگو ہوتی رہی، جواب اذان وغیرہ کے بعد دعا میں مفتی صاحب رفع یدین کو جائز مانتے ہیں، مولوی نقی صاحب کو اس مین تردد ہے، میرا رجحان بھی جواز کی طرف ہے۔

مولوی نقی صاحب کے جانے کے بعد صوفی عبدالرب صاحب آگئے اور انھوں نے ایک تحریر پڑھ کر سنائی جو بعض حجاج کی خواہش پر انھوں نے لکھی تھی، اس میں افراد تمتع اور قران کے شروع سے اخیر تک کے اعمال کی تفصیل تھی سنانے سے ان کا مقصود اطمئنان حاصل کرنا تھا، مفتی صاحب نے بھی اس کو سنا، ان تمام مجالس میں مولوی عبدالجبار اور مولوی اکبر خاں بھی شریک تھے۔

شام کو بعد مغرب حیدر آباد کے ڈاکٹر عبدالغفار اور صفدر حسین صاحب وکیل اور امجد علی صاحب رامپوری تشریف لائے اور صحت کے بعد تقریر و وعظ کا وعدہ کرا گئے، ان کے جانے کے بعد کئی صاحب کاٹھیاواڑ کے مسائل پوچھنے آئے اور بہت سے مسائل پوچھ ڈالے۔

آج بعد عشاء خان بہادر وہ تکیہ پھر دے گئے، میں سو گیا تھا اس لئے مولوی عبدالجبار سلمہ کو دیکر چلے گئے۔ آج دریا میں سکون ہے، ہوا بھی نرم ہے، جہاز میں بھی حرکت بہت کم ہو گئی ہے، اب حجاج کو بھی سکون ہے، کچھ چہل پہل

پیدا ہو چلی ہے، ہم وطن حجاج جو ڈیک میں ہیں ان کے سکون کی خبر بھی حاجی سلطان لائے ہیں، وہ لوگ کچھ کھانے پینے لگے، آج ہم لوگوں نے بھی دال روٹی کھائی ہے، جہاز میں پانی بہت کھاری دیا جارہا ہے اس لئے لیمن پینے پر ہم مجبور ہیں۔

مفتی صاحب نے آج ہی احرام باندھ لیا ہے، حالانکہ میقات ابھی بہت دور ہے۔

۲۱/ اگست ۱۹۵۲ء م ۲۹/ ذی قعدہ ۱۳۷۱ھ، آج ۲۴ گھنٹوں میں جہاز نے ۲۹۱ میل کی مسافت طے کی، اب جدہ ۸۹۵ میل رہ گیا، آج رات کو ۳/ بجے کے قریب عدن کی محاذات سے جہاز گذرے گا، آج پہلے دن ولی محمد اوپر آئے اور میں بھی ان لوگوں کی قیامگاہ تک مولوی عبدالجبار کی معیت میں گیا اور دیر تک بیٹھا رہا، وہاں سب نے مل کر ناشتہ کیا، جہاز کی رفتار تیز ہونے کے باوجود بالکل تکلیف دہ نہیں ہے، دریا بالکل ساکن ہے، معلوم ہوتا ہے کہ ایک بہت بڑی تھالی رکھی ہوئی ہے، کل سے دردسر کی تکلیف ہے اگرچہ بہت شدید نہیں ہے، کسی کسی وقت زیادہ ہو جاتا ہے، مولوی تقی صاحب اور مفتی صاحب سے علمی مذاکرات رہتے ہیں، آج بھی مفتی صاحب دیر تک ہمارے کمرہ میں رہے، آج صوفی عبدالرب کو بخار ہو گیا ہے، کئی گھنٹے وہ میری سیٹ پر قابض رہے، اور میں ان کی جگہ پر مسجد میں لیٹا رہا، آج جہاز میں کافی چہل پہل ہے، مسافرین کی حالت اچھی ہے، نہانے دھونے میں مصروف ہیں، آج مولوی تقی صاحب نے بعد عصر اور مولوی عبدالجلیل آسامی ایم ایل اے نے بعد عشاء وعظ کہا، آج سے دریا میں دوسرے جہاز بھی نظر آرہے ہیں۔

۲۲/ اگست م ۳۰/ ذی قعدہ، آج جمعہ ہے، آج ۲۴/ گھنٹے میں ۲۹۶ میل مسافت طے ہوئی، تقریباً ساڑھے بارہ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے جہاز چل رہا ہے، اب جدہ ۵۹۹ میل رہ گیا ہے، امید ہے کہ پرسوں یکشنبہ کو ۱۰ بجے دن کے قریب

جدہ پہونچ جائے گا، آج دن نکلنے کے بعد سے ہر دو طرف ساحل نظر آنے لگے، پہاڑوں کی قطار دکھائی دیتی ہے، چڑیاں بھی بکثرت اڑتی نظر آتی ہیں، جہاز بھی بکثرت دکھائی پڑتے ہیں، آج بارہ بجے سے پہلے ہمارا جہاز میرے خیال میں باب المندب میں داخل ہو گیا اور اس وقت ہم مخایا حدیدہ کے سامنے چل رہے ہیں، گرمی بہت سخت ہو گئی ہے، قبلہ بھی بدل گیا ہے، کہتے ہیں کہ کل ٹمپریچر ۱۱۳ ہو جائے گا، آج بہت سے لوگوں نے احرام کے کپڑے پہن لئے، ہم لوگ انشاء اللہ کل صبح کو احرام باندھیں گے، آج ہم لوگ دوسری دفعہ ڈیک میں اپنے ہم وطنوں کی قیامگاہ تک گئے اور دیر تک باتیں کیں، آج صوفی عبدالرب کا بخار ہلکا ہے، مجھے فروٹ سالٹ کی تین خوراکوں کے بعد اجابت ہوئی، سدے معلوم ہوتے تھے، مفتی صاحب آج بھی ہمارے کمرے میں تادیر بیٹھے رہے، بعد ظہر بیچ میں تھوڑی دیر باتیں ہوئیں، آج ایک صاحب ہندوستانی لباس میں ملے اور ملتے ہی بولے۔ "أنت حبيب الرحمن"؟ میں نے کہا، "نعم"! اس کے بعد وہ لپٹ گئے اور لگے دعائیں دینے، میں نے کہا" من أنت؟" انھوں نے کہا" أنا رجل من العرب حضرمی ." میں نے کہا" حضرمی"؟ کہا" نعم" ! میں نے کہا" من أين تسافر " کہا" من حيدر آباد" میں نے کہا" أنت مقيم هناك" کہا" نعم" اس کے بعد دعا کیلئے کہا اور میری پیشانی اور ہاتھ چومے گردن پر بوسہ دیا اس کے بعد میں نے کہا" الى الملتقى ان شاء الله " آج حکیم شریف الدین صاحب اور مولوی ہاشم اور صوفی عبدالرب نے بعض مسائل پوچھے، وعظ کیلئے بہت اصرار ہے، مگر میری طبیعت بالکل موزوں نہیں ہے، یہ روزنامچہ بھی بادل ناخواستہ اور مولوی عبدالجبار صاحب کے اصرار سے لکھ رہا ہوں۔ آج مولوی محفوظ الرحمٰن (۱) کے دور کے ایک رشتہ دار شیخ نور محمد پارک سرکس کلکتہ سے ملاقات ہوئی۔

(۱) غالباً مولانا محفوظ الرحمٰن نامی مراد ہیں، جن کا تذکرہ تلامذہ کے ذیل میں آئے گا۔

۲۳/ اگست ۵۲ء، آج جہاز میں بہت چہل پہل ہے، سمندر میں ادھر ادھر مختلف جہاز نظر آرہے ہیں، لوگ خوش ہیں کہ کل ہمارا جہاز ساحل جدہ پر لنگرانداز ہوگا اور اس قید سے عنقریب رہائی ملے گی۔

۲۴/ اگست، آج ایک بجے دن کے بعد جہاز ساحل پر لنگرانداز ہوا، ہم لوگ مطمئن بیٹھے رہے اور عصر کے وقت جہاز سے اتر کر بس پر سوار ہوئے اور کسٹم پہونچے، حاجی سلطان وغیرہ پہلے پہونچ چکے تھے بعد میں ہم پہونچے، مولوی عبدالجبار نے جاکر سامان ڈھونڈھا، بمشکل تمام ایک سامان یہاں سے ایک وہاں سے ملا، سامان پہونچانے کا انتظام نہایت غلط اور سخت پریشان کن ہے، بعد مغرب پھر بس پر سوار ہوکر ہم مدینۃ الحجاج پہونچے اور وکیل معلم کی ہدایت کے مطابق (پسر سید حسن اکبر معلم) نے ہم کو اس کے ایک کمرہ میں پہونچادیا، اس میں بس اتنی جگہ تھی کہ ساتھ میں جو دو عورتیں ہیں ان کو ہم نے وہاں بٹھادیا اور خود باہر نکل کر وضو کیا، اور نماز مغرب سے فراغت حاصل کی، اب کھانے اور سونے کی فکر ہوئی۔ پہلے ایک کھانے کی دوکان پر پہونچے، دو پراٹھے اور دو ہاف پلیٹ شوربے اور گوشت لے کر بھوک کو کچھ تسکین دی گئی، ایک پراٹھہ نس (آدھے ریال) میں ملا ہے، تین روپے میں دو آدمیوں کا پیٹ نہیں بھرا۔

اس کے بعد اپنے کمرہ کے سامنے آئے تو معلوم ہوا کہ سامان والا ٹرک آکر سامان پھینک گیا ہے، بڑی دقتوں سے اپنا سامان تلاش کیا اور کچھ دیر اسی پر بیٹھے رہے، لیکن یہاں کم از کم پوری رات گذارنی ہے، اس لئے اس طرح کب تک بیٹھے رہیں، خیال ہوا کہ اندر جگہ تو نہیں، کوئی چیز بچھانے کی ہو تو اسی کو باہر بچھا کر آرام سے بیٹھیں، معلوم ہوا کہ کوئی چیز نہیں، مجبوراً میں نے چٹائی والی جانماز بچھائی اور اس پر بیٹھا، اس کے بعد حاجی سلطان نے اپنا بستر کھولا اور اس کا کور نکال کر بچھایا، سونے کا وقت آیا تو بھائی اسحاق انصاری علیگڈھی نے اپنا فولیو

لا کر بچھادیا، مگر اثنائے شب میں وہاں کی خنکی برداشت نہ کر سکا، اور دوسرے کمرہ میں بھائی اسحاق کے بستر پر جالیٹا، باقی رفقاء حاجی سلطان کے کور پر لیٹے، صبح کو بہت سویرے آنکھ کھلی، وضووغیرہ سے فارغ ہو کر بہت دیر تک انتظار کرنے کے بعد باجماعت نماز ادا کی، مولوی نقی صاحب نے پان کھلایا، گھنٹوں کے بعد چائے پی۔ جی چاہتا تھا کہ اسی وقت بس مل جاتا تو ٹھنڈے ٹھنڈے مکہ چلے جاتے، اس کے علاوہ یہاں دن بھر سایہ ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر یہاں وہاں بیٹھنے کی زحمت سے نجات مل جاتی، مگر دوپہر کے قریب تک کچھ خبر نہیں ملی۔ دوپہر کے قریب علی نے بتایا کہ تین بجے کے بعد موٹر آئے گا، ہم نے تین تک انتظار کیا مگر کیسا موٹر، آخر بار بار کے تقاضے کے بعد خدا خدا کر کے رات کے دس بجے موٹر آیا، اور ہم اس پر سوار ہو کر ایک بجے رات کے بعد مکہ معظمہ پہونچے اور صفا پر سید حسن اکبر کے مکان میں اسباب رکھا، چند منٹ سستانے کے بعد طواف کرنے چلے گئے، مگر اذان کا وقت قریب تھا اس لئے پانچ شوط کے بعد مطاف میں صفیں لگ گئیں اور طواف روکنا پڑا، بعد نماز اس کو پورا کر کے طبیعت کا اندازہ لگایا تو سعی کی ہمت نہیں پڑی، اس لئے ستانے کیلئے قیام پر چلا آیا اور بہت دیر کے بعد سعی کر کے قصر کرلیا اور نہا کر کپڑے بدلے، جدہ میں جہاز ہی پر قدوائی صاحب کی زبانی معلوم ہو گیا تھا کہ آج یہاں چوتھی تاریخ ہے، جب کہ ہم لوگوں کے حساب سے ابھی دوسری تھی، قدوائی صاحب کو مولوی سید محمد میاں ہمارے پاس ملانے کو لائے تھے، اس ملاقات کے بعد وہ کئی دفعہ کشم اور مدینۃ الحجاج میں ملے، مولوی احمد عبداللہ نے مجھ سے کہا وہ آپ سے ملنے کے بہت مشتاق ہیں، رات کو وہ میری قیامگاہ پر آئے بھی تھے، کھانا کھانے کیلئے قصلیہ لیجانا چاہتے تھے، مگر میں موجود نہ تھا۔ مولوی نقی صاحب مل گئے تھے ان کو لے جا کر کھلایا، قصلیہ میں آج کل چریا کوٹ کے ایک ڈاکٹر ملازم ہیں، ہم نے قبض کی شکایت کی تو انھوں نے ایک

خوراک دست آور سفوف کی دی مگر ہم پریشانی میں اس کو استعمال نہ کر سکے۔

یہاں (جدہ میں) فی کس ایک سو چودہ روپے ہندی مالغہ عہ فیس معلمی اور ایک گنی یعنی عہ ہندی کرایہ مکان مدینۃ الحجاج اور عہ ہندی کرایہ بس از جدہ تا مکہ ادا کرنا پڑا۔

۲۶/اگست آج ہم مکہ معظمہ میں ہیں، بعد عصر مولوی عبداللہ زمزمی سے ملاقات ہوئی، صبح کو یوسف گرہست ۰۰۰ برکت اللہ اور محمد خیر آبادی وغیرہ ملنے آئے تھے۔، آج طبیعت بہت بدمزہ رہی، رات بھر کی بیداری کا یہ اثر تھا، حجاج کی کثرت کی وجہ سے مسجد میں جگہ نہیں ملتی۔

۲۷/اگست، آج معلم نے خیمہ کا کرایہ فی کس عہ اور موٹر کا کرایہ فی کس عہ وصول کیا، کل صبح کو منیٰ کو روانگی ہے، ہم نے پیدل کا ارادہ کیا تھا، مگر حاجی سلطان کی بی بی کے مرض کی وجہ سے سواری کا کرایہ ادا کیا۔

۲۸/اگست، آج ظہر سے بہت پہلے موٹر سے ہم لوگ منیٰ روانہ ہوئے گرمی سخت ہے ، موٹر شبیکہ میں کھڑا تھا، صفا سے وہاں تک پیدل جانا پڑا، منیٰ پہونچ کر ایک خیمہ میں معلم صاحب نے ٹھہرایا، وہیں دن بھر رہے، دھوپ اور گرمی کی شدت کی وجہ سے مسجد خیف میں نہ جا سکے، مغرب کی نماز مسجد خیف میں ادا ہوئی، وہاں امام مکہ اور ایک دوسرے مصری میں امامت کے باب میں جھڑپ ہو گئی اس لئے ہم نے الگ نماز پڑھی، شام کو مسجد خیف کے پیچھے دال بھات پکایا گیا، عشاء کے بعد کھا پی کر خوب سوئے۔

۲۹/اگست۔ آج تقریباً گھنٹہ بھر دن نکلنے کے بعد عرفات کیلئے موٹر سے روانہ ہوئے، جبل رحمت سے بہت قریب خیمہ پڑا ہوا تھا، اس میں ٹھہرے، معلم صاحب نے چائے پلائی، دھوپ کی تیزی کیوجہ سے مسجد نمرہ جانے کی ہمت نہیں ہوئی، خیمہ ہی میں ظہر و عصر اپنے اپنے وقت میں باجماعت ادا ہوئی، شام کو قبل مغرب جبل رحمت کے پاس جاکر کھڑے ہو کر کچھ دیر تمام رفقاء کے ساتھ دعا

مانگی۔ غروب کے بعد بہت دیر انتظار کے بعد بس ملا۔ راستہ میں موٹروں کا تانتا بندھا ہوا تھا، اس لئے کئی گھنٹہ میں مزدلفہ پہونچے، بس میں گرمی کی شدت اور بھوک سے بڑی تکلیف ہوئی، مزدلفہ پہونچ کر فوراً نماز مغرب و عشاء باجماعت پڑھی گئی، اس کے بعد کچھ باسی روٹیاں کھا کر پانی پیا، چار فنجان والی ایک کیتلی چائے نس ریال (تقریباً ۱۲/ر) میں لی۔ اس کے بعد ستانے کیلئے لیٹ گئے، لیٹتے ہی آنکھ لگ گئی، صبح صادق سے کچھ پہلے آنکھ کھلی، وضو کر کے چند رکعتیں پڑھیں۔ اس کے بعد نماز فجر باجماعت پڑھی گئی، اس کے بعد موٹر کا انتظار شروع ہوا مگر دس بجے دن سے پہلے موٹر نہ آسکا، خدا کا شکر ہے کہ اس دن بہت دیر تک بدلی تھی، جب دھوپ نکلی تو فوراً ہم لوگ اس سائبان میں چلے گئے جو حکومت کی طرف سے بنا ہوا ہے، وہاں بہت دیر انتظار کے بعد بس ملا، بس میں خدا جانے کتنے مسافروں کو جانوروں کی طرح بھر کر منیٰ لایا گیا، سنا جاتا ہے کہ بہت سے لوگ مزدلفہ کے میدان میں دھوپ میں پڑے پڑے مر گئے؛ بعض کا ناگفتہ بہ حال تو ہم نے بھی دیکھا تھا۔ موٹروں کا انتظام معقول نہیں ہے، ڈرائیور کمانے کی فکر میں حجاج کو موت کے گھاٹ اتار دیتے ہیں۔

منیٰ پہونچ کر ہم سب خیمہ میں داخل ہو گئے اور عصر سے پہلے تک باہر نکلنے کی ہمت نہ کر سکے، عصر کے بعد کچھ لوگ رمی عقبہ کیلئے گئے اور ہم لوگ ان کی واپسی کے انتظار میں بیٹھے رہے، جب وہ واپس ہوئے تو میں مع مولوی عبدالجبار کے رمی کیلئے گیا اور واپس آنے والوں میں کچھ لوگ قربانی کیلئے چلے گئے، جب ہم رمی کو چلے ہیں اس وقت بھی ہوا نہایت گرم تھی اور راستہ میں بہت سے لوگ دم توڑتے ہوئے ملے، یہ منظر دیکھ کر ہم لوگ حواس باختہ تھے، خدا خدا کر کے ہم نے رمی کی اور جلدی سے خیمہ میں واپس آگئے، مولوی عبدالجبار کے چہرہ کا رنگ فق تھا، میں بھی بہت پریشان خاطر تھا، واپس آکر نماز مغرب ادا کی، اس کے بعد قربانی کرنے والے لوگ واپس آئے اور جو کچھ ساتھ لائے تھے اس کے کھانے میں مصروف

ہو گئے، عشاء کے بعد کھانا کھایا گیا اس کے بعد خیمہ کے اندر ہی سب سو گئے۔

۳۱؍ اگست ۱۱؍ ذی الحجہ، آج طواف زیارت کرنا ہے اور خیال ہے کہ سویرے ہی مکہ چلے جائیں، اس لئے میں ناشتہ پکانے سے منع کر رہا ہوں، معلم کے لڑکے سے تاکید کی وہ ایک ٹرک کرایہ پر لایا، ہم سب لوگ اس پر سوار ہو کر چلے مگر راستہ میں پاکستانی مگر راستہ میں پاکستانی اور سعودی فوج کے مظاہرات ہو رہے تھے، اس لئے گھنٹوں ٹرک کو روکنا پڑا، بہت دیر بعد اجازت ملی اور کسی طرح مکہ پہونچے، پہونچ کر فوراً مولوی عبداللہ کے یہاں جاکر وضو کیا اور طواف زیارت سے فارغ ہو کر سعی شروع کر دی، بدقت تمام اس سے فراغت ہوئی، اس کے بعد کرایہ والے مکان میں ستانے کیلئے آگئے، سعی کے ہر چکر میں پانی یا شربت پینے کی ضرورت پڑتی تھی، کھانا کچھ کھایا نہ تھا، اس لئے پیاس نہ بجھتی تھی، عصر تک ستانے کے بعد منی واپس جانے کیلئے پھر ٹرک تلاش کی گئی اور سب لوگ اس پر سوار ہو کر مغرب سے اتنے پہلے منی پہونچ گئے کہ رمی جمرات سے فارغ ہو کر نماز مغرب ادا کی گئی، اس کے بعد حاجی شفیع وغیرہ نے مل کر کھانا پکایا اور کھا پی کر سب لوگ سو گئے۔

یکم ستمبر ۱۲؍ ذی الحجہ، ابھی کچھ لوگوں کو مزید قربانیاں کرنی تھیں، اس لئے آج سویرے ہی کئی آدمی قربانی کرنے چلے گئے، ادھر میں نے دیکھا کہ قریب پاس کے خیمے اکھڑ رہے ہیں اور آج کا موسم بھی بہت سخت معلوم ہوتا تھا اس لئے میں نے معلم سے کہا کہ بس والے کو بلائے اور قربانی کرنے والے واپس آجائیں تو ہمارا سامان اور ہم کو اسی وقت مکہ پہونچا دے، ہم لوگ شام کو آکر رمی کرلیں گے، معلم نے اس کو پسند کیا اور واپس آگیا، بہت دیر کے بعد قربانی والے واپس ہوئے اور ہم سب لوگ ۹ بجے کے قریب بس پر سوار ہو کر مکہ آگئے، شام کو قبیل عصر میرے سوا سب لوگ کرایہ کے ٹرک پر منی گئے اور رمی کی میری طبیعت خراب ہو گئی اس لئے میں نہ جا سکا اور اپنی طرف سے مولوی عبدالجبار کو

رمی کیلئے مامور کیا، وہ لوگ واپس ہوئے تو معلوم ہوا کہ بڑی پریشانیوں سے پہونچنا ہوا، اور واپسی بھی بڑی دقت سے ہوئی، فی کس پانچ ریال خرچ ہوئے، مگر اس کے ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہوا کہ جو لوگ رہ گئے ان کو اور بھی پریشانیاں پیش آئیں، حتی کہ بہت سے لوگ اپنا سامان لادے ہوئے پیدل آئے، منجملہ ان کے حاجی عبدالحی گھوسی والے اور محمد میاں خیر آبادی بھی تھے۔

۲؍ستمبر م ۱۳؍ذی الحجہ، اب تمام مناسک حج سے فراغت حاصل ہوگئی، حجاج پھر سب مکہ میں جمع ہوگئے اور حرم میں بے اندازہ ہجوم ہے، نماز پڑھنا مشکل ہے، یہ بھیڑ جمعہ سنیچر تک کم ہوگی۔

جب سے ہم مکہ معظمہ آئے ہیں برابر خطوط کا انتظار رہتا ہے، منی سے واپسی پر یہ انتظار اور بڑھ گیا ہے اور اس کی وجہ سے بڑی تشویش رہا کرتی ہے۔

۳؍ستمبر م ۱۴؍ذی الحجہ، آج بہت سے وطنی حجاج ملنے کو آئے، ان میں سے بعض نے ۱۲؍کو طواف زیارت نہیں کیا تھا ان کو مسئلہ بتایا کہ دم دینا ہے، حافظ عبدالحفیظ چکراوالے ملنے آئے، ان کو حکیم یسین چکراوی لائے تھے، آج مفتی صاحب سے ملاقات کو ہم گئے۔

۴؍ستمبر ۱۹۵۲ء م ۱۵؍ذی الحجہ، غالباً اس تاریخ میں مفتی شفیع دیوبندی سے ملاقات ہوئی، ان کی ملاقات ایسی خشک رہی کہ پھر ملنے کو جی نہیں چاہا، مولوی تقی صاحب سے جب سے ہم مکہ آئے ہیں ملاقات نہیں ہوئی، حاجی تجمل اور مولوی شفیع راستہ میں مل گئے تھے ان سے معلوم ہوا کہ فخریہ کے کسی مکان میں ٹھہرے ہیں، خیر آباد کے حجاج کی اقامتگاہ میں دو ایک بار جانا ہوا، مولوی عبداللہ صاحب کے یہاں روزانہ یا ایک دو دن کے ناغہ سے برابر جاتا ہوں۔

۵؍ستمبر م ۱۶؍ذی الحجہ، اب مکان سے خطوط آگئے ہیں، چونکہ عدن یا کامران سے اب کی دفعہ کوئی خط نہیں بھیجا جاسکا اس لئے اہل وطن بہت بے چینی سے خط کا انتظار کر رہے ہیں، ہم کو تو فی الجملہ اطمینان ہو گیا مگر ان کو جب جدہ

والا خط ملے گا اسی وقت اضطراب رفع ہو گا۔

۶/ ستمبر ۱۷/ ذی الحجہ، آج مفتی صاحب ملاقات کو آئے مگر میں موجود نہ تھا،

۷/ ستمبر ۱۸/ ذی الحجہ، آج مولوی اکبر و مولوی محمد میاں اور مولوی ظہور الاسلام فتحپوری ملاقات کو آئے۔

۸ ستمبر ۱۹/ ذی الحجہ، آج پروفیسر عبد المنان بیدل اور صالح سنبل اور مولوی محمد میاں ملنے آئے، پروفیسر صاحب نے مولوی محمد کا ایک مضمون جس کو انھوں نے ٹھیک کیا تھا سنایا اور اس کی نسبت میری رائے حاصل کی، میں نے ایک عربی مضمون ان کو دیا کہ وہ کونسل ہند کو اخبارات میں اشاعت کیلئے دیدیں، البلاد السعودیہ میں ایک دن کبار حجاج الہند کی ایک غلط اور نامکمل فہرست شائع ہوئی تھی میں نے اس مضمون میں ایک صحیح فہرست دی تھی، پروفیسر صاحب بہت معتقدانہ آتے ہیں، ان سے معلوم ہوا کہ حریری صاحب مکہ آئے ہوئے ہیں۔ کل اتفاقی طور پر صوفی عبد الرب صاحب سے مقام ابراہیم کے قریب ملاقات ہو گئی تھی، ان سے معلوم ہوا کہ خان بہادر محمد احمد صاجب سخت بیمار ہو گئے تھے، امید زیست منقطع ہو چکی تھی، مگر اب بحمد اللہ صبح و شام حرم آتے ہیں مولوی عبد اللہ صاحب زمزمی نے دور سا... ایک الرسالۃ المستطرفۃ ۰۰۰ ہدیہ کیا

۹۔ ستمبر ۲۰/ ذی الحجہ، آج خیر آباد والوں نے دعوت کی، آج بعد ظہر مدرسہ فخریہ کی عمارت میں ہم مولوی نقی اور مولوی اختر حسین صاحب سے ملنے گئے اور دیر تک وہاں بیٹھے رہے، شام کو بعد عصر حرم جارہا تھا کہ راستہ میں صفا کے قریب حریری صاحب ملے انھوں نے فرمایا کہ میں تمہارے ہی پاس جارہا تھا، اس وقت کھڑے کھڑے بہت دیر تک بات چیت ہوئی، اور یہ طے پایا کہ میں ان کے ساتھ ہی مغرب کی نماز حرم میں پڑھوں، مگر آج خلیفہ بن عبد العزیز(۱) ملک الحجاز والنجد کی آمد آمد تھی، سڑک پر پولیس کا سخت پہرہ تھا، ادھر سے ادھر جانا

(۱) مگر یہ خبر غلط تھی، در حقیقت امیر سعود ولی عہد طواف کرنے آئے تھے (حبیب الرحمٰن الاعظمی)

ممکن نہ تھا، اس لئے ان کے گذرنے کا انتظار کرنا پڑا، بہت دیر کے بعد وہ باب عالی سے حرم میں گئے تو ہم کو راستہ ملا، باب علی کے پاس پہونچ کر میں نے دیکھا کہ حریری کہیں نظر نہیں آرہے ہیں، میں نے سمجھا وہ پہلے داخل ہو گئے اس لئے میں پھر داخل ہو گیا، مگر اندر جانے کے بعد جب وہ نہیں ملے تو میں نے سمجھ لیا کہ وہ آگے بڑھ گئے اندر پہونچا تو معلوم ہوا کہ شاہزادہ صاحب طواف کر رہے ہیں، طواف سے فارغ ہوتے ہی اذان ہونے لگی، وہ اس وقت مقام ابراہیم میں تھے، بعد ازاں صفیں لگ گئیں اور نماز شروع ہو گئی، اقامتگاہ پر لوٹنے کے بعد مولوی عبدالجبار نے بتایا کہ نماز شروع ہونے کے بعد پولیس نے امام کے پیچھے کے تمام مصلیوں کو ہٹا کر ان کو کھڑا کیا اور نمازیوں کو نماز توڑ کر پیچھے ہٹنا پڑا۔

۱۰۔ ستمبر ۲۱/ذی الحجہ، آج میں باب الواسطیہ کے پاس حریری کی تلاش میں صبح کو کھڑا تھا کہ مولوی عبدالجبار بنارسی مل گئے اور وہ اپنی اقامتگاہ لے گئے، وہیں حریری صاحب بھی تھے، وہاں گھنٹوں مختلف تذکرے رہے، ناشتہ بھی وہیں ہوا، اس کے بعد وہ محمد مجددی مدنیؒ صاحب سے ملانے کیلئے مجھ کو لے چلے، ان سے پہلے اسمٰعیل و مولوی اسحاق صاحب دہلوی سے انھوں نے ملایا اور تعارف کرایا، اس کے بعد محمد صاحب نے مجھ سے میرا مکان پوچھنے کے بعد دریافت کیا مجلۃ الحج کے گم شدہ پرچوں کے باب میں آپ ہی نے مجھ کو خط لکھا تھا؟ میں نے کہا ہاں، انھوں نے کہا میں نے پرچے دوبارہ بھیج دئے تھے۔ میں نے کہا ہاں وہ ملے تھے! اس کے بعد محمد صاحب نے پوچھا اب کون سا پرچہ باقی رہ گیا ہے؟ میں نے کہا سنہ خامسہ کا عدد خامس، انھوں نے کہا وہ بھی مل جائے گا، اس کے بعد میں نے دفتر مجلۃ الحج دیکھنے کی خواہش کی، انھوں نے کہا! بہت شوق سے تشریف لایئے: میں نے کہا جگہ نہیں دیکھی ہے، انھوں نے کہا میری دوکان سے کسی لڑکے کو ساتھ لیکر آیئے مگر دو تین دن کے بعد، اس لئے کہ ابھی ازدحام بہت ہے، اس کے بعد میں اقامتگاہ پر آگیا، وہاں پہونچا تو دیکھا کہ برخوردار رشید احمد اور مختار کے خطوط

۴۳ ستمبر اور ۵ر ستمبر کے آئے ہوئے رکھے ہیں، مصر وغیرہ کا پاسپورٹ بھی اعظم گڈھ سے حاصل کر کے مختار نے بھیج دیا ہے، وہ بھی ساتھ آگیا ہے، عرفات و منیٰ سے واپسی کے بعد میری طبیعت خراب ہو گئی اور دو تین دن نہایت شدت کا بخار آیا، کمزوری بہت ہو گئی، اس لئے کہیں جانے کی ہمت نہیں ہوتی تھی، اچھے ہونے کے بعد ایک دن مجلۃ الحج کے دفتر گیا، وہاں شیخ محمد مجددی سے ملاقات ہوئی، انھوں نے چائے سے تواضع کی اور سعید عامودی ایڈیٹر الحج سے ملایا، عامودی صاحب سے مختصر سی گفتگو عربی میں ہوئی، مجددی سے بہت دیر تک گفتگو ہوتی رہی، انھوں نے گھر پر آنے کی دعوت دی مگر اتفاق نہیں ہوا۔

۲۵ر ذی الحجہ، آج مکتبہ الحرم الشریف دیکھنے کو گیا، مولوی محمد نور بنگالی ثم المکی مولانا عبید اللہ سندی مرحوم کے شاگرد آج کل مکتبہ کے مہتمم یا لائبریرین ہیں، نہایت متشدد اور مغلوب الغضب آدمی ہیں، تنقید میں نہایت بے باک ہیں اور بہت سخت کلام، مولانا مرحوم سے شاید زیادہ تر انھوں نے یہی سیکھا ہے۔ بہر حال انھوں نے مکتبہ کی فہرست دی، میں نے اس میں سے مندرجہ ذیل کتابیں نوٹ کیں۔ ا۔ فوائد البزار، ۲۔ کشف الالتباس عن الأحاديث التى تدور بين الناس لمحمد غرس الدين بن أحمد غرس الدين، مخطوطہ ۱۰۶۹ھ، ۳۔ الكافى شرح الوافى لحافظ الدين النسفى، نسخہ کاملہ، ۴۔ كمال الدراية فى شرح النقاية للشمنى، ۵۔ المحيط البرهانى ۶۔ اللباب فى الجمع بين السنة والكتاب لأبى محمد على بن أبى زكريا بن مسعود المنبجى المكتوب سنة ۷۳۴ بالمدرسة الظاهرية على يد عبدالله بن محمد بن ابراهيم الحنفى عرف والده بابن المهندس. اور یہی ایک کتاب میں نے نکلوا کر دیکھی۔ دوبارہ اس لئے موقع نہیں ملا کہ محمد نور صاحب کچھ بیمار ہو گئے تھے، انھوں نے ایک رسالہ عربی میں لکھا ہے، جس میں انھوں نے بہت شرح وبسط سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی

ہے کہ جو نمازیں سنن مؤکدہ کہی جاتی ہیں ان کے ترک سے کچھ مؤاخذہ نہیں ہے، اور علماء کو اس پر زور نہ دینا چاہیئے۔ میں نے وہ رسالہ محمد فیروز صاحب ناگپوری کے توسط سے پورا دیکھا ہے۔ اس وقت تک طبع نہیں ہوا تھا، مجھے رسالہ پڑھ کر بہت افسوس ہوا۔ (۱)

اس دن جب میں کتب خانہ میں پہونچا تو معلوم ہوا کہ محمد حسنین مخلوف مفتی مصر ابھی اٹھ کر جا رہے ہیں، مجھے افسوس ہوا کہ ذرا پہلے نہ آیا کہ ان سے بھی ملاقات ہو جاتی۔

اب کی دفعہ مکہ معظمہ میں ہمارا قیام ۹ محرم ۱۳۷۲ھ تک تھا، ۹ر کو ہمارے رفقاء کو مدینہ جانے کی اجازت اور سواری ملی، مکہ سے جدہ تک موٹر کا کرایہ فی کس ۵۰ ہندوستانی اور جدہ سے مدینہ کا ۱۳۵ ہندوستانی ادا کرنا پڑا، ادائیگی کے وقت فی کس ۵ مکان کا کرایہ بھی دیا گیا جو نسبۃً کم ہے۔ رات کو عشا کے قریب موٹر روانہ ہوا، بحرہ پہنچ کر موٹر رک گیا اور وہیں میدان میں کمبل ڈال کر ہم لیٹ گئے، صبح کو سویرے اٹھ کر ڈیرے سے دور قضائے حاجت کے لیے گیا، فارغ ہو کر وضو کیا، باجماعت نماز پڑھی، اس کے بعد موٹر جدہ روانہ ہوا، جدہ پہنچ کر زائد سامان وکیل معلم صالح بسیونی کے مکان میں بحفاظت رکھوایا، موٹر کے اوپر سے جب سامان اترنے لگا تو معلوم ہوا کہ رفقاء میں سے حاجی سلامت اللہ کا بستر غائب ہے، معلوم ہوتا ہے وہ راستہ میں گر گیا اور کسی کو احساس نہیں ہوا، جدہ سے مکہ جاتے ہوئے میرا اور مولوی عبدالجبار کا ڈرام جو بمبئی سے زمزم لانے کے لیے خریدا تھا، گر گیا اور ہر چند تلاش وجستجو کی گئی مگر نہیں ملا، ہاں جدہ کی گودی سے لے کر مکہ تک کے درمیان مولوی تقی صاحب کا ایک جھولا یا ڈبہ گر گیا تھا وہ البتہ مدینہ سے واپسی کے بعد ان کو مل گیا۔

سامان رکھنے کے بعد ہمارا موٹر مدینۃ الحجاج کے پاس گیا، وہاں پہنچ کر

(۱) علامہ اعظمی نے مولوی نور محمد کے رسالہ کا رد فرمایا، جو دیوبند سے اس وقت شائع ہونے والے عربی مجلہ دعوۃ الحق (محرم ۱۳۸۷ھ = مئی ۱۹۶۷ء) میں حول المسنن الرواتب کے نام سے شائع ہوا۔

ہمارے ڈرائیور نے آگے جانے سے انکار کردیا، منتظمین اس کو مجبور کرتے تھے مگر وہ برابر انکار پر مصر تھا، پھر معلوم نہیں اس کو کیا تاوان دینا پڑا اور ہم کو ایک دوسرا ڈرائیور دیا گیا، اب مصیبت یہ تھی کہ پہلا ڈرائیور موٹر کے ہر مسافر سے ایک ایک ریال (زبردستی) بخشش وصول کر چکا تھا، دوسرا ڈرائیور آیا تو اس نے پھر بخشش کا مطالبہ کیا، ہمارے موٹر میں زیادہ تر حیدر آبادی حجاج تھے، انھوں نے دینے سے انکار کردیا، اب ڈرائیور کسی طرح گاڑی لے چلنے کو تیار نہیں اور وہ بخشش دینے کو آمادہ نہیں، بالآخر میں نے ان کو بہت سمجھایا تو ان میں سے کچھ لوگوں نے اور بقیہ تمام حجاج نے آمادگی ظاہر کی اور روپیہ وصول ہونا شروع ہوا تو میں نے ڈرائیور کو سمجھایا کہ گاڑی لے چلو ہم سب سے وصول کر کے دیدیں گے اور اگر کوئی نہ دیگا تو اس کی طرف سے ہم دیدیں گے، اس نے اعتماد کر لیا اور بے تأمل آکر اس نے گاڑی اسٹارٹ کردی۔ وہ مجھ سے بہت خوش تھا اور مدینہ پہونچ کر اس نے خواہش کی کہ واپسی میں بھی آپ کوشش کر کے ہماری گاڑی پر آئیے۔

بہر حال ہم جدہ سے غالباً ۲ ؍ بجے دن کو روانہ ہوئے ظہر کی نماز ہم نے یہیں پڑھ لی تھی، عصر کی نماز ذھبان میں پڑھی اور روانہ ہو گئے، مغرب کی نماز آگے کی ایک منزل قضیمہ میں ہوئی اس کے بعد رابغ پہونچکر شام کا کھانا کھایا پھر نماز عشا سے فارغ ہو کر موٹر میں بیٹھے تو بستان میں آکر اترے، تقریباً بارہ بج چکے تھے، میدان میں کمبل بچھا بچھا کر سوئے، اور صبح سویرے قضائے حاجت سے فراغت کے بعد نماز پڑھی اور موٹر میں سوار ہو گئے، موٹر ڈرائیور بہت برہم تھا کہ بہت دیر کردی، میرے بہت کہنے سننے سے تو موٹر چلانے پر آمادہ ہوا، اس میں شبہہ نہیں کہ حجاج بڑی لاپروائی کرتے ہیں، اطمینان سے سوئے بیٹھے رہتے ہیں، ڈرائیور کی بات اور رفقاء کی تکلیف انتظار کا کچھ لحاظ نہیں کرتے، بعض اوقات ایک دو آدمیوں کیلئے تمام مسافر گھنٹوں موٹر میں بیٹھے بیٹھے انتظار کی تکلیف اٹھاتے ہیں۔ بستان سے چل کر

ہمارا موٹر ۹۔ دس بجے دن کے قریب مسیجید میں آکر کھڑا ہوا۔ یہاں قہوہ خانہ ہے اس میں کراسی (بہت اونچے اونچے پایوں کی چارپائیاں جو صرف ایک شخص کے لیٹنے کے برابر ہوتی ہیں) پڑی ہوئی تھیں، بہت سے مسافر چارپائیوں پر اور بہت سے زمین ہی پر کمبل ڈال کے لیٹ گئے، تھوڑی دیر بعد دکان سے کھانا لیکر کھایا گیا، اس کے بعد نماز ظہر ہوئی، ان سب کاموں سے فارغ ہو کر اور ستا کر چار بجے کے بعد موٹر روانہ ہوا، ایک منزل میں عصر کی نماز پڑھی گئی، پھر موٹر چلا تو مغرب کے وقت ذوالحلیفہ پہونچ گیا، جس کو اب بیر علی کہتے ہیں، وہاں باجماعت مغرب کی نماز پڑھی گئی اور ایک فنجان چائے سے کچھ تکان نکالی گئی، اس کے بعد موٹر میں بیٹھے اب کی دفعہ موٹر مدینہ ہی جا کر رکا، جب ہم پہونچے تو مسجد نبوی میں نماز عشا ہو چکی تھی۔

۱۲۔ محرم کو عشا کے وقت ہم مدینہ پہونچے، بہاء الدین مزور کے دروازہ پر سامان پہونچا کر مکان تلاش کرنے کیلئے آدمی بھیجے، تھوڑی دیر کے بعد پاس ہی کی ایک دوکان پر کھانا کھایا، اس کے بعد مدرسہ شرعیہ میں سامان پہونچایا ، مدرسہ شرعیہ بالکل مسجد نبوی کے پاس پورب جانب مولانا حسین احمد صاحب مدنی کے بڑے بھائی مولانا سید احمد فیض آبادی ثم المدنی کا قائم کیا ہوا ایک مدرسہ ہے، مدرسہ کی دو منزلہ عمارت بہت عمدہ ہے، مدرسہ سے متعلق اور بھی کئی مکان ہیں، زائرین کو مدرسہ میں بلا معاوضہ رہنے کیلئے جگہ مل جاتی ہے، مدرسہ میں ہمارے ساتھیوں کو ایک کمرہ مل گیا، اور دفتر کا کمرہ مجھے اور مولوی اختر حسین صاحب دیوبندی کو نیز مولوی نقی کو عنایت ہوا جو بہت آرام دہ اور کشادہ ہے، مدرسہ اور مسجد نبوی کے درمیان بیس گز سے زیادہ فاصلہ نہ ہوگا۔

اس دفعہ ہم کو مدینہ منورہ میں بیس دن اقامت کی سعادت حاصل ہوئی اور حق تعالیٰ کے فضل سے ہر وقت جماعت کے ساتھ اس مقدس مسجد میں نماز اور

روضۂ اقدس کے پاس صلوٰۃ وسلام کی توفیق حاصل ہوئی، شاید ایک وقت علالت کی وجہ سے حاضر نہیں ہوا تھا، ورنہ ایک وقت کے سوا جہاں تک یاد ہے غیر حاضری نہیں ہوئی۔ اب کی دفعہ مولانا حسین احمد صاحب مدنی کے چھوٹے بھائی مولانا سید محمود صاحب سے تعارف اور ملاقات کا شرف ملا، موصوف نے ایک دن میری اور تقریباً بیس دوسرے حجاج کی دعوت کی، جن میں پروفیسر عبدالمنان بیدل اور مولوی عبدالجلیل صاحب ایم ایل اے (آسام) مولوی اختر حسین دیوبندی، مولوی نقی (مالیگاؤں) مفتی مہدی حسن (مگر وہ شریک نہیں ہوئے) قابل ذکر ہیں۔

اتفاق سے اس وقت مولانا عبدالمجید الحریری البنارسی (جو اس سال سفیر ہند برائے جدہ نہیں تھے، لیکن حجاز ہی میں مقیم تھے، اور اب ان کی جگہ ایک سال قبل سے مسٹر مصطفیٰ کامل قدوائی سفیر تھے، اور حریری صاحب کو ولی عہد حکومت سعودیہ نے دارالسلطنت ریاض کے شاہی کتب خانہ کے مہتمم کے منصب پر سرفراز کیا ہے) مدینہ میں موجود تھے اور مع اہل وعیال اور ساز وسامان کے ریاض جانے کی تیاری کر رہے تھے، اور ٹرک اور ہوائی جہاز کا انتظار کر رہے تھے، اس لئے روزانہ دن یا رات میں گھنٹوں مدرسہ میں آکر بیٹھتے، سوکھے پان کھاتے اور کھلاتے اور مزے مزے کی باتیں کرتے، کسی کسی وقت علمی مذاکرات کا سلسلہ بھی چھڑ جاتا، مدینہ منورہ میں جو علمی نوادر جا بجا موجود ہیں بڑی محنت سے انھوں نے اس کا ٹوہ لگایا ہے اور ان کی فہرست مرتب کی ہے جو مجھے دکھا رہے تھے، ان کا خیال ہے کہ ان کو ریاض کے کتب خانہ کیلئے حاصل کرنے کی کوشش کریں گے، اور ان میں سے بعض کی اشاعت کی بھی کوشش کریں گے، مجھے اس کام سے بڑی دلچسپی ہے، انھوں نے خط لکھنے کا وعدہ کیا تھا مگر شاید بھول گئے ورنہ معلوم ہوتا کہ اس سلسلے میں اب تک کیا ہوا۔ ان کے ساتھ اس وقت ان کے لڑکے عبیداللہ بھی تھے جو کئی سال سے بسلسلۂ تجارت حجاز ہی میں رہتے ہیں، ان

کی تعلیم تو انگریزی ہے مگر اب خاصی عربی بول اور لکھ لیتے ہیں۔

اب کی دفعہ بھی ایک بار مسجد قبا، بئر اریس، اور وہاں سے جبل احد کے قریب مزارات شہدائے احد رضی اللہ عنھم اور مسجد الفتح مسجد القبلتین اور دیگر مشاہد متبرکہ کی زیارت سے مشرف ہوا، میں مفتی مہدی حسن کی معیت میں گیا تھا، دوسرے (دن) مولوی عبد الجبار دوسرے رفقاء کے ساتھ گئے۔

بقیع کی زیارت کئی بار کی، پہلی دفعہ مسجد غمامہ اور اس کے آس پاس کی مساجد کی زیارت بھی کی تھی، بیرحاء کا پانی پہلے بھی پیا تھا اس دفعہ بھی پیا، یہ کنواں اب بہاء الدین مزور کے مکان کی پشت پر ایک مکان کے اندر پڑ گیا ہے، مگر اس طرح کہ باہر سے لے سکتے ہیں، میں نے مولوی اسلام الحق کو بھی اس کنویں کی زیارت کرائی۔

بیر بضاعہ کو دیکھا اور اس کا پانی دونوں دفعہ حاصل ہوا، بیر بضاعہ سے آج بھی سنچائی ہوتی ہے، اب اس میں مشین لگ گئی ہے، اس کے ارد گرد ترکاریوں اور جوار وغیرہ کے کھیت اور باغ ہیں۔

بیر اریس کا پانی بھی دونوں دفعہ پینا نصیب ہوا، نہایت سرد وشیریں پانی تھا، اس میں بھی ہر چلانے کی جگہ اور سامان دیکھا، یہ کنواں بالکل مسجد قبا کے قریب بیر خاتم کے نام سے اس کی شہرت ہے۔

مسجد قبا سے مسجد الفضیخ کو راستہ جاتا ہے مگر ہم دھوپ ہو جانے کی وجہ سے نہ جاسکے۔

مناخہ (مدینہ کے بازار کے پاس ایک جگہ) میں ٹیکسیاں اور لاریاں کرایہ کی مل جاتی ہیں، جو ایک ایک دو دو ریال فی کس کرایہ پر قبا اور تمام مشاہد کی زیارت کرادیتی ہیں، مدینہ منورہ میں حضرت شاہ عبد الغنی صاحب مجددی کے نواسہ کی زیارت بھی ہم نے کی۔ ایک معمولی دوکان ان کا ذریعہ معاش ہے، ایک صاحب

وہاں مولوی محمد نمنکانی ہیں، وہ مدرسۃ الشرع میں پڑھاتے بھی ہیں اور کتابوں کی دوکان بھی رکھی ہے، ان کے پاس کوثری صاحب کی اکثر کتابیں تھیں، انھیں کے یہاں میں نے تلخیص سنن ابی داؤد للمنذری مع تہذیب السنن لابن القیم کا کامل مطبوعہ مصر نسخہ دیکھا، افسوس کہ روپے کی کمی کی وجہ سے خرید نہ سکا۔

اثناء قیام مدینہ میں اب کی دفعہ ایک بار مدرسۃ الشرع کا کتب خانہ بھی دیکھا، فہرست سے مندرجہ ذیل کتابیں میں نے نوٹ کیں۔

۱۔ الوجيز للإمام الفقيه ابی عبدالله محمدبن محمد السرخسی مكتوب سنة ۸۵۸

۲۔ ملجأ القضاة عند تعارض البينات للشيخ ابی محمد غانم البغدادی (قلمی)

۳۔ منح الغفار شرح تنوير الأبصار لمحمد عبدلله التمرتاشی //

٤۔ معدن الحقائق شرح كنز الدقائق لمحمد بن محمد السمرقندی //

٥۔ شرح النقايه لعلی القاری مطبوعه قازان (روس)

٦۔ شرح تحفة الملوك لابن الملك //

۷۔ تحرير المسائل علی النوازل و تحفة الملوك

۸۔ المنخول للغزالی

۹۔ تعليقات الطحطاوی علی الدرالمختار۔ نہایت عمدہ قلمی نسخہ دو ضخیم جلدوں میں۔ اگرچہ یہ چھپ گئی ہے پھر بھی یہ قلمی نسخہ قابل قدر ہے۔

ان میں سے ۲ ۳ ۴ ۶ اور ۹ کو میں نے الٹ پلٹ کر دیکھا۔ اور زیادہ توجہ سے الوجیز کو دیکھا۔ رضی الدین سرخسی نے چھوٹی بڑی چار کتابیں محیط کے نام سے لکھی ہیں، یہ چوتھی محیط ہے، کتاب کا خط نستعلیق ہے، ضخامت ایک سو سرسٹھ ورق ہے۔

میں کتب خانہ دیکھنے ۲؍صفر ۱۳۷۲ھ کو گیا تھا، میں کتاب بھی دیکھ رہا تھا

اور شیخ محمد بن ترکی نجدی کا درس ابی داؤد بھی سن رہا تھا۔

اس سال حجاج کو وطن واپس کرنے کیلئے جہازوں کی تعداد بہت کم تھی، اس لئے بہت دیر دیر میں جہاز ملتے تھے اور جدہ میں حجاج کی بہت بڑی تعداد اکٹھا ہو گئی، اس کے نتیجہ میں ان لوگوں کو جو مدینہ میں تھے، مدینہ سے جدہ جانے کی اجازت نہیں ملتی تھی، بہت سے لوگوں کے پاس پیسے کم تھے وہ جلد از جلد واپس لوٹ جانا چاہتے تھے، کتنے ملازم تھے جن کی رخصت ختم ہو رہی تھی، اس لئے مدینہ میں رکے ہوئے حجاج سخت پریشان تھے، ہمارے رفقاء کا بھی یہی حال تھا، اس پر طرہ یہ کہ مفتی مہدی حسن اور مولوی نقی کو ان کے مزور نے کسی طرح اجازت دلوا کر جدہ روانہ کر دیا، اب گھبراہٹ اور بڑھی اسلئے میں نے یہ طے کیا کہ اب سید محمود صاحب سے کوشش کرا کے سیارہ (موٹر) کا انتظام کرنا چاہئے، یہ خبر کہیں سے مولوی عبدالجلیل آسامی اور پروفیسر عبدالمنان بیدل نے بھی سن لی اور بہت مصر ہوئے کہ ہمارے لئے بھی موٹر کا انتظام کرا دیجئے، میں نے سید محمود کے پاس جا کر صورت حال بیان کی اور پچاس مسافروں کیلئے ایک بڑے موٹر کا انتظام کرانے کیلئے کہا، انھوں نے فوراً اپنے لڑکے سید حبیب صاحب کو بلا کر مجھ سے ملایا، اور بہت اونچا تعارف کرا کے کہا کہ تم ابھی امیر مدینہ (گورنر) کے پاس جا کر آپ کیلئے اور آپ کے پچاس رفقاء کیلئے ایک موٹر کی اجازت کا خط بنام شرکۃ السیارات العربیہ لے آؤ۔

یہ آٹھ بجے صبح کا قصہ ہے، دن کے بارہ بجے میں کھانا کھا رہا تھا کہ سید صاحب کا ملازم آیا اور اس نے خوشخبری سنائی کہ اجازت مل گئی، آپ ابھی میرے ساتھ چلئے! اس کے بعد وہ مجھے شرکۃ السیارات کے منتظم اعلیٰ کے پاس لے گیا اور اس کو خط دیا، منتظم نے اس سے کچھ سوالات کئے، ملازم نے میری طرف اشارہ کر کے کہا ھو یفھم العربیۃ، اس کے بعد منتظم نے مجھ سے کچھ باتیں کیں،

پھر کہا شام کو موٹر مل جائے گا، چنانچہ اسی دن ہم کو موٹر مل گیا، لیکن دوسرے حجاج میں ہلچل مچ گئی اور انھوں نے مزوروں اور کمپنی والوں کو بہت پریشان کیا کہ اجازت نہیں ہے تو ان کو موٹر کیسے مل گیا، ان لوگوں نے جواب دیا کہ بابا یہ گورنر سے اجازت لائے ہیں تم بھی لاؤ تو ہم کو کیا عذر ہے۔

بہر حال ہم تمام اہل مئو کو پانچ اور پروفیسر عبدالمنان مع اپنے رفقاء کے نیز مولوی عبدالجلیل مع تمام رفقاء کے ۳/ صفر ۱۳۷۲ھ کو بعد نماز عشا یہ کہتے ہوئے رخصت ہوئے۔

می روم سوئے وطن وز درد دل بے اختیار
نالۂ دارم کہ پنداری بغربت می روم

اور دوسرے دن شام کو ٹھیک مغرب کے وقت جدہ پہونچ گئے، پہونچتے ہی معلوم ہوا کہ کل مظفری جہاز جا رہا ہے، مگر اب بکنگ کی بالکل گنجائش نہیں ہے، مگر یہ بھی معلوم ہوا کہ پھر بھی کوشش پیروی سے کچھ لوگ لے لئے جاتے ہیں، اس لئے آپ بھی کونسل صاحب سے مل کر کوشش کیجئے، میں نماز مغرب سے فارغ ہو کر مدینۃ الحجاج سے جہاں اب جہاز سے اتر کر اور مدینہ سے واپسی میں حجاج کا قیام ہوتا ہے قنصلیۃ الھند (انڈین کونسلیٹ) گیا، اور قدوائی صاحب سے باتیں کیں، انھوں نے صاف انکار کیا، اس پر مجھے طیش آیا اور میرے لہجہ میں کچھ تندی و تلخی پیدا ہو گئی، جس کی انھیں ناگواری ہوئی، اس کے بعد وہ چلے گئے، چونکہ مفتی مہدی حسن صاحب کا قیام وہیں تھا، تھوڑی دیر کے بعد قدوائی صاحب کے یہاں سے ان کا کھانا آیا اور قدوائی صاحب نے مجھ سے بھی کھانے کو کہا، میں نے انکار کیا مگر وہ بیحد مصر ہوئے اور مفتی صاحب ان سے زیادہ، بالآخر دونوں نے مل کر مجھے کھانے پر مجبور کر دیا، اس کے بعد قدوائی صاحب نے مجھ سے کہا کہ اب ایک سیٹ فرسٹ کلاس کی خالی ہو گئی ہے، اور آپ تنہا جا سکتے ہیں، میں نے کہا رفیقوں کو

چھوڑ کر میں نہیں جا سکتا، لوگ مجھے سمجھانے لگے تو میں نے کہا کم از کم ایک جگہ ڈیک میں بھی دیجئے تاکہ ایک رفیق تو ساتھ ہو، اس کیلئے معذوری ظاہر کی تو میں نے بھی جانے سے معذوری ظاہر کی، پھر انھوں نے کہا اچھا ہم آخیر وقت تک کوشش کریں گے، اگر تیسرے درجہ کی بھی ایک جگہ مل گئی تو آپ چلے جایئے گا، مگر جہاز چھوٹنے سے کچھ پہلے انھوں نے آکر اطلاع دی کہ کوئی صورت پیدا نہ ہو سکی۔ انجام کار جہاز روانہ ہو گیا اور میں اپنے تمام رفقاء کے ساتھ جدہ میں رہ گیا اب پریشانی کا وہ عالم کہ الامان والحفیظ کتنے حجاج تھے کہ کھانے کا ٹھکانا نہیں تھا، اور کتنے تھے جو کم و بیش ایک ماہ سے جدہ میں پڑے ہوئے اکتا گئے تھے اور ابھی کم از کم بیس پچیس دن سے پہلے جہاز ملنے کی کوئی توقع نہیں تھی، دن رات یہی ذکر اور شب و روز یہی فکر تھی، حجاج کا ہجوم در ہجوم قدوائی کو قنصلیہ میں اور جب وہ روزانہ شام کو مدینۃ الحجاج آتے تو یہاں پر گھیرے رہتا تھا، مگر قدوائی کے پاس سوائے تسلی و دلاسا کی باتوں کے دوسرا کیا علاج تھا، ہاں ناداروں کی تکلیف کا ان کو اور انجمن خدام النبی والوں کو احساس اور اس کی فکر بہت تھی، اس لئے خدام النبی والوں نے دونوں وقت قنصلیہ کھانا پکوا کر ایسے حجاج کو کھانا کھلانے کا انتظام کیا اور جہاز آنے تک روزانہ سیکڑوں آدمیوں کو دونوں وقت کھانا کھلاتے رہے، اس فیاضی کا سہرا دراصل ہمارے دوست سیٹھ احمد غریب کے سر ہے، مگر راتوں کو جاگ کر اور دن میں دوڑ دھوپ کر کے انتظام کرنا اور اتنے بڑے کام کو خوش اسلوبی سے انجام دینے کا سہرا ہمارے دیرینہ محب مخلص مولوی احمد عبداللہ صاحب (بمبئی) کے سر ہے۔

جہاز کے انتظار میں دوسرے حجاج کے ساتھ ۱۱ دن ہم بھی جدہ میں پڑے رہے، قدوائی صاحب کا سخت اصرار تھا کہ آپ قنصلیہ میں آجائیں میں نے کہا: میں تنہا نہیں ہوں اور رفقاء سے علحدہ بھی نہیں ہونا چاہتا، تو انھوں نے سب رفقاء کو

ساتھ لانے کیلئے بار بار اصرار کیا مگر میری طبیعت آمادہ نہیں ہوئی، اور معذرت کرتا رہا، کسی کسی دن بہت مجبور کر کے انھوں نے اپنے ساتھ کھانا بھی کھلایا، ایک دن موٹر بھیج کر اپنے (یہاں) بلایا، قدوائی صاحب کی ان عنایتوں کا میں شکر گذار ہوں، مگر اس سال ہزار ہا حجاج کو کم وبیش مہینہ مہینہ بھر جدہ میں پڑے رہنے اور بہت سے پہلے آنیوالوں کو بعد میں اور بعد میں آنے والوں کو پہلے جہاز میں جگہ مل جانے کی شکایت بھی مجھ کو ان سے ہے اور اس کا تمامتر ذمہ دار میں انھیں کو سمجھتا ہوں، اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ان کے عملہ میں ایسے لوگ موجود ہیں جو بعد میں آنیوالوں کو دوسرے مستحقوں کے مقابلہ پہلے بک کرتے ہیں اور قدوائی صاحب کا دامن بھی اس سے پاک نہیں ہے، فرق یہ ہے کہ قدوائی محض مروت اور پاس ولحاظ کی بنا پر ایسا کرتے ہیں اور دوسروں کی نسبت بیسیوں حجاج کی زبانی دوسری باتیں بھی میں نے سنی ہیں۔

اس سلسلہ کے ایک دلچسپ واقعہ کی (جس کا الزام میں قدوائی صاحب یا ان کے عملہ کو نہیں دیتا) تحقیق تو میں نے کی اور سچ پایا اور وہ یہ کہ سورت کے دو دولتمند حاجیوں کو واپسی کی جلدی تھی، مگر جہاز میں جگہ نہیں تھی اور دوسرے لوگ ان کے مقابلہ میں زیادہ مستحق تھے تو انھوں نے یہ تدبیر کی کہ ایک حاجی اور ان کی بیوی کا حق سفر چار سو روپے میں خرید لیا اور ان کی بکنگ کینسل کرا کے اپنی بکنگ کرالی، جن مراد آبادی حاجی نے اپنا اور اپنی بیوی کا حق بیچا تھا میں نے خود اس کو پوچھا تو انھوں نے اس کی تصدیق کی۔

بہت سے لوگ قنصلیہ کے ڈاکٹر سے بیماری کا سرٹیفکٹ حاصل کر کے بھی دوسرے صحیح مستحقوں کا حق غصب کر کے مستحق بن جاتے ہیں، یہ باتیں انتظامی حیثیت سے سخت معیوب و قابل شکایت ہونے کے علاوہ شرعی حیثیت سے بھی سخت ناپسندیدہ ہیں جن کا لحاظ ان لوگوں کو کرنا تو بہت ضروری ہے جو

ہزاروں روپیہ صرف کر کے ایک فریضۂ شرعی کی ادائگی کیلئے ہزاروں میل کا سفر کرتے ہیں۔

جدہ میں جبری قیام شروع ہونے کے وقت ہی سے میرا خیال تھا کہ یہاں جدہ میں رہ کر کیا کریں گے، اس موقع کو غنیمت سمجھنا چاہئے اور جب تک جہاز نہیں ملتا اس وقت تک مکہ معظمہ میں قیام کرنا چاہئے، مگر مولوی احمد عبداللہ صاحب سے معلوم ہوا کہ ہوائی جہاز کی ایک کمپنی سے بات چیت ہو رہی ہے، اور عنقریب معاملہ طے ہو کر ایک جہاز بمبئی جائے گا، آپ بھی اسی سے چلے جائیے، پانی کے جہاز میں میرا ٹکٹ فرسٹ کلاس کا تھا اور صرف واپسی کا جو کرایہ ہوائی جہاز کا انھوں نے بتایا، اس میں اور پانی کے جہاز کے کرایہ میں کچھ زیادہ تفاوت نہیں تھا، اس لئے میں بھی یہی سوچنے لگا کہ ہوائی جہاز ہی سے چلا جاؤں، دوسرے لوگوں سے مشورہ کیا تو انھوں نے بھی یہی رائے دی، اس وجہ سے میں اب ہوائی جہاز کا انتظار کرنے لگا، مگر جب کئی دن گذر گئے تو میں نے یہ طے کر لیا کہ اب میں مکہ معظمہ چلا جاؤں گا، چنانچہ ۳ر نومبر ۱۹۵۲ء م ۱۴ر صفر ۱۳۷۲ھ کو میں مکہ چلا گیا اور چلتے چلتے مولوی احمد عبداللہ نے مجھ سے یہ کہا آپ جائیے بات طے ہو جائیگی تو میں روانگی سے ایک دن پہلے فون سے آپ کو مطلع کر دوں گا، اب کی دفعہ مکہ پہونچ کر میں نے یہ ارادہ کیا کہ کسی مکان میں رہنے کے بجائے حرم محترم ہی میں رات گذارنے کا کوئی ٹھکانا بنانا چاہئے، چونکہ موسم اب بہت خوشگوار ہو گیا تھا اس لئے سردی گرمی کا بھی کوئی سوال نہیں تھا، بہت آسانی سے شب و روز حرم میں رہنا ممکن تھا، الحمد للہ کہ ایک ہفتہ تک اسی صورت سے مکہ میں قیام ہوا۔ وہاں پہونچنے پر کسی طرح ہمارے معلم سید حسن اکبر کو ہماری آمد کی خبر معلوم ہو گئی دوسرے دن فجر کی نماز اور طواف سے فارغ ہو کر میں مطاف سے نکل رہا تھا کہ سید حسن اکبر مجھے حاشیۂ مطاف پر بیٹھے ہوئے نظر آئے، سلام و مصافحہ کے

بعد انھوں نے میرا ہاتھ پکڑ لیا کہ چلئے! میں نے کہا: کہاں؟ انھوں نے کہا چلئے ناشتہ کر لیجئے، میں ان کے ساتھ ہو لیا، راستہ میں انھوں نے شکایت کی کہ آپ میرے گھر کیوں نہ اترے اور وہیں قیام کیوں نہ کیا، میں نے پوری بات ان کو سمجھائی تو وہ اس پر راضی ہوئے کہ اچھا قیام کے باب میں اپنی مرضی پر عمل کر لیجئے مگر دونوں وقت کا کھانا اور ناشتہ بے تکلف میرے گھر کیجئے اور بلاوے کے انتظار میں نہ رہئے ، مجھ کو یہ بار ان پر ڈالنا تو گوارا نہ تھا مگر وہ کسی طرح نہیں مانے، اس لئے جب تک رہا ان کے گھر کھانا اور ناشتہ ہوا، حق تعالیٰ کا یہ بھی کرم ہے کہ اس نے یہ صورت پیدا کر دی، ورنہ ہر چند کہ میں دکان سے کھانا لیکر کھانے کا عزم مصمم کر کے گیا تھا مگر واقعہ یہ ہے کہ مجھ کو وہاں کے کھانے سے سیری نہیں ہوتی اور نہ وہ میرے مذاق کا ہوتا ہے۔ اس غیبی انتظام کی وجہ سے کھانے کا بہت آرام تھا، سید حسن اکبر کے اجداد کاٹھیاواڑ گجرات سے یہاں آئے ہیں اور اب بھی وہاں سے ان کے تعلقات ہیں، ان کی ایک بہن بہت اچھی اردو بولتی ہیں، وہ خود بھی اردو سے اچھے واقف ہیں، اس ہندوستانیت کی وجہ سے ان کے گھر کے کھانوں میں ہندوستانی کھانوں کا مزہ رہتا ہے، ایک دن انھوں نے بازار کا بہت عمدہ اور نہایت لذیذ ہریسہ بھی منگوا کر کھلایا، اس دفعہ قیام مکہ کے اثناء میں ایک دن سید عمر مدنی کے ایک عزیز کے یہاں شادی کی ایک دعوت میں بھی شرکت کی نوبت آئی، پہلے ایک نہایت چھوٹی سی پیالی جس میں قہوہ کی چند بوندیں تھیں، پیش ہوئی، تھوڑی دیر کے بعد دستر خوان بچھا اور بڑی بڑی تھالیوں میں پلاؤ لا کر رکھا گیا، اس کے ساتھ کچھ جلیبیاں بھی تھیں ، ایک ایک تھالی میں کئی کئی آدمیوں نے مل کر کھایا۔“

یہ روزنامچہ یہاں آکر ختم ہو جاتا ہے لیکن سفر ابھی پورا نہیں ہوتا، جس کی وجہ سے یہ داستان تشنۂ تکمیل رہ جاتی ہے، اس روداد سفر کو ہم بعض خطوط اور دیگر تحریروں سے پورا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس سفر کے دوران آپ نے جہاز اور حجاز سے اپنے اعزہ

اور متعلقین کو بہت سارے خطوط لکھے، آپ کے ایک شاگرد اور خادم خاص و حاضر باش مولوی مختار احمد مرحوم کا ذکر اوپر کئی مواقع پر آچکا ہے، علامہ اعظمی نے اس سفر میں ان کے پاس جو خطوط لکھے وہ خاصے دلچسپ ہیں، ان میں سے چند ایک ایسے ہیں جو بڑی شرح وبسط اور فرحت وانبساط کے عالم لکھے گئے ہیں، جن کا ذکر انشاء اللہ فائدہ سے خالی نہ ہوگا، ۲۷ر اگست ۱۹۵۲ء مطابق ۷رذی الحجہ ۱۳۷۱ھ بروز چہار شنبہ مکہ معظمہ سے لکھتے ہیں:

"صفا پر سید حسن اکبر صاحب کے مکان میں اس وقت قیام ہے، جس بالا خانہ پر ہم ہیں وہاں سے وہ مقام جہاں سے إن الصفا والمروة پڑھ کر سعی شروع کی جاتی ہے، شاید بیس گز کے فاصلے پر ہو، شب وروز مسلسل سعی کرنے والوں کی آوازیں کان میں آتی رہتی ہیں، اور ابتدائے مسعیٰ سے کئی گز دور تک ان کی سعی کا منظر نگاہوں کے سامنے ہے، چونکہ اس سال ۲۵ر برس کے بعد جمعہ کو حج ہو رہا ہے اس لئے مجمع بھی بہت زیادہ ہے، بعض اوقات ہمارے بالا خانہ کے سامنے تک سعی کی سڑک پر بھی صفیں لگ جاتی ہیں، آج رات میں بالکل صبح منیٰ کی روانگی ہے اب کئی دنوں کے بعد وہاں سے واپس ہو کر خط لکھنا ممکن ہوگا، اس لئے میں نے سوچا کہ آج فرصت نکال کر خط لکھ دوں، جہاز کے غیر وطنی رفقاء یہاں الگ الگ جا پڑے، اکثر سے ابھی تک ملاقات بھی نہیں ہوئی، وطنی لوگ البتہ چلے آرہے ہیں اور اکثر مسائل پوچھنے والے بھی آتے ہیں، کل مولانا عبداللہ زمزمی نے مالابار کے بہت سے پان ہدیہ کئے، ہم جو پان بمبئی سے لائے ہیں اکثر سوکھ چکے، پھر بھی امید ہے کہ عرفات ومنیٰ سے واپسی کے بعد بھی دو ایک دن چلیں گے، اس لئے ابھی تک اس کی تکلیف نہیں ہے، یہاں گرمی کافی ہے، لیکن تشویش کی کوئی بات نہیں ہے، بمبئی سے روانہ ہونے کے بعد آج پہلے دن میں نے مذاق کے مطابق کھانا پایا، جدہ میں بھی تقریباً بھوکا ہی رہا، میں بہت دبلا ہو گیا ہوں، مگر پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے،، الحمد للہ نہ مریض ہوں نہ کوئی دوسری بات، لیکن جہاز میں غذا نہ

ملنے کی وجہ سے لاغری ہے، ویسے طبیعت بحمد للہ ہشاش بشاش ہے، سید صاحب مجھ سے بھی اچھے ہیں۔"

جہاں ایک دنیا علامہ اعظمی سے عقیدت و محبت رکھتی تھی، وہیں اللہ کے کچھ بندے ایسے بھی تھے جن کو آپ سے بلاوجہ کی کداور پرخاش رہا کرتی تھی، اور جو وقتاً فوقتاً آپ کے درپئے آزار بھی رہا کرتے تھے، آپ جب حج کیلئے روانہ ہوئے تو اس قماش کے کچھ لوگوں نے آپ کی بابت کچھ بے سروپا باتیں اڑائیں، ممکن ہے آپ کے وہ حریف جو چند مہینے قبل یوپی اسمبلی کے الیکشن کے موقع پر آپ کے مقابلے میں بری طرح مات کھا چکے تھے بوکھلاہٹ کا شکار رہے ہوں اور آپ کی عدم موجودگی کا فائدہ اٹھا کر من گھڑت قصے مشہور کئے ہوں، اور اس کی خبر مولوی مختار صاحب نے خط کے ذریعہ آپ کو دی ہو تو اس کے جواب میں ۲۲ر ذی الحجہ ۱۳۷۱ھ مطابق ۱۱ر ستمبر ۱۹۵۲ء کو مکہ مکرمہ سے ایک خط میں یہ لکھنا پڑا ہو:

"میں نے شاستری جی کے باب میں کوئی خط مولوی حفظ الرحمٰن یا کسی دوسرے کو نہیں لکھا یہ کسی دشمن کی کارروائی ہے، میں اس قسم کی حرکات کا نہ عادی ہوں، نہ ایسی باتوں سے مجھے کوئی دلچسپی ہے، میری دوستی یا دشمنی اس طرح کی نہیں ہوتی۔"

اس سفر میں مولوی مختار مرحوم کے نام جو متعدد خطوط لکھے ان میں ایک مکتوب ۱۴ر محرم ۱۳۷۲ھ مطابق ۴ر اکتوبر ۱۹۵۲ء کا مدینہ منورہ پہونچنے کے دو تین بعد کا تحریر فرمودہ ہے، اس میں لکھتے ہیں:

"الحمد للہ کہ ہم لوگ یکم اکتوبر ۱۹۵۲ء کو عشا کے وقت مدینہ منورہ پہونچے، میری طبیعت بحمد اللہ اچھی تھی، اس لئے کوئی تکلیف نہیں، آنے کے ساتھ ہی تم لوگوں کے خطوط مل گئے تھے، مگر کچھ تو کسل اور کچھ یہاں کی مشغولی کی وجہ سے جواب آج لکھنے کی نوبت آئی، ابھی ابھی قبا وغیرہ سے واپس آیا ہوں، یہاں کا موسم مکہ معظمہ سے اچھا ہے، اس دفعہ مولانا مدنی کے بھائی کے مدرسہ میں

قیام ہے، مفتی مہدی حسن صاحب وغیرہ کا ساتھ ہے، مسجد نبوی اور مدرسہ کے درمیان سوائے راستہ کے کوئی دوسری چیز حائل نہیں ہے۔"

مدینہ منورہ سے ہی ۲۳؍ محرم مطابق ۱۳؍ اکتوبر کو ایک بہت مفصل خط لکھا، پورا خط نقل کرنے کی گنجائش نہیں، مگر اس کا کچھ حصہ ہدیۂ ناظرین ہے، لکھا ہے:

"...میں نے تم سب کی طرف سے، حضور اقدس میں سلام عرض کر دیا ہے، اپنے حق میں اکثر سلام کے بعد عرض کیا کرتا ہوں

فکن لی شفیعا یوم لا ذو شفاعة : بمغن فتیلا عن حبیب بن صابر(۱)

... گھر پر خرچ کیلئے معلوم نہیں روپیہ ہے یا نہیں، رشید احمد نے کچھ نہیں لکھا، مفتی صاحب وغیرہ اور سارے حجاج بہت پریشان ہیں، جدہ میں ہوتا تو تم لوگوں کے خطوط سے جی بہلتا مگر وہاں کا قیام بہت تکلیف دہ ہے، تم لوگوں کا جی اب مجھ سے بھر گیا اس لئے کچھ خیال نہیں کرتے، حالانکہ میں یہاں پہونچ کر بھی تم لوگوں کو نہیں بھولا، اپنے بچوں وغیرہ کے ساتھ تم لوگوں کو ہر موقع پر یاد رکھا

(۱) صحابی رسول حضرت سواد بن قاربؓ کا شعر ہے، جسے علامہ اعظمی نے اپنے حسب حال بنایا ہے، اصل شعر یوں ہے:

فکن لی شفیعا یوم لا ذو شفاعة بمغن فتیلا عن سواد بن قارب

سرکار رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں کہے گئے ایک قصیدے کا یہ آخری شعر ہے، جس کو احمد بن عبدالسلام جراوی نے الحماسة البصریة (۷۸/۱) میں غلطی سے ایک دوسرے صحابی سواد بن غزیہ کی طرف منسوب کیا ہے، جبکہ حافظ ابو نعیم اصفہانی نے معرفة الصحابة (۱۴۶/۳) اور حافظ ابن حجر عسقلانی نے اصابہ (۹۶/۲) میں اس کی نسبت سواد بن قارب کی طرف کی ہے، ان دونوں کتابوں میں الفاظ کا ذرا سا فرق ہے اور "بمغن فتیلا..." کی جگہ پر "سواك بمغن ..." ہے۔ شعر کا مطلب یہ ہے:
(میری اس دن شفاعت فرمایئے جس دن کوئی شفاعت کرنے والا سواد بن قارب (حبیب بن صابر) کے کچھ کام نہیں آسکتا)

بہرحال جو مجھے پوچھتا ہو اس کو سلام کہو، اگرچہ غریب الدیار و آوارہ وطن کو پوچھ ہی کون سکتا ہے، میں نے رشید احمد کو نہیں لکھا کہ اس سفر میں جب بھی اپنے بچے یا تم لوگ یاد آگئے ہو نم دیدہ ہو گیا ہوں، مگر تم لوگوں کیلئے یہ طویل فرصت آزادی، بے قیدی اور اپنی مرضی کے مطابق رہنے سہنے کا ایک زریں موقع ہاتھ آگیا ہے۔ خیر مجھے یقین ہے آج نہیں تو کل میری قدر ہو گی، خط طویل ہوتا جاتا ہے اور جو کچھ لکھنا چاہتا ہوں اس کا عشر عشیر بھی نہیں لکھ سکا اور نہ لکھ سکتا، کوشش کرو کہ بے کہے سمجھ جاؤ۔

اگر کوئی دوسرا انتظام نہ ہو سکا تو غالباً یکم نومبر کو یہاں سے روانگی ہو گی، یہ سولہ دن خدا بہتر جانتا ہے کیسے کٹیں گے، مسجد نبوی میں جتنی دیر ٹھہرنا ہوتا ہے وہ ساعت تو غنیمت کبریٰ ہے، اس وقت نہ کوئی گھبراہٹ ہوتی ہے نہ پریشانی، مگر مسجد سے باہر جو وقت گذرتا ہے مشکل سے ختم ہوتا ہے، لیکن ہمہ وقت مسجد میں رہنا بھی ممکن نہیں ...."

۱۴/ اکتوبر کو جدہ سے تحریر فرما رہے ہیں:

"میں آج خط لکھنے کے قابل نہیں ہوں، زکام، درد سر اور درد جسم سے پریشان ہوں، ۱۶۔ا۔ کا جہاز کل ۲۳/ کو روانہ ہو گیا اور ان شاء اللہ ۸۔ نومبر کو غالباً یہی جہاز روانہ ہوگا، جس سے تمام رفقاء سفر روانہ ہوں گے، میں بہت کمزور ہو گیا اور اب زیادہ قیام سے جی بھی گھبرا رہا ہے اور کمزوری بھی بڑھتی جاتی ہے، اس لئے مجبوراً ۲۸/ اکتوبر کو ہوائی جہاز سے ان شاء اللہ تعالیٰ چلا آؤں گا، مولوی عبدالجبار کی رفاقت ومعیت کی حرص میں کل کا جہاز ٹکٹ ملنے کے باوجود چھوڑ دیا، مگر اب مصلحت یہی معلوم ہوتی ہے کہ ہوائی جہاز سے چلا آؤں۔"

۶/ نومبر کو مکہ معظمہ سے لکھے گئے ایک خط میں ارقام فرماتے ہیں:

"عزیزم مختار احمد سلمہ اللہ

سلام مسنون ودعاہا، میں ۳؍نومبر سے مکہ مکرمہ میں ہوں، تم لوگ ہوائی جہاز سے میرا انتظار کر رہے ہو گے، مگر یہاں قصہ ہے کہ ۔

قسمت تو دیکھئے کہ کہاں ٹوٹی جاکمند   دو چار ہاتھ جب کہ لب بام رہ گیا

۲۸ کے بعد خبر ملی کہ ۳۱؍اکتوبر کو جہاز جائے گا، مگر ۳۱ کو یہ اطلاع پہونچی کہ اب ۲؍نومبر کو جائے گا اور اب انشاء اللہ اس میں تخلف نہ ہوگا، مگر افسوس کہ ۲؍کی صبح بالکلیہ پیام یاس سنا دیا گیا، اس لئے میں ۳؍کو یہاں چلا آیا، اور ۵؍کو مولوی عبدالجبار کو بھی یہیں بلا لیا، خیال تھا کہ یہاں سے بعد نماز جمعہ (۷۔نومبر کو) جدہ اور ۸ کو جدہ سے بسوئے بمبئی روانگی ہوگی مگر ۔

ما کل ما یتمنی المرء یدرکه   تجری الریاح بما لا تشتهی السفن

اب یہ اعلان ہو گیا کہ مظفری ۱۴؍کو جدہ سے روانہ ہوگا، عزیز من! حق تعالیٰ کی بندہ نوازی ہے کہ اس نے اس سفر میں دوبارہ اپنے گھر کی زیارت کرائی، اور اب کی دفعہ بحمدہ تعالیٰ شب و روز باب الوداع پر، عین اس جگہ جہاں بیت ام ھانی تھا، رہتا ہوں ، اور "مان نہ مان میں تیرا مہمان" بس انھیں کا مہمان بنا ہوا ہوں، وہ اپنے بندوں سے مہمان نوازی کراتے ہیں، میں یہاں اپنے ساتھ بدن کے کپڑوں کے سوا کچھ نہیں لایا ہوں، حتی کہ رومال بھی جدہ میں چھوڑ آیا ہوں، مگر الحمد للہ بستر تکیہ چادر سب موجود ہے، پان کا سامان بھی مل گیا ہے، الحمد للہ سوکھے پانوں کے بنے ہوئے بیڑے ہمہ وقت مہیا ہیں، شب و روز میں کسی وقت "سیاہ پوش نگار" آنکھوں سے اوجھل نہیں ہوتا، راتوں کو (اولاً چاندنی راتیں ہیں، پھر بجلی کے قمقمے اندھیری راتوں کو بھی حرم میں شب ماہتاب بنائے رہتے ہیں) گھنٹوں بیٹھا اس کے دیدار سے آنکھوں کو منور اور دل کو مسرور کرتا رہتا ہوں، لیکن ان تمام باتوں کے باوجود اس گھر کے مالک نے اپنے بندوں کے قلوب میں جو رحمت و مودت ودیعت

فرمائی ہے اس کے تقاضا سے اعزہ اقرباء کی اس تکلیف کے تصور سے جو ان کو ہمارے انتظار میں ہوگی ایک قلبی اذیت ہے، مگر افسوس کہ اس کا کوئی علاج اختیار میں نہیں ہے، میں تو آج آمادہ ہوں کہ کوئی جہاز ارزاں نرخ پر ہندوستان پہونچا دے تو چلا آؤں، مگر جس کے گھر ہوں جب تک اس کا حکم نہ ہو کچھ نہیں ہو سکتا وما تشاؤن الا ان یشاء اللہ رب العالمین ...."

اس سفر سے آپ کی واپسی بذریعہ ہوائی جہاز ہوئی، راستے میں کئی مقامات پر توقف کرنے کے بعد بمبئی پہونچے اور وہاں پر کئی دن کے قیام کے بعد مئو کیلئے روانہ ہوئے، اور کس سادگی سے مئو پہونچے اس کی نسبت ایک مختصر سی یادداشت میں لکھتے ہیں:

"۹ر نومبر ۱۹۵۲ء ۲۱ر صفر ۷۲ ۱۳ھ کو جدہ ہوائی اڈہ پر جیبوتی ایرویز پر ۹ر بجے عربی ٹائم (۳ بجے شب) سے سوار ہوئے، ۲۔ بجے عربی (۱۰ر نومبر تقریباً ۸ بجے صبح) بحرین ہوائی اڈے پر پہونچے، تھوڑی دیر کے بعد شہر میں ایک ہوٹل میں قیام کیا، بعد نماز ظہر بحرین کے بازار کی سیر کی، یہاں ہندوستانی تاجر دوکاندار بہت ہیں، اردو عموماً لوگ سمجھ لیتے ہیں، عربی اور ایرانی زیادہ بولی جاتی ہے، اصل زبان عربی ہے یہاں تازے پان ملتے ہیں، ۴ر کے ۸ پان ہم نے بھی لئے۔

۱۰ر نومبر ۳ بجے شب میں ہوائی جہاز بحرین سے روانہ کر ۱۱ر نومبر ۷ بجے صبح مسیرہ پہونچا، وہاں سے ۸۔ بجے اٹھا اور بمبئی ۲۔ بجے دن میں سانتا کروز پر اترا۔ ۱۳ر کو ساڑھے بارہ بجے شب میں کاشی اکسپریس سے ہم مئو روانہ ہوئے۔

۱۵ر نومبر ۱۹۵۲ء کو ہم ۱ بجے دن مئو اشٹیشن پہونچے، ہم نے کسی کو اطلاع نہیں کی تھی، اس لئے اشٹیشن پر یا بنارس میں کوئی نہیں ملا، جس کی خوشی کوئی ہم سے پوچھے، مئو پہونچ کر دو رکشے کئے، ایک پر میں اور ایک پر مولوی عبدالجبار سیدھے اپنے مکان پہونچے۔"

لکھنؤ میں قیام اور دار المبلغین میں سلسلۂ افادات

امام اہلسنت مولانا عبدالشکور صاحب فاروقی علیہ الرحمہ سے آپ کا تعلق زمانۂ طالب علمی سے تھا، یہ تعلق روز افزوں رہا اور مرور زمانہ کیساتھ اتنا قوی اور وسیع ہوا کہ حضرت امام اہلسنت کے جملہ اہل خانہ و متوسلین کے ساتھ رشتۂ صداقت و محبت قائم ہو گیا۔ ۱۳۵۱ھ میں امام اہلسنت نے لکھنؤ میں دار المبلغین قائم کیا تھا تو اس کو قوت واستحکام عطا کرنے کیلئے سب سے پہلے علامہ اعظمی کو دعوت دی تھی اور انھوں نے تقریباً دو مہینے دار المبلغین میں قیام فرما کر امام اہلسنت کی فرمائش کی بجا آوری کی تھی، علامہ اعظمی لکھتے ہیں:

"پھر جب امام اہلسنت نے دار المبلغین کی بنیاد ڈالی تو کام کی ابتداء اور بنیاد کو مستحکم کرنے کیلئے سب سے پہلے اس ناچیز کو منتخب کیا، ناچیز نے اس مقصد کیلئے کم وبیش دو ماہ دار المبلغین مین قیام کیا۔" (۱)

"اس طرح اس ادارہ کے قیام کے وقت سے کسی نہ کسی جہت سے آپ کی وابستگی رہی، لیکن جب ۱۹۵۲ مطابق ۱۳۷۱ھ میں بحیثیت ممبر اسمبلی آپ کا انتخاب عمل میں آیا تو پانچ سال تک لکھنؤ میں قیام پر مجبور ہوئے، علامہ اعظمی سیاسی آدمی تھے نہ سیاست سے آپ کو کوئی سروکار، آپ نے جو خالص علمی مزاج پایا تھا اس کے تحت حکومت کی طرف سے فراہم کردہ سرکاری قیام گاہ میں قیام نہایت وحشت خیز ثابت ہوتا، اور اس سے بھی زیادہ صبر آزما تعلیمی، تدریسی اور علمی سرگرمیوں سے بے تعلقی اور تصنیف و تحقیق کے مشاغل سے قطع تعلق ہوتا۔ اس پریشانی کا حل یہ نکالا کہ دار المبلغین میں قیام کرنے کو سرکاری قیام گاہ پر ترجیح دی،، اسی زمانہ میں دار العلوم ندوۃ العلماء اور وہاں کے منتظمین و متعلقین سے بھی آپ کے تعلقات بڑھے،

(۱) المآثر ج ۷ ش ۳ ص ۸۱

تعلقات پہلے بھی کبھی خراب نہ تھے، لیکن اس زمانہ میں مزید وسعت وقوت آئی، دارالمبلغین اور ندوۃ العلماء ان دونوں اداروں کے مدرسین و طلباء نے آپ کے لکھنؤ کے قیام کو غنیمت باردہ جانا اور خوب خوب کسب فیض کیا، اور خود علامہ اعظمی نے بھی وہاں کے کتب خانوں بالخصوص ندوہ کے کتب خانے میں موجود مطبوعات و مخطوطات سے بھرپور استفادہ کیا:

منعم بدشت وکوہ وبیاباں غریب نیست ہر جاکہ رفت خیمہ زدو بارگاہ ساخت

مولانا سعید الرحمٰن صاحب اعظمی ایڈیٹر البعث الاسلامی فرماتے ہیں:

”وفی هذه الایام بالذات أتاح الله سبحانه و تعالى لأستاذنا الجليل العلامة الأعظمی أن ينتخب عضواً فی مجلس الشيوخ لولاية اترا برادیش، و تحتم عليه أن يقضى معظم أوقاته فی لكناؤ ، و فعلاً رضی بالاقامة فی مدرسة دارالمبلغین التی أسسها امام أهل السنة فضيلة الشيخ الكبير عبدالشكور الفاروقی-رحمه الله- لتعليم العلوم الاسلامية و تدريب الطلبة على الاسلام على الوجه الصحيح ، فكانت اقامة العلامة المرحوم فی هذه المدرسة بمثابة سند قوى لطلبة العلم والمدرسين فيها الذين كانوا يراجعونه فی المشكلات العلمية و يستفيدون من وجوده ولا سيما علماء أسرة امام اهل السنة كالشيخ عبدالرحيم الفاروقی شقيقه الصغير والشيخ عبدالسلام الفاروقی نجله الكبير- رحمهما الله تعالى - و غيرهما و كانوا فرحين جدا باقامة العلامة الاعظمی فی هذه المدرسة ،وانتهزت أنا هذه الفرصة و تابعت زيارة الاستاذ الكبير والاستفادة منه، فكنت احضر كل يوم بعد صلاة العصروأجلس لديه وأستفيد منه ، واعتبرت ذلك نعمة من الله كبيرة علیّ. (۱)

---

(۱) البعث الاسلامی، جمادی الاولی ۱۴۱۳ھ۔ نومبر ۱۹۹۲ء۔ ص ۸۵۔۸۴

مولانا موصوف نے انھیں الفاظ کو معمولی سی کمی و بیشی کے ساتھ خود ہی اردو کا جامہ بھی پہنایا ہے، لہٰذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کا ترجمہ خود انھیں کی زبانی سن لیں:

"انھیں ایام میں علامہ اعظمی کو اسمبلی کا رکن منتخب کیا گیا جس کی وجہ سے لکھنؤ میں ان کا قیام لازمی سا ہو گیا، آپ امام اہلسنت مولانا عبد الشکور صاحب علیہ الرحمہ کے قائم کردہ مدرسہ دار المبلغین میں فروکش ہوئے، مولانا کی ذات مدرسہ کیلئے ایک نعمت غیر مترقبہ تھی، اس مدرسہ میں طلبہ سے لے کر اساتذہ تک علامہ اعظمی کے وجود کو مغتنم سمجھتے رہے، اور مشکل و پیچیدہ مسائل میں مولانا کی طرف مراجعت کیا کرتے۔ اس استفادہ میں خانوادۂ فاروقی کے افراد مولانا عبد الرحیم فاروقی ان کے برادر اصغر، اور مولانا عبد السلام صاحب فاروقی پیش پیش تھے اور اپنی قسمت پر ناز کرتے تھے۔ معمول یہ تھا کہ عصر کے بعد علامہ اعظمی کی مجلس لگتی تھی جس میں مستفیدین اور بڑے بڑے علماء کرام موجود ہوتے تھے، میں بھی مجلس میں پابندی کے ساتھ حاضر ہوتا اور زریں موقع سے استفادہ کی بھرپور کوشش کرتا رہا(۱)

جمعیۃ علماء ہند کی رکنیت | سرگرم سیاست سے آپ کا تعلق اگرچہ نہیں تھا، لیکن قومی و ملی مسائل سے آپ کی دلچسپی تقسیم وطن سے پہلے بھی رہی اور بعد بھی، اور یہی محرک تھا کہ جمعیۃ العلماء کے جلسوں اور اجلاسوں میں اکثر و بیشتر شرکت فرماتے، جمعیۃ کے اراکین و عہدیداران کے نزدیک آپ کو عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا اور آپ کی رائے اور مشورہ کی قدر کی جاتی تھی، جس کا اندازہ ذیل میں مذکور دو خطوں سے ہوگا جو مولانا احمد سعید دہلوی (۲) کے لکھے ہوئے ہیں، پہلا خط ۱۴ مئی ۱۹۴۴ء کا نوشتہ ہے، اس کی

(۱) ترجمان الاسلام ش ۱۳ ص ۱۹۔۱۸

(۲) حافظ احمد سعید دہلوی جمعیۃ علماء ہند کے ناظم و صدر کے عہدوں پر فائز رہ چکے تھے، اپنے وقت کے =

عبارت یہ ہے:

" مخدوم و مکرم زید مجدکم

السلام علیکم۔ ایک عریضہ پیشترار سال خدمت کر چکا ہوں، اس گرمی میں آپ کو تکلیف دینے کی وجہ یہ ہے کہ بعض معاملات نہایت اہم پیش آگئے ہیں، مسئلہ حج کے متعلق ابھی آواز بلند نہ کی گئی تو امسال بھی حج کی اجازت ملنا موہوم ہوگا، اسی طرح فلسطین میں سخت قوانین کا نفاذ ہو رہا ہے۔ عراق و ایران کی آزادی کا مسئلہ ہے، سب سے بڑی بات یہ ہے کہ کانگریس اور لیگ کی گفتگو شروع ہونے والی ہے، اور گورنمنٹ سے غالباً کوئی سمجھوتہ ہوگا، اس سے پیشتر کہ یہ باتیں ہوں، جمعیۃ علماء ہند کی تجویز جو لاہور میں پاس ہوئی ہے اس کا اعلان کرنا ہے، اسی طرح مقامی صوبہ دہلی کے بعض امور ہیں جن کے متعلق آواز بلند کرنی ہے ان تمام امور کا خیال کرتے ہوئے آپ کی شرکت اس اجلاس میں بہت ضروری ہے۔

یہ بھی ممکن ہے کہ جمعیۃ علماء اور مسٹر جناح کا بھی آپس میں تبادلہ خیالات

=بلند پایہ اور زبان آور خطیب تھے، زور خطابت کی وجہ سے "سحبان الہند" کے خطاب سے سرفراز ہوئے، ۱۸۸۸ء میں دہلی میں پیدا ہوئے، تعلیم کا آغاز حفظ قرآن سے کیا، ۱۳۲۸ھ میں مدرسہ امینیہ دہلی میں داخل ہوئے اور وہیں سے ۱۳۳۶ھ میں فراغت پائی، ملکی سیاست میں نہایت سرگرمی سے حصہ لیا۔ جہاد آزادی میں پیش پیش اور انگریزی حکومت کے خلاف بر سر پیکار رہے، اپنی سیاسی زندگی میں ۸ دفعہ جیل گئے، جمعیۃ علماء ہند کے ناظم اعلیٰ رہے اور مولانا مدنیؒ کے انتقال کے بعد اس کے صدر منتخب ہوئے، ۱۹۴۷ء میں ہندوستان کی آزادی کے بعد مسلمانوں پر جو قیامت ٹوٹی اور بالخصوص دہلی کے مسلمانوں پر جو تباہی نازل ہوئی، اس میں مسلمانوں کی حفاظت کیلئے مثالی اور ناقابل فراموش کارنامہ انجام دیا، ۴؍ دسمبر ۱۹۵۹ء مطابق ۱۳۷۹ھ کو دہلی میں وفات پائی۔

(کاروان رفتہ ۲۱-۲۰)

ہو، لہٰذا دہلی پہنچنا آپ کا ضروری ہے۔"

اس خط کے دو ہی دن بعد ۱٦ر مئی ۴۴ء کو ایک اور خط میں لکھتے ہیں:

"محترم و مکرم زید مجد کم

السلام علیکم۔ جناب کی خدمت میں یکے بعد دیگرے دو عریضے ارسال کر چکا ہوں، میرے ان عریضوں سے جمعیۃ علماء صوبہ کے سالانہ اجلاس کی اہمیت اور ضرورت کا علم ہو گیا ہو گا، میں آپ کے جواب کا بے چینی سے انتظار کر رہا ہوں، آپ کے جواب موصول ہونے پر پروگرام کی ترتیب موقوف ہے۔ آخر میں یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ آپ کو تین دن کی نیت سے آنا چاہئے تاکہ سبجیکٹ کمیٹیوں میں آپ کی رائے اور اجلاس عام میں آپ کی تقریر سے استفادہ کیا جا سکے..."

مذکورہ بالا دونوں اقتباسات سے جمعیۃ علماء کے اعلیٰ عہدیداروں کے نزدیک علامہ اعظمی کی رائے اور مشورے کی قدر و قیمت کا بآسانی اندازہ لگایا جا سکتا ہے، یہ دونوں خط جس وقت کے ہیں ممکن ہے صوبائی جمعیۃ کی رکنیت حاصل رہی ہو، اس وقت تک آپ مرکزی جمعیت کے رکن نہیں ہوئے تھے، تا آنکہ ۱۹۵۳ء میں شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی علیہ الرحمہ نے مرکزی جمعیۃ علماء ہند کی رکنیت کے لئے آپ کا انتخاب فرمایا، اس وقت کے ناظم عمومی مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی ایک خط میں جو ۱۱ر اگست ۱۹۵۳ء کا مکتوب ہے اطلاع دیتے ہوئے ارقام فرماتے ہیں:

"بڑی مسرت کے ساتھ یہ اطلاع آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں کہ صدر محترم حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی مدظلہ العالی نے مرکزی جمعیۃ علماء ہند کی مجلس عاملہ کی چند خالی شدہ نشستوں میں سے ایک نشست پر آپ کو بحیثیت رکن نامزد فرمایا ہے۔

امید ہے کہ آپ اس نامزدگی کو قبول فرمائیں گے اور بواپسی ڈاک اپنی

منظوری سے مجھے مطلع فرما کر ممنون فرمائیں گے۔"

مجلس انتظامی دارالعلوم ندوہ کی رکنیت ۱۹۵۴ء میں دارالعلوم ندوہ نے بھی اپنی انتظامی کمیٹی کا رکن منتخب کیا، ۵/اپریل ۱۹۵۴ء کو لکھے گئے ایک خط میں ناظم ندوہ مولانا ڈاکٹر عبدالعلی مرحوم نے اس کی اطلاع دی:

"میں دلی مسرت کے ساتھ اطلاع دیتا ہوں کہ مجلس انتظامی ندوۃ العلماء منعقدہ ۲۵/مارچ ۵۴ء نے آپ کو مجلس انتظامی ندوۃ العلماء کا رکن منتخب کیا ہے، امید ہے کہ آپ اس انتخاب کو منظور فرمائیں گے اور ازراہ کرم اپنی منظوری سے مجھ کو مطلع کریں گے۔"

یرقان کی بیماری اور شفایابی ۱۹۵۵ء کے اواخر میں آپ کے اوپر یرقان کی شدید بیماری کا حملہ ہوا، جس کی نسبت تحریر فرمایا ہے:

"ابتلائے فقیر حبیب الرحمٰن الاعظمی بمرضِ یرقان بتاریخ ۲۴/دسمبر ۵۵ء وشفایابی ازاں در اواخر جنوری ۵۶ء مطابق اوائل جمادی الاخری ۱۳۷۵ھ"
(فقیر حبیب الرحمٰن الاعظمی ۲۴/دسمبر ۵۵ء کو یرقان کی بیماری میں مبتلا ہوا، اور جنوری ۵۶ء کے اواخر مطابق جمادی الاخری ۱۳۷۵ھ کے اوائل میں اس سے شفایاب ہوا)

بیماری کی اس خبر سے علمی حلقوں میں تشویش واضطراب کی لہر دوڑ گئی، اہل علم نے جب اس تشویشناک خبر کو سنا تو آپ کی صحت و تندرستی اور خیر وعافیت کے لئے خدا سے دعا مانگی، چنانچہ یہ خبر جب روزنامہ "الجمعیۃ" میں شائع ہوئی تو مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی (۱) نے آپ کے پاس ۱۶/جنوری ۱۹۵۶ء کو یہ خط لکھا:

(۱) مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی ۱۱/صفر ۱۸۹۲ء کو لدھیانہ میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم لدھیانہ جالندھر اور امرتسر کے مدرسوں میں پائی، اور دارالعلوم دیوبند سے فراغت حاصل کی، پوری زندگی =

"۰۰۰ آج اخبار الجمعیۃ میں یہ خبر پڑھ کر بہت ہی تشویش ہو گئی ہے کہ آپ یرقان کی بیماری میں شدید مبتلا ہیں، اور اخبار میں یہ بھی لکھا ہے کہ غذا نہ ملنے کے باعث کمزوری بہت بڑھ گئی ہے، میں نے جس وقت سے یہ خبر پڑھی ہے اسی وقت سے برابر آپ کے لئے دعا کر رہا ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو صحت کاملہ و عاجلہ عطا فرمائے ۰۰۰"(۱)

استدراک بر شرح مسند احمد عصر حاضر کے ایک بڑے مصری عالم و محدث شیخ احمد محمد شاکر نے مسند امام احمد بن حنبل کی تحقیق کر کے اسے شائع کیا شیخ احمد شاکر نے اس کتاب کی تیسری جلد میں یہ اعلان شائع کیا کہ:

"میں اطراف عالم کے علماء حدیث سے یہ امید کرتا ہوں کہ اس مسند پر جہاں کہیں ان کو کوئی استدراک یا ملاحظہ یا بحث و تعقیب نظر آئے، اسے میرے پاس بھیج دیں، ان ملاحظات کی تمحیص و تجزیہ کرنے کے بعد جو تحقیق سے میرے نزدیک صحیح ثابت ہوگا، ان کو میں آنے والے اجزاء میں ذکر کر دوں گا۔"

= انگریزوں کے خلاف جہاد کیلئے وقف کر رکھی تھی، جس کی پاداش میں متعدد بار قید و بند کی صعوبتیں جھیلیں، تحریک خلافت میں پیش پیش رہے، پھر جب مجلس احرار قائم ہوئی تو اس میں شامل ہو گئے، ایک عرصہ تک احرار کے صدر بھی رہے، شروع ہی سے جمعیۃ العلماء سے وابستہ ہو گئے تھے اور عرصۂ دراز تک اس کے رکن رکین رہے، آپ کا شمار احرار کے شعلہ بیان خطیبوں میں ہوتا تھا، تقسیم وطن کے بعد لدھیانہ سے دہلی آگئے اور زندگی کے باقیماندہ ایام وہیں گذارے، اور وہیں سے فساد کے شکار مظلوموں اور ضرورتمندوں کی حاجت روائی اور چارہ جوئی کیلئے جد و جہد کرتے رہے، ۱۱ر صفر ۱۳۷۶ھ کو دہلی میں وفات پائی، اور جامع مسجد شاہجہانی کے شمالی جانب اس کے ملحقہ قبرستان میں مدفون ہوئے۔ (تاریخ دار العلوم دیوبند ۲: ۱۴۶-۱۴۴۔ المآثر ج ۶ ش ۴ ص ۹۶-۹۵)

(۱) المآثر ج ۶ ش ۴ ص ۴۶

اس اعلان کے بعد آٹھ سال تک کہیں سے ان کو کوئی استدراک و تعقیب یا ملاحظہ موصول نہیں ہوا، آٹھ سال بعد ذیقعدہ ۱۳۷۵ھ میں مصر، بلکہ عالم اسلام سے ہزاروں میل دور سے ان کے پاس ایک طویل ترین استدراک پہنچا، جسے دیکھ کر شیخ احمد شاکر کی حیرت و مسرت کی انتہا نہ رہی، یہ استدراک علامہ اعظمی کا تھا، اس استدراک کو شیخ احمد شاکر نے مسند کی پندرہویں جلد میں بعینہٖ شائع کیا اور اس کی تمہید میں بڑے بلند آہنگ اور توصیفی الفاظ میں علامہ اعظمی کا ذکر کیا، اور شکریہ کا اظہار فرمایا، یہ استدراکات مسند احمد کی پندرہویں جلد کے پچاس صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں، جبکہ علامہ اعظمی نے صرف آٹھ ہی جلدوں پر استدراک لکھا تھا۔

دارالعلوم ندوہ میں صحیح بخاری کا درس جن دنوں آپ اسمبلی کے ممبر تھے آپ کی مدت رکنیت ابھی ختم نہ ہونے پائی تھی کہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے شیخ الحدیث شاہ محمد حلیم عطا کا صفر ۱۳۷۵ھ میں وصال ہو گیا، مولانا حلیم عطا کی وفات ندوہ کیلئے ایک عظیم حادثہ تھا، یہ ایسا سانحہ تھا جس کی وجہ سے وہاں کی مسند حدیث خالی ہو گئی تھی، لیکن یہ ندوہ کی خوش بختی تھی اور خداوند قدوس کا عجیب و غریب کرشمہ کہ ندوہ کو فوراً ہی ایک نعم البدل مل گیا، اہل ندوہ بالخصوص مولانا سید ابوالحسن علی میاں ندوی نے علامہ اعظمی کی خدمت میں یہ درخواست گذاری کہ وہ اپنی ذات سے دارالعلوم ندوہ کے اس خلا کو پر کریں، علامہ اعظمی بطیب خاطر اس خدمت کے لئے تیار ہو گئے اور کم و بیش ڈیڑھ سال تک اس کی مسند حدیث کو رونق و زینت بخشتے رہے، مولانا سعید الرحمن صاحب اعظمی ندوی نے ان تمام حالات کا بنفس نفیس مشاہدہ کیا ہے اور اپنے اس مشاہدے کی روشنی میں فرماتے ہیں:

"لقد كانت الايام تمضى وأنا مكب على الدراسة والاستفادة اذ قيض الله سبحانه و تعالىٰ أن تنتدب جامعة ندوة العلماء، محدث الهند الكبير الشيخ الاعظمي -رحمه الله- منتهزة فرصة اقامته في

لكناؤ، ولكى يشغل مشيخة الحديث فيها، التى حدثت بوفاة المحدث الكبير فضيلة الشيخ محمد حليم عطاء ـ رحمه الله ـ فى شهر صفر ١٣٧٥ھ (شيخ الحديث فى ندوة العلماء)، فما استطاع المحدث الاعظمى أن يرفض طلب سماحة العلامة الندوى، و أبدى استعداده لذلك خلال إقامته فى لكناؤ، مما بعث السرور فى النفوس أساتذة و طلابا ... و بدأ العلامة الأعظمى يدرس صحيح البخارى فى السنة النهائية للاختصاص فى الشريعة الاسلامية، و غمر السرور قلوب الطلبة و اعتزوا بذلك"

اس اقتباس کو اردو زبان میں خود مولانا سعید الرحمٰن صاحب کے قلم سے ملاحظہ فرمائیے، لکھتے ہیں:

"میں زندگی اسی انداز سے گذار رہا تھا کہ دارالعلوم ندوۃ العلماء نے لکھنؤ میں علامہ اعظمی کے قیام کو غنیمت سمجھ کر ان کی خدمات حاصل کرنے کی کوشش کی، تاکہ مولانا شاہ محمد حلیم عطا کی موت سے مسند حدیث ایک مدت سے جو سونی پڑی تھی، اس کو زینت بخشیں، یہ درخواست استاذ گرامی حضرت (مولانا علی میاں صاحب مدظلہ) نے کچھ اس طرح پیش کی کہ وہ اسے مسترد نہ کر سکے۔ اور لکھنؤ میں قیام کی حد تک اس کے لئے تیار ہو گئے، یہ خبر مژدۂ جانفزا بن کر طلبہ و اساتذہ کے درمیان پھیل گئی اور تمام لوگوں نے انتہائی مسرت کا اظہار کیا، اس زمانہ میں مولانا عمران خاں ندوی (۱) دارالعلوم کے مہتمم تھے، انھوں نے علامہ اعظمیؒ

(۱) مولانا عمران خاں ندوی بھوپال کے رہنے والے تھے، ندوہ سے فراغت پائی اور جامع ازہر مصر میں تعلیم حاصل کی، سید سلیمان ندویؒ کے شاگرد عزیز تھے، دارالمصنفین کے رکن اور ندوہ کے مہتمم رہ چکے تھے، بھوپال کی عظیم الشان مسجد تاج المساجد کی تعمیر نوان کا خاص اور یادگار کارنامہ ہے، انتظام و انصرام، عزم و ارادہ اور قوت عمل میں اپنی مثال آپ تھے، تقریباً ۱۸ سال تک ندوہ کے مہتمم رہے ۱۹۸۶ء [illegible]

کے گھنٹوں کی ترتیب قائم کی اوران کے قیام کا معقول انتظام کیا، اور علامہ اعظمی فضیلت کے سندی سال والوں کو بخاری شریف کا درس دینے لگے"(۱)

دارالعلوم ندوہ کی اس خدمت کا آپ نے کوئی معاوضہ نہیں قبول فرمایا، ندوہ کی طرف سے حق الخدمۃ کے طور پر کچھ رقم پیش بھی کی گئی مگر آپ نے وہ رقم لوٹادی، آپ کی تحریروں میں مولانا ابوالحسن علی میاں ندوی مدظلہ کے نام کا ایک خط ہے، جو ۲۳ر فروری ۱۹۵۷ء کا مکتوب ہے، پتہ نہیں اس کی نقل روانہ کی گئی یا نہیں، پھر بھی ہم اس کو قارئین کے ملاحظہ کیلئے نقل کئے دیتے ہیں، لکھا ہے:

"صدیقی المحترم سلام مسنون!

پرسوں پانچ سوروپیہ کا ایک بیمہ آیا تھا، میں نے اس کو واپس کر دیا ہے، اس سے آپ رنجیدہ خاطر نہ ہوں، جب میں آؤں گا اس وقت جو حکم آپ کا ہوگا بسروچشم منظور کروں گا، مگر اس وقت اس کو وصول کرنے کیلئے میری طبیعت کسی طرح آمادہ نہیں ہوئی۔

مجھے پہلے بھی شبہہ تھا اور اب اور قوی ہو گیا کہ شاید جو بات آپ نے طے کی تھی وہ کسی کو بار ہوئی اور اس پر عمل درآمد نہیں ہو سکا، اس لئے آپ نے یہ نئی صورت تجویز فرمائی، جس کا ذکر تقریراً یا تحریراً آپ نے کبھی نہیں کیا تھا، ایسی صورت میں جو میرے کھانے پینے پر مدرسہ کا صرف ہوا اسی کا مجھ کو افسوس ہے چہ جائیکہ مزید کوئی بار ڈالوں۔

کھانسی کی شکایت ابھی باقی ہے، دوا پی رہا ہوں، اب جناب کا مزاج کیسا ہے، مولانا منظور صاحب اگر ہوں تو ان کو بھی سلام کہئے، اور اگر ان کے سفر کا کوئی

= ۲۲ر اکتوبر ۱۹۸۶ء کو ۷۳ برس کی عمر میں وفات پائی، اور بھوپال میں مدفون ہوئے (دیکھئے معارف نومبر ۱۹۸۶ء و تاریخ ندوۃ العلماء حصہ دوم ص ۴۴۳)

(۱) ترجمان الاسلام ش ۱۳ ص ۱۹

پروگرام ہو تو اس سے مطلع فرمایئے کرم ہوگا"(۱)

(۱) مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے پاس جو خطوط دونوں بزرگوں کے موجود ہیں ان کی روشنی میں اس خط کا پس منظر مختصر طور پر ذکر کر دیا جائے، بظاہر سمجھ میں یہ آتا ہے کہ شاہ حلیم عطا علیہ الرحمۃ کے انتقال کے بعد علامہ اعظمی نے عارضی طور پر ندوہ کے اندر صحیح بخاری کا درس دینا منظور فرمالیا تھا، لیکن یہ صورت چونکہ عارضی تھی اس لئے ارباب مدرسہ بالخصوص مولانا علی میاں صاحب مدظلہ کو اس سلسلہ میں بڑی تشویش تھی، اور ان کی یہ شدید خواہش تھی کہ مولانا اعظمی ندوہ کے اندر مستقل قیام کو منظور فرمالیں، انھوں نے اپنی اس خواہش کا بڑے شد و مد کے ساتھ متعدد خطوط میں اظہار کیا اور وہاں کے مستقل قیام کیلئے اصرار کرتے رہے، اس سلسلے میں انھوں نے ۱۳ر محرم ۱۳۹۷ھ کو ایک خط لکھا:

"سب سے پہلے تو اس کا شکریہ ادا کرنا اپنا نہایت خوشگوار فرض سمجھتا ہوں کہ جناب والا نے خادمین دار العلوم کی یہ درخواست منظور فرمائی کہ حدیث شریف کا درس شروع فرمائیں، اس سے ہم کو جو اعانت و تقویت حاصل ہوئی اس کا اظہار الفاظ میں دشوار ہے، طلبہ و اساتذہ و منتظمین دار العلوم سب اس بات سے نہایت مسرور ہیں۔

لیکن چونکہ یہ صورتحال عارضی ہے اس لئے ایک بے اطمینانی سی ہے، دار العلوم کی تعلیم و انتظام کے بارے میں جو سکون و استقرار درکار ہے وہ ایسی صورتحال میں مفقود ہے۔

اس لئے میں آپ سے اب پر زور و با اصرار درخواست کروں گا کہ جناب والا دار العلوم سے مستقل تعلق تدریس کا فیصلہ فرمالیں، مجھے یہ معلوم ہے کہ بعض اہم اداروں نے اس سے پیشتر یہ پیشکش کی تھی اور آپ نے عذر فرمادیا تھا، لیکن ہم کو قوی امید ہے کہ آپ ہم کو مایوس نہ فرمائیں گے، بہت سے اسباب ایسے جمع ہیں جو آپ کے قیام کی سفارش کرتے ہیں اور امید دلاتے ہیں کہ آپ کی ذات سے یہاں انشاء اللہ نفع ہوگا، اور آپ کو یہاں پورا تعاون و اعتماد حاصل ہوگا اور سکون قلب و دماغ کے ساتھ علم دین کی خدمت کا موقع ملے گا۔

= ہم آپ سے اس وقت یہ چاہتے ہیں کہ آپ فی الفور صحیح بخاری پڑھائیں، جب نشاط و قوت محسوس ہو تو کچھ اضافہ فرمالیں۔

دارالعلوم اس وقت اپنی مالی دقتوں کے پیش نظر دو سو روپیہ ماہوار پیش کریگا۔۔۔"

جب مولانا علی میاں صاحب کا اصرار بڑھا تو آپ نے چند شرائط کے ساتھ اس درخواست کی منظوری کی ہامی بھرلی اور وہ بھی بجبر و اکراہ، علامہ اعظمی کی یہ بڑی خوبی تھی کہ جب کسی سے کسی قسم کا بھی معاملہ فرماتے تو اپنی افتاد طبع، صاحب معاملہ کی طبیعت و مزاج اور نباہ کے تمام پہلوؤں پر غور و فکر فرما کر اپنی شرائط پہلے ذکر فرمادیتے، اس کے بعد ان امور کی پابندی کی پوری کوشش کرتے، چنانچہ مولانا علی میاں کے پیہم اصرار کے بعد جو تحریر آپ نے لکھی وہ حسب ذیل ہے:

"آپ حضرات کی محبت، اخلاق اور پیہم اصرار کی وجہ سے آج میں اپنے کو جس کشمکش میں پاتا ہوں دوسرے کسی موقع پر ایسی سخت کشمکش سے میں دوچار نہیں ہوا تھا، ایک طرف طبیعت کسی پابندی کو قبول کرنے کیلئے کسی طرح آمادہ نہیں ہے، دوسری طرف آپ حضرات کی محبت اور اصرار کے پیش نظر اس پیشکش کو قطعی رد کردینے کی جرأت اس لئے نہیں ہوتی کہ اس سے بے مروتی اور جفا کا الزام اپنے اوپر عائد ہوتا ہے، اس کی شرمندگی الگ ہے کہ میرے آخری فیصلہ کے انتظار کی مدت زیادہ سے زیادہ طویل ہوتی جارہی ہے، جو آپ حضرات کیلئے موجب کلفت و اذیت ہے، اس لئے ہر چند کہ مجھے اب بھی پورا شرح صدر نہیں ہے لیکن آپ کی محبت کی قدردانی اور اصرار کے احترام کے تقاضے سے آج جناب کو مطلع کرتا ہوں کہ سردست میں دارالعلوم ند۔۔ سے تعلق کو ترجیح دیتا ہوں۔ اور اس یقین و اذعان کی بنا پر ترجیح دیتا ہوں کہ یہ تعلق میری وارستہ مزاجی و آوارہ طبعی سے مزاحم و مصادم نہ ہوگا، اور اس کی وجہ سے مجھ پر کوئی ایسی نا ملائم پابندی عائد نہ ہوگی جو قطع تعلق پر مجھ کو مجبور کردے، اس سلسلہ میں بعض جزئیات کی تصریح بھی=

= میں ضروری سمجھتا ہوں کہ ان کو سامنے رکھ کر آپ اور دوسرے ذمہ دار حضرات غور کر لیں کہ ان باتوں کی موجودگی میں میرا تعلق دارالعلوم کے مفاد کے خلاف تو نہیں ہے۔

(۱) میں مہینہ میں دو بار ایام تعطیل کے علاوہ تین تین دن غیر حاضر رہوں گا۔ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ دو دفعہ کے بجائے ایک ہی دفعہ چھ دن کیلئے غیر حاضر رہوں۔

(۲) مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند، مجلس عاملہ مرکزی جمعیۃ علمائے ہند، اور صوبائی یا مرکزی جمعیۃ کے سالانہ اجلاسوں کے مواقع پر بھی حسب ضرورت مدرسہ سے میں غیر حاضر رہوں گا۔

(۳) میں دن میں صرف دو گھنٹے کار تعلیم انجام دے سکتا ہوں، اس سے زیادہ کی ذمہ داری لینے کیلئے میری طبیعت آمادہ نہیں ہے۔

(۴) ان دو گھنٹوں کے علاوہ مجھ پر کوئی پابندی نہ ہوگی، ان گھنٹوں کے بعد میں جہاں چاہوں گا آجاسکوں گا۔

(۵) ان مستثنیات سے فائدہ اٹھانے کیلئے قانونی طور پر اجازت حاصل کرنا میرے لئے ضروری نہ ہوگا، اخلاقی طور پر صرف اطلاع دیدینا کافی ہوگا۔

ان شرائط کے ساتھ اپنی آمادگی کی اطلاع دیتے ہوئے میں گذارش کروں گا کہ ایک بار پھر غور کر لیا جائے کہ میری ذات سے مدرسہ کا جو فائدہ متوقع ہے وہ حاصل بھی ہوگا یا نہیں، جب کہ میرا حال یہ ہے کہ اب ہی کی دفعہ میں صرف چار دن کیلئے گھر آیا تھا، مگر ایسے حالات و واقعات پیش آئے کہ چار دن کے بجائے ۱۵۔ دن مدرسہ سے غیر حاضر رہنا پڑا، اور عنقریب اکتوبر کے مہینہ میں بسلسلۂ شرکت اجلاس جمعیۃ پھر ایسی ہی طویل غیر حاضری متوقع ہے۔

اچھی طرح غور و فکر کرنے کے بعد جو رائے ہو اس سے مجھے مطلع فرمائیں،

حبیب الرحمٰن الاعظمی

۲۱/ ستمبر ۱۹۵۶ء

=علامہ اعظمی کے مذکورہ بالا خط اور شرائط کے جواب میں مولانا علی میاں صاحب نے ایک خط ۲۰ر صفر ۱۳۷۶ھ کو لکھا، جس میں تحریر فرمایا:

"آپ نے اپنی تحریر گرامی میں جو تفصیلات درج فرمائی ہیں، وہ میرے نزدیک سوائے اس جز کے جس کا تعلق آپ کے ہر ماہ دو یا کم سے کم ایک سفر سے ہے کچھ اشکال کا باعث نہیں، اس جز میں بھی جو اشکال ہے وہ محض اس بنا پر ہے کہ اس وقت مدرسہ میں تعلیمی انہماک کی ایک مخصوص فضا پیدا کرنا نہایت ضروری ہے، اس لئے اگر آپ اس جز پر نظر ثانی فرماسکیں تو بہت بہتر ہوگا اور ہم لوگوں کی بڑی مساعدت، لیکن اگر اس میں ترمیم یا تخفیف کی مطلقاً گنجائش نہ ہو تو یہ تعلیمی سال بہر حال اس جز کے ساتھ بھی مکمل فرمادیں، اور آئندہ تعلیمی سال کے موقع پر پھر نظر ثانی فرمالیں..."

بہر حال علامہ اعظمی نے ندوہ سے تعلق کیلئے اپنی رضامندی یا نیم رضامندی کا اظہار فرمادیا، مگر چونکہ آپ نہایت حساس دل اور خوددار طبیعت کے مالک تھے اس لئے آپ کو ندوہ کے بعض ذمہ داران کے رویہ سے شاید اندازہ یہ ہوا کہ تمام حضرات ان شرائط سے خوش نہیں ہیں، لہذا آپ نے نہایت خوبصورت انداز میں معذرت فرمادی، جس کا قلق مولانا علی میاں مدظلہ کو بھی بہت رہا اور وہ بار بار خطوط میں اپنے اس قلق کا اظہار فرماتے رہے، حتی کہ انھوں نے اپنے ایک خط میں جو بہت مفصل ہے یہاں تک لکھا:

"میں اس وقت تک دارالعلوم کے تعلق پر اصرار کروں گا جب تک کہ آپ سختی سے منع نہ فرمادیں گے، اور آپ کا طرز عمل مجھے مایوس اور منع نہ کردے گا، جس کی آپ کے تعلق واخوت سے امید نہیں، اب اس کی درخواست کہ آپ اس مخلصانہ عریضہ کے جواب میں جلد ایسا خط لکھ دیں جس سے دل کو اطمینان ہو، اور یہ معلوم ہو جائے کہ آپ ہم سے ناراض نہیں ہیں۔"

ان تمام واقعات کے بعد علامہ اعظمی نے وہ خط تحریر فرمایا جو اوپر متن میں ذکر کیا گیا ہے۔

اسمبلی کی رکنیت کا اختتام اور وطن واپسی

پانچ سال بعد جب اسمبلی کی مدت رکنیت ختم ہوئی تو علامہ اعظمیؒ نے وطن واپسی کا قصد کیا، دارالمبلغین اور اس کے متعلقین و متوسلین کو تو آپ کی روانگی اور مفارقت کا افسوس تھا ہی، اہل ندوہ کی بھی آزردگی و افسردگی کچھ کم نہیں تھی، وہاں کے لوگوں کی خواہ منتظمین ہوں، اساتذہ ہوں، یا طلبہ، شدید ترین خواہش تھی کہ آپ مزید قیام فرماکر سلسلۂ درس وافادہ کو جاری رکھیں، لیکن آپ اس پر آمادہ نہ ہو سکے اور مدت رکنیت ختم ہوتے ہی لکھنؤ کو چھوڑ کر گھر کی راہ لی، مولانا سعید الرحمٰن اعظمی رقم طراز ہیں:

"وظل العلامة الأعظمي يفيد الطلاب بعلمه العميق و بصيرته النافذة الى أكثر من مدة سنة و نصف حتى اقترب موعد الانتخابات الجديدة التى جرت فى بداية عام ١٩٥٧م (١٣٧٧ھ) وأوشكت عضوية المجلس التشريعي للولاية على النهاية، ولم يعد له مبرر للإقامة المستقلة فى لكناؤ، فأراد أن يغادر الى وطنه و يشرف على شئون مدرسته، واعتذر عن الاستمرار فى العمل التدريسي، رغم أن جميع المسئولين الكبار لندوة العلماء، قد أصروا على بقائه فيها كمرجع علمي كبير" (١)

"علامہ اعظمی ڈیڑھ سال تک ابر کرم بن کر طلبہ اور اساتذہ پر یکساں برستے رہے، حتی کہ ۱۹۵۷ء میں جب نئے الیکشن کا زمانہ قریب آگیا اور اسمبلی تحلیل کر دی گئی تو اب پھر لکھنؤ میں قیام کا کوئی جواز باقی نہیں رہا اور واپسی کے ارادہ کا اظہار فرمایا، ہر چند کہ طلبہ، اساتذہ اور ذمہ داران مدرسہ نے قیام پر اصرار کیا لیکن آپ نے مزید اقامت سے معذرت کر دی، اور وطن مالوف اعظم گڈھ واپس ہو گئے، اور اپنے مدرسہ کے انتظام والصرام میں مصروف ہو گئے (۲)"

(۱) البعث الاسلامی ج نمبر ۷ ۳ ش ۹ ص ۸۶ (۲) ترجمان الاسلام ش ۱۳ ص ۲۰

لکھنؤ سے واپسی کے بعد بھی ندوہ سے تعلق صفحات گذشتہ میں جو واقعات بیان کئے گئے ہیں ان میں علامہ اعظمی اور مولانا علی میاں ندوی کی، ندوہ میں قیام کے سلسلے میں، مراسلت کی کچھ تفصیل بھی آئی ہے، جس سے یہ معلوم ہو چکا ہے کہ علامہ اعظمی نے اپنی طبیعت اور مزاج اور ذمہ داران کے بعض رویہ کا تجزیہ کرنے کے بعد ملازمت قبول نہ کرنے کو ترجیح دی، لیکن آپ کے اس فیصلہ کے بعد بھی مولانا علی میاں کا جو اصرار تھا، اس کے پیش نظر آپ کی وسیع الظرفی اسے یکسر نظر انداز بھی نہیں کر سکتی تھی، لہذا ندوہ سے تھوڑا بہت تعلق اس کے بعد بھی آپ نے باقی رکھا، چنانچہ قاضی اطہر مبارکپوری کو ایک خط میں ۲۳ر نومبر ۱۹۵۷ء کو لکھتے ہیں:

"میں اس دفعہ ندوہ اس لئے چلا گیا تھا کہ ان لوگوں کا اصرار تھا کہ اگر مستقل قیام سے انکار ہے تو عارضی طور پر ہفتہ دو ہفتہ کیلئے کبھی کبھی آ جایا کیجئے، چنانچہ اب کی دفعہ بارہ دن رہ کر آ رہا ہوں..."

یک حرف کاشکیست کہ صد جا نوشتہ ایم علامہ اعظمی کی لکھنؤ سے واپسی کے بعد بھی ایک مدت تک مولانا علی میاں صاحب کا اس بات کیلئے اصرار رہا کہ آپ اپنی خدمات ندوے کیلئے وقف کر دیں، ان کی یہ شدید ترین خواہش تھی اور اس خواہش کا اظہار بار بار وہ خطوط میں کرتے رہے، مولانا علی میاں صاحب ۲۶ر ستمبر ۱۹۶۷ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں:

"انھیں تحقیقات اور خصوصیات کی بنا پر میرے دل میں آپ کی جو قدر و منزلت ہے۔ اس کو خدا جانتا ہے، کاش کہ آپ پھر اس پر غور فرماتے، کہ آپ صرف دار العلوم میں قیام کر لیتے، اور صرف آپ سے رہنمائی حاصل کی جاتی، اور عام استفادہ کیا جاتا، اب کوئی شخص نظر نہیں آتا جس سے ہم جیسے طالب علم رجوع کریں بہر حال ع

یک حرف کاشکیست کہ صد جا نوشتہ ایم

مدرسہ شاہی مراد آباد سے دعوت | ۱۳۷۷ھ کے اوائل میں مدرسہ قاسمیہ شاہی مراد آباد سے آپ کو دعوت دی گئی کہ وہاں قیام فرما کر مدرسہ کے لوگوں کو استفادہ کا موقع عنایت فرمائیں، جس کیلئے مولانا فخر الدین صاحب صدر المدرسین و مہتمم مدرسہ شاہی مراد آباد(۱) نے آپ کے پاس ۲۸ر صفر المظفر ۱۳۷۷ھ کو درج ذیل خط لکھا:

ذوالمجد والکرم حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب دامت برکاتہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

"... ایک موذبانہ درخواست ہے اور امید ہے کہ جناب والا ضرور شرف قبولیت سے نوازیں گے۔ یہ تو میں جانتا ہوں کہ حضرت والا ملازمت سے قطعاً بے نیاز ہیں مگر غالباً نیاز مندوں پر کرم فرمائی سے بے نیاز نہ ہوں گے، مدرسہ شاہی کو آپ کی ضرورت ہے اور فوری ضرورت ہے، انشاء اللہ آپ کو یہاں کوئی پریشانی نہ ہوگی، بس تشریف آوری کا انتظار ہے، ضروری امور بعد میں طے ہو جائیں گے..."

اس خط کو پانے کے کچھ ہی دنوں بعد یعنی ۱۰ر ربیع الاول ۱۳۷۷ھ کو علامہ اعظمیؒ نے مفتی ظفیر الدین صاحب کو ایک خط لکھا تو اس میں اس بلاوے کا بھی تذکرہ کیا:

(۱) آبائی وطن ہاپوڑ تھا، آپ کے دادا اجمیر میں تھانے دار تھے، مولانا فخر الدین صاحب وہیں اجمیر میں ۱۳۰۷ھ ۱۸۸۹ء میں پیدا ہوئے، قرآن کریم اور درسیات کی ابتدائی کتابیں گھر پر پڑھیں، دہلی اور گلاوٹھی کے مدرسوں میں بھی تعلیم حاصل کی، اس کے بعد دار العلوم دیوبند گئے اور وہیں سے ۱۳۲۸ھ م ۱۹۱۰ء میں فارغ ہوئے، فراغت کے بعد دار العلوم میں مدرس ہو گئے، پھر کچھ عرصہ بعد ان کو مدرسہ شاہی مراد آباد بھیج دیا گیا، جہاں تقریباً نصف صدی (۴۸ سال) تک حدیث و فقہ کا درس دیتے رہے، ۱۳۷۷ھ م ۱۹۵۷ء میں حضرت مدنیؒ کے انتقال کے بعد دار العلوم دیوبند کے منصب شیخ الحدیث کیلئے آپ کا انتخاب عمل میں آیا، درس و تدریس کے علاوہ سیاست سے بھی آپ کو تعلق تھا، اور قید و بند کی صعوبتیں بھی جھیلی تھیں، حضرت مدنیؒ کی جمعیۃ علماء ہند کی صدارت کے زمانہ میں دو دفعہ نائب صدر، اور آپ کے انتقال کے بعد ایک عرصہ تک اس کے صدر بھی رہے، ۲۰ر صفر ۱۳۹۲ھ ۵ر اپریل ۱۹۷۲ء کو مراد آباد میں جان جان آفریں کے سپرد کی اور وہیں مدفون ہوئے۔ (تاریخ دار العلوم ۲/۱۰۵-۱۰۸)

"مراد آباد سے مولانا فخر الدین صاحب نے لکھا تھا کہ شاہی میں چلے آیئے۔ میں نے معذرت کردی۔"(۱)

رکعات تراویح تراویح کی رکعتوں کے سلسلے میں غیر مقلدین نے ایک عرصے سے جو شور و غوغا کر رکھا ہے، اور امت مرحومہ کے ساڑھے بارہ سو برس کے معمول سے انحراف کر کے جو ایک فتنہ برپا کیا ہے، اس کے متعلق علامہ اعظمی نے یہ رسالہ تالیف فرمایا، جس میں پرزور دلائل سے یہ ثابت کیا کہ تمام عالم اسلام میں فاروق اعظمؓ کے زمانہ سے برابر بیس یا بیس سے زیادہ رکعتوں پر عمل درآمد رہا ہے، اور بیس والی مرفوع روایت کو یکسر ناقابل اعتبار کہنا، اور آٹھ کی روایتوں کی تصحیح اور ان پر اعتماد از روئے تحقیق اصول حدیث و مسلمات مخالفین کی روشنی میں قطعاً صحیح نہیں ہے، یہ کتاب ۱۳۷۷ھ مطابق ۱۹۵۷ء میں معارف پریس اعظم گڈھ سے چھپ کر شائع ہوئی، ہندوستان کے علمی حلقوں میں اس کتاب کی بہت زیادہ مقبولیت اور پذیرائی ہوئی، چنانچہ مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ ایک خط میں اس پر تبصرہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

"رسالہ اپنی گوناگوں خصوصیات کے لحاظ سے منفرد ہے، جو حضرت مصنف کی علمی عظمت کو دیکھتے ہوئے کوئی عجیب بات نہیں۔"

آگے پھر لکھتے ہیں:

"مجموعی طور پر رسالہ محققانہ اور دلچسپ ہے جو ایک جویائے عمل کے لئے کافی حجت اور شافی سند ہے۔"

لیکن اس کی جو داد تحسین حضرت مولانا مدنیؒ نے دی ہے، اس سے بڑھ کر اس کیلئے کوئی سند نہیں ہوسکتی، آپ ایک مکتوب گرامی میں تحریر فرماتے ہیں:

"مدعیان حدیث کی گندم نمائی اور جو فروشی کی وجہ سے بہت سے اشخاص اس غلطی میں مبتلا تھے کہ آٹھ رکعات تراویح کا ثبوت شرعی موجود ہے۔ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی زید مجدھم کی اس حقیقت نمائی نے

---

(۱) مشاہیر علماء ہند کے علمی مراسلے ص ۱۶۷

جو موصوف نے اس رسالہ میں فرمائی ہے، باطل کے پردوں کی دھجیاں اڑا دیں اور کالشمس فی رابعۃ النہار ظاہر کردیا کہ مدعیان حدیث کے دعاوی باطلہ ہرگز قابل التفات نہیں ہیں۔ میں نے رسالہ مذکورہ کو ابتدا سے اخیر تک مطالعہ کیا ہے۔ میں حضرت مولف ممدوح کی تحقیقات انیقہ اور دلائل قویہ پر حضرت کو مبارکباد دیتا ہوں جنھوں نے ان مدعیون کے خرمنہائے تزویر پر صواعق محرقہ برسا کر نیست و نابود کردیا ہے، جزاہ اللہ احسن الجزاء فی الدارین۔۔۔"

آٹھ سال بعد مفتاح العلوم میں درس حدیث

علامہ اعظمی کو مفتاح العلوم سے ایک والہانہ تعلق تھا، اور اسی تعلق کی بنا پر وہ اس کی خدمت کیلئے ہر وقت تیار رہتے تھے، لیکن تحقیقی و تصنیفی مشاغل، اسمبلی کی رکنیت اور دیگر بہت سی مصروفیات کے باعث باقاعدہ سلسلہ تقریباً آٹھ سال تک منقطع رہا، اور درس و تدریس کی گرم بازاری سرد پڑ گئی رہی، مولانا محمد موسی میاں (۱) افریقی کو ۱۱ر شعبان ۱۳۸۷ھ کے ایک خط میں لکھتے ہیں:

(۱) مولانا محمد بن موسی میاں افریقی کا آبائی وطن سملک ضلع سورت ہے، مگر ان کا خاندان چند پشت سے جنوبی افریقہ کے شہر جوہانسبرگ میں آباد ہو گیا تھا، وہیں تقریباً ۱۳۲۲ھ م ۱۹۰۴ء میں تولد ہوئے، تعلیم کیلئے ہندوستان بھیج دیا گیا، چنانچہ انھوں نے پالن پور میں تعلیم و تربیت پائی، ۱۳۴۲ھ میں دارالعلوم (دیوبند) میں داخلہ لیا اور ۱۳۴۴ھ میں تکمیل کی، فراغت کے بعد جوہانسبرگ چلے گئے اور وہاں اپنا تجارتی کاروبار سنبھالا، مگر اسی کے ساتھ دینی، علمی اور اسلامی خدمت بھرپور اور ٹھوس طریقے پر انجام دیتے رہے، اللہ تعالیٰ نے انھیں دین و دنیا دونوں نعمتوں سے نوازا تھا، دولت کی ریل پیل تھی، جس کو انھوں نے دینی و ملی کاموں میں بیدریغ صرف کیا، چنانچہ اسلامی اور عصری علوم کی تعلیم کیلئے جوہانسبرگ میں واٹروال اسلامک انسٹی ٹیوٹ قائم کیا، اور دارالعلوم دیوبند کے منہج کے مطابق طلبہ کیلئے مفت تعلیم کا انتظام کیا، جامعہ اسلامیہ ڈابھیل کی تعمیر و ترقی میں ان کا بڑا حصہ رہا ہے، ڈابھیل میں مجلس علمی کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا جس سے نہایت قیمتی اور نایاب کتابیں شائع ہوئیں، غرض علم و دین کی اشاعت کیلئے انھوں نے نہایت قابل قدر کارنامے انجام دیئے اور بے محابا دولت صرف کی، متعدد علمی اداروں کا یہ پشتیبان ۱۶/اپریل ۱۹۶۳ء، ۲۱/ذی قعدہ ۱۳۸۲ھ کو جوہانسبرگ کی خاک میں روپوش ہو گیا اللہ ان کی خدمات کو قبول فرمائے اور ان کا بہترین اجر عطا فرمائے، آمین (تاریخ دارالعلوم ۲: ۱۵۰-۱۵۱) (۱)

"... مدرسہ مفتاح العلوم جو میرے وطن میں ہے اور جس میں بیس برس سے زیادہ میں نے حدیث کا درس دیا ہے اس میں تیس سال سے برابر دورۂ حدیث ہوتا ہے اور کم و بیش پچیس طالب علم شریک دورہ ہوتے ہیں وہاں بھی میں نے آٹھ سال سے درس دینا ترک کر دیا ہے، کارکنان برابر متقاضی و مصر ہیں، لیکن میں نے دوبارہ تعلق قائم نہیں کیا، جیسا کہ میں اس سے پہلے بھی لکھ چکا ہوں۔

اگر مجھ کو اپنے حالات سے مجبور ہو کر درس کا مشغلہ پھر جاری ہی کرنا پڑے گا تو میں اپنے ذاتی و خانگی حالات کی بنا پر وطن ہی کے مدرسہ کو ترجیح دوں گا..."

یہ ترجیح عملی طور پر اس وقت ظہور پذیر ہوئی جب اس کے دوسرے ہی سال مفتاح العلوم میں درس و تدریس کا از سر نو آغاز کیا، حالات سے مجبور ہوئے ہوں یا نہ ہوئے ہوں، کارکنان کا اصرار و تقاضا ضرور رنگ لایا کہ " محفل درس جو ایک مدت سے سونی پڑی ہوئی تھی ایک بار پھر پر شور ہو گئی۔ مفتاح العلوم کی ۷۸-۱۳۷۷ھ کی روداد (ص ۲) میں "محدث کبیر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی کا درس حدیث" کے عنوان کے تحت لکھا ہے:

"اس خبر کی اطلاع دیتے ہوئے ہم بہت فخر محسوس کرتے ہیں کہ محدث کبیر حضرت العلامہ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی دامت برکاتہم نے خدام جامعہ کی درخواست منظور فرماتے ہوئے اس سال طلبہ دورۂ حدیث کو درس دینا شروع فرما دیا ہے، و نیز طلبہ کی نگرانی اور ان کی تربیت کے پیش نظر حضرت مولانا اپنی خرابیٔ صحت اور پیرانہ سالی کے باوجود بسا اوقات پوری مدت جامعہ میں ہی گذارتے ہیں، اس طرح جامعہ کے طلبہ اور دار الاقامہ کو ایک ایسے مربی کی سرپرستی حاصل ہو گئی ہے جس پر بجا طور پر فخر کیا جا سکتا ہے، خدا سے دعا

ہے کہ وہ حضرت مولانا کے سایۂ عاطفت کو تادیر اساتذہ وطلبہ پر باقی رکھے، آمین۔"

دکن کا ایک سفر علامہ اعظمی کے متفرق اوراق میں کاغذ کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں پر آپ کے ہاتھ کی لکھی ہوئی چھوٹی چھوٹی تحریریں ملتی ہیں، جو اس قدر مختصر ہوتی ہیں کہ ان سے صرف آپ کے احوال وسوانح کی طرف ہلکا سا اشارہ مل جاتا ہے، ایک کاغذ پر اپنے ایک سفر کے بارے میں یہ لکھا ہے:

"سفر حیدر آباد واورنگ آباد وگلبرگہ واحمد آباد از ۸ر نومبر ۵۸ء تا ۲۳ دسمبر ۵۸ء اواخر ربیع الثانی ۷۸ھ تا اوائل جمادی الاخری ۷۸ھ"

مختلف اداروں اور یونیورسٹیوں کے ممتحن کی حیثیت سے آپ کا تقرر

پنجاب یونیورسٹی ملک کے طول وعرض کی متعدد یونیورسٹیوں اور تعلیمی بورڈوں نے علامہ اعظمی کو دینی واسلامی علوم کیلئے ممتحن (Examiner) مقرر کیا۔ آپ کے منتشر اوراق میں اس نوعیت کا جو سب سے پہلا دستاویزی ثبوت ہمیں دستیاب ہوا، وہ ۱۹۵۶ء کا "پنجاب یونیورسٹی سولن شملہ" کا ہے، جس میں مذکورہ یونیورسٹی کے رجسٹرار آفس کی طرف سے آپ کو امتحان کی کاپیاں جانچنے کی ذمہ داری سپرد کی گئی ہے ۔اس سے یہ صاف ظاہر ہے کہ امتحان کے پرچہ سوالات بھی آپ ہی نے تشکیل دیئے ہوں گے، ہم نے اوپر جس دستاویز کا ذکر کیا ہے وہ پنجاب یونیورسٹی رجسٹرار کے سپرنٹنڈنٹ کی جانب سے ۳۰ر اپریل ۱۹۵۶ء کو جاری کردہ ایک خط ہے، جس کی عبارت درج ذیل ہے:

"I have to inform you that you have also to act as Examiner for evaluation of answer-book in --- paper V for the Molvi Fazil Examination held in june 1956.

You are requested to let this office know your address for answer -books in the appended form.

(میں آپ کو اس بات کی اطلاع دینا چاہتا ہوں کہ جون میں ہونے والے مولوی فاضل کے امتحان کے پانچویں پرچے کی کاپیوں کو جانچنے کیلئے بھی آپ کو ممتحن کی حیثیت سے کام کرنا ہے۔

لہذا آپ سے گذارش ہے کہ کاپیاں ارسال کرنے کیلئے اپنے پتہ سے ملحقہ فارم کے ذریعہ دفتر کو اطلاع دیں)

ویسٹ بنگال مدرسہ ایجوکیشن بورڈ کئی سال تک "ویسٹ بنگال مدرسہ ایجوکیشن بورڈ" کی جانب سے ہونے والے امتحان "ممتاز المحدثین" کے لئے ممتحن رہے، اس سے متعلق سب سے پہلا جو کاغذ ملا وہ ۲۴ر اگست ۱۹۵۶ء کو جاری کردہ ایک اطلاع ہے، اس وقت بورڈ کے رجسٹرار مولانا سعید احمد اکبر آبادی تھے، اور اطلاع نامہ انھیں کے دستخط سے روانہ کیا گیا ہے، جس کی عبارت یہ ہے:

" Sir I have the honour to inform you that you have been appointed Paper -setter and Examiner in Bukhari Sharif II of Mumtazul Muhaddethin examination to be conducted by the West Bengal Madrasah Education Board in 1957.

Your acceptance of the appointment must reach this office on or before the 10 Sep. 1956. "

(میں آنجناب کو یہ اطلاع دیتے ہوئے اعزاز محسوس کرتا ہوں کہ ویسٹ بنگال مدرسہ ایجوکیشن بورڈ کی طرف سے منعقد کئے جانے والے ممتاز المحدثین کے امتحان ۱۹۵۷ء کیلئے بخاری شریف جلد ثانی کے امتحان اور تشکیل سوالات کے لئے آپ کو نامزد کیا گیا ہے۔

اس نامزدگی کی منظوری ۱۰ر ستمبر یا اس سے قبل دفتر میں ضرور پہنچ جانی چاہئیے)

علامہ اعظمی کے کاغذات میں ۱۹۵۶ء سے ۱۹۶۴ء تک کے خطوط اسی مضمون کے ملے، جو اس بات کی دلیل ہیں کہ کم از کم ۹ر برس آپ اس کے ممتحن رہے، اور آپ کے تشکیل شدہ جو پرچے ملے ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ۱۹۵۶ء سے ۱۹۶۲ء تک بخاری شریف جلد ثانی کے ممتحن رہے، اور ۱۹۶۳ء و ۱۹۶۴ء میں جلد اول کے پرچے تشکیل دیئے۔

بہار بورڈ اور ناگپور یونیورسٹی بہار مدرسہ ایگزامینیشن بورڈ کے فاضل تفسیر، اور ناگپور یونیورسٹی کے مولوی فاضل کے بھی ممتحن رہے، ناگپور یونیورسٹی کی طرف سے آپ کو جو خطوط ملے ان سب کی عبارت تھوڑے بہت فرق سے رجسٹرار ڈاکٹر (S.V. Bhagwat) کی طرف سے یہ ہے:

" I am directed to inform you that Nagpur University has appointed you to be the paper- setter and examiner in Arabic (Maulvi Fazil) Paper VI at the next HIGHER DIPLOMA IN ORIENTAL LEARNING examination ...."

(یعنی مجھے آنجناب کو یہ اطلاع دینے کی ہدایت کی گئی ہے کہ ناگپور یونیورسٹی نے مشرقی تعلیم میں ہائر ڈپلوما کے امتحان مولوی فاضل کے لئے تشکیل سوالات و امتحان کے واسطے آپ کو نامزد کیا ہے)

دار العلوم ندوہ انھیں ایام میں دار العلوم ندوہ لکھنؤ نے بھی آپ کو علیا کی جماعتوں کیلئے ممتحن مقرر کیا، اور کئی سال تک ندوہ کے لئے اس خدمت کو بھی انجام دیا، مثلاً ۲۵ر جنوری ۱۹۵۸ء کو ندوہ کے اہتمام کی طرف سے یہ خط آپ کی خدمت میں ارسال کیا گیا:

مکرمی محترمی دام مجدہ!

"بعد سلام مسنون کے گذارش ہے کہ دار العلوم کا سالانہ امتحان ۲۲ر فروری ۱۹۵۸ء سے شروع ہونے والا ہے، امید ہے کہ جناب حسبۃ للہ امتحان کی زحمت گوارا فرمائیں گے..."

کئی برس تک ندوہ کے ممتحن رہے، مختلف سالوں میں مختلف کتابوں کا امتحان آپ کے ذمہ رہا، کبھی صحیح مسلم، کبھی سنن ابوداود، کبھی ہدایہ اور کبھی کوئی دوسری کتاب، اور بسا اوقات یہ بھی ہوتا کہ ایک سال میں ایک سے زائد کتابیں آپ کے ذمہ ہوتیں مثلاً ۱۳۷۸ھ میں مسلم شریف کامل اور ابوداود شریف کامل کا امتحان لیا۔

اس کے علاوہ دیگر معاملات کے لئے بھی دار العلوم ندوۃ العلماء کو جب علامہ اعظمیؒ کی ضرورت پڑی تو ان کی خدمات حاصل کیں، اور علامہ اعظمیؒ اس کے لئے برضا و رغبت تیار بھی ہوئے، مثال کے طور پر ۵ر مارچ ۱۹۶۲ء کو مولانا ابو العرفان ندوی عمید دار العلوم ندوہ(۱) کی جانب سے درج ذیل تحریر علامہ اعظمیؒ کی خدمت میں روانہ کی گئی:

"ایک زحمت دینے کیلئے یہ عریضہ ارسال خدمت ہے، ادھر دو سال سے دار العلوم ندوۃ العلماء کے سندی درجات میں یہ نظام جاری کیا گیا ہے کہ طلبہ اپنے لئے کوئی علمی یا دینی موضوع انتخاب کر کے اس پر ایک تحقیقی مقالہ تیار کریں (جن کے صفحات کی تعداد مقرر کر دی گئی ہے) ان کی عام رہنمائی کے لئے دار العلوم کے اندر یا باہر کسی فاضل کا انتخاب کرایا جاتا ہے، مگر طلبہ کی کوئی عملی یا تحریری امداد نہیں کی جاتی، وہ معلومات کو خود ہی اپنے الفاظ میں پیش کرتے ہیں، یہ نظام تجربہ سے بہت مفید ثابت ہوا۔ اس ذریعہ سے ملک کے مختلف فضلاء اور اہل نظر سے ان طلبہ کے علمی روابط بھی قائم ہو جاتے ہیں۔ امید ہے کہ یہ ان کی آئندہ زندگی میں بھی مفید ہوں گے اور ان کو کچھ مطالعے، غور کرنے اور معلومات کو ترتیب دینے کا موقع بھی مل جائے گا۔

اس سلسلہ میں "رجال الحدیث الاحناف" مقالہ کی جانچ کے لئے آپ کو زحمت دی جارہی ہے، دار العلوم سے دلچسپی اور آپ کے علمی ذوق کی بنا پر امید ہے آپ اس زحمت کو گوارا فرمائیں گے..."

---

(۱) مولانا ابو العرفان صاحب ندویؒ کھیتا سرائے ضلع جونپور سے متصل موضع پسری کے رہنے والے تھے، دار العلوم دیوبند، مدرسہ امدادیہ دربھنگہ اور دار العلوم ندوہ میں تعلیم پائی، فراغت کے بعد سید سلیمان ندوی کی زیر تربیت دار المصنفین سے کچھ دنوں وابستہ رہے، تقریباً ۴۵ سال تک ندوہ کی تعلیمی و انتظامی خدمات انجام دیں، وسیع المطالعہ اور وسیع النظر عالم تھے، شخصیت بہت باغ و بہار اور بھرپور تھی، ۱۷ر نومبر ۱۹۸۸ء کو وفات پائی۔ (ماہنامہ دار العلوم وفیات نمبر ۸۷۔۸۶)

اسی مضمون کی تحریر دوسرے سال یعنی ۱۹۶۳ء میں بھی روانہ کی گئی، جس کی آخر کی سطریں یہ ہیں:

"اس سلسلہ میں "الامام الشافعی..." مقالہ کی جانچ کیلئے آپ کو زحمت دی جارہی ہے..."

مذکورہ بالا امتحانات کے علاوہ آپ تقریباً سات سال اتر پردیش عربی فارسی بورڈ کے بھی ممتحن رہے۔

اعیان الحجاج ۱۹۵۸ء میں آپ کی بے نظیر کتاب "اعیان الحجاج" تنویر پریس (لکھنؤ) سے طبع ہو کر مکتبہ اعظمی (مئو) سے شائع ہوئی، یہ کتاب انبیاء کرام، صحابہ عظامؓ، علماء و صلحاء اور عظیم شخصیات کے حج و زیارت کے بصیرت افروز واقعات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کو مولانا عبداللہ زمزمیؒ نے دیکھا تو اس کو "اعجب العجائب" کے لفظ سے یاد کیا۔ ندوۃ المصنفین دہلی سے شائع ہونے والے ماہنامہ برہان ج ۴۱ ش ۲ میں اس کتاب پر نہایت شاندار تبصرہ شائع ہوا۔

بچی کی علالت اور وفات خاصان خدا کیلئے آزمائش اور مصائب بھی بہت ہوتے ہیں، تقدیر الٰہی ان کا ہر طرح امتحان لیتی رہتی ہے، علامہ اعظمی کی بھی پوری زندگی مصائب سے بھری اور ابتلاء سے عبارت رہی، لیکن واہ رے ثابت قدمی! پائے استقامت میں کبھی معمولی سی لغزش و لرزش بھی نہیں آئی۔ حوادث روزگار ان کے ساتھ ساتھ رہے لیکن وہ ہمیشہ " فصبر جمیل "کا ورد کرتے رہے۔ ان کی ایک صاحبزادی صفیہ خاتون کی بیماری ان کے لئے سخت آزمائش کا سبب بنی رہی، ایک طویل عرصے تک شدید ترین بیماری اور تکلیف میں مبتلا رہیں، علامہ اعظمیؒ نے ان کی بیماری کا بعض خطوط میں اس طرح ذکر کیا ہے جس سے درد کی کسک صاف طور پر محسوس کی جاسکتی ہے۔ ۵/ شوال ۱۳۷۸ھ مطابق ۱۴/ اپریل ۱۹۵۹ء کو مولانا محمد موسیٰ میاں کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

"الحمد للہ کہ میں نے گنجائش پاکر دوبارہ ڈاکٹری علاج اپنی لڑکی کا شروع

کر دیا، مگر اس کا مرض بہت بڑھ چکا ہے صرف ہڈی اور چمڑہ باقی ہے، خود سے کروٹ بھی بدل نہیں سکتی، بہر حال خدا کا نام لے کر برابر علاج ہو رہا ہے آج سب سے بڑی فکر اسی کی ہے دن بدن وہ کمزور ہوتی جا رہی ہے آپ بھی خدائے تعالیٰ سے دعا فرمائیں۔"

۲۹/اپریل ۱۹۵۹ء کے خط میں لکھتے ہیں:

"کئی دنوں سے عریضہ لکھنے کا ارادہ کر رہا تھا مگر آج کل لڑکی کی طبیعت پہلے سے بھی زیادہ نازک ہو گئی ہے اس لئے ذہنی انتشار بہت بڑھ گیا ہے، آپ کی عنایت و مہربانی کی بدولت علاج اور ڈاکٹروں کی طرف رجوع کرنے میں بہت سہولت پیدا ہو گئی ہے اس لئے بہت تندہی سے علاج ہو رہا ہے، لیکن شفا اللہ کے ہاتھ میں ہے، کسی وقت کچھ افاقہ محسوس ہوتا ہے تو دوسرے وقت بہت نا قابل اطمینان حالت ہو جاتی ہے، بہر حال دعا کا خواستگار ہوں"

لیکن یہ تمام علاج معالجے بے سود ثابت ہوئے، دست قضا کے سامنے ساری تدبیریں مغلوب ہو گئیں اور ۲۱/ر شوال ۱۳۷۸ھ کو شفیق باپ مہربان ماں اور تمام اہل خانہ کو حسرت ویاس میں ڈوبا ہوا چھوڑ کر عالم آخرت کو سدھاریں، باپ پر بچی کی وفات کا جو اثر ہوا اس کو بھی ایک خط میں پڑھئے جو مولانا محمد میاں ہی کو ۱۹/ر مئی ۱۹۵۹ء مطابق ۱۰/ر ذیقعدہ ۱۳۷۸ھ کو لکھا گیا ہے، کس قدر رنج وحسرت میں ڈوبی ہوئی تحریر ہے یہ:

"سب سے پہلے نہایت رنج و غم کے ساتھ آپ کو اطلاع دیتا ہوں کہ ۲۱/ر شوال ۱۳۷۸ھ کو عزیزہ صفیہ خاتون جو سب لڑکیوں میں نہایت عزیز تھی اور جس کی تشویشناک علالت کا ذکر بار بار کر چکا ہوں وہ اس زندگی میں ہمیشہ کیلئے رخصت ہو گئی، حق تعالیٰ اس کی مغفرت فرمائے۔

اس کی وفات کے صدمہ اور تجہیز و تکفین کے ترددات کے باعث دن بھر تعب سے دوسرے دن مجھ کو بخار اور پسلی میں درد ہو گیا، ہفتہ بھر کے بعد

آرام ہوا مگر نقاہت اب بھی ہے، طبیعت میں تقاضا تو فوراً اطلاع دینے کا تھا مگر ان پریشانیوں میں اور کئی دنوں سے خط کے انتظار میں دیر ہوئی۔"

رکعات تراویح مذیل علامہ اعظمی کی کتاب "رکعات تراویح" جب چھپ کر شائع ہوئی، تو ایک غیر مقلد عالم نے اس کا جواب "انوار مصابیح" کے نام سے لکھا، آپ نے انوار مصابیح کا رد کیا اور اس کو رکعات تراویح مذیل کے نام سے شائع کیا، یہ کتاب ۱۳۷۹ھ مطابق ۱۹۶۰ء میں تنویر پریس لکھنؤ سے چھپ کر شائع ہوئی۔

تیسرا حج ۱۳۸۰ھ مطابق ۱۹۶۱ء میں ادا فرمایا اس سفر کی تفصیل نہیں معلوم ہو سکی، البتہ اس سال کا پاسپورٹ ان کے کاغذات میں محفوظ ہے، اس پر ثبت مختلف مہروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس سفر پہ روانگی بمبئی سے بذریعہ طیارہ ہوئی، پاسپورٹ پر سانتا کروز ایرپورٹ سے ڈیپارچر کی جو مہر لگی ہے وہ ۳۰/اپریل ۱۹۶۱ء کی ہے جو ذی قعدہ کی غالباً ۱۵/ تاریخ تھی، اور واپسی میں بمبئی پہنچنے کی جو تاریخ ہے وہ ۴/جون ۱۹۶۱ء درج ہے۔

ادارۂ نشر و شاعت کے قیام کیلئے فکر خداوند قدوس نے علامہ اعظمی کو عجیب و غریب علمی ذوق اور جوش و ولولہ عطا فرمایا تھا، ان کا علمی ذوق و شوق اور کام کرنے کا جذبہ ان کو کسی منزل پر قرار نہیں لینے دیتا تھا، اسلامی علوم و فنون کی اشاعت کے ساتھ ان کا شغف ناقابل بیان حد تک تھا، پورے خلوص قلب اور اخلاص نیت کے ساتھ ان کی یہ کوشش رہتی کہ مسلمانوں میں علم دین کا رواج ہو اور اسلامی علوم و فنون کی ممکن حد تک ترویج کی جائے، اسی سلسلے میں آپ نے تصنیف و تالیف اور نشر و اشاعت کے ایک ادارہ کے قیام کی نسبت سوچنا شروع کیا، ۱۹۵۷ء اور اس کے بعد تین چار سال تک اس فکر کا آپ کے دل و دماغ پر بہت شدت کے ساتھ غلبہ رہا، اس زمانہ میں ان کے دل میں یہ شدید خواہش رہا کرتی تھی کہ ایک ایسے ادارے کا قیام عمل میں آجئے جس کے ذریعہ سے ان با صلاحیت اور صاحب استعداد فضلاء کے اندر جو علمی و تحقیقی کام کرنا چاہتے ہیں، بحث و تحقیق اور تصنیف و تالیف کا صاف ستھرا ذوق پیدا کیا جا سکے، اس طرح ان کے ذوق اور

صلاحیت کو نشو و نما اور فروغ پانے کے مواقع حاصل ہوں گے اور ادارہ کے ذریعہ نشرو اشاعت کا کام ہوگا، اس فکر میں ان کے شریک مولانا قاضی اطہر صاحب مبارکپوری (۱) بھی رہے، اور دونوں بزرگ ایک مدت تک اس کے امکانات پر غور اور کام کیلئے لائحۂ عمل تیار کرتے رہے، جیسا کہ قاضی اطہر صاحب لکھتے ہیں:

"اسی زمانہ میں خیال ہوا کہ بمبئی یا مئو میں ایک علمی ادارہ قائم کیا جائے جس میں تصنیف و تالیف اور نشرواشاعت کا کام ہو اور اس کے امکانات پر غور کیا جانے لگا۔" (۲)

قاضی اطہر صاحب کے نام علامہ اعظمی کے جو خطوط ہمارے سامنے ہیں، ان میں سب سے پہلے ۲۴ر فروری ۱۹۵۷ء کے ایک خط میں اس کی طرف قاضی صاحب کی توجہ مبذول کرائی ہے:

(۱) مؤرخ جلیل مولانا قاضی اطہر مبارکپوری ۱۴ر رجب ۱۳۳۴ھ مطابق ۷ر مئی ۱۹۱۶ء کو ضلع اعظم گڈھ کے مردم خیز قصبہ مبارکپور میں پیدا ہوئے، آپ کا نام عبدالحفیظ تھا لیکن علمی دنیا میں قاضی اطہر مبارکپوری کے نام سے مشہور ہوئے، ابتدائی تعلیم کے بعد ۱۳۵۰ھ میں مدرسہ احیاء العلوم مبارکپور میں عربی تعلیم شروع کی۔ احیاء العلوم میں مروجہ نصاب مکمل کرنے کے بعد مدرسہ شاہی مراد آباد گئے اور ۱۳۵۹ھ میں وہیں سے فارغ التحصیل ہوئے، فراغت کے بعد چار پانچ سال احیاء العلوم میں درس و تدریس کی خدمت انجام دی، اس کے بعد کار تدریس چھوڑ کر صحافت کی دنیا میں آئے اور امرتسر، لاہور، بہرائچ، بمبئی وغیرہ میں رہ کر مختلف رسائل و جرائد کیلئے مقالہ نگاری اور ادارت کے فرائض انجام دیتے رہے، تاریخ ان کا خاص فن تھا، اور اس میں ان کو سند سمجھا جاتا تھا، تاریخ کے علاوہ دیگر فنون پر بھی قدرت حاصل تھی، بیسیوں تصنیفات یادگار چھوڑی ہیں، لیکن ان سب میں "رجال السند والهند" کو بہت شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی، موصوف بڑی خوبیوں کے حامل تھے، محنتی، جفاکش، قناعت پسند اور سادہ طبیعت کے انسان تھے، بایں ہمہ علم و فضل تعلّی اور خود نمائی نام کو نہیں تھی، ۱۴ر جولائی ۱۹۹۶ء مطابق ۲۷ر صفر ۱۴۱۷ھ کو اس دنیا سے رخصت ہوئے۔ دیکھئے ترجمان الاسلام قاضی اطہر نمبر

(۲) ترجمان الاسلام ش ۱۱۔ ۱۲ ص ۳۹

"دوسری بات جو میں نے عزیز موصوف کے خط میں لکھی تھی معلوم نہیں اس کی نسبت کھو جانے والے خط میں کچھ لکھا تھا یا نہیں بہر حال اب آپ لوگوں کا جو خیال ہو اس سے مطلع فرمائیے، آپ نے سمجھ لیا ہوگا کہ میری مراد تصنیفی ادارہ کے قیام سے ہے۔"

ان تمام باتوں کے باوجود علامہ اعظمیؒ چونکہ بہت زیادہ محتاط طبیعت کے مالک تھے اور کسی کام کیلئے کوئی اقدام کرنے سے قبل اس کے مالہ وماعلیہ پر اچھی طرح غور فرماتے تھے، اس کے بعد نہایت احتیاط کے ساتھ پھونک پھونک کر قدم اٹھاتے اور آگے بڑھتے تھے، جس وقت آپ ادارہ کے قیام کے مسئلہ پر غور فرما رہے تھے، اس وقت آپ کے سامنے کچھ موانع ایسے تھے جن پر قابو پانا بظاہر دشوار نظر آرہا تھا۔ اس کے قیام کیلئے آپ کی نظر میں دو جگہیں تھیں، مگر پریشانی یہ تھی کہ ان دونوں ہی جگہوں کے کچھ ایسے مخصوص حالات تھے جن کی وجہ سے ان کو خوب اطمئنان اور شرح صدر نہیں ہو پاتا تھا، پہلی جگہ تو ان کا اپنا وطن اور مولد و مسکن مئو تھا، اور دوسرا مقام جو زیر غور تھا وہ بمبئی، ہندوستان کا عروس البلاد جہاں اس وقت قاضی اطہر صاحب فروکش تھے۔ اور ان دونوں ہی مقامات کے بارے میں ان کا اپنا جو تجزیہ تھا اسے ۲۲/ اکتوبر ۱۹۶۰ء کے ایک خط میں قاضی اطہر صاحب کو لکھا:

"اپنے (قرب) وجوار میں اب بھی میرا خیال ہے کہ جیسا ادارہ آپ چاہتے ہیں قائم ہونا مشکل ہے، اسی طرف (بمبئی) ایسے ادارے قائم ہو سکتے ہیں اور چل بھی سکتے ہیں، اس طرف (اپنے قرب وجوار میں) بخل حسد، اور بے ذوقی نے راستے بند کر رکھے ہیں، لیکن ادھر (بمبئی) جو خرابیاں ہیں ان کا انکار بھی ممکن نہیں۔(۱)

علامہ اعظمی کا یہ بے لاگ تجزیہ طویل تجربے کی روشنی میں تھا اور اپنے اس تلخ تجربہ کی وجہ سے وہ عجلت میں کوئی قدم نہیں اٹھانا چاہتے تھے، قاضی اطہر صاحب پھر لکھتے ہیں:

(۱) ترجمان الاسلام شمارہ ۱۱۔ ۱۲ ص ۳۹

"میں ادارہ کے قیام کے سلسلہ میں متعدد بار مولانا کی خدمت میں مئو گیا اور وہیں ادارہ کے قیام کی کوشش کی ؛ مولانا کے رفیق خاص مولانا عبداللطیف صاحب مرحوم جو اس وقت مئو میونسپلٹی کے چیئر مین تھے، انھوں نے اس رائے سے بالکلیہ اتفاق کرتے ہوئے کہا کہ میں اس کے لئے زمین اور عمارت کا ذمہ لیتا ہوں تصنیف و تالیف آپ لوگوں کا کام ہے، اس کے باوجود مولانا مرحوم کی شدت احتیاط اور اس وقت کی صورتحال کی وجہ سے ادارہ مئو میں قائم نہ ہوسکا۔"(۱)

اس شدت احتیاط کے باوجود اس وقت دل ودماغ پر یہ مسئلہ پوری طرح حاوی رہا۔ اس ادارہ کے قیام سے آپ کا کوئی ذاتی مفاد یا معاشی مسئلہ وابستہ نہیں تھا، بس یہ سودا سوار تھا کہ کچھ کام کریں اور کچھ لوگوں کو کام کے لائق بنادیں، یہ کام ایسا تھا کہ انفرادی طور پر تو ممکن نہیں تھا، اجتماعی طور پر کیا جاسکتا تھا، ۳؍نومبر ۱۹۵۸ء کے ایک خط میں قاضی صاحب کو پہلے ہی لکھ چکے تھے:

"میں نے تو بہت پہلے لکھنؤ سے آپ کو اور مولانا اسحاق کو متوجہ کیا تھا کہ سوچ کر کوئی کام کرنا چاہئیے، اور میرے نزدیک انفرادی کے بجائے اجتماعی کام ہونا چاہئیے، مگر اس وقت آپ کی بدگمان طبیعت نے معلوم نہیں کس بنیاد پر اس گذارش کو قطعاً قابل التفات قرار نہیں دیا، حالانکہ مجھے یہ حسن ظن ہے کہ حالات کے قطعی علم کی بنا پر میری یہ تحریک غرض پرستی (مثلاً فکر معاش) پر آپ کے نزدیک محمول نہیں ہوسکتی، اس لئے کہ الحمد للہ میرا ذریعہ معاش اس وقت بھی نقد تھا اور آج بھی ہے، مگر میرا وحشی مزاج اس سے راضی نہ ہوا اور آج بھی نہیں ہے۔"

خطوط سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ مالیگاؤں میں اس کے قیام کے لئے کچھ

---

(۱) ترجمان الاسلام شمارہ ۱۱۔ ۱۲ ص ۳۹

کوشش کی گئی لیکن وہ بار آور نہیں ہوئی، مگر پھر بھی امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹا اور اس کام کی فکر دل ودماغ پر مستقل طاری رہی۔ قاضی صاحب کو ۲۳؍ جولائی ۱۹۵۹ء کو لکھتے ہیں:

"تیسری بات یہ ہے کہ میں ابھی تک یہ "ہوس" رکھتا ہوں کہ کوئی علمی کام ضرور ہونا چاہیئے، مالیگاؤں کا تجربہ تو ہو چکا، اب کوئی دوسری صورت سوچئے اور برابر خیال میں رہیئے، مایوس ہو کر بیٹھ نہ جانا چاہیئے، میرے پیش نظر اپنا کوئی ذاتی مفاد نہیں ہے، بس کام کا شوق ہے اور یہ خواہش کہ کچھ لوگ کام میں لگ جائیں، مالیگاؤں میں کام شروع ہوا ہوتا تو مولوی حبیب الرحمٰن خیر آبادی سے کچھ کام لیا جاتا جو رفتہ رفتہ کام کے لائق ہو جاتے۔ بہر حال سوچئے۔"

مالیگاؤں میں مجلس احیاء المعارف کا قیام اور علامہ اعظمی کا تعاون

کافی تفکر وتدبر اور کوشش وکاوش کے باوجود آپ کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر ہوتا نظر نہیں آرہا تھا، کہ اسی اثناء میں مولانا عبد الحمید نعمانیؒ نے مالیگاؤں میں ایک ادارہ "معہد ملت" کے نام سے قائم کیا، مولانا عبد الحمید نعمانی مرحوم نے ابتداءً یہ کوشش کی کہ علامہ اعظمی سال میں کچھ وقت نکال کر معہد ملت میں قیام کریں، اس طرح وہاں کے لوگوں کو آپ کے خرمن علم سے خوشہ چینی کا کچھ موقع مل جائے گا، لیکن علامہ اعظمی اپنی عدیم الفرصتی کے سبب اس کے لئے تیار نہ تھے، اس کے بعد مولانا نعمانی مرحوم نے ایک دوسری تجویز یہ رکھی کہ مالیگاؤں میں ہی نشر واشاعت کا ادارہ قائم کیا جائے، یہ تجویز علامہ اعظمیؒ کی خواہش ومنشا کے عین مطابق تھی، لہٰذا آپ جلد یا بدیر اس سے تعاون کیلئے آمادہ ہو گئے، تفصیل قاضی اطہر صاحب مرحوم کی زبانی پڑھیے:

"اس کی صورت یہ ہوئی کہ مالیگاؤں کے مولانا عبد الحمید نعمانی مرحوم جن کا آبائی وطن مبارکپور ہے، مولانا کی علمی شہرت سن چکے تھے، انھوں نے مالیگاؤں میں "معہد ملت" کے نام سے ایک درسگاہ کی بنیاد رکھی اس کے افتتاحی جلسہ میں میری کوشش سے دولت کویت کے مدرسہ کویتیہ کے استاذ مدحت

اسمعیل میرے ساتھ شریک ہوئے، اور تدریسی خدمت کیلئے مولانا بشیر احمد مبارکپوری مرحوم، مولانا محمد عثمان صاحب مبارکپوری، اور مولانا حبیب الرحمٰن صاحب خیر آبادی بلائے گئے، اس کے بعد مولانا نعمانی اپنی بعض تالیفات و تراجم کی کتابت کیلئے بمبئی آتے جاتے رہے اور ہم لوگوں سے ملتے جلتے رہے، انھوں نے چاہا کہ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کسی صورت سے سال میں چند ماہ "معہد ملت" میں قیام کریں اور ان سے علمی استفادہ کیا جائے۔ مولانا مرحوم اس کے لئے تیار نہ تھے تو مولانا نعمانی نے یہ تجویز رکھی کہ مالیگاؤں میں ایک نشریاتی ادارہ قائم کیا جائے جس میں حدیث کی نادر و نایاب کتابوں کی تصحیح و تعلیق مولانا کی نگرانی میں ہو اور وہیں سے ان کو شائع کیا جائے۔ یہ تجویز مولانا کیلئے بڑی پرکشش تھی گویا ان کی دیرینہ دلی مراد پوری ہو رہی تھی، مگر جیسا کہ مولانا نے اپنے خط میں لکھا ہے، بمبئی اور اطراف بمبئی کے ذہن و مزاج اور حالات سے مطمئن نہیں تھے، جب مولانا نعمانی کا تقاضا زیادہ ہوا تو مولانا نے مجھ سے فرمایا کہ نعمانی بار بار تقاضا کرتے ہیں، مالیگاؤں چلو اور ادارہ کے قیام کیلئے فضا سازگار کی جائے، چنانچہ بمبئی سے مولانا، میں اور حاجی تکی زبیر صاحب مالیگاؤں گئے اور وہاں کے اہل علم میں سے مولانا عبدالقادر صاحب، مولانا عثمان صاحب اور دیگر علماء کے ساتھ معہد ملت کے مذکورہ بالا اساتذہ کی جدوجہد سے مجلس احیاء المعارف کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا اور ایک ہفتہ وہاں رہ کر اس کے جملہ انتظامات کئے گئے۔"(۱)

انتقاء الترغیب والترھیب کی اشاعت اس ادارے کے ساتھ علامہ اعظمی نے اپنا علمی تعاون اس طرح کیا کہ امام ابو محمد عبدالعظیم بن عبدالقوی منذریؒ کی مشہور کتاب "الترغیب والترھیب" جس کا اختصار حافظ ابن حجرؒ نے کیا ہے اور جس کا نام "انتقاء الترغیب والترھیب" ہے، تصحیح و تعلیق کے بعد شائع کرنے کے لئے دی۔ ۱۳۸۰ھ مطابق ۱۹۶۰ء

(۱) ترجمان الاسلام ش ۱۱۔ ۱۲ ص ۴۰۔ ۳۹

میں یہ کتاب مذکورہ بالا ادارے سے شائع ہوئی جو ادارہ کا پہلا اور اہم ترین کارنامہ تھا۔

بالآخر وہی ہوا جس کا ان کو اندیشہ تھا، ان کے خدشات سچ ثابت ہوئے، وہ آپ کی توقعات پر شاید پورا نہیں اترا اور نہ ہی آپ کے حسب منشا کام ہوا، آپ نے دل برداشتہ ہو کر ۶ ر رمضان المبارک ۱۳۸۰ھ کو جو ۱۹۶۱ء کے ابتدائی مہینوں میں سے کوئی تاریخ رہی ہوگی، قاضی اطہر صاحب کو تحریر فرمایا:

"عزیز من! میں نے تو بار بار لکھا کہ کوئی صورت بتاؤ تو اپنی ساری علمی تگ ودو اسی کیلئے وقف کردی جائے مگر افسوس کہ کوشش کے باوجود نہ مئو میں کوئی بات بن سکی نہ بمبئی میں، میری کوشش اور مداخلت سے ایک چیز ہوگئی تھی تو میں نے بے معاوضہ، بلکہ ہرج اور کچھ خرچ کرکے ایک کام پورا کردیا تاکہ ان "باآبرو" لوگوں کے ساتھ میری بھی بدنامی نہ ہو، اب نہ آگے کا کوئی پروگرام اُن کے سامنے ہے، نہ میرے اندر اس قدر قربانی کی ہمت ہے، نہ ان کے ساتھ چلنے کی"

جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے وائس چانسلر شیخ ابن باز کی دعوت

علامہ اعظمی علیہ الرحمۃ کو جو عالمگیر شہرت و مقبولیت، اور عالم اسلام کے علمی حلقوں میں جو رتبۂ بلند اور عزت و سربلندی نصیب ہوئی تھی، اس کا اندازہ ان ان گنت دعوت ناموں سے ہوگا جو نہ صرف عالم عرب اور عالم اسلام بلکہ بہت سے غیر اسلامی ممالک سے بھی رسمی اور غیر رسمی طور پر آپ کے پاس ارسال کیے گئے، اسی نوع کا ایک دعوت نامہ ۱۳۸۱ھ میں یا اس سے کچھ قبل جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے اس وقت کے نائب رئیس الجامعۃ شیخ عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز (۱) کی طرف سے آپ کی خدمت میں پیش کیا گیا، لیکن علامہ اعظمیؒ نے اپنی

(۱) شیخ عبدالعزیز بن عبداللہ بن عبدالرحمٰن بن عبداللہ آل باز، سعودی دارالحکومت ریاض میں ۱۳۳۰ھ میں پیدا ہوئے، بچپن ہی میں قرآن کریم حفظ کیا، اس کے بعد ریاض کے علماء سے دیگر اسلامی و شرعی و عربی علوم وفنون حاصل کیے، انھوں نے سعودی عرب کے مختلف مقامات پر تدریس وافتاء وقضاء کے فرائض انجام

مصروفیات کے پیش نظر اس سفر سے معذرت فرمادی، ہماری یہ محرومی ہے کہ اصل دعوت نامہ جو شیخ ابن باز نے آپ کی خدمت میں ارسال فرمایا تھا نہیں مل سکا، لیکن آپ کا معذرت نامہ وصول کرنے کے بعد شیخ ابن باز نے جو خط لکھا تھا وہ دستیاب ہوا، شیخ کا یہ خط ۱۰ر رجب ۱۳۸۱ھ کو جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے لیٹر پیڈ پر لکھا گیا ہے، اس میں فرماتے ہیں:

"من عبدالعزیز بن عبدالله بن باز الی حضرة الاخ المکرم حبیب الرحمن الاعظمی . وفقه الله آمین

سلام علیکم ورحمة الله و بر کاته،

اشارة الی خطابکم الکریم المؤرخ ۱۰/۶/ ۱۳۸۱ حول اعتذارکم من عدم تمکنکم من اجابة دعوتنا لکم فی موسم الحج الماضی ، نفیدکم بأن محبکم قد عذرکم أعانکم الله وأثابکم . . ."

(عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز کی جانب سے برادر مکرم جناب حبیب الرحمٰن الاعظمی وفقہ اللہ کی خدمت میں

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ:۔ آنجناب کے والانامے مورخہ ۱۰ر جمادی الاخری ۱۳۸۱ھ کے حوالے سے گذشتہ موسم حج کے موقع پر ہماری دعوت کی قبولیت سے معذرت کے سلسلہ میں، ہم آپ کو خبر دینا چاہتے ہیں کہ آپ کے اس محب نے آپ کا عذر قبول کرلیا، اللہ تعالیٰ آپ کی مدد کریں اور صلہ عطا فرمائیں)

=انجام دے، چنانچہ ۱۳۵۷ھ سے ۱۳۷۱ھ تک خرج کے قاضی رہے، ۱۳۷۱ھ سے ۱۳۸۰ھ تک ریاض کے کلیۃ الشریعۃ وغیرہ میں تدریسی خدمات انجام دی، ۱۳۸۱ھ سے ۱۳۹۰ھ تک جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے وائس چانسلر رہے، ۱۳۹۰ھ میں اس کے چانسلر مقرر ہوئے جس پر وہ ۱۳۹۵ھ تک برقرار رہے، ۱۳۹۵ھ میں ادارات البحوث العلمیۃ والافتاء والدعوۃ والارشاد کی رئاسۃ عامہ کے منصب پر فائز ہوئے، اس کے علاوہ مختلف علمی، دینی اور سماجی واجتماعی عہدوں پر فائز رہے آپ کا شمار سعودی عرب کے صف اول اور عالم اسلام کے ممتاز ترین اہل علم میں ہوتا تھا، علم وفضل کے ساتھ نہایت کشادہ دست، سیر چشم اور سخی وفیاض تھے، ۱۳ر مئی ۱۹۹۹ء مطابق ۲۶ر محرم ۱۴۲۰ھ کو فوت ہوئے۔

رسالۃ الاوائل کی طباعت واشاعت ۱۳۸۲ھ م ۱۹۶۲ء میں علامہ اعظمی نے شیخ محمد سعید سنبل کے رسالہ "الاوائل" کو نہایت اہتمام کے ساتھ چھپواکر شائع کرایا، اس میں شیخ سعید سنبل نے حدیث کی ۴۳ کتابوں کی ایک ایک حدیث (عموماً پہلی حدیث اور کسی کتاب کی آخری حدیث کو) اپنی سند سے نقل کیا ہے، اس رسالہ کو عموماً حدیث کا ذوق رکھنے والے سند واجازت کے حصول کے لئے پڑھا کرتے ہیں۔

مدرسہ مفتاح العلوم کا ایک ناخوشگوار واقعہ ۱۳۷۷ھ مطابق ۱۹۵۷ء میں جب دوسرا جنرل الیکشن ہوا تو مولانا عبداللطیف نعمانی مرحوم الیکشن میں جیت کر اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے، جس کے بعد لازمی طور پر ان کو مئو چھوڑ کر ۵ر سال لکھنؤ میں قیام کرنا پڑا۔ دوسری جانب علامہ اعظمیؒ جب لکھنؤ سے آئے تو مدرسہ کی ذمہ داریوں سے بہت حد تک سبکدوش رہے، کمیٹی کے سرپرست اعلیٰ رہے، اور بوقت ضرورت اور طلبہ واساتذہ کے اصرار پر کچھ کتابیں پڑھادیا کرتے، ان کی تربیت واصلاح کیلئے بھی کوشش کرتے رہتے، یہ سب بطیب خاطر اور برضاورغبت کرتے رہے، لیکن مدرسہ کا کوئی عہدہ قبول نہیں کیا، نتیجہ کے طور پر تمام ذمہ داریاں مولانا محمد ایوب صاحبؒ کے حصہ میں آئیں اور مولانا نعمانی مرحوم کی عدم موجودگی میں پورے پانچ سال تک انھوں نے تمام تعلیمی وانتظامی ذمہ داریاں حسن وخوبی سے انجام دیں، علامہ اعظمی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

> "... مگر جب وہ (مولانا عبداللطیف نعمانی) یوپی اسمبلی کے ممبر چن لئے گئے تو مولانا محمد ایوب صاحب نے تعلیمی اور انتظامی دونوں ذمہ داریوں کو سنبھالا، اور دونوں کو خوبصورتی کے ساتھ نباہا۔" (۱)

پانچ سال بعد جب مولانا نعمانی مرحوم کی مدت رکنیت ختم ہوئی اور دوبارہ مفتاح العلوم تشریف لائے، تو ایک نہایت ناخوشگوار واقعہ یہ پیش آیا کہ مولانا محمد ایوب صاحبؒ اور مولانا عبداللطیف صاحبؒ کے مابین کسی بات پر اختلاف ہوگیا، اختلاف کی یہ خلیج بڑھتی گئی، حتی کہ

(۱) تذکرۂ مولانا عبداللطیف نعمانی ص ۱۵

مولانا محمد ایوب صاحبؒ نے دل برداشتہ ہو کر مدرسہ چھوڑ دیا، مولانا اعظمیؒ فرماتے ہیں:

"ممبری کی مدت ختم ہونے کے بعد جب مولانا عبداللطیف صاحب نے دوبارہ مدرسہ میں آنا چاہا تو اس وقت ان میں اور مولانا ایوب صاحب میں تھوڑی نااتفاقی اور بدمزگی پیدا ہوگئی جس کے نتیجہ میں مولانا ایوب صاحب نے مدرسہ چھوڑ دیا، اور کچھ دنوں کے بعد مدرسہ تعلیم الدین ڈابھیل میں شیخ الحدیث کا عہدہ قبول کرلیا۔"(۱)

مفتاح العلوم کی نشأۃ ثانیہ کے بعد مدرسہ کا یہ پہلا ناخوشگوار اور افسوسناک واقعہ تھا، جو ظہور پذیر ہوا، اور مدرسہ کی توسیع وترقی کے تین اہم عناصر میں سے ایک عنصر الگ ہوگیا۔

مولانا محمد ایوب صاحب اعظمیؒ ۱۳۸۱ھ میں مفتاح العلوم سے علحدہ ہوئے، کچھ دنوں بعد دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ چلے گئے اور کم وبیش ڈیڑھ سال وہاں تدریسی خدمت انجام دی، بعد ازاں علامہ اعظمیؒ کی سفارش پر ڈابھیل تشریف لے گئے، اور جامعہ تعلیم الدین ڈابھیل میں مسند حدیث سنبھالی، تقریباً بیس سال تک وہاں شیخ الحدیث کے منصب پر فائز رہے، ڈابھیل پہونچنے کے بعد مولانا محمد ایوب صاحب علیہ الرحمۃ نے علامہ اعظمی کے ساتھ خط وکتابت اور مراسلت کا سلسلہ برابر قائم رکھا، اس وقت ڈابھیل سے لکھے ہوئے مولانا محمد ایوب صاحبؒ کے متعدد خطوط ہمارے سامنے موجود ہیں، جن میں سے پہلا خط جو ڈابھیل پہنچنے کے بعد علامہ اعظمیؒ کی خدمت میں لکھا تھا، پیش خدمت ہے، یہ خط ۲۹؍ربیع الثانی ۱۳۸۴ھ کا نوشتہ ہے لکھتے ہیں:

"مولانائے محترم اطال اللہ بقاءہ!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، آپ سے رخصت ہو کر بحمد اللہ بخیر وعافیت یہاں پہونچ گیا، طلبہ واساتذہ واراکین مدرسہ بڑے اخلاق ومروت سے پیش آئے، مہتمم صاحب نے دو آدمی سورت بھیج دیا جس سے یہاں تک پہونچنے میں بڑی

---

(۱) تذکرۂ مولانا عبداللطیف نعمانی ص ۱۵

آسانی ہوگئی، میرے متعلق بخاری شریف وترمذی شریف دو کتابیں رکھی ہیں اور اسباق شروع بھی ہو گئے ہیں، بحمد اللہ لڑکے خوش وارا کین مطمئن معلوم ہوتے ہیں، اللہ کی ذات سے قوی امید ہے کہ جو کلمۂ خیر بھی آپ نے میرے متعلق کہا ہو گا، اللہ تعالیٰ اس کو حرف بحرف صادق فرمائیں گے، اور میں رسوائی کا باعث نہ بنوں گا، ابھی کھانے کا کوئی خاص نظم نہیں ہے، کھانا دو وقتہ مہتمم صاحب کے گھر سے آجاتا ہے، ناشتے کا بھی معقول انتظام ہے کوئی تکلیف نہیں، اور طبیعت بھی بفضلہ اچھی ہے۔ آپ کی تصنیفات سے جامعہ کے اساتذہ وغیرہ بالکل ناواقف ہیں، بہت اچھا ہوتا کہ جب آپ تشریف لائیں تو متعدد نسخے رکعات اور اعلام ونصرۃ الحدیث کے لیتے آئیں، اور اگر تشریف آوری میں دیر ہو تو رکعات واعلام مرفوعہ کے دو دو نسخے بذریعہ ڈاک بھیج دیں پیسے میں آکر ادا کر دوں گا، یا جب آپ تشریف لائیں گے اس وقت دیدوں گا، مہتمم صاحب وغیرہ آپ کی تشریف آوری کے بیحد متمنی ہیں، کاشی اکسپریس سے میل نہیں ہے کافی تکلیف کا باعث ہے، بمبئی میل سے میل اچھا ہے، بھساول سے سورت تک ۱۲ر گھنٹہ کا راستہ ہے، میں اچھا ہوں، امید ہے مزاج گرامی اچھے ہوں گے، میری طرف سے مولانا عبدالجبار و مولانا عبدالباری صاحبان وغیرہ کو سلام مسنون عرض ہے۔۔۔"

رہبر حجاج حج کے مسائل اور ان کے احکام پر آپ نے مختصر مگر جامع رسالہ "رہبر حجاج" تصنیف فرمایا، یہ رسالہ ۱۳۸۲ھ مطابق ۱۹۶۲ء میں پہلی بار طبع ہوا۔

مسند حمیدی تقریباً ساٹھ سال کی عمر میں علامہ اعظمی نے اپنی عنان توجہ ایک دوسرے فن کی طرف موڑی، یعنی اس پیرانہ سالی کو پہنچنے کے بعد، جب کہ مختلف امراض و عوارض آپ کی زندگی کے ساتھی بن چکے تھے، قویٰ میں ضعف اور اضمحلال آگیا تھا، حدیث کی کتابوں کی تحقیق و تعلیق اور تخریج و تحشیہ کا وہ کام شروع کیا، جس میں بے پناہ قوت و ہمت کی

ضرورت پڑتی ہے۔

پیغمبر اسلام ؐ کی زندگی اور ان کی تعلیمات سے متعلق عینی شاہدوں کے بیانات، جو انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ کر اور اپنے کانوں سے سن کر بیان کئے ہیں، ان کو جن لوگوں نے سلسلہ بسلسلہ سن کر دوسری صدی ہجری یا تیسری صدی میں قلمبند کیا ہے، یا عہد نبوی میں پھر عہد خلفاء میں جو نوشتے عالم وجود میں آئے تھے، ان کی مدد سے ان سے مکمل تر اور جامع تر مجموعہ تیار کیا ہے، دنیا کے کتب خانوں میں ان کی کھوج لگا کر ان کے قلمی نسخوں کے فوٹو حاصل کر کے ان کی نقلیں تیار کرائیں، ان کو ایڈٹ کیا، ان کی توضیح و تشریح کی اور یہ بتایا کہ فلاں بیان اور فلاں حدیث و روایت اور کہاں کہاں پائی جاتی ہے۔

آپ کی تحقیق سے اس نوعیت کا جو سب سے پہلا مجموعہ منظر عام پر آیا، وہ "مسند حمیدی" ہے، اس سے قبل اگرچہ "انتقاء الترغیب والترھیب" آپ کی تحقیق سے شائع ہو چکی تھی، لیکن وہ انتخاب بہت بعد کا ہے۔ مسند حمیدی کو دوسری صدی کے اواخر یا تیسری صدی ہجری کے اوائل کا مجموعہ کہا جا سکتا ہے، اس کے مرتب ابو بکر عبد اللہ بن الزبیر الحمیدی (متوفی ۲۱۹ھ) امام بخاری کے استاد تھے، علامہ اعظمی نے شام اور ہندوستان کے متعدد کتب خانوں سے اس کتاب کے مخطوطے یا ان کا عکس حاصل کر کے، ان سب کو سامنے رکھ کر ایک صحیح نقل تیار کی اور کتاب کو نہایت دیدہ ریزی اور دقیقہ رسی کے ساتھ ایڈٹ کیا۔ جو مجلس علمی ڈابھیل سے ۱۳۸۲ھ م ۱۹۶۳ء میں دو جلدوں میں شائع ہوئی۔

اس کتاب کی اہل علم میں بہت پذیرائی ہوئی، اس کی مقبولیت کے لئے اتنا ہی عرض کر دینا کافی ہے، کہ نہ صرف ہندوستان اور عالم اسلام، بلکہ دنیائے علم و فن کے علمی مجلوں میں اس پر تبصرے شائع ہوئے۔ چنانچہ دمشق کے عربی ماہوار رسالہ " حضارۃ الاسلام " اور " مجلة المجمع العلمی العربی" جمادی الاولی ۱۳۸۳ (اکتوبر ۱۹۶۳ء) ص ۶۸۶۔۶۸۸ اور جنیوا (سوئزرلینڈ) کے مؤقر عربی رسالے " المسلمون" محرم۔ صفر ۱۳۸۵ھ (مئی۔ جولائی ۱۹۶۵ء) ص ۱۴۳۔۱۴۵ پر اس کتاب پر ریویو پڑھنے کے قابل ہے۔

جامعہ تعلیم الدین ڈابھیل کا جلسۂ دستار بندی اور علامہ اعظمیؒ کی صدارت

مولانا محمد ایوب صاحب علیہ الرحمۃ مفتاح العلوم سے قطع تعلق کے بعد تقریباً ڈیڑھ سال دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں رہے، اس کے بعد ڈابھیل گئے۔ ان کے ڈابھیل جانے کے تقریباً سوا سال بعد جامعہ تعلیم الدین (ڈابھیل) کا جلسۂ دستار بندی منعقد ہوا، جس کی صدارت کیلئے علامہ اعظمیؒ کا انتخاب ہوا اور مقررین میں مولانا ابوالوفاء صاحب شاہجہانپوری (۱) جیسے خطیب و مقرر تھے، تاریخ جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل میں اس جلسہ کی نسبت لکھا ہے:

"۳ شعبان ۸۵ھ مطابق ۲۸ نومبر ۱۹۶۵ء کو بعد نماز عشاء نو تعمیر شدہ دارالطعام (ڈائننگ ہال) میں سالانہ جلسۂ دستار بندی منعقد ہوا، جس کی صدارت ہندوستان کے مایۂ ناز محدث حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی مدظلہ نے فرمائی، بارش کی وجہ سے جلسہ ہال میں رکھا گیا۔ ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا، باہر بھی بہت مجمع تھا، قراءت و نظم کے بعد رپورٹ پیش کی گئی پھر مولانا ابوالوفاء شاہجہاں پوری کا وعظ ہوا" (۲)

---

(۱) اپنے دور کے بے مثال خطیب اور زبردست مناظر تھے۔ دارالعلوم دیوبند کے فاضل اور علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے مخصوص تلامذہ میں تھے، فراغت کے بعد دارالعلوم کے استاذ بھی رہے لیکن قدرت نے ان کی فطرت میں صحرانوردی لکھ دی تھی، اس لئے تقریر و خطابت کے بادشاہ بن کر ہندوستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک چکر لگاتے رہے۔ قادیانیوں اور رضاخانیوں سے بہت سے مناظرے کئے، جمعیۃ علماء ہند کے اہم رہنماؤں میں تھے، برطانوی حکومت کے خلاف ان کی تقریروں نے قید و بند کی بھی راہ دکھائی، شعر و شاعری سے بھی آپ کو دلچسپی تھی، عارف تخلص تھا، صرف نعت پاک کہتے تھے۔ آپ کی تقریر کا موضوع بھی سیرت پاک ہوا کرتا تھا ۱۴۰۰ھ م ۱۹۷۹ء میں شاہجہاں پور میں فوت ہوئے۔

(۲) تاریخ جامعہ تعلیم الدین ڈابھیل ۱۵۴

اس کے بعد اگلے صفحہ پر علامہ اعظمی رحمۃ اللہ علیہ کا نقل معائنہ درج ہے، جس میں اپنے رفیق محترم مولانا محمد ایوب صاحب کا تذکرہ اس طرح کیا ہے :

"...خوش قسمتی سے مدرسہ کو ہمارے محترم دوست جناب مولانا محمد ایوب صاحب (اعظمی) کی خدمات حاصل ہو گئی ہیں، جس کی وجہ سے مدرسہ کا تعلیمی معیار بلند اور اس کا پایۂ عظمت و وقار بہت اونچا ہو گیا ہے..."(۱)

چوتھا حج | ۱۳۸۴ھ اور مسیحی تقویم کے حساب سے ۱۹۶۵ء میں چوتھا حج کیا، اس سفر سے متعلق جو باتیں علامہ اعظمیؒ نے اپنی یادداشت میں تحریر فرمائی ہیں وہ یہ ہیں:

۲۸/ذی قعدہ مطابق یکم اپریل کے خانہ میں لکھتے ہیں:

"ہوائی جہاز سے حج کیلئے روانگی ۶/بجے شام بمبئی سے"

۲۹/ذی قعدہ ۲/اپریل میں لکھتے ہیں:

"طلوع آفتاب سے پہلے جدہ پہونچا، جدہ سے احرام باندھ کر جمعہ سے پہلے مکہ پہونچا، ٹیکسی والے نے فی کس ۶/ریال لئے۔"

سعودی تقویم اور ہندی تقویم میں دو دن کا فرق رہا ہو گا، اس لئے ۳۰/ذی قعدہ کے تحت لکھتے ہیں:

"۳۰/کی شب میں طواف و سعی سے فراغت حاصل کی، ۳۵/ریال منیٰ عرفات کا کرایہ ادا کیا۔"

۱۱/اپریل کے ذیل میں تحریر ہے : "آج وقوف عرفہ ہوا"

۱۲/اپریل کو لکھتے ہیں:

"آج مزدلفہ سے قبیل طلوع چل کر قریب ظہر منیٰ پہونچے، رمی اور نحر سے فراغت قبیل مغرب ہوئی، ۳۰/ریال میں بکرا ملا۔"

---

(۱) تاریخ جامعہ تعلیم الدین ڈابھیل

۲۰/اپریل منگل کے دن لکھتے ہیں:

"آج شیخ یحییٰ امان مکی سے ملاقات ہوئی۔"

۲۲/اپریل جمعرات کو لکھا ہے:

"آج عبدالرحمٰن معلمی، شیخ بہجۃ البیطار شامی، شیخ حسن مشاط مکی سے ملاقات ہوئی۔"

۴/محرم ۱۳۸۵ھ-۶/مئی ۱۹۶۵ء بروز پیر لکھتے ہیں:

"۶/مئی کو غروب کے وقت جدہ سے روانگی، ۷/مئی کو ۱۰ بجے دن میں بمبئی پہونچا۔"

۹/محرم-۱۱/مئی بدھ کے دن لکھا ہے:

"۱۱/مئی کو بمبئی سے روانہ ہوا، ۱۲- کو رات میں مکان پہونچا۔"

اس سفر میں آپ کی ملاقات بہت سے اہل علم وفضل سے ہوئی، جن میں چند ایک کا نام اوپر گذر چکا ہے، ان کے علاوہ مولانا بدر عالم صاحب میرٹھی مہاجر مدنی (۱) سے بھی آپ کی ایک طویل ملاقات رہی، جس کے بارے میں ایک جگہ لکھا ہے:

(۱) وطن میرٹھ تھا، ۱۳۱۶ھ مطابق ۱۸۹۸ء میں بدایوں میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم الہ آباد کے انگریزی اسکول میں پائی، ۱۳۳۰ھ میں سہارنپور بھیج دئے گئے اور ۱۳۳۶ھ میں مظاہر علوم سے فارغ ہوئے، وہاں ۱۳۳۷ھ میں معین مدرس مقرر ہوئے، مگر جلد ہی اس کو چھوڑ کر دیوبند چلے گئے اور وہاں ۱۳۳۹ھ میں دورۂ حدیث میں شریک ہو کر شاہ صاحب کے پاس صحیح بخاری پڑھی، کچھ سال وہاں بھی معین المدرسین رہے، مگر ۱۳۴۶ھ میں شاہ صاحب کے ساتھ ڈابھیل چلے گئے اور ۱۷/سال تک وہاں تدریسی خدمت انجام دی، وہیں انھوں نے شاہ صاحب کی وفات کے بعد بخاری شریف پر ان کے افادات کو فیض الباری کے نام سے مرتب کیا، ۱۳۶۲ھ م ۱۹۴۳ء میں ندوۃ المصنفین سے وابستہ ہو کر اس کے لئے ترجمان السنۃ لکھی، ۱۹۴۷ء میں ملک کی تقسیم کے بعد پاکستان اور پھر وہاں سے مدینہ منورہ ہجرت فرما گئے۔ ۵/رجب ۱۳۸۵ھ کو مدینہ منورہ میں وفات پائی، اور جنۃ البقیع میں مدفون ہوئے۔ (تاریخ دارالعلوم دیوبند ۲/۱۴۲-۱۴۱)

"زرته في داره المرة الأخيرة في أواخر ذي الحجة سنة أربع و ثمانين وثلثمائة والف فتحدث معي برهة طويلة و أهدى لي الجزء الثالث من تاليفه."

(میں نے ان سے آخری ملاقات ذی الحجہ ۱۳۸۴ھ کے اواخر میں ان کے مکان پر کی، وہ مجھ سے دیر تک گفتگو کرتے رہے اور اپنی کتاب کا تیسرا حصہ مجھے ہدیہ کیا۔)

اس سفر سے واپسی کے بعد گھر سے ۱۸/ محرم ۱۳۸۵ھ ۲۱/ مئی ۱۹۶۵ء کو شیخ ابوغدہ کے پاس ایک خط لکھا جس میں بعض عرب علماء کی ملاقات کا ذکر کیا ہے، لکھا ہے:

"وقد اتفقت في هذه الرحلة زيارة الشيخ محمد بهجة البيطار، والشيخ مصطفى الزرقاء، والشيخ محمد مبارك، والشيخ محمد الشامي والشيخ النبهاني . . ."

(اس سفر میں شیخ محمد بہجۃ البیطار، شیخ مصطفیٰ زرقاء، شیخ محمد مبارک، شیخ محمد شامی اور شیخ نبہانی سے ملاقات ہوئی)

کتاب الزہد والرقائق علامہ اعظمی نے جن مخطوطات پر تحقیقی کام کیا ہے، ان میں سب سے قدیم امام ربانی عبداللہ بن المبارک مروزی (متوفی ۱۸۱ھ) کی کتاب الزہد والرقائق ہے، اس کا زمانۂ تصنیف ہجرت کے تقریباً ڈیڑھ سو سال بعد ہے، اس کتاب کو آپ نے تین قلمی نسخوں کی مدد سے ایڈٹ کیا ہے، ایک نسخہ ترکی سے، دوسرا اسکندریہ سے اور تیسرا دمشق (شام) سے حاصل کیا۔ یہ کتاب ۱۳۸۵ھ م ۱۹۶۶ء میں مجلس احیاء المعارف سے پہلی دفعہ شائع ہوئی۔ یہ کتاب بھی علمی حلقوں میں نہایت قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھی گئی، بالخصوص عربوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ سابق شیخ الازہر ڈاکٹر عبدالحلیم محمودؒ نے علامہ اعظمی کی اس علمی خدمت کو "الامام الربانی الزاهد عبدالله بن المبارك" میں ان الفاظ میں داد تحسین دی ہے:

"كتاب الزهد والرقائق۔۔۔ وقد حققه و علق عليه الأستاذ المحدث المحقق الشيخ حبيب الرحمن الأعظمى وقد بذل المحقق جهداً مشكوراً حتى أخرجه فى صورة دقيقة و فى طبعة أنيقة ۔۔۔"(۱)

(اور کتاب الزہد والرقائق۔۔۔ استاذ محدث و محقق شیخ حبیب الرحمٰن الاعظمی نے اس کی تحقیق کی ہے اور اس پر تعلیقات لکھی ہیں اور اس کی تحقیق میں قابل شکر کوشش صرف کی ہے، حتی کہ اس کو بہتر اور پاکیزہ صورت میں شائع کیا۔)

اسی طرح شیخ الازہر نے اپنی کتاب (الامام الربانی) کی پیشانی پر جو ہدیہ کی عبارت لکھی ہے، اس میں یہ الفاظ تحریر فرمائے ہیں:

"الى السيد الاستاذ حبيب الرحمن الأعظمى تحية تقدير واعتراف بفضله فى تحقيق كتاب الرقائق لابن المبارك."

(سید استاذ حبیب الرحمٰن الاعظمی کی خدمت میں ابن مبارک کی کتاب الرقائق کی تحقیق میں ان کے فضل کا اعتراف اور اس کو تسلیم کرتے ہوئے)

جامعہ نظامیہ حیدر آباد کی نصاب کمیٹی کی رکنیت اور تشکیل نصاب

جامعہ نظامیہ حیدر آباد، ہندوستان کا بالخصوص جنوبی ہند کا مشہور تعلیمی ادارہ ہے، اپنے مخصوص تعلیمی نظام کی وجہ سے یہ ہمیشہ خاص اہمیت کا حامل رہا ہے، ۱۹۶۷ء میں اس کے نصاب درس میں اصلاح و ترمیم کی ضرورت محسوس کی گئی، اس پر غور و خوض کرنے کیلئے ایک کمیٹی تشکیل دی گئی، اس کمیٹی کے رکن علامہ اعظمی بھی بنائے گئے، آپ کے نام نامی کی پیش کش خصوصی طور پر مولانا سید ابوالحسن علی میاں صاحب نے کی، رکنیت کی اطلاع دینے کیلئے ۲۶ر ستمبر ۱۹۶۷ء مطابق ۲۱ ۱۳۸۷ھ کو مولانا علی میاں صاحب نے علامہ اعظمی کے پاس یہ خط لکھا:

(۱) الإمام الربانى ص ۱۲۰

"حکومت حیدر آباد مدرسہ نظامیہ کی اصلاح کی تجویز پر غور کر رہی ہے اس کیلئے اس نے ایک کمیٹی بنائی ہے، میں نے آپ کا نام بھی پیش کیا تھا، اس نے منظور کر لیا ہے اور مجھے اطلاع دی ہے، اور آپ کا پتہ دریافت کیا ہے، یہ سفر غالباً میری واپسی کے بعد ہو سکے، مدعو حضرات حکومت کے مہمان ہوں گے اور وہیں سے اس کے مصارف ادا ہوں گے۔"(۱)

اس کے بعد جب نصاب تشکیل دیا گیا تو علامہ اعظمی کی اس میں اہم مشارکت یہ رہی کہ انھوں نے اس کے کچھ ایسے رہنما اصول وضع کئے، جن سے اس کی ترتیب میں استفادہ کیا گیا، مولانا علی میاں صاحب ۱۴ر جون ۱۹۶۸ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں:

"مولانا ابوالعرفان صاحب نے محمد رابع کی رفاقت و شرکت کے ساتھ جامعہ نظامیہ کا نصاب تیار کر لیا، ان لوگوں کی درسی مشغولیت کی وجہ سے اس میں بھی دیر لگی، اس نصاب کی ترتیب میں آپ کے تحریر کردہ رہنما اصول سے بھی فائدہ اٹھایا گیا، میں نے لفظ بلفظ سن لیا اور مجھے مجموعی طور پر اس سے اتفاق ہے، ایک آدھ جگہ میں نے ترمیم بھی کر دی ہے، اس کام میں اتنی تاخیر ہو گئی ہے کہ مزید تاخیر کی گنجائش نہیں، سکریٹری صاحب کے تقاضے کا خط آئے ہوئے بھی خاصے دن ہو گئے، لیکن آپ کی نظر پڑنے سے پہلے اس کا بھیجنا مناسب نہ معلوم ہوا، لہذا اس کی نقل آپ کے پاس مرسل ہے۔ اب آپ یہ خط ملاحظہ فرماتے ہی اس پر نظر ڈال کر مطلع فرمائیں کہ اس کو براہ راست یہاں سے بھیج دیا جائے، اگر رائے بریلی کے پتہ پر تار دیدیا جائے تو اور بہتر ہوگا۔"

(۱) مولانا رشید احمد صاحب اعظمی سے معلوم ہوا کہ جامعہ نظامیہ کے تشکیل نصاب کیلئے جامعہ کی دعوت پر آپ نے باقاعدہ حیدر آباد کا سفر بھی فرمایا، حکومت کی طرف سے قیام کا انتظام ایک شاندار ہوٹل میں کیا گیا تھا، مگر مولانا ابوالوفا افغانی، جو اپنے وقت کے عظیم عالم و محقق تھے، اور علامہ اعظمی سے شدید محبت رکھتے تھے، اصرار کر کے اپنے دولت خانہ پر لے گئے، چنانچہ علامہ اعظمی جب تک حیدرآباد میں رہے انھیں کے یہاں مقیم رہے، اس وقت نصاب کمیٹی کی جو میٹنگ ہوئی تھی اس میں رہنما اصول طے کئے گئے تھے۔

دارالعلوم دیوبند سے صدارت تدریس کی پیشکش | ازہر ایشیا دارالعلوم دیوبند کی مسند صدارت نہایت بابرکت اور باعث عزت و تکریم سمجھی جاتی رہی ہے، اس کی مسند پر حضرت مولانا یعقوب نانوتویؒ (۱) حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ، امام العصر حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ، شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ اور حضرت مولانا ابراہیم بلیاویؒ جیسے علم کے آفتاب و ماہتاب جلوہ افروز رہ چکے ہیں، دارالعلوم دیوبند کی صدارت کی نسبت بجا طور سے کہا جا سکتا ہے کہ:

یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا

۲۴ر رمضان المبارک ۱۳۸۷ھ کو شیخ المعقول والمنقول علامہ ابراہیم بلیاوی صاحبؒ کی وفات کا سانحۂ دلگداز جب پیش آیا، تو ایک بار پھر دارالعلوم کے ارباب بست و کشاد کو یہ فکر لاحق ہوئی کہ یہ مسند صدارت کسی موزوں شخص کے سپرد کر کے اس خلا کو پر کیا جائے، اور صدارت افتاء کے ۲۳ر سال بعد صدارت تدریس کا یہ قرعۂ فال بھی علامہ اعظمیؒ کے نام نکلا، لیکن واہ رے بے نیازی! کہ:

تو ہی اگر نہ چاہے تو باتیں ہزار ہیں

اس بار بھی آپ نے معذرت فرمادی اور شاگرد عزیز مفتی محمد ظفیر الدین مفتاحی کو ۲۵ر شوال ۱۳۸۷ھ (۲) کو یہ خط لکھا:

---

(۱) مولانا مملوک علی نانوتوی استاذ عربک کالج دہلی کے خلف الرشید تھے نانوتہ ضلع سہارنپور میں ۱۲۴۹ھ (۱۸۳۳ء) میں پیدا ہوئے، دارالعلوم دیوبند کے سب سے پہلے صدر المدرسین تھے، اکابر علماء دیوبند آپ کے شاگرد تھے، جید عالم تھے اور جذب و سلوک کا آپ کے اوپر غلبہ رہا کرتا تھا۔ ۳ر ربیع الاول ۱۳۰۲ھ میں فوت ہوئے۔ (تاریخ دارالعلوم ۱: ۱۹۸۔ کاروان رفتہ ص ۲۶۹)

(۲) ترجمان الاسلام کے مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی نمبر میں ۲۵ر شوال ہے، جب کہ "مشاہیر علماء ہند کے علمی مراسلے" میں ۵ر شوال درج ہے، کسی ایک میں کتابت کی غلطی ہے۔

"علامہ کی وفات کے بعد دیوبند سے جو خط لکھا تھا وہ پہلے مل گیا تھا، آج وطن سے بھیجا ہوا تمہارا خط ملا۔ تم نے جو باتیں لکھی ہیں وہ بعید از قیاس نہیں ہیں میرا خیال ہے کہ ہر دو فریق مجھے اس لئے گوارا کرلیں گے کہ ہر ایک کے سامنے آئندہ جو اندیشے ہوں گے، وہ میرے باب میں یا تو نہ ہوں گے، یا بہت کم ہوں گے، مگر میں اپنے دل کو جہاں تک ٹٹولتا ہوں، میرے دل کے کسی گوشہ میں یہ تمنا نہیں ملتی۔ میں وہاں کے ماحول سے بہت متوحش ہوں، میں انشاء اللہ وہاں کا رنگ قبول نہیں کر سکتا اور امید نہیں کہ میرا رنگ وہاں مقبول ہو۔"(۱)

مکتوب الیہ مفتی محمد ظفیر الدین صاحب اس بات کی توجیہ اس طرح کرتے ہیں:

"حضرت کو دیوبند کی آب و ہوا کبھی موافق نہیں آئی، جب کبھی شوریٰ میں تین دن کیلئے بھی آئے تو بیمار ضرور ہوئے اور مجھے دوا کی فکر کرنا پڑی، ایک بڑی وجہ دیوبند سے وحشت کی یہ بھی تھی کہ حضرت نے جس قدر بھی علمی اور تعلیمی کام کیا، سب گھر پر بیٹھ کر کیا، ظاہری طور پر شہرت کی وجہ آپ کے ساتھ کچھ بھی نہیں تھی، جو کچھ تھا وہ آپ کی علمی خدمت، علوم دینیہ میں مہارت بالخصوص علم حدیث سے شغف تھا، اللہ تعالیٰ نے دل و دماغ اور فکر و ذہن متقدمین جیسا عطا کیا تھا، مئو جیسی چھوٹی اور صنعتی جگہ میں رہ کر پورے عالم اسلام میں روشناس ہوئے اور برصغیر سے لے کر سعودی عرب، کویت اور مصر تک کے علماء کرام نے آپ سے حدیث کی سند اور اجازت حاصل کی، طبیعت غیور اور بے نیاز پائی تھی ، شہرت طلبی کے جذبہ سے سینہ پاک تھا، نام و نمود سے کوسوں دوری تھی، مگر مقبولیت خداداد تھی اور غالباً علوم نبوت سے دلچسپی کا فیضان تھا۔"(۲)

---

(۱) ترجمان الاسلام ش ۱۱۔۱۰ ص ۱۶۰ (۲) ایضاً ص ۱۶۱۔۱۶۰

سنن سعید بن منصور | اس کتاب کی اہمیت اس سے سمجھی جاسکتی ہے کہ اس کے مؤلف امام سعید بن منصور (متوفی ۲۲۷ھ) امام مسلم جیسے جلیل القدر محدث کے استاذ تھے، علم حدیث کا یہ بیش بہا اور نادر ونایاب نسخہ بڑی اہمیت کا حامل تھا، صدیوں سے بڑے بڑے نامور علماء ومحدثین اس کی صورت دیکھنے کو ترستے تھے۔ خدائے تعالی نے اس کتاب کو منظر عام پر لانے کا شرف بھی خاک ہندوستان کے حصے میں لکھ رکھا تھا، اس مخطوطے کو ڈاکٹر حمید اللہ حیدر آبادی فرنساوی نے ترکی کے ایک کتب خانے میں دریافت کیا اور مجلس علمی کے بانی وسرپرست مولانا محمد موسیٰ میاں کو اس کی اطلاع دی، مولانا نے ڈاکٹر صاحب کو خط لکھا کہ آپ اسے ہندوستان مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی کے پاس بھیج دیں میں ان کو لکھ رہا ہوں کہ آپ اس کی تحقیق فرمادیں، علامہ اعظمی نے اس کی تحقیق اور احادیث کی تخریج کی، اس کی صرف دو ہی جلدیں دستیاب ہوسکیں، جو آپ کے ایڈٹ کرنے کے بعد مجلس علمی ڈابھیل سے ۱۳۸۷ھ م ۱۹۶۷ء اور ۱۳۸۸ھ ۱۹۶۸ء میں شائع ہوئیں، اس طرح ہندوستان کی کلاہ افتخار میں ایک اور طرہ کا اضافہ ہوا۔ علامہ اعظمی جس زمانہ میں اس کی تحقیق فرمارہے تھے، ڈاکٹر حمید اللہ نے مولانا ابراہیم میاں کو خط لکھا تھا کہ مولانا اعظمی سنن سعید بن منصور کی تحقیق کیا کررہے ہیں، کتاب کو چار چاند لگارہے ہیں۔

مجمع بحار الانوار | ہندوستان کے مشہور محدث اور اکبری دور کے زبردست عالم مولانا محمد طاہر پٹنی (متوفی ۹۸۶ھ) کی جامع اور بہترین کتاب حدیث کے لغت پر ہے، یہ کتاب لکھنؤ کے مشہور پریس منشی نول کشور سے متعدد بار چھپی تھی، مگر ان نسخوں میں غلطیاں بکثرت تھیں علامہ اعظمی نے اپنے تعاون سے اس کے مختلف نسخوں کا مقابلہ کراکے اس کی تصحیح، اور اس کو ایڈٹ کرکے از سر نو اشاعت کے قابل بنایا۔ اس کتاب کی پانچوں جلدیں ۱۳۸۷ھ ۱۹۶۷ء سے ۱۳۹۵ھ ۱۹۷۶ء کے درمیان مجلس دائرۃ المعارف النعمانیہ حیدر آباد سے شائع ہوئیں۔

حکومت کویت کی وزارۃ الاوقاف کی دعوت

۱۳۸۸ھ م ۱۹۶۸ء سے ۱۳۹۰ھ ۱۹۷۰ء تک تقریباً تین چار سال مسلسل آپ کو کویت کی وزارة الأوقاف والشئون الإسلامية کی جانب سے کویت کے سفر اور قیام کے لئے دعوت دی جاتی رہی ۔ کویت کی وزارت اوقاف نے اسلامی علوم وفنون اور علمی کتابوں کی اشاعت میں بعض بڑی قابل قدر خدمات انجام دی ہیں، اُن دنوں وزارت کی طرف سے " الموسوعة الفقهية" (فقہی انسائیکلوپیڈیا) کی جمع وترتیب کا کام ہو رہا تھا، اس سلسلے میں علامہ اعظمی کو بھی دعوت دی گئی کہ آپ وہاں کم وبیش ایک سال قیام فرمائیں اور دوران قیام انسائیکلوپیڈیا کی ترتیب سے متعلق جو ذمہ داری آپ کے سپرد کی جائے اس کو انجام دیں، اس کے لئے وہاں کے نامور عالم وفقیہ شیخ مصطفیٰ احمد الزرقاء کی طرف سے، جو اس مہم کے نگراں تھے، پہلے دعوت نامہ بعد ازاں یاد دہانی کے متعدد خطوط (Reminders) آئے، کافی پس وپیش اور تردد وتامل کے بعد کسی صورت سے علامہ اعظمی نے اس سفر اور اس مہم کی ادائیگی کیلئے اپنے ذہن کو سازگار کیا۔ شیخ مصطفیٰ احمد الزرقاء کو جب آپ کی آمادگی کا خط موصول ہوا تو ان کی خوشی کی انتہا نہ رہی ۔ شیخ زرقاء کے اولیں خطوط جن میں وہ دعوتنامہ اور سفر کے شرائط تھے ، وہ تو ہمیں مل نہیں سکے کہ ہم ان کو یہاں ذکر کریں، البتہ آخر کے دو خط ملے جو ہماری بات کی شہادت کیلئے کافی ہیں، شیخ کے دونوں خط جو دستیاب ہوئے ہیں ان میں پہلا وہی ہے جسے علامہ اعظمی کی آمادگی کے بعد انھوں نے تحریر فرمایا ہے اور جو ۱۶ ربیع الثانی ۱۳۸۹ھ مطابق ۳۰ رجون ۱۹۶۹ء کا مکتوب ہے، ذیل میں ہم اس خط کا ایک اقتباس نقل کر رہے ہیں کیونکہ پورا خط بہت طویل ہے اور فل اسکیپ کے دو صفحات پر مشتمل ہے۔ لکھتے ہیں:

" صاحب الفضيلة الأستاذ الجليل الشيخ حبيب الرحمن الأعظمي المحترم حفظه الله تعالى وأدام للمسلمين نفعه.

السلام عليكم :

وبعد فأحمد الله تعالى إليكم راجيا من فضله أن تكونوا بخير و عافية

من كل مكروه .

تلقيت الآن رسالتكم العزيزة المؤرخة في ٦/٤/١٣٨٩ھ جوابا على رسالتي الأخيرة اليكم . وقد كان سروري عظيما جداً بما تضمنته من استعدادكم للمجئى هنا للتعاون في مشروع الموسوعة بما يمكن أن يستفاد فيه من فضيلتكم في هذاالمشروع الجلل، بارك الله فيكم و قواكم وإيانا على متابعة الخدمة لهذه الشريعة الغراء الخالدة.

أفدتم في رسالتكم المشار إليها أنكم تأملون أن يتحقق مجيئكم في أول شهر آب المقبل ، فأقول لفضيلتكم إن الأفضل أن يكون مجيئكم بعد ذلك بنحو أربعين يوماً ، أى ما بين ١٠ـ١٥/ من شهر أيلول (سبتمبر) ذلك لأني سأكون غائبا خلال آب و حتى اليوم العاشر من شهر أيلول في إجازتي السنوية إن شاء الله . فالمناسب أن يكون مجيئكم في موعد عودتي من إجازتي. لذلك بادرت الآن الكتابة اليكم لترتبوا قدومكم الميمون ان شاء الله واستعدادكم له على هذا الأساس .

هذا رأى و اقتراح ، وليس حتما ، فإذا وجدتم أن تأخركم إلى أول شهر أيلول يخشي أن يكون تتجدد لكم به عوائق جديدة ، فعجلوابالمجيء في أول شهر آب وأترك لكم الخيار في ذلك ، و سأترك لكم قبل غيابي موضوعاً تخططونه و تكتبون فيه إذا رجحتم المجيء قبل عودتي . "

(فضیلت مآب استاذ جلیل و مکرم شیخ حبیب الرحمٰن الا عظمی! اللہ تعالیٰ آپ کی حفاظت فرمائیں اور مسلمانوں کیلئے آنجناب کے فیض کو تادیر باقی

باقی رکھیں۔

السلام علیکم۔

میں بحمد اللہ بخیر ہوں اور اس کے فضل سے امید کرتا ہوں کہ آنجناب بھی بخیر وعافیت ہوں گے۔

میرے آخری خط کے جواب میں ۶ ربیع الثانی ۱۳۸۹ھ کا آپ کا تحریر کردہ والانامہ موصول ہوا۔

میں بہت زیادہ مسرور ہوا جب میں نے اس کو انسائیکلوپیڈیا کے پروجیکٹ کے سلسلے میں تعاون کے لئے آپ کی یہاں آمد کی آمادگی پر مشتمل پایا ؛ تاکہ اس عظیم پروجیکٹ میں آنجناب کی ذات سے ممکن طور پر استفادہ کیا جاسکے ، اللہ تعالیٰ آپ کے کام میں برکت عطا فرمائیں اور آپ کو اور ہم کو اس روشن اور ابدی شریعت کے لئے خدمت کو جاری رکھنے کی قوت بخشیں۔

آپ نے اپنے مذکورہ بالا خط میں اس بات کا اظہار کیا ہے کہ آئندہ اگست میں یہاں آپ کی تشریف آوری کی امید ہے۔ تو میں آنجناب سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ بہتر ہوگا کہ آپ اس کے چالیس دنوں بعد یعنی ۱۰ر سے ۱۵ر ستمبر کے دوران تشریف لائیں، کیونکہ میں اگست میں اور ۱۰ر ستمبر تک اپنی سالانہ چھٹی کی وجہ سے غیر حاضر رہوں گا، لہٰذا بہتر ہوگا کہ آپ کی تشریف آوری چھٹی سے میری واپسی کے بعد ہو ، اسی لئے میں بغیر کسی تاخیر کے آپ کے پاس یہ خط لکھ رہا ہوں، تاکہ آپ اپنے قدوم میمنت لزوم کا پروگرام اسی کے موافق ترتیب دیں۔

یہ میری رائے اور تجویز ہے کوئی حتمی فیصلہ نہیں، لہٰذا اگر آپ یہ محسوس کریں کہ ستمبر کے شروع تک مؤخر کرنے کی صورت میں نئی رکاوٹوں کے پیدا ہونے کا اندیشہ ہے، تو پھر آپ اگست کے آغاز میں

تشریف لائیں، اس کا اختیار آپ کو ہے ، میری واپسی سے قبل اگر آپ تشریف لانا چاہیں تو میں اپنی عدم موجودگی میں ایک موضوع چھوڑ جاؤں گا جس کا لائحۂ عمل تیار کر کے آپ لکھنا شروع کر دیں گے ...)

مشغولیات کی کثرت، عدیم الفرصتی اور تنگئ اوقات کی وجہ سے بڑی ردوکد کے بعد کسی سفر کا پروگرام بناتے تھے، بالخصوص طویل سفر سے متعدد موانع آپ کے سامنے رہتے تھے، اور اکثر و بیشتر ایسا ہوتا کہ ایک دفعہ اگر پروگرام مؤخر یا ملتوی ہو جاتا تو دوبارہ اس کے پیش آنے کے امکانات بہت ہی کم، بلکہ نہیں کے برابر ہوتے تھے، اس پروگرام کا حال بھی وہی ہوا، ایک بار مؤخر ہوا پھر ہوتا ہی رہا، چنانچہ شیخ مصطفیٰ زرقاء کا دوسرا خط جو ہمارے پیش نظر ہے وہ ۱۱ رجب ۱۳۹۰ھ مطابق ۱۲ ستمبر ۱۹۷۰ء کا ہے، جس میں فرماتے ہیں:

"صاحب الفضيلة الأستاذ الجليل الشيخ حبيب الرحمن الأعظمي المحترم زاده الله عافية و قوة .

السلام عليكم .

وبعد. فأسأل المولى أن تكون حالتكم الصحية جيدة . وأن تكون آثار العملية الجراحية قد ولت وعاد اليكم نشاطكم المعهود ، وحينئذ أجد الفرصة سانحة لتكرار العرض على فضيلتكم للحضور الى الكويت والقيام بمهمة عضو في هيئة تحرير الموسوعة ، وذلك لمدة سنة مبدئيا ، بالشروط والتعليمات المبينة لسيادتكم سابقاً وبمرتب شهرى (ليس معه أى توابع أو علاوات) قدره / ۳۵۰ ر ثلاثماية و خمسون دينارا كويتيا . . . ."

(فاضل گرامی استاذ جلیل مکرمی جناب حبیب الرحمٰن الاعظمی صاحب اللہ تعالیٰ آپ کو مزید عافیت و قوت نصیب فرمائیں۔

السلام علیکم۔ میں خدا سے دعا گو ہوں کہ آنجناب کی صحت بہتر ہو اور

آپریشن کے اثرات زائل ہو چکے ہوں اور آپ کی نشاط و سرگرمی معمول پر آگئی ہو ، اس وقت میں یہ موقع غنیمت سمجھ رہا ہوں کہ کویت حاضری اور انسائیکلو پیڈیا کے ایڈیٹوریل بورڈ میں ایک ممبر کی حیثیت سے اپنی مہم کی ادائگی کے سلسلے میں آنجناب سے دوبارہ عرض کروں اور یہ کم از کم ایک سال کے لئے ہوگا ،انھیں شرائط و ہدایات کے ساتھ جو آنجناب سے پہلے عرض کئے جا چکے ہیں، اور ۳۵۰ / تین سو پچاس کویتی دینار کے مشاہرہ کے ساتھ (جس میں دیگر سہولیات ولوازمات شامل نہیں ہوں گے ...)

بہر حال علامہ اعظمیؒ کا یہ سفر مؤخر ہونے کے بعد منسوخ ہو گیا، اس کی منسوخی کے متعدد عوامل میں ایک بڑا سبب یہ تھا کہ اسی دوران آپ کو بیروت کا ضروری سفر پیش آیا اور وہاں چار مہینے قیام کرنا پڑا (جس کی تفصیل آگے آرہی ہے)البتہ آپ نے فقہی انسائیکلو پیڈیا کی خدمت ضرور انجام دی ، لیکن کویت جاکر اور وہاں شاہی مہمان بن کر نہیں ، اور نہ ہی درہم و دنیار اور مال و زر کی لالچ میں۔ وزارۃ الاوقاف کی تحریک پر ہی انسائیکلوپیڈیا کا کام کیا، لیکن سفالہ پوش مکان کے نیم تاریک گوشے میں بیٹھ کر، محض علم اور دین کی خدمت کے جذبے سے اور اسی کے ساتھ گھر بیٹھے ہی انسائیکلو پیڈیا کے متعدد مقالات پر نظر ثانی کا کام بھی کیا۔

ایک اور صاحبزادی کی وفات۔ پہلی صاحبزادی کی وفات کے دس سال بعد اسی قسم کا ایک اور جانکسل واقعہ بھی آپ کو سہنا پڑا، اور ایک اور بچی کو اپنے ہاتھوں قبر میں اتارنا پڑا، جب کہ آپ کی صاحبزادی زکیہ خاتون ۱۸/ محرم ۱۳۸۹ھ م ۶/ جون ۱۹۶۹ء کو اس دنیا سے کوچ کر گئیں، علامہ اعظمی خود لکھتے ہیں:

"زکیہ خاتون بنت حبیب الرحمٰن الاعظمی، والدہ مولوی ضیاء الحسن سلمہ ۱۸/ محرم ۱۳۸۹ھ مطابق ۶/ جون ۱۹۶۹ء کو سوا دس بجے دن میں بیس

اکیس دن کی بیماری کے بعد انتقال کر گئی، اپنی والدہ کی آنکھوں کی معذوری کے بعد سے بڑی حد تک میرے کھانے ناشتہ کی دیکھ ریکھ وہی کرتی تھی، اس کا اکلوتا لڑکا دورۂ حدیث میں تھا، اس کی فراغت کی خوشی میں افسوس کہ وہ شریک نہ ہو سکی، واللہ تعالیٰ أعلم بمصالح عبادہ"

احتباس بول اور آپریشن ارشاد نبوی ہے کہ جو خدا کا جتنا زیادہ مقرب ہوتا ہے اس کی آزمائش بھی اتنی ہی سخت ہوتی ہے، بچی کے انتقال کے ایک ماہ بعد علامہ اعظمی ۷ر جولائی ۱۹۶۹ء کو بمبئی کے ایک سفر پر روانہ ہوئے، ابھی ٹرین ہی پر تھے کہ جبل پور سے پہلے احتباس بول کی شکایت ہوئی، اس کے بعد دو آپریشن ہوئے، ایک جبل پور میں اتر کر فوراً اور دوسرا بمبئی میں، اس واقعہ کا ذکر ایک خط میں یوں کیا ہے:

"اسی اثناء میں ۷ر جولائی ۱۹۶۹ء کو مجھے بمبئی کا سفر پیش آیا اور ریل میں مجھے احتباس بول کی شکایت ہوئی، جس نے اتنی شدت پکڑی کہ مجھے جبل پور اتر کر ہسپتال میں داخل ہونا پڑا، وہاں موت و زیست کی کشمکش میں ایک چھوٹے آپریشن کے بعد ربر کی نلکی کے ذریعہ پیشاب جاری کیا گیا، اس کے بعد اسی حالت میں بمبئی جا کر ایک نرسنگ ہوم میں داخل ہوا اور وہاں غدود مثانہ کا آپریشن ہوا، چالیس دن تک وہاں رہا۔"

اس آپریشن کے دوران وہ کن تکالیف اور صبر آزما کیفیات سے گذرے، اس کے متعلق اسی خط میں چند سطر بعد لکھتے ہیں:

"میں اس علالت اور عملیہ جراحیہ کے دوران میں جن حالات سے گذرا ہوں بس اللہ ہی بہتر جانتا ہے، خیر حق تعالیٰ کا ہزار ہزار شکر ہے کہ اس نے گویا دوبارہ زندگی بخشی۔"

آپریشن کے بعد اس کے اثرات آپریشن کے بعد اصل مرض تو زائل ہو گیا،

لیکن اس کے شدید اثرات دوسرے اعضاء پر ظاہر ہوئے جو مدت تک برقرار رہے، مثلاً کمزوری، نقاہت اور دوران سر، یہ سب شکایتیں کافی دنوں تک رہیں، اس کا ذکر بھی اسی مذکورہ بالا خط میں کیا ہے۔ خیال رہے کہ یہ گرامی نامہ آپریشن کے تقریباً ۹ر ماہ بعد ۲۱ر اپریل ۱۹۷۰ء م ۱۴ر صفر ۱۳۹۰ھ بروز منگل کا نوشتہ ہے :

"بمبئی سے وطن آکر مہینوں چلنے پھرنے کے قابل نہیں تھا، اب تھوڑی دور چل پھر لیتا ہوں، مگر چلنے کی حالت میں جسم ڈگمگاتا ہے، توازن قائم نہیں رہتا، رات میں یہ کیفیت بڑھ جاتی ہے۔ بہر حال انھیں حالات میں اب لکھنے پڑھنے بھی لگا ہوں۔"

اس حالت و کیفیت کا تذکرہ اس زمانے کے کئی خطوط میں ملتا ہے۔ چنانچہ مذکورہ بالا خط سے پہلے مفتی ظفیر الدین صاحب کو لکھ چکے تھے :

"واقعی بڑا سخت ابتلا تھا، اللہ تعالیٰ کا فضل واحسان ہے کہ اس نے اس سخت مرحلہ سے سلامتی کے ساتھ گذار دیا، آپریشن میں الحمد للہ کوئی تکلیف وغیرہ نہیں ہے، لیکن دوران سر کی شکایت اتنی شدید ہے کہ ابھی تک مسجد جانے کے قابل نہیں ہوں، جسم قابو میں نہیں رہتا (۱)

بیروت کا سفر مصنف عبدالرزاق کی تحقیق علامہ اعظمی کا وہ عظیم الشان علمی و تحقیقی کارنامہ ہے جو علم حدیث کی تاریخ میں زریں حروف سے لکھنے کے قابل ہے، آپ کے اس تحقیقی شاہکار کی گونج اس کی طباعت واشاعت کے بہت پہلے سے علمی حلقوں میں سنائی دینے لگی تھی۔ علامہ اعظمی نے عالم اسلام کے مختلف کتب خانوں سے اس کے قلمی نسخوں کی فراہمی، نقل، اور ان کے مقابلہ اور تحقیق و تعلیق میں دس سال کی جو شبانہ روز محنت و مشقت اور جاں سوزی و جگر کاوی کی وہ آپ ہی کا حصہ تھا، ان تمام مراحل سے گذرنے کے بعد جب کتاب تیار ہو کر اس قابل ہوئی کہ پریس میں دی جاسکے تو اس کے

(۱) مشاہیر علماء ہند کے علمی مراسلے ص ۱۹۲

لئے بھی آپ نے خصوصی اہتمام فرمایا، مجلس علمی کی طرف سے اس کتاب کو نشر ہونا تھا، مجلس سے فرمائش و فہمائش کر کے لندن سے اعلیٰ درجہ کے کاغذ منگوائے، طباعت کی نگرانی اور فرموں کی دیکھ بھال کیلئے بنفس نفیس بیروت کا سفر کیا، اور تقریباً چار مہینے بیروت میں قیام فرما کر کتاب کے فرموں کی دیکھ بھال اور چھپائی کے کاموں کی نگرانی فرماتے رہے، اس سفر میں معاون کی حیثیت سے اپنے بڑے صاحبزادے مولانا رشید احمد صاحب اعظمی کو ساتھ رکھا، جو شروع ہی سے مخطوطات وغیرہ کے نقل و تحریر میں آپ کے دست راست اور کتب حدیث کی تحقیق و تخریج میں آپ کے معاون رہے ہیں۔

بیروت کے آپ نے دو سفر کئے، پہلا سفر ستمبر ۱۹۷۰ء کے اواخر میں ہوا، بمبئی کے سانتا کروز ایرپورٹ سے ۲۴ر ستمبر ۱۹۷۰ء کو صبح پانچ بجے روانہ ہوئے۔ جہاز کویت ایرپورٹ پر کئی گھنٹے رکا رہا، اور وہاں سے بیروت کے لئے شام ساڑھے چار بجے پرواز ہوئی، یہاں ایک خط کا کچھ حصہ ذکر کردوں جو بیروت پہنچنے کے اگلے روز یعنی ۲۵ر ستمبر کو وہاں کے ہوٹل "بوریواج" سے اپنے ایک محب و عقید تمند شیخ عبدالستار ابوغدہ مقیم کویت کو لکھا تھا:

"... فالأسف كل الأسف أني أبرقت اليكم من بومباى مساء ۲۳-سبتمبر أني أنزل في مطار الكويت ذاهباً الى بيروت، فان تفضلتم بالمجئى الى المطار كان أحرى، ولكن الظن أن البرقية لم تصل اليكم الى ظهر ۲٤ سبتمبر واني قد مكثت في المطار ست ساعات وغادرته في الساعة الرابعة والنصف .."

(مجھے افسوس بہت افسوس ہے کہ بمبئی سے میں نے ۲۳ر ستمبر کی شام میں آپ کو ٹیلیگرام کیا کہ میں بیروت جاتے ہوئے راستے میں کویت اتروں گا۔ لہذا اگر آپ ایرپورٹ آسکیں تو بہت بہتر ہوگا، لیکن میرا اندازہ ہے کہ تار ۲۴ر ستمبر کی دوپہر تک آپ کو نہیں مل سکا، میں ایرپورٹ پر چھ گھنٹے رکا رہا، اور وہاں سے میں نے ساڑھے چار بجے کوچ کیا۔)

مصنف بیروت کے مشہور عالم پریس دارالقلم میں طبع ہورہی تھی، آپ وہاں کم وبیش چار مہینے قیام فرمارہے ،ابتداءً قیام مذکورہ بالا ہوٹل (بوریواج) میں رہا، لیکن آپ کا مزاج ہوٹل کی رہائش اور وہاں کے ماحول سے مانوس نہیں تھا، جلد ہی ایک قسم کی وحشت سی محسوس کرنے لگے اور شیخ زہیر شاویش کے مکان پر ایک فلیٹ کرائے پر لیکر وہاں منتقل ہو گئے ،صاحبزادہ محترم مولانا رشید احمد صاحب اعظمی ایک آدھ مہینہ ساتھ رہے اس کے بعد شدید بیماری کی وجہ سے ان کو عمرہ کرتے ہوئے وطن واپس ہونا پڑا، جس کے بعد علامہ اعظمی کو کافی پریشانیاں جھیلنی پڑیں، شیخ عبدالستار ابوغدہ کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

"...وبما أني كنت في هذه الأيام مهموماً جداً لمغادرة ولدي رشيدأحمد بيروت مضطرا اليها ، لوعكة شديدة أصابته . ثم عولج و صحّ والحمد لله ولكنا خفنا أن تعاوده ، فأرسلناه إلى الحجاز)تأخرت في الاجابة ..."

(اس خط کے جواب میں اس وجہ سے تاخیر ہوئی کہ میں ان دنوں اپنے لڑکے رشید احمد کے سخت بخار کی بناپر مجبوراً بیروت سے کوچ کر جانے کی وجہ سے بہت متفکر تھا، پھر ان کا علاج کیا گیا اور بحمداللہ وہ صحت یاب ہوگئے ، لیکن ہمیں خدشہ ہوا کہ بخار دوبارہ عود نہ کر آئے،اس لئے ہم نے ان کو حجاز بھیج دیا۔)

آپ کے بیروت میں قیام کی خبر جب محقق فاضل ڈاکٹر حمیداللہ حیدر آبادی مقیم پیرس کو ملی، تو انھوں نے ۸ر رمضان المبارک کو پیرس سے ایک خط لکھا جس میں تحریر فرمایا:

"مولوی ابراہیم میاں (۱) کے خط سے معلوم ہوا کہ آں محترم مصنف عبدالرزاق کی طباعت کے لئے بیروت تشریف لاچکے ہیں، "شاہ ولی اللہ ثانی" کی یہ خدمت حدیث عنداللہ ماجور، عندالناس مشکور ہوگی۔ اللہ تعالی بہت دنوں آپ کا سایہ ہم سب پر سلامت رکھے اور آپ کو صحت وعافیت سے خدمت علم میں مشغول۔

(۱) مولانا محمد میاں کے لڑکے اور ان کے انتقال کے بعد مجلس علمی کے ناظم تھے

میں انشاء اللہ یکم مارچ کو استانبول پہنچوں گا اور تین ماہ یعنی ختم مئی تک وہاں رہنا ہے اگر اس اثناء میں آں محترم وہاں کچھ دنوں کے لئے تشریف لا سکیں تو ترکی اہل علم بھی مستفید ہوں گے اور آں محترم بھی ترکی خزائن علمی اور مخطوطات سے واقف ہو سکیں گے، ترکی میں تقریباً دس لاکھ قلمی کتابیں سرکاری کتبخانوں میں ہیں، صرف استانبول ہی میں کچھ نہیں تو ڈھائی لاکھ مخطوطے ہوں گے اور الحمد للہ اچھی حالت میں ہیں۔۔۔"

قیام بیروت کے دوران ہی ۱۹ر رمضان المبارک کو عمرہ کی غرض سے حجاز تشریف لے گئے اور وہاں تقریباً ۲۰ ریوم قیام فرمارہے، رمضان کا آخری عشرہ اور شوال کا اول عشرہ وہاں گذار کر دوبارہ بیروت تشریف لے گئے، حجاز سے شیخ عبدالستار ابو غدہ کو ایک اور خط لکھا، جو غیر مؤرخ ہے، شیخ عبدالستار ابو غدہ سے آخر وقت تک علامہ اعظمیؒ کی نہایت سرگرم مراسلت رہی، وہ عالم عرب کے مشہور عالم شیخ عبدالفتاح ابو غدہ رحمۃ اللہ علیہ کے بھتیجے ہیں، اور علامہ اعظمی کی تحقیق سے کویت کی وزارۃ اوقاف کی طرف سے شائع ہونے والی کتاب المطالب العالیہ کی طباعت کی نگرانی کرتے تھے۔ آپ نے حجاز سے ان کے پاس جو خط تحریر فرمایا تھا اس کا کچھ حصہ ہدیۂ ناظرین ہے:

" ۰۰۰ و أخبركم أن ولدى رشيد أحمد، بعد زيارة الحرمين وصل الى بومباى فى ۳۰/ من الشهر العاشر واليوم عندى طالب هندى يسمى اقبال أحمد، دعوته من الجامعة الاسلامية (بالمدينة) على أجازة شهر وسيخلفه حين أعود من الحجاز تلميذ آخر دعوناه من الهند ۰۰۰ و لا يخطر ببالك أنى اتحمل هذه المتاعب طمعا فى مبلغ كبير من المكافاة أو كمية ضخمة من نسخ الكتاب، فليس هنا شئ منهما، و إنما اقصد بتحمل [illegible] الاغتراب

حرصا على ان لا يذهب ما بذلته من جهود مضنية سدى [illegible] (۱)

لم يشرف تصحيح الملازم أو يبقى فى التعليقات فراغ تكون الحاجة داعية الى سده .

وقد بلغ الى عمكم الكريم الشيخ عبدالفتاح نزولى فى بيروت ، وجاء نى من عنده كتاب بالبريد يسألنى فيه عن موعد سفرى الى الحجاز وما اليه ، وقد أرسلت اليه جواب رسالة .

وأنا كما تعلمون مقيم فى بيت الشيخ زهير ،و عنده مكتبة قيمة ، أجد فيها ما أحتاج اليه من الكتب للمراجعة فاغنى ذلك عن تكليف السيد عبدالعزيز بإحضار المعجم المفهرس عندى .

وأفيد ونى عن الجزء الثانى من المطالب هل جاء طبعه ببطوء، ام توقف؟ و أصول الجزء الثالث معى فى هذه السفرة ،و لكنها تصير جاهزة للطبع حين أكرّر فيها النظر ، وهذا عسير نظراً الى كون أوقاتى كلها مشغولة بتصحيح الملازم ، حتى انى لا أكاد اختلس الفرصة لكتب الرسائل ، فإن كان فى النية إخراج الثالث الى نهاية العام (آخر الشهر الثانى عشر) فأفيدونى ، حتى أحجز شيئا من الوقت للمطالب ، لكنى أظن أنه لا يفيد شيئا ، لأنى لا أعود من الحجاز إلا الى نهاية الأسبوع الأول من الشهر الثانى عشر .

هذا وأرجو أن يكون السيد عقيل عاد معافىً، وأرجو إبلاغ تحياتى إليه والى السيد خبير الموسوعة، وإنى والله متأسف جداً على عدم إجابتى إياه عن رسالته الكريمة ، وليس السبب إلا ما قد تعلمون من مرض رشيد ، وعودته الى الوطن وبقائى وحيداً ثم انقطاعى الى المصنف بكليتى ، وقد وصلت رسالة السيد خبير الموسوعة فى بيتى بعد ما وعدت مدير المجلس العلمى بتلبية دعوته

و تجهزت للسفر فعلاً، ومع ذلك فاني أفكر في أن أفوض تصحيح الملازم و تكرير النظر في التعليقات الى احد أصحابي ، فإن تم هذا، أخبرت السيد خبير الموسوعة باستعداد ى للقيام بما يأمرني إن شاء الله ، والسلام عليكم .

(آپ کو معلوم ہو کہ میرے لڑکے رشید احمد حرمین کی زیارت کے بعد ۳۰؍اکتوبر کو بمبئی پہونچ گئے، اور اس وقت میرے پاس اقبال احمد نامی ایک ہندوستانی طالب علم ہیں، جن کو ایک مہینہ کی چھٹی پر جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ سے میں نے بلار کھا ہے ،اور جس وقت میں حجاز سے واپس لوٹوں گا تو ان کی جگہ ایک دوسرا طالب علم لے لے گا، آپ کے دل میں یہ خیال نہ گذرے کہ میں ان مشقتوں کو کسی بڑے معاوضہ یا کتاب کے نسخوں کی بھاری تعداد کے لالچ میں برداشت کر رہا ہوں ۔ان دونوں میں سے کوئی بات نہیں ہے، میں اس سفر کی مشقت کو محض ان وجہ سے برداشت کرہا ہوں کہ میں فرموں کی تصحیح کی نگرانی نہ کروں تو (کتاب کی تحقیق میں) میں نے جو جانگسل محنت کی ہے کہیں رائگاں نہ ہو جائے۔یا تعلیقات میں کچھ خلا باقی نہ رہ جائے جس کو پر کرنے کی ضرورت ہے۔

آپ کے عم محترم شیخ عبدالفتاح ابوغدہ کو بیروت میں میرے قیام کی خبر مل چکی ہے،اور میرے پاس بذریعہ ڈاک ان کا خط آیا تھا، جس میں میرے حجاز وغیرہ کے سفر کی نسبت دریافت کیا تھا، میں نے اس خط کا جواب بھیج دیا ہے۔

جیسا کہ آپ جانتے ہیں میں شیخ زہیر (شاویش) کے گھر قیام پذیر ہوں ان کے پاس ایک قیمتی کتب خانہ ہے جس میں مجھے حوالہ کی ضروری کتابیں مل جاتی ہیں، لہذا اس نے شیخ عبدالعزیز کو معجم مفہرس کی فراہمی سے بے نیاز کر دیا ہے ۔

المطالب العالیہ کی دوسری جلد کی طباعت میں کچھ تاخیر ہے یا رکی ہوئی ہے؟ تیسری جلد کی اصلیں اس سفر میں میرے ساتھ ہیں، لیکن وہ نظر ثانی کے بعد طباعت کے قابل ہوں گی، اور یہ فرموں کی تصحیح میں معروفیت کی وجہ سے بظاہر دشوار نظر آرہا ہے، یہاں تک کہ خطوط لکھنے کا موقع بھی نہیں نکل پاتا۔ اگر سال کے اختتام تک تیسری جلد کی اشاعت کا ارادہ ہو تو مجھے بتایئے، تاکہ میں مطالب کیلئے بھی کچھ وقت نکال سکوں، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا، اس لئے کہ دسمبر کے پہلے ہفتے کے آخر میں تو میں حجاز سے لوٹوں گا۔

امید ہے کہ شیخ عقیل بعافیت واپس ہوگئے ہوں گے، ان سے اور خبیر الموسوعۃ (شیخ مصطفیٰ زرقاء) سے امید ہے کہ میرا سلام پہونچادیں گے، ان کے خط کا کوئی جواب نہ دے سکنے کی وجہ سے میں متاسف ہوں، اور جیسا کہ آپ جانتے ہیں رشید احمد کی بیماری، اس کی وطن واپسی، میری تنہائی اور پھر مصنف کی طرف بالکلیہ توجہ کے علاوہ کوئی دوسری اس کی وجہ بھی نہیں ہے، ان کا خط مجھے گھر پر اس وقت ملا تھا جب کہ میں مدیر مجلس علمی کی دعوت کی قبولیت کا وعدہ کر چکا تھا اور عملی طور پر سفر کیلئے تیار ہو چکا تھا، اس کے باوجود میں اس وقت سوچ رہا ہوں کہ فرموں کی تصحیح اور تعلیقات پر نظر ثانی کا کام اپنے کسی شاگرد یا ساتھی کے حوالہ کردوں اگر ایسا ہو جاتا ہے تو میں ان کو ان کی فرمائش کی انجام دہی کیلئے اپنی آمادگی سے آگاہ کروں گا۔)

علامہ اعظمی کی مشقت و پریشانی کا علم جب ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کو ہوا تو انھوں نے پھر ایک خط ۲۴؍ رمضان المبارک ۱۳۹۰ھ کو دوشنبہ کے روز لکھا:

"عنایت نامہ باعث سرفرازی ہوا، ان مشکلات کے باوجود آں محترم خدمت حدیث شریف کئے جارہے ہیں، اسی تناسب سے اجر بھی بڑھتا جارہا ہے،

کاش میں ملازمت کے پھندے میں نہ ہوتا، میں خوشی سے بیروت آجاتا اور ممکنہ خدمت کی سعادت حاصل کرتا، بہرحال مرضی مولیٰ از ہمہ اولیٰ۔۔۔۔"

باوجودیکہ یہ ایام بڑی مصروفیت اور عدیم الفرصتی کے تھے، اہل علم سے رابطہ رہا اور افادہ و استفادہ کا سلسلہ برابر جاری رہا، وہاں کے بہت سے ارباب فضل و کمال نے آپ کی وہاں موجودگی کو بساغنیمت جان کر بھرپور علمی فائدہ اٹھایا، نیز بیروت کے قرب وجوار کے بعض مشہور مقامات کی زیارت بھی کی، مثال کے طور پر ابن بطوطہ نے اپنے سفرنامہ میں ایک جگہ لکھا ہے: " ثم وصلت الی مدینة طرابلس " (رحلۃ ابن بطوطہ ا ر ۷ ۳) یعنی میں طرابلس کے شہر پہونچا، علامہ اعظمی نے سفرنامہ کے اس مقام پر لکھا ہے: " وصلت الی قلمون ولم أصل الی طرابلس ' ونزلت فی قلمون فی بیت السید رشید رضا، و عزیت أقاربه علی وفاة أخیه " یعنی میں قلمون گیا ہوں اور طرابلس نہیں جاسکا اور قلمون میں سید رشید رضا کے مکان پر قیام کیا اور ان کے بھائی کی وفات پر ان کے اعزہ و اقارب کی تعزیت کی۔

بیروت کے علمی حلقوں میں علامہ اعظمیؒ کی پذیرائی، ان کے وہاں قیام سے وہاں کے اہل علم کی مسرت و ابتہاج اور بعض ملاقاتوں اور زیارتوں کا اندازہ اس ایک خط سے کیا جاسکتا ہے، جسے ۱۵ ر رمضان ۱۳۹۰ھ مطابق ۱۳ ر نومبر ۱۹۷۰ء کو املا کرا کر مولانا قاضی اطہر مبارکپوریؒ کے پاس روانہ فرمایا تھا، ذیل میں پورا خط منقول ہے:

"عزیزم قاضی اطہر صاحب السلام علیکم

آپ کے خط سے آپ کی خیریت اور وہاں کے حالات معلوم ہونے سے بہت سکون و اطمینان ہوا، ہم یہاں جمعرات ۲۴ ر ستمبر ۱۹۷۰ء کو غروب آفتاب کے وقت پہونچے تھے، دوسرے دن جمعہ کی نماز الجامعۃ الامریکیہ کے قریب ایک مسجد میں پڑھی، ہم پہونچے تو امام صاحب خطبہ دے رہے تھے۔ داڑھی مونچھ بالکل صاف، عبا پہنے ہوئے تھے خطبہ کے آخر میں جوش و خروش کیساتھ

دعا مانگی اور سامعین نے خوب دھوم دھام سے آمین کہی۔ مصلیوں میں شافعیوں کی کثرت تھی اور امام صاحب بھی شافعی تھے، ایک آدھ پاکستانی بھی تھے، سنیچر کو الشیخ محمد زہیر الشاویش ملنے کے لئے آئے، یہ ایک ممتاز عالم ہیں، ان کے پاس ایک مکتبۂ تجاریہ ہے، اصلاً شامی ہیں، مگر یہاں بلدیہ بیروت سے باہر حازمیہ میں ایک اچھا خاصا سہ منزلہ مکان بنا رکھا ہے، اس وقت ہمارا قیام بھی اسی مکان میں ہے، شیخ زہیر کا ذاتی کتب خانہ بہت اچھا ہے، اتوار کو شیخ زہیر کا فون آیا کہ شیخ ناصر الدین البانی دمشق سے تشریف لائے ہوئے ہیں، وہ ملنا چاہتے ہیں کب آئیں؟ ہم نے کہا جس وقت جی چاہے تشریف لا سکتے ہیں، تھوڑی ہی دیر کے بعد آگئے، بہت تپاک سے ملے دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہے، پھر افریقی صاحب نے شیخ زہیر سے کہا تھوڑی دیر کیلئے کہیں تفریح کو چلیں، شیخ زہیر کے پاس اپنی کار ہے اور خود ہی چلاتے بھی ہیں اور یہاں یہ عام دستور ہے۔ تقریباً ہر متوسط الحال کے پاس گاڑی ہے اور خود چلاتا ہے، مصنف جس پریس میں چھپتی ہے اس میں دو شریک ہیں اور حسن اتفاق سے دونوں ایک ہی بلڈنگ میں سکونت پذیر ہیں مگر دونوں کے پاس الگ الگ کار ہے، بہر حال ہم سب نیچے اترے اور کار میں سوار ہونے کے بعد رائے ہوئی کہ امام اوزاعی چلیں، شیخ ناصر الدین بھی ساتھ تھے، یہاں جس مقام پر امام اوزاعی مدفون ہیں وہ علاقہ امام اوزاعی کے نام سے مشہور ہے، وہاں ایک پرانی مسجد اور مسجد کے پیچھے اوزاعی کی پختہ قبر ہے، پاس ہی میں بہت خوبصورت نئی مسجد بھی بن گئی ہے، قبر کی زیارت کر کے نکلنے لگے تو مجاور سے جو دروازہ پر بیٹھا ہوا تھا شیخ ناصر صاحب فرمانے لگے کہ یہاں نماز جائز نہیں ہے، اس نے کہا شیخ الازہر تو آئے تھے اور یہاں نماز پڑھ کر گئے ہیں، وہ کچھ دیر اس سے الجھے رہے پھر آکر موٹر میں بیٹھے تو کچھ دیر تک اسی مسئلہ پر اظہار خیال فرماتے رہے، موٹر میں بیٹھنے کے بعد رائے ہوئی کہ صیدا تک چلیں، چنانچہ صیدا (جو بہت قدیم شہر ہے

اور ہم نے جو حصہ دیکھا وہ بہت خوبصورت ہے) بلکہ صور کے قریب تک گئے صور بھی نہایت قدیم اور مشہور شہر ہے جو اسرائیل کی سرحد پر ہے۔ یہاں سے شیخ زہیر نے ہم کو ہوٹل پہونچا دیا اور خود شیخ ناصر الدین صاحب کو لے کر حازمیہ چلے گئے، شیخ ناصر الدین بالکل بچپن میں شام آئے تھے اور عربی زبان بالکل نہیں جانتے تھے، وہ اکثر فصحیٰ میں گفتگو کرتے ہیں، انھوں نے مسند حمیدی کا مقدمہ پڑھا ہے، مجھ سے کہہ رہے تھے کہ ظاہریہ کا جو نسخہ آپ نے منگایا ہے اس کے علاوہ بھی ایک نسخہ ظاہریہ میں ہے، دمشق آیئے گا تو دکھاؤں گا۔ بہر حال تھوڑی دیر تک اچھی صحبت رہی، صیدا جاتے ہوئے سڑک کے کنارے ایک جگہ کچھ درخت نظر آئے، پوچھا کہ یہ کونسا درخت ہے تو شیخ زہیر نے بتایا کہ اس کو ہم لوگ مشمش ہندی کہتے ہیں، غور سے دیکھا تو وہ لوکاٹ تھا، شیخ زہیر کے باغ میں امرود کے کئی درخت ہیں۔ بچپن میں ہم لوگوں کو کمثریٰ کا ترجمہ امرود بتایا گیا تھا، یہاں آکر معلوم ہوا کہ امرود کو جوافہ کہتے ہیں، کمثریٰ دوسرا پھل ہے، ہم نے اس کو بھی کھایا ہے، وہ بالکل ناگ (ہندوستان کے مشہور پھل) کے مشابہ ہوتا ہے بلکہ میرے لئے ان دونوں میں تمیز بھی دشوار ہے۔

بیروت میرے لئے عجیب جگہ ہے، یہاں مجھے دینی ماحول نظر نہیں آتا۔ اس لئے طبیعت کو توحش ہے، یہاں کہیں آنا جانا بغیر سواری کے ممکن نہیں اور سواریاں بھی گراں، جمعہ کی نماز پڑھنے جایئے تو چار لیرے خرچ ہو جائیں گے، ایک لیرہ کی قیمت چار روپئے ہے۔ اس لئے ضرورت شدیدہ کیلئے ہی جانا ہوتا ہے، اپنے طور پر جو حضرات ملنے آئے ایک شیخ سعدی یاسین خطیب جامع ابی بکر ہیں، جو اچھے عالم ہیں اور رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ میں بیروت کے نمائندہ ہیں، ایک اور عالم شیخ عبداللہ حبشی ہیں، انھوں نے شیخ ناصر الدین کا رد بھی لکھا ہے جو میری نگاہ سے نہیں گذرا، ایک دن وہ بھی تشریف لائے تھے، اچھے متشرع اور

زاہد عالم معلوم ہوتے ہیں، صلاح الدین منجد بھی بیروت ہی میں رہتے ہیں، انھوں نے بھی آنے کو کہا تھا اور ایک شخص کے ذریعہ اپنے مکان پر چلنے کی دعوت بھی مجھ کو دی تھی، مگر اب تک نوبت نہیں آئی...“

علامہ اعظمیؒ نے وفیات الاعیان پر مشتمل اپنی یادداشت جو مرتب فرمائی ہے، اس میں شیخ سعدی یاسین کا جہاں ذکر فرمایا ہے وہاں لکھتے ہیں:

”الشیخ سعدی یاسین خطیب مسجد ابی بکر فی بیروت، اجتمعت به مراراً و صلیت خلفه و رافقته الی قلمون فی عزاء الشیخ عبدالرحمن (أخی صاحب المنار)...“

(شیخ سعدی یٰسین بیروت کی مسجد ابی بکر کے خطیب، ان سے میری بارہا ملاقات ہوئی ہے، میں نے ان کے پیچھے نماز پڑھی ہے اور شیخ عبدالرحمٰن (برادر سید رشید رضا) کی تعزیت کیلئے میرا ان کا قلمون تک ساتھ رہا ہے)

اسلامی علوم و فنون کے نشر و اشاعت کے اس عظیم مرکز میں تقریباً چار مہینے قیام اور حصول سعادت و فراغت حج و عمرہ کے بعد فروری ۱۹۷۱ء میں ہندوستان واپسی ہوئی، اور ۲۷/ فروری کو مالیگاؤں کے مدرسہ معہد ملت تشریف لے گئے، چنانچہ مالیگاؤں سے شائع ہونیوالے ماہوار عربی جریدے ”الأضواء“ نے مارچ و اپریل کے نشریہ میں یہ خبر شائع کی:

”استقبل أساتذة معهد ملت سماحة الشيخ العلامة الكبير فخر المحدثين حبيب الرحمن الأعظمي يوم ٢٧ من فبراير سنة ١٩٧١ بعد عودته من سفر طويل استغرق عدة اشهر، قام خلالها بطبع الكتاب "المصنف" لعبدالرزاق (مع تحقيقات فضيلة الشيخ). لقد تم طبع ثلاثة أجزاء من هذا الكتاب فی مطابع دارالقلم (بيروت) على نفقة المجلس العلمی (دهابيل، الهند) وستتم الاجزاء البقية فی مدة سنة

بالتقريب ان شاء الله .هذا وقد زار الشيخ خلال سفره المراكز العلمية فى لبنان والسعودية، واتصل بأصحاب العلم و المعرفة فيها .

طلب اساتذة المعهد من سماحة الشيخ أن يقدم لهم انطباعاته عن الشرق الاوسط ، فشرفهم الشيخ بخطابه الموجز البليغ الملئى بالافكار العالية والنصائح الغالية . صرّح الشيخ فى خطابه بانه توجد الرغبة الشديدة فى الأقطار العربية للرقى العلمى لا سيما العلوم الاسلامية،ولكنهم يعترفون بان الهند متقدمة فى هذاالمجال .

لقد استفاد به كثير من رجال العلم والباحثين الاسلاميين من مختلف الكليات والمعاهد فى هذه الرحلة ، فقد اتصل به غير مرة فضيلة الشيخ عبدالفتاح ابو غده واستفاد منه فى دراسته و تحقيقه حول مصنفات الشيخ مولانا عبدالحى .

التمس منه الباحث الاسلامى الكبير الدكتور حميد الله أن يزور تركيا أثناء وجوده بها . و كذلك وجهت اليه دولة الكويت الدعوة لاعداد الموسوعة الفقهية . انتهت هذه الجلسة بالدعاء.

(معہد ملت کے اساتذہ نے علامہ کبیر فخر المحدثین حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی کا ان کے کئی مہینوں کے طویل سفر سے واپسی کے بعد ۲۷ر فروری ۱۹۷۱ء کو استقبال کیا۔ مولانا نے اپنے اس سفر کے دوران (اپنی تحقیق سے شائع ہونے والی کتاب) مصنف عبدالرزاق کی طباعت کی نگرانی فرمائی اس کتاب کے تین حصے مجلس علمی ڈابھیل کے خرچ پر بیروت کے پریس دارالقلم سے شائع ہو چکے ہیں، اور اس کے بقیہ حصے بھی کم وبیش ایک سال کی مدت میں انشاءاللہ چھپ جائیں گے، مولانا نے اپنے اس سفر میں لبنان اور سعودی عرب کے علمی مراکز کے دورے بھی کئے اور ارباب علم وفن سے ملاقاتیں کیں۔

معہد ملت کے اساتذہ نے حضرت مولانا کے سامنے یہ درخواست گذاری کہ وہ مشرق وسطی کے سلسلہ میں اپنے تاثرات کا اظہار فرمائیں، تو آپ نے ان کے سامنے مختصر، فصیح و بلیغ اور فکر و نصیحت سے بھرپور تقریر فرمائی، مولانا نے اپنی تقریر میں اس بات کی وضاحت فرمائی کہ عرب ممالک میں علمی ترقی بالخصوص علوم اسلامیہ کی طرف زبردست رجحان پایا جاتا ہے، البتہ وہ لوگ اس میدان میں ہندوستان کی برتری کو تسلیم کرتے ہیں۔

اس سفر میں مختلف اسلامی اداروں اور کالجوں کے بہت سے علماء و محققین نے آپ سے استفادہ کیا، چنانچہ بارہا شیخ عبدالفتاح ابوغدہ نے آپ سے ملاقات کی اور حضرت مولانا عبدالحی فرنگی محلی کی کتابوں کی تحقیق و مطالعہ کے سلسلہ میں آپ سے فائدہ اٹھایا۔

بیروت کے اثناء قیام عظیم اسلامی محقق ڈاکٹر حمید اللہ نے آپ سے ترکی کے سفر کی درخواست کی، اسی طرح کویت کی حکومت نے آپ کو فقہی انسائیکلوپیڈیا کی تیاری کیلئے دعوت دی، دعا پر اس جلسہ کا خاتمہ ہوا۔)

عمرہ سنہ ۱۳۹۰ھ بیروت ہی سے آپ نے رمضان المبارک میں حجاز کا قصد کیا اور سعادت عمرہ سے مشرف ہوئے، آپ نے ایک خستہ کاغذ پر اپنے تمام حجوں کا سنہ ذکر کیا ہے اس پر لکھا ہے:

"پانچواں حج بیروت سے ۱۳۹۰ھ (۱۹۷۱ء) میں کیا، اسی سال رمضان ۱۳۹۰ میں بیروت سے عمرہ کیا فالحمد لله علی ذلك."

بیروت سے جدہ تک کا سفر مڈل ایسٹ ایر لائنز کے طیارے کے ذریعہ ہوا، اور ٹکٹ پر اسکے جاری ہونے کی جو تاریخ درج ہے وہ ۱۲/نومبر ۱۹۷۰ء ہے، اس سفر میں آپکی ملاقات غالباً بیروت واپسی کے وقت، شیخ محمد نصیف سے ہوئی، چنانچہ ایک جگہ لکھا ہے:

"قد زرته فی شوال سنة ۱۳۹۰ھ وأتحفنی بعدة کتب و

بالغ فی إکرامی۔"

(میں نے ان کی شوال ۱۳۹۰ھ میں زیارت کی انھوں نے مجھے متعدد کتابیں ہدیہ کیں، اور میرا مبالغہ آمیز اکرام کیا)

حج ۱۳۹۰ھ ابھی چند سطر پہلے پانچویں حج سے متعلق علامہ اعظمی کی ایک تحریر نظر سے گذر چکی ہے، جب حج کا موسم آیا تو ذی الحجہ کے اوائل اور جنوری کے اواخر میں وہیں سے عازم حج ہوئے۔ ۳/ ذی الحجہ ۱۳۹۰ھ مطابق ۳۰/ جنوری ۱۹۷۱ء کو تلمیذ اعز مولانا عبدالجبار صاحب مرحوم کو ایک خط لکھتے ہیں اور فرماتے ہیں:

"عزیزم مولوی عبدالجبار سلمہ اللہ السلام علیکم

الحمد للہ بخیر ہوں، میں ۲۵/ جنوری کو شب میں جدہ اور جدہ سے مکہ معظمہ آگیا، دن میں اکثر مدرسہ فخریہ میں رہتا ہوں، رات کو اب تک مصطفیٰ (۱) کے گھر سوتا ہوں، کھانا مئو کے حجاج کے یہاں اور مصطفیٰ کے یہاں اب تک کھایا

---

(۱) ڈاکٹر محمد مصطفیٰ الاعظمی ۱۳۵۰ھ م ۱۹۳۲ء میں مئو کے محلہ کیاری ٹولہ میں پیدا ہوئے حصول تعلیم کیلئے انگریزی اسکول میں داخل کئے گئے، اس کے بعد دارالعلوم مئو میں داخلہ لیا وہاں انھوں نے درس نظامی کی کتابیں پڑھیں، اس کے بعد مدرسہ شاہی مراد آباد اور پھر دیوبند گئے اور وہیں سے ۱۹۵۲ء میں فارغ التحصیل ہوئے، فراغت کے بعد مصر گئے اور ۱۹۵۵ء میں جامع ازہر سے عربی زبان وادب میں اختصاص کیا۔ ۱۹۵۶ء میں قطر میں عربی زبان کے استاذ کی حیثیت سے کام کیا، اور اگلے ہی سال قطر کی پبلک لائبریری (المکتبة العامة) کے نگراں مقرر ہوئے، کئی سال اس اہم عہدے پر فائز رہ کر خوش اسلوبی سے اس ذمہ داری کو نبھایا، اس کے بعد انھوں نے ریسرچ شروع کی اور ۱۹۶۶ء میں کیمبرج یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی، ڈاکٹریٹ کے بعد وہ سعودی عرب لوٹے، اور وہاں مختلف کالجوں اور یونیورسٹیوں میں فرائض تدریس انجام دئے، اب وہ سعودی شہری قرار دئے جا چکے ہیں، ڈاکٹر صاحب اپنی حدیثی خدمات کی وجہ سے فیصل ایوارڈ سے بھی سرفراز ہو چکے ہیں۔ اور ان کی متعدد تصنیفات وتحقیقات اہل علم میں قبولیت حاصل کر چکی ہیں۔"

ہے، اعلان تو ابھی نہیں ہوا مگر امید یہی ہے کہ وقفہ جمعہ کو ہوگا، کل ہم نے خود چاند دیکھا تھا، بہت اونچا اور کافی بڑا تھا، دوسری رات کا چاند معلوم ہوتا تھا، اس لئے آج جمعہ کو ۲؍ذی الحجہ ہوئی، کل میں منیٰ وغیرہ دیکھنے گیا تھا، رشید احمد کا خط بیروت میں ملا تھا، یہاں سعید احمد کا خط ملا نیز بشیر احمد کا، حالات کا علم ہوا، حافظ ظہور کے ذریعہ بھیجی ہوئی کل چیزیں پہونچ گئیں، اقبال اسی دن آگئے تھے جس دن میں بیروت سے آیا، ڈاکٹر مصطفیٰ اور اقبال مطار پہونچ گئے تھے، مصطفیٰ کی گاڑی سے مکہ آیا۔

حجاج کی کثرت سے حرم میں نماز پڑھنا مشکل ہو گیا ہے۔ کسی کسی وقت سڑک پر پڑھنی پڑی، آج جمعہ کی نماز بھی غالباً سڑک پر ہوگی، یہاں آج کل کسی سے ملاقات بہت مشکل ہے، حکومت کی طرف سے اعلان ہو گیا کہ حج جمعہ کو ہوگا۔ کل جمعہ کے وقت سے ہم نے بالائی منزل میں نماز شروع کر دی ہے، وہاں گنجائش رہتی ہے، نیچے تو سڑک تک صفیں لگی رہتی ہیں، یہاں ٹکٹ ملنا بھی سخت دشوار ہو گیا ہے اس لئے جدہ سے خط بھجوا رہا ہوں، سب حال پوچھنے والوں کو سلام کہو، تین دن سے یہاں سردی بڑھ گئی ہے، امید کی جاتی ہے کہ حج کے موقع تک شاید کم ہو جائے۔(۱)

آج ایک افریقی نے بتایا کہ مولوی ضیاء الحسن بمبئی سے روانہ ہو چکے ہیں مگر مجھے اب تک کوئی خبر نہیں ہے مولانا زکریا نے سلام کہلایا ہے۔ اور یہ کہ روزانہ شام کو میرے ساتھ کھانا کھایا کریں، آج بعد عشاء ایک دعوت میں ملیں گے تو معذرت کر لوں گا۔"

دائرۃ المعارف العثمانیہ کی لٹریری کمیٹی کی ایڈوائزری | "دائرۃ المعارف العثمانیہ" حیدر آباد کا ایک مشہور و معروف اور نامور ادارہ ہے، اس کی شہرت ہندوستان کی حدود پار کر کے اطراف عالم میں پھیلی ہوئی ہے، شاید ہی دنیا کا کوئی ایسا خطہ یا علمی حلقہ ہو

(۱) خط کے مضمون سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کو دوسرے دن مکمل کیا ہے۔

جہاں یہ ادارہ اپنی گرانقدر خدمات اور بیش قیمت مطبوعات کی وجہ سے جانا اور پہچانا جاتا ہو، متقدمین اہل علم اور اسلاف کی بہت سی نادر و نایاب کتابوں کی طباعت و اشاعت کا شاندار سہرا اس ادارہ کے سر ہے، بہت سی ایسی کتابیں جن کا لوگ محض نام سنتے اور کتابوں میں حوالے دیکھتے تھے، جو اپنے وجود کے لحاظ سے اہل علم کیلئے عنقا صفت تھیں، دائرۃ المعارف نے ان کو چھاپ اور شائع کر کے سہل الحصول اور علمی دنیا کو قیامت تک کے لئے اپنا ممنون احسان بنادیا، اس معروف و مشہور ادارے نے سنہ ۱۹۷۱ء میں علامہ اعظمی کو اپنی لٹریری کمیٹی کا ایڈوائزر منتخب کیا، جس کی اطلاع ۷/جون ۱۹۷۱ء کے ایک خط کے ذریعہ آپ کو دی گئی، اطلاع نامہ کی عبارت حسب ذیل ہے:

".... I feel pleasure to convey that under resolution No. XIII of the 49 th Meeting of the executive committee of the Dairatul-Maarif-il-Osmania, held on the 31st March , 1971, you have been appointed " External Advisor to the literary committee of the Dairatul- Maarifi-il- Osmania."

You are requested kindly to communicate your acceptence at an early date and oblige. "

(میں مسرت کیساتھ آنجناب کو یہ اطلاع دیتا ہوں کہ دائرۃ المعارف العثمانیہ کی ایگزیکیوٹیو کمیٹی نے ۳۱/مارچ ۱۹۷۱ء کو منعقدہ اپنے اجلاس میں تجویز نمبر ۱۳ کے تحت آپ کو دائرۃ المعارف کی لٹریری کمیٹی کا خارجی مشیر مقرر کیا ہے۔

لہذا آنجناب سے درخواست ہے کہ جلد از جلد اپنی منظوری کی اطلاع دے کر ممنون فرمائیں)

بیروت کا دوسرا سفر اوپر گذر چکا ہے کہ کئی مہینے بیروت میں قیام کے بعد حج سے کچھ پیشتر حجاز تشریف لے گئے اور حج سے فراغت کے بعد فروری ۱۹۷۱ء کے آخر میں وطن واپس ہوئے، مگر اس وقت تک مصنف پوری چھپ نہیں سکی تھی، اور اس کی صرف تین ہی جلدیں منظر عام پر آسکی تھیں، لہذا اس کے قرمون کی دیکھ بھال کا کام بعض لوگوں کے حوالے کیا اور خدا پر بھروسہ کر کے خود ہندوستان چلے آئے، لیکن مگر (۱)

آنے کے بعد بھی کتاب کی طباعت کے سلسلے میں ہر وقت متفکر اور مشوش رہا کرتے، چنانچہ اس زمانے میں اپنے شناساؤں بالخصوص عرب فضلاء کو جو خطوط لکھے ہیں اکثر میں شدید تشویش کا اظہار پایا جاتا ہے۔ اس بنا پر چند ہی مہینے گذرے کہ دوبارہ بیروت کے سفر کا عزم فرمایا، ۱۶/ اگست ۱۹۷۱ء کو اپنے ایک قدیم فاضل شناسا بغداد کے شیخ صبحی سامرائی کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

"۔۔۔ وأحسبكم تستبشرون بسماع المصنف لعبدالرزاق قد ظهرت منه ثلاثة اجزاء، وأنا إن شاء الله سأسافر إلى بيروت وشيكا، حتى أشرف على طبع بقية أجزائها وفى نيتي أن أزور بغداد فى هذه السفرة ۔۔۔"

(میں سمجھتا ہوں کہ آپ سن کر خوش ہوں گے کہ مصنف عبد الرزاق کی تین جلدیں منظر عام پر آچکی ہیں اور میں اس کے بقیہ اجزاء کی طباعت کی نگرانی کے لئے جلد ہی ان شاء اللہ بیروت کا سفر کروں گا، میرا ارادہ ہے کہ اس سفر میں بغداد کی بھی زیارت کروں۔)

اس دفعہ آپ کا ارادہ کویت، ترکی، مصر اور بغداد کی زیارت کا بھی تھا، اور ان تمام مقامات کے سفر کیلئے کرایہ کے پیسے بھی ادا کئے جا چکے تھے، چنانچہ برٹش اوور سیز ایرویز کارپوریشن کے چیف رزرویشن آفیسر جے۔ ایل ملہوترا کا ایک خط ۲۱/ مئی ۱۹۷۱ء کا لکھا ہوا آپ کے کاغذات میں محفوظ ہے، جس میں تحریر ہے:

"We are pleased to inform you that we have recieved economy class fare for your Delhi/ Beirut. Istanbul/ Cairo/ Baghdad/ Delhi......"

(ہم خوشی کے ساتھ آپ کو یہ اطلاع دیتے ہیں کہ دہلی سے بیروت، استانبول، قاہرہ، بیروت، بغداد، دہلی کے آپ کے سفر کا درمیانی درجہ کا کرایہ ہمیں موصول ہو چکا ہے۔)

پہلی دفعہ بیروت میں نزول اجلال کے ٹھیک ایک سال بعد، ۲۶/ ستمبر ۱۹۷۱ء

مطابق ۵ر شعبان ۱۳۹۱ھ کو دوبارہ پہنچے، ایک خط میں اپنے ایک شامی شاگرد شیخ عبدالوہاب زاہد ہندی حلبی کو لکھا ہے:

"وصلت بیروت مساء ۲٦ من الشهر التاسع، وسامكث هنا إن شاء الله شهرا أو شهرين، وفي نيتي أن أزور حلب قريبا إن تيسر لي رفيق يرشدني و يساعدني، وكذا أزور دمشق أيضاً إن شاء الله . . ."

(میں ۲٦ر ستمبر کی شام میں بیروت پہنچا، یہاں ایک دو مہینے ان شاء اللہ میرا قیام رہے گا، اگر کوئی معاون اور رفیق سفر مل جائے تو جلد ہی حلب کی زیارت کا بھی میرا ارادہ ہے، اور اسی طرح دمشق کی زیارت کا بھی۔)

حلب کے بارے میں تو نہیں معلوم کہ آپ اس سفر میں جا سکے یا نہیں، البتہ کویت میں کچھ قیام فرمایا، اس کے علاوہ دمشق بھی تشریف لے گئے، اپنی ایک یادداشت میں لکھتے ہیں:

"اتوار ۲٦ر ستمبر ۱۹۷۱ء ۔ ۵ر شعبان ۱۳۹۱ھ، کویت میں عبداللہ العقیل اور عبدالستار ابو غدہ سے ملاقات ہوئی شام کو بیروت پہونچے۔

۷ر شعبان منگل کو بعلبک گئے۔

قبل رمضان دمشق گیا، مکتبہ ظاہریہ دیکھا، جامع اموی، اور مزار حضرت ابوالدرداء کی زیارت کی، شعیب ارناؤط عبدالقادر ارناؤط و ناصر البانی وغیرھم سے ملاقات ہوئی۔

آخر جمعہ رمضان (۲۴ تاریخ) کو عبدالفتاح ابو غدہ سے دارالارشاد میں ملاقات ہوئی، ۲٦ر کو ریزیڈنس الروشہ میں دوبارہ ملاقات ہوئی، وہیں عبدالحکیم عابدین سے بھی ملاقات ہو گئی۔"

اس سفر کی زیادہ تفصیل نہیں مل سکی، دیگر مقامات کی زیارت کا جو آپ کا ارادہ

تھا، ان میں صرف شام کا سفر کیا لیکن اور جو مقامات ہیں ترکی، مصر اور بغداد وغیرہ ان کا سفر نہیں ہو سکا، اس دفعہ آپ نے جو خط لکھے ان میں صرف ایک خط مل سکا جو ۲۱ر اکتوبر ۱۹۷۱ء کا مکتوب ہے، وہ حسب ذیل ہے:

"عزیزانم مولوی رشید احمد وسعید احمد سلمھما اللہ! سلام مسنون
الحمد للہ ہم لوگ خیریت سے ہیں، یہاں کل چہار شنبہ کے دن سے روزہ شروع ہو گیا ہے ۔ کل ہی سے حرمین، مصر و شام اور بغداد و اردن میں بھی روزہ شروع ہوا ہے، یہاں چار بج کر بیس منٹ پر صبح صادق اور چار انچاس پر غروب ہے، موسم نہ بہت گرم ہے نہ بہت ٹھنڈا، رات میں کھلی جگہ پر تراویح کی کچھ رکعتیں پڑھی گئیں تو خنکی محسوس ہوئی ، ہمارا خیال ہے کہ ہندوستان میں آج پنج شنبہ کو روزہ شروع ہوا ہوگا۔

بغداد سے کتابوں کے آنے کی بھی اطلاع ملی ، آج صبحی سامرائی کو کتابوں کے پہونچنے کی اطلاع بھیج رہا ہوں، یہاں بھی ان کا خط آیا تھا، اجازت نامہ بھی بھیج رہا ہوں۔

کل مالیگاؤں سے تفسیرات ابن تیمیہ کے مزید سو صفحات آئے ہیں، آج یا کل پانی کے جہاز سے مندرجہ ذیل کتب بھیج رہا ہوں: مصنف عبد الرزاق ثالث، کتاب الزھد طبع بیروت، جامع الاصول مجلد چھ اجزاء زاد المسیر ۹/۸، شرح السنۃ پانچ اجزاء الأمثال العربیہ القدیمۃ ایک عدد، الاسرار المرفوعہ ایک عدد حجۃ الوداع طبع بیروت ایک عدد۔

مولانا ابوالوفاء افغانی کو ایک خط لکھ دو کہ میں نے ان کے لئے زاد المسیر نو اجزاء کامل اور مکتب اسلامی کی کچھ اور منشورات پانی کے جہاز سے بھجوائی ہیں، مولانا بھی کتاب الحجہ اور جو رسائل موجود ہوں بھجوا دیں تو بہتر ہے ، یہاں کا پتہ بھی مولانا کو لکھ بھیجو۔

مدرسہ (مفتاح العلوم) کیلئے تاج العروس کی مطبوعہ جلدوں کو کہہ آیا تھا کہ عبدالستار ابوغدہ خرید کر مئو بھیج دیں....."

مفتی لبنان کا ہدیہ ان دونوں سفروں میں علامہ اعظمی کی بہت سے اہل علم سے ملاقات ہوئی، ان ہی میں مفتی لبنان شیخ حسن خالد ہیں، ان سے آپ کی متعدد ملاقاتیں ہوئیں، ۱۰ر شوال ۱۳۹۱ھ ۲۹ر نومبر ۱۹۷۱ء کو مفتی لبنان نے اپنی تصنیف " الشهيد فی الإسلام " علامہ اعظمی کو بطور سوغات پیش کی، اور اس کی پیشانی پر یہ عبارت تحریر فرمائی:

" مع أصدق التحية وأجمل التقدير الى العلامة الكبير المحدث والمحقق الجليل الأستاذ حبيب الرحمن الاعظمی . . . "
(خالص ترین سلام اور بہترین خراج تحسین کے ساتھ علامہ محدث کبیر، اور محقق جلیل استاذ حبیب الرحمٰن الاعظمی کی خدمت میں...)

اس دفعہ بیروت میں دو مہینے سے کچھ زیادہ مقیم رہے۔ ۹ر مئی ۱۹۷۲ء کے ایک خط میں، مجلس علمی کراچی کے مدیر مولانا طاسین صاحب متوفی (۱۹۹۹ء) کو لکھتے ہیں:
"میں دوبارہ بیروت جاکر دو مہینے سے کچھ زیادہ رہ کر چلا آیا۔"

مصنف عبدالرزاق امام عبدالرزاق صنعانی (متوفی ۲۱۱ھ) ایک بڑے پایہ کے محدث گذرے ہیں، ان کی کتاب " المصنف " علم حدیث کا جامع اور بیش قیمت دیوان ہے، جو عرصہ سے نایاب تھا، علامہ اعظمی نے اس کتاب کے مخطوطے کو حاصل کر کے نہایت محنت و جانفشانی اور دقیقہ رسی کے ساتھ اس کی تحقیق کی، حتی کہ اس کی طباعت کی نگرانی اور فرموں کی دیکھ بھال کیلئے بیروت کے دو دو سفر کیے۔ اس عظیم الشان علمی خدمت پر سر زمین ہند جس قدر بھی فخر کرے کم ہے، علامہ اعظمی نے اس کام کیلئے اپنے کو جس طرح وقف کر دیا تھا، اس کی مثال مشکل سے ملے گی۔ علامہ اعظمی کا یہ کارنامہ فن حدیث پر

پر تحقیقی کام کے علاوہ عربی ادب کی بھی خدمت ہے ،اس کتاب سے پہلی ودوسری صدی ہجری کا عربی ادب نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے۔

یہ کتاب ۱۳۹۰ھ م ۱۹۷۰ء اور ۱۳۹۲ھ م ۱۹۷۲ء کے درمیان ۱۱ ضخیم جلدوں میں خوبصورت ٹائپ سے اعلیٰ درجہ کے کاغذ پر دارالقلم بیروت سے چھپ کر مجلس علمی (ڈابھیل۔ سورت) سے شائع ہوئی۔

یہ کتاب جب مصر، شام، عراق، حجاز، اور مغرب ومراکش کے اہل علم کے ہاتھوں میں پہنچی، تو علامہ اعظمی کے اس عظیم الشان اور بیش بہا علمی کارنامے کو دیکھ کر، ان کے ذہنوں میں عظمت رفتہ کی یاد تازہ ہوگئی۔

المطالب العالیہ علامہ اعظمی کی مصروفیت کا عجیب وغریب حال تھا، قاضی اطہر صاحب مبارکپوریؒ نے صحیح کہا ہے کہ یہ شعر

جوانی سے بھی زیادہ وقت پیری جوش ہوتا ہے : بھڑکتا ہے چراغ صبح جب خاموش ہوتا ہے

کسی اور پر صادق آئے نہ آئے محدث کبیر علامہ اعظمیؒ پر پوری طرح صادق آتا ہے۔

اس کی ایک روشن مثال یہ ہے کہ مصنف عبدالرزاق کی تحقیق کا کام زوروں پر ہے ،اسی کے ساتھ " المطالب العالیه بزوائد المسانید الثمانیه" کی تحقیقی خدمت بھی انجام دے رہے ہیں۔ یہ کتاب حدیث کی آٹھ بڑی بڑی کتابوں کا ایک انتخاب ہے جو ممتاز حافظ حدیث علامہ ابن حجر عسقلانی کی کاوش کا نتیجہ ہے ،ترکی سے اس کا مخطوطہ حاصل کرکے عالمانہ ومحققانہ انداز میں اس کو ایڈٹ کیا، یہ جاننے کے لئے کہ وہ کتنا بڑا علمی کام ہے، صرف یہ عرض کردینا کافی ہوگا کہ حکومت کویت کی وزارت اوقاف نے اس کو علامہ اعظمی سے حاصل کرکے ،اس کی طباعت پھر اس کی تقسیم کا انتظام سرکاری پیمانے پر کیا، یہ کتاب چار جلدوں میں ہے، جو ۱۳۹۰ھ م ۱۹۷۰ء اور ۱۳۹۳ھ م ۱۹۷۳ء کے درمیانی عرصہ میں وزارۃ الاوقاف کویت سے شائع ہوئی۔

عرب ممالک میں اس کی مقبولیت کا یہ حال ہے کہ سال بھر بھی نہ گذرنے پایا تھا

کہ دمشق کے ایک تاجر نے فوٹو آفسیٹ سے اس کا دوسرا ایڈیشن شائع کردیا۔

الالبانی شذوذہ و اخطاؤہ بیروت کے سفر سے واپسی کے بعد علامہ اعظمی کے قلم سے وہ شاہکار عالم وجود میں آیا جس نے علمی دنیا میں غلغلہ اور دنیائے سلفیت میں زلزلہ برپا کردیا۔ شیخ ناصر الدین البانی وہ سلفی عالم ہیں جن کے قلم کی دھار تلوار سے زیادہ تیز ہے، ائمہ و محدثین اور سلف صالحین بالخصوص علماء احناف میں بہت کم ایسے ہوں گے جو ان کے وار سے بچے ہوں، شیخ البانی نے متعدد کتابیں لکھی ہیں، جن میں وہ بہت سی جگہوں پر اہل علم کے وضع کردہ اصولوں سے انحراف کرتے ہیں، وہ خود ایک اصول ایک کتاب میں بناتے ہیں، مگر اپنا ہی اصول جب ان کے مزعومہ نظریہ کے خلاف ہوتا ہے تو دوسری جگہ اس کو توڑ دیتے ہیں۔ شیخ البانی نے جب علامہ اعظمی سے ملاقات کی تو خواہش ظاہر کی کہ علامہ اعظمی میری کتابیں پڑھ کر اپنی رائے لکھیں، چنانچہ زہیر شاویش سے (جو ان کی کتابوں کے ناشر تھے) کہہ کر وہ کتابیں مئو بھجوائیں، جس کے نتیجہ میں الألبانی شذوذہ و أخطاءہ معرض وجود میں آئی۔

اُس دور میں شیخ البانی کے علم اور ان کی زبان و قلم کی تیزی سے اکثر علماء عرب مرعوب تھے، لیکن علامہ اعظمی نے جب البانی صاحب کی غلطیوں کی گرفت کی اور ان کی تضاد بیانی کو واشگاف کیا تو دلوں پر ان کا جو طلسم طاری تھا وہ یکلخت ٹوٹ گیا، اور عرب علماء اور خاص طور پر مذاہب اربعہ کے پیرو کار آپ کے بہت شکر گذار ہوئے، یہ کتاب چھوٹے چھوٹے چار اجزاء میں چھپی ہے، جس کے مجموعی صفحات لگ بھگ پونے دو سو ہیں، ۱۹۸۵ء میں یہ کتاب کویت کے " دار العروبة للنشر والتوزیع" سے دوبارہ شائع ہوئی، تو کویت کی کتابوں کی ایک نمائش میں یہ کتاب اتنی بڑی تعداد میں فروخت ہوئی کہ مولانا بدر الحسن قاسمی مقیم کویت نے خط لکھا:

> "یہاں دار العروبہ للنشر والتوزیع نے " الالبانی اخطاؤہ و شذوذہ " کو بڑے اہتمام سے شائع کیا تھا اور معرض الکتاب العربی میں بہت فروخت ہوئی"
>
> (مکتوب ۱۳/۳/۱۹۸۵ء)

مفتاح العلوم میں اسکول کے قیام کی تحریک اور علامہ اعظمی کا موقف

۱۹۷۱ء میں مدرسہ مفتاح العلوم کے اندر بعض اراکین کی طرف سے اسکول کے قیام کیلئے کوشش کی گئی۔ یہ علامہ اعظمی کی زندگی کا معروف ترین زمانہ تھا، اس وقت آپ کی علمی اور تصنیفی و تحقیقی مشغولیات پورے شباب پر تھیں، اسفار کی کثرت اس پر مستزاد تھی، چنانچہ اسی دور میں بیروت کے دو طویل سفر بھی پیش آئے، اسکول کے قیام کی تحریک شروع کرنے سے پہلے ہی شاید محرکین کے ذہن میں یہ بات رہی ہو کہ علامہ اعظمی اس تجویز سے اتفاق نہیں کریں گے، لیکن اس وقت حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہتی جب ہم کاغذات میں دیکھتے ہیں کہ آغاز تحریک سے تقریباً ایک سال قبل ایجنڈا کے رجسٹر سے علامہ اعظمی کا نام اڑادیا گیا، اس کا علم تو اللہ ہی کو ہے کہ آپ کے نام پر سفیدی پھیر کر کس ظالم نے اپنا اعمالنامہ سیاہ کیا تھا، بہرحال آپ کے طویل اسفار اور گوناگوں مصروفیت کے باعث ان کو اس ناروا اقدام کا موقع ہاتھ آگیا، اسکول کے قیام کی اس تحریک کا افسوسناک پہلو یہ تھا کہ مولانا عبداللطیف نعمانی علیہ الرحمۃ بھی اس کے حق میں تھے، لیکن اس تجویز و تحریک کے خلاف علامہ اعظمی کا شدید رد عمل سامنے آیا، یہ معاملہ ابھی پس و پیش ہی میں تھا کہ علامہ اعظمی بیروت کے دوسرے سفر پر روانہ ہو گئے، آپ کی روانگی کے کچھ ہی دنوں بعد ۱۰ ر شعبان ۱۳۹۰ھ مطابق یکم اکتوبر ۱۹۷۱ء کو جمعہ کے دن نماز جمعہ کے بعد مدرسہ کی کمیٹی منعقد ہوئی، اس کمیٹی کے لئے جو ایجنڈا پاس ہوا تھا اس کے موضوع زیر بحث کا عنوان ہی تھا "انگریزی اسکول کا قیام مولانا کے تاثرات پر غور"، اس وقت کمیٹی میں سب سے پہلے اسی مسئلہ پر بحث ہوئی کہ کمیٹی میں لائے بغیر رجسٹر سے یہ نام (علامہ اعظمی کا نام) خارج کیسے کر دیا گیا، جب کہ یہ نام سرفہرست رہا کرتا تھا، اس وقت کچھ اراکین نے کھل کر علامہ اعظمی کی مخالفت کی، اور بات صرف مخالفت تک نہیں رہی بلکہ آپ کی ذات کو طنز و تعریض کا نشانہ بھی بنایا، اس صورتحال اور علامہ اعظمی کی ذات پر حملہ سے مولانا عبداللطیف صاحب طبعی طور پر دل گرفتہ ہوئے اور بالآخر انھوں نے یہ فراخدلانہ

پیشکش کی کہ مدرسہ کا کلی اختیار مولانا (علامہ اعظمی) کے ہاتھ میں دیدیا جائے، اور ہم تمام لوگ مع مدرسین وملازمین مستعفی ہو جائیں، وہ جس کو چاہیں رکھیں اور جس کو چاہیں نکال دیں۔

یکم اکتوبر کی وہ نشست بغیر کسی فیصلہ کے برخاست ہو گئی، اس کے بعد ایک آدھ اور نشستوں کے بعد اس تجویز پر خط تنسیخ پھیر دیا گیا، لیکن اس سے مجال انکار نہیں کہ اس واقعہ سے اختلاف وانشقاق کی ایک نیو پڑ گئی تھی، جس کے اثرات کئی سال بعد ظہور پذیر ہوئے۔

نئے مکان کی تعمیر اور اس میں منتقلی اب تک علامہ اعظمی پرانے مکان میں جوان کا آبائی مکان تھا، اور جسمیں اب آپ کے بڑے صاجزادے مولانا رشید احمد صاحب سکونت پذیر ہیں، زندگی گذارتے رہے، لیکن آپ کی ضروریات کو دیکھتے ہوئے مکان ناکافی تھا، اور علمی کاموں کی انجام دہی کے لئے کافی دقت ودشواری کا آپ کو سامنا کرنا پڑتا، چنانچہ اپنے محلہ میں قریب ہی ایک زمین تھی، اسمیں اپنی ضرورت کے مطابق تعمیر کرایا، اور وہاں منتقل ہو گئے، اسی مکان میں آج کل آپکے چھوٹے صاحب زادے حاجی سعید احمد صاحب اقامت گزیں ہیں۔ ۱۹/ اپریل ۱۹۷۲ء م ۴/ ربیع الاول ۱۳۹۲ھ کے ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:

"... مجھے اپنے لکھنے پڑھنے کے لئے جگہ کی بہت ہی تنگی تھی۔ ضرورت کے وقت کتابوں کے تلاش کرنے میں کبھی کبھی ایک ہفتہ صرف ہو جاتا تھا۔ اس لئے کہ کتابیں بالکل غیر مرتب رکھی ہوئی ہیں، اس لئے محلہ ہی میں ایک زمین تھی، اسمیں ایک کمرہ بنوا رہا ہوں، آج کل تقریباً دن بھر وہیں رہتا ہوں، وہیں جتنا موقع ملتا ہے، کچھ پڑھتا اور نوٹ کرتا رہتا ہوں" (۱)۔

سیریا سے ترتیب مخطوطات کے لئے دعوت ۱۹۷۲ء میں سیریا (شام) کے تین

(۱) مشاہیر علماء ہند کے علمی مراسلے ص ۱۸۷

مشہور شہر حمص، حماۃ اور حلب کے مفتیوں کی طرف سے آپ کی خدمت میں ایک مشترکہ دعوت نامہ پیش کیا گیا، اس دعوت کا مقصد یہ تھا کہ شام میں کچھ عرصہ قیام فرما کر وہاں موجود مخطوطات کی ترتیب کا کام آپ انجام دیں، اخراجات کا تمام باران لوگوں کے سر ہوتا، اس دعوت کا ایک دوسرا پہلو یہ تھا کہ ہندوشام کے درمیان ثقافتی تبادلے کو فروغ حاصل ہو، اس سلسلے میں انھوں نے پہلے ایک خط انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشنز (Indian council for cultural relations) آزاد بھون نئی دہلی کو لکھا، کونسل سے وہاں کی پروگرام آرگنائزر محترمہ بندنا بنرجی نے اپنی ایک تحریر کے ساتھ ملحق کر کے علامہ اعظمی کے پاس مئو روانہ کردیا، قارئین کے سامنے پہلے محترمہ بندنا بنرجی بعدہ حمص اور حلب و حماہ کے مفتیوں کا خط پیش کیا جارہا ہے، مس بنرجی کی تحریر ۳/اکتوبر ۱۹۷۲ء کی کونسل کے لیٹر پیڈ پر یہ ہے :

"Maulana Habib al rahman
sheikh ul Hadis, Madrasa Islamia
Mau Nath Bhanjan . Distt Azamgarh. U.P.
Dear Sir,

I am directed to enclose herewith copy of a letter received from the Mufties of Homs and hama , two cities in Syria regarding possibility of your visit to Syria. We shall be grateful if you kindly let us know if the offer is acceptable to you "

(مولانا حبیب الرحمٰن صاحب، شیخ الحدیث مدرسہ اسلامیہ
مئوناتھ بھنجن ، ضلع اعظم گڈھ اترپردیش

جناب والا! مجھے ہدایت ملی ہے کہ شام کے شہر حمص و حماہ کے مفتیوں کی طرف سے موصول ایک خط کی نقل روانہ کروں، یہ خط آپ کی شام کی زیارت کے امکان سے متعلق ہے ، برائے کرم آپ ہمیں مطلع فرمائیں کہ کیا یہ پیشکش آنجناب کیلئے قابل قبول ہے)

اب ■ خط ملاحظہ فرمایئے جو سیریا سے انڈین کونسل کو لکھا گیا تھا، اس کی تاریخ

تحریر ۱۰ر جون ۱۹۷۲ء:

" We have known from the works of the great Indian scholar , Maulana Habib al Rahman Al Azami , that he is one of the greatest authorities in traditions in this age .We have read his works and commentaries and have greatly benefited from his knowledge .

We would like to inform, you that we have a big number of manuscripts on traditions in Homs and Hama. We, however, regret to say that there is no body well qualified here to interpret and comment on these manuscripts. In view of the above , We request you to do us a favour and send this scholar on a visit to Syria to help us to evaluate the value of these manuscripts. We shall bear all expenses of his travel and residence in Syria .As the job is difficult one, his stay may extend to one year in Syria .

We hope that you will approve of his visit to our country as we need him urgently for the academic studies taking place here.

Thanking you in advance for your approval for his visit in the name of mutual co-operation between the scholar of our two countries." .

(ہم عظیم ہندوستانی محقق مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی کے کارناموں سے یہ جان چکے ہیں کہ وہ عصر حاضر میں حدیث کے مستند ترین علماء میں سے ایک ہیں، ہم ان کے کاموں اور تحقیقات کو پڑھ چکے ہیں اور ان کے علم سے بہت زیادہ مستفید ہوئے ہیں۔

ہم آپ کو اطلاع دینا چاہتے ہیں کہ ہمارے پاس حمص و حماہ میں بڑی تعداد میں حدیث کے مخطوطات موجود ہیں، اور اسی کے ساتھ ہمیں یہ بات

نہایت افسوس کے ساتھ کہنی پڑتی ہے کہ یہاں کوئی شخص اتنا باصلاحیت نہیں ہے، جو ان مخطوطات کی صحیح طور پر تعبیر و تبصرہ کر سکے، مذکورہ بالا باتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہم آپ سے درخواست کرتے ہیں کہ ہماری ایک مدد کریں اور محقق موصوف کو سیریا بھیج کر ان مخطوطات کی قدر و قیمت کو متعین کرنے میں ہمارے ساتھ تعاون کریں، ان کے سفر اور شام میں قیام کے تمام اخراجات ہم برداشت کریں گے، چونکہ کام قدرے مشکل ہے، اس لئے سیریا میں ان کا قیام ایک سال تک کھنچ سکتا ہے۔

ہمیں امید ہے کہ آپ ہمارے ملک کے ان کے سفر کو منظور فرمائیں گے، کیونکہ یہاں ہونیوالے علمی دراسات کے لئے ہمیں ان کی فوری ضرورت ہے۔

دونوں ملکوں کے محققین کے درمیان باہمی تعاون کے نام پر ہونے والے ان کے سفر کے لئے آپ کی منظوری کا پیشگی شکریہ۔)

اس خط کے نیچے ان تین حضرات کے نام مذکور ہیں، جن کی طرف سے یہ خط لکھا گیا ہے، اور وہ ہیں حمص کے مفتی شیخ محمد طیب العطاسی، حلب میں خادم حدیث شیخ عبدالباسط ابوالنصر اور حماۃ کے مفتی شیخ بشیر المراد۔

مولانا عبداللطیف نعمانی کی رحلت اور علامہ اعظمی کی گرانباری

دسمبر ۱۹۷۲ء کے اواخر میں علامہ اعظمی کلکتہ تشریف لے گئے، ابھی آپ کلکتہ ہی میں تھے کہ ادھر مئو میں ایک دل فگار سانحہ رونما ہوا، وہ یہ کہ آپ کے ہمدم دیرینہ، رفیق معزز اور سفر و حضر کے ساتھی مولانا عبداللطیف صاحب نعمانیؒ حرکت قلب بند ہو جانے سے واصل بحق ہو گئے، مولانا نعمانیؒ کی رحلت کا حادثہ ۳/ جنوری ۱۹۷۳ء م ۳۰/ ذیقعدہ ۱۳۹۲ھ کو پیش آیا، ۴/ جنوری کو ظہر کی نماز کے بعد نماز جنازہ ادا کی گئی، اس کے بعد مدرسہ کے جنوب مغربی سمت میں تدفین عمل میں آئی، اس سانحہ کی خبر علامہ اعظمی کو ٹیلی فون کے

دی گئی، جس کو سننے کے بعد ان پر جو گزری ہو گی اس کا احساس کچھ انھیں کو ہوا ہو گا۔ اس کے بارے میں وہ خود تحریر فرماتے ہیں:

"وہاں سے جس دن شام کو میری روانگی تھی، اس دن صبح کو ٹرنک کال کے ذریعہ اچانک یہ جانکاہ خبر ملی کہ مئو میں مولانا عبداللطیف صاحب انتقال فرماگئے۔

اس خبر کا جو اثر دل ودماغ پر پڑا بیان سے باہر ہے، تحقیق کے بعد معلوم ہوا کہ اب بنارس جانے والا کوئی پلین نہیں ہے، اس لئے ہم سب دل تھام کر بیٹھ گئے کہ جنازہ میں شرکت تو ناممکن ہے، اب کل قبر ہی کی زیارت کا امکان ہے۔

مئو آنے پر مفصل معلوم ہوا کہ مولانا نے عشاء کی نماز کے بعد مطالعہ کیا، دس بجے کے قریب بیت الخلاء گئے اور واپسی میں بے قابو ہو کر بیچ میں ہی بیٹھ گئے اور جب اٹھا کر لائے گئے تو چند ہی منٹ میں روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔"(۱)

مولانا محمد عثمان صاحب معروفی اپنے مضمون میں تحریر فرماتے ہیں:

"۶؍ذوالحجہ ۱۳۹۲ھ کو بعد نماز جمعہ شاہی مسجد میں محدث جلیل ابوالمآثر مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی دامت برکاتہم نے قدرے تفصیل سے آپ کے حالات زندگی پر روشنی ڈالی اور مسلمانوں کو صبر کی تلقین فرمائی..."(۲)

اور مولانا مفتی ظفیر الدین صاحب مفتاحی نے مولانا نعمانیؒ کی تدفین اور علامہ اعظمی کی تقریر اور ان کے اوپر مدرسے کی ذمہ داریوں کا ذکر کرتے ہوئے تحریر فرمایا ہے:

"...مولانا مرحوم کی وفات کے بعد یہی ہوا کہ مفتاح العلوم کا سارا

---

(۱) تذکرۂ مولانا عبداللطیف نعمانی ص ۱۷

(۲) ایضاً ص ۶۵

بوجھ آپ پر آگیا، اور یہی وجہ ہے کہ مجموعی طور پر وفات کا جو غم حضرت مولانا اعظمی مدظلہ کو ہوا، شاید کسی کو نہیں ہوا ہوگا۔ جن لوگوں نے مولانا مدظلہ کی جامع شاہی کی تقریر سنی ہے جو آپ نے مولانا نعمانیؒ کی وفات کے بعد کی تھی، ان کو اندازہ ہوا ہوگا۔ ربیع الاول ۱۳۹۳ھ میں جب مئو حاضری ہوئی تو ٹیپ ریکارڈ سے وہ تقریر خاکسار نے بھی سنی تھی ... بڑا اچھا ہوا کہ حضرت الاستاذ مولانا اعظمی مدظلہ کی خصوصی توجہ سے آپ کو مفتاح العلوم کے ایک گوشہ میں خانۂ خدا کے زیر سایہ سپرد خاک کیا گیا ...(۱)

مولانا نعمانیؒ قدس سرہ کی تجہیز و تکفین کے چند یوم بعد جب غم کچھ ہلکا ہوا تو سب سے اہم مسئلہ مدرسے کے نظم و نسق اور فرائض صدارت و نظامت تھے، کوئی ایسی شخصیت رہی نہیں جو ان ذمہ داریوں کو کما حقہ سنبھال اور ادا کر سکتی، مجبوراً علامہ اعظمی ہی گرانبار ہوئے، اور ضعف و ناتوانی کے باوجود ایک بار پھر آپ نے مدرسہ کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لی، اور بوجھ جس سے عمر بھر بھاگتے رہے، کہن سالی کے باوجود اپنے شانوں پر لاد لیا، اور نہ چاہتے ہوئے بھی صرف مدرسہ کے مفاد کے پیش نظر یہ بوجھ برداشت کر لیا، چنانچہ حضرۃ الاستاذ مولانا عبدالجبار صاحب اعظمی مرحوم تحریر فرماتے ہیں:

"تیسرے روز کمیٹی منتظمہ نے باتفاق رائے پاس کیا کہ اب حضرت مولانا مدظلہ مدرسہ کے مہتمم اور صدر مدرس کے کام انجام دیں گے۔

مولانا اس وقت پوری طرح مدرسہ کی جانب متوجہ ہیں، نماز جمعہ کے بعد عوام کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ: مولانا مرحوم نے میری ذمہ داری اپنے سر لے لی تھی اس وجہ سے میں مدرسہ کی ذمہ داری سے بڑی حد تک سبکدوش تھا، اب جبکہ میرے سوا کوئی مدرسہ کا سنبھالنے والا نہیں رہا، تو اس کا بار میں اپنے

---

(۱) تذکرۂ مولانا عبداللطیف نعمانی ص ۱۰۷

اوپر محسوس کرتا ہوں، لہذا اس کا تعلیمی اور انتظامی کام حتی المقدور میں انجام دوں گا، البتہ تمام لوگوں کا تعاون میرے ساتھ ہونا چاہئے۔"(۱)

اس پوری صورتحال اور علامہ اعظمی کی گرانباری اور پریشانی کو خود انھیں کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیں، مولانا عبداللطیف نعمانی مرحوم کی وفات اور مدرسہ کی باگ ڈور سنبھالنے کے تقریباً تین ہفتے بعد اپنے تلمیذ رشید مفتی ظفیر الدین مفتاحی کو خط لکھا، یہ خط ۲۹؍جنوری ۱۹۷۳ء کا مرقوم ہے، اس میں فرماتے ہیں:

"تمہارے دونوں خطوط ملے، جواب میں تاخیر کا سبب ظاہر ہے، مولانا عبداللطیف صاحب کی وفات میرے لئے ایک صدمہ جانکاہ ہونے کے علاوہ بہت سی پریشانیوں کا سبب بھی بن گئی ہے، مدرسہ کی خدمت کی ذمہ داریاں نہ میں نے قبول کی ہیں، نہ میرے اوپر ڈالی گئی ہیں، وہ از خود میرے سر آگئی ہیں، اس لئے کہ یہ ساری ذمہ داریاں میں ہی ان کے سپرد کر کے ان کی زندگی میں سبکدوش ہو گیا تھا۔

مجبوراً روزانہ مدرسہ جاتا ہوں، بخاری کی جلد اول پڑھاتا بھی ہوں، بعض اور اسباق بھی پڑھاتا ہوں، اب سب کو منتقل کر رہا ہوں، بخاری جلد ثانی مولانا عبدالجبار کے حوالہ کر دی ہے، انتظامی امور کی دیکھ بھال خود ہی کر رہا ہوں۔"(۲)

مولانا محمد ایوب صاحب کو دوبارہ لانے کی خواہش اوپر لکھا جا چکا ہے کہ مولانا عبداللطیف صاحب نعمانی مرحوم جب اسمبلی کی رکنیت کے اختتام کے بعد دوبارہ مفتاح العلوم میں آئے تو ان میں اور مولانا محمد ایوب صاحب علیہ الرحمۃ میں کچھ نا اتفاقی ہو گئی، اور اس کے نتیجہ میں صورتحال قدرے مخدوش ہو گئی، جس کی وجہ سے مجبوراً

(۱) تذکرۂ مولانا عبداللطیف نعمانی ص ۸۲

(۲) مشاہیر علماء ہند کے علمی مراسلے ص ۱۹۳

مولانا محمد ایوب صاحبؒ کو مدرسہ چھوڑنا پڑا۔ اب جب زمام مدرسہ علامہ اعظمیؒ کے ہاتھ میں آئی تو ان کی یہ خواہش ہوئی کہ مولانا محمد ایوب صاحب کو ایک بار پھر مدرسہ میں لائیں۔ چنانچہ مفتی ظفیر الدین صاحب کے مذکورہ بالا خط میں اس کے بعد لکھتے ہیں:

"مولانا ایوب صاحب آجاتے تو بوجھ ہلکا ہو جاتا، مگر درمیان سال میں بلانے سے وہاں کا نقصان ہوگا اور شاید وہ بھی قبول نہ کریں (۱)

واقعہ یہ ہے کہ علامہ اعظمی کو مدرسہ مفتاح العلوم سے ایک والہانہ عشق تھا، اس کی محبت رگ و پے میں رچی بسی تھی۔ یہ شغف اور شیفتگی اخلاص پر مبنی تھی، آپ کی کوئی غرض یا ذاتی مفاد اس سے وابستہ نہیں تھا، مفتاح العلوم انھیں کی ذات سے چمکا، بڑھا اور مشہور و معروف ہوا، اس سے لیا کچھ نہیں اور دیا سب کچھ تھا، مفتاح العلوم ان کی شہرت و ناموری کیلئے زینہ یا ذریعہ نہیں بنا، بلکہ اس کے برعکس اس کی شہرت و ناموری آپ کی رہین منت رہی، دلوں کا بھید تو اللہ بہتر جانتا ہے، لیکن اس کی توسیع و ترقی میں جس جوش و جذبہ اور محنت و لگن کا مظاہرہ کیا اس کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ ایک لمحہ کیلئے بھی اس سے کوئی فائدہ یا منفعت حاصل کرنے کا آپ کے دل میں خیال گذرا ہوگا۔

مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند کی تجویز اسی سال (۱۳۹۲ھ) رجب میں دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کا اجلاس منعقد ہوا، جس میں اصحاب شوریٰ کی تجویز پر آپ نے اس بات کی ہامی بھرلی، کہ سال میں کچھ روز دارالعلوم میں قیام کر کے وہاں کے اساتذہ و طلبہ کو استفادہ کا موقع فراہم کریں گے، اور یہ تجویز جو تجویز نمبر ۱۲ ہے، دارالعلوم کے لیٹر پیڈ پر نقل کر کے مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ مہتمم دارالعلوم کے ایک خط کے ساتھ ملحق کر کے دفتر دارالعلوم کی طرف سے آپ کی خدمت میں روانہ کی گئی، تجویز کی عبارت یہ ہے:

"نقل تجویز مجلس شوریٰ رجب ۱۳۹۲ھ

(۱) مشاہیر علماء ہند کے علمی مراسلے ص ۱۹۳

۱۲۔ مجلس شوریٰ شیخ الحدیث حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی کے اس وعدہ کو قدر کی نگاہ سے دیکھتی ہے اور اس کا احترام کرتی ہے کہ آپ دیوبند تشریف لاکر کچھ روز قیام فرمایا کریں، اور طالبان علوم کو استفاضہ کا موقع دیا کریں گے۔ مجلس اس وعدہ کا احترام کرتے ہوئے توقع رکھتی ہے کہ حضرت ممدوح سال میں چند بار اس افادہ کا موقع دیا کریں گے۔ حضرت موصوف سے اس سلسلہ میں رابطہ رکھا جائے، آمدورفت اور قیام کے جملہ انتظامات من جانب دارالعلوم کئے جائیں۔"

قاری محمد طیب صاحب کا خط اور یہ تحریر ۱۷رجب ۱۳۹۲ھ کی مکتوب ہے، لیکن اس کے چند ہی مہینے بعد مولانا عبداللطیف صاحب نعمانی کا انتقال ہو جانے سے آپ کے اوپر مفتاح العلوم کی جو ذمہ داریاں آئیں وہ اس افادہ کے لئے سد راہ بن گئیں۔

فتح المغیث ابوالفضل زین الدین عبدالرحیم بن الحسین العراقی (متوفی ۸۰۶ھ) ایک بڑے محدث گذرے ہیں، انھوں نے اصول حدیث پر "الفیۃ الحدیث" کے نام سے ایک منظوم رسالہ تصنیف فرمایا، اس الفیہ کی شرح نثر میں مشہور محدث حافظ شمس الدین محمد بن عبدالرحمٰن سخاوی (متوفی ۹۰۲ھ) نے ۳ ضخیم جلدوں میں "فتح المغیث" کے نام سے کی، یہ شرح بہت مفصل اور مبسوط ہے اور علم اصول حدیث کے اندر نہایت جامع، وقیع اور اہم خیال کی جاتی ہے، یہ کتاب دستیاب تھی اور مصر و ہند سے چھپ چکی تھی، لیکن کتابت وطباعت کی اغلاط سے پر تھی، جس کی وجہ سے اس سے کماحقہ فائدہ نہیں اٹھایا جاسکتا تھا، علامہ اعظمیؒ نے اس کے مطبوعہ نسخوں کا باہم مقابلہ کرکے ایک صحیح اور پاکیزہ نسخہ تیار کیا اور مطبعۃ الاعظمی مئو اعظم گڈھ سے چھاپ کر شائع کیا۔

چھٹا حج ۱۹۷۳ء مطابق ۱۳۹۳ھ میں آپ نے چھٹی بار حج کیا، اس سفر کے تعلق سے علامہ اعظمی نے اپنی یادداشت میں جو باتیں تحریر فرمائی ہیں وہ حسب ذیل ہیں:

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔

یوم الاحد ۲۳ر دسمبر ۱۹۷۳ء۔ دن میں بارہ بجے سعودی طائرہ زمین سے اٹھا، سوا پانچ گھنٹے میں جدہ پہونچنے کا اعلان ہوا۔

عبدالغنی جدہ کو ۲۱ر دسمبر ۱۹۷۳ء کو تار دیدیا گیا تھا۔ (گیارہ روپے) میں تار ہوا اس طرح کے تار کو لیٹر ٹیلیگرام کہتے ہیں۔

ایرپورٹ پر سامان وزن کیا گیا تو ۲۷ر کیلو ہوا مگر لے لیا گیا۔

۲۳ر ہی کو رات میں مکہ پہونچا، فخریہ میں قیام ہوا، دوسرے دن علی میاں اور مولوی منظور ملنے کو آئے۔

حج ۲ر جنوری ۱۹۷۴ء کو ہوا، اس دن ہندوستان میں ۷ر ذی الحجہ تھی۔

مکہ۔ شیخ الازہر، رشید فارسی، صالح قزاز، حسنین مخلوف، محمد نور سیف، محمد الحسن بن علوی مالکی، محمد الحافظ التیجانی، عبدالفتاح ابو غدہ، محمد علی صابونی، بن باز حمد ابراہیم صلیفیح، محمد نمر الخطیب وغیرہم سے ملاقاتیں ہوئیں۔

۲۸ر جنوری کو مدینہ گیا۔ ۲ر کو جدہ واپس ہوا۔ ۴ر کو ہندوستانی ٹائم سے ساڑھے گیارہ بجے جدہ سے روانہ ہوا اور تین بج کر چالیس منٹ پر بمبئی پہونچ گیا، حاجی شمس الدین بیکری والوں کے یہاں قیام ہوا۔"

علاوہ بریں وفیات پر مشتمل اپنی بیاض جو مرتب فرمائی ہے، اس میں ایک جگہ شیخ علال فاسی کا ذکر کیا ہے۔ اس میں اور باتوں کے ساتھ یہ بھی لکھتے ہیں:

"وقد استمعت الی محاضرته فی مقر الرابطة فی موسم الحج عام ۱۳۹۳ھ"

یعنی ۱۳۹۳ھ کے حج کے موسم میں رابطہ عالم اسلامی کے دفتر میں میں نے ان کا لیکچر سنا۔

اسی سفر کی بابت ایک جگہ اور لکھا ہے:

"چھٹا حج میں نے ۱۳۹۳ھ میں کیا، فخریہ میں قیام تھا، اسی سال شیخ الازہر سے ملاقات ہوئی۔"

علامہ اعظمی کا کتابوں اور کتب خانوں سے تعلق و شغف محتاج بیان نہیں، بالخصوص ایسی لائبریریوں کے، جہاں مخطوطات پائے جاتے ہوں، وہ فریفتہ و دلدادہ تھے، اس سفر میں مدینہ منورہ کی لائبریری "المکتبة العامة" میں تشریف لے گئے اور متعدد مخطوطات کے نام نوٹ کئے، اور اشارات کے لئے نہایت مختصر طور پر ایک جگہ نوٹ کر دیا۔ آپ کی تحریر یہ ہے:

"محرم ۱۳۹۴ھ۔ المکتبة العامة بالمدینة المنورة

۱۔ المطالب العالیة، مکتوبہ ۸۷۸ھ کامل۔ ورق بے حد کمزور و وزیدہ

۲۔ اطراف مسند احمد لابن حجر، جلد اول تا مسانید ابن مسعود فقط۔ مکتوبہ قدیم، شاید سخاوی کے ہاتھ کا ہوا مؤلف کے۔

۳۔ فتح المغیث شرح ألفیة للعراقی، کلاهما هو التبصرة والتذکرة۔

۴۔ تقییدات ابن نقطة

۵۔ جزء عن تاریخ أحمد بن أبی خیثمة"

علامہ اعظمی کے تئیں عربوں کی عقیدت و محبت اور شیفتگی و گرویدگی کا جو دلآویز منظر پروفیسر محمد اجتباء صاحب ندوی نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، اس کی نسبت ان کا بیان ہے:

"۱۹۷۳ء کے آخر میں، سعودی وزارت تعلیم کی دعوت پر ریاض گیا ۷۴ء کے حج کی سعادت حاصل کرنے کیلئے ریاض سے مکہ مکرمہ حاضر ہوا تو معلوم ہوا کہ حضرت محدث اعظمی کا قیام مدرسہ فخریہ میں ہے، پہلی فرصت میں حاضر ہوا، کئی برس کے بعد ملاقات ہوئی تھی لپٹا لیا، شفقت و محبت سے حالات پوچھے

رہے، کمرہ کے ایک کونہ میں بڑی سادگی، تواضع اور انکساری سے تشریف فرما تھے، اور عرب و عجم کے علماء و محدثین اور محققین خدمت میں حاضر ہوتے تھے، سند حدیث لیتے تھے اور تاثر و عقیدت سے مالامال لوٹتے تھے۔"(۱)

جامع ازہر مصر کی دعوت ۱۹۷۴ء میں جامع ازہر مصر سے حدیث و تفسیر سے متعلق کچھ تحقیقات کے لئے آپ کو قاہرہ تشریف لے جانے کی دعوت دی گئی، چنانچہ شیخ الازہر کی ہدایت پر، ازہر کے ماتحت ادارے مجمع البحوث الاسلامیہ (Islamic Research Academy) کے سیکریٹری جنرل ڈاکٹر محمد عبدالرحمٰن بیصار نے درج ذیل خط آپ کی خدمت میں روانہ کیا، جو دفتر کے لیٹر پر ۲۰/مارچ ۱۹۷۴ء کا مکتوب ہے:

"فضيلة الأستاذ الشيخ حبيب الرحمن الأعظمى

السلام عليكم و رحمة الله و بركاته وبعد!

يسعدنا أن نرحب بفضيلتكم فى القاهرة ضيفاً على الأزهر الشريف من أجل دراسات تتعلق بالحديث والتفسير ... لبضعة أشهر وذلك بناء على توجيهات الإمام الأكبر شيخ الجامع الأزهر على أن تكون الزيارة من أول يونيو سنة ١٩٧٤ . مع رجاء أن نوافى بالموعد الذى تحددونه للحضور الى القاهرة بخمسة عشر يوما على الأقل .

و نحن إذ نوجه الدعوة لفضيلتكم يسرنا أن نسعد بوجودكم فى مصر لنستفيد من علمكم و يستفيد الأزهر من خبرتكم ..."

(استاذ فاضل شیخ حبیب الرحمٰن الاعظمی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

ہمارے لئے یہ سعادت کی بات ہے کہ قاہرہ میں، جامع ازہر کے مہمان

(۱) ترجمان الاسلام ش ۱۳ ص ۱۰۷-۱۰۶

کی حیثیت سے، حدیث و تفسیر سے متعلق تحقیقات کے سلسلے میں چند مہینوں کیلئے، ہم آپ کو خوش آمدید کہیں، یہ دعوت امام اکبر شیخ الازہر کی ہدایت پر دی جا رہی ہے، بایں طور کہ آپ کا سفر جون ۱۹۷۴ء کے آغاز سے ہو، امید ہے کہ قاہرہ تشریف آوری کے سلسلہ میں آپ جو وقت مقرر فرمائیں گے کم از کم پندرہ دنوں میں ہم تک پہنچ جائے گا۔

ہم آنجناب کی خدمت میں یہ دعوت نامہ گذارتے ہوئے اس بات سے خوش ہیں کہ مصر میں آپ کی موجودگی سے ہم سرفراز ہوں گے، تاکہ ہم آنجناب کے علم سے استفادہ کرسکیں اور ازہر آپ کے تجربہ سے فائدہ اٹھاسکے۔)

علامہ اعظمی کی مفتاح العلوم سے علحدگی مدرسہ مفتاح العلوم کے لئے علامہ اعظمی کی خدمات اور قربانیاں اتنی عظیم الشان اور بیش بہا ہیں کہ انھیں حیطۂ تحریر میں لانا دشوار ہے، پھر بھی گذشتہ صفحات میں جو کچھ لکھا جاچکا ہے، اس سے قارئین کو کسی حد تک اندازہ ضرور ہو سکتا ہے، علامہ اعظمی کی طبیعت کا یہ عجیب پہلو تھا، کہ ہند و بیرون ہند سے پیش کئے جانے والے اعلی علمی عہدوں اور اونچے اونچے مناصب کو کبھی خاطر میں نہیں لائے، آپ دیکھ چکے ہیں کہ کس کس طرح لوگوں نے بڑے بڑے مشاہروں اور خطیر تنخواہوں کی ترغیب دے کر اپنے اداروں میں بلانا چاہا، لیکن ادھر سے ہمیشہ بے نیازی بلکہ بیزاری رہی، مگر مفتاح العلوم کی کسی بھی خدمت کیلئے ہمہ وقت کمربستہ اور ہمہ تن تیار رہے۔

مولانا عبداللطیف صاحب نعمانیؒ کو اس بات کا پوری طرح احساس تھا کہ علامہ اعظمی کی شخصیت مدرسے کی سب سے قیمتی متاع ہے، وہی اس کے روح رواں اور وہی اس کے تاج کے آبدار موتی ہیں، انھیں کے دم سے مدرسہ کی بزم سجی ہے، اور ان ہی کے وجود سے اس کی رونق قائم ہے، یہی وجہ ہے کہ جس وقت علامہ اعظمی کی مصروفیات منتہائے کمال کو پہونچی ہوئی تھیں، مولانا نعمانی مرحوم نے اپنی ایک اہم خواہش کا اظہار کیا تھا، جس کو مفتی ظفیر الدین صاحب نے درج ذیل الفاظ میں قلمبند کیا ہے، لکھتے ہیں

"شوال ۱۳۹۲ھ میں وفات سے دو ماہ پہلے حاضری ہوئی تو کئی مجلسوں میں فرمایا کہ دل چاہتا ہے کہ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی مدظلہ مفتاح العلوم میں بیٹھ کر تصنیف و تالیف کی خدمات انجام دیں، جی چاہے تو ایک آدھ سبق پڑھا دیں، نہ جی چاہے نہ پڑھائیں، مگر دو تین گھنٹے لکھنے پڑھنے کا کام گھر کے بجائے یہیں بیٹھ کر ضرور کیا کریں، میں خود ہی خدمت میں حاضر ہو کر کہوں گا، تم لوگ بھی عرض کرو، چنانچہ اس کا تذکرہ خاکسار نے مولانا مدظلہ سے ان ہی دنوں میں کیا تھا، حضرت اقدس مدظلہ نے امید افزا انداز میں فرمایا سوچوں گا۔"(۱)

یہ مولانا نعمانی مرحوم کے دل کی آواز اور مدرسہ کے مفاد کے سلسلے میں اہم ترین خواہش تھی، جس کا اظہار انھوں نے وصال سے کچھ عرصہ قبل کیا تھا، پھر حالات خود ہی ایسے آن پڑے کہ علامہ اعظمی کو خود کو پوری طرح مفتاح العلوم کے حوالے کر دینا پڑا، لیکن یہ بات نہایت افسوس کی ہے کہ مولانا نعمانی نور اللہ مرقدہ کے ہی کچھ حلقہ بگوشوں نے ان کی خواہشات کو پامال اور ان کی آرزوؤں اور تمناؤں کا ان کے انتقال کے بعد بدترین انداز سے خون کیا۔

علامہ اعظمیؒ نے اپنی تصنیفی و تحقیقی مصروفیات کی وجہ سے مولانا عبداللطیف صاحب نعمانی کو اپنا جانشین بنا رکھا تھا، چنانچہ آپ کی جو تحریر صفحہ ۱۶۶ پر گذر چکی ہے، اس کے بعد متصلاً آپ ارقام فرماتے ہیں:

"جب میں نے مصنف عبدالرزاق کی تحقیق کا کام شروع کیا، تو مجبوراً میں نے اپنی جگہ مولوی عبداللطیف نعمانی کو سپرد کر کے کام کیلئے یکسوئی حاصل کرلی"

آپ نے صرف مصنف کے نام کو اس کی اہمیت کے پیش نظر ذکر کیا ہے، ورنہ یہ وہ زمانہ تھا کہ مصنف کی تحقیق کے ساتھ مسند حمیدی، سنن سعید، کتاب الزھد اور

(۱) تذکرۂ مولانا عبداللطیف نعمانی ص ۱۰۷

المطالب العالیہ وغیرہ کی تحقیق کا کام بھی جاری تھا، یہ مہمات ایسی تھیں کہ آپ سے مکمل انہماک اور کامل یکسوئی کی متقاضی تھیں، جس کے نتیجہ میں طبعی طور پر مفتاح العلوم کی طرف آپ کی توجہ کم ہوگئی، جس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ مولانا عبداللطیف صاحب نعمانی علیہ الرحمۃ نے مدرسہ کی ذمہ داریوں کو بحسن وخوبی سنبھال رکھا تھا۔

لیکن اسی کیساتھ یہ حقیقت بھی نہایت تلخ اور باعث افسوس ہے کہ حضرت مولانا عبداللطیف صاحبؒ کے گرد ایسے لوگ اکٹھا ہوتے گئے، جو علم وبصیرت سے محروم تھے، جن کا شیوہ صرف تملق تھا اور اسی پر بس نہیں، بلکہ وہ انتظامی امور میں دخیل اور مدرسہ کے معاملات پر غالب ہوتے جارہے تھے، اسی ذہنیت کے لوگوں نے مولانا محمد ایوب صاحبؒ کے اوپر حملہ کیا، اور اسی ذہنیت کے لوگ تھے کہ جب علامہ اعظمی نے مدرسہ کے اندر اسکول وکالج کے قیام کی تحریک کو روکنا چاہا، توان پر طعن آمیز اور گستاخانہ جملے کسے، یہ لوگ مجلس انتظامی پر حاوی ہوتے جارہے تھے، حالانکہ اس قسم کے لوگوں سے مدرسہ کے مفاد کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی، بلکہ ضرر اور نقصان پہونچنے کا اندیشہ تھا، چنانچہ اس تسلط کا نتیجہ یہ ہوا کہ مولانا نعمانیؒ کی وفات کے بعد ایسے حالات پیدا ہوگئے، جن کے پیش نظر علامہ اعظمی کو مدرسہ سے علحدگی کا فیصلہ کرنا پڑا۔ ۱۱؍مارچ ۱۹۷۵ء کو مالیگاؤں سے ایک خط میں حاجی عبدالغفار صاحب نعمانی کو (جو اس وقت مفتاح العلوم کے خزانچی تھے) لکھتے ہیں:

"میں بنگلور سے مدراس اور حیدرآباد ہوتا ہوا مالیگاؤں آگیا ہوں، مئو واپس ہونے کی مجھے کوئی جلدی نہیں ہے، مدرسہ کے حسابات کی جانچ پڑتال اگر ہوگئی ہو توخیر ورنہ بلاتاخیر کمیٹی کیلئے نوٹس گشت کرادی جائے اور ۰۰۰ صاحب بغیر کسی لیت ولعل کے اپنی رپورٹ کمیٹی میں پیش کردیں اور تمام کاغذات اور رجسٹر کمیٹی کے حوالہ کردیں، کمیٹی کسی معتمد کے چارج میں ساری چیزیں دیدے، نیز رپورٹ پر حق وانصاف کا جو تقاضا ہو اس کے مطابق کمیٹی فیصلہ صادر کردے

میں اب مدرسہ کی ہر خدمت سے معذور ہوں، مگر مدرسہ چھوڑنے سے پہلے اس کی بقا کے لئے ایک ضروری مشورہ دے رہا ہوں، کہ آپ لوگ فوراً جدید انتخاب ممبران کا کر لیجئے جس میں قدیم ممبران میں سے کسی کو نہ لیجئے...

میرا انتظار نہ کیا جائے، میں آنے کے بعد مدرسہ نہ آؤں گا، نہ کمیٹی میں شرکت کروں گا۔

حبیب الرحمٰن الاعظمی

۱۱۔مارچ ۱۹۷۵ء"

علیحدگی کے اسباب | علامہ اعظمی مفتاح العلوم سے قطع تعلق کا حتمی فیصلہ کر چکے تھے، لیکن آپ کے اس فیصلہ کے پس منظر میں کیا اسباب و عوامل کار فرما تھے، اور وہ کون سے حالات و واقعات رونما ہوئے جن کے نتیجہ میں آپ اس اہم ترین فیصلہ پر مجبور ہوئے۔ میں ان کو مختصراً مالہ وماعلیہ کے ساتھ ذکر کر دینا چاہتا ہوں، اس کا سبب نہایت اجمال کے ساتھ آپ خود تحریر فرماتے ہیں:

"لیکن مولوی عبداللطیف صاحب کے انتقال کے بعد پھر اس کا (مدرسہ کا) انتظام اپنے ہاتھ میں لینا پڑا، مگر یہ سلسلہ صرف اس وجہ سے دیرپا نہ ہو سکا کہ مجلس انتظامی کا جدید انتخاب کئی سال سے نہیں ہوا تھا، نعمانی صاحب (۱) کے وقت میں بھی بار بار یہ تجویز پاس ہوئی کہ نیا انتخاب ضروری ہے اور میرے آنے کے بعد بھی، مگر ممبران ہمیشہ رکاوٹ ڈالتے رہے، اس لئے میں نے مدرسہ جانا بند کر دیا، اور لکھ کر بھیج دیا کہ جب تک نیا انتخاب نہ ہوگا میں مدرسہ نہیں آسکتا، انجام کار نیا انتخاب نہیں ہوا اور نعمانی کے لڑکوں نے ایک غیر قانونی مجلس میں نعمانی کے بڑے لڑکے کو ناظم اعلیٰ منتخب کر لیا، حالانکہ یہ انتخاب اور انتخابی مجلس بالکل ناجائز اور غیر قانونی تھی، مدرسہ کے دستور دفعہ

(۱) مولانا عبداللطیف نعمانی مراد ہیں

ے کی رو سے کوئی مجلس بغیر ناظم کے منعقد نہیں ہو سکتی، اور یہ مجلس جس میں انتخاب ہوا، اس کو نہ میں نے بلایا تھا نہ میں نے اس کا حکم دیا تھا اور نہ میں اس میں موجود تھا۔"

مجلس انتظامی میں جس قسم کے لوگ غالب ہو چکے تھے، ان سے مدرسہ کو سخت نقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا، بلکہ بہت نقصان پہنچ چکا تھا، اور مدرسہ کے قیام کے مقاصد اور دینی مصالح کو ذاتی مفادات اور سیاسی مصلحتوں کے مقابلہ میں پس پشت ڈالا جا رہا تھا، اس لئے علامہ اعظمی مجلس انتظامی کو یکسر تبدیل کر دینے کا عزم کر چکے تھے، مگر اراکین اس تبدیلی کو برداشت کرنے کے لئے آمادہ نہیں تھے۔ صورتحال اس قدر ناگفتہ بہ اور وحشت خیز ہو چکی تھی کہ اس کا تصور بھی تکلیف دہ ہے، حتی کہ آپ اپنی ایک تحریر میں لکھتے ہیں:

"پروسیڈنگ بک جس پر ابتدا سے مولانا عبداللطیف کے انتقال سے کچھ پہلے تک کی کارروائیاں درج تھیں گم کردی گئی۔
قبض الوصول کا رجسٹر بھی گم کر دیا گیا۔"

صرف یہی نہیں، مدرسہ کے دستور العمل کو مسلسل پامال اور اس کے اصول و ضوابط کو رسوا کیا جاتا رہا، چنانچہ آپ اوپر پڑھ چکے ہیں کہ دفعہ ۷ کی خلاف ورزی کی گئی، جس کی نسبت مدرسہ کے دستور (قواعد متعلقہ ناظم مدرسہ) میں یہ مذکور ہے۔ "کوئی مجلس بغیر ناظم یا نائب ناظم اجلاس نہیں کر سکتی" یعنی دستور مدرسہ کی خلاف ورزی کر کے ناظم کا انتخاب کیا گیا، اور پھر نو منتخب ناظم نے کیا کیا بے ضابطگیاں کیں ان میں سے بعض باتیں علامہ اعظمی نے تحریر فرمائی ہیں، چنانچہ آپ نے لکھا ہے کہ دفعہ ۳ کی مخالفت کی گئی، یعنی "ممبران عمومی کا انتخاب شہر کے جلسہ عام میں نہیں ہوا، بلکہ ناظم نے اپنی رائے سے کثیر افراد کو ممبر بنا لیا" اور "ممبر خصوصی کی نامزدگی ناظم نے اپنے رائے سے کی" دستور العمل کی مخالفت کے زیر عنوان ان باتوں کے علاوہ اور بھی متعدد دفعات کی مخالفت آپ نے ذکر فرمائی ہے، جو اس بات پر صاف دلالت کرتی ہے کہ مدرسہ کی روح کو پے بہ پے ضرب پہنچائی جاتی رہی اور ان لگاتار ضربوں سے اس کی روح پوری طرح مجروح ہو چکی تھی

علامہ اعظمی کے خلاف جو محاذ آرائی کی گئی ،اس کا ایک بنیادی سبب یہ بھی تھا، کہ مدرسہ کا اتر پردیش عربی و فارسی بورڈ سے جو الحاق تھا اس کو آپ ختم کرانا چاہتے تھے، آپ کو مدرسے پر سرکاری اثر و نفوذ دیکھنا کسی طرح گوارا نہیں تھا، گویا ان کی خداداد بصیرت اور مومنانہ فراست اس سے مرتب ہونے والے اثرات اور آگے آنے والے خطرات کو دیکھ رہی تھی، اس لئے ان کی قطعی رائے یہ تھی کہ مدرسہ آزادانہ طور پر علم و دین کی خدمت انجام دے ،سرکار یا سرکاری امداد کا دست نگر اور محکوم نہ ہو، سرکاری امداد کی بنیاد پر دینی مدرسہ چلانا ،ان کے نزدیک مدرسہ کو سرکار کی تحویل میں دیدینے کے مترادف تھا، لیکن مخالفین کے لئے ان کا یہ نظریہ بھی قابل قبول نہ تھا، اور اس کی بنیاد پر بھی آپ کی سخت مخالفت کی گئی، یہاں تک کہ آپ کی نسبت بے سروپا حکایتیں اور جھوٹے افسانے گھڑے گئے جن سے آپ کا دامن پوری طرح پاک تھا۔

موقع پرستوں نے مفتاح العلوم سے علامہ اعظمی کی توجہ ہٹانے اور اس پر اپنی گرفت جمانے کے لئے وہ سیاسی بازیگری کی اور ایسے ایسے حربے اور ہتھکنڈے آزمائے، جن سے ادارہ کی پوری تاریخ شرمسار ہے ،ان کرم گستروں نے علامہ اعظمی اور ان کے متعلقین کے خلاف طرح طرح کی سازشیں رچیں، ان کی شہ پر کچھ طلباء نے مولانا عبدالجبار صاحب اور مولانا نعمت اللہ صاحب (۱) کی شان میں سخت گستاخی کی، اور

(۱) مولانا نعمت اللہ صاحب اعظمی معروفی ۱۳۵۴ھ میں پورہ معروف میں پیدا ہوئے، تعلیم اپنے قصبہ کے مدرسہ اشاعت العلوم میں حاصل کی، اس کے بعد دارالعلوم دیوبند گئے اور وہاں سے ۱۳۷۲ھ میں فارغ التحصیل ہوئے، فراغت کے بعد درس و تدریس کا کام شروع کیا اور سب سے پہلے دارالعلوم تاؤلی ضلع مظفرنگر میں تدریسی خدمت انجام دی ،اس کے بعد علامہ بلیاوی کے حکم پر داماپور گئے اور وہاں کم عمری کے باوجود بخاری و ترمذی پڑھائی ،اس کے علاوہ مصباح العلوم کوپاگنج اور جامعۃ الرشاد اعظم گڈھ میں بھی درس و تدریس کی خدمت انجام دی، ۱۳۹۳ھ م ۱۹۷۳ء میں علامہ اعظمی نے ان کو مفتاح العلوم میں شیخ الحدیث کا منصب تفویض کیا، اختلاف کے بعد وہاں =

بدتمیزی کی دنیا میں ایک مثال قائم کردی، وہ دن مفتاح العلوم کی تاریخ کا تاریک ترین دن تھا، جب مولانا عبدالجبار صاحب کے سامنے سے چند سرکش طلبہ نے (جن میں سے بعض اب صاحب جبہ و دستار ابلقلم خود حدیث نبوی کے خدمت گذار بن گئے ہیں) دوران درس صحیح مسلم چھینی، ان تمام حالات و واقعات کا نتیجہ وہی ہوا جو ان شر انگیز وں کا مقصد تھا کہ علامہ اعظمی نے مفتاح العلوم کو ہمیشہ کیلئے داغ مفارقت دے دیا! مگر واہ رے استقامت کہ نصف صدی تک جس باغ کی اپنے خون جگر سے آبیاری کی، اس سے جدائی برداشت کرلی مگر اپنے نقطۂ نظر سے سمجھوتا کرنا ہرگز گوارا نہ کیا!

مدرسہ سے قطع تعلق کے جو اسباب و محرکات تھے، ان میں سے صرف اہم باتوں کو ہم نے اختصار کے ساتھ ذکر کیا ہے، ورنہ مدرسہ مفتاح العلوم کی اس وقت کی داستان طویل ہے، اور یہ داستان اب پارینہ بن چکی ہے، ان باتوں کا ذکر بھی اس لئے ضروری سمجھا گیا کہ یہ واقعات آپ کی زندگی میں پیش آنے والے سب سے زیادہ تکلیف دہ، غم انگیز اور روح فرسا واقعات تھے۔ اس حادثہ سے آپ کے دل و دماغ شدید طور پر متاثر ہوئے، کہ مستعفی ہوکر علامہ اعظمی کے ایماء پر مظہر العلوم بنارس گئے، اور پھر علامہ اعظمی نے ہی دارالعلوم دیوبند کے لئے آپ کا نام تجویز کیا، چنانچہ اس وقت آپ دیوبند میں استاذ حدیث ہیں، اور وہاں کے سب سے مؤقر اور متبحر استاد تسلیم کئے جاتے ہیں۔

علامہ اعظمی مدرسہ مفتاح العلوم کو ترقی کی انتہا پر دیکھنا چاہتے تھے، اسی لئے نہایت خیر خواہی کیساتھ آپ نے اس کی مسند حدیث کے لئے مولانا نعمت اللہ صاحب کا انتخاب فرمایا تھا مگر

وکم من موقف حسن أحیلت محاسنه فعد من الذنوب

آپ کا یہ فیصلہ کچھ لوگوں کو ناگوار گذرا، لیکن علامہ اعظمی جوہر شناس تھے، ان کی قیافہ شناسی صلاحیتوں کو چہروں پر پڑھ لیتی تھی، مولانا نعمت اللہ صاحب کی اس وقت علمی حلقوں میں شہرت و مقبولیت اور ان کی علمی عظمت نے علامہ اعظمی کے فیصلہ کی صحت کے لئے وافر ثبوت فراہم کردیے ہیں، اور ان کے حسن انتخاب پر مہر تصدیق ثبت کردی ہے۔

جس چمن کو اپنے خون پسینے سے سینچا، جس کی عمر بھر اپنے لہو سے آبیاری کی جس کی ایک ایک شاخ اور ایک اک پتی کی تراش خراش میں اپنی قوتوں اور توانائیوں کو صرف کیا، جس کی ہوا اور فضا میں آپ کی سانسوں کی مہک اور زمزموں کی گونج تھی، جس کے منبر ومحراب، درودیوار اور ایک ایک اینٹ پر جاہ وجلال اور عظمت وشوکت کے تابندہ نقوش چھوڑے تھے، جس میں نصف صدی تک علم وفن کے جام ومینا لنڈھائے اور کوثر وتسنیم بہائے تھے، تاحیات جس کے دست گرہ کشا، روح رواں اور فکر رسا رہے، اس کو اپنی زندگی ہی میں اپنی آنکھوں سے خزاں رسیدہ ہوتے بھی دیکھا، یہ اوقات آپ پر کس قدر شاق اور کیسے کربناک گذرے ہوں گے اہل نظر کے لئے اس کا اندازہ لگانا کچھ مشکل نہیں! آپ کے خلاف جو ماحول بنایا گیا اس سے آپ کا کرب واضطراب اس حد تک پہنچ چکا تھا کہ غم غلط کرنے اور ذہنی سکون حاصل کرنے کے لئے مئو سے باہر قصبہ بہادر گنج یا کہیں اور چلے جایا کرتے اور وہاں اپنے علمی کام کیا کرتے۔

شیخ الازہر کی آمد پر شوال ۱۳۹۵ھ کی آخری تاریخوں میں دارالعلوم ندوۃ العلماء کا پچاسی سالہ اجلاس بہت شان وشوکت کے ساتھ منعقد ہوا، یہ اجلاس ۲۵/۲۶/۲۷/۲۸ شوال ۱۳۹۵ھ مطابق ۳۱/اکتوبر و ۱/۲/۳/نومبر ۱۹۷۵ء کو منعقد ہوا، اجلاس کے انعقاد سے قبل ۲۹/شعبان ۱۳۹۵ھ مطابق ۷/ستمبر ۱۹۷۵ء کو ناظم ندوہ مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے علامہ اعظمی کے پاس ایک خط بھیجا جس میں تحریر فرمایا:

"۔۔۔ عربی میں چھپا ہوا پروگرام پہونچا ہوگا، ہماری بڑی خواہش اور ضرورت ہے کہ کسی موضوع پر آپ بھی عربی میں کوئی مقالہ تیار فرمائیں، یہ اجلاس کے لئے بڑے فخر اور زینت کی بات ہوگی، دو تین موضوع ایسے معلوم ہوتے ہیں جن پر قلم اٹھانا شاید طبیعت کے خلاف نہ ہو۔

۱۔ علوم اسلامیہ اس وقت کس حالت میں ہیں رو بہ ترقی یا رو بہ زوال؟ اور اس میں کس طرح نئی روح پھونکی جا سکتی ہے؟

۲۔ ہندوستان میں صوفیائے کرام کی اشاعت اسلام کے میدان میں خدمات، انسانی سیرت کی تعمیر اور اخلاقی تربیت میں ان کا حصہ۔

۳۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے خاندان و تلامذہ کی اصلاحی و تجدیدی کوششیں اور ان کے اثرات۔

اس کے علاوہ آپ جس موضوع پر لکھنا پسند فرمائیں، ہمارے لئے فخر و مباہات کی بات ہوگی، افسوس ہے کہ وقت بہت کم رہ گیا ہے، ہماری خواہش تھی کہ عربی مقالہ کا اردو اور انگریزی میں خلاصہ تیار رہے، اور اردو کا انگریزی اور عربی میں، بہر حال ایک درخواست ہے جو آپ کی خدمت میں پیش کر دی۔

ع

گر قبول افتد زہے عزّ و شرف

اگر ایک دو روز پہلے تشریف لے آئیں تو قیمتی مشوروں سے بھی استفادہ کا موقع ملے۔

الحمد للہ والد صاحب کی تلخیص الاخبار جس پر آپ نے از راہ کرم نظر ڈالی تھی، اور مولانا عبد الجبار صاحب نے مقابلہ و تصحیح کی زحمت گوارہ کی تھی۔ المکتب الاسلامی سے "تهذيب الأخلاق" کے نام سے شائع ہو کر آگئی ہے، میری متعدد کتابیں بھی ان مطابع نے شائع کی ہیں، انشاء اللہ تشریف آوری پر پیش کی جائیں گی۔۔۔"

یہاں یہ ذکر کر دینا ضروری ہے کہ علامہ اعظمیؒ ناسازیٔ طبع کے باعث مقالہ تیار نہیں کر سکے تھے، حتی کہ آپ وقت پر اجلاس میں شرکت بھی نہیں فرما سکے تھے، بلکہ آپ وہاں تاخیر سے پہونچے، اور طبیعت کے ہموار نہ ہونے کی وجہ سے سہارے سے چلتے پھرتے تھے۔

اس اجتماع میں ہند و پاک کے علاوہ عالم عرب و عالم اسلام کی عظیم و ممتاز ترین شخصیتوں نے شرکت کی، جن میں سر فہرست فاضل اجل شیخ الازہر ڈاکٹر عبد الحلیم محمودؒ کا

نام نامی ہے۔ یہ وہی شیخ الازہر ہیں جنھوں نے اس اجتماع کے انعقاد سے ایک سال قبل علامہ اعظمی کو سفر مصر کی دعوت دی تھی، شیخ الازہر جب ہندوستان تشریف لائے تو مختلف مقامات پر ہفتہ عشرہ سے زائد ان کا قیام رہا، اس دوران علامہ اعظمی سے بھی ان کی مفصل ملاقات اور طویل رفاقت رہی۔

اجلاس کے اختتام کے بعد شیخ الازہر کے پروگرام میں بعض دوسرے مقامات کی زیارت ودید بھی شامل تھی، جس میں بمبئی اور ڈابھیل کا سفر بھی تھا، لہذا لکھنؤ سے شیخ الازہر، علامہ اعظمی اور کچھ دیگر فضلاء بذریعہ طیارہ عروس البلاد بمبئی تشریف لے گئے، اور پھر وہاں سے علامہ اعظمی کچھ پہلے اور ان کے بعد ۱۱/نومبر ۱۹۷۵ء مطابق ۶/ذی قعدہ ۱۳۹۵ھ کو شیخ الازہر ڈابھیل پہنچے، جامعہ تعلیم الدین میں ایک عظیم الشان جلسہ ہوا، جس کی صدارت علامہ اعظمی نے فرمائی، اس میں شیخ الازہر کو بطور اعزاز دستار فضیلت پیش کی گئی، شیخ الازہر کے سر پر اس دستار کو باندھنے کا شرف بھی علامہ اعظمی کو حاصل ہوا۔

شیخ الازہر نے اس موقع پر عربی زبان میں ایک تقریر بھی فرمائی، اردو میں جس کی ترجمانی علامہ اعظمی نے فرمائی، "تاریخ جامعہ تعلیم الدین ڈابھیل" میں مذکور ہے:

> "دنیا کی سب سے قدیم اور بڑی اسلامی یونیورسٹی "جامعہ ازہر مصر" کے شیخ ڈاکٹر عبدالحلیم محمود صاحب ۱۱/نومبر ۱۹۷۵ء ۶/ذی قعدہ ۱۳۹۵ھ کو جامعہ میں رونق افروز ہوئے، اس موقع پر ہندوستان اور گجرات کے دیگر اکابر علماء بھی تشریف فرما ہوئے، عوام کا ایک بہت بڑا مجمع اکٹھا تھا، مقامی علماء کے علاوہ محدث جلیل علامہ کبیر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی مدظلہ اور فدائے ملت حضرت مولانا اسعد مدنی مدظلہ اور جنرل شاہنواز صاحب خاص طور سے قابل ذکر ہیں، جلسۂ عام کی صدارت مولانا اعظمی صاحب نے فرمائی ... جامعہ کی طرف سے شیخ الازہر کو اعزازی عمامہ دیا گیا۔ اس "عمامة الفضيلة والتكريم" کو شیخ الازہر کے سر پر ہندوستان بلکہ دنیا کے مسلم ماہر حدیث مولانا

حبیب الرحمٰن مدظلہ نے باندھا، جس کو شیخ الازہر نے بخوشی قبول فرمایا۔۔۔ جامعہ کے اساتذہ اور طلبہ کے پروگرام کے بعد شیخ الازہر نے عربی زبان میں تقریر کی جس کی ترجمانی شیخ المشائخ حضرت مولانا اعظمی نے کی۔۔۔۔(۱)

کتنا عجیب و غریب و پر کیف اور روح پرور منظر رہا ہوگا! وقت کی دو عظیم ترین اور مقدس شخصیتوں کا اجتماع ہے، ایک طرف شیخ الازہر دوسری طرف شیخ العرب والعجم، ایک مملکت علم کا تاجدار، دوسرا علم کے تاج کا جوہر آبدار، ایک کا دست ناز ہے اور دوسرے کا سر نیاز، دست بھی مبارک! دستار بھی مبارک! سر بھی مبارک!!!

اس تقریب میں شیخ الازہر کے علاوہ مصر کے وزیر اوقاف شیخ محمد حسین ذھبی بھی تھے، وزیر موصوف نے تقریر کرتے ہوئے علامہ اعظمی کے بارے میں فرمایا کہ ہندوستان کے سب سے بڑے محدث ہیں، تو شیخ الازہر نے درمیان میں ٹوکا کہ عالم اسلام کے سب سے بڑے عالم ہیں ع: قدر جوہر شاہ داند یا بداند جوہری

ان تمام واقعات کے مولانا ابوبکر غازیپوری عینی شاہد تھے، میں نے ان سے اس تقریب کی تفصیلات دریافت کی تو انھوں نے ازراہ کرم پوری داستان تحریر فرمادی جوان ہی کے الفاظ میں حسب ذیل ہے:

"جامعہ ازہر کی تاریخ میں ڈاکٹر عبدالحلیم محمود جیسا شیخ الازہر بہت دنوں کے بعد ہمیں نظر آتا ہے۔ شکل وصورت، علم و تقویٰ، نگہ کی بلندی میں ڈاکٹر عبدالحلیم محمود منفرد شخصیت کے مالک تھے، تواضع وانکساری میں علماء ہند کے مثل نظر آتے تھے، غالباً انھیں خصوصیات کی وجہ سے محدث کبیر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی کا ان سے خاص ربط و تعلق تھا، اور شیخ الازہر بھی حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی بڑی قدر کرتے تھے، مولانا کی علمی بلندی کا بہت کشادہ دلی کے ساتھ اعتراف کرتے تھے، شیخ الازہر کے منصب جلیل پر

(۱) تاریخ جامعہ تعلیم الدین ڈابھیل ص ۱۸۳

ہوتے ہوئے حضرت مولانا کے سامنے بہت متواضع انداز میں بیٹھتے اور گفتگو کرتے تھے، اس کا مشاہدہ ہم نے خود اپنی آنکھوں سے اس وقت کیا جب وہ جامعہ اسلامیہ ڈابھیل تشریف لائے۔

۱۹۷۵ء میں ندوۃ العلماء لکھنؤ اپنا پچاسی سالہ جشن منا رہا تھا، جس میں شیخ الازہر ڈاکٹر عبدالحلیم محمود بھی شریک ہوئے تھے، حضرت مولانا اسعد مدنی کے توسط سے جامعہ اسلامیہ ڈابھیل نے بھی شیخ الازہر کو اس موقع سے اپنے یہاں مدعو کیا، شیخ الازہر کو یہ اطلاع کی گئی تھی کہ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی بھی اس موقع پر تشریف لائیں گے، غالباً یہی چیز ان کے لئے اس کا باعث بن گئی کہ انھوں نے جامعہ اسلامیہ ڈابھیل کی دعوت کو بلاتردد اور بڑی خوشی سے قبول کر لیا، حالانکہ اس قسم کے سرکاری پوسٹ کے آدمی کا پروگرام بڑا بندھا اور نپا تلا ہوتا ہے، مگر شیخ الازہر نے حضرت اعظمی رحمۃ اللہ علیہ کا نام سن کر جامعہ اسلامیہ ڈابھیل حاضر ہونے کی دعوت قبول فرمالی اور ۶/ ذی قعدہ ۱۳۹۵ھ مطابق ۱۱/ نومبر ۱۹۷۵ء براہ بمبئی جامعہ تشریف لائے، مولانا اعظمی رحمۃ اللہ علیہ دوروز قبل ہی آپ کی پیشوائی کے لئے ڈابھیل تشریف لاچکے تھے۔

شیخ الازہر کی آمد پر جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں ایک یادگار اور تاریخی اجلاس کا انعقاد ہوا تھا، جس کی صدارت حضرت اعظمی رحمۃ اللہ علیہ فرمارہے تھے، ہندوستان کی متعدد سرکاری و غیر سرکاری شخصیتیں موجود تھیں، آدمیوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر ڈابھیل کی سرزمین پر امڈا ہوا تھا، شیخ الازہر کی تقریر کا حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی رحمۃ اللہ علیہ نے خود ہی ترجمہ کیا اور دلچسپ بات اس ترجمہ کی یہ تھی کہ جب شیخ الازہر نے بعض عرب علماء کا تذکرہ کیا تو حضرت اعظمی رحمۃ اللہ علیہ نے ان علماء کی مزید

خصوصیات سے بھی سامعین کو محظوظ کیا، جب علامہ زبیدی (۱) کا تذکرہ آیا تو شیخ الازہر کو یہ معلوم نہیں تھا کہ علامہ زبیدی ھندی الاصل ہیں، حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب نے اس موقع سے عربی زبان میں دوران ترجمہ علامہ زبیدی کا مفصل تعارف کیا، اور جب یہ بتلایا کہ یہ اصلاً ہندی تھے تو شیخ الازہر اور ان کے رفقاء کی حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہی، اور مولانا اعظمی رحمۃ اللہ علیہ کے اس تعارف پر انھوں نے بطور خاص تشکر کا اظہار کیا، اس موقع سے ہم نے یہ بھی معلوم کیا کہ حضرت اعظمی رحمۃ اللہ علیہ جس طرح فصیح عربی لکھنے پر بلا تکلف قادر تھے، اسی طرح بلا تکلف عربی زبان میں آپ تقریر بھی کر سکتے تھے۔

---

(۱) آپ کا نام مرتضیٰ بن محمد بن قادری بن ضیاء اللہ حسینی واسطی بلگرامی ہے، ۱۱۴۵ھ م ۱۷۳۲ء میں بلگرام میں ولادت ہوئی، بلگرام کے علاوہ سندیلہ، سورت اور دہلی وغیرہ میں علم کی تحصیل کی ۱۱۵۸ھ میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کے ہاتھوں پر بیعت ہو کر نقشبندی سلسلے میں داخل ہوئے، پھر ۱۱۶۰ھ میں شیخ سید یٰسین عباسی نزیل اکبر آباد کے ہاتھوں پر سلسلہ چشتیہ سے بھی شرفیاب ہوئے، ۱۱۶۳ھ کے قریب جب کہ آپ کی عمر صرف اٹھارہ برس تھی، رخت سفر باندھا اور حجاز جاوارد ہوئے، اور زیارت حرمین کے علاوہ وہاں کے علماء سے اکتساب فیض بھی کیا، دو سال بعد وہاں سے رخصت ہو کر یمن کے مشہور شہر زبید پہونچے، اور ایک مدت تک وہاں مقیم رہے، جس کی وجہ سے زبیدی کی نسبت سے معروف ہوئے، ایک عرصہ کے بعد وہاں سے سفر کیا اور مصر پہونچ کر سکونت اختیار کی اور وہیں ۱۲۰۵ھ م ۱۷۹۰ء میں طاعون کی بیماری میں وفات پائی۔

علامہ بلگرامی ایک بلند پایہ ادیب، لغت کے نکتہ داں و رمز شناس، علم حدیث کے ماہر اور انساب و اسماء الرجال کے زبردست عالم تھے، متعدد کتابیں تصنیف فرمائیں جو کئی کئی جلدوں پر مشتمل ہیں، تصنیفات میں "تاج العروس" "امام غزالی کی "احیاء العلوم" کی شرح "اتحاف السادۃ المتقین" اور "عقود الجواہر المنیفۃ فی ادلۃ مذھب الامام أبی حنیفۃ" کو خاص شہرت حاصل ہوئی۔

دوران تقریر شیخ الازہر اس بات کا بار بار خوشی سے اظہار بھی کر رہے تھے، کہ ان کی ترجمانی ہندوستان ہی نہیں بلکہ عالم اسلام کا زبردست محدث اور عالم کر رہا ہے۔

شیخ الازہر کی تقریر سے پہلے مصر کے وزیر الاوقاف (شیخ محمد حسین ذھبی) نے تقریر کی تھی، انھوں نے دوران تقریر حضرت مولانا اعظمی رحمۃ اللہ کی طرف اشارہ کر کے یہ کہا، کہ یہ ہندوستان کے سب سے بڑے محدث ہیں جن سے ملنے کی ہمیں آج سعادت نصیب ہوئی ہے، اس پر شیخ الازہر ڈاکٹر عبدالحلیم محمود نے ان کو ٹوکتے ہوئے کہا کہ **بل إنه اکبر علماء العالم الاسلامی** (نہیں بلکہ وہ عالم اسلام کے سب سے بڑے عالم ہیں)۔

جامعہ اسلامیہ ڈابھیل نے اس موقع پر شیخ الازہر کو **عمامة الفضيلة والتكريم** دینے کا فیصلہ کیا تھا، جب یہ عمامہ حضرت اعظمی رحمۃ اللہ علیہ نے ان کے سر پر اپنے ہاتھ سے باندھا، تو شیخ الازہر نے فرط مسرت و عقیدت سے حضرت مولانا کا ہاتھ چوم لیا، اور جب تک آپ کا ڈابھیل میں قیام رہا یہ عمامہ آپ کے سر پر رہا، اور ہمارے دوستوں نے بتلایا کہ جب وہ بمبئی تشریف لے گئے تو اس وقت بھی عمامہ آپ کے سر پر رہا۔

شیخ الازہر عبدالحلیم محمود کا قیام تقریبا ایک دن ڈابھیل میں رہا۔ ان کا زیادہ وقت پروگرام کے علاوہ حضرت اعظمیؒ کے ساتھ گذرتا تھا، ہم لوگ دیکھ رہے تھے کہ مصر کی سب سے عظیم جامعہ کا سب سے عظیم منصب پر فائز آدمی ہندوستان کے ایک بوریہ نشیں کے سامنے کتنی عقیدت و محبت سے بیٹھا ہوا علمی استفادہ کر رہا ہے اور تواضع و ادب کا اظہار اس سے اس طرح ہو رہا ہے جیسے کسی بڑے عالم کے سامنے کوئی تلمیذ ہو۔""

☆☆☆

تلخیص خواتم جامع الاصول | یہ بھی علامہ محمد طاہر پٹنی کی علمی کاوش کا نتیجہ ہے، جامع الاصول حدیث کی ایک مشہور و مستند کتاب ہے، اس کے خاتمہ (اخیر) میں حدیث کی چھ مشہور درسی کتابوں (صحاح ستہ) کے راویوں کا مختصر تعارف کیا گیا ہے، علامہ شیخ محمد طاہر نے اسی کا خلاصہ بیان کیا ہے۔

علامہ اعظمی نے اس کا قلمی نسخہ رام پور اور ندوہ کے کتب خانے سے بر آمد کیا، اور بانکی پور سے اس کا فوٹو حاصل کر کے ایڈٹ کیا، ۱۳۹۵ھ میں پٹن کے ایک علم دوست اور مخیّر تاجر عبد الغنی نورولی کے نفقہ پر مالیگاؤں سے شائع ہوئی۔

علامہ اعظمی پر دل کا دورہ اور طویل علالت | اپنے عزیز ادارہ سے جدائی کوئی معمولی صدمہ نہیں تھا، علامہ اعظمی نے زندگی میں بہت سے مصائب و آلام جھیلے تھے، کہا جاتا ہے کہ اللہ کے نزدیک جو جتنا زیادہ متقرب ہوتا ہے اس کی آزمائش بھی اتنی ہی سخت ہوتی ہے، انھوں نے بھی اپنی زندگی میں بہت ہی آزمائشوں کا سامنا کیا تھا، لیکن اسی کے ساتھ اللہ جل شانہ نے صبر و تحمل اور ضبط و برداشت کی بے پناہ قوت عطا فرمائی تھی، سخت ترین حالات سے دو چار ہونے کے باوجود کبھی آپ کے حوصلوں میں پستی، ارادوں میں ضعف، عزائم میں اضمحلال اور پائے استقامت میں لغزش نہیں آئی، لیکن مفتاح العلوم کے پیش آمدہ واقعات، وہاں کی صورت حال اور اس سے مفارقت یہ ایسا غم تھا جو نا قابل برداشت تھا، بلکہ صرف ایک جدائی ہی کا صدمہ ہوتا تو جس طرح بہت سارے مصائب جھیلے تھے اسی طرح ایک دکھ اور سہا جا سکتا تھا، مگر ستم ظریفی یہ کہ کچھ سیاسی شعبدہ باز اور ان کے ایسے ہم نواؤں نے، تملق پسندی جن کا شعار اور کاسہ لیسی جن کی شریعت ہے۔ اس عظیم انسان کے خلاف ایسی ایسی الزام تراشیاں اور افترا پردازیاں کیں کہ الاماں والحفیظ! اور اسی پر بس نہیں بلکہ کچھ دریدہ ذہنوں نے تو ہرزہ سرائی اور یاوہ گوئی تک سے دریغ نہیں کیا۔ آخر یہ صدمہ اپنی انتہائی بھیانک اور خطرناک صورت میں اس وقت ظاہر ہوا جب ۲۰ / مئی ۱۹۷۶ء مطابق ۲۱ یا ۲۲ / جمادی الاولی

۱۳۹٦ھ کو نہایت زبردست اور جان لیوا قسم کا قلب کا دورہ پڑا، اپنے ایک عرب نیاز مند کو لکھتے ہیں:

"وإني مريض على الفراش، وقد كانت أصابتني نوبة قلبية في ۲۰ مايو، وكانت شديدة . لكن الله تعالى قد من عليّ بالشفاء"

(میں اس وقت صاحب فراش ہوں، ۲۰؍ مئی کو مجھے دل کا شدید دورہ پڑا تھا، لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے شفا بخشی)

اس عارضہ کی شدت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ مہینوں تک اس کے اثرات زائل نہیں ہوئے، چنانچہ اس حادثے کے ایک مہینے بعد ۲۱؍ جون ۱۹۷٦ء کو شیخ الازہر ڈاکٹر عبدالحلیم محمودؒ کو لکھتے ہیں:

"... فإني لا أزال أعاتب نفسي على عدم الاتصال بكم منذ فارقتكم في ڈابهيل، وذلك لانصرافي بالكلية الى إكمال بعض ما تركته نا قصا من تحقيق زوائد مسند البزار و غير ذلك، وإعادة النظر في بعض المسودات وابتلائي في اثناء ذلك بمختلف الأسقام حتى كانت آخر حملة للمرض في ۲۰؍ مايو حيث أصبت بنوبة قلبية شديدة الخطر، لكن الله سبحانه تداركني بلطفه، وأنعم عليّ بالشفاء العاجل؛ فصرت أصلي قاعدا بعد شهر ..."

(میں خود کو برابر اس بات پر ملامت کر رہا ہوں کہ ڈابھیل میں آنجناب سے جدا ہونے کے بعد آپ سے کوئی رابطہ نہیں قائم کر سکا، اور یہ زوائد مسند بزار وغیرہ کے بعض حصوں کی تحقیق کو جو ناقص چھوڑ دیا تھا ان کی تکمیل، کچھ مسودات پر نظر ثانی اور مختلف بیماریوں میں مبتلا رہنے کی وجہ سے تھا، یہاں تک کہ بیماری کا آخری حملہ ۲۰؍ مئی کو ہوا جبکہ میرے اوپر دل کا نہایت خطرناک دورہ پڑا، لیکن اللہ پاک نے لطف وکرم کا معاملہ فرمایا، اور جلد شفا عطا

فرمائی، لہذا ایک ماہ بعد اب میں اس قابل ہو گیا ہوں کہ بیٹھ کر نماز پڑھ سکوں ...)

علامہ اعظمی پر طاری ہونے والے یہ لحات متعلقین کے لئے بھی قیامت سے کم نہیں تھے، ہر آدمی حواس باختہ اور از خود رفتہ، ہر چہرہ حیران و پریشان اور ہر شخص متفکر کہ نہ جانے تقدیر الٰہی سے کیا فیصلہ ہو، لیکن خدا کا کرم ہوا کہ کئی روز کی شدید ترین علالت کے بعد قدرے افاقہ ہوا اور مرض کی شدت میں کچھ کمی آئی، اسی اثناء میں ایک اہم واقعہ یہ پیش آیا کہ ایک دن قلم کاغذ طلب فرمایا، سب نے یہ سمجھا کہ شاید اب زندگی کے آخری لحات ہوں اور بطور وصیت کچھ کلمات ارشاد فرمائیں، بڑے صاحبزادے مولانا رشید احمد صاحب اعظمی قرطاس و قلم لے کر حاضر خدمت ہوئے، لیکن آپ کی زبان فیض ترجمان سے جو کچھ نکلا، عشق رسول اور حب نبی کا واضح اور سچا ثبوت تھا، آپ نے موت و زیست کی اس کشمکش میں جو املا فرمایا وہ ایک نعت نبیؐ تھی، جس کے ابتدائی دو اشعار ہدیۂ ناظرین ہیں:

میں والہ و شیدا ہوں نبی عربیؐ کا مکی، مدنی، ہاشمی و مطلبی کا
ایماں ہے مرا زمزمہ خواں صدر خلافت صدیق، عمر، حضرت عثمان و علی کا

یہ پوری نعت علم و حکمت کے نور سے بھرپور ہے، اور جس حالت میں اس کو املا کرایا ہے اس حالت میں اس مضمون کا ذہن میں آنا اس مقرب بارگاہ خداوندی کی کھلی کرامت ہے۔ پوری نعت شاعری کے باب میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔

اعیان الحجاج ۱۳۹۶ھ مطابق ۱۹۷۶ء میں "اعیان الحجاج" کا دوسرا حصہ اسرار کریمی پریس (الہ آباد) سے چھپ کر مکتبۂ اعظمی (مئو) سے شائع ہوا، اس میں آپ نے تابعین سے لے کر اپنے اساتذہ تک کے واقعات حج کا تذکرہ کیا ہے، یہ وہ ایمان افروز واقعات ہیں جن کو پڑھنے سے دل کے اندر حج و زیارت کا ولولہ پیدا ہوتا ہے۔

xxxxx

سفر شام علامہ اعظمی اپنی یادداشت میں لکھتے ہیں:

"۱۳۹۸ھ ۲۵؍ ستمبر ۱۹۷۸ء کو دہلی سے دمشق کے لئے سیرین ایر لائن کے جہاز سے سفر کیا، ابوظبی میں ۳۔ گھنٹے جہاز رکا رہا، پھر ۱۵۔ منٹ دبئی میں، دہلی سے ۴۔ بجے آخر شب میں روانگی ہوئی، اور دمشق میں ۱۲۔ بجے وہاں کے ٹائم سے پہونچے، دمشق میں ۲۔ دن قیام کے بعد حلب روانہ ہوا..."

اس سفر کی نوعیت بیروت کے سفر سے مختلف تھی، اس میں آپ کے اوپر کام کا وہ بوجھ نہیں تھا، جو بیروت کے پورے سفر کا لازمہ تھا، یہ سفر شامی ارباب علم و فضل اور عقید تمندوں کی دعوت و اصرار پر محض دید و زیارت، ترویح نفس اور تسکین خاطر کے لئے تھا، علامہ اعظمی کو اللہ نے عجیب و غریب مقبولیت عطا فرمائی تھی کہ ان کے محبین و مخلصین نہ صرف بر صغیر اور عالم عرب، بلکہ تمام عالم اسلامی، بلکہ پوری دنیا میں پائے جاتے تھے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان سے جس قدر محبت و مودت شامیوں کو تھی کسی اور جگہ کے لوگوں کو نہ رہی ہوگی، شام کے تقریباً تمام نامور اصحاب فضل و کمال آپ کے معترف و مداح تھے، ان میں سے کئی ایک ایسے ہیں جن کی محبت، گرویدگی کی حد تک تھی، انھیں میں ایک شیخ عبدالوہاب زاہد ہندی حلبی بھی ہیں، جنھوں نے آپ کو حلب آنے کی دعوت دی، علامہ اعظمی اپنے ایک خط میں شیخ نذیر حسین صاحب لاہور کو لکھتے ہیں:

"حلب سے میرے ایک شاگرد عبدالوہاب زاہد ہندی کئی سال سے حلب بلا رہے تھے، میری روانگی سے اڑھائی سال پہلے ہوائی جہاز کا ٹکٹ بھی بھیج دیا تھا، مگر جس وقت ٹکٹ آیا تھا، عین اسی وقت مجھے ہارٹ اٹیک ہو گیا تھا، صحتیاب ہونے کے بعد یہ سفر زیادہ تر احتیاط کے پیش نظر ٹلتا رہا، میں ستمبر میں جمعیۃ العلماء کی ورکنگ کمیٹی میں شرکت کے لئے دہلی گیا ہوا تھا تو جی میں آیا کہ لاؤ ویزا حاصل کرنے کی دوبارہ کوشش کروں، اس لئے کہ ایک بار ویزا کی میعاد گذر چکی تھی، بہر حال مہربانوں نے بہت دوڑ دھوپ کی تو ویزا مل گیا،

جس دن ویزا ملا اسی دن سیرین ایرلائنز کے ہوائی جہاز کی روانگی بھی تھی، کوشش کرتے کراتے کسی طرح جگہ مل گئی اور میں دفعتاً بلا اطلاع دمشق کے لئے روانہ ہوگیا، سفر کا مقصد میری طرف سے "لقاءات علمیہ" اور چند مخطوطات کی جستجو اور اگر امکان ہو تو ان کو حاصل کرنے کی کوشش کے سوا اور کوئی چیز نہیں تھی، ویسے جانے پر حلب کے علاوہ دمشق، حمص اور حما کے بکثرت علماء نے حدیث کی سند اور اجازت حاصل کیا، دو تین مجلسوں میں مختصر خطاب کی بھی نوبت آئی، زیادہ تر مشغولیت کتب خانہ احمدیہ میں رہی، چند عالموں نے اپنے مؤلفات سنا کر یا دکھا کر تصحیح و تصویب بھی کرائی۔"(۱)

شام میں آپ کی موجودگی وہاں کے اہل علم کے لئے ایک بڑی نعمت تھی، جن شامی فضلاء نے آپ سے کسب فیض کیا اور سند و اجازت حاصل کی ان کی ایک طویل فہرست ہے ،اس سفر میں شام کے مختلف شہروں اور تاریخی مقامات کا مشاہدہ کیا، لیکن بیشتر مدت علم و فن کے مشہور مرکز حلب میں گذری ،جو فتوحات اسلامیہ کے عہد سے لے کر عصر حاضر تک لاتعداد اجلۂ اہل علم کا مولد و مسکن رہا ہے ،اور جو موجودہ دور کے مشہور و نامور عالم و محدث علامہ شیخ عبدالفتاح ابوغدہ رحمۃ اللہ علیہ کی جائے ولادت بھی ہے۔

شیخ عبدالوہاب زاہد کا قیام حلب کی جامع البختی میں تھا، علامہ اعظمی جب وہاں پہنچے ہیں تو وہ موجود نہیں تھے، اپنی قیامگاہ پہنچ کر جب علامہ اعظمی کو دیکھا ہے تو ان کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا، انھوں نے (شیخ عبدالوہاب نے) اپنی ایک یادداشت میں لکھا ہے:

" وصلنا حلب مع أذان العصر و دخلنا جامع البختي فإذا بالحبيب المنتظر داخل غرفتي المتواضعة التي يحيط جدرانها

(۱) معارف اگست ۱۹۹۲ء ص ۱۴۹-۱۴۸

الكتب الخاصة بی، فأقبلت اليه معانقاً وقبلت يده ، ثم عانقه الشيخ محمد عوامه و قبل يده ثم عانقه الحاج محمود صيفجي وقبل يده ثم تحدثنا قليلا وصلينا العصر بجماعة بإمامة الشيخ حبيب الرحمن ، حيث صلى ركعتين صلاة قصر للمسافر و أتممنا صلاتنا ، ثم عدنا الى الغرفة ويظهر على اليشخ التعب والنصب ، و أحضرت طعام الغداء و تناولنا جميعا بفضل الله ،و تم الاتفاق على أن ياخذ الشيخ راحته هذااليوم من وعثاء السفر .

(ہم عصر کی اذان کے ساتھ ساتھ حلب پہنچے اور جامع بختی میں داخل ہوئے، اچانک ہم دیکھتے کیا ہیں کہ وہ محبوب (علامہ اعظمی) جن کا ہمیں انتظار تھا، میرے اس معمولی کمرے میں تشریف فرما ہیں، جس کی دیواروں کا میری ذاتی کتابیں احاطہ کئے ہوئے ہیں، میں نے ان کی طرف بڑھ کر معانقہ کیا اور دست بوسی کی، پھر شیخ محمدعوامہ اور ان کے بعد الحاج محمود صیفجی نے ان سے معانقہ کیا اور ان کے ہاتھ چومے، پھر تھوڑی دیر ہم نے گفتگو کی اور شیخ حبیب الرحمٰن الاعظمی کی امامت میں عصر کی نماز باجماعت پڑھی انھوں نے قصر کیا اور دو رکعت پڑھی اور ہم نے اپنی نماز پوری کی، پھر ہم کمرے میں گئے، شیخ پر تکان کے آثار نمایاں تھے، میں نے دوپہر کا کھانا حاضر کیا اور خدا کے فضل سے ہم سب نے ساتھ بیٹھ کر کھایا، پھر اس بات پر اتفاق ہوا کہ شیخ آج کے دن آرام کر کے سفر کی تھکان دور کریں۔)

"آپ حلب پہنچے تو جمعرات کا دن تھا، اگلے روز جمعہ تھا،" ان کی بابت شیخ عبدالوہاب لکھتے ہیں:

"استيقظنا قبيل الفجر . ثم صلينا صلاة الفجر ، و جلسنا بخدمة الشيخ حبيب الرحمن الأعظمي حفظه الله ، ثم جاء فضيلة

الاستاذ محمد عوامه الساعة العاشرة مع الدكتور ابوالفتح بيانونى وتشاورنا معاً على صلاة الجمعة وفى أى مسجد تكون ، وقالوا لو كانت الصلاة فى جامع الروضة عند فضيلة الشيخ طاهر خير الله ، وحضر عددمن الناس يسلمون على فضيلة الشيخ ، و بعد ذلك جهز الشيخ نفسه للذهاب الى صلاة الجمعة وانطلقنا بسيارة الأخ الحاج محمود صيفجى إلى جامع الروضة . و تم التعارف بين الشيخ حبيب الرحمن والشيخ طاهر قبيل الصلاة ، وأذن الموذن أذان الجمعة ، و صعد الشيخ طاهر و خطب بنا الجمعة . . . و بعد انتهاء الخطبة والصلاة قام الشيخ طاهر و عرّف الناس بالمحدث الكبير والضيف الكريم فريد عصره ، ثم طلب منه أن يدعو الله لنا وللحاضرين فى هذا الجامع الممتلئ بالمصلين ، فقام فضيلته و شكر الناس على حفاوتهم به ، ثم دعا الله دعوة ذرفت منها العيون وخشعت لها القلوب ."

(فجر سے کچھ پہلے ہم بیدار ہوئے ، پھر فجر کی نماز پڑھی اور شیخ حبیب الرحمٰن الاعظمی حفظہ اللہ کی خدمت میں حاضر ہوئے، دس بجے ڈاکٹر ابوالفتح بیانونی کے ہمراہ شیخ محمد عوامہ آگئے، ہم نے جمعہ کی نماز کی نسبت مشورہ کیا کہ کس مسجد میں پڑھی جائے، رائے یہ ہوئی کہ شیخ طاہر خیر اللہ کے پیچھے روضہ کی جامع مسجد میں نماز ادا کی جائے اور لوگ حضرت مولانا سے سلام بھی کرلیں، اس کے بعد شیخ نے خود کو نماز جمعہ کے لئے تیار کیا اور ہم لوگ الحاج محمود صیفجی کی کار سے جامع مسجد پہنچے، نماز سے کچھ پہلے شیخ حبیب الرحمٰن اور شیخ طاہر کے مابین تعارف ہوا، موذن نے اذان دی اور شیخ طاہر نے منبر پر چڑھ کر خطبہ دیا، خطبہ اور نماز کے ختم ہونے پر شیخ طاہر کھڑے ہوئے اور لوگوں سے محدث کبیر، مہمان مکرم

اور یکتائے روزگار شخصیت کا تعارف کرایا، پھر ان سے درخواست کی کہ نمازیوں سے بھری ہوئی اس جامع مسجد کے اندر ہمارے اور حاضرین کے لئے اللہ سے دعا فرمائیں، تو حضرت کھڑے ہوئے اور لوگوں کی عزت افزائی کا شکریہ ادا کیا، پھر اللہ تعالیٰ سے دعا کی جس سے آنکھیں اشکبار ہو گئیں اور دلوں پر خشوع طاری ہو گیا)

شام میں آپ کی مدت قیام سوا مہینہ رہی، اس عرصے میں بہت سے اہل علم اور اصحاب کمال نے آپ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا اور اپنے اپنے طور پر فائدہ اٹھایا، ان ہی میں محقق فاضل شیخ محمد عوامہ مدظلہ ہیں، موصوف اس وقت حلب کے مدرسۃ التعلیم الشرعی میں استاذ تھے، وہ شیخ عبدالفتاح ابو غدہ علیہ الرحمۃ کے شاگرد ہیں، اور اپنے استاذ ہی کی طرح علامہ اعظمی کے شیفتہ و وارفتہ، ممکن ہے علامہ اعظمی کی عقیدت و محبت کا سبق بھی اپنے انھیں استاذ کی درسگاہ میں پڑھا ہو، جب علامہ اعظمی حلب پہونچے تو اس موقع کو غنیمت کبریٰ سمجھا اور اپنی تصنیف " أثر الحديث فى اختلاف الفقهاء والمحدثين "جو پریس میں جانے کو تیار تھی، لیکر حاضر خدمت ہوئے، اور اس کو آپ کے پاس سبقاً سبقاً پڑھا، چنانچہ اس کے صفحہ ۱۴ پر لکھتے ہیں:

"وفى يوم الخميس السادس والعشرين من شوال للعام المذكور قدم بلدتنا حلب فضيلة العلامة الكبير، المحدث البارع النبيل مولانا الشيخ حبيب الرحمن الأعظمي، من كبار علماء الهند، حفظه الله تعالىٰ بخيرو عافية ، فسررت أنى لم اكن قدّمت الرسالة الى المطبعة ، فقرأتها كلها على سماحته . . ."

(سال مذکور (۱۳۹۸ھ) میں ۲۶ر شوال بروز جمعرات ہمارے شہر حلب میں فضیلت مآب علامہ کبیر، محدث ماہر و نبیل مولانا شیخ حبیب الرحمٰن الاعظمی حفظہ اللہ جو ہندوستان کے کبار علماء میں سے ہیں، تشریف لائے، میں

بہت خوش ہوا کہ کتاب ابھی پریس کے حوالے نہیں کی تھی، اس وقت میں نے آپ کی جناب میں پوری کتاب پڑھی۔۔۔۔)

اوپر ہم لکھ چکے ہیں کہ حلب شیخ ابو غدہ کا وطن اور جائے پیدائش تھی، شیخ ابو غدہ کو علامہ اعظمی سے محبت و گرویدگی ناقابل بیان حد تک تھی، وہ عالم عرب میں علامہ اعظمی کے بہت بڑے معترف اور مداح تھے، علامہ اعظمی کے حلب پہنچنے پر شیخ ابو غدہ کی فرحت و مسرت کی انتہا نہ رہی ہوگی، ۲۵/ذی قعدہ ۱۳۹۸ھ کو حلب ہی میں انھوں نے علامہ اعظمی کو ایک کتاب ہدیہ کی، کتاب کی پیشانی پر ہدیہ کی جو عبارت تحریر فرمائی اس سے آپ کی خوشی صاف چھلکی پڑتی ہے، وہ عبارت ہے:

" هدية متواضعة مقدمة الى شيخنا العلامة المحدث الناقد الضليع مولانا الشيخ حبيب الرحمن الاعظمي تذكاراً لتشريفه بالزيارة بلاد الشام و تكريمه مدينة حلب بمقامه فيها ، أمتع الله به و أكرم المسلمين بطول حياته النافعة و آثاره الماتعة . آمين ، من محبه عبدالفتاح ابو غده . "

(اپنے شیخ علامہ محدث، ناقد ماہر مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی کی خدمت میں ایک حقیر ہدیہ، ملک شام کو اپنی تشریف آوری سے مشرف فرمانے اور حلب کو اپنے قیام سے عزت بخشنے کی یادگار کے طور پر، اللہ تعالیٰ ان سے فائدہ پہنچائیں، اور ان کی نفع بخش زندگی اور مفید کارناموں کی درازی سے مسلمانوں کو مشرف فرمائیں، آمین۔ ان سے محبت کرنے والے عبدالفتاح ابو غدہ کی طرف سے)

اس سفر میں علامہ اعظمی نے حلب کے علاوہ شام کے کئی ایک مشہور مقامات و زیارت گاہوں کی زیارت فرمائی، اور بہت سے صحابۂ کرام اور علمائے امت کی قبروں پر فاتحہ خوانی بھی کی، ایک کاغذ پر خود ان کی تحریر ہے:

"زرت في يوم الجمعة ٢/ ذى الحجة سنة ١٣٩٨ھ في دمشق الفيحاء ، قبر سيدنا بلال الحبشي رضي الله عنه، وقبر سيدنا عبدالله بن جعفر في مقبرة الباب الصغير ، ثم قبرالشيخ المحدث بدرا لدين الحسنى ، وقبر ولده تاج الدين، وقبر الشيخ ابراهيم الغلاييني، وقبر الشيخ مصطفى السباعى ، والشيخ عبدالكريم الرفاعى في نفس المقبرة، رحمهم الله تعالىٰ ثم مدفن الصحابى أبى بن كعب رضى الله عنه فى الباب الشرقى ، ثم مدفن سيدنا دحية الكلبى في المزة ، ومدفن سعد بن أبى وقاص في المزة، ثم زرت في الصالحية أوحى الشيخ محى الدين بن عربى قبره ، في قبو بجوار جامع باسمه، و لقد زرت قبله بيومين بحمص مقام سيدنا خالد بن الوليد في جامع ضخم بناه السلطان الزاهد بيبرس في المائة السابعة

وقد سافرت قبل هذا من حلب الىٰ اللاذقية ،و من اللاذقية الى جبلة ، وزرت مقام سيدنا ابراهيم بن ادهم في الناحية الشرقية من الجامع ."

(۲/ذی الحجہ ۱۳۹۸ھ کو جمعہ کے دن میں نے دمشق میں باب صغیر کے قبرستان میں سیدنا بلال حبشی رضی اللہ عنہ اور سیدنا عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ کی قبروں کی زیارت کی، پھر اسی قبرستان میں شیخ بدرالدین حسنی محدث، ان کے فرزند شیخ تاج الدین، شیخ ابراہیم غلایینی ، شیخ مصطفیٰ سباعی اور شیخ عبدالکریم رفاعی رحمھم اللہ کی قبروں کی زیارت کی، پھر باب شرقی کے قبرستان میں صحابی رسول ابی بن کعبؓ اور مزہ میں سیدنا دحیہ کلبی اور حضرت سعد بن ابی وقاص(رضی اللہ عنہم)کی قبروں کی زیارت کی ، اس کے بعد صالحیہ

یا شیخ محی الدین بن عربی کے محلہ میں ان کی قبر کی زیارت کی، جو ان کے نام سے موسوم ایک جامع مسجد کے بغل میں ایک قبہ کے اندر واقع ہے ، اور اس سے دو دن پہلے میں حمص میں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے مقام کی زیارت ایک عظیم الشان جامع مسجد میں کر چکا تھا، جس کو پرہیزگار بادشاہ سلطان بیبرس نے ساتویں صدی ہجری میں بنوایا تھا۔

اور اس سے بھی پہلے میں نے حلب سے لاذقیہ اور لاذقیہ سے جبلہ تک کا سفر کیا تھا اور وہاں جامع مسجد کے مشرقی حصہ میں حضرت ابراہیم بن ادہم کی قبر کی زیارت کی تھی)

ایک دوسرے کاغذ پر لکھا ہے :

"عبدالستار وزیر اوقاف شام سے ملاقات ہوئی۔

بذریعہ کار لاذقیہ گیا، وہاں سے بس پکڑی اور جبلہ گیا، ابراہیم ادہم کے مزار کی زیارت کی، بحر ابیض کے کنارے بیٹھ کر کھانا کھایا، پھر بس سے لاذقیہ اور لاذقیہ سے دوسری بس پر حلب آیا۔

جامع اموی (حلب) کے مغرب اور جنوب میں جو قدیم مدارس واقع ہیں ان کو دیکھا۔"

اس سفر میں حلب و دمشق میں جن لوگوں سے آپ کی ملاقات ہوئی اور جن میں سے اکثر نے آپ سے اجازت و سند حاصل کی، ان کی خاصی تعداد ہے، مثلا: شیخ عبداللہ ناصح علوان، شیخ محمد عوامہ، شیخ ابوالفتح بیانونی، شیخ عبدالوہاب زاہد ہندی، شیخ طاہر خیر اللہ، شیخ محمد علی ادلبی، شیخ ساریہ عبدالکریم رفاعی اور ان کے برادران اسامہ اور عبداللہ رفاعی، شیخ جمال سیروان، شیخ وہبی سلیمان، شیخ نورالدین عتر، شیخ عبدالرؤف ابوطوق دمشقی اور ان کے علاوہ بہت سے دیگر فضلانے بھی حدیث کی اجازت لی۔

دمشق میں شیخ محمد ابوالیسر عابدین(۱) ایک بڑے عالم و فاضل شخص تھے ،

(۱) شیخ ابوالیسر عابدین مفتی شام ابوالخیر عابدین کے بیٹے تھے ،اپنے والد کی طرح یہ بھی شام کے مفتی ہوئے ،اس کے علاوہ ڈاکٹر بھی تھے ،اور دمشق کے کلیۃ الحقوق (Law College) میں استاذ بھی ،وہیں عربی زبان کے صاحب طرز ادیب شیخ علی طنطاوی ان کے زمرۂ تلامذہ میں داخل ہوئے ، علی طنطاوی نے اپنے ان استاد کا اپنی کتاب "ذکریات" میں کئی جگہ ذکر کیا ہے ، مثلاً حصہ اول میں صفحہ ۴۰ پر ان کا تذکرہ ضمناً کیا ہے ، پھر (۱۶۶/۲) پر کلیۃ الحقوق کے اپنے اساتذہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:" وطائفة من العلماء منهم واحد كان مفتي الشام ، وكان أبوه من قبله مفتي الشام ، وكان يدرس لنا الاحوال الشخصية (أحكام الزواج والطلاق وما يتصل بهما) والفرائض والوصايا و أصول الفقه ، وهو النموذج الكامل لعلماء القرن الماضى وهو الشيخ ابو اليسر عابدين۔" (علماء کی ایک جماعت تھی جن میں ایک مفتیٔ شام بھی تھے، اور ان سے پہلے ان کے والد مفتی شام رہ چکے تھے ، وہ ہمیں پرسنل لاء (نکاح وطلاق اور اس سے متعلق احکام) فرائض ، وصایا اور اصول فقہ پڑھاتے تھے ، وہ گزشتہ صدی کے علماء کا کامل نمونہ تھے ، اور وہ شیخ ابوالیسر عابدین ہیں) وسعت مطالعہ کے ساتھ بڑے ہی ولولہ وشوق کے آدمی تھے ، طنطاوی لکھتے ہیں :" قرأ على أبيه الشيخ أبى الخير عابدين الحاشية مثلاً ، باجزائها الخمسة الكبار ثلاث مرات ، و أقرأها من بعد أكثر من ثلاث عشرة مرة "(۱۶۸/۲) مثال کے طور پر انھوں نے اپنے والد شیخ ابوالخیر عابدین کے پاس حاشیہ کی پانچوں جلدیں تین مرتبہ پڑھیں ، اور تیرہ سے زائد دفعہ اس کو پڑھایا بھی ہے ، علم وتفقہ کا حال یہ تھا:" كان الشيخ ابو اليسر فهرساً ناطقا (كمبيوتر) لكتب الفقه الحنفى ، تسأله عن المسألة فيدلك على موضعها من الكتاب التى هى فيه كأنه هو الذى وضعها بيده ."(۱۶۸/۲) (شیخ ابوالیسر فقہ حنفی کی کتابوں کا کمپیوٹر تھے ، ان سے کسی مسئلہ کی نسبت پوچھو تو اس کی کتاب میں ایسے ہی نشاندہی کرتے گویا خود انھیں نے اسے لکھا ہے) شیخ ابوالیسر بڑے کمال کے آدمی تھے ، وہ ڈاکٹر بھی تھے ، مگر ڈاکٹری انھوں نے کب پڑھی تھی ؟ اور کیونکر پڑھی تھی؟ اس کا عجیب وغریب قصہ ہے! جس وقت وہ کلیۃ الحقوق میں فرائض تدریس انجام دے رہے تھے ان ہی دنوں ان کو ڈاکٹری پڑھنے کا شوق پیدا ہوا ، لیکن مشکل یہ تھی کہ میڈیسن کی تمام کتابیں شام میں فرنچ زبان میں پڑھائی جاتی تھیں ، کیونکہ اس وقت شام فرانسیسیوں کے زیر تسلط تھا ، اور شیخ ابوالیسر کو =

=فرنچ زبان آتی نہیں تھی، اس مشکل کا حل انھوں نے کیا نکالا، طنطاوی لکھتے ہیں:" لقد كان أستاذاً في كلية الحقوق ، فخطر له أن يدرس الطب ، ودراسة الطب لا تتم إلا بمعرفة اللغة الفرنسية ، فتعلمها و صار طالباً نظامياً في (الطب) وهو أستاذ يدرس في (الحقوق) حتى حاز شهادة (دكتور في الطب) سنة ١٩٢٦ ،" (٢/ ١٦٩)(وہ لا کالج میں استاذ تھے، اس وقت انھیں طب پڑھنے کی سوجھی، اور فن طب فرانسیسی زبان کے علم کے بغیر حاصل نہیں کیا جا سکتا تھا، لہذا پہلے انھوں نے فرانسیسی پڑھی، پھر یہ ہوا کہ وہ میڈیکل میں باقاعدہ طالب علم تھے اور لاء میں استاذ، یہاں تک کہ ۱۹۲۶ء میں ڈاکٹر آف میڈیسن کی سند حاصل کرلی)ڈاکٹری کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد انھوں نے کلینک(Clinic)کھولا، اور اب وہ اپنا کلینک بھی دیکھتے تھے، لاء کالج میں پڑھاتے بھی تھے، اور اسی پر بس نہیں، درس وافادہ کا سلسلہ کہاں تک پھیلا ہوا تھا! جدید و قدیم اور دین ودنیا میں کس طرح ربط پیدا کیا طنطاوی نے لکھا ہے:" وله حلقة في جامع الورد الذي يؤم فيه ويخطب الجمعة ، وكان يفتي المستفتين ، و يقرئ في داره من يقصده من طلبة العلم." (٢/ ١٦٩) (جامع الورد میں، جس کے وہ امام وخطیب تھے، ان کا حلقہ لگتا، اور مسئلہ پوچھنے والوں کو مسائل بتلاتے، اور ان کے گھر اگر کوئی طالب علم آجاتا تو اس کو بھی پڑھاتے)ان مشاغل کے ساتھ ان کی ایک مصروفیت یہ بھی تھی " كانت له مكتبة كبيرة فيها الكثير من المخطوطات النادرة ، فهو يعكف عليها، يقرأ دائما و يكتب " (٢/ ١٦٩)(ان کی ایک بڑی لائبریری تھی، جس میں بہت سے نادر مخطوطات تھے، وہاں وہ ہر وقت کتابوں پر جھکے لکھا پڑھا کرتے)تصنیف و تالیف کا اتنا ستھرا ذوق اور ایسی قوت و قدرت کہ بقول طنطاوی: ترك ثلاثين مؤلفا مكتوبة بخطه رأيتها و كتبت عنها في جريدة الأيام الدمشقية في ١٨/ ٥/ ١٩٦١ "(۱۶۹/۲)(۳۰ کتابیں اپنے ہاتھ کی لکھی ہوئی چھوڑیں، جن کو میں نے بچشم خود دیکھا ہے، اور دمشق سے نکلنے والے اخبار" الأيام" میں ۱۸/ مئی ۱۹۶۱ء کو ان پر لکھا بھی ہے) ان تمام خوبیوں کے ساتھ علم اتنا ٹھوس اور تاریخ پر دستگاہ ایسی کہ ان کی کتاب " اغاليط المؤرخين" کی داد تحسین علامہ اعظمی نے ان الفاظ میں دی ہے:" وہ کتاب اس قابل ہے کہ اس کا اردو ترجمہ بار بار شائع کیا جائے"(المآثر ج ۳ ش ۲ ص ۶۴) اس بات کا افسوس ہے کہ ان کی تصنیفات میں اس کتاب کے علاوہ کوئی اور چھپ نہ سکی، سال ولادت ۱۳۰۰ھ اور سال وفات ۱۳۸۰ھ ہے(امداد الفتاح ص ۱۹۹،۳۵۸)۔

یہ علامہ ابن عابدین شامی کے بھائی کے پوتے اور ماہر طبیب و معالج تھے، اور کافی ضعیف اور سن رسیدہ ہو چکے تھے، علامہ اعظمی نے ان کے گھر واقع حی الورد میں جا کر ان سے ملاقات کی، اس وقت شیخ ابوالیسر نے اپنی معرکۃ الآراء کتاب "أغاليط المؤرخين" جو علامہ اعظمی کی پسند فرمودہ بھی ہے، ہدیہ کی اور اس کی پیشانی پر اہداء کی یہ عبارت تحریر فرمائی:

"تقدمة تذكار ومودة لسيادة الشيخ حبيب الرحمن الأعظمي رجاء دعوة صالحة، مع اسبال ذيل الستر على هفواتي المعتادة، نسأله تعالى ... والرضا مع حسن الختام بجاه النبي عليه الصلوٰة والسلام.

محمد ابو اليسر عابدين ٥/ ذى الحجة سنة ١٣٩٨

٦/ تشرين ثاني سنة ١٩٧٩

ساتواں حج دمشق سے ۶/ نومبر ۱۹۷۸ء م ۶/ ذی الحجہ ۱۳۹۸ھ کو حج کے ارادہ سے جدہ کے لئے روانہ ہوئے، سفر شام کے شروع میں جس یادداشت کا تذکرہ ہے، اس کے آگے لکھتے ہیں:

"دمشق میں ۲۔ دن قیام کے بعد حلب روانہ ہوا، وہاں تقریباً سوا مہینہ رہ کر ۶۔ نومبر ۱۹۷۸ء مطابق ۶/ ذی الحجہ ۱۳۹۸ھ دمشق سے بذریعہ سعودی ایرلائنز جدہ روانہ ہوا، ایک بجے رات میں مکہ مکرمہ پہونچا، ۲۲/ ذی الحجہ کو مدینہ منورہ روانہ ہوا، ۳۰ کو ہوائی جہاز سے جدہ آیا، ۲/ محرم ۱۳۹۹ھ کو جدہ سے بمبئی آیا، دس بجے رات میں بمبئی پہونچا تھا، ۵/ کو بمبئی سے چل کر ۷۔ کو ۴۔ بجے شب میں مئو آیا۔"

اس سفر میں سعادت حج سے مشرف ہونے کے علاوہ غالباً رابطہ عالم اسلامی کی کانفرنس میں بھی شریک ہوئے، کیونکہ آپ کے پاسپورٹ پر دمشق میں واقع سعودی کونسلیٹ کا جو ویزا لگا ہے، اس میں اوپر لکھا ہے: "لحضور مؤتمر رابطة العالم الإسلامي بجدة" یعنی جدہ میں ہونے والی رابطہ عالم اسلامی کانفرس میں شرکت کیلئے۔

المعہد العالی و مرقاۃ العلوم کی تاسیس | علامہ اعظمیؒ مفتاح العلوم کے واقعات

اور وہاں کے کرمفرماؤں کے لگائے ہوئے زخموں سے بہت دل برداشتہ اور کبیدہ خاطر ہو چکے تھے، آپ کے ساتھ جو کچھ پیش آیا تھا اور جو ناروا سلوک کیا گیا تھا وہ نہایت ہمت شکن اور حوصلہ فرسا تھا، ان کی جگہ اگر معمولی عزم و حوصلہ کا کوئی شخص ہوتا تو ان حالات کی تاب نہ لا سکتا، باوجودیکہ آپ ۸۰۔ سال کی عمر کو پہونچ چکے تھے، مگر حالات کے آگے سپر انداز نہیں ہوئے، اور درس وافادہ کا سلسلہ بہر صورت جاری رکھا، بقول شاعر:

ان کا جو کام ہے وہ اہل سیاست جانیں میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے

لہذا اس سلسلۂ درس وافادہ اور پیغام محبت کو جاری وساری رکھنے کیلئے ضعف و پیرانہ سالی کے باوجود ایک نئے کام کا آغاز کیا، اور اس کام کے لئے ایک ایسے ادارے کی بنیاد ڈالی جس کو اپنے طرز کا منفرد ادارہ بنانا چاہتے تھے، اس غرض کی تکمیل کے لئے اپنے مسکن سے قریب ہی چند بالشت زمین خریدی، اور کسی ظاہری اور دنیوی ساز و سامان کے بغیر صرف اللہ رب العزت پر توکل کرتے ہوئے "المعہد العالی للدراسات العلیا" کی طرح ڈالی ۔ کوئی شور ہوا نہ ہنگامہ، اشتہار چھپا نہ پمفلٹ تقسیم ہوا، نہایت خاموشی اور سکون، سادگی کے ساتھ، جو آپ کی طبیعت ثانیہ تھی ،اس کام کی ابتداء ہوئی ، لیکن اللہ تعالیٰ مسبب الاسباب ہے، اس نے اس ادارے کی تعمیر و ترقی کے لئے اسباب پیدا فرمائے، اس کے لئے آپ کا سب سے اہم اور بڑا اصول یہ تھا کہ حکومتی اور سرکاری امداد کے بغیر مسلمانوں کے چندے پر اس ادارہ کے قیام و بقاء کا انحصار ہو، اور دوسرا اہم اصول یہ تھا کہ جو تعلیم حاصل کی جائے وہ دنیوی مال و متاع اور حصول عز و جاہ کے لئے نہ ہو، بلکہ محض دین اور علم دین کی اشاعت و تبلیغ کے لئے ہو، اور اخلاص و نیک نیتی سب سے بڑا سرمایہ ہو، اخلاص و للہیت کی دعوت و تبلیغ آپ عمر بھر کرتے رہے اور اس نئے ادارے کے اساتذہ کو بھی آپ اسی کی تلقین کرتے رہے کہ ایک طالب علم اور عالم دین کی سب سے بڑی متاع اس کا خلوص اور نیک نیتی ہے۔

المعہد العالی کا قیام نہایت بلند اور عظیم مقاصد کے لئے ہوا تھا، اس سے آپ کا ارادہ یہ تھا کہ مدارس دینیہ کے فارغ التحصیل طالب علموں کو اعلیٰ تعلیم و تربیت کے ذریعہ درس و تدریس بحث و تحقیق، تصنیف و تالیف اور دعوت و تبلیغ جیسے مختلف شعبوں کے لئے تیار کریں، اور ان کی ٹریننگ اس نہج سے کریں کہ عصر حاضر کے چیلنجوں اور نت نئے مسائل کا مقابلہ کرتے ہوئے وہ اسلام اور علوم دینیہ کی صحیح طور پر خدمت بجالائیں، اس کے لئے علامہ اعظمیؒ نے خود ہی المعہد العالی کا نصاب ترتیب دیا، جو کتابیں دستیاب نہیں تھیں اسلامی اور عرب ممالک سے وہ کتابیں منگوائیں اور تن تنہا اس کام کا آغاز کر دیا۔ مدرسہ مفتاح العلوم کی تعمیر و ترقی میں آپ کے دور شباب کی امنگ اور جوش و جذبہ کار فرما رہا، تو یہاں نالہ سحر اپنا اثر دکھاتا رہا، آپ کے خلوص نیت اور اخلاص و للّٰہیت کی برکت تھی کہ مختصر سی مدت میں اس کی خوشبو دور دور تک پھیلی، اور اس دور انحطاط میں ایسے ادارے کے قیام پر اہل علم نے بڑی خوشی و مسرت کا اظہار کیا، چنانچہ مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانیؒ کو جب اس کی اطلاع ملی تو ۶ر جنوری ۱۹۸۰ کے ایک خط میں اپنی قلبی کیفیت کا اظہار یوں کیا:

> "مخدوم محترم حضرت مولانا دام مجدھم السامی!
>
> السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ
>
> مکرمت نامہ ایسے وقت ملا کہ بمبئی کے لئے پابرکاب ہوں، وہاں تین چار روز قیام رہے گا۔ "المعہد العالی" کے قیام سے قلبی اور روحانی مسرت ہوئی، یہ تربیت گاہ خدا نے چاہا تو بے حد مفید ثابت ہوگی، اصل چیز تربیت ہی ہے، اللہ تعالیٰ برکت عطا فرمائے، بہ تقاضائے عمر و حالات کسی مصرف کا نہیں رہا، دل کڑھتا ہے مگر اپنے اختیار کی کوئی بات بھی نہیں ہے ... میرے ذمے جو خدمت رکھئے گا اس کے لئے دل و جان سے حاضر ہوں، لوگوں کو اندازہ نہیں ہے، آپ جیسی گرانمایہ شخصیت اب کہاں ملیں گی! اللہ تعالیٰ آپ کی مدد فرمائیں..."

المعہد العالی کے ساتھ ہی آپ نے "مرقاۃ العلوم" کی اساس ڈالی، اس مدرسہ کا آغاز بھی یوں ہوا کہ ایک دو جماعتیں بچوں کی تھیں اور ان کو پڑھانے والے دو مدرسین تھے، دو تین طالب علم ابتدائی عربی جماعتوں میں تھے، کافی غور وخوض کے بعد آپ نے اس کا جو نصاب تعلیم تشکیل دیا، درس نظامی کے موجودہ نظام تعلیم سے بہت کچھ مختلف تھا، اس میں آپ کے اسی (۸۰) سالہ وسیع تجربات کا نچوڑ شامل تھا اور اس کے لئے لائحۂ عمل یہ بنایا کہ چند باقاعدہ مدرسین کے علاوہ المعہد العالی کے طلبہ ان کی تعلیم و تربیت کے فرائض انجام دیتے، جبکہ طلبۂ معہد کے اسباق خود آپ پڑھاتے، علاوہ بریں ابتدائی درجات کی کئی ایک کتابیں بھی اپنے زیر درس رکھتے تھے، یہ علامہ اعظمی کے تواضع، کسر نفسی اور سادگی کی انتہا تھی، ملک و بیرون ملک کے اہم اور عظیم ترین تعلیمی اداروں سے اعلیٰ عہدے اور مناصب کی پیشکش کی گئی، لیکن کسی ایک کو بھی قابل التفات نہیں گردانا، ایک پودے کو خود اپنے ہاتھوں سینچ سینچ کر پروان چڑھایا اور جب تناور درخت ہوا تو عین عالم بہار میں چند نادانوں کی نادانی کی وجہ سے اس سے مفارقت اختیار کرنی پڑی، اور جس وقت کہ پوری دنیا کے علمی حلقوں میں آپ کی عظمت و عبقریت کا سکہ چل رہا تھا ایک معمولی سے نیم تاریک گوشہ میں بیٹھ کر معلم الصبیانی کر رہے تھے۔ عرب و عجم کے ممتاز ترین اہل علم و ہنر اور اصحاب فضل و کمال آپ کی دست بوسی کو اپنے لئے باعث فخر اور آپ کی ایک نگاہ کو اپنے لئے سرمایۂ سعادت سمجھ رہے ہیں، مگر آپ ان سب سے بے نیاز چند بچوں کو کبھی میزان و منشعب پڑھا رہے ہیں، اور کبھی ان سے دروس الادب اور منہاج العربیہ کے اسباق سن رہے ہیں، کیا زہد و تقویٰ، استغناء و قناعت، اخلاص و للّٰہیت اور خدمت علم و دین کی ایسی عجیب و غریب کوئی مثال مل سکتی ہے!

المعہد العالی کے سلسلہ میں آپ کی فکر کچھ زیادہ کامیاب نہیں رہی۔ اس کی سب سے بڑی اور اہم وجہ یہ تھی کہ آپ کو جس قسم کے فضلاء درکار تھے، ان کی فراہمی مادیت پسندی کے اس دور میں ناممکن نہیں تو مشکل ضرور تھی، جو آتے وہ آپ کے وضع

کردہ معیار پر بہت کم پورے اترتے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چند برسوں بعد یہ شعبہ موقوف ہو گیا، البتہ آپ نے مرقاۃ العلوم کے غیر فارغ التحصیل طلبہ پر محنت اور توجہ صرف کی، ان کو عمدہ استعداد اور پختہ صلاحیت سے آراستہ کرنے کے لئے بیک وقت کئی کئی اسباق اپنے پاس رکھتے، کبھی ایسا بھی ہوا کہ ایک ہی وقت میں نور الایضاح سے لے کر صحیح بخاری تک مختلف کتابیں اپنے ذمہ رکھیں، اور اس طرح منہاج العربیہ سے لے کر بخاری و ترمذی پڑھنے والے آپ کے شاگردوں کی سب سے پہلی جماعت ۱۶ر شوال ۱۴۰۷ھ کو فارغ التحصیل ہو کر نکلی، اپنی زندگی ہی میں اپنے بڑے صاحبزادے مولانا رشید احمد صاحب اعظمی کو نظامت کی ذمہ داری سپرد کی، اور خود اس کی سرپرستی کے ساتھ تا دم واپسیں مرقاۃ العلوم کے طلبہ کی تدریس و تعلیم کا مشغلہ جاری رکھا، اور الحمد للہ آج بھی آپ کے فیوض و برکات کے اثرات نظر آرہے ہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے :

کہے دیتی ہے شوخی نقش پا کی — ابھی اس راہ سے کوئی گیا ہے

دائمی تقویم کی ترتیب | اسی دور میں علامہ اعظمی نے ایک اہم خدمت یہ انجام دی کہ طلوع و غروب، سحر و افطار اور نماز پنجگانہ وغیرہ کے اوقات کی ایک تقویم (جنتری) مرتب فرمائی، جو ظاہر ہے ایک آدھ سال میں نہیں انجام پا سکتی، بلکہ برسوں کی کاوش کے بعد ہی پوری ہو سکتی ہے۔ اس تقویم کی ابتداءً کچھ لوگوں نے اگرچہ شدت سے مخالفت کی، لیکن علامہ اعظمی کا یہ عمل اس طرح مقبول ہوا کہ آج مئو اور اس کے اطراف ونواح میں تقریباً ہر جگہ اسی تقویم پر لوگوں کا عمل ہے، جس کو عند اللہ مقبولیت کی علامت کہا جا سکتا ہے۔

رفیقۂ حیات کی وفات | ۹ر جون ۱۹۷۹ء کو آپ کی رفیقۂ حیات ایک لمبی بیماری کے بعد وفات پا گئیں، اپنی یادداشت میں لکھتے ہیں:

"رفیقۂ حیات حبیب اعظمی، سیدہ آمنہ بنت مولوی عبد العزیز اورنگ آبادی بتاریخ ۹ر جون ۱۹۷۹ء داغ مفارقت داد، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ از روز وفات او

تاایں دم بارہا ایں شعر اردو تکرار کردہ ام:

رنج تنہائی سہی لیکن بہل جاتا ہے دل کچھ تمہاری یاد سے کچھ نالہ و فریاد سے" ۔

(حبیب اعظمی کی رفیقۂ حیات، سیدہ آمنہ بنت مولوی عبد العزیز اورنگ آبادی نے ۹/ جون ۱۹۷۹ء کو داغ مفارقت دیا، انا للہ وانا الیہ راجعون، ان کی وفات کے دن سے اب تک بارہا اردو کے اس شعر کی تکرار کر چکا ہوں:

رنج تنہائی سہی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔)

رفیقۂ حیات کی وفات پر آپ کی شدت غم کا اندازہ ایک مکتوب سے بھی لگایا جاسکتا ہے، جو شیخ عبداللہ ابراہیم انصاری قطر کے لئے لکھا گیا ہے، اس میں آپ لکھتے ہیں:

"فقد تلقيت رسالتكم السامية وأنا مسافر سفرا قاصدا للترفيه عن نفسي و تنفيس ما أجده عني، وقد كنت مهموما حزينا مفجوعا بمصاب زوجتي رحمها الله۔۔۔۔"۔

(آپ کا گرامی نامہ مجھے اس حال میں ملا کہ میں تسکین قلب اور تخفیف غم کے لئے رخت سفر باندھ رہا تھا، کیونکہ میں اپنی اہلیہ رحمۃ اللہ علیہا کے حادثۂ وفات کی وجہ سے رنجیدہ و غمگین اور شکستہ خاطر تھا)

عالم اسلام کے ممتاز عالم شیخ ابوغدہؒ کی مئو تشریف آوری

جون ۱۹۷۹ء مطابق رجب ۱۳۹۹ھ میں ممتاز شامی عالم بالخصوص حدیث اور علوم حدیث کے زبردست ماہر اور عظیم محقق علامہ شیخ عبد الفتاح ابوغدہ کی مئو تشریف آوری ہوئی، شیخ ابوغدہؒ علامہ اعظمی کے بڑے شیدائی اور عقیدتمند تھے، جب کہ خود ان کا شمار عالم اسلام کی ان نامور اور قد آور علمی شخصیتوں میں ہوتا تھا، جنھوں نے اپنے بعد اپنا مثل نہیں چھوڑا، مگر اس کے باوجود علامہ اعظمیؒ سے ان کی والہانہ محبت و عقیدت قابل رشک تھی، وہ جب مئو تشریف لائے تو تقریباً تین دن قیام فرما رہے، یہ تین دن مئو کے لئے تاریخی حیثیت کے حامل تھے،

عجیب کیف پرور اور جانفزا منظر تھا، جب نہ صرف مئو بلکہ اس کے اطراف کے بھی علماء وفضلاء جمع ہو گئے تھے، اور جب ان فضلاء کے درمیان وقت کی یہ دو عظیم شخصیتیں یکجا ہوتیں تو ایسا معلوم ہوتا کہ آسمان علم وفضل کے آفتاب وماہتاب ہوں، علامہ اعظمیؒ نے شیخ ابو غدہؒ کی تشریف آوری کے موقع پر ان کے استقبال میں ایک قطعہ نظم فرمایا تھا جس کو سن کر شیخ ابو غدہؒ آبدیدہ ہو گئے تھے، وہ قطعہ یہ ہے:

أهلا بمقدمك الهنيئي و مرحبا　　يا عالم الشهباء إمام الشام

لم يحو علم الفقه و الآثار شا　　مىً كجمعك بعد ذاك الشامي

شیخ ابو غدہؒ کے قیام مئو کے ان تین دنوں میں ایک دن جمعہ کا تھا، اس وقت مدرسہ مرقاۃ العلوم کی موجودہ مسجد ابھی تعمیر نہیں ہوئی تھی صرف ایک شیڈ تھا، جس میں کسی زمانہ میں پاور لوم ہوا کرتا تھا، علامہ اعظمی کے اصرار پر شیخ ابو غدہؒ نے نماز جمعہ کی امامت فرمائی، بعدازاں ایک طویل تقریر کی اور دعا فرمائی، اس دن شیخ کی گریہ وزاری کا منظر قابل دید ولائق صد رشک تھا، آپ نے نہایت خشوع وخضوع کے ساتھ علامہ اعظمیؒ کی درازیٔ عمر اور صحت وعافیت نیز عامۃ المسلمین کی خیر وعافیت اور صلاح وفلاح کے لئے دعا فرمائی تھی۔

علامہ اعظمیؒ کے پاس کوئی مہمان خانہ وغیرہ تو تھا نہیں، نہ ہی وسیع وکشادہ مکان تھا، معمولی سی تنگ جگہ میں زندگی بسر کرتے تھے جس کی دیواریں اور چھت سب نہایت خستہ حالت میں تھیں، مدرسہ مرقاۃ العلوم ابھی بالکل ابتدائی مرحلے میں تھا، اس کی عمارت ابھی تعمیر نہیں ہوئی تھی۔ لہذا مجبوراً آپ نے شیخ ابو غدہؒ کے قیام کا انتظام مدرسہ سے متصل ڈاکٹر نثار احمد انصاری صاحب کے مکان پر کیا، ڈاکٹر صاحب کا نہایت کشادہ مکان تھا جس میں زیریں حصہ ضرورت سے زائد تھا، شیخ ابو غدہ کے قیام کا انتظام ڈاکٹر صاحب کے مکان پر ان کی راحت وآرام کے لئے کیا تھا کہ وہاں ان کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہوتی، نیز واردین وصادرین کے لئے بھی سہولت ہوتی، جب شیخ ابو غدہ علیہ الرحمۃ یہاں سے واپس

تشریف لے گئے ہیں تو ۱۷ر شعبان ۱۳۹۹ھ کو علامہ اعظمی کی خدمت میں ایک خط لکھا جس میں تحریر فرمایا:

"... أرسلت لكم من فترة رسالة من الرياض أجدد فيها شكري لكم عما لقيته من حفاوة و تكريم، أكرمكم الله، وأجدد هذا الشكر الآن أيضا، وقد بالغتم في تكريمي، وأرجو أن أمتع بزيارتكم في وقت معتدل، أقيم عندكم في غرفتكم المتواضعة الرفيعة، فأكون من أهل العباءة أهل البيت، وأرجو من الله تعالىٰ أن أمتع بهذا في الآتي إن شاء الله ..."

(ریاض سے کچھ مدت قبل میں نے آپ کے پاس ایک خط لکھا تھا، جس میں آپ کے اعزاز و اکرام کا میں نے شکریہ ادا کیا تھا، اللہ تعالیٰ بھی آپ کا اکرام فرمائیں، اس وقت پھر میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آنحترم نے میری بہت زیادہ عزت افزائی فرمائی، میں اس بات سے پُرامید ہوں کہ کسی مناسب وقت پر پھر شرف ملاقات حاصل کروں اور آپ کے ساتھ آپ کے متواضع اور بلند کمرے میں قیام کروں، تاکہ میں آپ کے اہل خانہ میں شمار کیا جاؤں، اللہ کی ذات سے مجھے امید ہے کہ مستقبل میں ان شاء اللہ اس سعادت سے بہرہ ور ہو سکوں گا...)

قطر سے تیسری سیرت کانفرنس میں شرکت کے لئے دعوت

محرم ۱۴۰۰ھ (نومبر ۱۹۷۹ء) میں قطر کے دارالحکومت دوحہ میں سیرت نبوی (علی صاحبہا الصلاۃ والسلام) کی تیسری عالمی کانفرنس منعقد ہوئی، اس میں شرکت کے لئے علامہ اعظمی کو بھی مدعو کیا گیا، اصل دعوت نامہ تو ہمیں آپ کے کاغذات میں نہیں مل سکا، شاید کہیں گم ہو گیا ہو، دعوتنامہ موصول ہونے کے بعد آپ نے شرکت کا وعدہ فرمایا ہوگا، جس کے لئے کانفرنس کی آرگنائزنگ کمیٹی نے آپ کے مقالہ کے تقاضا کا خط لکھا، جو ۱۹ر رجب

۱۳۹۹ھ م ۱۴؍ جون ۱۹۷۹ء کا مکتوب ہے، اس کی عبارت یہ ہے:

"۔ ۔ ۔ فلا زالت اللجنة التحضيرية للمؤتمر العالمي الثالث للسيرة والسنة النبوية في انتظار بحثكم الذى وعدتم بكتابته وإرساله الينا و ذلك لنتمكن من إعادة طباعته و تهيئته ليكون معداً اثناء المؤتمر ۔ ۔ ۔"

(سیرت وسنت نبوی کی تیسری عالمی کانفرنس کی آرگنائزنگ کمیٹی آپ کے مقالہ موعودہ کا برابر انتظار کر رہی ہے، تاکہ ہم اس کو دوبارہ چھاپ کر کانفرنس کے وقت کے لئے تیار کر سکیں)

لیکن اسی دوران اہلیہ مرحومہ کی وفات کا دلگداز سانحہ پیش آگیا، جس سے آپ کے دل و دماغ شدید طور پر متاثر ہوئے، اس صورت میں آپ بحث کہاں سے تیار کر سکتے، اس لئے آپ نے کمیٹی کے چیئر مین شیخ محمد عبداللہ ابراہیم انصاری کو خط لکھا جس میں مقالے کی تیاری سے معذرت کرتے ہوئے تحریر فرمایا:

"وقد تيسرت لى فى تلك الفترة زيارة أخينا فى الله السيد أبى الحسن على الندوى فى لكناؤ فالتمست منه أن يخبركم عما أنا فيه و يعتذر اليكم عنى ، أني لا أستطيع كتابة البحث الموعود و أنا مهموم القلب بهذه الدرجة ،لكنى أرجو أن يذهب الله عنى بعض ما يشغلنى عن إعداد البحث ويسلينى فأكتبه إن شاء الله .

فلعلّ الأستاذ الندوى نسى أن يكتب إليكم ، فمعذرة منى إليكم ، وعفواً عما قاسيتم من شدة الانتظار ، وتاخير كتابة البحث ۔ ۔ ۔""

(اسی اثنا میں میری ملاقات برادرم سید ابوالحسن علی ندوی سے لکھنؤ میں ہوئی، تو میں نے ان سے عرض کیا کہ میری مصیبت سے آپ کو باخبر کر دیں اور میری طرف سے معذرت کر لیں کہ میں مقالہ موعودہ اس درجہ

رنجیدہ دلی کی حالت میں نہیں لکھ سکتا، لیکن مجھے امید ہے کہ اگر اللہ نے مقالے کی تیاری کی رکاوٹ دور فرمادی اور میرا غم غلط ہو گیا تو میں ان شاء اللہ اس کو لکھ سکوں گا۔

شاید استاذ ندوی آپ کے پاس یہ لکھنا بھول گئے ہوں، لہذا میں معذرت چاہتا ہوں اور مقالہ نویسی کی تاخیر اور آپ کو انتظار کی جو شدت برداشت کرنی پڑی ہے اس کے لئے معافی کا خواستگار ہوں)

اس خط کی وصولی کے بعد چنیر مین شیخ عبداللہ انصاری نے پھر ایک خط ۵ر شوال ۱۳۹۹ھ م ۲۷ر اگست ۱۹۷۹ء کو لکھا جس میں تعزیت اور صبر واستقلال کی تلقین کے بعد تحریر فرمایا:

"تقديراً منا لحالتكم النفسية نفيدكم بأننا قد أعفيناكم من البحث على أن تكونوا باذن الله تعالى عضوا عاملا في المناقشات خلال أيام المؤتمر ... وسيكون لنا معكم اتصال آخر قريباً لترتيب اجراء ات السفر."

(آنجناب کی نفسیاتی حالت کا اندازہ کرتے ہوئے ہم آپ کو اطلاع دینا چاہتے ہیں کہ بحث لکھنے سے آپ کے عذر کو ہم نے قبول کر لیا، اس شرط پر کہ کانفرنس کے دوران ہونے والے مذاکرات میں آپ عملی طور پر حصہ لیں، سفر کی کارروائیوں کی ترتیب کے لئے جلد ہی ہم آپ سے ایک بار پھر رابطہ قائم کریں گے۔)

اس مراسلت اور خط وکتابت کے بعد ذہنی طور پر علامہ اعظمی اس کانفرنس میں شرکت کے لئے آمادہ ہو گئے، اور کچھ ہی عرصہ بعد حج وزیارت کے لئے حجاز تشریف لے گئے، ان کا ارادہ تھا کہ اس فریضہ کی ادائگی کے بعد ادھر ہی سے قطر کا سفر بھی نمٹالیں گے، لیکن انسان چاہے کتنا بھی عظیم ہو جائے قدرت کے تکوینی فیصلوں کے سامنے بے بس ہے

ہو جاتا ہے۔ حرم شریف پر اس سال یکم محرم کو شر پسند باغیوں کا ناپاک اور بد ترین حملہ ہوا، جس کی وجہ سے کئی دنوں تک حرم شریف (زادہ اللہ شرفاً) کے دروازے بند رہے اور بہت سارے امور معطل ہو گئے، ان حالات کے پیش نظر کانفرنس میں آپ کی شرکت غیر یقینی بلکہ عدم شرکت یقینی ہو گئی، چنانچہ ۸؍صفر ۱۴۰۰ھ مطابق ۲۸؍دسمبر ۱۹۷۹ء کو لکھا ہے:

"فانی واللہ متاسف جدا علی أنه لم يمكن لی حضور موتمر السيرة ، لأجل أنی کنت إذ ذاك محصوراً فی غرفة تجاه باب اجياد بمكة المكرمة ، حتی انی لم استطع الاتصال بكم بالهاتف ، أو بالبرق ، وقد كنت عازما علی الحضور صحبة السيد ابی الحسن علی الندوی من جدة فلم يتيسر لی الاجتماع به لأجل الحادث الفظيع . . ."

(پس بخدا مجھے سیرت کانفرنس میں شریک نہ ہو سکنے کا بہت افسوس ہے، کیونکہ میں اس وقت مکہ مکرمہ میں باب اجیاد کے سامنے ایک کمرے میں محصور تھا، یہاں تک کہ میں آپ سے ٹیلی فون یا ٹیلی گرام کے ذریعہ بھی رابطہ نہیں قائم کر سکا، جب کہ میں جدہ سے سید ابوالحسن علی ندوی کی رفاقت میں حاضری کا عزم کئے ہوئے تھا، لیکن اس روح فرسا واقعہ کی وجہ سے میری ان سے ملاقات بھی نہ ہو سکی)

شیخ ابو غدہ کی ریاض بلانے کی کوشش اس سال (۱۴۰۰ھ) شیخ ابو غدہ علیہ الرحمۃ نے آپ کو جامعۃ الامام محمد بن سعود ریاض میں ایک مہینہ کے لئے بلانے کی کوشش کی، اس بابت پہلے انھوں نے وکیل الجامعۃ سے گفتگو کی، پھر علامہ اعظمیؒ سے ان کی رائے طلب کی، شیخ ابو غدہ کے بھیجے ہوئے خطوط میں اس موضوع کا ایک خط، جس پر تاریخ درج نہیں ہے۔ ملاحظہ ہو:

" سيدی الأجل:

اقترحت علی وكيل الجامعة عندنا استزارتكم لجامعتنا لمدة

شهر، فوافق و رحب ، وطلب مني أن أقدم طلبا بذلك ، فقدمت طلبا ، واقترحت فيه أن يكون مقدمكم إلينا من أوائل المحرم عام ۱۴۰۰ھ إن شاء الله تعالیٰ ، و جعلت عنوان تبليغ دعوتكم عنواني لأقوم أنا بمتابعة معاملة الدعوة في الجامعة و لأتبلغها و أبلغها لفضيلتكم بسرعة . فأرجو أن تعرفوني بعنوانكم الممكن الاتصال به في مكة المكرمة أو في المدينة المنورة مع ذكر الهاتف الممكن الإستعانة به لإبلاغكم ، وأرجو أيضاً أن تعرفوني عن رأيكم في التوقيت هل هو مناسب ، فإني اخترته لأنكم هنا قريبون منا ، والجو عندنا ربما كان أقل برودة من الهند عندكم فتستريحون بلطافة الجو إن شاء الله تعالیٰ . . . "

(آقائے بزرگوار: میں نے وکیل جامعہ کے سامنے ایک مہینہ کے لئے ہماری یونیورسٹی کی آپ کی زیارت کی تجویز رکھی، توانھوں نے میری اس تجویز سے اتفاق کیا اور اس کا خیر مقدم کیا، اور مجھ سے اس کے لئے ایک درخواست پیش کرنے کو کہا، لہذا میں نے ایک درخواست گذار دی اور اس میں یہ تجویز بھی رکھی کہ آپ کی تشریف آوری محرم ۱۴۰۰ھ کے اوائل میں ہو، اور آپ تک دعوت رسانی کے لئے میں نے اپنا پتہ دیدیا ہے، تاکہ میں اس معاملے کو بذات خود انجام دے سکوں اور سرعت کے ساتھ آپ تک دعوت نامہ پہنچا سکوں، لہذا مجھے امید ہے کہ مکہ مکرمہ یا مدینہ منورہ میں آپ اپنے ممکنہ پتہ سے آگاہ فرمائیں گے، اسی کے ساتھ کوئی ٹیلیفون نمبر بھی ذکر فرمائیں گے جس کی مدد سے آپ تک پیغام پہنچایا جا سکے، اسی طرح مجھے امید ہے کہ وقت کی نسبت بھی اپنے خیال سے آگاہ فرمائیں گے کہ کیا وہ مناسب رہیگا۔ اس وقت کا انتخاب میں نے اس لئے کیا ہے کہ آپ اس وقت ہم سے قریب ہوں گے اور یہاں کا موسم ہندوستان کی بہ نسبت کم سرد ہوگا، لہذا آپ موسم کی لطافت سے بھی انشاء اللہ آرام پائیں گے . . .)

آٹھواں اور آخری حج علامہ اعظمی نے آٹھواں حج جو کہ ان کا آخری حج بھی ہے ۱۳۹۹ھ مطابق ۱۹۷۹ء میں کیا، یہ وہ سال ہے جب کہ حرم مکی۔ زادہ اللہ شرفا وعزاً۔ پر فتنہ پردازوں کا شرارت آمیز و قیامت خیز حملہ ہوا تھا(۱) علامہ اعظمی نے جس کاغذ پر اپنے حج کے سال لکھے ہیں، اس میں آخر میں تحریر ہے:

"آٹھواں ۱۳۹۹ھ۔ اسی حج میں پہلی محرم ۱۴۰۰ھ کو مخالفین حکومت سعودیہ کا فتنہ رونما ہوا اور حرم کے دروازے بند کردئے گئے۔"

اس حج کی کسی قدر تفصیل آپ نے اپنی ایک یادداشت میں تحریر فرمائی ہے، ہم اس کو بتمامہ قارئین کی خدمت میں پیش کررہے ہیں، لکھتے ہیں:

"حج ۱۳۹۹ھ ۱۹۷۹ء

۱۷/ اکتوبر (۲۳/ ذی قعدہ) کار سے بنارس آیا، بنارس سے ۳ بجے دن میں بذریعہ کار الہ آباد روانہ ہوا، ۸/ بجے شب میں الہ آباد پہونچا، عبدالشکور صاحب کے یہاں قصر حافظ میں قیام ہوا، مولانا محمد احمد، و مولوی عمار و ڈاکٹر صلاح الدین

---

(۱) اس فتنہ کی نسبت علامہ اعظمی اپنی بیاض میں تحریر فرماتے ہیں: "فتنہ مدعی مہدویت در مکہ، نامش محمد بن عبداللہ بود، در حرم مکہ بااسلحہ کثیر وانبوہ مردم معتقداں داخل شد، ودر عین نماز فجر درہائے حرم راز داخل بست وتا پانزدہ روز ابواب مسدود بودند، ومردم حجاج وغیر حجاج از نماز و طواف در حرم محروم ماندند، من نیز ازیں محروماں یکے بودم، ایں حادثہ در یکم محرم ۱۴۰۰ھ وقوع یافت۔"

(مکہ میں مدعی نبوت، جس کا نام محمد بن عبداللہ تھا، کا فتنہ حرم مکہ میں بہت زیادہ اسلحے اور معتقدوں کی بھیڑ کے ساتھ داخل ہوا، ٹھیک فجر کی نماز میں حرم کے دروازے اندر سے بند کر دئے، پندرہ روز تک دروازے بند رہے، اور حاجی وغیر حاجی تمام لوگ حرم میں نماز و طواف سے محروم رہے، میں بھی ان ہی محروموں میں سے ایک تھا، یہ حادثہ یکم محرم ۱۴۰۰ھ کو واقع ہوا)

و مولوی قمرالزماں وہیں آکر ملے، دوسرے دن ۱۸/ اکتوبر کو ان سب حضرات نے بمبئی میل پر ۱۰ بجے دن میں سوار کرایا۔ رشید احمد، سعید احمد، مولوی محمد وغیرہ بھی رات کی گاڑی سے الہ آباد آگئے تھے۔ ۱۹/ اکتوبر کو صبح ۵ بجے منماڈ اسٹیشن پر بہت سے حضرات ملنے آئے، مولانا عثمان، شمس الضحیٰ وکیل، شمس الہدیٰ وکیل، سید حمید، حاجی بقاتی، ڈاکٹر ریاض وغیرہ سب آئے تھے۔

۱۹/ اکتوبر۔ ساڑھے گیارہ بجے بوری بندر پہونچے، مولوی ابرار احمد برادر حاجی شمس الدین گاڑی لے کر آئے تھے، اپنے گھر لے جاکر ٹھہرایا۔ سامان رکھ کر جمعہ کی نماز عرب مسجد میں پڑھی، نماز کے بعد یوپی حج کمیٹی کے دفتر گئے، اپنے کاغذات معروف زکریا وغیرہ کے حوالے کئے، پھر حج کمیٹی میں محمد امین اگزکیٹیو آفیسر سے ملاقات کی، انھوں نے اطمئنان دلایا کہ تینوں آدمیوں کو ۲۵ ہی کے جہاز سے روانہ کردیں گے۔

۲۵ تک حاجی شمس الدین کے مکان ہی پر قیام رہا، ۷ بجے سے پہلے ہی مولوی ابرار نے ہم کو اپنی گاڑی پر ایرپورٹ پہونچایا، مولوی مستقیم ساتھ تھے، سید حمید وغیرہ اپنی گاڑی سے ہوائی اڈہ گئے، وہاں مولوی ظفرالحسن اور مولوی عبدالحلیم (۱) وغیرہ سے ملاقات ہوئی، ۱۱ بجے جہاز اڑا، ساڑھے تین بجے (سعودی عرب کے ۱ بجے) دن میں جدہ ایرپورٹ پر اترا، نماز ظہر سے فارغ ہوکر صوفی عبدالرحمن کے ساتھ ان کے اور نورولی کے یہاں چلا گیا، طبیعت نہایت ناہموار تھی اور بے حد تکان معلوم ہو رہی تھی، نورولی کے گھر آرام کیا، کھانا کھایا، نماز

(۱) غالباً مولانا عبدالحلیم صاحب گورینی مراد ہیں، ابھی کل ہی (۱۰/ محرم ۱۴۲۰ھ م ۲۷/ اپریل ۱۹۹۹ء) آپ کی وفات کی جانکاہ خبر موصول ہوئی ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون، مولانا طویل عرصہ سے بستر علالت پر تھے، ان کی رحلت سے بڑا خلاء پیدا ہوگیا ہے، اللہ ان کے درجات کو بلند فرمائے اور ان کی قبر کو نور سے بھردے۔ آمین

پڑھی اور چند منٹ سویا، پھر ۱۲ بجے شب میں ایرپورٹ آیا، عبد العلی واحسان الحق انتظار میں تھے، ڈرافٹ بھنایا، اور دو بجے بس ملی فجر کی نماز کے بعد روانہ ہوئی، تھوڑی دور جاکر خراب ہو گئی، گھنٹوں انتظار کے بعد دوسری بس آئی، اس نے ۹ بجے دن میں مکہ کے اندر پہونچادیا، مگر بھیڑ کی وجہ سے ہم لوگ ۳ بجے بعد جمعہ سے پہلے اپنے اپنے ٹھکانے پر نہ پہونچ سکے۔

مولوی عبدالحلیم ساتھ تھے مکہ پہونچ کر الگ الگ ہو گئے۔

۲۶؍اکتوبر یوم جمعہ۔ مدرسہ فخریہ میں قیام کیا، صابر سکندر نے دن کا کھانا کھلایا، وہاں حاجی تجمل، مولوی نصرت علی، حیات النبی، ظفرالحسن، سید ناصر علی شمس موجود ملے۔

۸؍ذی الحجہ (ہندوستان کی ۷ ذی الحجہ) دوشنبہ ۲۹؍اکتوبر ۱۹۷۹ء کو بس سے منی روانہ ہوئے، جلد ہی پہونچ گئے، سہ شنبہ (۳۰؍اکتوبر) کو بس سے عرفات حاضر ہوئے، زوال سے بہت پہلے آگئے تھے، مکہ سے عبدالباسط بنارسی، اخلاق احمد، حفیظ الرحمٰن اعظم گڈھ وغیرہ کا ساتھ ہو گیا تھا، ہر جگہ یہ لوگ ساتھ رہے، مولوی رضوان بہرائچی کے انتظام میں عبدالباقی سکندر کے خیمہ میں قیام رہا، رضوان کے والد حافظ نعمان نے بھی خدمت گذاری کی۔

۱۰؍ذی الحجہ (یکم نومبر) رات منی میں گذار کر ۴؍بجے بس پر سوار ہو کر طواف زیارت کے لئے مکہ آیا، فجر کی نماز باجماعت حرم میں پڑھی اور فوراً ہی تن تنہا اسی بھیڑ میں طواف کیا، اب ۱۲ ذی الحجہ ہو گئی ہے، طواف سے فارغ ہو کر مولانا مشتاق کے گھر جاکر کنجی لی اور کمرہ کھول کر پڑ رہا، ۱۰؍بجے تک ظفرالاسلام ساتھ رہے، ان کو بس کا کرایہ دے کر رمی کے لئے بھیج دیا۔

۱۲۔ کو رات میں ہمارے رفقاء اور مئو کے حجاج منی سے واپس ہوئے۔

۱۲؍ذی الحجہ (۲ نومبر) کو جمعہ تھا، بیحد رش تھا، میں نے ظہر پڑھی، اس

دن منی سے آنے والوں کو بڑی پریشانی ہوئی۔

۱۳ر ذی الحجہ ۳ نومبر ۱۹۷۹ء۔ آج شیخ ابو الفتح بیانونی دن میں اور الاستاذ حسن ضیاء الدین عترات میں ملنے آئے، مغرب سے پہلے سید لقمان بی بی پور والے ملنے آئے وہ حائل میں مدرس ہیں۔

۱۴ر ذی الحجہ ۴ر نومبر ۱۹۷۹۔ آج مولانا صدیق باندہ والے ملنے آئے، خریدئی کتب کے بارے میں مشورہ لیا، مولانا عبدالحلیم گورینی والے بھی تشریف لائے، شیخ ابو الفتح ایک جماعت کے ساتھ آئے۔

۱۵ر لقمان نے پھل ہدیہ کئے، کچھ دوائیں دیں۔

۱۶ر انس ریاض گئے، آج ہی جدہ سے مولوی انعام الحق محمد آبادی ہندوستان جائیں گے، انھوں نے مکہ میں دو وقت دعوت کی۔"

اسی قسم کی ایک تحریر ایک دوسرے کاغذ پر ملی، جس میں قدرے اختصار و تغیر کے علاوہ مضمون تقریباً یکساں ہے، جی چاہتا ہے اسے بھی ہدیہ ناظرین کردیا جائے فرماتے ہیں:

"۲۵ر اکتوبر کو بمبئی سے روانہ ہوئے، اسی دن جدہ پہونچے، ۲۶ر کو بعد نماز فجر بس سے مکہ روانہ ہوئے، ۳ر بجے بعد جمعہ مکہ پہونچے، فخریہ میں قیام ہوا، حاجی تجمل و مولوی نصرت علی و مولوی ظفر الحسن و حیات النبی بھی اسی کمرہ میں تھے، ۲۷ر کو ازہر (۱) ریاض سے آیا، ۲۸ کو اقبال آیا، عرفات میں مولوی افتخار و مولوی ہاشم وقوف کے بعد ملنے آئے، عرفات سے دیر میں روانگی ہوئی، ۱۱ر بجے مزدلفہ پہونچے، مزدلفہ سے سویرے چلے، غلس میں نماز پڑھ کر دعا کی اور روانہ ہوگئے، مگر مزدلفہ سے باہر وقت پر ہوئے، ۸ر بجے منی پہونچے، ۱۱ر کو بعد ظہر ازہر طواف زیارت کو مکہ آیا، وہ ایک بجے رات میں منی واپس ہوا، اور میں ۴ر بجے بس سے روانہ ہوا، فجر کی نماز باجماعت حرم میں پڑھی اور پھر طواف کیا۔

(۱) مولانا ازہر رشید الاعظمی جو اس وقت جامعۃ الامام محمد بن سعود ریاض میں زیر تعلیم تھے۔

۲۴ر ذی الحجہ کو رابطہ گیا۔ ۲۷ر ذی الحجہ ۱۷ر نومبر۔ امام حرم سبیل سے ملا، ایک شیشی عطر اور تلخیص ہدیہ کی، انھوں نے کئی کتابیں دیں، مولوی شمیم سے صولتیہ میں ملا، انھوں نے باب العمرہ پر خلوہ کی کنجی دی۔

یکم محرم ۱۴۰۰ھ کو نماز فجر میں مسجد حرام پر باغیوں نے قبضہ کرلیا۔ آج تین دن ہو گئے ابھی دروازے نہیں کھلے، ۳ر محرم ۱۴۰۰ھ بعد مغرب۔

۱۳ر محرم تک دروازے نہیں کھلے، اس لئے ہم لوگ مدینہ ۱۳ر کو چلے آئے۔ سوا نو چلے قبل مغرب پہونچے۔"

علامہ اعظمی کا یہ آخری حج تھا، اسی سفر میں مدینہ منورہ سے واپسی کے وقت آپ نے وہ پرسوز و جانگداز نعت موزوں فرمائی جس کا ایک ایک حرف اور ایک ایک لفظ حب نبی کا آئینہ دار اور عشق رسولؐ میں ڈوبا ہوا ہے، جس کا پہلا شعر ہے :

زاستانت با سرشک غم بیادت می روم
بادل صد چاک و با صد یاس و حسرت می روم

کشف الاستار عن زوائد مسند البزار حدیث کی اس کتاب کو گوشہ گمنامی سے باہر لانا پھر اس پر تحقیقی کام کر کے شائع کرنا بھی علامہ اعظمی کا ناقابل فراموش علمی کارنامہ ہے، تیسری صدی ہجری کی ایک تصنیف مسند بزار ہے، یہ کتاب اسی کا انتخاب ہے جو نویں صدی ہجری میں علامہ نورالدین ہیثمی کے ذریعہ انجام پایا ہے۔ یہ کتاب چار جلدوں میں مؤسسۃ الرسالۃ (دمشق) سے چھپی ہے، دو جلدیں (اول و دوم) ۱۳۹۹ھ م ۱۹۷۹ء میں، تیسری ۱۴۰۴ھ م ۱۹۸۴ء اور چوتھی ۱۴۰۵ھ ۱۹۸۵ء میں شائع ہوئی۔

شیخ یوسف القرضاوی اور بعض دیگر فضلاء کی مئو تشریف آوری ۲۱ر ۲۲ر ۲۳ر فروری کو دارالمصنفین اعظم گڈھ میں بڑے پیمانے پر "اسلام اور مستشرقین" کے موضوع پر ایک کانفرنس منعقد ہوئی، اس کانفرنس میں برصغیر ہندو پاک کے علاوہ عرب ممالک کی بعض مشہور شخصیتوں نے بھی شرکت کی، جس میں نمایاں

اور ممتاز نام علامہ ڈاکٹر یوسف قرضاوی مقیم قطر کا ہے، قرضاوی صاحب کا شمار اس وقت عالم اسلام کی قد آور علمی شخصیتوں میں ہوتا ہے۔ مذکورہ بالا کانفرنس میں علامہ اعظمی مدعوئین خصوصی میں تھے، اور انھوں نے اس میں شرکت کی پوری تیاری بھی کر لی تھی، لیکن عجیب اتفاق کہ ان ہی دنوں ان پر دل کا دورہ پڑا جس کی وجہ سے وہ اعظم گڈھ جانے سے معذور رہے، کانفرنس میں شرکت کرنے والے بہت سے فضلاء علامہ اعظمی کی ملاقات کے خواہش مند تھے، ان لوگوں نے جب ان کو وہاں نہیں پایا تو کئی ایک مئو حاضر ہوئے، چنانچہ ایک شام علامہ ڈاکٹر یوسف قرضاوی بھی تشریف لائے، علامہ اعظمی سے ان کے فضیلت کدہ پر ملاقات کی، اور مدرسہ مرقاۃ العلوم کی مسجد میں تھوڑی دیر تقریر کی، جس میں علامہ اعظمی کے فضل وکمال، ان کی علمی خدمات اور ان کے تصنیفی و تحقیقی کارناموں کا بڑے بلند آہنگ الفاظ میں ذکر کیا اور خوب سراہا، اور علامہ اعظمی سے اپنی اس ملاقات پر نہایت مسرت وشادمانی کا اظہار کیا۔

شیخ یوسف قرضاوی کی آمد کے دوسرے دن پاکستان کے ایک نامور فاضل اور علامہ اعظمی کے پرانے نیاز مند شیخ نذیر حسین صاحب پنجاب یونیورسٹی لاہور اور ان کے ہمراہ ایک اور عقیدتمند عبدالرحمن کوندو صاحب تشریف لائے، شیخ نذیر حسین صاحب نے پاکستان واپس جانے کے بعد اپنی مئو تشریف آوری اور علامہ اعظمی کی خدمت میں حاضری کا اپنے ایک مضمون میں مفصل تذکرہ کیا ہے، جو ہدیہ ناظرین ہے:

"دوسرے دن ناشتہ کے بعد مجھے اور کوندو صاحب کو محدث جلیل مولانا حبیب الرحمن اعظمی کے مستقر کی تلاش ہوئی، مولانا اعظمی مولانا انور شاہ مرحوم کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں اور کم وبیش پچاس برس سے حدیث کا درس دے رہے ہیں، مصنف عبدالرزاق کی اشاعت نے انھیں بین الاقوامی شہرت عطا کی ہے۔ بعض علمی مشکلات کے حل کیلئے راقم السطور ان سے رجوع کرتا رہا ہے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ مولانا کا وطن مئو ناتھ بھنجن ہے جو اعظم گڑھ والے

تین میل کے فاصلہ پر ہے اور وہاں بس جاتی ہے، میں اور کوندو صاحب بس سے سفر کرتے ہوئے ڈیڑھ گھنٹے بعد پوچھتے ہوئے مولانا اعظمی کے فضیلت کدے پر حاضر ہوئے، سلام مسنون کے بعد کوندو صاحب نے میرا تعارف کرایا تو مولانا اعظمی مجھ سے بغل گیر ہوئے، نہایت مسرت کا اظہار کیا اور کہنے لگے کہ میں تو دل کے دورے کی وجہ سے دارالمصنفین کے سیمینار میں شریک نہیں ہو سکا، میں نے اپنا بڑا بیٹا بھیج دیا تھا اور اسے تاکید کر دی تھی کہ اگر شیخ صاحب (راقم السطور) لاہور سے آئے ہوں تو انھیں ضرور لایا جائے، میں نے عرض کیا بندہ خود حاضر ہو گیا ہے، فرمانے لگے کل رات مشہور مصری فاضل جناب یوسف القرضاوی بھی ان سے ملنے آئے تھے ،اس کے بعد وہ اپنی بیٹھک میں لے آئے جہاں چاروں طرف الماریوں میں کتابیں بھری تھیں۔ انھوں نے اپنی شائع کردہ حدیث کی کتابیں دکھائیں، ان میں سے حدیث کی ایک نایاب کتاب زوائد البزار بیروت سے ۴ جلدوں میں نہایت آب و تاب سے شائع ہوئی ہے ،اب مولانا اعظمی مصنف ابن ابی شیبہ کی تصحیح و تعلیق میں مصروف ہیں اور اس کی تین جلدیں چھپنے کے لئے حجاز بھیج چکے ہیں۔ کوندو صاحب نے مولانا اعظمی سے انوار الباری (ترجمہ و شرح اردو صحیح بخاری از سید احمد رضا بجنوری) کے متعلق رائے دریافت کی۔ مولانا اعظمی نے فرمایا کہ بجنوری صاحب نے بعض جگہ متشددانہ کلام کیا ہے اور حد اعتدال سے تجاوز کر گئے ہیں، جو اکابر علماء دیوبند کی علمی روایت کے خلاف ہے، مولانا نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے فرمایا کہ ہمارے استاذ مولانا انور شاہ مرحوم و مغفور نے کبھی بھی کسی امام یا مجتہد کی تنقیص یا تحقیر نہیں کی، وہ ہمیشہ امام ابن تیمیہ کو شیخ الاسلام اور حافظ ابن حجر کو حافظ الحدیث کے لقب سے یاد کرتے رہے، راقم السطور نے صحیح بخاری کی مختلف شروح (فتح الباری اور عینی) کے متعلق ان کی رائے پوچھی ،فرمانے لگے جہاں تک حدیث کے فنی مباحث کا

تعلق ہے، فتح الباری کو تمام شروح پر فوقیت حاصل ہے، لیکن عینی، عمدۃ القاری میں بعض معلومات (مثلاً صرفی ونحوی مشکلات کا حل، بلاغی نکات کا بیان اور فقہی مسائل کی صراحت) فتح الباری سے زائد ہیں۔ اس لئے ایک مدرس یا صاحب ذوق عالم کے لئے ان دونوں شرحوں کا مطالعہ لازمی اور ضروری ہے، مولانا اعظمی فنون حدیث کے علاوہ تاریخ اور ادب کا بھی ستھرا ذوق رکھتے ہیں، طبقات اور تراجم کی کتابوں پر بھی ان کی گہری نظر ہے ۔ میرے رفیق سفر کوندو صاحب کو سید علی ہمدانی اور کشمیر کے دوسرے علماء کے حالات کی جستجو تھی ، وہ ان کے حالات دریافت کرتے رہے اور مولانا اعظمی متعلقہ کتب کی نشاندہی فرماتے رہے ، کھانے کے بعد ہم نماز پڑھنے کے لئے قریب کی مسجد میں گئے ، مولانا اعظمی نے یہ مسجد سات آٹھ لاکھ روپے کی لاگت سے تعمیر کرائی ہے، نماز کے بعد نمازیوں سے ہمارا تعارف کرایا اور مسجد کے تمام حصے بڑے شوق سے دکھائے، مسجد سے واپسی پر دیکھا کہ بہت سے ہندو ان کے انتظار میں بیٹھے ہوئے ہیں، معلوم ہوا کہ یہ مولانا سے تعویذ لینے آئے ہیں۔

مولانا اب درس وتدریس چھوڑ کر تصنیف و تالیف میں مصروف ہو گئے ہیں، ان کی عمر اسی بیاسی برس کے قریب ہے۔ لیکن صحت ماشاء اللہ بہت اچھی ہے اور اپنی عمر سے کم معلوم ہوتے ہیں، مولانا گھر کے بھی خوش حال ہیں۔ یوپی اسمبلی کے ممبر رہ چکے ہیں، لیکن رہن سہن، بالکل سادہ اور درویشانہ ہے، علم وفضل کے باوجود غرور وتمکنت اور خودستائی نام کو نہیں، علمی انہماک کا یہ عالم ہے کہ اب بروکلمان کی تاریخ الادب العربی (عربی ترجمہ) پر استدراک لکھ رہے ہیں اور بعض شوقین طلبہ کو مقدمہ ابن الصلاح بھی پڑھاتے ہیں، طلباء کی آمد پر ہم اٹھ کھڑے ہوئے اور مولانا نے دعائیں دے کر ہمیں رخصت کیا۔ مولانا کے بڑے صاحبزادے مولوی رشید احمد صاحب دور تک ہمیں چھوڑنے آئے۔ (المعارف لاہور۔ مئی ۱۹۸۲ء ص ۳۴۔۳۵)

امریکہ سے دعوت نامہ | شکاگو میں واقع امریکہ کے اسلامک سینٹر کے ڈائرکٹر مسٹر جابر محمد ہربرٹ نے الصلاۃ والاسلام کے نام سے امریکی مسلمانوں کے لئے ایک کتاب لکھی، ہربرٹ صاحب نے امریکہ میں اس کتاب کی وسیع پیمانے پر اشاعت کا پروگرام بنایا، ان کا ارادہ تھا کہ اس کتاب کی تکمیل کے بعد رسم اجراء کی تقریب منعقد کریں، اس تقریب کے لئے انھوں نے دو شخصیتوں کا انتخاب کیا، ایک طنجہ کے مشہور عالم و محدث شیخ عبداللہ بن الصدیق الغماری اور دوسرے علامہ اعظمی کا، اس مقصد سے ۱۸/ جنوری ۱۹۸۲ء کو شیخ احمد درویش نے علامہ اعظمی کے پاس درج ذیل خط بھیجا:

"إلى حضرة ريحانة الزمان مولانا المحدث الفاضل حبيب الرحمن الأعظمي نفعني الله به تعالىٰ

السلام عليكم و رحمة الله و بركاته وبعد،

فقد كلفني كل من مولاى المحدث السيد عبدالله الصديق الغمارى بطنجة بالهاتف . والسيد جابر محمد هربرت مدير البطل العالمي للملاكمة محمد على كلاى الذى أعمل عنده فى مؤسسته الاسلامية، بأن أتصل بسماحتكم طلبا أن تتكرم و تقبل الدعوة بالزيارة للمؤسسة يوم ۱۰/ مارس ۱۹۸۲م

ذلك أن السيد جابر يريد جمع عمل الأحاديث الصحيحة والحسنة أو معظمها ، والسيد عبدالله بن الصديق قد تسلّم تذاكره ليحضر مع زوجته و خادمتها وأحد مساعديه.

وكان السيد عبدالله جاء هنا قبل موسم الحج السابق لمدة ۱۱ يوما حيث راجع كتابا عن الصلاة للجماعة الاسلامية الأمريكية التى يرأسها أخو السيد جابر ولها قرابة ۲۰۰ فرع (مسجد أو مركز) بكافة ولايات أمريكا ، وأغلب المترددين من المسلمين

السمر ، وكان والد إمامهم (الإمام محمد وارث الدين) ويدعى الياجه محمد مدعيا للنبوة ثم لما توفي صحّح ابنه الامام السالف الذكر المسيرة لعقيدة اهل السنة إلا انهم بالنسبة للحديث جماعة بكر ، وهم يهتمون بالحديث الصحيح والحسن لا غير.

والسيد عبدالله يرجوكم التفضل بقبول الدعوة حتى نرسل لكم التذاكر ، والسيد عبدالله سيحضر لمدة ٤ أشهر حيث يصل يوم ١٠/ مارس.

وأنتم بالخيار لجلوس كل المدة أو بعضها أو أكثر ، وسوف تجلسون في منزل محمد علي كلاى بشيكاغو وهو مكيف مركزيا ، وقد تبرع به محمد علي للمؤسسة و يبني جابر علي مقربة من هذا المنزل مسجداً علي نفقته الخاصة . . .»

(ریحانۂ عصر محدث فاضل مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی کی خدمت میں!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مجھے میرے آقا سید عبداللہ بن صدیق غماری محدث مقیم طنجہ نے ٹیلیفون پر، اور مکہ بازی (Boxing) کے عالمی چیمپین محمد علی کلے کے سیکریٹری مسٹر جابر محمد ہربرٹ نے جن کے پاس ان کے اسلامی ادارے میں میں کام کرتا ہوں، ہردو نے مجھے یہ حکم دیا، کہ میں آنمحترم سے رابطہ قائم کرکے یہ درخواست کروں کہ ۱۰/مارچ ۱۹۸۲ء کو ادارے کی زیارت کی دعوت قبول فرمائیں۔

اس دعوت کی غرض یہ ہے کہ مسٹر جابر محمد تمام صحیح اور حسن احادیث یا ان کے بیشتر حصے کو جمع کرنا چاہتے ہیں، سید عبداللہ بن صدیق نے اپنے ٹکٹ لے لئے ہیں تاکہ اپنی اہلیہ، خادمہ اور ایک معاون کے ساتھ تشریف لا سکیں [illegible]

سید عبداللہ یہاں گذشتہ موسم حج سے قبل ۱۱ر دنوں کے لئے آئے ہوئے تھے، اس وقت انھوں نے امریکہ کی اسلامی جماعت کے لئے لکھی گئی نماز پر ایک کتاب کی نظر ثانی فرمائی، اس جماعت کے صدر مسٹر جابر کے بھائی ہیں، اور اس کی تقریباً ۲۰۰ شاخیں مسجد اور مرکز کی صورت میں تمام امریکہ میں پھیلی ہوئی ہیں، اور اس کے بیشتر وارد و صادر سیاہ فام مسلمان ہیں۔ ان کے امام، محمد وارث الدین کا باپ، جو الیاجہ محمد کے نام سے جانا جاتا ہے، مدعی نبوت تھا، پھر جب اس کی موت واقع ہوگئی تو مذکورہ بالا امام نے اہل سنت کے عقیدہ کے مطابق اپنی روش درست کرلی، مگر یہ حدیث کی نسبت سے نوخیز جماعت ہے اور ان کے نزدیک صرف صحیح اور حسن حدیثوں کا اہتمام ہے۔

سید عبداللہ پر امید ہیں کہ آپ اس دعوت کو قبول فرمالیں گے تاکہ ہم ٹکٹ روانہ کردیں، سید عبداللہ ۴ر مہینے کے لئے تشریف لائیں گے اور دس مارچ کو یہاں پہونچیں گے۔

آپ کو اختیار ہے کہ چار مہینے قیام فرمائیں یا کم و بیش، آنجناب کا قیام شکاگو میں محمد علی کلے کے مکان پر ہوگا جو کہ (Central airconditioned) ہے اور جس کو محمد علی کلے نے مرکز کو عطا کردیا ہے، اور جابر اس مکان کے قریب اپنے صرفہ سے ایک مسجد تعمیر کررہے ہیں۔۔۔)

مذکورہ بالا خط میں امریکی مسلمانوں کے امام محمد وارث الدین کے باپ کی نسبت یہ تحریر ہے کہ وہ مدعی نبوت تھا، لیکن امام وارث الدین نے اپنی روش اور سیرت اہل سنت کے عقیدہ کے مطابق کرلی تھی، اور ہر چند کہ مدعو کرنے والے جناب محمد جابر ہر برٹ کا تعلق الیاجہ محمد کے ساتھ خط سے بظاہر نظر نہیں آتا، مگر پھر بھی بہت تامل کے بعد اس سفر کے لئے علامہ اعظمی نے کسی طرح سے خود کو آمادہ کیا تو احتیاط کا پہلو پیش نظر رکھتے ہوئے سید احمد درویش کو جواب لکھا:

"فقد تلقیت رسالتکم التی علی غلافها ختم البرید المورخ بالثامن عشر من ینایر ۱۹۸۲م بکل غبطة و سرور، وقد زاد نی سرورا علی سرور أنها صارت سببا لنوع من تجدد العهد بالشیخ عبدالله الصدیق الغماری حفظه الله.

وإنی أرجوك أن ترفع سلامی و تحیاتی الی حضرة الشیخ، ثم تخبره أني لبیت دعوة السید جابر امتثالا لأمره الشریف، و اعتمادا علیه فی أنه لا تکون تلبیتي هذه تصدیقا لدعوی نبوة أحد بعد سیدنا محمد صلی الله علیه وسلم، أو تاییدا لها، فإن عزمتم إرسال التذاکر فلتکن التذاکر ثلاثا ۰ ۰ ۰ ولتکن من دلهی إلی القاهرة، الی شیکاغو، والمقصود أن لا تفوتنی زیارة القاهرة بدءاً أو عوداً.

وإنی لا استطیع أن أمکث عندکم إلا أیاماً قلائل، و تفضلوا باهداء سلامی تحیة الاسلام الی السید جابر و ذویه. "

علامہ اعظمی فرماتے ہیں کہ "آپ کا خط، جس کے لفافے پر ۱۸ر جنوری ۱۹۸۲ء کی ڈاک کی مہر ثبت ہے، پا کر بڑی خوشی اور مسرت ہوئی، میری خوشی میں اس بات سے اور اضافہ ہو گیا کہ یہ شیخ عبداللہ صدیق غماری حفظہ اللہ کے ساتھ تجدید عہد کا سبب بنا۔

امید ہے کہ آپ میرا سلام و تحیہ جناب شیخ کی خدمت میں پہنچادیں گے، پھر آپ ان تک میرا یہ پیغام بھی پہنچادیں گے کہ میں نے مسٹر جابر کی دعوت کو، ان کے (شیخ عبداللہ غماری کے) حکم کی تابعداری کرتے ہوئے اور ان کے اوپر اس بات کے لئے اعتماد کرتے ہوئے قبول کرلیا ہے کہ میری یہ قبولیت، ہمارے آقا حضرت محمد ﷺ کی نبوت کے بعد، کسی کے دعویٰ نبوت کی تصدیق یا تائید کے لئے نہ سمجھی جائے، اس کے بعد اگر آپ ٹکٹ بھیجنا چاہتے ہیں تو ٹکٹ تین ہونے چاہئے

چاہئیں، اور یہ کہ وہ دہلی سے قاہرہ اور قاہرہ سے شکاگو کے ہوں، اس کا مقصد یہ ہے کہ آمد یا رفت میں قاہرہ کی زیارت کا موقع فوت نہ ہو۔

اور میں آپ کے یہاں چند دن سے زیادہ قیام نہیں کر سکتا، میرا اسلام، جو اسلامی طرز سلام ہے، مسٹر جابر اور ان کے متعلقین تک پہنچادیجئے۔"

علامہ اعظمی" اس سفر کے لئے آمادہ ہوگئے تھے، اور جہاں تک میرا خیال ہے اس سفر کا ایک بہت بڑا محرک قاہرہ کا شوق دید تھا، لیکن حالات نے مساعدت نہیں کی اور ناسازیٔ طبع کے باعث اس پروگرام کو ملتوی کرنا پڑا، اس کے بعد بھی کئی خطوط شیخ سید احمد دریش کے اس سفر کے لئے آئے، لیکن پھر آپ آمادہ نہیں ہوئے اور بہت سارے دعوتناموں کی طرح یہ دعوت نامہ بھی سرد خانے میں ڈال دیا گیا۔

صدر جمہوریہ ایوارڈ ۱۹۸۴ء میں علامہ اعظمی کو ان کی شاندار علمی خدمات کے اعتراف میں صدر جمہوریہ ایوارڈ دیا گیا، لیکن یہ ایوارڈ آپ کے لئے باعث اعزاز نہیں تھا، بلکہ اس کو قبول فرما کر آپ نے اس کی قدر و قیمت میں اضافہ فرمایا، انھوں نے تمام علمی خدمات خلوص وللّٰہیت کے ساتھ انجام دی تھیں، حطام دنیا کی حرص میں نہیں، اور نہ دنیا ان کی خدمتوں کا معاوضہ دینے پر قادر تھی، اس ایوارڈ کو علامہ اعظمی کی نذر کرنے کے لئے ڈاکٹر مختار الدین آرزو سابق صدر شعبۂ عربی علی گڈھ مسلم یونیورسٹی نے بھی کچھ کوشش کی تھی، چنانچہ علامہ اعظمی نے ان کو خط میں لکھا، جس کے لہجہ سے اظہار تشکر کے باوجود ناخوشی اور بیزاری صاف جھلکتی ہے:

"اب معلوم ہوا کہ جناب کا بھی اس میں ہاتھ ہے، چونکہ آپ نے نیک نیتی کے ساتھ میرے ساتھ ایک بہتر سلوک کیا ہے، اس لئے میں آپ کا شکر گذار ہوں، مگر میرے خیال میں پہلے میرا عندیہ معلوم کرنا ضروری تھا۔"(۱)

---

(۱) المآثر ج ۲ ش ا ص ۷۹

مدرسہ مرقاۃ العلوم میں سلسلہ درس وتدریس درس وتدریس کا سلسلہ پوری طرح کبھی متروک نہیں ہوا، بلکہ آخر دم تک جاری رہا، مرقاۃ العلوم کے قیام کے بعد بھی یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہا، بلکہ اس وقت تو چراغ صبح کی طرح اور تیز بھڑکنا شروع ہو گیا تھا، اور اس کے ابتدائے قیام سے لے کر آخری لمحے تک اس کے طلبہ کو محض اپنی شفقت و عنایت اور لطف و کرم سے کسی نہ کسی کتاب کا سبق پڑھاتے رہے، بلکہ کبھی کبھی تو ایسا ہوتا کہ کئی کئی کتاب کا سبق اپنے پاس رکھتے۔

متنبی اور حماسہ کا درس چنانچہ خود ہم نا اہلوں نے ان سے ایک ایک سال میں کئی کئی کتابیں پڑھیں، ۵۔۱۴۰۴ھ م ۸۵۔۱۹۸۴ء میں ہماری جماعت کو دیوان متنبی و دیوان حماسہ پڑھایا، کچھ دنوں پہلے تک ناچیز کے پاس موجود دیوان حماسہ پر ایک کور چڑھا ہوا تھا، جس پر اس ناچیز نے زمانۂ طالب علمی میں یہ نوٹ لگایا تھا:

"۲۷؍ جنوری ۱۹۸۵ء مطابق ۵؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۰۵ھ کو حضرت مولانا نے پہلا درس دے کر اس کتاب کو شروع کرایا، پھر اس کے بعد حضرت ہی کے پاس سبقاً سبقاً طلقاً طلقاً ہم سب یہ کتاب پڑھتے رہے۔"

مصنف ابن ابی شیبہ ابو بکر بن ابی شیبہ (متوفی ۲۳۵ھ) اس کے جامع اور مصنف ہیں، یہ کتاب بھی مصنف عبد الرزاق ہی کی طرح قدیم اور ضخیم ہے، اس کے قلمی نسخے مختلف کتب خانوں کی زینت بنے ہوئے تھے، اور اس کے کچھ اجزاء حیدر آباد اور ملتان وغیرہ سے شائع بھی ہوئے تھے، لیکن اس میں تصحیح و تحقیق کا اہتمام بالکل نہیں برتا گیا تھا، علامہ اعظمی نے بعض اہل علم کی فرمائش پر اس کی تحقیق و تعلیق اور تخریج و تحشیہ کا بیڑا اٹھایا، اور شبانہ روز کی محنت سے اس کی تقریباً ۱۵؍ جلدوں پر تحقیق و تحشیہ کا کام انجام دیا، مگر اس کی اب تک صرف چار ہی جلدیں شائع ہو سکی ہیں، یہ چاروں ہی علامہ اعظمی کی حیات میں شائع ہوئی تھیں، پہلی ۱۴۰۳ھ م ۱۹۸۳ء میں اور تین ۱۴۰۴ھ م ۱۹۸۴ء میں۔ اس کے بعد کی جلدیں بھی ناشر کے پاس بھیجی جا چکی ہیں، اب پتہ نہیں کس مرحلہ میں ہیں۔

بغداد کی اسلامی کانفرنس کے لئے دعوت | عراق، ایران جنگ سے پیدا شدہ صورتحال کے جائزہ کے لئے ۱۹۸۵ء میں ۲۲ تا ۲۵ اپریل بغداد میں ایک عالمی اسلامی کانفرنس منعقد کی گئی، اس کانفرنس کی انتظامی کمیٹی نے علامہ اعظمی کے نام دعوتنامہ بھیجا جسے اس وقت کے عراقی سفیر برائے دہلی فخری اے کیوالقیسی نے اپنے ایک خط کے ساتھ ملحق کر کے ۱۵/ مارچ ۱۹۸۵ء کو آپ کے پاس روانہ کر دیا، وہ خط ہدیہ ناظرین ہے:

"... I Have the honour to forward herewith text of telex message dated 11th of March, 1985 from the preparatory committee for the second Popular Islamic Conference to be held in Baghdad during 22-25 April, 1985. I shall be grateful if your acceptance is kindly conveyed as soon as possible for further action."

(میں دوسری عوامی اسلامی کانفرنس کی انتظامی کمیٹی کی طرف سے ۱۱/ مارچ ۱۹۸۵ء کو جاری کردہ ایک ٹیلکس پیغام کو آپ کی خدمت میں روانہ کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں، جس میں آپ کو، ۲۲ تا ۲۵/ اپریل ۱۹۸۵ء کو بغداد میں منعقد ہونے والی دوسری عوامی اسلامی کانفرنس میں شرکت کے لئے دعوت دی گئی ہے۔ میں آپ کا بڑا شکر گذار ہوں گا اگر آپ کی منظوری کی اطلاع جلد از جلد ہمیں موصول ہو جائے تاکہ آگے کی کارروائی کی جاسکے۔)

آپ نے یہ دعوت منظور فرمالی اور منظوری کی اطلاع عراقی سفیر برائے دہلی کو روانہ فرمادی، اس کے بعد اس سلسلہ میں بڑا دلچسپ واقعہ یہ پیش آیا کہ بغداد جانے کے لئے گھر سے پوری طرح تیار ہو کر نکلے، لیکن ابھی بنارس کے بابت پور ایرپورٹ ہی پر تھے کہ طبیعت کچھ ناساز محسوس کی، ناسازیٔ طبع کا یہ معمولی سا احساس وہیں سے ان کو گھر واپس لے آیا، یہ سفر سے وحشت کی وجہ سے تھا، ورنہ آپ کی طبیعت اس وقت ایسی نہ تھی کہ سفر جاری رکھا جاسکتا۔ آپ کی عدم شرکت سے وہاں کے منتظمین نے سخت افسوس کا اظہار کیا، اور کانفرنس کی کمیٹی کے سکریٹری جنرل محقق فاضل شیخ بشار عواد معروف نے (جو آپ کی

تحقیقات کے بڑے قدرداں بھی ہیں) اس کے اختتام کے بعد اظہار افسوس کرتے ہوئے اس کی قرارداد اور تفصیلات علامہ اعظمی کے ملاحظہ کے لئے خدمت عالیہ میں ارسال فرمائیں۔

سفر مصر مصر فتوحات اسلامیہ میں داخل ہونے کے بعد سے ہی اسلامی علوم و فنون اور تہذیب و ثقافت کا ایک اہم مرکز بن چکا تھا، اور جیسے جیسے زمانہ گذرتا گیا اس کی مرکزیت میں اضافہ ہوتا گیا، اس خاک سے ہر دور میں اہل دولت و ثروت، ارباب فضل و کمال، فقہاء و ادباء اور محدثین و مؤرخین اٹھے اور نام آور ہوئے ہیں، اور یہی نہیں بلکہ اس کی مرکزیت دوسرے ملکوں کے اہل علم کو بھی اپنی طرف کھینچتی رہی ہے، جو پیدا ہوئے اور پلے بڑھے تو کہیں اور، لیکن ان کے فیضان کا اصلی میدان یہی وادی نیل رہی، مصر آج بھی تجدد پسندی اور مغربیت سے شدید طور پر متاثر ہونے کے باوجود، عربی اور اسلامی ادب و ثقافت اور علم و فن کا مرکز شمار ہوتا ہے۔ دنیا کی قدیم ترین اسلامی درسگاہ اسی سرزمین پر واقع ہے، یہاں کے کتب خانوں میں نہ جانے کتنے بیش قیمت اور نادر مخطوطات پائے جاتے ہیں جن کا کہیں اور وجود نہیں، یہاں سے ہر سال بے شمار کتابیں چھپتی ہیں اور عالم اسلام بلکہ سارے عالم کے علمی حلقوں سے خراج تحسین وصول کرتی ہیں۔

مصر کی یہ علمی و ادبی مرکزیت اہل علم کیلئے ہمیشہ باعث کشش بنی رہی ہے، اس کے سفر اور زیارت کی خواہش علامہ اعظمی کو بھی ہمیشہ رہی، چنانچہ پہلے سفر حج ۱۹۵۰ء سے لے کر کئی دفعہ ان کے دل میں اس کی تحریک از خود پیدا ہوتی رہی۔ ایک آدھ بار وہاں سے دعوت نامے بھی آئے اور آپ آمادۂ سفر بھی ہوئے، لیکن کسی مانع کی وجہ سے یہ سفر معرض تعویق میں چلا گیا۔ پھر نومبر ۱۹۸۵ء میں قاہرہ میں ایک عظیم الشان بین الاقوامی کانفرنس منعقد ہوئی، جس میں شرکت کیلئے آپ کو بھی دعوت دی گئی۔ آپ نے اس سفر کا پروگرام بنایا، لیکن ارادہ و آمادگی کے باوجود طبیعت و مزاج کی وجہ سے کئی دفعہ ایسا محسوس ہوا کہ شاید اس بار بھی یہ سفر پیش آنے سے رہ جائے، لیکن جاذبہ توفیق نے ساتھ نہیں چھوڑا، اور اکتوبر ۱۹۸۵ء کے اواخر میں گھر سے دہلی کے لئے روانہ ہوئے

دہلی سے بمبئی گئے اور بمبئی سے قاہرہ کے لئے روانگی ۳۰ر نومبر کو ہوئی، اس سفر میں آپ کے بڑے صاحبزادے مولانا رشید احمد صاحب ہمراہ تھے، مصر میں آپ کا قیام ۱۳ر دن رہا، اس سفر میں مصری اہل علم اور کانفرنس کے شرکاء نے نہایت گرمجوشی کے ساتھ اور بڑے پرتپاک انداز میں آپ کا استقبال کیا، ہوٹل ماریوت (Marriot Hotel) جہاں آپ کا قیام تھا، آنے جانے والوں کا ہر وقت ایک سلسلہ لگا رہتا، جن میں بیشتر تعداد ان اہل علم کی ہوتی جو آپ سے استفادہ کرتے اور اپنے اشکالات و مسائل حل کرتے، وہاں کی نمایاں شخصیتوں میں ایک نہایت فاضل شخص ڈاکٹر حسینی ہاشم تھے، یہ اس وقت وکیل الازہر تھے انھوں نے علامہ اعظمی سے ان کے مدرسے کا الحاق جامع ازہر سے کرانے کی اصرار کے ساتھ پیشکش کی، لیکن آپ مصر کی مغرب پسندی اور تجدد کے سیلاب کی وجہ سے اس کے لئے تیار نہ ہوئے۔

آپ کے کاغذات میں ایک تجویز ملتی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کو آپ نے تحریری طور پر صدر کانفرنس کے سامنے پیش کیا تھا، وہ تجویز یہ ہے:

"أقترح على رئيس المؤتمر، أن يتخذ قرارا بطبع طبقات ابن سعد من جديد، كاملا، مع العناية بتحقيق النص، فإن الكتاب طبع مرتين، وفيه نقص كبير فى عدة مواطن، وهذا النقص يرجى تلافيه من اعتماد ما يوجد من صور أو أفلام الكتاب فى خزانة كتب جامعة الدول العربية بالقاهرة."

(میں کانفرنس کے صدر کے سامنے یہ تجویز پیش کرتا ہوں کہ وہ طبقات ابن سعد کی، تحقیق کے ساتھ، ازسرنو مکمل طباعت کی قرارداد پاس کریں، اس لئے کہ یہ کتاب دو دفعہ چھپی ہے اور اس میں کئی جگہ نقص ہے، اور اس نقص کی تلافی کی امید قاہرہ کی جامعۃ الدول العربیہ کی لائبریری میں موجود کتاب کی تصویروں یا فلموں پر اعتماد کر کے کی جا سکتی ہے)

یہاں یہ بھی عرض کردوں کہ علامہ اعظمی نے کبر سنی کے باوجود طبقات کی تحقیق کا حوصلہ بھی کیا تھا، اور ان کے دل میں اس عظیم الشان کام کی انجام دہی کا شدید داعیہ بھی پیدا ہوا تھا، چنانچہ انھوں نے اپنے اس ارادے کا اظہار وکیل ازہر ڈاکٹر حسینی ہاشم سے کیا، جو کانفرنس کے جنرل سکریٹری بھی تھے، تو انھوں نے اپنے دفتر کے لیٹر پیڈ پر جامعۃ الدول العربیہ کے مشرف، بریگیڈیر محمد عبدالظاہر ہاشم کے نام حسب ذیل تحریر لکھ کردی:

" فالمرجو التكرم بتمكين الشيخ حبيب الرحمن الأعظمی كبير محدثی الهند من تصوير نسخة من مخطوط الطبقات الكبرى لابن سعد الموجود بالجامعة و ذلك لما لفضيلته من جهود عظيمة فی خدمة السنة . "

(ہندوستان کے محدث کبیر شیخ حبیب الرحمٰن الاعظمی کو جامعہ میں موجود طبقات ابن سعد کے مخطوطے کی فوٹو کاپی کی فراہمی کی امید کی جاتی ہے، اس لئے کہ حدیث کی خدمت میں جناب کی عظیم الشان خدمات ہیں۔)

لیکن آپ کی زندگی کا پیمانہ اب آہستہ آہستہ لبریز ہوتا جارہا تھا، اور یہ زندگی بھی اب انتہائی مصروفیت کی تھی، اور اس سفر کے بعد عمر نے اتنی وفا نہ کی کہ یہ مہم انجام پاسکے، ورنہ اس کتاب کی تحقیق اگر آپ کے ہاتھوں ہوگئی ہوتی، تو ہندوستان کی علمی تاریخ میں ایک اور زریں باب کا اضافہ ہوگیا ہوتا، لیکن آں قدح بشکست وآں ساقی نماند

اسی کاغذ پر ایک دوسری تجویز بھی لکھی ہوئی ہے، وہ یہ ہے:

"وإن كتاب السيرة لمحمد بن إسحاق لا يوجد بكامله فيما أعتقد ، لكنه نقل إلى الفارسية فی عصر الحافظ عبدالعظيم المنذری ، وإن منها نسختين توجدان فی الهند ، إحداهما فی اله آباد، والأخرى فی سهارن پور ، فأقترح على الإمام الأكبر شيخ الأزهر أن يقرر

سماحته أخذ صورة الكتاب ثم نقله الى العربية ، ثم نشره ، عسى أن يسد مسد الأصل ، و يملأ الفراغ الذى نشعر به من فقد الأصل . "

(سیرۃ محمد بن اسحاق میرے علم کے مطابق پوری نہیں پائی جاتی، لیکن وہ حافظ عبدالعظیم منذری کے زمانہ میں فارسی میں نقل کی گئی تھی ، جس کے دو نسخے ہندوستان میں پائے جاتے ہیں، ایک الہ آباد میں اور دوسرا سہارنپور میں، لہذا میں امام اکبر شیخ ازہر کے سامنے یہ تجویز رکھتا ہوں کہ آنجناب کتاب کی فوٹو لینے اور اسے عربی زبان میں نقل اور نشر کا فیصلہ کریں، امید ہے کہ وہ اصل کی جگہ لے سکے گی اور اس خلا کو پر کر سکے گی جو ہم اصل کی گمشدگی سے محسوس کرتے ہیں)

مصر میں آپ کا قیام تیرہ دن رہا، اور ۱۶؍ نومبر کو وہاں سے واپسی کے لئے روانگی ہوئی، واپسی میں آپ کا ارادہ اردن رکنے کا تھا، اور اس کے لئے وزارت اوقاف کی فرمائش پر اردن کا ویزا بھی مل چکا تھا، مگر پھر طبیعت آمادہ نہ ہو سکی اور سیدھے وطن تشریف لائے۔

آپ کا یہ دورہ اس قدر مختصر تھا کہ مصری اہل علم ابھی آپ کے چشمۂ صافی سے اچھی طرح مستفید بھی نہ ہو سکے تھے، چنانچہ کانفرنس کے اختتام کے بعد وہاں کے وزیر اوقاف ڈاکٹر الاحمدی ابوالنور اور وکیل الازہر نے اصرار کر کے آپ کو روکنا چاہا، اور کہا کہ اب آپ ہمارے مہمان رہیں گے، مگر علامہ اعظمی مزید قیام کے لئے تیار نہ ہوئے اور واپسی کے بعد ڈاکٹر احمدی ابوالنور (۱) نے جلد ہی پھر علامہ اعظمی کو دعوت دے کر انھیں

(۱) ڈاکٹر الاحمدی ابوالنور علامہ اعظمی کے فضل و کمال کے بڑے معترف تھے ، جس کا اندازہ ان کی اس بات سے ہوتا ہے جس کو وزیر احمد صاحب ندوی نے قاہرہ سے ۲۰؍ اپریل ۸۶ء کو لکھا ہے کہ ایک اعظمی لڑکے کا ازہر میں مناقشہ (Viva Voce) ہوا، مناقش بھی ڈاکٹر صاحب موصوف تھے ، انھوں نے اس لڑکے کے نام کیساتھ جب الاعظمی دیکھا تو فوراً بول پڑے :" أسرة الأعظميين التى يتزعمها الشيخ حبيب الرحمن الأعظمى حفظه الله، لا تزال تخدم السنة النبوية . " وہ سمجھتے تھے کہ اعظمی کوئی خاندان یا قبیلہ ہے اس لئے انھوں نے کہا (اعظمیوں کا خاندان جس کے سربراہ شیخ حبیب الرحمن الاعظمی حفظہ اللہ ہیں، برابر حدیث نبوی کی خدمت کر رہا ہے۔)

مصر بلانا چاہا، اور اس کے لئے انھوں نے خود ہی دو ٹکٹ بھیجنے کی بھی خواہش ظاہر کی، جیسا کہ ڈاکٹر صلاح الدین ندوی ازہری نے اس سفر کے تقریباً پونے دو مہینے بعد ۷ر جنوری ۱۹۸۶ء کو خط لکھا کہ وکیل ازہر ڈاکٹر حسینی ہاشم نے ان کے پاس وزیر موصوف کا یہ پیغام بھیجا کہ ان کی خواہش ہے کہ مولانا اعظمی اگر قاہرہ آنے کا ارادہ کریں تو وہ (الاحمدی ابوالنور) دو ٹکٹ بھیج دیں، لیکن ما کل ما یتمنی المرء یدرکہ۔

جنوبی ہند کا ایک سفر شدید ترین تدریسی، تصنیفی اور تحقیقی مصروفیات اور علمی مشاغل کے باوجود آپ تقریباً ہر مہینہ اور ہر سال تھوڑا بہت وقت اندرون ملک کے سفر کے لئے نکال لیتے تھے، اور اس طرح سے مختلف اوقات میں تقریباً ملک کے ہر حصے کے سفر فرمائے، کتابوں اور بالخصوص نادر مخطوطات سے چونکہ آپ کو شیفتگی اور وارفتگی تھی، اسلئے ان مقامات کے سفر کا شوق زیادہ دامنگیر رہتا جہاں بڑے بڑے کتب خانے ہوں اور ان میں مطبوعات و مخطوطات کے قیمتی ذخائر ہوتے، ان کے علاوہ مذہبی، ملی اور علمی اداروں کی دعوتوں پر بھی آپ نے اندرون ملک بہت سے دورے کئے، یہاں ہم جنوبی ہند کے ایک سفر کا تذکرہ اس بنا پر کر رہے ہیں کہ اس کے بارے میں خود علامہ اعظمیؒ کی ایک تحریر ہمیں دستیاب ہوئی ہے، آپ کو یادداشت تحریر کرنے کی باقاعدہ عادت نہیں تھی، بس اتفاقیہ کبھی کوئی بات کسی کاغذ پر تحریر کر دیتے، چنانچہ ان منتشر تحریروں نے اس سوانح کی ترتیب میں ہماری بڑی رہنمائی بھی کی ہے۔ انھیں اتفاقی تحریروں میں یہ بھی ہے:

"۱۰ر مارچ ۱۹۸۶ء کو ساڑھے چار بجے بنارس سے روانہ ہوئے، دہلی ۶ر بجے پہنچے، ٹیکسی کر کے مسجد عبدالنبی آکر قیام کیا۔ ۱۱کی صبح ۹ بجے ایرپورٹ کے لئے روانہ ہوئے، بنگلور کیلئے پونے گیارہ بجے روانہ ہوئے، سوا بجے بنگلور پہونچے، ایرپورٹ پر استقبال کیلئے لوگ آگئے ان کے ساتھ شہر میں آکر مدنی منزل حریر ٹاؤن میں قیام ہوا، ۱۲ر کو اصلاح البنات اور جامعۃ العلوم میں دعا کیلئے گئے، اور مدرسہ شاہ ولی اللہ میں نماز عصر ادا کی، اس کے بعد سراج العلوم جلسہ عام میں شریک ہوئے۔"

بعد مغرب حفاظ کی دستار بندی عمل میں آئی یہ تقریب اس ناچیز کے ہاتھوں سے انجام پائی۔ ۱۳ر کی صبح کو سیلم کے لئے روانہ ہوئے، دھرم پوری مدرسہ معراج العلوم دیکھا، اور اس سے متعارف ہوا، مدرسہ کے ایک کارکن کے یہاں دوپہر کا کھانا کھایا۔ اس سفر میں مولانا معراج الحق (۱)، مولانا مرغوب الرحمٰن (۲)، مولانا سعید احمد پالنپوری (۳)، مولانا قمر الدین (۴) اور حاجی علاء الدین (۵) سیلم تک

---

(۱) رجب ۱۳۲۸ھ م ۱۹۱۰ء میں دیوبند میں پیدا ہوئے، آپ کے والد بزرگوار منشی نور الحق بسلسلۂ ملازمت پنجاب کے ایک قصبہ "برنالہ" میں مقیم تھے، وہیں آپ نے پرائمری درجات کی تعلیم پائی، اس کے بعد مڈل تک کی تعلیم دیوبند میں حاصل کی، بعد ازاں دیوبند میں ہی اردو فارسی اور عربی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں، ۱۳۴۵ھ میں آپ کے والد کا تبادلہ سہارنپور ہو گیا، ساتھ ہی آپ بھی وہاں کے مدرسہ مظاہر علوم میں داخل ہو گئے، ۱۳۴۹ھ میں دار العلوم میں دوبارہ داخلہ لیا اور ۱۳۵۱ھ میں فراغت پائی، اس کے بعد پنجاب یونیورسٹی سے "مولوی فاضل" کا امتحان دیا، درس و تدریس کی ابتدا مدرسہ ہاشمیہ جامع مسجد زکریا اسٹریٹ بمبئی سے کی، یہاں ۱۳۵۳ھ م ۱۹۳۴ء سے ۱۳۵۸ھ م ۱۹۳۹ء تک رہے، اس کے بعد گلبرگہ گئے، جہاں مدرسہ دینیہ روضتین کے اہتمام و صدارت کا منصب آپ کے سپرد رہا، ۱۳۶۲ھ ۱۹۴۳ء میں آپ کا تقرر دار العلوم میں ہو گیا، درس و تدریس کے علاوہ دار العلوم میں مختلف انتظامی ذمہ داریاں بھی آپ نے سنبھالیں، چنانچہ ۱۳۸۲ھ ۱۹۶۲ء سے ۱۳۹۳ھ ۱۹۷۳ء تک نیابت اہتمام کا عہدہ سنبھالا، اور ۱۴۰۲ھ سے تادم آخر صدارت تدریس کے منصب پر فائز رہے۔ ۷ر صفر ۱۴۱۲ھ ۱۸ر اگست ۱۹۹۱ء یکشنبہ کو داعیٔ اجل کو لبیک کہا، (دار العلوم وفیات نمبر ۱۳۵۔۱۴۳)

(۲) دار العلوم دیوبند کے موجودہ مہتمم ہیں۔

(۳) دار العلوم میں استاذ حدیث ہیں تدریسی صلاحیت کمال کی ہے، درس ترمذی کو خاص شہرت حاصل ہے۔

(۴) بوبل گنج گورکھپور کے باشندہ اور دار العلوم میں استاذ ہیں۔

(۵) گجرات کے باشندے، بمبئی کے چائے کے مشہور تاجر اور دار العلوم دیوبند کی شوریٰ کے رکن تھے، تبلیغی جماعت میں بہت پیش پیش رہتے تھے۔

ہم سفر رہے، سیلم میں مولانا شفیق الرحمن خاں (۱) صاحب کا مسکن قیام گاہ رہا، ۱۳ / ر کو بعد عصر مظاہر علوم سیلم کے چھ لڑکوں کو بخاری شریف ختم کرایا اور ان کی دستار بندی کی، پھر وہاں کے اساتذہ نے بخاری شریف کی پہلی حدیث پڑھ کر اجازت حاصل کی، بعد مغرب مدرسہ داؤدیہ (ایروڈ) وغیرہ کے اساتذہ نے بخاری شریف کی پہلی حدیث پڑھ کر اجازت حاصل کی، وہاں سے دوسرے دن ۱۴ / ر مارچ کو وانمباڑی کے لئے بذریعہ کار روانہ ہوئے، براہ دھرم پوری و کرشنا گیری وانمباڑی دوپہر کو پہنچے، پروفیسر نصر اللہ لینے کیلئے سیلم پہونچے تھے، وانمباڑی میں حاجی عبد الحمید آلت تور کے مکان پر قیام رہا، بعد مغرب مسجد قادر پیٹ میں بیان ہوا، دوسرے دن ناشتہ کے بعد وانمباڑی کے مدرسہ معدن العلوم کو دیکھتے ہوئے وہاں سے روانہ ہوئے۔ آمبور، عمر آباد، گڈیاتم ہوتے ہوئے پرنام بٹ کے مدرسہ وصیۃ العلوم پہنچے، وہاں پر دعا وغیرہ سے فارغ ہو کر پلمنیر کیلئے روانہ ہوئے، پرنام بٹ کے مدرسہ کے سرپرست مفتی ثناء احمد صاحب اور ناظم مفتی سعید بن مفتی محمود صاحب مرحوم ہیں۔ حکیم ذکی الدین اور حکیم محمد امین بھی مدرسہ سے تعلق رکھتے ہیں، مفتی محمود صاحب مرحوم حضرت شاہ وصی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مجاز تھے، اور ان کے لڑکے مولانا ابرار الحق صاحب کے مجاز ہیں۔ وہاں سے پلمنیر کے مدرسہ معہد العلوم الاسلامیہ پہنچے، جو صوبہ آندھرا میں ہے، اس کے ناظم و بانی مولانا عبد الرحیم صاحب ہیں، وہاں پر معہد کے ہمارے اساتذہ اور بنگلور کے بہت سے علماء جن کی تعداد ۲۲ تھی، اوائل کی پہلی حدیث پڑھ کر اجازت حاصل کی، اس کے مدرسہ کی جدید عمارت کی بنیاد رکھی۔"

(۱) سیلم کے مدرسہ مظاہر علوم کے شیخ الحدیث ہیں، ذیقعدہ ۱۴۰۱ھ میں مئو آئے، اور ہماری جماعت کے ساتھ علامہ اعظمی کے صحیح بخاری کے درس میں شریک ہوئے، یہ مرقاۃ العلوم میں دورۂ حدیث کا آغاز تھا، جس میں موصوف کے علاوہ ایک جوان شامی فاضل شیخ ایمن رشدی سوید بھی شریک ہوئے، مولانا موصوف تقریباً دو ہفتے کے قیام کے بعد تشریف لے گئے۔

قراءت واجازت حدیث کی اس مبارک تقریب کا ۱۵؍مارچ ۱۹۸۶ء مطابق ۴؍رجب ۱۴۰۶ھ بروز سنیچر دس بجے دن میں انعقاد کیا گیا تھا، اس تقریب سعید کے لئے مولانا عبدالرحیم صاحب مدیر معہد نے خاص اہتمام کیا اور حصول برکت کے لئے علماء کے علاوہ اعیان شہر اور قرب وجوار کے معززین کو شرکت کی دعوت دی تھی، جس کیلئے انھوں نے باقاعدہ دعوتنامہ چھپوا کر اہل شہر میں تقسیم کرایا تھا۔

دست کار اہل شرف یہ علامہ اعظمی کی ایک قدیم تصنیف ہے لیکن زمانہ تصنیف کے بعد عرصۂ دراز تک زیور طباعت سے آراستہ نہیں ہو سکی تھی، یہ کتاب ان بلند پایہ اکابر کے تذکروں پر مشتمل ہے جن کا تعلق پارچہ بافی کے پیشہ سے تھا۔ ۱۴۰۶ھ مطابق ۱۹۸۵ء میں حسن پریس (مئو) سے چھپ کر مکتبۂ اعظمی (مئو) سے شائع ہوئی۔

بیضاوی، قطبی اور طحاوی کا درس اس وقت احساس نہیں تھا، مگر آج جب حضرت استاذ رحمۃ اللہ علیہ کی شفقت وعنایت یاد آتی ہے تو سوچ کر آنکھیں نم ہو جاتی ہیں، آپ کا کرم موسلا دھار بارش کی طرح برستا تھا، لیکن زمین ہی شور تھی، اپنے اندر کچھ اگانے کی صلاحیت کہاں سے پیدا کرتی! قربان جایئے ان کی شفقت وعنایت کے! متنبی وحماسہ پڑھانے کے اگلے ہی سال (۶-۱۴۰۵ھ) ہم نالائقوں کو تفسیر بیضاوی سورہ بقرہ تک، اس کے بعد قطبی تصدیقات اور امام طحاوی کی شرح معانی الآثار کے کچھ حصے پڑھائے، اس کے علاوہ ایک دوسری جماعت کو کچھ دنوں توضیح وتلویح اور حافظ ابن حجرؒ کی شرح نخبۃ الفکر اور ابتدائی درجے کو بچوں کو المنہاج الجدید پڑھائی۔

قطر یونیورسٹی سے دعوت ۱۹۸۶ء میں قطر یونیورسٹی کے مرکز بحوث السنۃ والسیرۃ (سنت وسیرت ریسرچ سینٹر) کی طرف سے علامہ اعظمی کو دو مہینے کے لئے قطر یونیورسٹی میں قیام اور وہاں رہ کر کچھ علمی امور کی انجام دہی کیلئے دعوت دی گئی، جس کیلئے وہاں کے مدیر جامعہ ا.د. محمد ابراہیم کاظم نے آپ کی خدمت میں ایک خط روانہ کیا، جس وقت یہ

خط پہونچا ہے آپ جنوبی ہند کے سفر پر تھے، یہ علامہ اعظمی کی زندگی کا وہ دور تھا جب آپ جسمانی طور پر ضعف واضمحلال اور امراض کا شکار ہو چکے تھے، اس لئے ایک رفیق سفر کی شرط کے ساتھ اس سفر کیلئے آمادگی ظاہر فرمادی، آپ کی اس مشروط رضامندی کی اطلاع جب مدیر مرکز علامہ ڈاکٹر شیخ یوسف قرضاوی کو ملی ہے تو انھوں نے خوشی و مسرت کے عالم میں ۱۸؍ محرم ۱۴۰۷ھ مطابق ۲۲؍ ستمبر ۱۹۸۶ء کو حسب ذیل خط روانہ فرمایا:

"فضيلة المحدث الكبير الشيخ / حبيب الرحمن الأعظمي
حفظه الله

السلام عليكم و رحمة الله و بركاته وبعد!

سبق لجامعة قطر أن أرسلت لفضيلتكم تدعوكم أستاذا زائراً لمدة شهرين لمركز بحوث السنة والسيرة، وطلبتم فضيلتكم بعد ذلك ضرورة السماح لمرافق لكم من بداية الرحلة حتى نهايتها.

يسرني أن أوضح لفضيلتكم أن جامعة قطر يشرفها حضوركم أستاذا زائراً لمدة شهرين للاستنارة برأيكم في جهود المركز، و بخاصة حول الموسوعة المقترحة للحديث النبوي الشريف.

كما يسرني أن أعلمكم أنه لا مانع من اصطحابكم من ترونه ليرافقكم في هذه الزيارة كما طلبتم.

فيرجى التفضل بموافاتنا ببيانات جوازي سفركم والمرافق و تحديد موعد حضوركم، حتى يمكن اتخاذ اللازم.

مع خالص تحياتي و تحيات الاخوة هنا من أساتذة كلية الشريعة وأعضاء المركز نسأل الله لكم الصحة والعافية في دينكم ودنياكم.

والسلام عليكم و رحمة الله وبركاته

مدير المركز . يوسف القرضاوي"

(فضیلت مآب محدث کبیر شیخ حبیب الرحمٰن الاعظمی حفظہ اللہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

قطر یونیورسٹی اس سے قبل جناب والا کی خدمت میں ایک دعوتنامہ ارسال کر چکی ہے ، جس میں آنجناب کو سنت وسیرت ریسرچ سینٹر کیلئے دو مہینے کے واسطے استاذ زائر (Visiting Professor) کی حیثیت سے دعوت دی ہے اور اس کے بعد آنجناب نے آغاز سفر سے اختتام سفر تک ایک معاون کی اجازت کا مطالبہ کیا ہے۔

مجھے آنجناب سے یہ کہتے ہوئے خوشی محسوس ہوتی ہے کہ قطر یونیورسٹی میں دو مہینے کیلئے استاذ زائر کی حیثیت سے آپ کی تشریف آوری مرکز کی کوششوں میں آپ کی رائے سے استفادہ کا شرف بخشے گی ، بالخصوص حدیث نبوی کی مجوزہ انسائیکلوپیڈیا کے سلسلے میں۔

اسی طرح مجھے یہ عرض کرتے ہوئے خوشی ہوتی ہے کہ اسکے لئے آپ کے حسب طلب ونشا ایک رفیق سفر سے کوئی چیز مانع بھی نہیں ہے۔

لہذا امید ہے کہ آپ اپنے اور رفیق سفر کے پاسپورٹ کی تفصیلات اور تشریف آوری کے وقت کی تعیین سے مشرف فرمائیں گے ، تاکہ اس کے لئے ضروری کارروائی کی جاسکے۔

میرا اور کلیۃ الشریعۃ کے میرے پروفیسر دوستوں اور مرکز کے ارکان کا پر خلوص سلام قبول فرمائیں ، ہم خدا سے دین ودنیا کے اندر آپ کی صحت وعافیت کے لئے دعا گو ہیں۔

والسلام علیکم..... مدیر مرکز

یوسف قرضاوی)

حادثۂ لغزش پا علامہ اعظمی کی پوری زندگی ابتلاء سے عبارت رہی، عمر کے اخیر حصے میں جب کہ آپ کی ایک ایک سانس اور ایک ایک لمحے کی قدر و قیمت میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا، ایک اور سخت مصیبت سے دوچار ہوئے، ۱۹۸۶ء اگست یا ستمبر کی بات ہے کہ استنجاء کے لئے تشریف لے جارہے تھے، حمام رہائشی کمرے سے بالکل متصل ہی تھا، ناگاہ پاؤں پھسل گیا، بغیر سہارے کے تو آپ کا چلنا مشکل تھا پھسلنے کی صورت میں کہاں خود کو سنبھال سکتے تھے، بے اختیار زمین پر گرے، جس کے نتیجہ میں سخت چوٹیں آئیں اور سب سے زیادہ تکلیف دہ بات یہ ہوئی کہ پسلی کی ہڈی پر شدید چوٹ آئی، اور بہت علاج و معالجے کے بعد بھی اس کا اثر ایک عرصے تک رہا، بلکہ شاید آخر تک مکمل طور پر زائل نہیں ہوا۔

انتخاب امیر الہند ہندوستان میں امارت شرعیہ کے قیام کے لئے طویل عرصہ سے کوشش کی جارہی تھی، برطانوی سامراج کے زمانے میں ہندوستان کے اکابر علماء قیام امارت کے لئے اپنی کوششیں صرف کر چکے تھے، جمعیۃ علماء ہند تو اپنے قیام کے آغاز ہی سے اس مسئلہ پر غور و خوض کر رہی تھی، لیکن سامراج کے زمانے میں چونکہ حالات موافق و مساعد نہیں تھے اور علماء و سربراہان ملت کے سامنے سب سے اہم مسئلہ انگریزوں کے پنجۂ اقتدار سے رہائی کا تھا، اس لئے ان کا یہ فکر حیطۂ عمل میں نہیں آرہا تھا۔

امارت شرعیہ کا فکر اساسی اور اس کا اصلی اور بنیادی مقصد یہ تھا کہ ہندوستان کا مسلم معاشرہ جو انتشار و پراگندگی کا شکار ہے۔، اس کی شیرازہ بندی کی جائے، اور اس کے منتشر اور بکھرے ہوئے شیرازوں کو اس طرح جوڑا جائے کہ وہ ایک یونٹ اور اکائی معلوم ہونے لگے، کیونکہ مسلمانوں کی اصل قوت اجتماع و اتحاد میں ہے نہ کہ افتراق و انتشار میں۔ اور اجتماعیت ہی میں اسلامی شان و شوکت اور قوت و عظمت کا راز مضمر ہے۔ لہذا ہندوستانی مسلمانوں کو ایسے مواقع فراہم کئے جائیں کہ اسلامی شریعت کے مطابق اپنی زندگی گذار سکیں، اور اس کے قوانین کے تحت اپنے مسائل کو حل کرسکیں۔ اپنے اسی فکر کو روبہ کار

کو روبہ کار لانے کیلئے ۲؍ نومبر ۱۹۸۶ء مطابق ۲۸؍ صفر ۱۴۰۷ھ کو جمعیۃ نے دفتر جمعیۃ علماء ہند نئی دہلی میں اہل علم و فضل اور ارباب فکر و بصیرت کا ایک نمائندہ اجتماع بلایا، جس میں علامہ اعظمی کو باتفاق رائے امیر الہند اول منتخب کیا گیا ، علامہ اعظمی اپنی معذوری کے باعث اس اجتماع میں شریک نہ ہو سکے تھے ، لیکن امیر الہند ہونے کا ان کے جیتے جی ان سے زیادہ مستحق بھی کون ہو سکتا تھا، تاہم یہ امر بھی یقینی ہے کہ امارت نے ان کی قدر و منزلت نہیں بڑھائی بلکہ انھوں نے اپنی ذات سے اس کو اعتبار بخشا۔

مرقاۃ العلوم میں دورۂ حدیث اور علامہ اعظمی کا درس بخاری و ترمذی و مقدمہ مسلم

۱۴۰۶ھ مطابق ۱۹۸۶ء میں مرقاۃ العلوم میں دورۂ حدیث کا آغاز ہوا، یہ سال ہم نااہلوں کا سندی سال تھا، ہم اس قابل تو ہرگز نہ تھے کہ محدث کبیر کے شاگرد کہلائے جاتے، کجاوہ آفتاب علم و فضل اور کجا یہ چند بے مقدار ذرے! چہ نسبت خاک را با عالم پاک!! واقعہ یہ ہے کہ آج تک اپنی نالائقی کا احساس ہر وقت دامنگیر رہتا ہے اور دل میں یہ خیال اکثر و بیشتر آتا رہتا ہے کہ :

خر عیسیٰ اگر بہ مکہ رود　　چوں بیاید ہنوز خر باشد

لیکن چونکہ ہم روایتی طور پر دورۂ حدیث پڑھنے کے مستحق ہو گئے تھے ، اس لئے اس روایت پر عمل بھی ضروری خیال کیا گیا، اگرچہ محدث کبیر کسی کے پابند نہیں تھے، مگر خورد نوازی کا بے پناہ جذبہ جو ان کے اندر موجزن رہتا تھا، کام آیا اور دورۂ حدیث کا باقاعدہ آغاز ہو گیا:

ایں سعادت بزور بازو نیست　　تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

۲۵؍ شوال بروز بدھ ۱۴۰۶ھ کو مسلم شریف کے مقدمے سے اس کی ابتداء ہوئی، چنانچہ آج بھی راقم الحروف کے پاس موجود مسلم شریف پر جلد ساز نے الگ سے جو ایک کاغذ لگا رکھا ہے، تحریر ہے:

"تلقينا الدرس الاول من هذا الكتاب على فضيلة مولانا (بارك

الله فی عمره و حیاته) صباح الاربعاء ۲۵ / شوال سنة ۱۴۰۶ھ)
(اس کتاب کا پہلا سبق ہم نے حضرت مولانا (اللہ ان کی عمر و حیات میں برکت عطا فرمائے) کے پاس ۲۵ / شوال ۱۴۰۶ھ کو بدھ کے دن پڑھا)

آپ نے ہم لوگوں کو مسلم شریف کا صرف مقدمہ پڑھایا۔ اس کے بعد یہ کتاب حضرت مولانا عبدالجبار صاحبؒ اور مولانا نسیم اللہ صاحب کے سپرد کر دی۔ اسی طرح ترمذی شریف پر تحریر ہے:۔

"تلقینا الدرس الاول من هذا الکتاب علی فضیلة الشیخ حضرة الاستاذ أبی المآثر حبیب الرحمن الأعظمی صباح السبت ۲۸ شوال سنة ۱۴۰۶ھ ثم کنا نقرأه علیه طلقا طلقا و درساً درساً"
(اس کتاب کا پہلا سبق ہم نے فضیلۃ الشیخ حضرت الاستاذ ابوالمآثر حبیب الرحمٰن الاعظمی (رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ) کے پاس ۲۸ / شوال ۱۴۰۶ھ سنیچر کی صبح کو پڑھا، پھر ہم آہستہ آہستہ اس کتاب کو آپ کے پاس پڑھتے رہے)

مقدمہ مسلم اور ترمذی شریف کے اسباق ہوتے رہے، لیکن بخاری شریف کا درس ابھی شروع نہیں ہوا تھا، اس کی وجہ یہ تھی کہ حضرۃ الاستاذ علامہ اعظمی مرحوم کا ارادہ یہ تھا کہ اس مبارک موقع پر ہندوستان کے اکابر اہل علم کو شرکت کی دعوت دیتے اور اہل علم کے اس اجتماع میں درس بخاری کا آغاز ہوتا لیکن ع

ما درچہ خیالیم و فلک درچہ خیال ست

عجیب اتفاق کہ انھیں دنوں ایک شامی فاضل شیخ ایمن رشدی سوید علامہ اعظمی سے بخاری شریف پڑھنے کیلئے مئو حاضر ہوئے، ان کی تشریف آوری غالباً ذی قعدہ کی پہلی تاریخ کو ہوئی تھی۔ ان کے آنے کا مقصد یہ تھا کہ علامہ اعظمی کے پاس بخاری شریف سبقاً سبقاً پڑھ کر اجازت و سند حاصل کریں، جس کے لئے وہ تین ہفتہ یہاں مقیم رہے، میرے

پاس موجود بخاری شریف پر ایک ٹوٹی پھوٹی عبارت درج ہے، اس میں تحریر ہے:

"بدأنا هذا الكتاب عند فضيلة الشيخ الاستاذ حبيب الرحمن الاعظمي يوم الخميس ١٤٠٦/١١/٢هـ قرأناه عليه رواية ٢٢ يوما يقرؤه عليه الشيخ أيمن رشدي السويد و نحن نسمع حتى انتهينا إلى آخر كتاب الصوم ١٤٠٦/١١/٢٣هـ صباح الخميس ، و بدأناه دراية صباح السبت ١٤٠٦/١١/٢٥هـ"

(اس کتاب کو ہم نے حضرۃ الاستاذ مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی کے پاس جمعرات ۲/ذی قعدہ ۱۴۰۶ھ کو صبح میں شروع کیا، ہم آپ کے پاس اس کتاب کو روایۃً ۲۲/دن تک اس طرح پڑھتے رہے کہ شیخ ایمن رشدی سوید پڑھتے اور ہم سنتے، یہاں تک کہ جمعرات ۲۳/ذیقعدہ ۱۴۰۶ھ کی صبح کو کتاب الصوم ختم کر ڈالی، پھر اس کے بعد ۲۵/ذی قعدہ ۱۴۰۶ھ کی صبح کو معنی و مطلب کے ساتھ آپ کے پاس پڑھنا شروع کیا۔)

اس طرح علامہ اعظمی نے اس سال (۱۴۰۶-۷ھ م ۸۷-۱۹۸۶ء) بخاری شریف مکمل، ترمذی شریف کی دونوں جلدوں کے اکثر حصے، اور مقدمۂ مسلم پڑھائی، یہ زمانہ آپ کے نہایت ضعف اور کمزوری کا زمانہ تھا، نقاہت کی وجہ سے بیٹھ نہیں سکتے تھے، لیٹ کر پڑھاتے تھے، مگر کس قدر ہمت تھی کہ سوائے طبیعت کی خرابی یا سفر کے کبھی ناغہ نہیں ہوا، وقت معین پر طبیعت ہموار نہ ہوتی تو کسی دوسرے وقت بلا لیتے اور یہی نہیں پورے رمضان بخاری شریف پڑھائی، بالآخر ۱۶/شوال ۱۴۰۷ھ مطابق ۱۳/جون ۱۹۸۷ء کو آپ نے مرقاۃ العلوم کی مسجد میں ایک عظیم الشان اجتماع میں بخاری شریف کا آخری درس دے کر اس کا اختتام فرمایا۔

حجاز کا آخری سفر اوپر گذر چکا ہے کہ ذی قعدہ ۱۴۰۶ھ میں ایک شامی فاضل شیخ ایمن رشدی سوید مئو آئے، موصوف شامی الاصل ہیں، لیکن سعودی عرب کے شہر جدہ میں

سکونت پذیر ہیں، شام کے صدر حافظ الاسد کا جب وہاں کے علماء پر قہر ٹوٹا اور دارو گیر شروع ہوئی، تو بہت سے اہل علم کی طرح یہ بھی ترک وطن پر مجبور ہوئے، ۱۳۹۸ھ م ۱۹۷۸ء میں جب علامہ اعظمی نے شام کا سفر کیا تھا، اس وقت شیخ ایمن نے بھی آپ سے نیاز حاصل کی تھی اور عقید تمندوں کے حلقے میں داخل ہوئے تھے۔

ان کے اندر علم کا شوق اور طلب و تڑپ بلا کی تھی، اس کی دلیل اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگی کہ صرف حدیث پڑھنے کی غرض سے ہزاروں میل کا سفر کر کے مئو آئے، اور ہر طرح کی مشقت برداشت کرتے ہوئے تقریبا ۳ رہفتے قیام پذیر رہے اور علامہ اعظمی سے بخاری شریف کا درس لیتے رہے، علامہ اعظمی بھی موصوف کی رعایت کرتے ہوئے ضعف و نقاہت اور بسا اوقات طبیعت کی ناہمواری کے باوجود روزانہ کئی کئی صفحات پڑھا جاتے، چنانچہ تین ہفتہ کی اس مدت میں انھوں نے بخاری شریف کا معتدبہ حصہ پڑھ لیا، مگر ختم ہونے کی نوبت نہ آنے پائی، تین ہفتے قیام کے بعد وہ یہاں سے واپس تشریف لے گئے، یہاں سے جانے بعد بقیہ حصے کی تکمیل کیلئے ان کی خواہش ہوئی کہ علامہ اعظمی حجاز کا سفر فرمائیں، تاکہ ان کے ساتھ وہاں کے دوسرے اہل علم کو بھی استفادہ کا موقع ملے، اور آپ کو بھی زیارت وعمرہ کی ایک بار پھر سعادت حاصل ہو جائے، بالآخر ان کے جانے کے سوا سال بعد ربیع الاول ۱۴۰۷ھ میں کسی طرح اس سفر کے لئے وقت نکال سکے۔

علامہ اعظمی نومبر ۱۹۸۶ء کے شروع میں مئو سے دہلی، اور ۸ر نومبر ۱۹۸۶ء م ۷ ار ربیع الاول ۱۴۰۷ھ کو دہلی سے جدہ کیلئے سعودی ایر لائنز کے طیارہ سے روانہ ہوئے، اس سفر میں آپ کے ہمراہ مولانا رشید احمد اعظمی اور فاضل محترم مولانا محمد یحیی صاحب ندوی بھی تھے، جہاز جب سعودی عرب کے دار الحکومت ریاض پہنچا تو وہاں شیخ عبد الفتاح ابو غدہ اور بعض دوسرے اہل علم نے شاندار استقبال کیا، پھر اس کے بعد جدہ کیلئے روانہ ہوئے۔

اس سفر میں مولانا یحیی صاحب نے علامہ اعظمی کی عربوں میں مقبولیت اور پذیرائی کا جو منظر دیکھا اس کا تذکرہ وہ لطف لے لے کر کیا کرتے تھے، مستفیدین کا ایک

سلسلہ لگا رہتا تھا، علماء و طلباء آپ کے پاس استفادہ کی غرض سے اس طرح آتے جاتے کہ " طاروا الیہ زرافات و وحدانا " کی مثال بن گئے تھے، جسے خلوت پسندی کے اپنے مزاج کے باوجود محض علم ودین کی خدمت لئے آپ گوارا کرتے، چنانچہ اس سفر میں جدہ اور مکہ ومدینہ کے بہت سے اہل علم نے سند واجازت حاصل کی۔

اس سفر میں آپ زیارت حرمین اور عمرہ سے بھی مشرف ہوئے، اسی موقع پر مولانا محمد یحیی صاحب نے سوال کیا کہ تمام محدثین اور اہل علم نے یہاں کوئی نہ کوئی خاص دعا ضرور کی ہے، آپ نے کیا دعا مانگی؟ علامہ اعظمی نے فرمایا، حافظ ابن حجر نے آب زمزم پیتے وقت یہ دعا کی تھی کہ مجھے امام ذہبی کا علم عطا فرما، میں نے آب زمزم پیتے وقت، بیر بضاعۃ کا پانی پیتے وقت اور حطیم وملتزم ہر جگہ یہی دعا کی کہ خداوندا! مجھے حافظ ابن حجر اور امام ذہبی دونوں کا علم عطا فرما، پھر آپ کی آنکھیں اشک آلود ہو گئیں اور تشکر و تحدیث نعمت کے طور پر فرمایا کہ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے دیا بھی۔

تقریبا ایک مہینہ قیام اور بھرپور افادہ واستفادہ کے بعد ۱۱؍ دسمبر ۱۹۸۷ء کو وہاں سے بمبئی کے لئے روانہ ہوئے، بیرون ہند کا یہ آپ کا آخری سفر تھا، گویا یہ کہنا چاہئے کہ یہ مسک الختام تھا، اس کے بعد کسی بیرونی سفر کی نوبت نہیں آئی، تا آنکہ اس سفر پر روانہ ہو گئے جہاں سے واپسی نہیں ہوتی ، اور جہاں آپ کا خیر مقدم نہ جانے کتنی اور کیسی کیسی مقدس روحوں نے کیا ہوگا۔

زیارت بغداد کی دوسری دعوت | ۱۹۸۸ء کے اواخر میں عراقی سفارت خانہ واقع دہلی سے آپ کے پاس ایک خط آیا جس میں بغداد اور اس کے مقامات ومشاہد کی زیارت کیلئے دعوت دی گئی تھی، یہ خط عراقی سفیر اے ڈبلیو شیخلی کی طرف سے تھا، جو ۲۸؍ ستمبر ۱۹۸۸ء کو لکھا گیا تھا، خط کی عبارت درج ذیل ہے:

"I have the honour to inform you that ministry of Awkaf and Religious affairs, Republic of Iraq has extended an invitation for you to visit Iraq and the Holy Shrines there. The ministry has proposed end of October or early November, 1988

for this visit

It will be highly appreciated if you kindly advise us, as soon as possible, the date suitable and convenient to you for the above mentioned visit.

(میرے لئے آپ کو یہ اطلاع دینا باعث عزت ہے کہ جمہوریہ عراق کے اوقاف اور مذہبی امور کی وزارت نے آنجناب کو عراق اور اس کے متبرک مقامات کی زیارت کے لئے دعوت دی ہے، وزارت نے اس زیارت کیلئے اواخر اکتوبر یا اوائل نومبر ۱۹۸۸ء کو تجویز کیا ہے۔

آپ کا بڑا کرم ہوگا اگر مذکورہ بالا زیارت کے لئے کسی موزوں اور مناسب تاریخ کا جلد از جلد تعین فرمادیں)

مراکش کی وزارۃ الاوقاف والشئون الاسلامیۃ کی دعوت

رمضان المبارک ۱۴۰۹ھ مطابق ۱۹۸۹ء میں مراکش کی وزارت اوقاف و اسلامی امور کی جانب سے آپ کو اس غرض سے دعوت دی گئی کہ آپ وہاں کے قصر شاہی میں منعقد ہونے والی مجالس (رمضانی دروس) میں شرکت فرمائیں، جن کا انعقاد وہاں کے بادشاہ، شاہ حسن ثانی کرتے ہیں، اور ان میں اپنی صوابدید کے مطابق جس موضوع پر چاہیں درس دیں، ذیل میں مراکش کے وزیر اوقاف ڈاکٹر عبدالکبیر علوی مدغری کا خط مورخہ ۱۲؍ جمادی الاولی ۱۴۰۹ھ مطابق ۲۲؍ دسمبر ۱۹۸۸ء نقل کیا جارہا ہے۔

صاحب الفضيلة الأستاذ حبيب الرحمن الأعظمي المحترم

إمام دار الحديث بالجمهورية الهندية

السلام عليكم و رحمة الله تعالىٰ و بركاته.

وبعد! فجريا على السنة الحميدة التي دأب عليها أمير المؤمنين جلالة الملك حسين الثاني نصره الله وأيده بعقد مجالس الدروس الحسنية في شهر رمضان المبارك وفي رحاب القصر الملكي العامر

بالرباط والتی یحضرها صفوة من علماء المملكة المغربية و بلاد العالم الاسلامی۔

یشرفنی أن أوجه الی فضیلتکم الدعوةلحضور تلك الدروس الدینیة الرمضانیة،والمشارکة فیها بدرس دینی تلقونه بین یدی صاحب الجلالة فی الموضوع الذی ترتؤنه و تختارونه و تودون المشارکة به فی هذاالملتقی العلمی الفرید راجیامنکم موافاة الوزارة فی أقرب وقت ممکن بعنوان الدرس مع آیة کریمة أو حدیث شریف یکونان مفتحا للدرس و محوراً له . . . . "

فضیلت مآب استاذ محترم جناب حبیب الرحمٰن الاعظمی صاحب

ہندوستانی جمہوریہ کے امام دارالحدیث

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امیر المؤمنین شہنشاہ معظم حسن ثانی ، اللہ تعالیٰ ان کی مدد اور تائید فرمائیں، اپنی عادت حسنہ و مستمرہ کے مطابق رمضان المبارک کے مہینے میں رباط کے قصر شاہی کے بھرے ہوئے ہال میں حسنی دروس کی مجلس منعقد کرتے ہیں، جس میں مراکش اور عالم اسلام کے چیدہ علماء شریک ہوتے ہیں۔

میرے لئے شرف کی بات ہے کہ میں آنجناب کو رمضان کے ان دینی دروس میں شرکت اور کسی درس کے ذریعہ حصہ لینے کی دعوت دوں، جس کو بادشاہ کے سامنے جس موضوع پر آپ چاہیں، پیش فرمائیں، اور جس کے ذریعہ آپ اس منفرد علمی اجتماع میں شرکت پسند فرمائیں، امید کرتے ہوئے کہ جلد از جلد وزارت کو کسی آیت یا حدیث شریف کے عنوان سے، جو درس کا نقطۂ آغاز اور محور ہو، مطلع فرمائیں)

xxxxx

المجمع العلمی العراقی کی رکنیت فروری ۱۹۸۹ء مطابق رجب ۱۴۰۹ھ میں بغداد کے مشہور علمی ادارے المجمع العلمی العراقی (IRAQI ACADEMY) کی کمیٹی نے علامہ اعظمی کو اکیڈمی کا رکن منتخب کیا، جس کی اطلاع اکیڈمی کے چیئرمین ڈاکٹر صالح احمد العلی نے اس خط کے ذریعہ دی جو ۱۵؍ مارچ ۱۹۸۹ء م ۸؍ شعبان ۱۴۰۹ھ کا مکتوب ہے:

"یسرنی أن أبلغکم بأن مجلس المجمع العلمی العراقی فی جلسته العاشرة المنعقدة فی الثانی والعشرین من شهر رجب سنة ۱۴۰۹ھ الموافق للثامن والعشرین من شهر شباط سنة ۱۹۸۹م قرر انتخابکم عضواً مؤازراً فیه تقدیراً لمکانتکم العلمیة الرفیعة ومجهوداتکم فی میادین اللغة والثقافة مما یعنی المجمع بدراسته.

وإننی إذ أهنئکم بهذا الانتخاب الذی یو ثق العلاقة العلمیة والثقافیة، أرجو تزوید المجمع بموجز عن سیرتکم العلمیة و عناوین أبحاثکم المنشورة لیحفظ۔ مع الاعتزاز به۔ فی سجلاته . . ."

(میں مسرت کے ساتھ آپ کو اطلاع دیتا ہوں کہ المجمع العلمی العراقی (IRAQI ACADEMY) کی کمیٹی نے ۲۲؍ رجب ۱۴۰۹ھ مطابق ۲۸؍ فروری ۱۹۸۹ء کو منعقد ہونے والے اپنے دسویں اجلاس میں آپ کے بلند علمی مقام اور ادب و ثقافت کے میدان میں آپ کی کاوشوں کی قدر دانی کرتے ہوئے اکیڈمی کا معاون ممبر منتخب کیا ہے۔

میں آنجناب کو اس انتخاب کی مبارکباد دیتے ہوئے، جو علمی اور ثقافتی رابطے کو مضبوط کرے گا، امید کرتا ہوں کہ اکیڈمی کو اپنی علمی زندگی اور شائع شدہ تحقیقات کے ناموں سے مختصر معلومات فراہم فرمائیں گے، تاکہ اسے فخر کے ساتھ اکیڈمی کے ریکارڈ میں محفوظ رکھا جائے۔)

بڑی صاحبزادی کی وفات ضعف و پیری کی حالت میں علامہ اعظمی کو ایک نہایت جانکاہ اور دلگداز صدمہ اس وقت سہنا پڑا جب آپ کی بڑی صاحبزادی عائشہ خاتون ایک مختصر سی علالت کے بعد داغ مفارقت دے گئیں، ان کا سانحۂ وفات ۱۹ر جنوری ۱۹۹۰ء کو پیش آیا۔ مرحومہ آپ کی اولاد ذکور واناث میں سب سے بڑی تھیں، اولاد کی نعمت سے محروم تھیں اور یہ حسرت دل ہی میں لے کر راہیٔ ملک بقا ہوئیں۔ أنعم الله عليها في دار كرامته شآبيب نعمه و رضوانه، وفات کے وقت ان کی عمر تقریباً ستر سال تھی، کیونکہ علامہ اعظمی نے ان کی نسبت ایک جگہ تحریر فرمایا ہے:

"در شب بست و ہفتم شوال یوم شنبہ ۱۳۴۰ھ قبیل نماز صبح دخترم مسماۃ عائشہ تولد شد۔"

(۲۷ر شوال بروز سنیچر ۱۳۴۰ھ کو نماز فجر سے کچھ پہلے میری لڑکی عائشہ پیدا ہوئی)

مرحومہ بڑی خوبیوں کی حامل خاتون تھیں، نرم خو، خوش اطوار، سلیقہ شعار، خوش مذاق اور پاکیزہ اخلاق والی عورت تھیں، اولاد جیسی نعمت سے محرومی کے باوجود تمام حسرتیں نہاں خانۂ دل تک رکھتی تھیں، چہرے پر یاس وافسوس کا سایہ اور لب پر گلہ وشکوہ کم ہی آنے دیتی تھیں۔ امور خانہ داری میں مہارت رکھتی تھیں، گھریلو انتظام وانصرام کا بلا کا ملکہ تھا، ان کا ہر کام حسن انتظام کا آئینہ اور خوبیٔ نظم ونسق کی تصویر ہوتا تھا، کوئی رشتہ دار یا مہمان ان کے یہاں وارد ہوتا تو اس کی ضیافت کے انتظامات اس طرح کرتیں کہ وہ متاثر ہوئے بغیر نہ جاتا، مولانا محمد عثمان صاحب معروفی، مقیم حال مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور، جو ان کے دور کے سسرالی رشتے دار ہیں، اپنے زمانہ طالب علمی کے واقعات میں لکھتے ہیں:

"... میرا قیام مفتاح العلوم میں تھا، لیکن اکثر کیاری ٹولہ عبد الغفور مؤذن کے گھر جایا کرتا۔ ان سے میری پھوپھی منسوب تھیں، ان کے بڑے

صاحبزادے حاجی محمد فاروق (۱) سے محدث کبیر کی بڑی صاحب زادی عائشہ خاتون منسوب تھیں، جو میری ضیافت اور راحت رسانی کا بے حد خیال فرمایا کرتی تھیں۔ جس سے اندازہ ہوا کہ محدث کبیر نے اپنی اولاد کی تربیت کتنے اعلیٰ طریق پر کی تھی۔"(۲)

امدادی وظائف کی تحقیقاتی کمیٹی کی ممبر شپ | ۱۹۹۰ء میں وزارت فروغ انسانی وسائل (Ministry of Human Resources Development) کے تعلیمی شعبے (Deptt. of Education) کی طرف سے عربی فارسی جیسی قدیم زبانوں کے اداروں کو دی جانے والی امداد ووظائف کی تحقیقاتی کمیٹی کا آپ کو ممبر نامزد کیا گیا، اس کی اطلاع دینے اور منظوری کی طلب کے لئے اسسٹنٹ ایجوکیشنل اڈوائزر جناب آر۔ کے۔ شرما (R.K. Sharma) نے ۶/جون ۱۹۹۰ء کو یہ خط ٹائپ شدہ بھیجا:

"This Ministry has a Grant-in-aid Committee to examine the applications from Voluntry Organizations engaged in the field of classical languages i.e. Arabic and Persian and recommend suitable financial assistance to such organizations.

I am happy to inform you that you have been nominated as a member of the above Committee for a period of two years. You may kindly convey your acceptance to serve on the Committee urgently..."

(اس وزارت کی ایک امدادی وظائف کمیٹی ہے، جو عربی اور فارسی جیسی قدیم زبانوں کے میدان میں مصروف رضاکار اداروں کی طرف سے پیش کی

---

(۱) علامہ اعظمی کے بڑے داماد، نیک، عبادت گزار اور ولی صفت بزرگ تھے، محلے کی مسجد (مرکزی مسجد) کے امام تھے، اور وقت کے بڑے پابند، ہمیشہ وقت سے پہلے پہنچ جاتے تھے، چھوٹے بڑے ہر ایک کی نگاہ میں ان کی بڑی عزت تھی۔ ۲۳ ذیقعدہ ۱۴۱۲ھ م ۲۷ مئی ۱۹۹۲ء کو وفات پائی رحمہ اللہ وغفرلہ۔

(۲) ترجمان دارالعلوم اکتوبر ۱۹۹۶ء ص ۲۸

جانے والی درخواستوں کی تحقیق کرتی ہے، اور ان اداروں کے لئے مناسب مالی
تعاون کی سفارش کرتی ہے۔

میں یہ اطلاع دیتے ہوئے خوشی محسوس کرتا ہوں کہ آپ دوسال کے
لئے مذکورہ بالا کمیٹی کے ممبر نامزد کئے گئے ہیں، آپ برائے مہربانی جلد از جلد اپنی
منظوری سے آگاہ فرما کر کمیٹی کے ساتھ تعاون فرمائیں۔)

بغداد کی عالمی کانفرنس کی طرف سے دعوت نامہ: اگست ۱۹۸۹ء میں کویت پر
عراق کے حملے کے بعد رد عمل کے طور پر اتحادیوں کا عراق پر جو زبردست حملہ ہوا، اس
سے اظہار بیزاری کے لئے جون ۱۹۹۰ء میں بغداد میں ایک کانفرنس بڑے پیمانے پر منعقد کی
گئی، اس میں شرکت کے لئے علامہ اعظمی کو بھی دعوت دی گئی اور دہلی میں واقع عراقی
سفارت خانے کی طرف سے درج ذیل مضمون کا دعوت نامہ آپ کی خدمت میں بھیجا گیا:

"Dear sir ,

It gives me great pleasure to convey to you the invitation from International Popular Islamic Organization to participate in a Conference to confirm Solidarity with Iraq against the threat from the enemies in U.S.A., Britain and Zionists. The conference will take place in Baghdad from 16th June 1990 and will be attended by numerous Ulemas from Islamic Countries including representatives of all Islamic Institutions, Associations and organizations.

Please let me have your acceptance for this invitation as soon as possible in order that necessary action could be taken in this regard.

(محترم جناب ! .

بڑے احساس مسرت کے ساتھ انٹر نیشنل پاپولر اسلامک آرگنائزیشن
کی طرف سے ایک کانفرنس میں شرکت کے لئے یہ دعوت نامہ آپ کے پاس
ارسال کر رہا ہوں، تاکہ امریکہ، برطانیہ۔ اور صیہونی دشمنوں کی جارحیت کے

خلاف عراق کے ساتھ اتحاد کو مضبوط کیا جاسکے، کانفرنس کا آغاز بغداد میں ۱۶/ جون ۱۹۹۰ء سے ہوگا، جس میں اسلامی ممالک کے متعدد علماء بشمول اسلامی اداروں، ہیئتوں، اور تنظیموں کے نمائندوں کے شرکت کریں گے، برائے مہربانی اس دعوت نامہ کی منظوری سے جلد از جلد آگاہ فرمائیں، تاکہ اس سلسلہ میں ضروری اقدامات کیے جاسکیں۔)

مرض الموت اور سانحۂ وفات اب آپ عمر کے اس مرحلے تک پہونچ گئے تھے کہ بلغ من العمر عتیا کا مصداق ہوگئے تھے، عوارض وامراض تو بہت سارے آپ کے اوپر طاری ہوئے تھے، لیکن سانسوں کی آمد ورفت نے ساتھ چھوڑنا کبھی گوارہ نہیں کیا، لیکن اب آہستہ آہستہ وقت موعود قریب ہوتا جارہا تھا، اور وہ گھڑی نزدیک آتی جارہی تھی جو ہر نفس کیلئے محتوم ومقدر ہے، اور اسی کے ساتھ آپ کی زندگی کے ایک ایک لمحے کی قیمت میں اضافہ ہوتا جارہا تھا، اور ہر ہر سانس دنیائے علم وفن کے لئے بیش بہا اہمیت کی حامل ہوتی جارہی تھی، جو لوگ آپ کے مرتبہ ومقام سے صحیح طور پر واقف تھے وہ اب یہ محسوس کرنے لگے تھے کہ قلمروئے علم کا یہ تاجدار اگر جدا ہوگیا تو دنیائے علم وفن کو ایک ناقابل بیان محرومی کا سامنا کرنا پڑے گا، مگر حسرتناک ساعت قریب آتی رہی اور جسم وجان بتدریج ایک دوسرے کا ساتھ چھوڑتے گئے۔

عمر کا یہ آخری حصہ تھا اور علامہ اعظمی پر بہت جلد جلد مختلف بیماریوں کے حملے ہوتے رہے، شعبان ۱۴۱۲ھ کے آخر اور مارچ ۱۹۹۲ء کے اوائل میں ضعف واضمحلال کی وجہ سے نہایت نحیف ونزار ہوگئے تھے، کوئی خاص مرض نہیں تھا بجز اس ایک مرض کے جو سو بیماریوں کی ایک بیماری ہے، اور جس کا علاج دنیا کی کسی میڈیکل سائنس میں نہیں ہے، وہ پیری اور بڑھاپا تھا، علامہ اعظمی بھی اب اپنی زندگی سے مایوس ہوچکے تھے، اور اب آپ کے اوپر ایک طرح کی استغراقی کیفیت طاری ہوتی جارہی تھی، اسی عالم میں ایک روز جب کہ چند طالب علم آپ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے، عجیب وغریب حالت میں فرمایا کہ اس

مہینے میں یہ کمرہ خالی ہو جائے گا، گویا اس وقت رحمت رب کو قریب ہوتے ہوئے محسوس کر رہے تھے، بہر حال اب دن بدن ضعف واضمحلال یا بلفظ دیگر مرض کی شدت میں اضافہ ہوتا رہا، ڈاکٹر آتے، دیکھتے، تشخیص کرتے اور علاج تجویز کرتے مگر ہر دوا بے سود اور ہر علاج بے کار۔ نقاہت اس قدر ہو گئی تھی کہ کسی کام کے لئے بمشکل اشارہ تک کر پاتے، رمضان شروع ہوا تو آپ کے اوپر غشی کی سی حالت رہنے لگی، ڈاکٹر نے لوگوں کی آمدورفت سے منع کر رکھا تھا، کوئی خاص آدمی آجاتا تو اس کو زیارت وعیادت کی اجازت دی جاتی تو بمشکل آنکھ کھول کر دیکھ لیتے۔

۹ر رمضان المبارک بروز یکشنبہ تقریباً دس بجے دن میں حالت بہت زیادہ خراب ہوئی اور سانسیں اکھڑ کر چلنے لگیں، زندگی کے دن پورے کرنے کے لئے معالج خاص ڈاکٹر نثار احمد انصاری نے آکسیجن لگایا، جلد ہی شدت مرض کی خبر پورے مئو میں اور اطراف مئو میں پھیل گئی، عیادت وزیارت کرنے والوں کی آمدورفت کے ساتھ ساتھ شہر کے چھوٹے بڑے ڈاکٹر بھی آنا شروع ہو گئے، یہ وقت نہ صرف آپ کے متوسلین ومنتسبین بلکہ پورے شہر کیلئے نہایت صبر آزما تھا، چہروں پر اداسی کے بادل اور لبوں پر مہر لگی ہوئی، ہر صورت تصویر یاس وحسرت اور ہر نگاہ سوالیہ بنی ہوئی! اگر کہیں کوئی گفتگو بھی ہوتی یا کوئی کسی سے کچھ پوچھتا بھی تو وہ "بڑے مولانا" ہی کی حالت اور کیفیت مزاج سے متعلق ہوتی، غرض یہ وقت پہاڑ بن کر گذرتا رہا! آکسیجن لگنے کے بعد سے علامہ اعظمی کی سانسیں یکساں طور سے چلتی رہیں، حالت میں کوئی خاص تغیر نہیں پیدا ہوا، غشی ایسی تھی کہ آنکھیں بھی نہیں کھلتی تھیں، ڈرپ کے ذریعہ جسم میں پانی اور قوت پہنچائی جاتی، اور تھوڑے تھوڑے وقفہ سے ایک آدھ چمچہ پانی سے حلق اور دہانہ تر کر دیا جاتا، اسی کیفیت میں پورا ایک دن اور ایک رات اور پھر ۱۰ر رمضان المبارک کا دن بھی گذرا، دس رمضان المبارک کو افطار کے وقت حالت میں بظاہر کچھ سدھار اور افاقہ محسوس ہوا، مگر کیا خبر تھی کہ کچھ ہی دیر بعد قیامت صغریٰ بپا ہونے والی ہے

اور سر زمین مئو عرصۂ حشر بننے والی ہے!

عشرۂ رحمت ختم ہو رہا ہے، رحمت کے فرشتے اپنا دفتر لپیٹ رہے ہیں، ایام مغفرت کی آمد آمد ہے، روزہ دار افطار کے لئے بیٹھے ہوئے ہیں، مؤذن اپنے رب کی بڑائی کی صدا لگاتا ہے، نماز کی طرف دعوت دیتا ہے، عین اسی وقت عاشق رسول، حدیث نبوی کا سب سے بڑا فدائی و جاں نثار داعی اجل کو لبیک کہتا ہے اور اس کی روح اس شان سے واصل بحق ہوتی ہے کہ ایک طرف رحمت کے فرشتے سایہ کئے ہوئے ہیں اور دوسری سمت مغفرت کے ملائکہ اپنے پر پھیلائے ہوئے ہیں، ان شاء اللہ۔ ادھر زمین والوں کا حال یہ ہے کہ ایک کہرام مچ گیا ہے، اس فاجعہ کبریٰ کی خبر اس تیزی سے مشرق و مغرب اور شمال و جنوب میں پھیلی ہے کہ جنگل کی آگ بھی کبھی اس تیزی سے نہ پھیلی ہو گی، انتقال کو چند لمحے بھی نہیں ہوئے ہیں کہ آخری زیارت و دیدار کرنے والوں کا ایک سیلاب موجیں مار رہا ہے، ہر آدمی ایک ہی سمت بھاگتا اور دوڑتا ہوا، پورا شہر كأنهم إلى نصب يو فضون کا منظر پیش کر رہا ہے، جسم مبارک وہیں رکھا ہوا ہے، جس کمرے میں حضرت نے زندگی کے آخری ایام گذارے ہیں، زیارت کرنے والے ایک راستے سے آتے اور دوسرے راستے سے نکل جاتے، بھیڑ کو قابو میں کرنے کے لئے منتظمین نے بڑی بڑی بلیاں اور بانس باندھ دیئے۔ ہر آدمی بے چین، ہر نفس بیتاب و بیقرار، ہر چہرہ اداس و پژمردہ اور ہر آنکھ اشکبار و خوں فشار! لوگوں کا ایسا گریہ اور ایسی آہ و فغاں چشم فلک نے بھی کم دیکھی ہو گی!

مولانا اعظمی کے وصال کی خبر نہ صرف برصغیر اور عالم اسلام بلکہ سارے عالم میں جس تیزی سے پھیلی ہے اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا، ذرا غور کیجئے کہ ۶ر بج کر سات یا آٹھ منٹ پر مئو جیسے دور افتادہ مقام پر انتقال ہوتا ہے اور سات بج کر بیس منٹ پر اتر پردیش سے سوبائی نشریہ میں لکھنؤ سے انتقال کی خبر نشر ہو جاتی ہے۔ اور لندن سے بی بی سی اپنے ۹ر بجے کی اردو بلیٹن میں اس خبر کو سارے عالم کے اردو دانوں تک پہنچا دیتا ہے، اور اسی وقت سے ہند و بیرون ہند سے تعزیت کرنے والوں کے تعزیتی پیغام آنا شروع ہو

جاتے ہیں۔

دوسرے دن ۱۱ رمضان المبارک مطابق ۱۷ مارچ کو ظہر کی نماز کے بعد اڑھائی بجے نماز جنازہ کا وقت طے تھا، ۱۲ بجے بند کمرے میں غسل دیا گیا، غسل دیتے وقت وہاں پر موجود لوگوں کی جو کیفیت تھی وہ ناقابل بیان ہے، تقریباً ایک بجے جنازہ باہر نکالا گیا، مشایعت کرنے والوں کی سہولت کے لئے تابوت کے چاروں پایوں پر بڑی بڑی بلیاں باندھ دی گئی تھیں، پھر بھی مشایعین کا ہجوم جس طرح بڑھا ہے معلوم ہوتا تھا بلیاں ٹوٹ جائیں گی، اس وقت کے منظر کا جن لوگوں نے مشاہدہ کیا ہے آج بھی ان کی نگاہوں میں بسا ہوا ہے، لوگ صرف ایک مرتبہ تابوت کو چھونے کیلئے اس طرح ایک دوسرے پر ٹوٹتے ہیں کہ اپنی جان کی بھی پروا نہیں کی، کسی کے سر سے ٹوپی گر رہی ہے، کسی کے ہاتھ سے گھڑی جا رہی ہے، اور کسی کے چپل جوتے اس کے پاؤں کا ساتھ چھوڑ رہے ہیں، مگر لوگ ہیں کہ ان تمام باتوں سے بے خبر ہیں، صرف ایک ہی سودا ہے کہ کسی طرح اس تخت چوبیں کو چھولیں جس پر "بڑے مولانا" کا جسم بے جان اپنے آخری سفر پر ہے، اور اگر کوئی یہ بھی نہ کر سکتا تو اپنے رومال اور انگوچھے سے ہی ایک بار اس لکڑی کو مس کر دینا اپنے لئے باعث سعادت و برکت سمجھتا، تابوت اس طرح دست بدست اور شانہ بشانہ آگے بڑھتا گویا دریا میں مچھلی تیر رہی ہو۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد جنازہ ریلوے گراؤنڈ پہنچایا گیا جہاں نماز جنازہ ادا کی جانے والی تھی، جو مئو کا سب سے بڑا اور وسیع میدان ہے، اور سرزمین مئو کی تاریخ میں پہلی دفعہ کسی کی نماز جنازہ اس میدان میں ادا کی گئی ہے، نماز جنازہ میں شرکت کیلئے مئو کے قرب وجوار کی تمام بستیاں مردوں سے خالی ہو گئی تھیں، اس کے علاوہ اعظم گڈھ، جونپور، فیض آباد، لکھنؤ، دلی، بنارس اور کلکتہ تک کے لوگوں نے شرکت کی، کسی کی نماز جنازہ کا ایسا عجیب و غریب منظر لوگوں نے پہلی بار دیکھا جس میں تقریباً دو لاکھ روزہ دار بھوک و پیاس سے بے نیاز، شدت کی گرمی، چلچلاتی دھوپ اور سورج کی تند و تیز تمازت میں نماز ادا کر رہے ہوں اور ۔۔۔ رحمت و مغفرت کر رہے ہوں۔ ٹھیک دو بج کر تیس منٹ پر

پر آپ کے شاگرد رشید و تلمیذ اعز مولانا عبد الجبار صاحب مئوی نے آہوں اور سسکیوں کی صداؤں کے بیچ نماز پڑھائی، نماز کے بعد جنازہ جائے تدفین کی طرف لیجایا گیا، جہاں تقریباً ایک گھنٹہ بعد پہنچ سکا، اور تین چوتھائی صدی کی جلوہ تابانی کے بعد علم و عمل کا آفتاب لوگوں کی نگاہوں سے روپوش ہو گیا، جناب مولانا نظام الدین اسیر ادروی صاحب نے اس منظر کی بہت مؤثر تصویر کشی کی ہے، وہ لکھتے ہیں:

"جنازہ کی نماز اور جنازہ کی مشایعت کرنے والوں کی کثرت اگر عند اللہ مقبولیت کی علامت ہے تو کہا جا سکتا ہے کہ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی رحمۃ اللہ علیہ خداوند قدوس کے مقبول اور مقدس ترین بندوں میں سے تھے، آپ خود غور کریں کہ مولانا موصوف عرصۂ دراز سے گوشۂ خلوت میں رہتے تھے، عوام سے بقدر ضرورت ہی رابطہ تھا، ایک گمنام اور غیر مشہور گلی میں آپ کی سکونت تھی، اس راستے سے گذرنے والا کوئی بھی شخص یہ نہیں سمجھتا تھا کہ اس گلی کے ایک خام سفالہ پوش مکان میں ایک ایسی عظیم الشان شخصیت ہے کہ بقول حفیظ بنارسی:

دشت عجم سے تا بہ عرب جس کی دھوم تھی

لوگوں پر آپ کی عظمت، علوئے شان اور عند اللہ مقبولیت کا راز اس وقت کھلا جب ان کا جنازہ دیکھا، شہر کے سارے مسلم و غیر مسلم حیرت و استعجاب کی نگاہوں سے انسانوں کے اس سیلاب عظیم کو دیکھ رہے تھے، اور کہتے تھے کہ ہم کو خبر بھی نہیں تھی کہ اس شہر میں کوئی اتنی عظیم شخصیت بھی رہتی ہے ،ابتدائے شب میں جب آپ سفر آخرت پر روانہ ہو رہے ہیں اس وقت گنتی کے چند افراد موقعہ پر موجود ہیں، لیکن صبح ہوتے ہی سفید پوش انسانوں سے مئو کی گلیاں، سڑکیں، شاہراہیں بھر گئیں، مولانا کی رہائش گاہ کے چاروں طرف مسلمانوں کا جم غفیر اس طرح چھا گیا جیسے کسی بہت بڑے دریا میں یک بیک طوفانی سیلاب آگیا ہو" (۱)

(۱) ترجمان الاسلام ۱۱-۱۲ ص ۱۴

آگے مزید لکھتے ہیں:

”نماز جنازہ میں تخمیناً دولاکھ مسلمان شریک ہوئے، میرے محدود علم و مطالعہ کے مطابق اس پوری صدی میں ہندوستان میں کسی عالم دین کا اتنا بڑا جنازہ نہیں اٹھا، جس کی نماز جنازہ اتنے مقدس ترین اور اتنے بڑے مجمع نے ادا کی ہو، مولانا موصوف کے سوا دوسری کوئی مثال نہیں ملتی، دولاکھ مسلمانوں کا خالص یہ مجمع اور پھر اس مجمع کا ہر ہر فرد روزے سے، گرمیوں کا موسم ہے، ٹھیک دوپہر میں جنازہ اٹھتا ہے، ایک میل پاپیادہ چلچلاتی ہوئی دھوپ میں لوگ مشایعت کرتے ہیں اور جب ریلوے گراؤنڈ میں پہنچتے ہیں جہاں نماز جنازہ ادا کی جانے والی ہے، پورے لق ودق میدان میں ایک درخت کا سایہ بھی نہیں، موسم گرما کا تمتمایا ہوا سورج سروں پر چمک رہا ہے ،اس کی کرنیں روزہ داروں کے بھوکے پیاسے جسم پر تیر کی طرح برس رہی ہیں۔اب دن کے دو(۱) بج جاتے ہیں، دھوپ کی تمازت اپنے شباب پر آجاتی ہے، دولاکھ روزہ رکھے ہوئے مسلمانوں کا مقدس ومنتخب روزگار مجمع حضرت مولانا اعظمی کی نماز جنازہ پڑھتا ہے، دعائے مغفرت کرتا ہے ، درجات کی بلندی کی دعائیں مانگتا ہے، کیا ہندوستان میں ایسی کوئی دوسری مثال پیش کی جاسکتی ہے؟

یہ شرف، یہ افتخار صرف محدث جلیل ابوالمآثر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی رحمۃ اللہ علیہ کو حاصل ہوا، مولانا موصوف کے زہد و تقویٰ، خلوص وللّٰہیت، علم و فضل، علوم اسلامی کی بے لوث اور بے غرض اشاعت اور ساری زندگی حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی شب و روز خدمت اور بے پناہ جذبۂ احیاء سنت کے پیش نظر ہمارا ایمان ہے کہ جب آپ کی مقدس روح ملأ اعلیٰ میں پہونچی ہوگی تو رحمت خداوندی کہہ رہی ہوگی **فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی** اور جنت کے فرشتے صف بستہ استقبال کے لئے کھڑے رہے

(۱) یہ سبقت قلم ہے جنازہ کی نماز ڈھائی بجے ادا کی گئی تھی

ہوں گے اور پورے انبساط سے کہہ رہے ہوں گے سلام علیکم طبتم فیھا خالدین۔"(۱)

اور مولانا ضیاء الدین اصلاحی ایڈیٹر مجلہ "معارف" اعظم گڈھ تحریر فرماتے ہیں:

"اپنے وطن میں مولانا کو جو مقبولیت حاصل تھی اس کا اندازہ ان کے جنازہ سے ہوا جس میں شرکت کے لئے دارالمصنفین سے راقم اپنے رفیق کار مولوی محمد عارف عمری اور مولوی احتشام علی ندوی کے ساتھ گیا تھا، مئو کے ہر گلی کوچہ میں آدمی ہی آدمی دکھائی دیتے تھے، ہم لوگ بڑی زحمت سے مولانا کی قیامگاہ (پٹھان ٹولہ) پہنچے لیکن دید وزیارت کا شرف حاصل نہ کر سکے، ریلوے کے بڑے اور وسیع میدان میں جنازہ کی نماز کا اہتمام کیا گیا تھا، مولانا ہی کے ایک ہم نام اور اپنے اہل تعلق مولوی حبیب الرحمٰن ندوی (۲) کی معیت میں ریلوے میدان گئے، جہاں اتنے لوگوں نے نماز جنازہ ادا کی جن کی تعداد کا کوئی اندازہ نہیں ہو سکا، البتہ بعض لوگوں کو جب یہ کہتے سنا کہ مئو میں ابھی تک کسی کے جنازہ میں نہ اتنا بڑا مجمع ہوا تھا اور نہ آئندہ ہونے کی توقع، تو ہم نے بھی اپنے دل میں کہا یہ اس عہد کے امام زیلعی اور ملا علی قاری کا جنازہ ہے، جن کی زبان و قلم ہمیشہ احادیث کی شرح و ترجمانی اور ان کی مشکلات و غوامض کو حل کرنے میں مصروف رہے ہیں اور جن کا وجود گرامی علوم نبوی کی خدمت و فروغ اور نادر و نایاب کتب احادیث کی طبع و اشاعت کے لئے وقف رہا ہے۔"(۳)

---

(۱) ترجمان الاسلام ص ۱۵۔۱۴

(۲) مولانا ادری کے باشندہ تھے، لیکن مئو میں سکونت اختیار کر لی تھی، علامہ اعظمی کے تلامذہ میں تھے، افسوس کہ ۲۵ر شوال ۱۴۱۹ھ مطابق ۱۲ر فروری ۱۹۹۹ء کو وفات پا گئے، انا للہ وانا الیہ راجعون

(۳) معارف اپریل ۱۹۹۲ء ص ۳۱۲۔۳۱۱

حضرت علامہ اعظمیؒ کی وفات پر بعض بڑی حیران کن باتیں دیکھنے میں آئیں، لوگوں کا عام طور پر مشاہدہ رہا کہ غیر مسلموں کا تاثر اور رنج و غم بھی کچھ کم نہیں تھا، عموماً ہندوؤں کے چہروں پر یاس و حسرت کے بادل چھائے ہوئے دیکھے گئے، بلکہ اس موقع پر بہت سے ہندوؤں کو پھوٹ پھوٹ کر روتے دیکھا گیا، اس سلسلے میں سب سے عجیب و غریب واقعہ اس وقت پیش آیا جب ریلوے گراؤنڈ (جہاں نماز جنازہ ادا کی گئی تھی) کے قریب واقع ایک مندر (جو ہندی بھون کے نام سے مشہور ہے) کے پجاری نے نمازیوں اور مشایعت کرنے والوں کے راحت و آرام کے لئے مندر کے دروازے کھول دیئے، اور اسی پر بس نہیں جو لوگ بے وضو تھے ان کے لیے اپنے ہاتھ سے وضو کا پانی فراہم کیا، جب کہ واقعہ یہ ہے کہ اس سے قبل اس مندر کے دروازے تک بھی کسی مسلمان کا قدم نہیں پہنچا تھا، یہ حضرت مولانا اعظمیؒ کی غیر مسلموں کے اندر مقبولیت کی ایک مثال ہے۔

ایک عالم کا خواب مولانا ابو بکر ہاشمی (۱) حیدر آباد کے ایک صاحب علم و فضل اور مولانا ابوالوفاء افغانی کے مخصوص تلامذہ میں ہیں، انھوں نے علامہ اعظمی کے انتقال کے بعد جو تعزیتی خط لکھا اس میں اپنے حسب ذیل خواب کا ذکر کیا:

> "چار روز قبل خواب میں مجھے بتلایا گیا تھا کہ کسی بڑے عالم دین کا انتقال ہونے والا ہے، آج تعبیر مل گئی" مکتوب ۱۷ر مارچ ۱۹۹۲ء

---

(۱) مولانا ابو بکر ہاشمی دار العلوم دیو بند کے فضلاء میں ہیں، مولانا ابوالوفاء افغانی کے تربیت یافتہ ہیں، اس وقت دائرۃ المعارف العثمانیہ میں مصحح کے عہدہ پر فائز ہیں، ۲۴ر ربیع الآخر ۱۴۲۹ھ مطابق یکم مئی ۲۰۰۸ء کو آپ کی وفات ہوگئی۔

پانچواں باب

تلامذہ

پانچواں باب

تلامذہ
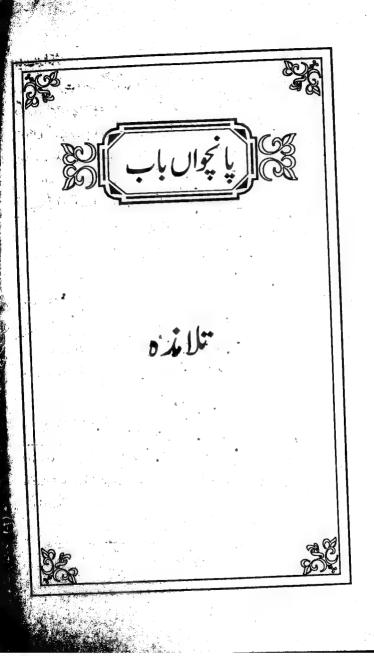
مولانا عبدالجبار صاحب مئوی

ماقصۂ سکندر ودارانہ خواندہ ایم　　ازما بجز حکایت مہر ووفا مپرس

ہمارے استاد ومربی اور علامہ اعظمی کے تلمیذ اعز وارشد مولانا عبدالجبار صاحب مئوی رحمۃ اللہ علیہ ۱۳۲۴ھ کے لگ بھگ مئو میں پیدا ہوئے، سکونت اصلاً چھتر پورہ کے قریب محلہ باغیچہ میں تھی، بعد میں وہاں سے ملک ٹولہ منتقل ہوگئے، اور وہیں رہائش اختیار کرلی۔

علامہ اعظمی علیہ الرحمۃ نے ۱۳۴۰ھ میں فراغت کے بعد دارالعلوم مئو میں مسند تدریس سنبھالی، تو اس وقت مولانا عبدالجبار صاحب اس مدرسہ کے ایک طالب علم تھے، علامہ اعظمی کے زمانۂ تدریس میں ہی دارالعلوم سے فارغ ہوئے، پھر جب آپ دارالعلوم سے مستعفی ہوکر مظہر العلوم بنارس گئے تو ساتھ مولانا عبدالجبار صاحب بھی گئے، اور علوم وفنون کی مزید کتابیں پڑھ کر اعلیٰ استعداد بہم پہونچائی، اور دو سال بنارس میں طالب علمانہ قیام کے بعد واپس مئو لوٹے، اس طرح ہمارے علم کے مطابق ۱۳۴۰ھ کے قریب (دارالعلوم سے) علامہ اعظمی کے ساتھ آپ کے ربط وتعلق کی ابتدا ہوئی، اور ۱۴۱۲ھ تک تقریباً ۷۲ سال یہ تعلق قائم رہا، اور تعلق ایسا کہ اکاد کا سے زیادہ تاریخ میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔

مولانا عبدالجبار صاحب نے ۱۳۴۲ھ میں دارالعلوم مئو سے فراغت پائی، اس کے بعد مختلف مدارس میں درس وتدریس کی خدمت انجام دی۔ علامہ اعظمی جب تک مفتاح العلوم مئو میں رہے، مولانا بھی وہاں کے زمرۂ مدرسین میں رہے، اور ادب وتفسیر وفقہ کے اسباق آپ سے متعلق رہے، پھر جب مولانا عبداللطیف نعمانیؒ کے انتقال کے چند سال بعد کچھ موقع پرستوں نے علامہ اعظمی کے خلاف مدرسہ میں دسیسہ کاری

کا جال بنا تو مولانا عبدالجبار صاحب بھی اس کا شکار ہوئے، آپ کے ساتھ گستاخی کی گئی یہاں تک کہ کچھ شر پسند طلبہ نے دوران درس آپ کے سامنے سے صحیح مسلم چھینی، اور جب علامہ اعظمی نے مفتاح العلوم سے بالآخر مفارقت اختیار فرمالی تو مولانا عبدالجبار صاحب بھی اس سے علیحدہ ہوگئے۔

مفتاح العلوم سے مفارقت کے کچھ ہی دنوں بعد علامہ اعظمی کے ایما پر مظہر العلوم بنارس چلے گئے، وہاں کئی سال تک استاذ حدیث و تفسیر اور شیخ الحدیث رہے، اور نہ صرف اساتذہ و طلبہ بلکہ شہریوں میں بھی حد درجہ ادب و احترام اور عزت و توقیر کی نگاہ سے دیکھے جاتے رہے، مظہر العلوم بنارس میں آپ کا قیام لگ بھگ دس برس رہا، آخر میں بہت زیادہ کمزور ہوگئے، اور صحت سفر کے قابل نہ رہی تو مستقلاً مئو میں اقامت گزیں ہوگئے، اور مدرسہ مرقاۃ العلوم کو درس و افادہ کا مرکز بنایا، علامہ اعظمی کی وفات کے بعد تو آپ ہی کی ذات سب کا محور و مرکز ہوگئی تھی۔

مولانا ایک جید الاستعداد، باصلاحیت اور ماہر و آزمودہ کار مدرس اور صاحب فضل و کمال عالم تھے، جن لوگوں کو مولانا کی شاگردی حاصل رہی ہے ان کا اتفاق ہے کہ تعلیم و تدریس کا ان کے جیسا ملکہ کسی اور استاد کے اندر دیکھنے میں نہیں آیا، افہام و تفہیم کی قوت و صلاحیت ان کو قدرت نے بلا کی ودیعت کی تھی، سبق کو گھول کر پلانے کی مثال اگر کہیں حقیقی شکل میں دیکھنے کو ملی تو وہ مولانا کی ذات تھی، مشکل سے مشکل مسائل اور پیچیدہ سے پیچیدہ مقامات کی تشریح وہ اس خوبی کے ساتھ اور ایسے دلنشیں انداز میں کرتے کہ معمولی سے معمولی طالب علم کی سمجھ میں بھی بات بآسانی آجاتی، درسی تقریر نہایت مختصر مگر جامع کرتے، نفس مسئلہ کو سمجھاتے، طولانی تقریر اور دور از کار باتوں سے اجتناب کرتے، ایک پتلی سی چھڑی درسگاہ میں ہمیشہ ساتھ رکھتے، جس سے بوقت ضرورت طالب علموں کی، مبتدی ہو یا منتہی، مرمت کرتے، مگر اصلاح کا انداز ایسا ہوتا کہ کوئی طالب علم برا نہ مانتا۔

مولانا کے اندر تصنیف و تالیف کا ملکہ بھی بدرجۂ اتم تھا، لیکن انھوں نے اس

طرف کوئی خاص توجہ نہیں کی، تاہم کچھ کام اس میدان میں بھی اہم انجام دیئے، چنانچہ انھوں نے دار العلوم ندوۃ العلماء کے نصاب میں داخل درسی کتاب "منثورات" کا سلیس اردو ترجمہ کیا، جو "باکورات" کے نام سے شائع ہوا، پھر اس کے بعد مشکل الفاظ کی لغوی تحقیق و تشریح "دلیل المنثورات" کے نام سے کی۔

مولانا کا ایک اہم قلمی کام "کتاب الزہد والرقائق" کا اردو ترجمہ ہے، کتاب الزہد امام ابو حنیفہؒ کے شاگرد اور امام بخاریؒ کے استاذ الاساتذہ حضرت عبداللہ بن مبارکؒ کی تصنیف ہے جو علامہ اعظمی کی تحقیق و تعلیق سے شائع ہوئی ہے، مولانا عبدالجبار صاحب نے اس کتاب کا جامع ترجمہ "ایثار آخرت" کے نام سے کیا۔

لیکن ان کا سب سے اہم کارنامہ صحیح بخاری کے حواشی سے متعلق ہے، مولانا احمد علی سہارنپوری نے بخاری شریف کے پچیس پاروں اور حجۃ الاسلام مولانا قاسم نانوتوی نے آخر کے پانچ پاروں کا نہایت جامع اور محقق و مدلل حاشیہ تحریر فرمایا، جو صحیح بخاری کے ہندوستان میں رائج نسخوں کے ساتھ شائع ہوتا رہتا ہے، یہ حاشیہ پہلی مرتبہ مولانا احمد علی سہارنپوری کے پریس سے پوری دقت و صحت کے ساتھ چھپ کر شائع ہوا، بعد میں ناشرین نے اس کی صحت کا خاص اہتمام نہیں برتا اور مرور زمانہ کے ساتھ ساتھ اس حاشیہ میں غلطیاں در آتی گئیں۔ مدرسہ مظہر العلوم کے زمانۂ تدریس میں جب صحیح بخاری کا سبق مولانا عبدالجبار صاحب کے سپرد ہوا تو شدت کے ساتھ آپ کو ان غلطیوں کا ادراک و احساس ہوا، اور پوری ہمت و حوصلہ کیساتھ ان کی تصحیح و تصویب کا بیڑہ اٹھایا، کام بہت دقیق ، باریک اور محنت طلب تھا، ہر آن کتابوں سے مراجعت کی ضرورت پڑتی تھی، لیکن مولانا مرحوم نے کئی برس کی شبانہ روز محنت سے اس مشکل کو آسان بناڈالا، اور ہر جلد کی الگ الگ تصحیح دو حصوں میں کی، اور اس کو بخاری شریف ہی کے سائز میں چھپوا کر شائع کیا تاکہ بآسانی اس کے ساتھ اس کی جلد بندی کی جاسکے، اس کا نام "التصویبات لما فی حواشی البخاری من التصحیفات" رکھا۔

مولانا عبدالجبار صاحب کو اپنے استاذ و شیخ سے جو عقیدت و محبت تھی اور جو

تعلق خاطر وطول ملازمت حاصل رہا ہے اس کی مثال ملنا مشکل ہے، مولانا رشید احمد صاحب اعظمی تحریر فرماتے ہیں:

”حضرت والد محترم کا وہ کمرہ جہاں بیٹھ کر انھوں نے علم حدیث کی خدمت انجام دی ہے، وہ کھپریل کا حجرہ جس میں کتابوں کے انبار کے درمیان وہ چھپ چھپ جاتے تھے، اس کے سامنے ایک مختصر سا صحن ہے، میں نے بچپن میں دیکھا ہے کہ ہر روز وہاں دو چارپائیاں بچھائی جاتی تھیں، ایک پر والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور دوسری پر حضرت مولانا عبدالجبار صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہوتے۔“(۱)

مولانا صدق ووفا کا پیکر تھے، اپنے استاذ حضرت علامہ اعظمی کے لئے ان کی فنائیت مثالی اور نصیحت آمیز تھی، ستر بہتر سال کی مدت کوئی معمولی مدت نہیں ہوتی، اور نہ ہی طبیعت ہمیشہ ایک ڈھب پر رہتی ہے بقول داغ:

رہرو راہ محبت کا خدا حافظ ہے اس میں دو چار بہت سخت مقام آتے ہیں

وہ اپنی زندگی استاد کے لئے وقف کر چکے تھے، سفر وحضر میں ساتھ ہوتے، پہلے دونوں حج میں بھی ان کی رفاقت رہی، اور اگر علامہ اعظمی سفر میں ہوتے اور مولانا عبدالجبار صاحب گھر پر، تو گھر کی نگرانی اور تمام امور کی دیکھ بھال آپ ہی کے ذمہ ہوتی، باہر سے آنے والی ڈاک، خطوط ورسائل اور گھر کی خیر وعافیت سے ہر ایک دو روز پر بذریعہ خط علامہ کو اطلاع دیتے رہتے، وہ جسمانی طور پر اپنے استاد سے جدا ہوئے ہوں تو ہوئے ہوں، لیکن دل ودماغ ہمیشہ ساتھ ساتھ رہا۔

حاصل عمر نثار رہِ یارے کردم شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم

اس وسیع وعریض مدت کی رفاقت وصحبت کے باوجود ادب واحترام اور تعظیم وتوقیر کا رشتہ کبھی ہاتھ سے نہ جانے دیا، علامہ اعظمی کے سامنے ان کی نشست وبرخاست کا انداز ایسا ہوتا جیسے ان کے وجود کی کوئی حقیقت ہی نہ ہو، کم گو اور خاموش طبع تو فطرتاً تھے لیکن اپنے شیخ واستاد علامہ اعظمی کے سامنے مہر بلب ہو جاتے، ایسا معلوم ہوتا جیسے ان کے منھ میں زبان ہی نہ ہو،

(۱) المآثر ج ۲ ش ۳ ص ۵

بہت سخت ضرورت پڑنے پر ہوں ہاں کرتے ورنہ خاموش بیٹھے رہتے، الغرض حسن ادب کا ایسا نمونہ بہت کم کسی نے دیکھا ہوگا، علامہ اعظمیؒ کبھی کبھی ہماری بے ادبی دیکھ کر فرماتے کہ "تم لوگوں کو ادب سیکھنا ہے تو مولوی عبدالجبار صاحب سے سیکھو"

واقعہ یہ ہے کہ استاذ محترم مولانا عبدالجبار صاحب کی اپنے استاذ سے محبت و عقیدت اور صحبت ورفاقت کی داستان ایسی نہیں جسے حیطۂ تحریر میں لایا جاسکے، ان کی وفاداری کے متعلق علامہ اعظمی نے خود کشف الاستار کے مقدمہ میں یہ محبت آمیز جملہ لکھا ہے:

"خويصتي الشيخ عبدالجبار المئوى الذى هو منى بمنزلة الهيثمي من العراقي في الملازمة والصحبة ولكن أين أنا و هو، وأين العراقي والهيثمي." (۱)

(میرے خاص الخاص شیخ عبدالجبار مئوی، جو میری معیت وصحبت کے التزام میں ایسے ہی ہیں جیسے علامہ ہیثمی اپنے استاذ عراقی کے نزدیک تھے، لیکن کہاں میں اور وہ اور کہاں عراقی اور ہیثمی۔)(۱)

ان سب باتوں کے ساتھ شرافت نفس، متانت و سنجیدگی، حلم و وقار، بے نفسی اور تواضع وسادگی کا جیتا جاگتا نمونہ اور حسن اخلاق کا مرقع تھے، یوں تو ہر کس و ناکس کے ساتھ نہایت خوش اخلاقی اور خندہ روئی سے پیش آتے۔ لیکن اپنے شاگردوں کے ساتھ ان کا برتاؤ والدین سے زیادہ شفقت و محبت کا ہوتا، اگر یہ کہا جائے تو مبالغہ نہیں ہوگا کہ سادگی اور بے نفسی آپ کی ذات پر ختم ہوتی تھی۔

۱۰ر رمضان المبارک ۱۴۱۲ھ کو جب علامہ اعظمی کا وصال ہوا ہے، تو جو خلاء مولانا عبدالجبار صاحب نے محسوس کیا ہوگا اور جدائی کا جو رنج وصدمہ انھوں نے سہا ہوگا اور لوگ اس کا تصور بھی نہیں کرسکتے، دنیا ان کی نظر میں ایک ویرانہ بن چکی تھی، جس کے اندر ان کیلئے کوئی کشش نہیں باقی رہ گئی تھی، بس زندگی کے دن پورے کر رہے تھے اور اس وقت کا انتظار جو ہر ذی نفس کا مقدر ہوتا ہے، نحیف ونزار اور کمزور ولاغر تو پہلے ہی ہو چکے تھے،

(۱) كشف الاستار كلمة المحقق ج ۱

استاد و شیخ کے فراق کا غم ان کو اندر اندر کھاتا اور اپنا کام کرتا رہا۔ بالآخر ۱۷؍رجب ۱۴۱۴ھ مطابق ۳۱؍دسمبر ۱۹۹۳ء کو عین جمعہ کی اذان کے وقت پیام اجل آپہنچا، اسی روز عشاء کی نماز کے بعد مئو و اطراف مئو کے ہزاروں آدمیوں نے نماز جنازہ پڑھی اور علامہ اعظمی رحمۃ اللہ علیہ کے پہلو میں داہنی جانب سپرد خاک کیا گیا۔

جان ہی دے دی جگر نے آج پائے یار پر　　عمر بھر کی بے قراری کو قرار آ ہی گیا

ادھر ۱۹۹۳ء کا سال اپنی بساط لپیٹ رہا تھا، ادھر ایک دور ایک عہد کا خاتمہ ہو رہا تھا اور ایک عہد آفریں شخصیت اپنے رب کے حضور اخلاص و محبت، شرافت و کرامت، اور صدق و صفا کا دفتر کھول رہی تھی۔ رحمهما الله رحمة واسعة وأمطر عليهما شآبيب نعمته و رضوانه

مولانا محمد منظور نعمانی سلطان المناظرین حضرت مولانا محمد منظور نعمانی ۱۸؍شوال ۱۳۲۳ھ م ۱۶؍دسمبر ۱۹۰۵ء کو سنبھل میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم اپنے وطن سنبھل اور دہلی کے مدرسہ عبد الرب میں حاصل کی، ۱۳۴۰ھ میں جب مولانا کریم بخش صاحب سنبھلی صدر مدرس ہو کر دار العلوم مئو آئے تو ان کے دامن تربیت سے وابستہ ہو کر مولانا منظور نعمانی بھی آئے، اور دار العلوم میں داخل ہو کر ان کی زیر نگرانی تحصیل علم کرتے رہے، یہیں انھوں نے علامہ اعظمی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا، اور ان سے کئی ایک کتابیں پڑھیں، دار العلوم مئو میں ان کی مدت تعلیم تقریباً تین سال رہی، جس کے دوران انھوں نے متوسطات تک کی لگ بھگ سبھی کتابیں پڑھ ڈالیں، اس کے بعد تکمیل کیلئے دیوبند گئے اور وہاں سے ۱۳۴۵ھ میں سند فراغ حاصل کی۔

فراغت کے بعد اپنے وطن میں مدرسہ محمدیہ سے درس و تدریس کا آغاز کیا، ایک سال بعد امروہہ چلے گئے اور وہاں کے مدرسہ اسلامیہ چلہ میں تین سال تک یہ خدمت انجام دی، اس کے بعد درس و تدریس کا سلسلہ موقوف ہو گیا، اور پھر کہیں باقاعدہ مدرسی نہیں کی سوائے ندوہ میں چند سالہ تدریس حدیث کے۔

مولانا منظور نعمانی نے مشغلۂ درس و تدریس سے سبکدوش ہو کر اپنی عنان توجہ دوسری طرف موڑی، اور اپنی جد و جہد کا مرکز ایک دوسرا میدان بنایا، یہ میدان تھا اہلسنت

کی حمایت اور اہل باطل کا رد وابطال، اس کے لئے انھوں نے اپنی تمام قلمی، لسانی اور ایمانی قوتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے نہایت عظیم الشان کارنامے انجام دیئے، اور اسلام اور سنت وشریعت کی سربلندی کے لئے باطل قوتوں کے ساتھ عمر بھر برسرپیکار رہے، ان سے مناظرے اور مباحثے کئے، ان کی تحریروں اور تقریروں کی کاٹ کی، اور جب تک رہے اہل باطل کے لئے صاعقہ آسمانی بنے رہے۔

اس مقصد کے لئے ان کا سب سے اہم کارنامہ ماہنامہ الفرقان کا اجراء تھا، جسے انھوں نے محرم ۱۳۵۳ھ مطابق مئی ۱۹۳۴ء میں بریلی سے جاری کیا، جو بعد میں منتقل ہو کر لکھنؤ آگیا، الفرقان کے ذریعہ مولانا نے دین ومذہب کی بیش بہا خدمت انجام دی۔

تصنیف وتالیف میں بھی کمال حاصل تھا، تصنیفات کی تعداد پچاسوں ہیں، لیکن ان میں سے چند ایک کو خاص شہرت حاصل ہوئی، جن میں آپ کی معرکۃ الآراء کتاب "ایرانی انقلاب امام خمینی اور شیعیت" اور "بوارق الغیب" وغیرہ ہیں۔ آپ کی ایک عالمانہ و محدثانہ تصنیف "معارف الحدیث" ہے۔ جو متعدد جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔ اس کتاب کی پہلی جلد پر تقریباً چالیس صفحات میں علامہ اعظمی کا ایک فاضلانہ اور بیش قیمت مقدمہ بھی ہے۔

مولانا نعمانی علامہ اعظمی کے اولین شاگردوں میں تھے، وہ دارالعلوم مئو میں غالباً مولانا عبدالجبار صاحب کے ہم درس تھے، اپنے استاد سے حد درجہ عقیدت ومحبت رکھتے تھے، اور عقیدت ومحبت کا یہ تعلق آخر تک قائم رہا، چنانچہ جولائی ۱۹۸۷ء میں ناچیز کو ایک دو دفعہ آپ کی خدمت میں حاضری کی سعادت نصیب ہوئی، اس وقت آپ صاحب فراش تھے، اور لوگوں سے ملنا جلنا عام طور پر متروک ہو چکا تھا، لیکن علامہ اعظمی کی شاگردی کے تعلق سے ملاقات گوارا فرمائی، غایت درجہ محبت وشفقت سے پیش آئے، اور ضعف واضمحلال کی اس حالت میں بھی خاصی دیر تک (تقریباً آدھے گھنٹہ تک) پاس بٹھائے رکھا، جب تک بیٹھا رہا اپنے استاد ہی کا ذکر فرماتے رہے، ان کی خیریت دریافت فرماتے، ان کی مشغولیات پوچھتے، اس وقت مولانا نے کئی ایک کتابوں کا نام بھی لیا جو انھوں نے زمانۂ طالب علمی میں علامہ اعظمی کے پاس پڑھی تھیں، لیکن افسوس کہ میں اپنی غفلت ولاپرواہی کی وجہ سے انھیں اس وقت نوٹ نہ کر سکا، اور "حسامی" کے سوا تمام کتابوں کا نام ذہن سے نکل گیا۔

۲۶/ذی الحجہ ۱۴۱۷ھ مطابق ۴/مئی ۱۹۹۷ء کو آٹھ بجے شب میں انتقال فرمایا، رحمه الله رحمة واسعة.

مولانا محمد حسین بہاری: دارالعلوم دیوبند کے اپنے وقت کے استاذ الاساتذہ مولانا محمد حسین بہاری ۱۳۲۱ھ کے قریب صوبۂ بہار کے ضلع سیتامڑھی کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم اپنے وطن اور چمپارن میں پائی، اس کے بعد مئو آئے اور دارالعلوم میں داخلہ لیا، یہ وہی وقت تھا جب مولانا کریم بخش صاحب سنبھلی، علامہ اعظمی اور مولانا عبداللطیف نعمانی جیسے ارباب فضل و کمال دارالعلوم میں درس و تدریس کی بساط بچھائے ہوئے تھے، چنانچہ اسی زمانے میں انھوں نے علامہ اعظمی کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا اور ان کے خرمن علم سے خوشہ چینی کی۔ دارالعلوم مئو کے بعد سنبھل گئے، اور ایک سال وہاں پڑھا، سنبھل سے مظاہر علوم سہارنپور اور سہارنپور سے دیوبند پہنچے، اور وہیں سے ۱۳۴۵ھ میں فارغ التحصیل ہوئے۔

فراغت کے بعد درس و تدریس کا سلسلہ شروع ہوا، سب سے پہلے سہارنپور کے مدرسہ شاہ بہلول میں تعلیم دی، اس کے بعد راندیر (سورت) اور دہلی کے مدرسوں میں درس و تدریس کی خدمت انجام دی، ۱۳۶۷ھ میں اکابر دارالعلوم دیوبند کی نظر انتخاب آپ پر پڑی، اور دارالعلوم میں بحیثیت مدرس آپ کو بلا لیا گیا، اس وقت دہلی کے ایک مدرسہ میں محفل درس جمائے ہوئے تھے، دارالعلوم دیوبند میں آپ نے چالیس برس سے زائد مدت تک درس دیا، وہاں کی فضا سے کچھ ایسی انسیت پیدا ہوئی کہ مر کر بھی اس سے جدا نہ ہوئے اور وہیں کی خاک کا پیوند ہوئے۔

مولانا بہاری یوں تو مختلف علوم و فنون کے جامع تھے، لیکن معقولات میں خاص درک تھا، معقولات ان کا فن اختصاص تھا، اس فن کی بڑی بڑی کتابیں آپ کے زیر درس رہا کرتی تھیں، جن کو وہ بڑی عمدگی اور خوبی سے طلبہ کو پڑھایا کرتے تھے، انتقال کے بیس بائیس برس قبل سے حدیث کی بعض کتابیں بھی آپ کے زیر درس رہنے لگی تھیں، اور معقولات کے بعد منقولات میں بھی اسی مہارت اور جامعیت کا ثبوت دیا، ۵/رجب

۱۴۱۲ھ مطابق ۱۲؍ جنوری ۱۹۹۲ء کو وفات واقع ہوئی(۱)۔ رحمہ اللہ

مولانا عبدالرشید حسینی مئوی تاریخ ولادت کا صحیح علم نہیں، مولانا عبدالجبار صاحب اور مولانا منظور نعمانی کے ہم درس وہم عصر تھے، اس حساب سے سال پیدائش ایک آدھ سال آگے پیچھے ہوسکتا ہے۔ واللہ اعلم

دارالعلوم مئو میں تعلیم حاصل کی، وہیں سے فراغت پائی اور وہیں ان کو علامہ اعظمی سے نسبت تلمذ بھی حاصل ہوئی، درس وتدریس کا آغاز غالباً دارالعلوم مئو سے کیا اس کے بعد ایک عرصہ تک مفتاح العلوم مئو میں تدریسی خدمت انجام دیتے اور اس کے نہایت صاحب استعداد، باصلاحیت اور کامیاب مدرس شمار ہوتے رہے ہیں، کتب حدیث میں جامع ترمذی سے خاص شغف تھا، اور اس کے درس کی شہرت بھی تھی۔

اللہ تعالیٰ نے مولانا کو علم دین کے ساتھ دینا کی دولت سے بھی نوازا تھا، جس کا اثر ان کی ظاہری حالت پر بھی نمایاں طور پر نظر آتا تھا۔ وہ بڑی خوبیوں کے آدمی تھے، خندہ رو، خوش اخلاق، خوش اطوار، خوش پوشاک تھے، نفاست پسند حد درجہ تھے، بڑے ذہین وفطین تھے اور طبیعت میں ظرافت اور بذلہ سنجی بہت تھی، بچوں سے بھی ہنس ہنس کر اور پرلطف باتیں کرتے تھے، ہم لوگوں نے مولانا کو بچپن میں دیکھا ہے، جب وہ مفتاح العلوم کے زمانۂ تدریس میں اکثر وبیشتر ہمارے غریب خانہ پر تشریف لایا کرتے تھے، ان کی صاف ستھری ہیئت، چہرے کے نقوش، ان کی بشاشت، ان کا قدوقامت اور سراپا اور سب سے بڑھ کر ان کی پرلطف باتیں اب بھی دل ودماغ میں بسی ہوئی ہیں۔ ۲۶؍ ذی قعدہ ۱۴۰۲ھ م ۱۵؍ ستمبر ۱۹۸۲ء کو بدھ کے دن سفر آخرت پر روانہ ہوئے، رحمہ اللہ وغفرلہ

شیخ الاسلام حضرت مولانا مدنیؒ سے شرف بیعت حاصل تھا اور اسی نسبت سے خود کو حسینی لکھا کرتے تھے۔

---

(۱) اس کا اکثر حصہ ماہنامہ دارالعلوم وفیات نمبر سے ماخوذ ہے۔

مولانا محمد یحییٰ صاحب اعظمی سال پیدائش معلوم نہیں، دارالعلوم مئو میں تعلیم حاصل کی اور وہاں علامہ اعظمی سے بطور خاص کسب فیض کیا۔ علامہ اعظمی کے ذخیرۂ مکاتیب میں مولانا یحییٰ صاحب کے ہاتھ کے لکھے ہوئے جو خطوط محفوظ ہیں ان سے بظاہر اندازہ ہوتا ہے کہ شوال ۱۳۴۵ھ (مطابق ۱۹۲۷ء) میں دیوبند گئے اور وہاں ہدایہ کی جماعت میں داخلہ لیا، دیوبند سے مظاہر علوم سہارن پور گئے اور وہیں فاتحۂ فراغ پڑھی، خطوط سے یہ اشارہ بھی ملتا ہے کہ سہارن پور کے زمانۂ طالب علمی میں شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا صاحب کا قرب حاصل رہا، حضرت شیخ کے بعض مسودات کی تبییض وغیرہ کی خدمت بھی انجام دی، اور ان کی خدمت میں علامہ اعظمی کے سلام و پیام کے لئے واسطہ کا کام بھی کرتے تھے۔ مولانا یحییٰ صاحب نے مدرسہ مفتاح العلوم مئو میں سالہا سال تک فرائض تدریس انجام دیئے۔

ان کا شمار مفتاح العلوم کے باصلاحیت اور کامیاب مدرسین میں ہوتا تھا، عربی ادب سے ان کو خاص مناسبت تھی، اور ان کا ادب عربی کا درس مشہور تھا، سہارنپور سے علامہ اعظمی کی خدمت میں جو خط لکھے ہیں، وہ سب عربی ہی میں ہیں۔

مولانا سیدھے سادے، منکسر المزاج، متواضع اور بے نفس انسان تھے، متانت و سنجیدگی اور شرافت طبیعت ثانیہ تھی، نام و نمود اور تعلی و ترفع کی ہوا بھی نہ لگی تھی، نہایت خاموشی اور خلوص کے ساتھ درس و تدریس اور کتابوں کی تجارت میں عمر بسر کی۔

ان کا اپنے استاد علامہ اعظمی سے گہرا اور مضبوط تعلق تھا، اور یہ ربط و تعلق آخر تک استوار و برقرار رہا، وہ علامہ اعظمی کے مخصوص ابتدائی تلامذہ میں تھے، اور ان کو اپنے استاد کا دامن چھوڑنا گوارا نہ تھا، لیکن جب علامہ اعظمی دارالعلوم چھوڑ کر بنارس چلے گئے تو وہ بھی دیوبند اور سہارنپور سفر کر گئے، علامہ اعظمی کے پاس حدیث نہ پڑھ سکنے کا ان کو افسوس تھا، اور اپنی حسرت و افسوس کا اظہار انھوں نے ۲۲ ربیع الآخر ۱۳۴۸ھ کو سہارن پور سے لکھے ہوئے ایک خط میں اس طرح کیا:

"إني سعيت ما أمكن أن أحضر مجلس تدريسكم الحديث لكن الزمن الزبن لم يساعدني."

(۴)

(میں نے ہر ممکن کوشش کی کہ آپ کے درس حدیث کی مجلس میں شرکت کروں، لیکن زمانہ نے معاونت نہ کی)

۱۲/ شعبان ۱۳۹۶ھ مطابق اگست ۱۹۷۶ء کو وفات پائی، اللہ تعالیٰ ان کے اوپر اپنی رحمت کا سایہ فرمائے۔

مولانا عبدالستار معروفی آپ ضلع مئو کے مردم خیز قصبہ پورہ معروف میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم مدرسہ معروفیہ میں پائی، اس کے علاوہ مصباح العلوم کوپاگنج، احیاء العلوم مبارکپور، اور دارالعلوم مئو میں بھی تعلیم حاصل کی، اور مظاہر علوم سہارنپور سے سند فراغ حاصل کی۔

فراغت کے بعد درس و تدریس میں مشغول ہو گئے، اور اس مبارک مشغلے کو عمر بھر جاری رکھا، ابتداءً دارالعلوم مئو اور قاسم العلوم ہریا بھٹنی میں تدریسی خدمات انجام دیں، اس کے بعد مدرسہ معروفیہ اور پھر اشاعت العلوم پورہ معروف میں صدر مدرس مقرر ہوئے، مدرسہ بیت العلوم مالیگاؤں میں صدر مدرس و شیخ الحدیث اور دارالعلوم ندوہ میں شیخ الحدیث رہے، اس کے علاوہ دارالعلوم امدادیہ بمبئی میں بھی فریضۂ تدریس انجام دیا۔

مولانا عبدالستار صاحب، علامہ اعظمی کے خاص شاگردوں اور سعادتمند تلامذہ میں تھے، استاد کی عقیدت و محبت میں سرشار تھے، غالباً دارالعلوم مئو کے زمانۂ طالب علمی میں علامہ اعظمی کے حلقۂ تلامذہ میں داخل ہوئے، اور اس وقت سے تادم واپسیں اپنے استاد کے ادب و احترام میں کوئی کوتاہی نہیں کی، یہاں تک کہ آپکے دیگر افراد خانہ حتیٰ کہ خوردوں کے ساتھ بھی تعظیم و توقیر کا معاملہ فرماتے، بعض علمی و تحقیقی کاموں میں علامہ اعظمی کے معاون بھی رہے، چنانچہ مسند حمیدی کے مخطوطات کے مقابلہ میں آپ علامہ اعظمی کے شریک رہے، جیساکہ خود علامہ اعظمی نے مسند کے مقدمے میں ذکر فرمایا ہے۔

مولانا عبدالستار صاحب بڑے ذی علم، صاحب استعداد اور باصلاحیت انسان تھے، آپ کا فضل و کمال مسلم تھا، بہت وجیہ شخصیت کے مالک تھے، مگر ان تمام باتوں کے ساتھ سادگی اور تواضع کا پیکر تھے، بے نفسی و انکساری ایک ایک ادا سے ٹپکتی تھی، زمانۂ دراز تک علمی و تعلیمی خدمات انجام دینے کے بعد ۲۲/ رجب ۱۴۱۴ھ م ۶/ جنوری ۱۹۹۴ء کو مالیگاؤں میں انتقال فرمایا اور وہیں مدفون ہوئے۔

مولانا محفوظ الرحمن نامی | رسڑا ضلع بلیا کے باشندہ تھے، ولادت جمادی الثانیہ ۱۳۲۹ھ (مئی ۱۹۱۱ء) میں ہوئی، دیندار گھرانے کے چشم وچراغ تھے، غالباً ابتدائی تعلیم کے بعد مئو آئے، اور دارالعلوم مئو میں داخلہ لیا، وہیں علامہ اعظمی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا، دارالعلوم مئو میں کئی سال رہے اور علامہ اعظمی کے دامن فضل سے خاص طور سے وابستہ رہے، اس کے بعد ۱۹۲۷ء (غالباً ۱۳۴۶ھ) میں دیوبند گئے اور وہاں کئی سال زیر تعلیم رہ کر علم وفن کی تکمیل کی۔

فراغت کے بعد اپنی علمی ودینی سرگرمیوں کے لئے بہرائچ کا انتخاب کیا، وہاں انھوں نے نورالعلوم کے نام سے ایک مدرسہ قائم کیا، اس مدرسہ کی نشو ونما اور تعمیر وترقی کے لئے انتھک کوششیں کیں، اور آخر وقت تک اس کے لئے اپنی فکری، علمی اور عملی صلاحیتیں اور توانائیاں صرف کرتے رہے، اس کے اندر انھوں نے دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ صنعت وحرفت کے شعبے قائم کئے۔

مولانا نامی اپنے وقت کے ایک جید الاستعداد اور باصلاحیت عالم اور عابد وپرہیزگار انسان تھے، قرآن کریم کے ساتھ خاص شغف تھا، اور قرآن کی تعلیم وتدریس کا ان کے اندر شدید جذبہ موجزن تھا، اس کے لئے انھوں نے مفتاح القرآن کے نام سے رسائل لکھے، قرآن پاک کی تعلیم وترجمہ کے مسلمانوں میں فروغ کی ان کو اس قدر فکر لاحق تھی کہ اس کے لئے انھوں نے متعدد مقامات کے دورے کئے، اسی کے ساتھ وہ خوش بیان واعظ ومقرر بھی تھے، بہرائچ میں حنفیت اور دیوبندیت کے فروغ کے لئے بھی بڑی قابل قدر کوششیں کیں۔

قدرت کی طرف سے ان کو دینی ودنیوی دونوں وجاہتیں عطا ہوئی تھیں، چنانچہ وہ متعدد اہم مناصب پر فائز رہے، بہرائچ میں ان کو بڑی مقبولیت اور عوام کے درمیان اعزاز واکرام حاصل تھا، ۱۹۳۷ء میں کانگریس کے ٹکٹ پر الیکشن لڑے(۱) اور لیگ جیسی طاقتور

---

(۱) کاروان رفتہ ص ۲۳۶

اور مسلمانوں میں اثر و رسوخ رکھنے والی پارٹی کے مقابلہ میں کامیاب ہوئے، اور لکھنؤ اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے، وہ وزارت تعلیم میں پارلیمنٹری سکریٹری بھی رہ چکے تھے، ان عہدوں کے علاوہ وہ علیگڈھ مسلم یونیورسٹی کورٹ کے ممبر بھی رہ چکے تھے۔

علامہ اعظمی سے جب سے نسبت تلمذ قائم ہوئی، اس وقت سے لے کر آخر دم تک ربط و تعلق برقرار رکھا، خط و کتابت کا سلسلہ زمانۂ طالب علمی سے لے کر وفات سے کچھ پیشتر تک جاری رکھا، اہم امور میں آپ سے مشورے لیتے، اپنے مدرسے کے لئے اساتذہ و مدرسین کی تقرریوں میں آپ کی طرف رجوع کرتے، بلکہ کئی ایک موڑ پر انھوں نے علامہ اعظمی کو اپنے مدرسے میں درس و تدریس کے لئے بلانے کی کوشش بھی کی، علامہ اعظمی بھی ان کو عزیز رکھتے تھے، اور وعظ و تقریر و جلسوں میں ان کو کبھی کبھار دعوت بھی دیتے، شاگرد کے نام استاذ کے ایک خط کی نقل ہمارے سامنے موجود ہے، جو ۲۳ر جنوری ۱۹۳۴ء کا نوشتہ ہے وہ خط حسب ذیل ہے۔

"عزیز مکرم مولوی محفوظ الرحمٰن صاحب حفظہ اللہ

السلام علیکم۔ میں نے مئو میں آپ سے ذکر کیا تھا کہ میں نے ایک طالب علم کو آپ کے پاس جانے کا مشورہ دیا ہے، آج اس طالب علم کو اپنا رقعہ دے کر آپ کے پاس بھیجتا ہوں، اس کے وظیفہ کا انتظام کر کے مجھے اطلاع دیجئے، یہ لڑکا عزیز قوم ذل کا مصداق ہے، کبھی اس کا خاندان مئو میں بڑا نامی خاندان تھا، لیکن اب آوارگی کی وجہ سے نہ صرف بدنام بلکہ افلاس میں بھی مبتلا ہے۔

بہر حال اس کا خیال کیجئے اور تعلیم کے ساتھ تربیت کا بھی لحاظ رکھئے، تہذیب اخلاق کی طرف خاص توجہ درکار ہے، آپ کے مدرسہ کی کاپیاں دیکھ کر واپس کرتا ہوں اس کی رسید بھیجئے، زلزلہ کی وجہ سے جو نقصانات ہوئے ہیں ان کی تفصیل معلوم ہو گی، جامع مسجد کی بھی ایک مینار گر گئی ہے، اور سب خیریت ہے، والسلام

حبیب الرحمٰن الاعظمی ۲۳ر جنوری ۳۴ء"

رجب ۱۳۸۳ھ مطابق نومبر ۱۹۶۳ء میں فالج کے مرض میں وفات پائی۔

مولانا قاری ریاست علی بحری آبادی مئوی

آبائی وطن بحری آباد ضلع غازیپور تھا، وہیں ۱۹۰۰ء میں تولد ہوئے، لیکن عمر زیادہ تر مئو میں گزاری اور نقل وطن کر کے یہیں سکونت پذیر ہوئے۔ ابتدائی تعلیم بحری آباد میں پائی، اس کے بعد مدرسہ فرقانیہ لکھنؤ اور پھر سبحانیہ الہ آباد میں رہ کر تجوید و قرأت سبعہ کی تکمیل کی اور اس فن میں مہارت بہم پہنچائی۔

فن تجوید و قرأت کی تکمیل کے بعد کچھ دنوں بریلی میں اس کے استاد رہے، کچھ ہی دنوں بعد ۱۳۴۰ھ میں دار العلوم مئو آگئے، اور یہاں تجوید و قرأت کے استاد مقرر ہوئے، مگر ساتھ ہی سلسلۂ تحصیل علم بھی جاری رکھا، اپنے وقت کی تقسیم اس طرح کی کہ چار گھنٹے طلبہ کو پڑھاتے اور دو گھنٹے خود طالب علم بن کر اساتذہ سے علم حاصل کرتے، اس طرح ۱۲ سال کی طویل مدت کے بعد ۱۳۵۲ھ میں سند فراغ حاصل کی، اسی زمانہ میں علامہ اعظمی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کر کے مقامات حریری اور نور الانوار وغیرہ کا درس لیا۔

قاری صاحب کی علم و فن سے لگن کا اندازہ ان کی اسی ایک بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ استاذ القراء کے عہدہ پر فائز رہتے ہوئے بارہ برس تک طالب علمی کی زندگی گذاری، تجوید و قرأت میں ان کا پایہ بہت بلند تھا، اور اس میدان میں ان کے معاصرین میں بہت کم ان کے ہمسر ہوئے، اس فن میں ان کا فیض دور دور تک پہنچا اور ایک دنیا اس چشمۂ صافی سے فیضیاب ہوئی۔

قاری صاحب نے درس نظامی کی تکمیل کے بعد عربی درجات میں بھی درس و تدریس کا کاروبار شروع کیا، پوری عمر تدریسی خدمات انجام دیتے اور دار العلوم کی خدمت کرتے گذار دی، ان کے فضل و کمال کی ایک شاندار مثال یہ تھی کہ شیخ القراء کے ساتھ دار العلوم مئو کے شیخ الحدیث اور صدر المدرسین کا تاج بھی ان کے سر پر رکھا گیا۔

آخر عمر میں کینسر کے موذی مرض میں مبتلا ہو گئے تھے، اور بالآخر اسی بیماری میں ۱۴؍ ذی الحجہ ۱۳۹۱ھ مطابق ۲۱؍ جنوری ۱۹۷۲ء کو جان جان آفریں کے سپرد کی، نماز جنازہ ان کے استاد محترم حضرت علامہ اعظمی نے پڑھائی تھی۔

مولانا مفتی محمد ظفیر الدین مفتاحی اس کتاب میں یہ نام بے شمار بار آیا ہے، علامہ اعظمی کے ارشد تلامذہ میں ہیں۔ صوبہ بہار کے ضلع دربھنگہ کے ایک موضع پورہ نوڈیہا میں ۷؍مارچ ۱۹۲۶ء کو پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم وطن اور راجپور نیپال کے مدرسہ محمودیہ میں پائی، ۱۹۳۴ء میں چھپرہ کے مدرسہ وارث العلوم میں داخل ہوئے، اور ۱۹۴۰ء تک وہاں رہ کر شرح وقایہ تک کی کتابیں پڑھیں، اسی اثناء میں علامہ اعظمی اور مولانا عبد اللطیف نعمانی کے درس کا غلغلہ ان کے کانوں میں پڑا، اور جاذبۂ توفیق انھیں مدرسہ مفتاح العلوم مئو تک لایا، مفتاح العلوم میں انھوں نے شوال ۱۳۵۹ھ میں داخلہ لیا، اور چار سال قیام پذیر رہ کر شعبان ۱۳۶۳ھ م ۱۹۴۴ء میں علامہ اعظمی کے پاس بخاری و ترمذی پڑھ کر فارغ التحصیل ہوئے۔

مفتاح العلوم مئو میں داخلہ کا اصل محرک ان ہی دونوں بزرگوں بالخصوص علامہ اعظمی کی شہرت تھی، جس کا آوازہ انھوں نے چھپرہ میں سنا تھا، اس وقت کا مفتاح العلوم آج کا مفتاح العلوم نہیں تھا، اس وقت یہ بلند و بالا عمارتیں نہ تھیں، کمروں کی کمی تھی، حتی کہ جامع مسجد کا فرش اساتذہ کی درسگاہ تھا، مگر تعلیمی لحاظ سے وہی مفتاح العلوم کا عہد شباب تھا، مفتی ظفیر الدین صاحب اسی بے سروسامانی کے زمانہ کی پیداوار ہیں، زمانۂ طالب علمی میں ان کا قیام محلہ باغیچہ کی مسجد میں رہا، پاس ہی مولانا عبد الجبار صاحب کی رہائش تھی، اس لئے انھوں نے ان سے بھی خوب فیض حاصل کیا، مفتی صاحب اس وقت علامہ اعظمی کے خاص خادموں میں تھے، اس زمانے میں بجلی ناپید تھی، لہذا علامہ اعظمی جب رات کے وقت سفر وغیرہ سے واپس آتے تو مفتی صاحب روشنی کا انتظام کر کے آپ کو لینے کے لئے اسٹیشن جاتے، اور اکثر ایسا ہوتا کہ وہ رات آپ مفتی ہی صاحب کی مسجد میں گذارتے، اس کے علاوہ بیماری وغیرہ کی حالت میں بھی خدمت گذاری کرتے۔

فراغت کے بعد درس و تدریس کا آغاز ہوا، ایک سال مفتاح العلوم میں ابتدائی درجوں کے مدرس رہے اور افتاء وغیرہ کی مشق کی، اس کے علاوہ مدرسہ معدن العلوم

نگرام، دارالعلوم معینیہ سانہہ مونگیر اور جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل وغیرہ میں کارہائے تدریس انجام دیئے، ۱۳۷۶ھ میں مفتی صاحب کو دارالعلوم دیوبند طلب کر لیا گیا، جہاں وہ شعبۂ تصنیف و تالیف میں ملازم ہوئے، اس کے بعد ان کو فتاویٰ دارالعلوم کی ترتیب کی ذمہ داری سونپی گئی، جس کو انھوں نے باحسن وجوہ انجام دیا، بعد ازاں کتب خانہ دارالعلوم کا مدیران کو بنایا گیا، جس میں انھوں نے اپنی بہترین صلاحیت و قابلیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کی فن وار ترتیب دی، اور اس وقت وہاں کے شعبۂ افتاء میں مفتی کے اہم منصب پر فائز ہیں جو ایک مقتدر علمی عہدہ ہے۔

مفتی صاحب بچپن ہی سے ذہین و فطین اور محنتی تھے، درس و مطالعہ کا شوق تھا، اپنی جماعت اور ہم درسوں میں ہمیشہ طاق رہے، ان کی یہی خوبیاں تھیں جن کی وجہ سے اپنے اساتذہ کے مقرب اور منظور نظر تھے، ان کے روابط تو اپنے تمام اساتذہ ہی سے تھے، لیکن علامہ اعظمی کے ساتھ ان کی گرویدگی حد سے زیادہ تھی، اور واقعہ یہ ہے کہ ان کی تعلیم و تربیت اور ارشاد و رہنمائی میں علامہ اعظمی کا خاص کردار رہا ہے، شاید و باید ہی کوئی ایسا اہم کام رہا ہو، جس میں وہ علامہ اعظمی سے مشورہ اور راہنمائی کے طالب نہ رہے ہوں۔ یہ علامہ اعظمی کی شاگرد کے اوپر غایت درجہ شفقت تھی کہ جب وہ مفتاح العلوم سے فارغ ہوئے تو آپ نے انتظامیہ پر زور دے کر تدریس و افتاء کی مشق کے لئے مفتاح العلوم میں ان کا تقرر کروایا۔ علامہ اعظمی کی شفقت کے بارے میں مفتی صاحب خود فرماتے ہیں:

"شفقت تو تمام ہی اساتذہ کرام کی رہی، لیکن حضرت الاستاذ مولانا اعظمی نے زیادہ توجہ فرمائی۔" (۱)

چند سطروں کے بعد پھر لکھتے ہیں:

"میرے سب کچھ حضرت اقدس ہی تھے، جب تک حضرت بقید حیات رہے، خاکسار اکتساب علم کرتا رہا، بڑی عنایتیں تھیں۔" (۲)

---

(۱) مشاہیر علماء ہند کے علمی مراسلے ۱۴۱ (۲) ایضاً ۱۴۲

ان کی علمی خدمات میں ایک درجن سے زائد کتابیں ہیں، جو متعدد موضوعات پر انھوں نے تصنیف فرمائی ہیں، یہ تصنیفات تالیف و تصنیف کے ان کے ستھرے ذوق کی آئینہ دار ہیں۔ اللہ تعالیٰ مفتی صاحب کی عمر میں برکت عطا فرمائے، اور ان کے فیض کو جاری وساری رکھے۔

مولانا ضیاء الحسن صاحب اعظمی ۲۰ر جنوری ۱۹۳۲ء کو مئو میں پیدا ہوئے ، تعلیم متوسطات تک مفتاح العلوم مئو میں حاصل کی، اس کے بعد دیوبند گئے اور وہاں شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کے پاس بخاری پڑھ کر ۱۳۷۱ھ میں فارغ التحصیل ہوئے۔ فراغت کے بعد دارالعلوم ندوہ جاکر عربی ادب میں تخصص کیا اور عربی زبان وادب کی بہترین صلاحیت بہم پہونچائی، ندوہ سے اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد علامہ اعظمی کے دامن تربیت سے وابستہ ہوئے، اور ان کے خوان علم سے بھرپور زلہ ربائی کی، یہ وہ زمانہ تھا کہ علامہ اعظمی سن و سال کے لحاظ سے اگرچہ عمر رسیدہ ہو چکے تھے، لیکن علمی و تحقیقی اعتبار سے یہ ان کا عہد شباب تھا، دوسری طرف مولانا ضیاء الحسن صاحب بھی استعداد و صلاحیت کے ساتھ بھرپور جوش وولولہ رکھتے تھے، علامہ اعظمی نے ان کی ابھرتی ہوئی صلاحیت اور جوش وولولہ کو دیکھتے ہوئے ان کے اوپر دست شفقت رکھا، اور اپنے تحقیقی مشاغل میں ان کو معاون و مددگار بنایا، اور پھر جب مصنف عبدالرزاق کی طباعت کے سلسلہ میں علامہ اعظمی کو سفر لبنان پیش آیا، اور بیروت میں صاحبزادۂ محترم مولانا رشید احمد صاحب بیمار ہو کر گھر واپس لوٹے، تو طباعت کی نگرانی اور اپنی معیت کے لئے مولانا کو بیروت طلب فرمایا، چنانچہ اس مقصد سے وہ خاصے عرصے تک بیروت میں قیام پذیر رہے۔

مولانا ضیاء الحسن صاحب نے پوری عمر علمی مشاغل اور درس و تدریس میں صرف کی، معہد ملت مالیگاؤں، مفتاح العلوم مئو اور مظہر العلوم بنارس وغیرہ میں تدریسی خدمت انجام دی، مظہر العلوم بنارس میں بیک وقت شیخ الحدیث اور صدر المدرسین کے عہدے پر فائز رہے، اس کے بعد ندوۃ العلماء کے شیخ الحدیث مقرر ہوئے، اور آخر وقت

تک اس کی مسند کو رونق بخشتے رہے۔

ایک طویل اور صبر آزما علالت کے بعد ۲۳ر جمادی الاخری ۱۴۰۹ھ مطابق ۴ر جنوری ۱۹۸۹ء کو اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔

مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن الاعظمی | علامہ اعظمی کے شاگردوں میں سب سے زیادہ نامور، عربی زبان کے کہنہ مشق ادیب اور شعلہ بیان خطیب مولانا سعید الرحمٰن الاعظمی الندوی، مولانا محمد ایوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے فرزند دلبند ہیں، ۱۹۳۴ء میں مئو میں پیدا ہوئے، درس نظامی کا نصاب مفتاح العلوم مئو میں مکمل کیا، اور ۱۹۵۱ء میں فارغ التحصیل ہوئے، دورۂ حدیث کی کتابوں میں علامہ اعظمی کے پاس سنن ابن ماجہ پڑھی، ۱۹۵۲ء میں ندوہ میں داخلہ لیا اور دو سال زیر تعلیم رہ کر ادب عربی میں تخصص کی سند حاصل کی، اس کے بعد وہیں استاد مقرر ہوگئے، غالباً ۱۹۹۵ء میں (شعراء الرسول صلى الله عليه وسلم، بين الواقع والقريض) کے عنوان پر آپ نے دکتوراہ (Doctrate) کیا، جس کی بنیاد پر آپ کو دارالعلوم ندوۃ العلماء کی طرف سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری تفویض کی گئی، ۱۹۵۵ء میں ندوہ سے جب "البعث الاسلامی" نکلنا شروع ہوا تو اس کے مدیر (ایڈیٹر) منتخب ہوئے، اور ۱۹۷۹ء میں مولانا محمد حسنی کے انتقال کے بعد سے اس کے رئیس التحریر (Chief Editor) ہوئے، اور اپنے خلوص و لگن اور انتھک جد و جہد سے اس کو اعلیٰ معیار تک پہنچایا۔

"البعث الاسلامی" کی ادارت کے علاوہ ندوہ سے نکلنے والے ایک پندرہ روزہ اخبار "الرائد" کے نائب الرئيس العام بھی ہیں، ندوہ کے اور بھی کئی انتظامی عہدے آپ کے سپرد ہیں، چنانچہ وہ كلية اللغة العربية کے عمید اور ندوہ کے نائب مہتمم بھی ہیں

مولانا سعید الرحمٰن صاحب اعظمی علامہ اعظمی کے خاص شاگردوں میں ہیں، راقم السطور نے علامہ اعظمی کے سامنے جس ادب و احترام کے ساتھ ان کو نشست و برخاست کرتے ہوئے دیکھا ہے، شاگردوں میں مولانا عبدالجبار صاحب کے علاوہ اور کسی کو نہیں دیکھا۔ علامہ اعظمی کی شاگردی کا شرف ان کو بچپن ہی میں اس وقت حاصل ہو گیا تھا،

جب وہ عربی کی ابتدائی جماعتوں میں تھے، مولانا محمد ایوب صاحبؒ کی درخواست پر علامہ اعظمی نے آپ کو "القراءۃ الرشیدۃ" جزءاول پڑھائی، اس کے علاوہ کچھ حصے مقامات بدیع و مقامات حریری کے بھی پڑھائے، فراغت کے بعد عربی کتابت وانشاء کی مشق کرائی، جو ان کی ترقی کا سب سے بڑا ظاہری سبب بنی، اس قصے کو انھوں نے عربی اور اردو کے اپنے مضامین میں خود بہت تفصیل سے قلمبند کیا ہے، جس کا ایک اقتباس ہم اس جگہ نقل کر رہے ہیں، وہ فرماتے ہیں:

"... دوران طالب علمی ان کے قیمتی مشورے اور ہدایات میری زندگی کے لئے مشعل راہ ثابت ہوئے اور ان سے میں نے ادب عربی میں جو کچھ پڑھا وہی آگے چل کر ندوۃ العلماء میں داخلہ کا سبب اور ابا حضور کی دیرینہ آرزو کی تکمیل کا باعث بنا۔"

میں نے یہ صفحات لکھتے وقت مولانا کے پاس خط لکھ کر اس بابت مزید تائید وتوثیق چاہی تو انھوں نے ازراہ عنایت یہ سطریں تحریر فرماکر روانہ فرمائیں:

"دورہ کے بعد والے سال میں والد صاحب رحمہ اللہ نے حضرت الاستاذ رحمۃ اللہ علیہ سے درخواست کی کہ میرے لڑکے سعید الرحمٰن کو عربی لکھ کر آپ کی خدمت میں پیش کرنے اور اصلاح لینے کی اجازت دیں، چنانچہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے روزانہ ظہر کے بعد گھر پر اپنے دارالمطالعہ میں حاضر ہونے کی اجازت دی اور ایک کتاب عربی ادب کی عطا فرمائی کہ میں اس کا اردو میں ترجمہ کر کے روزانہ خدمت عالیہ میں پیش کروں، کبھی کبھار اس اردو کو عربی میں تبدیل کرنے کی بھی سعادت حاصل ہوئی بغیر اس کے کہ کتاب سے کوئی مدد لی جائے، اس سے بہت فائدہ ہوا اور کم و بیش پورے ایک سال تک روزانہ بلاناغہ حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں انشاء لے کر حاضر ہوتا رہا اور استفادہ کر کے واپس آتا تھا، شاید اسی پابندی کا نتیجہ تھا کہ عربی زبان و ادب

سے کسی قدر مناسبت پیدا ہوئی اور ندوہ جیسے عظیم ادارے میں خدمت کا موقع ملا۔"

استاد نے اپنے اس شاگرد رشید کی کس طرح تعلیم و تدریب کی تھی اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ علامہ اعظمیؒ نے ایک دفعہ راقم الحروف سے فرمایا کہ مولوی سعید الرحمٰن جب فارغ ہوئے تو مولوی ایوب صاحب نے مجھ سے کہا کہ سعید الرحمٰن کو عربی تحریر و انشاء کی مشق کرا دیجئے، تو ایک آدھ سال تک وہ میرے پاس انشاء کی مشق کرتے رہے، اس کے بعد مولوی ایوب ہی کے کہنے پر میں نے ان کو ندوہ بھیج دیا، ان کے ندوے جانے کے کچھ دنوں بعد جب میں ندوہ گیا تو شاہ حلیم عطا (سابق شیخ الحدیث دارالعلوم ندوہ) اپنی درسگاہ کی طرف سے آرہے تھے، مجھے گیٹ پر دیکھ لیا، بڑے تپاک سے ملے اور گلے لگا کر کہا "مولانا! آپ نے شاگرد نہیں شعلۂ جوالہ بنا کر بھیجا ہے۔"[۴]

علامہ اعظمی کے الفاظ بعینہٖ یاد نہیں رہ گئے۔ مفہوم یہی تھا جو بیان کیا گیا ہے البتہ آخر کا جملہ بعینہٖ مذکور ہے۔

☆☆☆

علامہ اعظمی نے فرمایا:

ہم انگریزی پڑھنے کو بالکل منع نہیں کرتے مگر جو طریقہ اختیار کیا گیا ہے وہ غلط ہے، ایک لڑکا انگریزی پڑھتا ہے، تو یہ سمجھتا ہے کہ یہ نماز وغیرہ تو مدرسہ میں جو طالب علم پڑھتے ہیں ان کا کام ہے، روزہ رکھنا ان کا کام ہے، ان کو ان چیزوں سے، اسلامی وضع قطع سے نہ کوئی دلچسپی ہے اور نہ اپنے لئے وہ ضروری سمجھتے ہیں، بلکہ وہ اپنے لئے ضروری سمجھتے ہیں کہ ان تعلیمات کی مخالفت کریں، اگر ایسا نہیں کرتے تو وہ اپنی نسبت سمجھتے ہیں کہ لوگ ہم کو دقیانوسی اور قدیم خیال کا آدمی تصور کریں گے، یہ ساری برائیاں ہیں۔ یہ برائیاں اسکولوں اور کالجوں سے تو دفع ہونے کی نہیں، لیکن کسی مجبوری کے تحت جب ہمارے بچے ان میں پڑھتے ہیں تو ان کی ذہنی تربیت کا انتظام کرنا چاہئے۔

المآثر ج ۳ ش ا ص ۸۷

☆☆☆☆☆

چھٹا باب

خانگی زندگی

چھٹا باب
خانگی زندگی

بیویاں علامہ اعظمی نے دو شادیاں کی تھیں، اور یہ دونوں شادیاں زمانہ طالب علمی ہی میں ہوئی تھیں، پہلی بیوی کا نام مقیمہ تھا، جو آپ کے استاد مولوی عبدالرحمن صاحب اورنگ آباد (مئو) کی صاحبزادی تھیں، لیکن ان کی عمر نے وفا نہ کی اور رخصتی سے پہلے ہی انتقال کر گئیں۔

مولوی عبدالرحمن صاحب کے ایک بھائی مولوی عبدالعزیز صاحب تھے جو مفتاح العلوم کے ابتداء قیام میں اس کے نائب صدر رہ چکے تھے، یہ بھی آپ کے استاد تھے جن سے ابتدائی کتابیں پڑھی تھیں، علامہ اعظمی کی دوسری شادی انھیں کی دختر نیک اختر سے ہوئی، ان کا نام آمنہ خاتون تھا، اور اغلب یہ ہے کہ ان سے آپ کا نکاح ذی الحجہ ۱۳۳۸ھ میں ہوا تھا، کیونکہ آپ نے ایک جگہ "قطعہ تہنیت شادی و تاریخ" کے عنوان سے یہ شعر لکھا ہے:

در ماہ عید قرباں از فضل کبریائی ... فصل بہار آمد در باغ مصطفائی

اور اس کے نیچے "فیروز کتخدائی" تحریر ہے، جس کے اعداد ۱۳۳۸ برآمد ہوتے ہیں، اس کے علاوہ آپ کی نظموں میں ایک نظم سہرا کے عنوان سے ہے جو ۱۳۳۸ھ کی لکھی ہوئی ہے اور اس واقعہ کی طرف اشارہ کرتی ہے، ویسے یہ بات تو بہر حال یقینی ہے کہ شوال ۱۳۳۹ھ سے قبل آپ کا عقد ہو چکا تھا۔ کیونکہ آپ کے ذخیرۂ مکاتیب میں اس زمانہ کے دیوبند سے لکھے ہوئے کچھ خطوط زوجہ کے نام کے ملتے ہیں۔

علامہ اعظمی نے اپنی بیاض میں اپنی اہلیہ کا نسب نامہ بھی تحریر فرمایا ہے، جو حسب ذیل ہے:

"آمنہ خاتون بنت مولوی عبدالعزیز بن میانصاحب ولی اللہ بن میاں جی جمال الدین عرف جمن بن طولن بن رجو بن صدور بن اسماعیل بن اشرف(۱) بن شہاب الدین(۲) بن خواجن بن جمال(۳) بن مدا۔"

انھوں نے عمر خاصی طویل پائی اور اپنے عظیم خاوند کیلئے بہترین رفیقۂ حیات ثابت ہوئیں، ان کی زندگی حسنِ معاشرت کا نمونہ تھی، زندگی کا ہر دکھ سکھ جھیلتی رہیں، لیکن زبان پر کبھی حرف شکایت نہ آنے دیا، علم و عمل، درس و تدریس اور تعلیم و تعلم کی قدر و قیمت سے بہر طور آگاہ تھیں، اور اپنی خدمت گذاری سے شوہر کو ہمیشہ آرام پہنچاتی رہیں، ۹ر جون ۱۹۷۹ء کو عین سحر کے وقت آپ کا انتقال ہوا۔

اولاد و اعقاب دوسری شادی میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے بہت برکت عطا فرمائی، اولادیں آپ کی تمام ان ہی سے ہوئیں، اور خوب پھلیں پھولیں، چنانچہ وفات کے وقت آپ نے اولاد و احفاد و اسباط کا ایک بہت بڑا اور بھرا پرا کنبہ چھوڑا۔

ان سے آپ کی دس اولاد ہوئی: تین ذکور سات اناث، جن کے نام حسب

(۱) علامہ اعظمی نے ان کے نام پر حاشیہ کا نمبر دے کر لکھا ہے: "كان حيا في سنة ۱۱۲۵ ھ و قد باع النصف من محلة الباز التي ورثه هو و إخوانه من أبيه بمأتي روبية و روبية من منور بن مبارك بن گهاسی ۵۱." یعنی ۱۱۲۵ھ میں حیات تھے، انھوں نے نصف پورہ باز، جس کو انھوں نے اور ان کے بھائیوں نے اپنے والد سے وراثت میں پایا تھا، ۲۰۱ روپے میں منور بن مبارک بن گھاسی کے ہاتھ بیچ دیا تھا۔

(۲) ان کے بارے میں حاشیہ میں لکھتے ہیں: "كان حيا في سنة ۱۱۰۳ ھ وهو عهد السلطان عالمگیر." یعنی ۱۱۰۳ میں جو کہ سلطان عالمگیر کا عہد ہے، بقید حیات تھے۔

(۳) ان کی نسبت لکھا ہے: "هو الذي اشترى محلة الباز بثلث مائة و ست و خمسين روبية من بانيها باز بن عالم الحائك (سفید باف)۔" انھوں نے ہی محلہ پورہ باز کو اس کے بانی باز بن عالم حائک (سفید باف) سے ۳۵۶ روپے میں خریدا تھا۔

ترتیب پیدائش یہ ہیں: عائشہ، اسماء، رضیہ تاریخی نام رضیۃ الرحمان، زکیہ، رشید احمد تاریخی نام فضل عظیم، صفیہ، خدیجہ، سعید احمد، مختار حسن، عبیدہ ، ان میں تین صاحبزادیاں اور ایک چھوٹے صاحبزادے (مختار حسن) اپنے والد کی حیات ہی میں وفات پاگئے، صاحبزادے کی تاریخ وفات کا تو علم نہیں ہو سکا، صاحبزادیوں کی وفات کے بارے میں چوتھے باب میں لکھا جا چکا ہے۔

☆☆☆

علامہ اعظمی نے فرمایا:

زمانہ چاہے جتنا بھی ترقی کر جائے، روشنی چاہے جتنی بڑھ جائے، آپ اور ہم چاہے جتنے روشن خیال ہو جائیں، لیکن احکام اسلام کے اندر کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی، اور جو طریقۂ کار عائشہ صدیقہؓ اور فاطمہ زہراؓ کے لئے تھا وہی طریقہ تعلیم اور وہی طریقۂ تربیت آج ہماری اور آپ کی بیٹیوں کیلئے بھی رہے گا، چودہ سو برس پہلے محمد رسول اللہ ﷺ نے جس طرح عورتوں کے رہنے سہنے اور ان کی تعلیم کا انتظام کیا تھا، اسی کی روشنی میں، اسی کی مطابقت میں، اسی کی پیروی میں آج ہم کو بھی کرنا ہوگا، ہمارا یہ عذر اللہ کے نزدیک مسموع نہ ہوگا کہ ارے صاحب زمانہ بہت ترقی کر گیا تھا، فلاں چیز کا اگر خیال کیا جاتا تو دنیا کہتی کہ یہ لوگ کیسے تاریک خیال ہیں، کیسے دقیانوسی ہیں، اللہ کے نزدیک یہ عذر نہیں ہوگا۔ یہ دقیانوسیت نہیں ہے۔ یہ اپنے اصول، اپنے طریقہ کار اور اپنی مذہبیت کے اندر پختگی ہے۔

المآثر ج ۳ ش ا ص ۸۸-۸۹

☆☆☆☆☆☆☆☆

ساتواں باب

اخلاق و عادات، اوصاف و کمالات

ساتواں باب

اخلاق وعادات، اوصاف وکمالات

قد و قامت اور سراپا قد میانہ بلکہ پستی کی طرف مائل، رنگ سانولا، بدن قدرے چوڑا، سینہ دل کی طرح کشادہ اور فراخ، چہرہ نہایت بارعب اور پر جلال جو لوگ جہاندیدہ قسم کے ہیں ان کا خیال ہے کہ اس عصر کے علماء میں ایسا رعب اور جلال کسی اور شخصیت کے چہرہ پر نظر نہیں آیا۔ آنکھوں کے اندر زہد و تقوی کا نور، عقل و دانش کی چمک، جھکی اور فکر میں ڈوبی ہوئی، پیشانی چوڑی، ناک کچھ بڑی، دہانہ درمیانہ بڑا نہ چھوٹا، بال سنتی یعنی کانوں کی لوؤں تک بالکل سیدھے، بالوں میں خواہ سر کے ہوں یا داڑھی کے ۹۲ بیانوے سال کی عمر تک پوری طرح سفیدی نہیں آئی تھی، اور ابھی خاصے سیاہ تھے، دانت مصنوعی استعمال کرتے تھے، کیونکہ جتنے قدرتی تھے سب گر چکے تھے، آنکھوں کی روشنی نور بصیرت کی طرح تیز اور قوی، البتہ آخر عمر میں موتیابند کا پانی اتر آیا تھا جس کی وجہ سے آپریشن کرانا پڑا، اس لئے عینک کا بھی استعمال کرنا پڑا۔ لیکن یہ اس وقت کی بات ہے جب عمر اسی پچاسی سے متجاوز ہو چکی تھی، داہنے ہاتھ میں انگشت شہادت، بیچ کی انگلی اور انگوٹھے میں کچھ گڑھا جو قلم پر گرفت کا نشان تھا، دو زانو ہو کر کہنیوں کے سہارے مطالعہ کرنے کی وجہ سے دونوں کہنیوں پر گٹے پڑے ہوئے، ہاتھوں کا ملمس نرم و گداز تھا۔

علامہ اعظمی کی جسمانی ساخت کافی اچھی تھی، مدت حیات میں بہت سے عوارض میں وقتاً فوقتاً مبتلا رہے، اور بسا اوقات بہت جان لیوا قسم کی بیماریوں سے بھی دوچار ہوئے، لیکن دیکھنے والا بہت تندرست و توانا سمجھتا، دیکھنے سے بظاہر یہ نہ معلوم ہوتا کہ آپ کو کوئی بیماری ہے۔ جسمانی ساخت کو دیکھ کر یہ خیال گذرتا تھا کہ عہد شباب میں شاید تنومند رہے

ہوں، اخیر عمر میں جب کہ مجموعۂ امراض ہو گئے تھے، سوائے اعصابی اور جسمانی کمزوری کے آپ کی مجموعی حالت و ہیئت میں کچھ خاص فرق نہیں آیا تھا، ہم نے تو خیر عمر رفتہ میں دیکھا، لیکن آپ کے شاگرد عزیز مفتی ظفیر الدین مفتاحی جو ۱۹۴۰ء میں پہلی دفعہ آپ کی زیارت سے مشرف ہوئے تھے اور ۱۹۹۲ء تک برابر دیکھتے رہے ان کا بیان پڑھئے، وہ لکھتے ہیں:

"خاکسار کا ذاتی مشاہدہ یہ ہے کہ مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی یادداشت پر اور ظاہری صورت و شکل پر بڑھاپے کا کوئی ادنی اثر نہیں دیکھا گیا، ۱۹۴۰ء میں جس صورت شکل پر پہلی بار میں نے دیکھا تھا، رجب ۱۹۹۲ء یعنی وفات سے دو ماہ پہلے تک میں نے حضرت کو اسی شکل و صورت پر پایا، تکلیف تھی، کمزوری بھی تھی، مگر چہرے بشرے پر اس کا کوئی اثر محسوس نہیں ہوتا تھا، یہی حال قوت حافظہ کا تھا۔ یہ اللہ کی دین تھی اور علم حدیث سے شغف کی برکت۔" (۱)

لباس و پوشاک گرمیوں میں عموماً موٹے ململ کا کالر دار کرتہ استعمال فرماتے، جو نہ چھوٹا ہوتا نہ غیر ضروری لمبا، اس کی درازی گھٹنوں سے کچھ نیچے ہوتی، سر پر دوپلی یا گول ٹوپی کے اوپر اکثر و بیشتر رومال بھی رہتا۔ گھر پر ہوتے یا مسجد و مدرسہ میں، بلکہ قرب و جوار کے قصبوں میں بھی تشریف لے جاتے تو تہبند پہنے رہتے، البتہ سفر پر بالخصوص لمبے سفر پر جاتے وقت پائجامہ پہن لیتے، جو شلوار نما رہتا تھا، کبھی صدری بھی استعمال کرتے تھے۔

سردی کے موسم میں عام طور پر اونی کپڑے کا کرتہ پہنتے، سردی جب شدت کی ہوتی یا آخر عمر میں جب ضعف زیادہ ہو گیا تھا تو کرتے کے نیچے علاوہ دیگر گرم کپڑوں کے روئی دار مرزئی بھی جسم مبارک پر ہوتی، اونی رومال اور شال کا بھی استعمال کرتے، عمامہ یا صافہ باندھنے کا معمول نہیں تھا، البتہ سخت سردی کے ایام میں اونی رومال وغیرہ سر پر لپیٹ کر رضائی سر سے ڈال کر جب بیٹھتے تو رعب و جلال دوچند اور شخصیت دلآویز ہو جاتی۔

شیروانی کا استعمال کبھی کسی خاص تقریب اور موقع سے کرتے، البتہ بیرونی ممالک

(۱) ترجمان الاسلام ۱۱۔۱۲ ص ۱۴۰

کے سفر پر جب گئے تو اکثر و بیشتر شیروانی ہی میں ملبوس رہے، چنانچہ بیروت و حجاز کے اسفار اور قاہرہ کی کانفرنس میں شیروانی ہی پہن کر شریک ہوئے، ان سب مواقع پر سر پر رومال بھی عموماً رہتا تھا۔

عیدین کے موقع پر یعنی نماز دوگانہ کیلئے بہترین قسم کی عبا زیب تن کرتے، جس میں سادگی کے ساتھ پرکاری بھی ہوتی۔ ہاتھوں میں خوبصورت پتلی سہارنپوری چھڑی آپ کی شخصیت کا جزو لازم تھی۔ آپ کے لباس اور ملبوسات کی خصوصیت سادگی تھی جس کا دامن کسی بھی موقع پر ہاتھ سے نہ چھوٹتا، نمائش اور دکھاوے کا معمولی شائبہ تک نہیں تھا۔

رہائش آپ کی رہائش گاہ اور مکان دیکھ کر آج کے علماء و محققین مشکل سے یہ باور کریں گے کہ دنیائے علم کا تاجدار اور قلمروئے علم کا یہ تخت نشین اتنے معمولی سے گھر میں رہتا ہوگا، چھپر کا مکان جس کی کوئی دیوار صحیح و سالم اور کوئی اینٹ سیدھی نہیں، نشست گاہ ہی آپ کی رہائشگاہ، وہی ملاقات کا کمرہ، وہی کتبخانہ، جس میں چاروں طرف کتابیں اور آلات کتابت بکھرے ہوئے اور ایک آدھ بالشت جگہ لیٹنے اور پاؤں پھیلانے کے لئے بمشکل خالی ہوتی، نشست گاہ کے سامنے اتر طرف ایک چھوٹا سا صحن جس کے ایک کونے میں ذاتی استعمال کا استنجا خانہ تھا، اسی صحن میں گرمی کے دنوں میں رات میں چارپائی ڈال دی جاتی جس پر آپ استراحت فرماتے، وہاں چارپائیاں عموماً دو رہا کرتی تھیں؛ ایک آپ کے لئے اور دوسری آپ کے شاگرد رشید مولانا عبدالجبار صاحب کے لئے۔

وہ آپ کا آبائی مکان تھا، اور وہیں آپ کے بیشتر تصنیفی و تحقیقی کارنامے انجام پائے، جنھوں نے دنیائے علم و تحقیق کے اندر آپ کے نام کی دھوم مچادی، پھر جب وہاں جگہ کی بہت زیادہ تنگی محسوس کی جانے لگی، تو چند قدم کے فاصلہ پر ایک قطعہ زمین خریدا اور وقتی طور پر ایک کمرہ بنوا کر منتقل ہوگئے، یہ ۱۹۷۲ء کے لگ بھگ کی بات ہے، اور زندگی کے آخری ایام میں اسی سے متصل پھر ایک زمین خریدی اور اپنی سہولت کے لحاظ سے دو کمرے تعمیر کرائے، ایک کمرہ نسبتاً وسیع جس کو کتبخانہ کے طور پر استعمال کیا، اور

دوسرا اپنی بود و باش کے لئے رکھا، یہ ایک بڑا احاطہ تھا جس میں اپنے شوق کے حساب سے کچھ پیڑ پودے لگائے، اور اسی احاطے کے جنوب مشرقی گوشے میں اپنی ابدی آرامگاہ کیلئے خود ہی جگہ تجویز فرمائی، اور اب آپ کے اسی کمرے اور کتبخانے کے ٹھیک اوپر ایک نہایت خوبصورت اور عالیشان لائبریری تعمیر کر دی گئی ہے، جس میں حضرت الاستاذ رحمۃ اللہ علیہ کی تمام کتابیں اور نوادرات منتقل کر دیئے گئے ہیں، اور اس طرح بحمد اللہ لائبریری کی تعمیر کی آپ کی زندگی کی ایک بڑی خواہش کی تکمیل کر دی گئی۔

ماکل و مشرب عہد شباب کے بارے میں تو سنا یہ گیا ہے، کہ بڑی فاقہ مستی میں زندگی گذاری ہے، اس لئے کھانے پینے کا زیادہ شوق بھی نہ رہا ہوگا۔ وقت پر جو کچھ میسر ہوا ہوگا کھالیا ہوگا۔ ماکل و مشرب میں جہاں تک میرا مشاہدہ ہے نہ کسی چیز میں بہت زیادہ رغبت ظاہر کرتے تھے، اور نہ کسی چیز سے بظاہر اباء کرتے تھے، آخر عمر میں جب میں نے دیکھا ہے اس وقت آپ ہائی بلڈ پریشر کے مریض اور دل کی بیماری کے مستقل شکار ہو چکے۔ تھے اور ایک آدھ بار دل کا شدید دورہ بھی پڑ چکا تھا اس لئے بہت پھیکی غذا، یعنی ہلکے نمک اور کم مرچ مسالہ کی، تناول فرماتے تھے، زیادہ تر بکرے کا بالکل بچے کا نرم و ملائم گوشت اور نرم و گیلا چاول اور گھی میں ملی ہوئی روٹی، وجہ یہ تھی کہ دانت سب گر چکے تھے، اور مصنوعی دانت کے استعمال کے باوجود چبانے میں دقت پیش آتی تھی، کبھی کبھی فرمائش کر کے ہلکے مرچ مسالے کا مغز بنواتے۔ خوراک بہت کم تھی، بہت تھوڑا کھانا کھاتے۔ ناشتے کا کوئی خاص اہتمام نہیں تھا، چائے کے ساتھ بسکٹ یا اس قسم کی کوئی چیز تناول فرمالیا کرتے، دہی بھی اکثر و بیشتر استعمال میں رہا کرتا تھا، ایسا جو تازہ جما ہو اور ترش نہ ہو کہ بغیر شکر کے بھی کھایا جا سکے، لیکن چائے کے چمچے سے دو تین چمچے سے زیادہ نہیں لیتے تھے۔ چائے قریب قریب ہر وقت تھرماس یا کیتلی میں موجود رہتی جس سے واردین و صادرین کی بھی تواضع کرتے، اور خود بھی جب کام کرتے کرتے تھک جاتے تو نوش جاں فرماتے، چائے کے متعلق آپ کا کوئی خاص فلسفہ یا فارمولا نہیں تھا جو بعض اکابر کے یہاں نظر آتا ہے، حتی کہ اس

کے لئے تازگی کی بھی شرط نہیں تھی، بلکہ تھرماس کی گرم چائے یا کیتلی کی ٹھنڈی چائے بھی گرم کر کے پی لیتے، پان بغیر تمباکو کا کھاتے، خمیرہ و معجون کا استعمال ہمیشہ کرتے جو بدن اور حافظہ دونوں کو تقویت پہنچاتے۔

استغناء و بے نیازی شخصیت کی تعمیر اور ذات کی تکمیل میں کچھ ایسے اوصاف و خصائل پوری قوت کے ساتھ کار پرداز رہے ہیں، جس میں آپ واضح طور پر دوسروں سے ممتاز نظر آتے ہیں، انھیں خصوصیات میں سے ایک وصف خاص استغناء تھا، یہ وصف آپ کی شخصیت کا ایک ایسا اہم عنصر تھا، جو دیگر تمام اوصاف پر حاوی اور بھاری تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ کبھی آپ نے دنیا اور حطام دنیا کی طرف نظر بھر کر نہیں دیکھا، آپ اس سے ہمیشہ اعراض اور اغماض برتتے رہے، طالب علمی کا عہد ہو یا اسکے بعد کا زمانہ، اقتصادی اور معاشی طور پر کبھی آسودگی اور بے فکری نہیں رہی، مگر اس کے باوجود کبھی دنیا کمانے کی فکر نہیں ہوئی۔ اس زمانے میں جب مفتاح العلوم سے ملنے والی تنخواہ کے صرف ۴۵ روپے پر گذارہ کرتے تھے، اور یہی نہیں ایک مہینے کی پوری پونجی لاکر والد محترم کے حوالے کر دیتے تھے، ہندوستان کے بڑے بڑے اداروں سے سات سات سو روپے ماہوار کی ملازمت کی پیش کش کی گئی، مگر اس کی طرف نظر التفات بھی نہیں کی۔

اوپر آپ تفصیل سے پڑھ آئے ہیں کہ صرف ہندوستان نہیں، بلکہ عالم اسلام سے کیسے کیسے جاہ و منصب آپ کے قدموں میں ڈالے گئے، لیکن ان کی طرف نظر بھر کر دیکھنا بھی کبھی گوارا نہیں کیا، عالم اسلام کے اہم مدارس اور جامعات سے بلاوے آتے ہیں کہ آپ آکر اساتذہ کی تربیت اور فضلاء کی نگہداشت و اشراف کا عمل انجام دیں، لیکن دھن کے ایسے پکے کہ معلم الصبیانی ہی میں خوش اور مگن نظر آتے ہیں۔

شاہ مراقش سے لے کر مکے بازی (Boxing) کی دنیا کے بے تاج بادشاہ (محمد علی کلے) تک کے دعوت نامے آتے ہیں، اور ان پر صرف ایک نگاہ غلط انداز ڈال کر سرد خانے میں ڈال دیا جاتا ہے۔

یہاں میں آپ کے استغناء کی ایک مثال ذکر کردوں جسے ممکن ہے مادیت پسندی کے اس دور میں مبالغہ خیال کیا جائے لیکن ع

حدیث گرچہ غریب است راویاں ثقہ اند

آپ نے مصنف عبدالرزاق کی تحقیق و تعلیق کا جب بیڑا اٹھایا، تو بڑی محنت سے اس کتاب کے قلمی نسخوں کو مختلف کتب خانوں سے حاصل کیا، اور شبانہ روز کی محنت کے بعد دس سال کے طویل عرصے میں نہایت دیدہ وری اور عرق ریزی کے ساتھ اس کی ایک ایک حدیث کی تلاش و تحقیق کے بعد اپنی بیش قیمت تعلیقات سے سجا کر شائع کرنے کے قابل بنایا، جو گیارہ ضخیم جلدوں میں مجلس علمی ڈابھیل کی طرف سے بیروت میں چھپ کر شائع ہوئی، یہ علامہ اعظمی کا ایسا اہم اور عظیم الشان کارنامہ تھا کہ اس کا چرچا کتاب کی اشاعت سے قبل ہی عالم اسلام کے علمی حلقوں میں تحسین و ستائش کے ساتھ ہونے لگا تھا، اس عظیم کام کی رائلٹی (Royalty) کی نسبت جب آپ سے بات کی گئی، جو ۱۹۷۰ء میں، یعنی آج سے تقریباً تیس سال قبل، ہندوستانی کرنسی سے ۱۶؍ لاکھ روپے ہوتی تھی، تو آپ نے بڑی بے نیازی کے ساتھ جواب دیا کہ میں نے اس کام کو شروع کرتے وقت للہ (یا یہ فرمایا کہ بلامعاوضہ) اس کو انجام دینے کی نیت کرلی تھی۔

ایک اور واقعہ سن لیجئے، مولانا محمد یحییٰ صاحب ندوی سابق (مونگیر) ناچیز سے ایک دفعہ فرمانے لگے کہ حضرت مولانا (علامہ اعظمی) کو جس وقت کویت سے انسائیکلوپیڈیا کی ترتیب کے لئے دعوت دی گئی تھی، تو وہ اقتصادی طور پر آپ کے لئے سخت تنگی اور عسرت کا دور تھا، اسی دوران ایک دن حضرت خدابخش لائبریری پٹنہ تشریف لائے، تو میں نے عرض کیا کہ حضرت! کویت کی دعوت قبول کرلیجئے، تو آپ نے فرمایا: تمہاری ہی طرح دو اور دنیاداروں نے مجھے یہی مشورہ دیا تھا۔

آپ نے عظیم الشان علمی کارنامے جس بے نیازی و استغناء اور جذبۂ خلوص کے ساتھ انجام دئے وہ بہت تعجب خیز ہیں۔ یہاں آپ کے ایک خط کا ایک ٹکڑا پڑھ لیجئے جسے

۲۱؍ستمبر ۱۹۶۷ءم ۱۵؍جمادی الثانیہ ۱۳۸۷ھ کو مولانا ابراہیم میاں افریقی کے نام لکھا ہے:
"آپ نے اپنے عنایت نامہ میں میری مشکلات کی طرف بھی اشارہ کیا ہے، مشکلات کی تفصیل لکھنا علم کے نام کو بٹہ لگانا ہے"

یہ واقعات قرون اولیٰ کے محدثین وحفاظ کی یاد تازہ کردیتے ہیں، اور امید کی جاتی ہے کہ آپ کا شمار ان نفوس قدسیہ میں کیا جائے گا، جن کے بارے میں ارشاد خداوندی ہے: "من المؤمنین رجال صدقوا ما عاهدوا الله علیه"

غیرت وخودداری طبیعت بلا کی غیور پائی تھی، غیرت آپ کی سب سے قیمتی اور عزیز متاع تھی، عمر بھر جس کی کسی آبگینے کی طرح حفاظت کرتے رہے، اور زندگی کے کسی بھی حصے اور مرحلے میں اس پر کوئی بال نہیں آنے دیا، آپ کی زندگی میں بہت سارے نشیب وفراز آئے، تلخ وترش حالات سے دوچار ہوئے، دنیا کی دھوپ چھاؤں دیکھی، لیکن غیرت وخودداری کے اس ٹھوس جذبہ کو کبھی ٹھیس نہیں لگنے دی۔ امیر کبیر ہو، رئیس ہو یا بڑے سے بڑا وزیر کبھی کسی کے سامنے سر خم نہیں ہوا۔

مفتاح العلوم میں جس وقت شیخ الحدیث اور صدر مدرس تھے، تو وہاں کی تنخواہ کے ۴۵؍روپے واحد وسیلۂ معاش تھے۔ لیکن جب غیرت حق کا مسئلہ آیا تو اس کو بھی لینے سے انکار کردیا، اور دو ڈھائی سال تک تمام امور بلا معاوضہ انجام دیتے رہے، مگر خودداری پر ایک لمحہ کے لئے بھی حرف نہیں آنے دیا۔

حمیت دینی دینی حمیت آپ کے اندر بدرجۂ کمال موجود تھی، بلکہ آپ کی ذات اس صفت کا منتہا تھی، اس کی شاہد عدل وہ تصانیف ہیں جو آپ کے قلم فیض رقم سے وجود میں آئی ہیں۔ سنیت ہو یا دیوبندیت وحنفیت، ہر میدان میں دین کا آپ نے پرجوش دفاع کیا ہے، اور یہ سب کسی تعصب کا نتیجہ نہیں تھا، بلکہ تصلب فی الدین کے اثرات ومظاہر اور احقاق حق کا بے پناہ جذبہ تھا، جیسا کہ مفتی ظفیر الدین صاحب فرماتے ہیں:
"درس حدیث میں فرماتے تھے کہ مجھے کسی سے عناد نہیں ہے، حدیث میں نماز

کے سلسلہ میں متعدد روایتیں آئی ہیں، ایک پر اگر غیر مقلد عمل کرتے ہیں تو ان سے کیوں لڑا جائے، جب کہ وہ بھی حدیث سے ثابت ہے، لیکن جب ▪ حنفیوں کو طعنہ دیتے ہیں کہ یہ حدیث پر عمل نہیں کرتے، قیاس پر عمل پیرا ہیں تو اس وقت سوچو کیسے خاموش رہا جائے، اور یہ کیوں نہ بتایا جائے کہ ہم حدیث پر تم سے زیادہ عمل کرنے والے ہیں، اور تم سے زیادہ حدیث جاننے والے ہم ہیں(۱)۔"

اور واقعہ یہی ہے کہ جدل و مناظرہ اور تخاصم و تصادم آپ کے طبع و مزاج کے سر تا سر خلاف تھا، پڑھنا پڑھانا آپ کا شیوہ، بحث و تحقیق اور تصنیف و تالیف آپ کا مشغلہ اور درس و مطالعہ طبیعت ثانیہ تھا، کتاب ہو اور گوشۂ عافیت اس سے زیادہ پسندیدہ کوئی چیز نہیں تھی، ع

فراغتے و کتابے و گوشۂ چمنے

لیکن بات وہی ہے کہ جب مسلک اہلسنت، دیوبندیت یا حنفیت پہ زد آتی اور حق و صداقت کے خلاف غل مچایا جاتا، اس وقت آپ اپنی طبیعت کے خلاف مجبور ہو کر قلم اٹھاتے اور ع

چل مرے خامے بسم اللہ

پڑھ کر اپنے فرض منصبی کی انجام دہی میں مصروف ہو جاتے۔ مسلک اہلسنت کے اثبات میں دلائل و براہین کے انبار لگا دیتے اور مخالفین کے الزامات و اعتراضات کے تار و پود بکھیر کر رکھ دیتے۔ اس وقت آپ کے قلم کی تیزی تلوار کی کاٹ کے مشابہ ہوتی، یہ سب باتیں میں کسی حسن عقیدت یا حسن ظن کی بنیاد پر نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ ان کی تصانیف میری بات کے لئے شاہد عدل ہیں۔ آپ کی دینی حمیت کو جاننے کے لئے مثال کے طور پر ۱۱ر محرم ۵۸ھ کو حضرت تھانویؒ قدس سرہ کی خدمت میں لکھے گئے ایک مکتوب کا یہ اقتباس پڑھئے:

"آج کل ایک شیعی رسالہ (رجال بخاری) کے رد میں منہمک ہوں، حضرات صحابہ کی شان میں سخت گستاخی کی گئی ہے، دیکھ کر خون کھولنے لگتا ہے، اس

(۱) ترجمان الاسلام ۱۱۔۱۲ ص ۱۶۱

کے رد میں اتنا انہاک ہے کہ بجز درس و فرائض شرعی و ضروریات کے اور کوئی کام نہیں ہوتا، سارا وقت اسی میں صرف ہوتا ہے"

مذکورہ بالا اقتباس سے آپ کی حمیت دینی کے علاوہ حضرات صحابہ کرامؓ سے آپ کی بے پناہ محبت و عقیدت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

ادری کا مناظرہ ہویا مہوا بسم اللہ کا جلسۂ عام اور ان کے علاوہ بے شمار مناظرانہ جلسے، ان سب میں شرکت کے پیچھے حق کے دفاع کی وہی روح کار فرما ہوا کرتی تھی، اور یہی دینی جوش تھا کہ اپنے جیتے جی جب تک طاقت و قوت رہی اپنے قصبہ مئو میں باطل فرقوں اور ان کے بڑے بڑے جغادریوں کا قدم نہیں جمنے دیا، بلکہ بہت سے مخالفین مئو کا نام سن کر گھبرا اٹھتے تھے۔

یہ دینی حمیت ہی کا ثمرہ تھا کہ آپ کے کلک گہربار سے اردو زبان میں بیسیوں بیش قیمت کتابیں وجود میں آئیں، جو سب کی سب اپنے موضوع و مواد کے لحاظ سے حرف آخر خیال کی جاتی ہیں، رد غیر مقلدیت میں رکعات تراویح اور اعلام مرفوعہ، رد بریلویت میں شارع حقیقی اور رد روافض میں متعدد بیش بہا رسائل آپ کے اسی دینی اور مذہبی جوش و غیرت کی یادگار نشانیاں ہیں۔

ہندوستان میں جہاں بہت سارے فتنے پیدا ہوئے انھیں میں ایک فتنہ منکرین حدیث کا نوخیز فرقہ بھی تھا، صرف ہندوستان ہی نہیں مختلف شکلوں اور صورتوں میں انکار حدیث کا یہ فتنہ عالم عرب بالخصوص مصر میں بھی اٹھا، اردو زبان میں آپ کے قلم کے شاہکار "نصرۃ الحدیث" کے سوا آپ کی حدیثی تحقیقات کے پیچھے حجیت حدیث کے اثبات کا جذبہ بھی کار فرما تھا، اور یہی وجہ ہے کہ علامہ اعظمی نے تحقیق و تعلیق کے لئے جن مخطوطات کا انتخاب فرمایا، ان میں سے بیشتر مجموعے صحاح ستہ کے پہلے کے ہیں۔ کیونکہ منکرین کی طرف سے صحاح ستہ کے جامعین پر یہ تہمت لگائی جاتی ہے کہ ان لوگوں نے حدیثیں اپنی طرف سے وضع کرلی ہیں، لہذا احادیث کے ان مجموعوں کے سامنے آنے کے

بعد منکرین حدیث کا سب سے پہلا اعتراض ہی کافور ہو جاتا ہے، اور ان کی بنائی ہوئی عمارت کی حیثیت تار عنکبوت سے زیادہ نہیں رہ جاتی۔ بہر حال آپ کی تصنیفات تو ہماری دوسری جلد کا موضوع بحث ہوں گی، اور وہاں ان تمام موضوعات پر انشاء اللہ تفصیل سے گفتگو کی جاسکے گی۔

دینی حمیت کی عجیب و غریب مثال | گذشتہ دو صدیوں میں یورپ میں جو علمی بیداری آئی، اور اس کے نتیجہ میں تلاش و جستجو اور بحث و تحقیق کی جو طوفان خیز لہر اٹھی، تو ایک معتد بہ تعداد ان مستشرقین کی پیدا ہوئی جنھوں نے اسلامی علوم و فنون کو اپنا مجال اختصاص اور موضوع بحث بنایا۔ اس سے انکار کی گنجائش نہیں کہ حدیث و تاریخ اور سیرت کے بہت سارے قدیم مخطوطات انھیں اہل علم مستشرقین کی توجہ اور کوشش و کاوش کی بدولت زیور طباعت سے آراستہ ہو کر بازار علم و ادب کی زینت بنے، اور اس نسبت سے مسلمانوں کو ان کی خدمات کا بہر حال شکر گذار ہونا چاہیے۔

لیکن چند افراد کے استثناء کے ساتھ اسلامی علوم و فنون کے اندر اہل یورپ کی بڑھی ہوئی دلچسپی کے پس پردہ، خدمت علم کے علاوہ ایک مخصوص ذہنیت کارفرما رہا کرتی تھی، اور وہ یہ کہ اسلامی تاریخ کے صاف ستھرے اور بے داغ دامن کو داغدار کرنے کے لئے کبھی کبھی بڑی خطرناک قسم کی دسیسہ کاری اور زہر آمیزی سے کام لیا کرتے تھے۔ یوروپین محققین کے تحقیقی کارناموں میں ایک اہم کارنامہ "الطبقات الکبریٰ" کی تحقیق و اشاعت ہے، اس کی تحقیق مشہور جرمن مستشرق پروفیسر سخاؤ نے کی ہے اور ۸/ ضخیم جلدوں میں شائع ہوئی ہے، اس کتاب کے مصنف محمد بن سعد متوفی ۲۳۱ھ ہیں، چونکہ یہ کتاب اسلامی تاریخ کے قدیم مآخذ میں سے ہے اس لئے اس کو اسلامی تاریخ کے مآخذ میں خاص مقام اور اہم حیثیت حاصل ہے۔

اس کتاب کی اشاعت بلا شبہہ مستشرقین کا ایک اہم کام تھا، لیکن ان کے معہود طرز عمل کی وجہ سے ان کے اس تحقیقی عمل کی طرف سے شک و شبہہ اور بدگمانی کا

پیدا ہوناکہ

ساقی نے کچھ ملانہ دیاہو شراب میں

ایک بجابات تھی ۔ چنانچہ یہ بد گمانی مولانا عبدالرؤف صاحب داناپوری مصنفِ "اصح السیر" کے دل میں پیدا ہوئی اور انھوں نے اس کے متعلق مذکورہ کتاب کے مقدمہ میں مستشرقین کی انھیں دسیسہ کاریوں کی وجہ سے طبقات ابن سعد کے درجۂ استناد پر شک وشبہہ کا اظہار کیا، کہ موجودہ پوزیشن میں اس کی غیر متداول روایتوں پر اعتماد کیا جا سکتا ہے یا نہیں۔

مستشرقین کی خبث باطنی اور بد طینتی، اسلام اور تعلیمات اسلام کو زک پہنچانے کی نازیبا حرکتوں اور ہمہ وقتی سرگرمیوں کی وجہ سے اس شبہے نے علامہ اعظمی کے دل میں بھی سر ابھارا، مگر علامہ اعظمی نے دفع شبہات کے لئے کون سا عمل اپنایا؟ واقعہ یہ ہے کہ علامہ اعظمی کا یہ عمل ہندوستان کی علمی تاریخ کا روشن اور تابناک باب ہے جو آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہے اور حمیت دینی کی زندہ اور شاندار مثال ہے ، دنیائے علم وفن کے نامور اور راستباز مصنف مولانا سعید احمد اکبر آبادی مرحوم لکھتے ہیں:

"مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی جو اس زمانہ کے نامور محقق اور محدث ہیں میں نے ایک خط کے ذریعہ ان سے اس بارے میں استصواب کیا تو مولانا نے تحریر فرمایا:

"پروفیسر سخاؤ پر یہ شبہہ اور بد گمانی بالکل بے جا ہے، میں نے خود طبقات کے مطبوعہ نسخہ کا مقابلہ اس کے اصل مخطوطہ کے ساتھ حرفاً حرفاً کیا ہے اور کہیں میں نے دونوں میں عدم مطابقت نہیں پائی۔"(۱)

قوت حافظہ | مولانا افضال الحق صاحب جوہر قاسمی تحریر فرماتے ہیں:

"حضرت مولانا کو قدرت کے دست فیاض نے حافظہ غضب کا دیا تھا، اور اس

(۱) عثمان ذوالنورین ص ۲۴

قوت سے انھوں نے اپنے اندر فقہ، ادب عربی اور حدیث کے خزانے جمع کر لئے تھے“

واقعہ یہ ہے کہ آپ کی قوت حفظ علامہ انور شاہ کشمیریؒ اور حافظ ابن حجرؒ کے مثل تھی، ایک بار کوئی چیز پڑھ لی، یا دیکھ یا سن لی تو برسوں تک وہ بات بعینہٖ دماغ میں محفوظ رہتی تھی، آپ کے غیر معمولی قوت حافظہ کے عجیب وغریب واقعات ہیں جنھیں سن کر عقل دنگ رہ جاتی ہے، چند واقعات آپ بھی ملاحظہ فرمالیں، مفتی ظفیر الدین صاحب لکھتے ہیں:

”دیوان حماسہ کا سبق پڑھاتے ہوئے ایک دن فرمایا کہ تم لوگوں میں ادبی شوق وذوق نہیں ہے، اپنا حال سناتے ہوئے فرمایا کہ مجھے خیال ہوا کہ دیکھوں مجھے کتنے عربی اشعار یاد ہیں، تو اپنی یادداشت سے صرف ردیف الف کے پانچ سو اشعار لکھ گیا، پھر خیال آیا کہ کبر کہیں پیدا نہ ہو جائے یادداشت سے لکھنا بند کر دیا، پھر یہ بھی فرمایا کہ اب پہلا جیسا حافظہ نہیں رہا، میری طالب العلمی میں میرے حافظہ کی شہرت ہوئی، ایک شاعر صاحب نے کہا جو مئو ہی کے تھے، کہ میں کسی دن امتحان لوں گا پھر مانوں گا۔

مئو میں مشاعرہ ہوا ہی کرتا تھا، ایک مشاعرہ ہوا تو وہ صاحب اپنے نئے اشعار کہہ کر لے گئے اور دوسرے شعراء کے ساتھ انھوں نے اپنے بھی اشعار سنائے، میرا نام لے کر پکارا کہ حبیب الرحمٰن کے حافظہ کی بہت شہرت ہے وہ اسٹیج پر آجائے اور میں نے جو اشعار ابھی پڑھے ہیں یہاں آکر سنائے، مولانا فرمانے لگے میں مجمع سے نکل کر گیا، فرمایا کہ تم نے میرے اشعار سنے ہیں سناؤ، میں نے کھڑے ہو کر ان کی پوری غزل حرف بحرف پڑھ کر سنادی، فرمانے لگے !اچھا بھائی! آج سے میں تمہارے حافظہ کی گواہی دوں گا، اللہ تعالیٰ نے بڑی دولت سے تم کو نوازا ہے۔“(۱)

مولانا افضال الحق صاحب لکھتے ہیں:

”جن لوگوں نے مفتاح العلوم مئو کی مدرسی کا دور دیکھا ہے مثلاً مولانا صفی اللہ صاحب دیوریاوی جیسے حضرات وہ کہتے تھے کہ کبھی کبھی حضرت مولانا عبدالشکور صاحب لکھنوی کے بھائی مولانا عبدالرحیم صاحب فاروقی مفتاح العلوم آجاتے

---

(۱) ترجمان الاسلام ۱۱۔۱۲ ص ۱۳۹

تو مولانا اور وہ فاروقی صاحب اگر عشاء بعد بیت بازی شروع کر دیتے تو عربی فارسی شعروں میں سخت مقابلہ ہوتا اور صبح کی اذان تک کوئی کسی سے پیچھے نہیں رہتا تھا، کیونکہ قوت حافظہ دونوں حضرات کی عجیب وغریب تھی۔"(۱)

یادداشت کا یہ حال صرف اشعار وابیات تک نہیں تھا، بلکہ احادیث ونصوص بھی آپ کے حافظے میں اسی طرح محفوظ رہتی تھیں، بلکہ ان کا معاملہ اشعار سے بھی بڑھ کر تا تھا، مولانا افضال صاحب ہی ارقام فرماتے ہیں:

"مہوا بسم اللہ ضلع گونڈہ کا ایک دور افتادہ گاؤں تھا، شہری آبادی سے کوسوں دور، مگر مسلمانوں کا علاقہ، وہاں ایک نوخیز عالم مولوی حفیظ اللہ صاحب نے ایک باغ میں جلسہ کرنا چاہا، مگر وہاں کے زمیندار نے روک دیا، کیونکہ جلسہ کرنے والے حنفی تھے اور باغ کا مالک غیر مقلد تھا، اس وقت مولوی حفیظ اللہ صاحب مظاہر علوم سہارنپور میں دورے کے طالب علم تھے، انھوں نے جگہ بدل کر دھرم پور کے باغ میں جلسہ کیا اور اس کے لئے مولانا عبدالشکور صاحب فاروقی جیسی برگزیدہ ہستیوں کے یہاں سفر کر کے انھیں تیار کیا اور غیر مقلدین کی وجہ سے مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اور مولانا عبداللطیف صاحب کو بلا کر لے گئے۔"(۲)

وہاں پہنچنے کے بعد اسٹیج پر علامہ اعظمی کے جس کمال کا ظہور ہوا، اس سے سامعین وقارئین کے حیرت واستعجاب کی انتہا نہ رہی، آپ کی تقریر کا موضوع تھا "قرأۃ خلف الامام"، اس ایک موضوع پر ان کی جولانی طبع اور قوت حافظہ کا حال مولانا افضال صاحب کی ہی زبانی سنئے:

"حضرت مولانا نے حدیث پڑھ کر اور اس کی سند اور متن پر بحث کر کے جب تقریر شروع کی ہے تو غیر مقلدین یہ دیکھ کر دم بخود تھے کہ ایک حنفی عالم

---

(۱) ترجمان الاسلام ۱۱۔۱۲ ص ۱۷۲

(۲) ایضاص ۱۷۰

زبانی حدیث پڑھتا ہے اور اس پر حوالے کیساتھ بحث کرتا چلا جاتا ہے، ہم تو صرف یہ جانتے تھے کہ حنفی عالم صرف ابو حنیفہ کی فقہ پڑھتے ہیں، حدیث پڑھتے ہی نہیں، مگر آج دیکھا کہ ایک عالم ہے، حنفی ہے، جوان ہے اور اسے ایک موضوع پر سینکڑوں حدیثیں مستحضر ہیں جن کو بلا کسی کتاب اور کاپی کے زبانی پڑھتا چلا جاتا ہے۔" (۱)

عیاں راچہ بیاں! یہ واقعات تو طفولیت، شباب اور کہولت کے زمانوں کے ہیں فقیر نے تو خداداد یادداشت کا کرشمہ اس وقت مشاہدہ کیا ہے جب عمر مبارک چوراسی پچاسی برس اور اس سے زائد ہو چکی تھی۔ ۸۵۔۱۹۸۴ء میں ناچیز کی جماعت نے آپ سے دیوان متنبی اور دیوان حماسہ پڑھا، حماسہ پڑھاتے وقت آپ کی طبیعت میں بڑا انشراح رہا کرتا تھا، بظاہر ایسا معلوم ہوتا کہ اس کے درس میں آپ کو بھی بڑا لطف آتا ہے۔ ایک روز کسی بات پر فرمانے لگے کہ چالیس سال بعد پڑھا رہا ہوں، اور اس چالیس سال کے بعد پڑھانے پر بھی یہ کیفیت تھی کہ آپ ضعف و نقاہت کے سبب لیٹے رہتے اور ہم ساتھی دونوں پہلوؤں کی طرف بیٹھے پڑھ رہے ہوتے، نہ کبھی آپ کو کتاب دیکھنے کی نوبت آئی نہ قاموس و معجم کی، جاننے والے حضرات اندازہ لگا سکتے ہیں کہ دیوان حماسہ جیسی کتاب، جس میں غریب اور نامانوس الفاظ کی بھرمار ہے، چالیس سال کے بعد پڑھانا اور وہ بھی اس طرح کہ لغت تو درکنار کبھی حماسہ کی کتاب بھی ہاتھ میں لینے کی نوبت نہ آئے، کیا کسی کرشمہ سے کم ہے؟ الفاظ و معانی اور حوادث و واقعات ذہن کے نہاں خانے میں اس طرح محفوظ تھے جیسے کمپیوٹر میں کوئی چیز فیڈ (Feed) کر دی جائے، الفاظ و معانی کا ایک موجزن دریا تھا جو پوری روانی کے ساتھ بہتا ہوا چلا جاتا تھا۔

عمر کے اس آخری حصے میں ہم ناقدروں کو مقامات حریری کے کچھ حصے سے لیکر دیوان متنبی، دیوان حماسہ، بیضاوی شریف، قطبی تصدیقات، طحاوی، مقدمہ مسلم، ترمذی اور بخاری شریف تک پڑھنے کی سعادت حاصل ہوئی، زیادہ تر ایسا ہی ہوا کہ لیٹے رہے، یا بیٹھے بھی رہے تو کتاب کبھی سامنے نہ رہی، صرف یادداشت کے سہارے لاینحل عقدوں کو

(۱) ترجمان الاسلام ۱۱۔۱۲ ص ۱۷۱

حل کرتے چلے جاتے، اور کیا مجال ہے کہ ایک واو یا فا کا مطلب بیان کرنے سے رہ جائے۔ اور اسی پر بس نہیں حماسہ وغیرہ کے اشعار زبانی اس طرح یاد تھے کہ ایک مصرعہ ہم پڑھتے تو شعر کی تکمیل دوسرا مصرعہ پڑھ کر حضرت الاستاذ خود فرمادیتے، اس سے ان کی طبیعت کی روانی اور انشراح کا پتہ چلتا۔

آخر عمر میں جب آپ مصنف ابن ابی شیبہ ایڈٹ کررہے تھے، تو دورۂ حدیث اور اس کے بعد کے ایک سال میں حوالے وغیرہ کی کتابیں ادھر سے ادھر کرنے کی تھوڑی بہت سعادت فقیر کے حصے میں بھی آئی والحمد للہ علی ذلک، اس وقت قوت حافظہ کے عجیب وغریب مظاہر دیکھنے میں آتے، ایک حدیث آتی اس کے لئے ارشاد ہوتا کہ فلاں کتاب کا فلاں باب دیکھو، دوسری آتی اس کے لئے حکم ہوتا فلاں کتاب دیکھو، اور شاذ ونادر ہی ایسا ہوتا کہ اس کتاب میں نہ ملے۔ واقعہ یہ ہے کہ قدرت نے بلا کا حافظہ عطا فرمایا تھا۔

بداہت واستحضار: علامہ اعظمی کی نمایاں خصوصیات میں بداہت واستحضار بھی ایک اہم خصوصیت تھی، صرف اسی ایک وصف کو لیکر کوئی اگر لکھنا چاہے تو مستقل کتاب تصنیف کرسکتا ہے، اللہ جل شانہ کی طرف سے آپ کو عطا کردہ ایک عجیب وغریب نعمت تھی کہ بچپن کی پڑھی ہوئی چیزیں تو ایک طرف کہ وہ تو نقش کالحجر ہوتی ہیں، بعد میں بھی جو کوئی چیز آپ کی نظر سے گذری وہ ہر وقت اور ہر جگہ مستحضر رہتی تھی، یہ بات بالکل مشاہد ومحسوس تھی کہ آپ کی جناب میں نہ صرف ہندوستان اور عالم اسلام بلکہ یورپ وامریکہ اور افریقہ وغیرہ ملکوں سے مسلم علماء اور عربی داں طبقے کی طرف سے علمی اشکالات ومسائل پر مشتمل خطوط آتے، جو اکثر وبیشتر مہینوں کی محنت اور ورق گردانی کے بعد بھی ان کے لئے پیچیدہ اور ناقابل حل رہتے، لیکن آپ انھیں مسائل کو کتابوں سے مراجعت کئے بغیر چند لمحوں اور جملوں میں اس طرح حل کرتے کہ وہ بے غبار ہوجاتے، اس نوعیت کی دوچار اور دس بیس نہیں سیکڑوں مثالیں اور واقعات ہیں، جو مستقل تصنیف کا موضوع ہیں، نمونہ کے طور پر میں یہاں صرف چند واقعات ذکر کروں گا۔

مولانا خورشید انور صاحب (استاذ مدرسہ تعلیم الدین مئو) راوی ہیں کہ جامع مسجد شاہی کے سابق امام مولانا حکیم منیر الدین صاحبؒ ایک بار فرمانے لگے کہ میں دورۂ حدیث کے سال میں تھے، اور علامہ اعظمی بخاری شریف پڑھا رہے تھے، ایک دفعہ سید سلیمان ندویؒ اعظم گڈھ سے تشریف لائے اور سیدھے علامہ اعظمی کی درسگاہ میں پہنچے، اور کسی حدیث کی نسبت دریافت فرمایا کہ میں کئی دنوں سے اس کو تلاش کر رہا ہوں لیکن مل نہیں رہی ہے، آپ بتایئے کہاں ملے گی؟ راوی کا بیان ہے کہ حضرت مولانا (علامہ اعظمی) کے سامنے بخاری شریف کھلی ہوئی رکھی تھی، آپ نے کتاب بند کیا اور اسے جب دوبارہ کھولا تو کھلے ہوئے صفحہ پر سید صاحب کی مطلوبہ حدیث موجود تھی۔

علی گڈھ کے میرے زمانۂ طالب علمی میں استاذ محترم و مکرم ڈاکٹر محمد ظہور الحق صاحب کے بھائی، اردو زبان کے نامور اور معروف محقق و مصنف شعبۂ اردو گورکھپور یونیورسٹی کے سابق صدر اور اردو اکیڈمی لکھنؤ کے سابق چیرمین پروفیسر محمود الٰہی صاحب ایک دفعہ شعبۂ اردو کے کسی انٹرویو کے لئے تشریف لائے، ڈاکٹر ظہور الحق صاحب نے موصوف سے ملاقات کی غرض سے شام کے وقت فقیر کو دولت خانے پر طلب فرمایا، ناچیز حسب ارشاد وقت مقرر پر حاضر ہوا، پروفیسر محمود صاحب سے تعارف اور ملاقات کی سعادت حاصل ہوئی، بہت خلیق، متواضع، خورد نواز اور سادگی پسند انسان معلوم ہوئے، اثناء گفتگو علامہ اعظمی کی بات نکل آئی، بلکہ اس وقت گفتگو کا مرکز و محور انھیں کی ذات و صفات اور خدمات تھیں، باتوں باتوں میں پروفیسر صاحب نے اپنے اوپر بیتے ہوئے ایک واقعہ کا ذکر کیا، انھوں نے فرمایا کہ اپنی کسی کتاب کی تصنیف کے دوران انھیں کسی مخصوص شخصیت کے تذکرے کی ضرورت تھی، ان ہی کا بیان ہے کہ اس کے لئے انھوں نے مہینوں علی گڈھ اور ندوہ وغیرہ کے کتب خانوں کی خاک چھانی، اور سیر و سوانح تذکرہ و تراجم کی بے شمار کتابیں الٹ پلٹ ڈالیں، مگر اس تمام کوشش و کاوش اور تلاش و جستجو کے بعد بھی مراد بر نہیں آئی اور جس چیز کی انھیں تلاش تھی اس کا کوئی سراغ ملا نہ منزل کا نشان، بالآخر انھوں نے علامہ اعظمی سے رجوع کیا، آپ کے پاس گویا الہ دین کا

چراغ تھا ایک لمحے اور جملے میں ان کی ساری مشکل اور الجھن کا خاتمہ ہو گیا۔

میں نے جب اس کتاب کی ترتیب و تسوید کا کام شروع کیا، تو اس واقعہ کی تفصیل کے لئے ایک خط لکھ کر پروفیسر صاحب سے دریافت کیا، تاکہ ایک بات جو زبانی سنی تھی تحریری شکل میں قارئین کے سامنے پیش کر دی جائے، انھوں نے میرے خط کا جو جواب مرحمت فرمایا وہ بعینہ ناظرین کے ملاحظہ کے لئے حاضر خدمت ہے، خط کی عبارت منجملہ دیگر باتوں کے یہ ہے:

"آپ نے علامہ مرحوم کے جس علمی واقعہ کی یاد دلائی ہے، وہ یہ ہے کہ مجھے اردو میں ترجمۂ قرآن کی ایک جلد ملی تھی، میں اسے شمالی ہند میں اردو نثر کا نقطۂ آغاز سمجھتا تھا۔ اس کے مصنف یعنی مترجم کے حالات کہیں سے معلوم نہیں ہوئے۔ میں چاہتا تھا کہ اس پر طویل مضمون لکھوں لیکن جب مترجم کے بارے میں کچھ معلوم نہ ہو تو قلم اٹھانا کچھ مستحسن نہیں تھا۔

ایک دن ڈاکٹر منور انجم مئو سے آئے تو میں نے ان سے کہا کہ آپ محدث جلیلؒ سے میرا سلام کہیے اور بعض نکات پر ان سے گفتگو کیجئے۔ میں نے تاکید کی تھی کہ ان کا جواب نوٹ کر لیجئے۔ وہ ملے اور میرا سوال نامہ ان کے سامنے رکھا تو فوراً جواب دیا کہ سلسلۂ مظہر جان جاناں کے اہل علم کا مطالعہ کروں تو اس مصنف کا حال معلوم ہو جائے گا۔

حوالے کی کتابیں میرے پاس تھیں، میں نے منور صاحب کے تحریری جواب کی روشنی میں سلسلۂ مظہر جان جاناں کو کھنگالا تو منزل مقصود سامنے تھی، اس سے محدث جلیل کے تبحر علم اور علم الرجال میں ان کے غیر معمولی مطالعے کی کیفیت عیاں ہوتی ہے۔"

اللہ اکبر! جس مشکل کے حل کے لئے مہینوں کی محنت بار آور نہیں ہوئی، اور نہ جانے علم و ادب کے کتنے دفتر کھنگالے گئے مگر ہنوز روز اول ہی رہا، مگر وہی مشکل جب

اپنے وقت کے سب سے بڑے بوریہ نشیں کی بارگاہ میں پہنچتی ہے تو کس آسانی سے صرف ایک فقرہ میں اس کی عقدہ کشائی ہو جاتی ہے، اس کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ ع

اب انھیں ڈھونڈھ چراغ رخ زیبا لے کر

یہ چند واقعات میں نے بطور مثال ذکر کر دیئے ہیں، جب کہ آپ کی ذات کے ساتھ اس قسم کے دو چار نہیں صدہا واقعات وابستہ ہیں جن کا اگر احاطہ کیا جائے تو ایک خاصا ضخیم دفتر تیار ہو سکتا ہے۔

ذہانت و فطانت فاطر کائنات نے آپ کو جن بے حساب نعمتوں سے نوازا تھا انھیں میں ذہانت و فطانت اور ذکاوت بھی تھی، بہت سے دوسرے اوصاف کی طرح اس وصف میں بھی اپنے معاصرین واقران میں ممتاز خیال کئے جاتے تھے، اس خوبی کی شہادت ہمعصروں کو تو چھوڑ دیجئے ان کے اساتذہ نے بھی دی ہے، اور تعریف کی ہے، ذہین سے ذہین افراد جس بات تک پہنچنے سے قاصر رہتے، آپ اپنی ذہانت کی بدولت نہایت آسانی سے اس کی تہ تک پہنچ جاتے، مولانا حبیب الرحمٰن صاحب معروفی (استاذ مدرسہ مرقاۃ العلوم) مولانا ہدایت اللہ صاحب معروفی کی روایت سے نقل کیا کرتے ہیں کہ مفتاح العلوم کے زمانۂ قیام میں امام اہلسنت مولانا عبدالشکور فاروقیؒ کے برادر خورد مولانا عبدالرحیم فاروقیؒ کی بہت آمد و رفت رہا کرتی تھی، اس وقت دونوں بزرگوں کی مجلسیں جمتیں اور علمی مباحثے ہوتے، مولانا عبدالرحیم صاحب خود بھی بہت ذہین و فطین تھے اور منطق و فلسفہ میں کامل و ماہر سمجھے جاتے تھے، وہ جب آتے تو طلبہ سے بھی سوالات کرتے رہتے اور ان سے چھیڑ چھاڑ کرتے، ایک دفعہ علامہ اعظمی نے (از راہ تلطف) کہا کہ کیا آپ لڑکوں کو پریشان کر رہے ہیں؟ مجھ سے بات کیجئے! مولانا عبدالرحیم صاحب نے کہا کہ اچھی بات ہے، وہ گئے اور (غالباً) قاضی حمد اللہ لے آئے، اور اس کا سب سے مشکل مقام نکال کر علامہ اعظمی کے سامنے بڑھا اور کہا کہ ذرا اس کی وضاحت فرما دیجئے! آپ نے جب اس کی تقریر فرمائی، تو مولانا فاروقی نے قسم کھا کر کہا کہ اس مقام کی اس سے بہتر (یا ایسی) تقریر کسی نے نہیں کی، اس کے بعد علامہ اعظمی کا جواب سنئے، انھوں نے بھی قسم کھا کر کہا کہ آج تک میں نے

'اس مقام کو دیکھا بھی نہیں!

آپ کی ذہانت وذکاوت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے جو حضرت مدنیؒ کی وفات پر آپ نے تاریخ وفات نکالی ہے، کسی بات کی طرف ذہن کس تیزی سے منعطف ہوتا تھا، اس کی دلیل کے لئے خود آپ کی زبان سے سنئے فرماتے ہیں:

"آج فجر کی نماز کے بعد تلاوت کر رہا تھا جب "فاما الذین آمنوا وعملوا الصلحت فهم فی روضة یحبرون" پر پہونچا تو یک بیک دل میں آیا کہ شاید "فی روضة یحبرون" سے سال وفات کے اعداد بر آمد ہوں، اس خیال کے آتے ہی رکا اور رک کر حروف کے اعداد پر غور کیا تو ٹھیک ۱۳۷۷ھ بر آمد ہوئے۔ فالحمد لله علی ذلك."(۱)

دقت نظر آپ کے اوصاف ومحاسن اور فضائل وکمالات اس کثرت ووسعت سے ہیں کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا لکھا جائے اور کیا چھوڑا جائے، بیشمار خوبیاں ذہن میں آتی ہیں اور ع کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجا ست، کا منظر پیش کرتی ہیں، اس وقت جذبات میں تلاطم اور ذہن میں طوفان سا برپا ہے، لیکن قرطاس وقلم کی تنگ دامانی دل ودماغ کا ساتھ دینے سے قاصر ہے، اسی کے ساتھ ڈر اس بات کا بھی ہے کہ کہیں مبالغہ آرائی اور رنگ آمیزی کی تہمت نہ عائد کر دی جائے۔ اس وجہ سے بہت ساری باتیں عمداً بھی نظر انداز کرنی پڑتی ہیں۔ آپ کی خوبیوں کے متعلق یہی کہا جا سکتا ہے کہ:

لیس علی الله بمستنکر   أن یجمع العالم فی واحد

بہت سارے کمالات جو آپ کے معاصرین میں انفرادی طور پر نظر آتے ہیں وہ ان تمام میں ان سے فائق نظر آتے ہیں، آپ کے صرف ایک وصف دقتِ نظر کو لے لیجئے۔ اس وصف خاص میں نہ صرف اپنے ہمعصروں پر فوقیت رکھتے ہیں، بلکہ گذشتہ کئی صدیوں تک آپ چلے جائیے آپ کی عقابی شان کی نظیر بہت کم نظر آئے گی۔ اور یہ بھی خیال نہ کیا

(۱) الجمعیۃ شیخ الاسلام نمبر ص ۴۵

جانا چاہئے کہ یہ وصف حدیث اور علم حدیث کے ساتھ خاص تھا، بلکہ دیگر بہت سے فنون مثلاً فقہ و تاریخ وادب کے اندر بھی نظر کی وہی بلندی اور دقت دیکھنے کو ملے گی، جو حدیث کے اندر ہو گی، یہ بات اگر بالتفصیل ذکر کی جائے تو قصہ بہت طولانی ہو جائے گا اس لئے میں اس وقت اپنے دعوی کی دلیل دینے سے قصداً گریز کرتا ہوں، دلائل اگر دیکھنے ہوں تو مجلہ "المآثر" میں آپ کے فتاوی کے علاوہ ناچیز کی ترتیب سے شائع ہونیوالا سلسلہ وار مضمون "استدراکات محدث کبیر" ملاحظہ فرمائیں، اس میں مثالیں بکثرت مل جائیں گی۔

قوت استدلال خدائے ذوالجلال نے آپ کے اندر استدلال کا بلا کا ملکہ ودیعت فرمایا تھا، یہ قوت وصلاحیت آپ کے اندر حیرت انگیز حد تک تھی، پیچیدہ سے پیچیدہ مسائل اور مشکل سے مشکل امور میں جب کہ بڑے بڑے اہل علم و فضل اور باکمال داناؤں کے ذہن میں کوئی دلیل نہ آتی اس وقت قرآن و سنت اور فقہ و تاریخ سے ایسے ایسے دلائل چن کر لاتے کہ عقل حیران رہ جاتی۔ آپ کی استدلالی شان دیکھنی ہو تو دستبرد زمانہ سے محفوظ رہ گئے فتاوی، نیز آپ کے مقالات و مضامین اور تصنیفات کا مطالعہ کیا جائے، ناظرین کو میرے دعوی کی صداقت کا خود بخود یقین ہو جائے گا۔ اس وقت مثال کے لئے صرف ایک واقعہ کا ذکر کروں گا۔ مولانا اسیر ادروی رقم طراز ہیں:

> "ایک بار لکھنؤ میں ایک موقر ادارہ کی طرف سے ہندوستان کے مشاہیر صاحب درس وافتاء علماء کا اجتماع کیا گیا اور اس اجتماع میں ان لوگوں کو خاص طور سے مدعو کیا گیا جن کو فقہ سے دلچسپی تھی اور افتاء کا کام کرتے تھے، اس اجتماع نے کئی نشستوں میں بیمہ، انشورنس وغیرہ کے جواز کا فیصلہ کیا اور ان تمام دلائل کو جمع کر کے ایک تفصیلی فتوی مرتب کیا گیا اور اس فتوی پر اجتماع میں موجود تمام علماء کا اتفاق ہو گیا، مگر اس کی عام اشاعت سے پہلے ضرورت محسوس کی گئی کہ اگر مولانا اعظمی کی تائید و تصویب حاصل ہو جائے تو اس کو رسالوں اور

اخباروں میں اشاعت کیلئے دیدیا جائے، اجتماع نے ایک ذہین و فطین عالم کے ذریعہ یہ تحریر مولانا اعظمی کی خدمت میں بھیجی، مولانا نے یہ تحریر دیکھی، اس میں کئی باتیں آپ نے ایسی پائیں جن سے آپ اتفاق نہیں کر سکتے تھے، اس لئے آپ نے اس فتوی پر آٹھ صفحات میں اپنی رائے لکھی جو اس متفقہ فتوی کے خلاف تھی، علماء کے اس اجتماعی فتوی کے خلاف جو دلائل مولانا اعظمی نے تحریر فرمائے تھے اس کو پھر علماء کی مجلس میں پیش کیا گیا تاکہ ان پر غور کر کے اپنے سابقہ فتوی کو برقرار رکھا جائے یا اس کو رد کر دیا جائے، علماء کی اس مجلس نے متفقہ طور پر یہ کہا کہ مولانا اعظمی نے جن دلائل کی روشنی میں اس کے عدم جواز کا فیصلہ فرمایا ہے وہی صحیح ہے اس کو رد نہیں کیا جا سکتا اور فیصلہ کیا گیا کہ یہ فتوی واپس لے لیا جائے۔"

یہ تو ایک مثال ہے ورنہ اس قسم کے نہ جانے کتنے واقعات سے آپ کی حیات کے صفحات بھرے پڑے ہیں۔ قارئین محض اس ایک واقعے کو پڑھیں اور دل پر ہاتھ رکھ کر انصاف کے ساتھ فیصلہ کریں کہ کیا اس دور میں آپ کا کوئی ثانی پیش کیا جا سکتا ہے؟ اور کیا اس بات میں ان کو مبالغہ کا شائبہ نظر آرہا ہے کہ ع

ایسا کہاں سے لائیں کہ ان سا کہیں جسے

وسعت مطالعہ اور تبحر علمی مولانا محمد یحیی صاحب ندوی سانہہ (مونگیر بہار) ایک وسیع المطالعہ بذلہ سنج اور وارفتہ مزاج آدمی ہیں، علامہ اعظمیؒ کے حد درجہ معترف، مداح اور عقیدت مند، اور غایت درجہ مزاج شناس۔ علامہ اعظمی کے فضل و کمال کی نسبت وہ فرمایا کرتے تھے، کہ اگر کوئی "مفخرۃ الھند" کہلانے کا مستحق ہے تو وہ حضرت مولانا (علامہ اعظمی) ہیں۔ اسی طرح آپ کے وفور علم کے متعلق ان کا یہ خیال ہے اور بارہا اس کا اظہار کیا ہے کہ "آپ کے علم کا صرف دس فیصد حصہ ظاہر ہوا ہے، نوے فیصد سینے ہی میں محفوظ لے کر دنیا سے رخصت ہو گئے۔"

مولانا یحیی صاحب بلا کے طباع بھی ہیں، ان کی ان ہی خصوصیات، وارفتگی طباعی اور وسعت مطالعہ کی وجہ سے علامہ اعظمی بھی ان سے بہت مانوس تھے، آپ کی حیات میں

وہ جب کبھی مئو آتے تو ہفتوں اور مہینوں رہ جاتے، اور ان کے قیام کے دوران فرصت کے لمحات میں علامہ اعظمیؒ بھی خوش وقت رہا کرتے۔ مولانا محمد یحیی صاحب مسائل پوچھتے، سوالات کرتے اور اشکالات کا حل چاہتے تو آپ خوش ہوتے کہ ناقدروں کے اس جہان آباد میں ایک تو قدرداں ہے۔

جب علامہ اعظمی کا آخری سفر حجاز کا ۱۹۸۷ء میں عزم ہوا تو مولانا محمد یحیی صاحب نے حق رفاقت کی درخواست کی، ان کی درخواست قبول کرلی گئی اور سفر پر وہ بھی ساتھ روانہ ہوئے، اس سفر میں انھوں نے جو استفادہ کیا سو کیا، عربوں کے نزدیک علامہ اعظمی کی مقبولیت، پذیرائی اور دیدہ و دل میں جگہ دینے کے جو مناظر دیکھے اس سے بھی جی بھر کے لطف اندوز ہوئے۔ ایک روز انھوں نے آپ سے عجیب و غریب سوال کیا، کہ حضرت! اکثر اسلاف واکابر نے حطیم وملتزم میں کوئی نہ کوئی مخصوص دعا کی ہے آپ نے کیا دعا مانگی؟ حضرت مولانا نے پہلے تو اس سوال کے جواب سے پہلو بچانا چاہا، لیکن سوال کرنے والا بھی اپنی ضد کا ایک پکا، جب یہ مصر ہوگئے تو علامہ اعظمی نے جو جواب دیا وہ حسب ذیل ہے۔

علامہ اعظمی نے فرمایا کہ حافظ ابن حجرؒ نے آب زمزم پیتے وقت اللہ سے دعا کی کہ مجھے امام ذہبیؒ کا علم عطا فرما، میں نے (علامہ اعظمی نے) آب زمزم پیتے وقت، حطیم و ملتزم میں، بیر بضاعہ کا پانی پیتے وقت اور مقبولیت کے دوسرے تمام مقامات پر یہ دعا کی کہ خداوندا! مجھے امام ذہبیؒ اور حافظ ابن حجرؒ دونوں کا علم عطا فرما۔ پھر آپ نے بطور تحدیث نعمت کے فرمایا کہ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے دیا بھی۔

علامہ اعظمی کے اس واقعے کے ساتھ ہی میرے ذہن میں ایک حدیث بھی آتی ہے، جس کی روشنی میں آپ کی اس بات کو سمجھنا ہمارے لئے قدرے آسان ہو سکتا ہے، سرکارؐ نے فرمایا تھا:

" مثل امتی کالمطر لا یدری أوله خیر ام آخره" (میری امت کی مثال بارش کی طرح ہے، نہیں معلوم کہ بارش کا پہلا حصہ بہتر ہوگا یا آخری حصہ)

آپ کی وسیع و عمیق معلومات، وفور علم، ہمہ گیر ثقافت، معقولات و منقولات پر بے نظیر دسترس، اسلامی علوم و فنون میں براعت و مہارت اور علم حدیث، اسماء الرجال اور فن جرح و تعدیل کے اندر آپ کی مسلمہ امامت کو دیکھتے ہوئے خیال کیا جاسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو درس و مطالعہ کی کس بے پناہ قوت واستعداد سے سرفراز فرمایا ہوگا۔ ذہانت وذکاوت اور فہم وفطانت تو آپ کے اندر فطری اور وہبی تھی ہی، شب و روز کے مطالعہ اور کتب بینی نے نورٌ علی نور کا کام کیا، اور ان دونوں قوتوں کے امتزاج کے بعد جن فضائل و کمالات کا ظہور ہوا اس سے اگر کوئی شخص انکار، یا شک وشبہ کا اظہار کرے تو اس کے متعلق اس کے سوا کیا کہا جاسکتا ہے جو کسی عرب شاعر نے کہا ہے:

النجم تستصغر الأبصار صورته الذنب للطرف لا للنجم في الصغر

ستاروں کی صورت کو نگاہیں چھوٹا سمجھتی ہیں اس میں قصور نگاہ کا ہے نہ کہ ستارے کا

مطالعہ و کتب بینی کا آپ کے یہاں ہم کو وہی ذوق و شوق دیکھنے میں آتا ہے، جو ادوار گذشتہ کی بعض عبقری اور تاریخ ساز شخصیتوں کی تاریخوں میں ملتا ہے، آپ کے بارے میں سنا ہے کہ چراغ کی روشنی میں آپؒ کے والد آپ کو مصروف مطالعہ دیکھتے تو لخت جگر کی جگر سوزی دیکھ کر ان کو خیال گذرتا کہ یہ لڑکا تو ان کتابوں کے پیچھے اپنی صحت کو برباد اور اپنے آپ کو ہلاک کرلے گا، اس وقت متنبہ کرتے اور سونے کی تاکید کرتے، آپ بھی اطاعت والدین کا ثبوت دیتے ہوئے چراغ کی لو دھیمی کردیتے، کچھ دیر بعد جب اندازہ ہو جاتا کہ والد محترم سو گئے تو چراغ کی لو تیز کرکے پھر پڑھنا شروع کردیتے، اس کے بعد انہماک کا کبھی کبھی یہ حال ہوتا کہ گذرے ہوئے وقت کا احساس اس وقت ہوتا جب رات بھر کے جاگے ہوئے تاروں پر بھی نیند کا نشہ طاری ہو جاتا، اور سپیدۂ صبح رات کی تاریک اور سیاہ چادر کو چاک کرکے اپنے لئے جگہ بنا رہا ہوتا۔ تب اگر کچھ وقت باقی بچ رہا ہوتا تو تھوڑی دیر پیٹھ لگا کر فجر کی نماز کے لئے تیار ہو جاتے۔

بقدر الكد تكتسب المعالي ومن طلب العلى سهر الليالي

محنت کے بقدر بلندیاں حاصل کی جاتی ہیں ۔۔۔ جس نے بلندیوں کو طلب کیا وہ راتوں کو بیدار رہا

درس و مطالعہ کی یہ غیر معمولی قوت و صلاحیت زندگی کے ہر دور میں آپ کی شخصیت کا لازمی جزو رہی، اس سے آپ کی روح کو غذا اور بالیدگی، دل کو سکون اور قلب کو آسودگی حاصل ہوتی تھی۔ کتابوں میں ڈوب کر غم جہاں اور آلام روزگار سے یکسر غافل ہو جاتے تھے۔ آپ کی حالت وحیات "وخیر جلیس فی الزمان کتاب" (زمانے میں سب سے بہتر ہم نشیں کتاب ہے) کی عملی اور واقعی تفسیر تھی۔

مطالعہ کرتے وقت آپ کے انہماک اور استغراقی کیفیت کا اندازہ ایک واقعہ سے لگایا جاسکتا ہے، جس کو مثالاً ہدیۂ ناظرین کر رہا ہوں، یہ اس زمانے کی بات ہے جب علم کی پیاس بجھانے کے لئے اکثر و بیشتر دارالمصنفین اعظم گڈھ تشریف لے جایا کرتے تھے، مئو میں کوئی ایسا کتب خانہ نہیں تھا جو آپ کی علمی تشنگی کے لئے آسودگی کا سامان فراہم کر سکتا، اس کے برعکس دارالمصنفین میں ایک تو سید صاحب (علامہ سلیمان ندوی) کا وجود، دوسرے شبلی اکیڈمی میں کتابوں کا بیش قیمت ذخیرہ، دونوں ہی باتوں میں آپ کے لئے بلا کی کشش تھی، پھر کیا تھا، جب تک کتب خانہ کھلا ہوتا آپ ہوتے اور روح کو غذا مہیا کرنے والی کتابیں ہوتیں، کتب خانہ بند ہونے کے بعد سید صاحب کی پر لطف صحبتیں ہوتیں، ان کی باتوں سے دل بہلاتے، بحث و مباحثے ہوتے اور دونوں اہل علم ایک دوسرے کی معلومات میں اضافہ فرماتے، یہ ایام علامہ اعظمی کے لئے بڑے خوش گوار ہوتے، جس کی وجہ سے اعظم گڈھ میں کبھی کبھی آپ کا قیام ہفتوں تک ہو جاتا، لیکن واقعہ کیا پیش آیا، اس کو بھی سنیے:

> "اسی زمانہ کا واقعہ ہے کہ دوپہر میں کھانے کا وقت ہوا، دارالمصنفین بند ہو گیا، دستر خوان لگا تو سید صاحب نے پوچھا کہ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب نظر نہیں آرہے ہیں، لوگوں نے ادھر ادھر تلاش کیا لیکن کہیں پتہ نہ چلا۔ سید صاحب نے فرمایا کہ دیکھو کتب خانہ میں نہ ہوں، چنانچہ دارالمصنفین دوبارہ کھولا گیا۔ دیکھا گیا کہ مولانا اعظمی مطالعہ میں غرق ہیں اور ان کو یہ بھی خبر نہیں کہ کتب خانہ دوبارہ کھولا گیا ہے، جب لوگوں نے آپ کو دوپہر کے کھانے کی اطلاع دی تو حیرت سے پوچھا کہ

اچھا! کھانے کا وقت ہو گیا!"(۱)

دارالمصنفین بند بھی ہوا اور کھلا بھی ، مگر علم کا ایسا سودا کہ دونوں سے لاعلم رہے، اور سچ پوچھئے تو یہی ادائے دلنواز تھی جس پر خود سید صاحب کو بھی پیار آتا تھا۔

پڑھتے وقت آپ کی محویت کا یہ حال ہوتا کہ کبھی نماز کا وقت ہو جاتا اور آپ کو اس کا بھی احساس نہ ہوتا، جب مسجد پہنچتے تو تھوڑی بہت تاخیر ہو چکی ہوتی، جس کی وجہ سے تاسف و ندامت بھی ہوتی، علمی و تحقیقی زاویۂ نظر سے یہ کیفیت چاہے جتنی بھی خوش آئند رہی ہو، دینی اور دیانتی لحاظ سے اس کو اپنے لئے بہتر نہیں خیال فرمایا ہوگا، اس لئے اس کا روحانی علاج دریافت کرنے کی خاطر حضرت تھانوی کی خدمت میں ایک خط لکھا جس میں یہ تحریر فرمایا:

"بعض اوقات مطالعہ میں اتنا انہماک ہوتا ہے کہ مسجد دیر میں پہنچتا ہوں، اور لوگوں کو منتظر پاکر نادم و متاسف ہوتا ہوں کہ ان لوگوں کو میری وجہ سے تکلیف ہوئی"

مطالعہ میں آپ کو کیا کیف و سرور اور کیا حظ حاصل ہوتا تھا، مجھ جیسے کم سواد و کم ہمت کے حیز خیال میں بھی نہیں آسکتا۔ فتح الباری کی اہمیت، قدر و قیمت اور حجم و ضخامت سے جو اہل علم ہیں وہ واقف ہیں۔ لیکن جو ناواقف ہیں ان کے لئے عرض کر دیا جائے کہ یہ حدیث کی اہم ترین اور عظیم ترین کتاب بخاری شریف کی شرح ہے، جو ۱۳ ضخیم جلدوں میں چھپی ہے۔ اس کتاب کے متعلق صاحبزادۂ محترم مولانا رشید احمد صاحب کا بیان ہے کہ والد صاحب نے اس کو تین مرتبہ بالاستیعاب پڑھا تھا۔

قارئین و دارسین اندازہ لگا سکتے ہیں کہ بالاستیعاب تین مرتبہ تو ایک طرف، ایک دفعہ بھی بلکہ ایک جلد بھی پڑھنا کوئی آسان کام نہیں۔ الا من وفقہ اللہ۔ اس زبانی روایت کی شہادت کیلئے ایک تحریری ثبوت بھی پیش کر دوں۔ فتح الباری کی

(۱) المآثر ج ۲ ش ۱ ص ۴۷

نسبت تو ممکن ہے کسی کو خیال گذرے کہ چونکہ صحیح بخاری کی شرح ہے۔اور سب سے اہم واکرم شرح ہے،اور علامہ اعظمی بخاری پڑھایا کرتے تھے اس لئے یہ کتاب مطالعہ میں رہا کرتی تھی۔ لیکن علامہ شمس الدین سخاوی متوفی ۹۰۲ھ کی مشہور کتاب ہے" الضوء اللامع فی أعیان القرن التاسع"۔ تاریخ و تذکرہ کی یہ کتاب چھ ضخیم جلدوں اور ۱۲ ار اجزاء پر مشتمل ہے،اس کتاب کی پہلی جلد کے سرورق پر علامہ اعظمی کے قلم سے یہ عبارت منقوش ہے۔

"طالعت هذ الكتاب كله أعنى أجزاء ه الاثنى عشر قبل اليوم بسنوات مستعيراً إياه من مكتبة دارالمصنفين (باعظم گڈھ)ثم لما اشتريته لمفتاح العلوم شرعت فی قراء ته ثانيا سنة ١٣٦٩ ھ۔"

(میں نے اس کتاب کے تمام اجزاء کا آج سے برسوں پہلے دارالمصنفین (اعظم گڈھ) کے کتبخانہ سے مستعار لے کر مطالعہ کیا، پھر جب میں نے اس کو مفتاح العلوم کے لئے خریدا تو ۱۳۶۹ھ میں اس کو دوبارہ پڑھنا شروع کیا)

یہ واقعات میں نے مشتے نمونہ از خروارے کے طور پر ذکر کردئے ہیں،ورنہ آپ کے غیر معمولی ذوق مطالعہ، جگر کاوی اور جاں سوزی کی گواہی آپ کی ذاتی کتابوں کا بیش بہا ذخیرہ دے گا،اور علم کے لق ودق صحرا میں آپ کی رہ نوردی، آبلہ پائی، اور بادیہ پیائی کی شہادت ہند و بیرون ہند کے مشہور و معروف کتب خانوں کے در و دیوار دیں گے۔

اور یہ بھی نہیں کہ یہ درس و مطالعہ کسی ایک یا دو فن،یا اسلامی علوم تک محدود و محصور ہو،بلکہ آپ کی حدود مطالعہ میں علوم عالیہ کے علاوہ علوم آلیہ،ادب و بلاغت، نحو وصرف، منطق و فلسفہ، طب و حکمت، طریقت و تصوف، حتی کہ قصص و روایات کی کتابیں بھی ہیں اور وہ بھی عربی فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں۔اور ایسا بھی نہیں کہ سرسری طور پر ورق گردانی کی ہو،بلکہ صاف پتہ چلتا ہے کہ پوری باریک بینی اور دقت نظر کیساتھ ان کا مطالعہ فرمایا ہے۔"

کتابوں کا شوق شوق مطالعہ کے ساتھ کتابوں کا شوق بھی عشق کی حد تک تھا، کتابیں آپ کی غمگسار، مونس و غمخوار اور تنہائی کی رفیق تھیں۔ کون سی کتاب دنیا کے کس کتب خانے میں ہے، مطبوعہ ہے یا مخطوطہ اس کے بارے میں معلومات بہم پہنچانا آپ کا اہم ترین مشغلہ تھا۔ نہایت اہتمام کے ساتھ کتبخانوں کی فہرستیں منگواتے اور ان میں موجود کتابوں کے سلسلے میں آگاہی حاصل کرنے کے لئے بسا اوقات کئی کئی جلدوں پر مشتمل فہرستیں پڑھ جاتے، کوئی اہم کتاب کہیں چھپتی اور شائع ہوتی تو اس کی فراہمی کے لئے بقدر امکان کوشش کرتے۔ ابتدائی دور آپ کا پر مشقت اور عسرت و تنگی کا دور تھا، مگر اس کے باوجود گنجائش نکال کر حتی المقدور کتابوں کی خرید کے لئے کوشاں رہتے، پھر بعد میں بحمد اللہ معاشی تنگی جب دور ہوئی، تو اس وقت آپ کی آمدنی کا خاصہ حصہ کتابوں پر صرف ہوتا تھا۔ آپ کی تحقیق و تعلیق سے شائع ہونے والی کتابوں کا جو "حق الخدمۃ" آپ کو ملتا، بسا اوقات سب کا سب کتابوں کی خرید پر خرچ ہو جاتا۔

مخطوطات کے ساتھ آپ کی شیفتگی و گرویدگی ناقابل بیان ہے، مخطوطات کے سلسلے میں وسیع تر معلومات اور اطلاعات کے باب میں بہت کم ایسے ہوں گے جو آپ کی ہمسری کا دعوی کر سکیں، بر صغیر اور عالم عرب میں موجود مخطوطات سے تو آپ وہاں کا سفر کر کے اور فہرستیں پڑھ کر باخبر رہتے تھے، لیکن یورپ جانے کی نوبت کبھی نہیں آئی تھی، لہذا وہاں پائے جانے والے مخطوطات سے واقفیت ڈاکٹر حمید اللہ مقیم پیرس سے حاصل کرتے تھے، چنانچہ ڈاکٹر حمید اللہ صاحب سے مراسلت کا محور یورپ میں موجود اسلامی علوم وفنون کی کتابوں کے قلمی نسخے رہا کرتے تھے۔ اس سلسلے میں آپ کا ایک واقعہ مشہور ہے کہ حج کے کسی سفر میں کسی کتاب کا مخطوطہ آپ کے ہاتھ آ گیا، اس کو نہایت اہتمام کے ساتھ بریف کیس میں رکھ کر اپنے ہم وطن کسی حاجی صاحب کے حوالے کر دیا اور سخت تاکید کی کہ بہت حفاظت کے ساتھ اس کو گھر تک لے چلنا ہے، حاجی صاحب بیچارے نے جب اس شدت سے تاکید کرتے ہوئے دیکھا تو پوچھا مولانا! اس میں خزانہ ہے کیا؟

ظاہر ہے ان کے نزدیک سونے سے زیادہ قیمتی چیز کا تصور ہی نہیں رہا ہو گا، آپ نے فرمایا: اس سے زیادہ قیمتی چیز ہے۔

کتابیں چونکہ آپ کی زندگی کی سب سے قیمتی اور عزیز ترین متاع تھیں، اس لئے ان کی حفاظت بھی دل و جان سے کرتے تھے، لیکن حفاظت کے شدید اہتمام کے باوجود وسائل کی قلت کے باعث لکڑی کی الماریوں میں رہنے کی وجہ سے کبھی کوئی کتاب خراب ہو جاتی، مثلاً دیمک وغیرہ لگ جاتے تو اس وقت آپ کے رنج و قلق کی انتہا نہ رہتی اور مارے غم کے چٹائی کا فرش کانٹوں کا بستر بن جاتا۔

کتابوں، خاص طور پر مخطوطات کا شوق آپ کو اکثر و بیشتر جہاں گردی اور صحرا نوردی پر مجبور کرتا تھا، چنانچہ ہندوستان کے اہم علمی مراکز، جہاں بڑے بڑے کتبخانے اور لائبریریاں موجود ہیں، ان کے سفر کی غرض و غایت مطبوعات و مخطوطات کی تلاش و جستجو ہوتی، آپ کے لکھے ہوئے بعض خطوط کی نقلیں آپ کے اوراق میں محفوظ ہیں، جن سے اس کی طرف واضح طور پر اشارہ ملتا ہے۔ مثال کے طور پر ۱۷ ر رجب ۷۷ھ کو دیوبند سے مولانا عبدالجبار صاحب کو تحریر فرماتے ہیں:

> "۔۔۔ میں آج یہاں کے کام سے فارغ ہو گیا، اب انشاء اللہ کل یہاں سے روانگی ہوگی، کچھ رام پور کا خیال ہے مگر سردی بہت ہے اس لئے ممکن ہے وہاں اترنے کی ہمت نہ کر سکوں ۔۔۔"

۱۴ر شعبان ۷۸ھ کو بہرائچ سے ارقام فرماتے ہیں:

> "۔۔۔ شاید دیوبند سے مولوی ظفیر الدین صاحب نے خط لکھا ہو، میں دیوبند سے سہارنپور، وہاں سے لکھنو اور لکھنؤ سے بہرائچ آ گیا ہوں۔
>
> پرسوں رسولی جانا ہے، اس کے بعد انشاء اللہ گھر ہی آؤں گا ۔۔۔۔"

شوق و طلب کا ایک نمونہ ۴۴ھ کے پٹنہ کے سفر کے ضمن میں بھی گذر چکا ہے۔ یہاں کچھ مثالیں اور ملاحظہ فرمالیں، ۲۷ر ستمبر ۱۹۵۹ء مطابق ربیع الاول ۱۳۷۹ھ کو

حیدر آباد سے مولانا محمد موسیٰ میاں کو ایک طویل خط میں لکھتے ہیں:

"۲؍ ستمبر کو میرا سفر شروع ہوا، مالیگاؤں میں میرے کئی شاگرد مدرس ہیں، ان کو اطلاع کر دی تھی، وہ منماڈ اسٹیشن پر ملنے آئے اور باصرار مالیگاؤں لے گئے، پھر وہاں سے اہل علم کی ایک پارٹی نے طے کیا کہ برہان پور بھی کبھی علم کا مرکز رہا ہے، اور وہاں شیخ طاہر سندی اور شیخ فتح محمد محدث پیدا ہوئے ہیں، لہذا وہاں بھی کتابوں کی جستجو کرنی چاہئے، چنانچہ احقر نے برہانپور کا سفر کیا وہ حضرات بھی ساتھ تھے، وہاں مولوی سید احکام اللہ بخاری کا کتب خانہ دیکھا، کچھ قلمی کتابیں ان کے پاس ہیں، مگر حدیث وفقہ کی کوئی خاص چیز وہاں نہیں ہے۔ پھر شیخ برہان الدین راز الہ کی درگاہ کے سجادہ نشین سید حبیب الدین کا کتب خانہ دیکھا وہاں بھی اب کچھ نہیں ہے، یا ہے مگر انھوں نے سب چیزیں نہیں دکھائیں، برہانپور سے پھر مالیگاؤں آیا اور چار پانچ دن ٹھہر کر حیدر آباد کا قصد کیا، حیدر آباد پہنچا تو آپ کا والا نامہ ملا۔۔۔"

اسی خط میں چند سطروں کے بعد لکھتے ہیں:

"۔۔۔روزانہ کسی نہ کسی کتبخانہ میں ۹ بجے سے چار بجے تک وقت صرف کرتا ہوں، شام تک تھک کر چور ہو جاتا ہوں، کل جامعہ عثمانیہ کا کتبخانہ دیکھا وہاں ایک نسخہ مسند حمیدی کا ملا، مگر روزانہ وہاں جا کر مقابلہ کرنا پڑے گا، جو میری قیام گاہ سے سات میل دور ہے، پرسوں جمعہ کے بعد سے آصفیہ میں مصروف رہا۔۔۔"

اسی سفر میں طویل صحرا نوردی کے بعد بمبئی پہنچے جہاں سے ۱۰؍ اکتوبر ۵۹ء کو مولانا محمد میاں کے پاس ایک اور مفصل خط لکھا، جس میں تحریر فرمایا:

"حیدر آباد سے ایک عریضہ روانہ کر چکا ہوں، اب میں کل سے بمبئی آگیا ہوں، ا۔ یہاں اسرار المحبۃ للشاہ رفیع الدین کا نسخہ دستیاب ہو گیا اور اس کو

نقل کے لئے دیدیا ہے ۔ یہاں سامرود کے باب میں حافظ محمد شفیع اور مولوی سعید کے خطوط ملے کہ سامرود میں مصنف کا نسخہ نہیں ہے اور اس کی اطلاع آپ کو بھی ان لوگوں نے دیدی ہے ...“

درس و تدریس اوپر یہ عرض کیا جاچکا ہے کہ استاذ مرحوم نے درس و تدریس کا آغاز عنفوان شباب ہی میں اس وقت کیا تھا جب کہ تحصیل علم سے باقاعدہ فراغت نہیں نصیب ہوئی تھی ، اور ابھی تکمیل علم و فن سے بمراحل دور تھے۔ لیکن یہ سلسلہ ایک ڈیڑھ سال سے اوپر قائم نہیں رہا اور فریضہ تدریس چھوڑ کر پہلے آپ نے علوم کی تکمیل کی ، ۱۳۴۰ھ میں دارالعلوم سے باضابطہ فراغت حاصل ہوئی، اس کے بعد آپ نے باقاعدہ درس و تدریس کی ابتداء فرمائی، اور اب جو آپ کا فیضان شروع ہوا ہے تو اس کا سلسلہ تادم واپسیں برقرار رہا، ۱۳۴۰ھ سے لے کر ۱۴۱۲ھ تک تقریباً ستر بہتر سال تک آپ کے دم سے مسند درس کی رونق قائم رہی۔ اس عرصہ میں متعدد نسلوں اور بے شمار افراد نے، جن کا حصر واحاطہ ناممکن ہے، آپ کے خوان علم سے زلہ ربائی کی۔

آپ کا طرز تدریس جداگانہ تھا، طلبہ عبارت پڑھتے اور وہی ترجمہ بھی کرتے، آپ مطالب و معانی کی وضاحت فرمادیتے، آپ کے پاس عبارت خوانی، طلبہ کے لئے بڑی آزمائش کی چیز ہوتی تھی، عبارت پڑھنے والے طالب علم کے ہوش و حواس بہت مشکل سے بجا رہتے تھے۔ ایک تو غیر معمولی رعب وہیبت، دوسرے ایک ایک حرف ایک ایک حرکت کا صحیح تلفظ اور ٹھیک ٹھیک ادائیگی ، عبارت پڑھنے والے کو گویا ہر ایک بات نظر میں رکھنی پڑتی تھی، مفتی ظفیر الدین صاحب ارقام فرماتے ہیں:

”عبارت خوانی ان کے درس میں لوہے کے چنا چبانے سے کم نہیں، کیا مجال کہ کوئی طالب علم ایک زبر زیر کی غلطی کر کے نکل جائے، اسی طرح ترجمہ میں بھی غلطی برداشت نہیں کرتے تھے، جہاں غلطی ہوئی مولانا کی طرف سے ہوں کی آواز آئی، اگر عبارت ٹھیک ہو گئی تو کچھ نہیں فرماتے، مگر ہوں کے بعد

بھی غلطی ٹھیک نہیں ہوئی تو مولانا کی چھڑی اٹھ جاتی اور ساتھ نحوی و صرفی ترکیب کے سوالات شروع ہو جاتے، طالب علم پر کپکپی طاری ہو جاتی۔ اسی وجہ سے جس کو عبارت پڑھنا ہوتی وہ دو چار کتابوں کی مدد سے سارے مسائل حل کر کے جاتا تھا۔"(۱)

استاذ مرحوم حضرت علامہ اعظمی۔ نور اللہ مرقدہ و برد مضجعہ۔ عبارت خوانی کے دوران طالب علم پر کتنی باریکی سے نگاہ رکھتے تھے، اس کا تماشہ ناچیز نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا اور مشاہدہ کیا ہے، ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ ہم لوگوں کے دورۂ حدیث کا سال تھا، ہمارے ایک شریک درس بخاری شریف کی عبارت پڑھ رہے تھے، ایک جگہ "الفَرَس" کا لفظ آیا، ساتھی نے اس کو "الفرْس" پڑھ دیا۔ بظاہر یہ ایک معمولی سی بات ہے، لیکن ایک بخاری پڑھنے والے کے لئے علامہ اعظمی کے نزدیک یہ چھوٹی سی بات بھی ناقابل برداشت تھی، چنانچہ آپ بہت خفا ہوئے اور سخت تنبیہ فرمائی۔

درسی تقریر میں افہام و تفہیم کے علاوہ ایجاز واختصار، ترتیب مقدمات اور نتائج کے استنباط پر حیرت انگیز قدرت اور عجیب و غریب ملکہ حاصل تھا۔ اللہ نے آپ کے اندر یہ عجیب و غریب موہبت و صلاحیت ودیعت فرمائی تھی کہ جو کتاب کی عبارت ہوتی آپ کی تقریر اسی ترتیب سے ہوتی، ہم نے آپ کی اس عظمت و شان کے مناظر اس وقت دیکھے ہیں جب آپ باعتبار عمر چراغ سحری ہو چکے تھے، اور ضعف و تعب کی وجہ سے لیٹ کر درس دیا کرتے تھے، اس عمر میں بھی وہ شان و شوکت پائی جاتی تھی، جو عہد شباب اور کہولت میں بدرجہا زیادہ رہی ہو گی، مگر اس صورت اور حالت میں بھی دیوان متنبی، حماسہ اور تفسیر بیضاوی اور دیگر کتابوں میں معانی و مطالب کی وضاحت اس حسن ترتیب سے فرماتے کہ نہ کوئی حرف چھوٹتا اور نہ توضیح کے درمیان کوئی لفظ ادھر سے ادھر ہوتا، اور عبارت بالکل آئینہ ہو جاتی۔ آپ درس میں لمبی چوڑی تقریر کے عادی تھے نہ قائل، بلکہ اس کے سخت خلاف تھے، یہ آپ کا کمال تھا کہ مشکل سے مشکل مباحث اور دشوار سے دشوار

(۱) ترجمان الاسلام ۱۱۔ ۱۲ ص ۱۳۸

مقامات کی وضاحت و تصریح چند فقروں میں اس طرح فرمادیتے کہ بات بے غبار ہو جاتی۔
بخاری اور ترمذی کے درس کے دوران نہ جانے کتنے مقامات پر یہ مشاہدہ محسوس رہا ہے کہ وہ پیچیدہ مسائل و معانی جن پر دنوں اور ہفتوں تک بحث و تمحیص ہوتی رہتی ہے، ان کی اس طرح عقدہ کشائی کرتے ہیں کہ پتہ ہی نہیں چلتا کہ ان کے اندر کوئی تعقید رہی ہو۔

مطالعہ کی سخت تاکید فرماتے، اس کی اہمیت آپ کے نزدیک تکرار سے زیادہ تھی، بلکہ آپ تکرار کی افادیت کے چنداں قائل نہیں تھے۔ میں نے آپ کی تحریروں میں کہیں دیکھا ہے کہ خود بھی زمانۂ طالب علمی میں تکرار کے حلقوں میں نہیں بیٹھتے تھے، بلکہ انفرادی مطالعہ کو ترجیح دیتے تھے، آپ درس کے دوران استاذ کی تقریر بھی قلمبند کرنے کے حق میں نہیں تھے، ہم لوگ جب ترمذی شریف کا سبق آپ سے پڑھ رہے تھے تو ہمارے ایک ہم درس نے آپ کے افادات قلمبند کرنا چاہا، آپ نے سختی سے منع فرمادیا اور فرمایا کہ میری بات غور سے سنو اور اس کو سینے میں محفوظ رکھنے کی کوشش کرو، اصل علم وہی ہے جو سینے میں محفوظ رہ جائے۔

پابندیٔ اوقات علامہ اعظمیؒ کے نزدیک وقت بہت قیمتی متاع تھی، وہ اپنے بیش قیمت اوقات کے ایک ایک لمحے کا حساب کتاب رکھتے اور اسے کام میں لاتے تھے۔ اگر کہا جائے کہ وہ لمحے کا سواں حصہ بھی ضائع نہیں کرتے تھے تو مبالغہ نہیں ہوگا۔ اور یہی وجہ تھی کہ وہ اپنے اوقات کے سخت پابند تھے، نشست و برخاست، درس و تدریس، تصنیف و تالیف اور زیارت و ملاقات ہر عمل کے لئے ایک وقت مقرر تھا۔ شاید و باید ہی کبھی ایسا ہوتا ہو کہ ان کے معمولات میں تخلف یا خلل واقع ہوتا ہو، ان کا ہر کام الگ الگ اوقات پر منقسم تھا، صبح کے ناشتہ سے لے کر ناشئۃ اللیل تک کی تمام مصروفیات کے لئے وقت مقرر تھا، درس و تدریس کا وقت، تصنیف و تالیف یا تحقیق کا وقت خطوط نویسی کا وقت، بارہ بجتے ہی دوپہر کے کھانے کا وقت، عقیدتمندوں کے لئے دعا و تعویذ کا وقت، اور خواص سے ملاقات کا وقت، الغرض لیل و نہار کی ہر ساعت مصروفیت میں صرف ہوتی تھی۔

اگر وقت کی اس شدت سے پابندی نہ ہوتی، تو آپ نے جو اتنے محیر العقول کارنامے

انجام دیئے ہیں، وہ شاید سامنے نہ آتے۔ آپ نے اپنے وقت کی قدر کی تو اللہ نے اسی قدر اس میں برکت عطا فرمائی۔ یہاں یہ ذکر کر دینا مناسب نہ ہوگا کہ آپ کی زندگی میں بہت سے لوگوں کو آپ کی سخت مزاجی اور تند خوئی کا شکوہ تھا، مگر واقعہ یہ ہے کہ یہ شکایت محض آپ کے مزاج وطبیعت سے ناواقفیت کی بنا پر تھی، ورنہ در حقیقت وہ بہت زیادہ نرم دل اور رقیق القلب تھے۔ لیکن اسی کے ساتھ وہ حد درجہ حساس، لطیف الطبع اور ذکی الحس تھے، اور اس لطافت طبع اور حساسیت کے ساتھ ان کی ذات سے متعلق دو چیزیں اور بھی تھیں جن میں وہ کسی دخل اندازی کو عموماً برداشت نہیں کرتے تھے۔ ایک ان کے اصول وضوابط دوسرے اوقات۔ مگر عوام بیچارے عقیدت ومحبت سے مجبور زیادہ تر بے وقت ہی آتے، اور تفصیلی ملاقات اور بات کی آرزو لے کر آتے، یہ بے وقت کی آمد علامہ اعظمی کے دل ودماغ پر جس قدر شاق گذرتی وہ کسی سنگ گراں سے کم نہ ہوتی، اس صورت میں کبھی آپ ملنے سے انکار کر دیتے یا سخت بات کہہ دیتے تو لوگ اس کو تند خوئی اور تلخ مزاجی پر محمول کرتے، جب کہ یہ ان کے مزاج میں ہرگز نہیں تھا، صرف یکسوئی کا تقاضا تھا جس کے سبب ایسا کرنا پڑتا، اسی وجہ سے وہ اپنے اس طرز عمل پر کبھی کبھی متاسف بھی ہوتے۔

یہ غالباً وقت کی قدر وقیمت ہی کا اثر تھا کہ جب آپ نے اپنا مختصر سا رسالہ "اہل دل کی دل آویز باتیں" تالیف فرمایا، تو اس میں سب سے پہلا جو واقعہ ذکر کیا وہ وقت کی قدر و قیمت سے ہی متعلق ہے اور اس کا عنوان "وقت کی قدر وقیمت" قائم کیا ہے۔

کم گوئی: یہ علامہ اعظمی کا ایک بہت خاص وصف تھا۔ آپ حد درجہ کم سخن اور خاموش طبع تھے، بقدر ضرورت تکلم فرماتے ورنہ خاموش رہتے، اور خاموشی بھی برائے خاموشی نہیں بلکہ ایسا معلوم ہوتا جیسے فکر کے سمندر میں ڈوبے ہوئے ہوں، یہ آپ کا عجیب وغریب وصف تھا، ایک طرف سینہ علم وحکمت سے اس طرح معمور جس پر "کنیف ملئی علماً" کا قول صادق آئے، دوسری طرف زبان ودہن پر ایسی مہر سکوت جیسے قوت گویائی مفقود ہو، البتہ

علم کے اس سمندر میں جب کچھ تموج پیدا ہوتا تو کچھ جواہر پارے ساحل پر آکر بکھر جاتے۔
کوئی شخص آپ سے اگر کچھ دریافت کرتا تو اکثر و بیشتر صرف ہاں، نہیں میں جواب دیدیتے یا اگر کچھ فرماتے بھی تو بقدر ضرورت، لیکن وہی چند جملے حکمت و معنی سے بھرپور ہوتے۔ کم گوئی آپ کی ایسی صفت تھی کہ اس کی وجہ سے ان لوگوں پر، جو آپ کے تبحر علمی سے واقف نہ ہوتے، آپ کے علم کی حقیقت آشکارا نہیں ہو پاتی تھی۔

وعظ و تقریر: حضرۃ الاستاذ علامہ اعظمیؒ کی گوناگوں خصوصیات میں فن خطابت پر قدرت تامہ بھی تھی، گوکہ آپ واعظ شعلہ بیان تھے نہ مقرر خوش الحان، اس کے باوجود آپ کے اندر ایک اچھے واعظ اور ماہر و مشاق خطیب کے جملہ اوصاف موجود تھے، اور بہت سارے کمالات کی طرح وہ اس میدان میں بھی یکتا و بے مثل تھے، اور کم از کم خطۂ پورب میں خطابت کے اندر آپ کا ہمپایہ کوئی نہیں تھا۔

علامہ اعظمی کے اندر یہ کمال بھی عطیۂ قدرت اور خداداد تھا، درس و تدریس کے زمانۂ آغاز سے ہی مجالس وعظ و تذکیر میں جلوہ آرا نظر آتے ہیں، آپ کے خطوط کے پشتارہ میں پانچ دریاؤں کی سرزمین (پنجاب) سے لے کر مشرقی بہار تک کی مختلف مجلسوں اور محفلوں میں شرکت کے دعوت نامے شروع زمانہ سے ملتے ہیں۔ امام اہلسنت حضرت مولانا عبدالشکور صاحب فاروقی کا خطابت میں جو پایہ اور مرتبہ تھا وہ محتاج بیان نہیں، علامہ اعظمی ان کے نہایت معتمد اور مقرب تھے، حضرت امام اہلسنت کے مجموعۂ مکاتیب میں جو انھوں نے علامہ اعظمیؒ کے نام ارسال فرمائے ہیں، معتد بہ تعداد ایسے گرامی ناموں کی ہے جن میں جلسوں میں شرکت اور وعظ و تقریر کے لئے دعوت اور پیشکش ہے، ان خطوط کے مضامین سے صاف پتہ چلتا ہے کہ علامہ اعظمی کی ہمراہی و ہم سفری اور ہم مجلسی کو اپنے لئے موجب فخر و ابتہاج سمجھتے تھے، اور علامہ اعظمی خود ایک موقع پر اس کی طرف اشارہ فرماتے ہوئے ارقام فرماتے ہیں:

"یاد نہیں کتنے جلسوں میں میری دعوت پر امام اہلسنت نے شرکت فرمائی

اور کتنے جلسوں میں ان کی خواہش پر میں نے ان کی معیت میں شرکت کی۔"(۱)

آپ کے خطوط کے انبار پر ایک طائرانہ نگاہ ڈال لینے سے ہی یہ ہویدا ہو جاتا ہے کہ ان کی خطابت کا چرچا اور شہرہ ریعان شباب میں ہی ہو گیا تھا، یہی ایک مثال لے لیجئے کہ مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی کے قصبہ میں انصاری برادری کے کسی شیعی نے فتنہ وفساد کا بازار گرم کر رکھا تھا، تو اس کی کاٹ کے لئے مولانا سیوہاروی کی نگاہ انتخاب آپ پر پڑی، اور آپ کو بلانے کے لئے انھوں نے متعدد خطوط روانہ فرمائے۔

اسی طرح نہ جانے کتنے جلسوں اور مجلسوں میں مشاہیر اہل علم اور اکابر قوم کی موجودگی میں رئاست وصدارت کی کرسی تفویض کی گئی۔ نومبر ۱۹۳۶ء میں اعظم گڈھ میں ایک جلسے کا انعقاد ہوا جس کے شرکاء میں شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ اور حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ تھے۔ اس اجلاس کی صدارت کا تاج علامہ اعظمی کے سر پر رکھا گیا تھا، ڈاکٹر منور انجم اقبال سہیل حیات اور شاعری (ص ۱۶۰) میں لکھتے ہیں:

"اسی طرح نومبر ۱۹۳۶ء میں جب مولانا موصوف (حضرت مولانا مدنیؒ) سدھاری اعظم گڈھ کے دینی جلسے میں شریک ہوئے جس کی صدارت محدث العصر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی نے کی تھی......"

اس ضمن میں یہ عرض کر دینا بے موقع نہ ہوگا کہ اس جلسے کی مناسبت سے اقبال سہیل نے شرکاء اجلاس بزرگوں کی شان میں فارسی میں ایک برجستہ اور پر اثر استقبالیہ نظم پیش کی تھی، اقبال سہیل نے اس کے اندر علامہ اعظمیؒ کو جس بلند آہنگ پیرایہ میں خراج تہنیت پیش کیا تھا وہ یہ شعر ہے:

وزاں پس آں حبیب ما، ادیب ما، خطیب ما : کہ ذاتش در مئو احناف را حصن حصیں آمد (۲)

علامہ اعظمیؒ جب تک مفتاح العلوم مئو سے وابستہ رہے، ان کا ہمیشہ کا یہ معمول رہا

---

(۱) المآثر ج ۷ ش ۳ ص ۷۹

(۲) دراصل یہ جلسہ علامہ سید سلیمان ندوی کی زیر صدارت ہونے والا تھا، سید صاحب اس وقت حرمین تھے، اور اسی روز واپس آنے والے تھے، لیکن جب آخر وقت تک ان کی واپسی نہیں ہوئی، تو صدارت کیلئے علامہ اعظمی کا نام پیش کیا گیا، اقبال سہیل جو نظم لکھ کر لائے تھے اس میں مذکورہ شعر نہیں تھا، انھوں نے وہیں برجستہ وہ شعر کہا اور کاغذ کے ایک ٹکڑے پر پنسل سے لکھ کر علامہ اعظمی کے حوالے کیا، سہیل صاحب کے ہاتھ کا لکھا ہوا شعر اب بھی علامہ کے کاغذات میں محفوظ ہے۔

کہ رمضان المبارک کے مہینے میں ہر جمعہ کو نماز جمعہ کے بعد وعظ فرماتے، ان کے مواعظ رمضان کے علاوہ سال کے دیگر مہینوں میں بھی ہوتے رہتے تھے، لیکن یہ معمول نہیں تھا، البتہ ماہ مبارک میں تقریباً یہ معمول بن چکا تھا، اور یہ معمول مفتاح العلوم سے مفارقت کے بعد بھی مدرسہ مرقاۃ العلوم سے متصل جامع مسجد رحمانی میں قائم رہا اور آخری عمر تک جاری رہا اور جس سال آپ کی وفات ہوئی ہے، اس سے پہلے تک آپ نے اس کو برقرار رکھا۔ آپ کے یہ مواعظ ومجالس مئو کی تاریخ کے لئے یادگار اور باعث صد افتخار ہیں، رمضان میں آپ کا وعظ سننے کے لئے لوگوں کا جو مجمع امڈتا تھا اس کی مثال مشکل سے ملے گی، نہ صرف مئو بلکہ قرب وجوار کے قصبات وقریٰ سے بھی لوگ "بڑے مولانا" کی تقریر سننے کے لئے بڑی تعداد میں مئو آکر جمعہ کی نماز پڑھتے اور مولانا کی نصیحتوں سے مستفید وفیضیاب ہو کر واپس جاتے، رمضان کے آخری جمعوں میں تو لوگوں کا ہجوم اس قدر ہوتا کہ ان کی تعداد کا صحیح اندازہ بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔

علامہ اعظمی کا وعظ عجیب وغریب خصوصیت کا حامل ہوتا تھا، ان کا کلام " کلم الناس علی قدر عقولھم " کی تمثیل پیش کرتا تھا، حاضرین وسامعین کے مبلغ علم اور معیار عقل کے اعتبار سے وہ تقریر بھی فرماتے، موقع ومقام کی بھی پوری رعایت فرماتے، مجمع عوام کا ہوتا تو آپ کی تقریر نہایت عام فہم ہوتی جسے ہر کہہ ومہہ بخوبی سمجھ سکتا تھا۔ لیکن اگر اہل علم کا اجتماع ہوتا اور کوئی علمی تقریب ہوتی، اس وقت آپ کی خطابت کا رنگ خالص علمی اور تحقیقی ہوتا، عموماً خطاب مختصر فرماتے، مگر جب کبھی طبیعت میں نشاط ہوتا اور سامعین میں ولولہ وشوق زیادہ ہوتا تو تفصیل سے بھی کام لیتے، رمضان کے جمعوں میں سامعین کے جاذبۂ شوق کو دیکھ کر بالعموم طویل تقریر فرماتے، چنانچہ ہم نے اخیر عمر میں جب کہ آپ انتہائی نحیف ونزار ہو چکے تھے، دیکھا ہے کہ ایک ایک گھنٹے سے زیادہ بلا تکان بولتے چلے جارہے ہیں۔

اوپر اشارہ کیا جاچکا ہے کہ آپ کی تقریر حال ومقام کی مناسبت سے ہوتی، اسی

طرح سامعین کی نفسیات کی بھی حد درجہ رعایت ہوتی، ان رعایتوں کی وجہ سے آپ کی باتیں بڑی پر اثر ہوتی تھیں، اہل مجلس آپ کی ایک ایک بات غور سے سنتے اور دل میں اتارتے، آپ جب تقریر فرمارہے ہوتے تو سکوت وسکون کا حال عربی کے مشہور محاورہ کأن علی رؤسهم الطیر کا ہوتا، آپ کے وعظ کی یہ عجیب وغریب تاثیر تھی کہ اسلاف کے تاریخی واقعات جب بیان فرماتے تو انداز اتنا موثر ہوتا کہ اگر واقعہ خوش کن ہوتا تو بے اختیار ہنسی آجاتی اور اگر کوئی حسرتناک اور رقت آمیز بات ہوتی تو پورے مجمع پر گریہ طاری ہوجاتا، مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ مدرسہ مرقاۃ العلوم کی مسجد میں ایک دفعہ جمعہ کے دن اتفاق سے ۱۷ر رمضان کی تاریخ تھی۔ اس دن غزوہ بدر کے واقعہ کی اس انداز سے منظر کشی کی کہ سامعین میں شاید کوئی ایسا رہا ہو جس کی آنکھوں سے آنسو نہ رواں ہوگئے ہوں، اور یہ سارا بیان نہایت سادگی کے ساتھ سیدھے سادے انداز میں ہوتا تھا۔

آپ کی مثال کسی ماہر نباض کی تھی کہ معاشرے میں رائج خرابیوں اور غیر شرعی امور پر نگاہ رکھتے اور ان کو دور کرنے کی بہر طور نصیحت فرماتے، اور اسلامی اخلاق اور دینی اقدار کے اپنانے کی ترغیب دلاتے، مولانا محمد عثمان صاحب معروفی تحریر فرماتے ہیں:

”صحن احیاء العلوم میں اجلاس تھا، اسٹیج کے پیچھے دیوار پر دو خوبصورت بنارسی ساڑیاں لگی ہوئی تھیں، حضرت نے ابتداء میں اس پر نکیر کی اور فرمایا کہ یہ زیبائش وآرائش کیا اسراف میں داخل نہیں ہے؟“(۱)

آپ کی تقریر کی ایک اہم خصوصیت یہ تھی کہ آپ کی باتیں نہایت پر مغز، جامع، مدلل اور معلومات افزا ہوتیں، اختصار اور جامعیت دریا کو کوزہ میں بند کرنے کے مترادف ہوتا تھا، مولانا مفتی محمد یسین صاحب مبارکپوری (متوفی ۱۴۰۴ھ م ۱۹۸۴ء) فرماتے ہیں:

”ان کا (علامہ اعظمیؒ کا) وعظ یا تقریر ایک مہذب اور جامع متن کے درجہ میں ہوتا ہے جو حشو وزوائد سے پاک ہوتا ہے، اور جس کی لمبی شرح کی جاسکتی ہے۔

(۱) ترجمان دارالعلوم اکتوبر ۱۹۹۶ء ص ۲۰

دوسری خوبی آپ کے بیان میں یہ ہوتی ہے کہ دوسری بات پہلی بات کی دلیل ہوا کرتی ہے، یہی وجہ ہے کہ آپ کی تقریر کو اہل علم بہت دلچسپی سے سنتے ہیں (۱)"

خطابت پر جس طرح اردو زبان میں قدرت حاصل تھی اسی طرح عربی زبان میں بھی دسترس تھی، اوپر گذر چکا ہے کہ جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل میں شیخ الازہر ڈاکٹر عبدالحلیم محمود علیہ الرحمہ کی تشریف آوری کے موقع پر جب علامہ مرتضی زبیدی کا شیخ الازہر کی زبان پر ذکر آیا، تو آپ نے عربی زبان میں برجستہ علامہ موصوف کا تعارف کرایا، اور ان کے ھندی الاصل ہونے کو دلائل سے ثابت کیا، اس موقع پر مولانا ابوبکر غازیپوری کا یہ جملہ آپ سن چکے ہیں کہ اس وقت ہمیں معلوم ہوا کہ حضرت مولانا کو جس طرح فصیح عربی لکھنے پر قدرت حاصل ہے اسی طرح عربی بولنے پر بھی قدرت حاصل ہے۔

قاہرہ کی سنت وسیرت کانفرنس کو جب آپ نے برجستہ خطاب فرمایا تو حاضرین اجلاس حد درجہ متاثر ہوئے، حتی کہ جب آپ واپس تشریف لائے تو مصر کے کئی فضلاء کے خطوط آئے جن میں انھوں نے آپ کے خطاب کی تحسین وستائش کی، ان میں سے کئی ایک خط اس کم سواد نے بچشم خود دیکھا ہے۔

اسی طرح جب آپ عربی زبان میں گفتگو فرماتے تو نہایت فصیح وبلیغ اور شستہ ورواں انداز والفاظ میں فرماتے، آپ کے لب ولہجہ اور انداز گفتگو کی تعریف وتوصیف خود عرب اہل علم کرتے، شامیوں نے باوجود شستہ اور ستھری عربی بولنے کے جب آپ کی گفتگو سنی تو بہت متحیر ہوئے، اور ہم نے خود علامہ شیخ ابوغدہؒ اور بعض دیگر عرب فضلاء کے ساتھ نہایت روانی اور بے تکلفی سے گفتگو کرتے ہوئے سنا اور دیکھا ہے۔ اس وقت محسوس یہ ہوتا کہ اردو زبان کی طرح یہ بھی گھٹی میں پڑی ہو۔

---

(۱) ترجمان دارالعلوم ص ۲۱

وسیع الظرفی اعلیٰ درجہ کے وسیع الظرف اور کشادہ قلب تھے، کسی کے بدخواہ نہیں تھے۔ اگر آپ سے کوئی کسی معاملے میں مشورہ طلب کرتا تو دین و دنیا کے مفاد کو پیش نظر رکھ کر اس کو بہتر سے بہتر مشورہ دیتے۔ آپ کی وسیع الظرفی کی انتہا یہ تھی کہ باایں ہمہ وفور علم اور عظمت شان آپ کی تحریر میں کوئی اگر صحیح طور پر اصلاح کردے تو اس کو بھی تسلیم کرنے کی گنجائش پائیں، بلکہ خوشی اور شکر گزاری کے ساتھ تسلیم کریں، مگر آپ کی ہر بات چونکہ نہایت مدلل و مبرہن اور محقق ہوتی اس لئے واقعی طور پر ایسا کبھی نہیں ہوا، قاضی اطہر صاحب مبارکپوری مرحوم کو ایک خط میں لکھتے ہیں، پورا خط تو میں کسی اور مقام پر نقل کروں گا، خط کی جو بات اس جگہ سے متعلق ہے اس کو ملاحظہ فرمالیں، لکھتے ہیں:

"آپ کے تصرفات کی نسبت گزارش ہے کہ اصلاح اگر موجہ ہو تو میں صرف خوش نہیں بلکہ شکر گزار بھی ہوتا ہوں۔"(۱)

دارالعلوم دیوبند اور ندوۃ العلماء لکھنؤ کے درمیان شروع سے جو نظریاتی اختلاف اور اس کے نتیجہ میں باہمی رسہ کشی ہو رہی ہے، وہ کوئی نئی بات نہیں، لیکن آپ کے دل میں دونوں کے لئے برابر کی جگہ رہی، صرف یہی نہیں ندوہ میں ڈیڑھ پونے دو سال تک خالصۃً لوجہ اللہ محفل درس بھی گرم رکھی، سید سلیمان ندوی مرحوم کا ایک اہم کارنامہ یہ لکھا گیا ہے کہ دونوں اداروں کے اختلافات کو ختم کرانے میں ان کی شخصیت بہت مؤثر رہی ہے۔ چنانچہ ان کی نسبت ہمارے شہر کے شاعر و مصنف جناب اثر انصاری نے لکھا ہے:

"اس کے علاوہ سید صاحب کا یہ کارنامہ بھی یاد رکھنے کے لائق ہے کہ انھوں نے ندوہ لکھنؤ اور دارالعلوم دیوبند کے دیرینہ باہمی اختلافات کو بھی ختم کرادیا جس سے دونوں اداروں میں دوستی کی فضا پیدا ہوئی۔"(۲)

---

(۱) روزنامہ انقلاب بمبئی ۳۰ دسمبر ۱۹۵۳ء

(۲) دیکھئے، اثر انصاری فکر و فن کے آئینے میں ص ۱۷۲ بحوالہ دبستان شبلی کے نامور انشاء پرداز (۱)

اس بات کو اگر حقیقت واقعہ مان لیا جائے، اس کے بعد ہم حقائق کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کریں، تو مجھے یقین ہے کہ اس "دوستی کی فضا پیدا" کرنے میں علامہ اعظمی کی شخصیت نمایاں طور پر ابھر کر سامنے آئے گی۔ یہ بات بالکل بدیہی ہے کہ سید صاحب اکابر دیوبند سے اس کے بعد زیادہ قریب ہوئے ہوں گے جب وہ حضرت تھانویؒ کے دست حق پرست پر بیعت ہوئے، لیکن آستانۂ تھانوی تک ان کی راہنمائی کس نے کی؟ اس کو جاننے کے لئے دور حاضر کے مستند مورخ قاضی اطہر صاحب مرحوم کی تحریر پڑھئے وہ لکھتے ہیں:

"اس سلسلہ میں حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی کے علم و تحقیق پر سید صاحب (علامہ سلیمان ندوی) کو بڑا فخر و اعتماد تھا، چنانچہ سید صاحب مرحوم کا آخر میں حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے حلقۂ ارادت میں داخل ہونا حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب ہی کے اشارے اور مشورے سے تھا۔" (۱)

مذکورہ بالا حوالوں کی روشنی میں اگر منطقی طور پر نتیجہ بر آمد کیا جائے، تو کیا یہ حقیقت منکشف نہیں ہوتی کہ دونوں اداروں کے "باہمی اختلافات" کو ختم کرانے کا سید صاحب کا جو یادگار "کارنامہ" خیال کیا جاتا ہے، اگر یہ کارنامہ سید صاحب کا بلاواسطہ مان لیا جائے تو بالواسطہ علامہ اعظمی صاحب کا بھی کارنامہ ضرور مانا جائے گا۔

بات سے بات نکلتی ہے، اور جب بات حضرت تھانوی اور سید صاحب کی آہی گئی، تو ان دونوں بزرگوں سے متعلق ایک اور اہم واقعے کا ذکر کر دینا بے موقع نہ ہوگا، اس سے قارئین کو اندازہ لگانے میں دشواری نہیں ہوگی کہ اس چھوٹی سی کٹیا میں رہنے والے کی اکابر کے نزدیک کس قدر وقعت و عظمت تھی، اور اس نے پردۂ خفا میں رہ کر خاموشی کے ساتھ کیسا کیسا اہم کام کر ڈالا۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب:

(۱) انقلاب بمبئی ۲۶ نومبر ۱۹۵۳ء

"سید صاحب کو اب حضرت تھانوی سے دلی عقیدت پیدا ہو چکی تھی"(۱)

کہ سید صاحب کی بعض تحریروں پر گرفت کر کے ان کی شخصیت پر نہایت ناروا اور نا مناسب حملے کیے گئے، اس ضمن میں کسی دہلوی صاحب کی طرف سے ایک رسالہ بھی تصنیف کیا گیا جس پر بعض علماء دیوبند کی طرف سے تقریظیں لکھی گئیں، اور سب سے بڑھ کر غضب یہ ہوا کہ حضرت تھانوی کی طرف سے بھی تقریظ لکھی گئی، یہ بلائے ناگہانی سید صاحب کے لئے کس قدر تکلیف دہ اور صبر آزما رہی ہوگی بآسانی اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اس وقت سید صاحب نے علامہ اعظمی کے پاس خط لکھ کر صورتحال سے آگاہ کیا، اور اس کی اطلاع مولانا عبد الماجد دریابادی کو ایک خط کے ذریعہ دی، ان کو لکھا:

"میں مولوی حبیب الرحمٰن صاحب (مئو) کے ذریعہ مولانا اشرف علی صاحب کو ۰۰۰ خط لکھوا رہا ہوں۔"(۲)

اس صورت حال سے علامہ اعظمی بھی بلاشبہ بہت رنجیدہ اور غمگین ہوئے ہوں گے، اور انھوں نے خط لکھ کر:

"حضرت (تھانوی) کو ایک بڑے معقول پیرایہ میں توجہ دلائی۔"(۳)

حضرت تھانویؒ نے علامہ اعظمی کے پاس جواباً ایک طویل اور مفصل خط لکھا جس کو آپ نے سید صاحب کی طرف روانہ کر دیا، حضرت تھانوی کا یہ خط "مکتوبات سلیمانی ۲/۵۰" پر شائع ہو چکا ہے، اس میں حضرت تھانویؒ نے اپنے طرز عمل پر تاسف اور ندامت کا اظہار کر کے اظہار معذرت کی ہے۔ اور اس طرح ایک اٹھتا ہوا غبار علامہ اعظمیؒ کی وساطت سے دب گیا۔

---

(۱) مکتوبات سلیمانی ۲: ۴۹

(۲) ایضاً

(۳) ایضاً

رواداری آپ کی شخصیت بڑی پہلودار تھی، تصلب فی الدین اور حمایت حق کے باب میں جس طرح آتش بجان اور قلم بدست رہا کرتے تھے، اپنی ذات کی حد تک اسی قدر بے غرض اور بے ضرر تھے، ذاتی طور پر وہ کسی سے عناد اور دشمنی نہیں رکھتے تھے، مذہبی، مسلکی اور شرعی معاملے سے ہٹ کر وہ حد درجہ غیر متعصب اور روادار انسان تھے۔ لیکن اس رواداری کی وجہ سے دین وشریعت اور مذہب و مسلک کو کوئی زد پہنچے، یہ بات ان کے لئے ہرگز قابل برداشت نہیں تھی، اس وقت حق کی حمایت میں جو سب سے پہلا قلم اٹھتا تھا وہ انھیں کا ہوتا تھا۔

یہی وجہ ہے کہ آپ کے شناساؤں میں دوسرے مسلک و مذہب کے افراد بھی نظر آتے ہیں، غیر مقلدین اہل علم میں مولانا عبدالمجید حریری بنارسی تو کہہ لیجئے آپ کے حلقۂ احباب میں آتے تھے۔ شیخ ناصر الدین البانی سے آپ کا جو شدید نظری اور فقہی اختلاف ہے وہ اہل علم پر مخفی نہیں ہے، لیکن اس کے باوجود جب آپ نے دمشق کا سفر فرمایا تو ان سے ملاقات کی غرض سے خود ان کی قیام گاہ پر تشریف لے گئے۔ جہاں تک آپ سے استفادہ کرنے والوں کا تعلق ہے، تو ان میں ایک خاصی تعداد ان لوگوں کی ہے جن سے نظریاتی طور پر آپ کا اتفاق ہرگز نہیں ہو سکتا، چنانچہ مستفیدین میں جماعت اسلامی کے بعض چوٹی کے رہنما اور اہل علم نیز بعض نیم بریلوی اور غیر مقلد حضرات ہیں۔

اسی طرح اجازت وسند حاصل کرنے والوں میں بڑی تعداد ان اصحاب علم و فضل کی ہے، جو شافعی حنبلی اور مالکی مذہب سے تعلق رکھتے ہیں، جن سے زندگی بھر نہایت گہرے اور خوشگوار تعلقات رہے۔

عزم وحوصلہ اور قوت ارادی ہم جب علامہ اعظمی کی زندگی اور ان کے حالات وواقعات پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں ان کی شخصیت، ہمت وحوصلہ اور عزم وثبات کا ایک پیکر مجسم نظر آتی ہے۔ محنت ومشقت، جدوجہد اور جگر کاوی وجانفشانی ان کی سیرت و شخصیت کی نمایاں اور اہم ترین خصوصیات تھیں۔ تکاسل اور تساہل پسندی ان کی عمر طویل

کے کسی لمحے میں برائے نام بھی دیکھنے میں نہیں آتی۔ باوجودیکہ متعدد بار حالات وسانحات کے سبب یا اپنی افتاد طبع اور وارستہ مزاجی کی وجہ سے اکتاہٹ کا شکار بھی ہوئے، لیکن صبر و استقلال اور ثابت قدمی کا دامن کبھی ہاتھ سے نہیں چھوٹا، امراض واسقام بھی ان کی زندگی میں برابر ساتھ ساتھ چلتے رہے، لیکن کبھی نہ ان سے شکست کھائی نہ مغلوب ہوئے بلکہ اپنی قوت ارادی اور پامردی کی بدولت ان پر غالب ہی رہے ۔یہ ان کے اوپر خدا کا عظیم الشان انعام تھا۔

واقعات کی روشنی میں ان کی حیات کے مختلف جہات وادوار کا جائزہ لیجیے پھر دیکھیے ان کی زندگی سعی وجہد اور نشاط سے کتنی لبریز نظر آتی ہے۔ ۲۲ برس کا سن ہے، طالب علمی کا زمانہ ابھی ابھی رخصت ہوا ہے، بساط درس وتدریس کے ابھی بالکل تازہ وارد ہیں، اس وقت مدرسہ دارالعلوم مئو کی روداد شائع ہوتی ہے، اس روداد میں شعبۂ تصنیف وتالیف کے خانے میں نہایت فخر ومباہات کے انداز اور بلند بانگ الفاظ میں آپ کی ۱۲ر عدد تصانیف کے نام ذکر کیے جاتے ہیں، ان میں سے تین کتابیں عربی زبان میں ہیں، موجودہ دور کی بات چھوڑ دیجیے، جو لوگ تاریخ سے واقف ہیں اور تاریخ کا مطالعہ رکھتے ہیں، اگر تاریخ کے صفحات پر نظر دوڑائیں تو اتنی بھرپور علمی ابتدا کی شاید اتنی ہی مثالیں ان کو ملیں جو انگلیوں پر گنی جاسکیں۔

ذرا اور آگے بڑھئے! صرف ۲۹ برس کی عمر ہے۔ کہنا چاہیے کہ ریعان شباب ہے، لیکن اسی مختصر سی عمر میں آپ کے قلم سے وہ شاہکار عالم وجود میں آتا ہے جسے آپ کے اساتذہ امام العصر علامہ انور شاہ کشمیریؒ اور علامہ شبیر احمد عثمانیؒ جیسے عباقرۂ وقت اور جہابذۂ زمانہ تحسین وستائش کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، آپ کی اس تصنیف کا نام ہے "الحاوی لرجال الطحاوی"۔

گویا شروع ہی سے مختلف النوع مشاغل ومصروفیات کا ایک سلسلہ نظر آتا ہے، اس دوران آپ کی گرمیٔ نفس سے نہ جانے کتنے اور کیسے قابل ذکر کارنامے وجود اور ظہور میں

آئے، جن میں بہت سے ایسے ہیں جو تاریخ کے صفحات پر محفوظ رہ گئے، اور کچھ ایسے بھی ہیں جن تک ہماری رسائی نہیں ہوسکی، لیکن خدا کے یہاں انشاء اللہ محسوب و ماجور ہوں گے۔

آپ جب ساٹھ سال کی عمر کو پہنچتے ہیں، اس وقت آپ کی علمی زندگی کا دھارا ایک دوسری طرف مڑتا ہے، یہاں سے آپ کی تحقیقی زندگی کا وہ دور شروع ہوتا ہے جس نے انھیں عالم اسلام کا محدث کبیر تسلیم کرالیا، ہجوم اشغال کے ساتھ امراض و عوارض میں بھی ہر روز اضافہ ہوتا ہے۔ غم روزگار بھی بجائے کم ہونے کے بڑھتے ہی جاتے ہیں، لیکن ان سب کا استقلال و پامردی سے مقابلہ کرتے ہوئے مہمات سر انجام دیتے ہیں جو حدیث و سنت کی تاریخ میں آپ کے نام کو لازوال بنا دیتے ہیں۔ آپ نے تحقیق و تعلیق کے عظیم الشان کارنامے کن حالات و کیفیات میں انجام دئے، اس کی شہادت کے لئے آپ کے انتہائی مقرب اور مزاج شناس، مولانا قاضی اطہر مبارکپوری کے الفاظ پڑھئے، وہ لکھتے ہیں:

"۱۹۶۰ء میں جب کہ ان کی علمی زندگی کا دوسرا دور شروع ہوا ان کی عمر ساٹھ سال کی تھی۔ طرح طرح کے عوارض و اسقام لاحق ہو گئے تھے، قوی میں اضمحلال پیدا ہو گیا، اس دور کے اکثر خطوط میں بخار، ضعف بصارت، دوران سر اور دوسرے امراض کا ذکر کیا کرتے تھے، مگر اللہ کی شان کہ اس دور میں ان کو علم حدیث کی عظیم الشان خدمت کی توفیق ملی اور بڑھاپے میں امراض و اسقام کے ہجوم کے باوجود وہ کام کیا جو جوانی میں کرنے کا تھا وہ جو کسی نے کہا ہے۔

بڑھاپے میں جوانی سے بھی زیادہ جوش ہوتا ہے

اور کسی پر صادق آئے یا نہ آئے مولانا پر پورے طور سے صادق آتا ہے۔"(۱)

ازاول تا آخر آپ کی کتاب زندگی کا ایک ایک ورق اور ایک ایک صفحہ سعی و عمل، جد وجہد، عزم و حوصلہ اور ثبات و استقلال سے عبارت ہے، شباب و کہولیت کی باتیں تو در کنار، آپ کی جس بے نظیر مصروفیت اور حوصلہ و ہمت کا منظر راقم نے بچشم خود دیکھا ہے، اس کی بات کرتا

(۱) ترجمان الاسلام ال۔ ۱۲ ص ۴۷

ہے، پچاسی سال سے زائد عمر ہوچکی ہے، مگر اس عمر میں بھی کن کن کارناموں کی انجام دہی پر کمربستہ ہیں، ہماری جماعت کو بخاری شریف دونوں جلد اور ترمذی شریف کے درس کے علاوہ ابتدائی جماعت کے بچوں کو بھی ایک آدھ سبق پڑھا رہے ہیں، اور اس فریضۂ تدریس کے علاوہ علمی مہمات میں مصنف ابن ابی شیبہ کی تحقیق کا کام زوروں پر ہے، المطالب العالیہ کے مسندہ نسخے کو اپنی زیر نگرانی نقل کرا رہے ہیں، حیاۃ الصحابہ پر نظر ثانی فرما رہے ہیں، ہند و بیرون ہند کے متوسلین اور اہل علم کی طرف سے آنے والے خطوط و رسائل کے جوابات بھی صادر فرما رہے ہیں، اور اسی میں عوام سے ملاقات اور تعویذ و دعا کے لئے بھی وقت نکالتے ہیں، اور صرف یہی نہیں اس ہماہمی کے عالم میں جب مصر پہنچتے ہیں تو وہاں کے بعض علمی اور تحقیقی اداروں سے طبقات ابن سعد کی تحقیق کی خواہش ظاہر فرماتے ہیں۔

تربیت اور مردم سازی کی فکر: علامہ اعظمی کی نسبت کچھ لوگوں کا یہ گمان ہے کہ ان کو اوروں کی شخصیت سازی کی کم فکر ہوتی تھی، یہ بات سرتاسر خلاف واقعہ اور ناواقفیت کا نتیجہ ہے، حقیقت یہ ہے کہ وہ تعلیم و تربیت کے باب میں ہمہ وقت متفکر اور مضطرب رہا کرتے تھے۔ اہل و عیال اور تلامذہ کی فکر تو در کنار، عام طور پر مدارس کا گرتا ہوا علمی معیار، اساتذہ کے اندر بحث و تحقیق کا فقدان اور طلبائے مدارس کی بے شوقی و بد ذوقی آپ کو رنجیدہ خاطر کئے رہتی، اور وقتاً فوقتاً اپنی حسرت و افسوس کا اظہار خطوط و خطبات میں کرتے رہتے، مفتی ظفیر صاحب کو لکھے گئے متعدد خطوط میں یہ حسرت صاف طور سے پڑھی جا سکتی ہے، ۲۱ر فروری ۱۹۴۷ء مطابق ۲۸ر ربیع الثانی ۱۳۶۶ھ کے ایک مکتوب میں فرماتے ہیں:

"... مجھے تو ایسا نظر آتا ہے کہ علم کی روشنی ہندوستان میں برابر کم ہوتی جا رہی ہے، مدرسہ کی تعداد بڑھ رہی ہے اور علم کم ہوتا جا رہا ہے علماء کو بھی احیاء علم کا خیال نہیں ہے، ایسے افراد شاذ و نادر دیکھنے میں آتے ہیں جن کو علمی ترقی کا خیال ہو،

بڑے سے بڑے مدرسہ میں بھی غوغا کے سوا کچھ نہیں ہے، اللہ تعالیٰ رحم فرمائے۔"(۱)

اس فکر میں طلبہ اور اہل علم کی علمی ترقی اور تحقیقی ذوق کی تخلیق، اور نشو و نما کی آرزو اور دعا کرتے اور خود سے جو کچھ بن پڑتا اس سے دریغ نہ کرتے، اور اگر کوئی ذرا بھی جد وجہد اور کوشش و کاوش کا مظاہرہ کرتا، تو نہ صرف یہ کہ اس سے خوش ہوتے، بلکہ اس کی ہمت بندھاتے اور حوصلہ افزائی فرماتے، شاگرد رشید مفتی ظفیر الدین صاحب کو ۱۳ر صفر ۱۳۷۱ھ مطابق ۱۴ر نومبر ۱۹۵۱ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں:

"میرے خیال میں آج کل ایسے مضامین کی سخت ضرورت ہے جس سے عربی خواں طلبہ میں دینی جوش اور علم و تحقیق کا ولولہ پیدا ہو، کچھ نہیں تو عربی زبان میں مہارت اور اس پر قدرت حاصل کرنے کا جذبہ ابھرے۔ غور سے دیکھو کہ ہمارے مدارس کی "پیداوار" اب کیا، اور کتنی رہ گئی ہے۔"(۲)

اپنے شاگردوں اور خوردوں کے علمی و تحقیقی کام سے کس قدر خوش ہوتے اور کس طرح ان کی ہمت افزائی فرما کر آگے بڑھنے پر اکساتے، اس کی مثال مفتی ظفیر ہی صاحب کو لکھے گئے ایک اور خط میں پڑھیے، یکم محرم ۱۳۷۱ھ مطابق ۱۳ر اکتوبر ۱۹۵۱ء کو لکھا ہے:

"... دار العلوم میں تمہارا مضمون پڑھا، جی خوش ہوا۔ زیادہ خوشی کی بات یہ ہے کہ کچھ نہ کچھ کرتے رہتے ہو۔ کام میں لگے رہنا انشاء اللہ رائیگاں نہیں جائے گا۔"(۳)

اس سے پہلے ۲۸ر جنوری ۱۹۴۶ء مطابق ۲۳ر محرم ۱۳۶۵ھ کو اپنے ان ہی شاگرد کو لکھا ہے:

---

(۱) مشاہیر علماء ہند کے علمی مراسلے ص ۱۵۰

(۲) ایضاً ص ۱۶۲

(۳) ایضاً ص ۶۲

"یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ تم یکسوئی کے ساتھ اپنا کام کر رہے ہو محنت کا یہی وقت ہے اور اس وقت کی محنت بہت کام آئے گی..."(۱)

صرف اسی پر بس نہیں، اپنے تلامذہ و متوسلین کو طلبہ و شاگردوں کے اندر علم و عمل کا جذبہ اور شوق پیدا کرنے اور اخلاص کی تلقین کی ترغیب و تحریک دلاتے رہتے، مولانا ظفیر صاحب ہی کو لکھتے ہیں:

"... محنت سے مطالعہ کر کے پڑھاؤ اور مولانا کے کتب خانہ سے فائدہ اٹھاؤ، طلبہ میں سچی مذہبیت اور دینداری کا جذبہ پیدا کراؤ، خود بھی استقلال اور اخلاص سے کام کرو۔ آج عالم اور مولوی کہلانے والے بہت ہیں، مگر صحیح معنوں میں عالم عنقا ہو رہے ہیں..."(۲)

یہ اقتباسات پڑھتے پڑھتے ناظرین شاید اکتا گئے ہوں، یہ چند مثالیں میں نے بطور "مشتے نمونہ از خروارے" ذکر کر دئے ہیں، مقصود اس سے احصاء واستقصاء نہیں ہے۔ مفتی ظفیر الدین صاحب کو آپ نے جو خطوط لکھے ہیں ان کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ تلامذہ و طلبہ پر آپ کی عنایت و توجہ اس درجہ ہوتی تھی کہ ان کی وکالت میں بسا اوقات اراکین وانتظامیہ سے شکر رنجی تک پیدا ہو جاتی تھی، اس میں ان کی صرف یہ خواہش و آرزو ہوتی تھی کہ جو ہونہار اور با استعداد طالب علم ہیں اور علم و تحقیق کا شوق اور ولولہ رکھتے ہیں ان کو کام کرنے کے مواقع میسر ہو جائیں۔

لوگوں کو کام کا بنانے اور کام کی لیاقت رکھنے والوں کو کام پر لگانے کی آرزو آپ کے اندر انتہا کو پہنچی ہوئی تھی، بار بار اس کی طرف لوگوں کو توجہ دلاتے، شوق و ولولہ پیدا کرتے، یہ سودا آپ کے سر میں اس شدت سے سمایا ہوا تھا کہ ایک زمانے میں کسی علمی مجلس کے قیام نے آپ کو بہت دنوں تک فکر میں مبتلا رکھا، قاضی اطہر صاحب مرحوم کو،

(۱) مشاہیر علماء ہند کے علمی مراسلے ص ۱۴۸

(۲) ایضا

ان کے بمبئی قیام کے زمانے میں، آپ نے جو خطوط لکھے ہیں ان میں سے بہتوں میں اس کا تذکرہ بہت شدومد کے ساتھ پایا جاتا ہے، مثال کے طور پر ۲۳؍ جون ۱۹۵۹ کو لکھتے ہیں:

"تیسری بات یہ ہے کہ میں ابھی تک یہ "ہوس" رکھتا ہوں کہ کوئی علمی کام ضرور ہونا چاہئے، مالیگاؤں کا تجربہ تو ہو چکا، اب کوئی دوسری صورت سوچئے اور برابر خیال میں رہئے، مایوس ہو کر بیٹھ نہ جانا چاہئے، میرے پیش نظر اپنا کوئی ذاتی مفاد نہیں، بس کام کا شوق ہے اور یہ خواہش کہ کچھ لوگ کام میں لگ جائیں۔

مالیگاؤں میں کام شروع ہوا ہوتا تو مولوی حبیب الرحمٰن خیر آبادی سے کچھ کام لیا جاتا جو رفتہ رفتہ کام کے لائق ہو جاتے۔"

رویت ہلال کی تصدیق علامہ اعظمی کی بے نظیر انفرادیت

علامہ اعظمی کی کتاب زندگی عجیب و غریب اور بے مثال کارناموں سے بھری پڑی ہے، ان کے سر پر علم و فضل کے ایک سے بڑھ کر ایک تاج رکھے گئے۔ ان کی استغنائیت، عزلت پسندی اور گوشہ نشینی کے باوجود ان کی ذات بندگان خدا کی توجہات کا مرکز بنی رہی، زندگی کے کسی بھی حصے میں انھوں نے مرجعیت کی خواہش نہیں کی، مگر اس کے باوجود پوری عمر مرجع خلائق بنے رہے، اور کچھ عجب نہیں کہ یہ بے پناہ افضال و انعام اسی استغنائیت اور بے نیازی کے صدقے میں عطا ہوا ہو۔ اللہ نے اپنے بندوں کے دلوں میں ان کی ایسی محبت و عقیدت بسا دی تھی کہ جیتے جی دینی امور میں اگر کسی پر اعتماد تھا تو بس علامہ اعظمی کی ذات پر۔

میری یہ بات کسی مبالغہ آرائی یا رنگ آمیزی پر محمول نہ کی جائے۔ عوام کے نزدیک ان کی مقبولیت کا اندازہ صرف ایک رویت ہلال کے مسئلے سے لگایا جا سکتا ہے، وہ جب تک حیات رہے انھیں کی ذات کا نام رویت ہلال کمیٹی تھا، کیونکہ برسہا برس تک رویت ہلال کی تصدیق کا کام انھوں نے تنہا انجام دیا، شعبان و رمضان یا عید کے موقع پر اگر عام رویت نہیں ہوئی اور کہیں ایک آدھ آدمی نے چاند دیکھ لیا تو اس کا مرکز توجہ سیدھے علامہ اعظمی کی ذات ہوتی، باوجودیکہ یہ بات عیاں را چہ بیاں کے درجہ میں ہے، پھر بھی

میں تائید کے لئے مولانا نظام الدین اسیر ادروی کے حسب ذیل قول کو پیش کرتا ہوں:

"رویت ہلال کا مسئلہ اس علاقہ میں بڑی اہمیت اختیار کر چکا تھا، رمضان اور عید کے موقعہ پر اگر عام رویت نہیں ہوئی تو ضلع اعظم گڈھ، ضلع مئو اور ضلع غازیپور سے آنے والوں کا اژدحام مولانا موصوف کی رہائشگاہ پر ہو جاتا اور یہ مجمع اتنا بڑھ جاتا کہ لوگوں کو اس اژدحام کو سنبھالنے کے لئے بڑی دقتیں اٹھانی پڑتی تھیں، یہ اژدحام بلاوجہ نہیں تھا، رویت ہلال کے مسئلہ میں مولانا موصوف کا فیصلہ ہی ان اضلاع میں قابل قبول تھا، کسی دوسرے کی بات سننا بھی گوارا نہیں تھا۔ مولانا موصوف کے علم و فضل، زہد و تقوی اور فقہی بصیرت پر اعتماد کا یہ حال تھا کہ دوسرے مکتبۂ فکر کے اہل علم بھی مولانا ہی کے فیصلے کے منتظر رہتے تھے، اور جب آپ فیصلہ فرمادیتے تو اس کو بخوشی تسلیم کرتے اور اسی کے مطابق عمل کرتے تھے، جس آبادی میں چند لوگوں نے چاند دیکھا ہے تو وہاں کے اہل علم ان کو لے کر سیدھے حضرت مولانا کی قیامگاہ پر آجاتے، اسی طرح اطراف و جوانب میں جہاں بھی رویت کا ثبوت ملتا ان شاہدوں کو حضرت کے سامنے پیش کیا جاتا، آپ قانون شہادت کے جملہ شرائط کی روشنی میں شہادت لیتے، جرح فرماتے اور پھر فیصلہ فرماتے اور یہ فیصلہ فوراً مجمع عام میں سنادیا جاتا اور مذکورہ بالا تینوں ضلعوں میں اس فیصلہ کی خبر آناً فاناً پھیل جاتی اور اس پر عمل کیا جاتا اور اختلاف کا دروازہ بند ہو جاتا۔"(۱)

یہ علامہ اعظمی کا ایسا امتیازی شرف تھا، جس کی مثال مشکل ہی سے ملے گی، اس معاملے میں آپ سے اختلاف کرنے کا کبھی کسی کو خیال نہیں پیدا ہوا، اور ایک آدھ بار کسی نے اپنا تفوق جتانے کے لئے یا از راہ عناد اختلاف کیا بھی تو اس کا یہ اختلاف نہ عند اللہ مقبول ہوا اور نہ عند الناس مسموع۔ چنانچہ شاید دو دفعہ اس قسم کے واقعے پیش آئے کہ چند

(۱) ترجمان الاسلام ش ۱۱۔ ۱۲ ص ۱۰۔ ۹

لوگوں نے نیک نیتی یا بدنیتی سے آپ کی تحقیق کی مخالفت کرنی چاہی اور اختلاف وانشقاق کی دیوار کھڑی کی تو قدرت کا عجیب وغریب نظام کہ اگلے ہی مہینے جب چاند نظر آیا تو " من عادیٰ لی ولیا فقد آذنته بالحرب " کا کھلا کرشمہ دیکھ لیا، اور شرمندہ ہو کر ان کو اپنی اس حرکت سے تائب ہونا پڑا۔

☆☆☆

علامہ اعظمی نے فرمایا:

حضرات! تقلید اور مذاہب سلف کا تقید ہی ہے جس کی بدولت دین و مذہب مبطلین کی تحریفات سے آج تک محفوظ ہے، یہ اگر نہ ہو تو مذہب بازیچۂ اطفال بن جائے، آج جس قدر جہل مرکب کا شیوع ہے ظاہر ہے، کون نہیں جانتا کہ آج مشکوٰۃ کا ترجمہ کرنے والا اپنے کو مجتہد وقت سمجھتا ہے، ہر حرف شناس اپنے کو علامہ خیال کرتا ہے اور ہر خرنا شخص اپنے کو عیسیٰ قرار دیتا ہے، ایسی حالت میں ہر مولوی یا عالم کو اجتہاد کا حق دیدیا جائے اور تقلید ائمہ واتباع سلف کی پابندی اٹھالی جائے تو ان کے مجتہدات دین ومذہب کے مسائل وفتاویٰ ہوں گے یا جہل وغوایت کے کرشمے؟

المآثر ج۶ ش ۲ ص ۳ و ۱۲

ہوں صابر مسکین و ولی کا میں جگر بند
دعویٰ نہیں ہوں شمس و قمر کا بیٹا
کیا ناز کروں اپنے فن پر اخترؔ
فائق تھا کہیں مجھ سے حجر کا بیٹا

xxxxxxxxx

آٹھواں باب

علامہ اعظمی اور تصوف
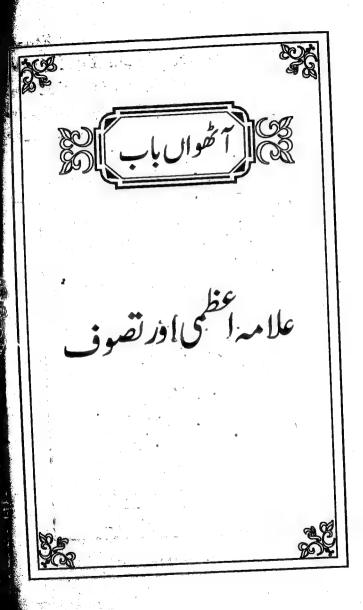
آٹھواں باب

علامہ اعظمی اور تصوف

فہم وفراست، فکر ونظر، تفکر وتدبر اور عقل ودانش کے اعتبار سے وہ اپنے وقت کی نادر الوجود اور یگانۂ روزگار شخصیتوں میں سے ایک تھے، جس کی شہادت ان کے معاصرین اور اکابر نے دی ہے ، اہم امور میں مشورہ کے لئے، پیچیدہ معلاملات میں رائے معلوم کرنے کے لئے، پر پیچ اور لاینحل گتھیوں کی عقدہ کشائی کے لئے اہل علم اور ارباب بصیرت آپ کی طرف رجوع کیا کرتے تھے، اس کی کچھ مثالیں اوپر کے صفحات میں گذر چکی ہیں۔

لیکن دل کی دنیا ایک الگ دنیا ہوتی ہے، اس کے جلوے اور کرشمے عالم عقل وخرد سے مختلف اور جداگانہ ہوتے ہیں۔ اس کی حقیقت وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو احسان و سلوک کے رہرو اور سر طریقت کے رازداں ہوں، امام غزالی سے لے کر مولانا عبد الماجد دریابادی تک جب بھی کسی پر عقل وخرد کا غلبہ ہوا ہے، تو اسے خود کو سنبھالنے، تہافت سے بچانے اور تکمیل ذات کے لئے معرفت وسلوک کا سہارا لینا پڑا ہے:

فلسفی سر حقیقت نتوانست کشود گشت رازے دگر آں راز کہ افشامی کرد

علامہ اعظمی نے نوعمری سے ہی شریعت وطریقت دونوں کو لازم وملزوم سمجھا، انھوں نے اپنی ذات سے کبھی ایک کو دوسرے سے جدا نہیں ہونے دیا، تکمیل ذات کیلئے ان کے نزدیک یہ دونوں ہی چیزیں جزو لازم کی حیثیت رکھتی تھیں، یہی اعتقاد و اذعان انھیں زمانہ طالب علمی میں دیوبند کے مرکز علم سے تھانہ بھون کے منبع عرفان کو لے گیا تھا، جہاں چند دنوں میں وہ اس نعمت کبریٰ سے سرفراز ہوئے تھے، جو انسان کو ایک مدت کی ریاضت کے بعد حاصل ہوتی ہے۔

تھانہ بھون حاضری اور حضرت تھانوی سے بیعت

علامہ اعظمیؒ کے والد ماجد مولانا محمد صابر رحمۃ اللہ علیہ کے تذکرہ میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ حکیم الامت حضرت تھانویؒ سے بیعت تھے، اور یہ کہ حضرت تھانوی کی نگاہ میں آپ کی کس قدر عزت اور قدر و منزلت تھی، کہ جب آپ کا ہدیہ خدمت والا میں پہنچا تو فرمایا کہ یہ ہدیہ نہیں تبرک ہے، اور یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ گھر کے ماحول پر طہارت و تقویٰ، دینداری اور راستبازی کا رنگ کس طرح غالب تھا، لہٰذا عجب نہیں کہ حضرت تھانویؒ کی محبت و عقیدت سے آپ کے دل و دماغ بچپن ہی سے معمور و معطر رہے ہوں، والد محترم کی زبان سے جب کبھی ان کے شیخ کا نام عقید تمندانہ انداز سے سنا ہوگا تو لوح دل پر عظمت کے نقوش ضرور مرتسم ہوئے ہوں گے، دیوبند جانے کے بعد تھانہ بھون حاضری کے لئے کسی موقع کے انتظار میں رہے ہوں گے، اور جیسے ہی عید الاضحی کی تعطیل ہوئی، فرصت کو مغتنم سمجھا اور آستانۂ تھانوی کا قصد کیا، گئے تو محض زیارت و ملاقات کے لئے تھے، لیکن قسمت یاوری کر رہی تھی اور سعادت ہمرکاب تھی، وہاں پہونچ کر کس نعمت سے سرفراز ہوئے اس کے لئے خود آپ کا بیان پڑھئے، تذکرۂ مصلح الامت کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

"وہ میری زندگی کے نہایت مسعود و مبارک لمحات ہیں، جو خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون میں گذرے، مجھے حاضری کی سعادت پہلی بار اس وقت حاصل ہوئی جب دارالعلوم دیوبند میں طالب علمانہ زندگی بسر کر رہا تھا۔ ۱۳۴۳ھ میں غالباً ذی الحجہ کی تعطیل میں حضرت تھانوی قدس سرہ کی زیارت کے مقصد سے حاضری ہوئی تھی، مگر خوش قسمتی سے بیعت کا شرف بھی حاصل ہو گیا، پہلے سے جانے پہچانے متوسلین میں اس وقت مولانا فتح پوری صاحب سوانح اور خواجہ صاحب (مجذوب تخلص) خانقاہ میں موجود تھے۔ مولانا فتح پوری حضرت اقدس کی نشست گاہ کے پیچھے ایک تنگ حجرہ میں سامنے ذرا داہنے کو ہٹ کر بیٹھنے پر مامور تھے اور وہیں حضرت کے ملفوظات قلمبند کرتے تھے، مولانا فتح پوری کو کئی دن

تک دیکھنے اور وقتاً فوقتاً اپنی قیامگاہ پر آنے جانے، ملنے اور بات کرنے کا موقع ملا۔ عصر کے بعد خانقاہ کے دروازے پر ایک چائے خانہ میں چائے پینے اور گفتگو کی بھی نوبت آئی۔ جس شب میں بعد نماز مغرب شرف بیعت سے مشرف ہوا تھا، اس کے بعد والے دن میں غالباً بعد عصر حضرت مولانا فتح پوری نے خواجہ صاحب سے فرمایا کہ خواجہ صاحب! مولوی حبیب الرحمٰن صاحب سے مٹھائی وصول کرنی چاہئے، ان کو حضرت نے زمانۂ طالب علمی میں بیعت کرلیا، حالانکہ حضرت ایسا نہیں کیا کرتے، یہ ان کی خصوصیت ہے۔"(۱)

بیعت کے بعد آستانہ تھانوی سے تعلق آستانہ تھانوی سے تعلق برابر بڑھتا رہا، چنانچہ ۱۳۳۹ھ میں جب حصول علم کے لئے آپ دوبارہ دیوبند تشریف لے گئے، تو عید اضحی کی چھٹی میں ایک بار پھر تھانہ بھون حاضر ہوئے، ۶/ ذی الحجہ ۱۳۳۹ھ مطابق اگست ۱۹۲۱ء کو اپنے ایک ہم درس مولانا عبدالمجید مئوی کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

"آج شام کی ٹرین سے تھانہ بھون حضرت مولانا اشرف علی صاحب سے ملنے جارہا ہوں، وہاں سے شاید دہلی جاؤں، کل جمعہ سے اس جمعہ تک تعطیل ہے۔۔۔"

فراغت کے بعد ہی چونکہ درس و تدریس میں مشغول ہو گئے تھے، اس لئے بھی اور بعض دوسرے موانع کی وجہ سے بھی کثرت کے ساتھ تھانہ بھون کا سفر نہیں کر سکتے تھے، مگر اس کے باوجود فرصت کی تلاش میں رہتے اور جب کبھی موقع ملتا حضرت تھانوی کی زیارت و ملاقات اور استفاضہ کے لئے سفر کی زحمت اٹھاتے، حضرت تھانویؒ کی خدمت میں لکھے ہوئے علامہ اعظمی کے جو خطوط ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ تھانہ بھون کے علاوہ آپ کی مجالس میں شرکت کے لئے لکھنؤ کا سفر بھی فرمایا، مگر سفر کی فرصت چونکہ کم نصیب ہوتی تھی اس لئے گاہے ماہے خط لکھ کر اپنی حالت و کیفیت کی اطلاع دیتے اور

(۱) مقدمہ تذکرۂ مصلح الامت

روحانی معالج سے اپنے حسب حال نسخۂ علاج طلب کرتے رہتے، چنانچہ حضرت تھانویؒ کی خدمت میں لکھے ہوئے بیسیوں خطوط اس وقت ہمارے سامنے موجود ہیں، جن میں سے دو تین خط ذیل میں ذکر کئے جارہے ہیں، اس سلسلہ میں ایک بات اور عرض کردینا ضروری ہے کہ حضرت تھانویؒ کا طریقہ مسلوکہ یہ تھا کہ متوسلین ان کی خدمت میں خط لکھتے تو حضرت حسب ضرورت اور بقدر حاجت ان خطوط ہی کے بین السطور میں اپنے ملاحظات یا ہدایات تحریر فرمادیا کرتے، اور آپ کی یہی تحریریں ان خطوط کا جواب ہوتیں، ہم ذیل کے متن میں علامہ اعظمی کے خطوط اور ان پر حضرت تھانویؒ کے جو ملاحظات ہیں ان کو ترتیب وار حاشیہ میں نقل کریں گے، پہلا خط ۱۳۵۷ھ کا لکھؤ میں حضرت تھانوی کی ملاقات اور آپ کی مجالس میں شرکت کے بعد کا ہے، اس میں فرماتے ہیں:

"مخدوم ومطاع ما حضرت حکیم الامت دامت برکاتھم!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔(۱)

حضرت والا کے کانپور تشریف لے جانے کے بعد ناچیز وطن لوٹ آیا، جمعہ کو بعد عصر مجلس شریف میں حاضر ہونے کے باوجود کوئی موقع نہ پاسکا کہ حضرت سے مل کر رخصت ہولوں، اور سنیچر کو امین آباد آیا تو معلوم ہوا کہ حضرت والا کانپور روانہ ہوگئے، بے ملے چلے آنے کا رنج ہے(۲)۔

جب سے مکان پر آیا کسی ذریعہ سے حضرت والا کا حال معلوم نہیں ہوا، خیریت مزاج مبارک کی نسبت دو کلمے تحریر فرماکر رفع تشویش فرمائیں گے۔(۳)

حضرت والا! میں اپنی بدقسمتی پر جتنا روؤں کم ہے، حضور سے اتنا دور ہوں کہ برس دو برس میں چند قلیل ایام صحبت کے نصیب ہوتے ہیں، ملازمت کی مشغولی، نیز اخراجات کی کثرت اور آمدنی کی قلت سے مجبور رہتی ہے، ورنہ

---

(۱) السلام علیکم (۲) رنج کی کیا بات ہے جب باطنا ہر وقت ملنا میسر ہے۔
(۳) بالکل صحت حاصل ہے، قدرے ضعف باقی ہے، اب وطن آگیا ہوں۔

سال میں کئی بار حاضر ہوتا، دل بہت چاہتا ہے مگر مجبور ہوں، حضور دعا فرمائیں کہ صحبت کا زیادہ موقع نصیب ہونے لگے۔(۱)

تجربہ سے یہ معلوم ہوا کہ بغیر صحبت کے کوئی کام بآسانی نہ ہوگا، جب تک صحبت میں رہتا ہوں، ہر چیز کا اہتمام اور ہر چیز کی طرف توجہ رہتی ہے، لیکن جب یہاں پہونچ کر دوسرے مشاغل میں پھنس جاتا ہوں تو غفلت چھا جاتی ہے، حضور سے دوام توجہ واہتمام کے لئے دعا اور علاج کا خواستگار ہوں۔(۲)

والد صاحب سلام مسنون عرض کرتے ہیں۔(۳)

خادم حقیر

محمد حبیب الرحمٰن مدرس مفتاح العلوم مئو۔اعظم گڈھ"

ایک اور مکتوب جسے غالباً اس جوابی مکتوب کی وصولیابی کے بعد تحریر فرمایا تھا پیش خدمت ہے، اس کی تاریخ تحریر ۵؍رمضان المبارک ۱۳۵۷ھ ہے۔

"سیدی! ادام اللہ ظلکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔(۴)

حصول صحت کی اطلاع پاکر بڑی مسرت ہوئی(۵) خداوند تعالیٰ آپ کا سایہ بہت دنوں تک باقی رکھے، نیز حضرت والا کے کلمات تسلی سے بالکل تشفی ہوگئی۔(۶)

مواعظ شریفہ کا مطالعہ کرتا ہوں، اور کچھ شبہہ نہیں کی صحبت حسی کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔

---

(۱) سب سے اول کا معروض قابل ملاحظہ ہے۔

(۲) دعا سے حاضر ہوں، باقی صحبت حسیہ ہے سو اس کا بدل مطالعہ ہے مواعظ کا۔

(۳) میری طرف سے بھی سلام کہئے۔

(۴) السلام علیکم (۵) آپ کی محبت ہے۔

(۶) هنيئاً لكم.

نوافل واوراد کی طرف طبیعت کو بہت متوجہ کرتا ہوں مگر کتب بینی کے مقابلہ میں ادھر توجہ نہیں ہوتی، جو کچھ ہوتا ہے تھوڑی دیر بجبر وقہر ہوتا ہے(۱) یا ایسے وقت میں ہوتا ہے جس میں کسی وجہ سے کتب بینی نہیں ہو سکتی۔ یہ اہتمام مطلوب ہے یا نہیں اور مطلوب ہے تو اس کی تدبیر کیا ہے (۲) بعض اوقات مطالعہ میں اتنا انہاک ہوتا ہے کہ مسجد دیر میں پہونچتا ہوں، اور لوگوں کو منتظر پاکر نادم و متاسف ہوتا ہوں کہ ان لوگوں کو میری وجہ سے تکلیف ہوئی۔ (۳)

لکھنؤ میں حضرت والا نے حکیم اجمیری صاحب مقیم بمبئی کا ذکر کرتے ہوئے اس بات کی بڑی تعریف فرمائی تھی کہ انھوں نے اپنے والد کی زندگی میں جو کچھ کمایا سب اپنے والد کے حوالہ کیا وغیرہ وغیرہ۔ الحمد للہ و بنعمتہ تتم الصالحات کہ اب تک ناچیز کا بھی یہی دستور ہے، ۴۵ ماہوار پاتا ہوں اور کل والد کے حوالہ کر دیتا ہوں، پھر اگر ایک پیسہ کی بھی ضرورت ہوتی ہے تو ان سے مانگ کر ضرورت پوری کرتا ہوں، اور ان کے استرضاء کیلئے اتنا اہتمام کرتا ہوں کہ بعض اوقات یہ جانتے ہوئے کہ مشورہ نہ دینے میں نقصان ہے مشورہ نہیں دیتا اس لئے کہ میرا مشورہ ان کے رجحان کے خلاف ہوتا ہے جس کو وہ بطیب خاطر نہیں مان سکتے، بعض دفعہ ان کی رائے پر عمل کرنے سے میری سبکی بھی ہوتی ہے تاہم ان کے خلاف نہیں چلتا۔ (۴) تحدثاً بالنعمۃ یہ بات ذکر کر دی، اور اس لئے بھی کہ شاید اس سلسلہ میں حضرت والا کوئی افادہ فرمائیں (۵)۔ والسلام، والد صاحب سلام مسنون عرض کرتے ہیں۔ (۶)

حبیب الرحمٰن۔ مئو ضلع اعظم گڈھ

۵ رمضان المبارک ۷۵ھ"

---

(۱) جبر وقہر ہی سے کام کیا جائے (۲) اختیاری کی تدبیر استعمال اختیار

(۳) گھڑی سامنے رکھنا چاہئے

(۴) زادکم اللہ البر بالوالدین

(۵) دعا کرتا ہوں (۶) میری طرف سے بھی سلام

مذکورہ بالا دونوں مکتوب بطور نمونہ میں نے نقل کر دیئے ہیں، تاکہ ان سے سلامت طبع اور استواریٔ مزاج کا اندازہ لگایا جا سکے، ان کے علاوہ اور جتنے بھی خطوط ہیں سب تربیت و تزکیہ کے امور پر مشتمل ہیں، جن میں علامہ اعظمی نے حضرت تھانوی سے اپنے روحانی امراض کا علاج دریافت فرمایا ہے، طوالت کا خوف اگر مانع نہیں ہوتا تو ان سب کو نقل کرنے کی سعادت حاصل کرتا، لیکن ان صفحات کے اندر زیادہ کے تحمل کی گنجائش نہیں ہے، اس لئے ان ہی دو پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ البتہ ۱۱ر محرم ۱۳۵۸ھ کو لکھے گئے ایک مکتوب کا ٹکڑا اور اس کے جواب کے بعد کی حالت کا ذکر کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے علامہ اعظمی لکھتے ہیں:

"اس سے پہلے مواعظ کا مطالعہ اور کسی قدر ذکر بھی ہوتا تھا، مگر آج کل مدرسہ میں چھ گھنٹے کام کرنے کے بعد بہت تھوڑا وقت دن میں کام کرنے کے لئے بچتا ہے، اور رات کو مطالعہ و کتب بینی سے کم فرصت ملتی ہے، اس لئے ذکر وغیرہ بھی چھوٹ گیا ہے(۱)

کچھ دنوں سے موت کا اکثر اوقات تصور و خیال رہتا ہے، اور سکرات و قبر کے تصور سے بعض اوقات نہایت گھبراہٹ ہوتی ہے، ایک دن سونے کے وقت یہ تصور اتنا قوی ہو گیا کہ کسی طرح نیند نہیں آتی تھی، اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بدن سے جان نکل رہی ہے، لالٹین بجھا کر سونے کی کوشش کی تو معلوم ہوتا تھا کہ قبر میں پڑا ہوں، اس لئے پھر لالٹین جلائی، نزع کی تکلیف اور قبر کی تنہائی سے بہت زیادہ گھبراتا ہوں، اس باب میں حضور والا کے ارشاد کا محتاج ہوں، جو ارشاد ہو اس کے مطابق کروں۔"(۲)

---

(۱) وہ بھی طاعت ہے اور وقت کی ضرورت، لہٰذا اوراد کی کمی مضر نہیں۔

(۲) منشا اس کا خشیت حق ہے اس لئے مبارک حالت ہے، البتہ اس کی تعدیل کے لئے مراقبۂ صحت و تقویت رجاء ضروری ہے اس کے بعد بھی اگر پریشانی ہو، طبی و طبعی مرض ہے، جس کے لئے طبیب سے رجوع کیا جاوے۔

مرشد کے ارشاد کے بعد کیفیت میں جو تغیر پیدا ہوا، اس کی نسبت ۱۸ر ذی قعدہ ۱۳۵۸ھ کے مکتوب میں لکھتے ہیں:

"پہلے ایک خط میں موت کے خوف کی وجہ سے بعض اوقات سخت پریشانی کا ذکر کیا تھا، اور حضرت والا نے اس کا علاج بتایا تھا، الحمد للہ اب وہ بات نہیں ہے، وقتاً فوقتاً شدائد موت کا تصور ہوتا ہے، لیکن پہلے جو پریشانی ہو جاتی تھی نہیں ہوتی۔"(۱)

خلافت | حضرت تھانویؒ کے وصال کے بعد ان کے خلیفہ اجل حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب فتحپوری سے نسبت ارادت قائم ہوئی، جن سے آپ کے علائق وروابط زمانۂ طالب علمی سے ہی تھے، اور پھر شاہ صاحب ہی کے دست مبارک پر خلافت واجازت سے بھی سرفراز ہوئے، شاہ وصی اللہ صاحب کے علاوہ آپ کو اجازت سید الطائفہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کے خلیفہ مولانا منیر الدین صاحب مہاجر مکی سے بھی حاصل ہوئی، ڈاکٹر عبد المعید صاحب لکھتے ہیں:

"حضرت محدث اعظمی کو اجازت بیعت و خلافت حضرت مولانا منیر الدین صاحب" مہاجر مکی خلیفہ شیخ العرب والعجم حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی کی طرف سے بواسطہ حاجی عبد الحمید صاحب اورنگ آباد مئو (جبکہ وہ حج کو تشریف لے گئے تھے) حاصل ہے"(۲)

جہاں تک علامہ اعظمی کے خلفاء کا تعلق ہے، تو ہماری معلومات کے مطابق آپ نے تین حضرات کو اجازت وخلافت عطا فرمائی تھی، ایک مولانا غلام رسول صاحب مہاجر مکی، جو پہلے شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا صاحب سے بیعت تھے، بعد میں علامہ اعظمی کے

(۱) تو ضرر کیا ہے، پریشانی تو مقصود نہیں، بلکہ ذکر موت سے مقصود صرف کف عن المعاصی ہے، اگر اس کا ملکہ ہو جاوے تو پھر اس ذکر موت ہی کی ضرورت نہیں۔

(۲) المآثر ج ۲ ش ۱ ص ۲۷

ہاتھ پر تجدید بیعت کی اور خرقۂ خلافت سے سرفراز ہوئے ،ان کے علاوہ مولانا محمد عثمان صاحب سابق مدرس معہد ملت و موسس ورئیس جامعہ الصالحات مالیگاؤں اور ڈاکٹر ریاض احمد صاحب لیکچرر طبیہ کالج منصورہ مالیگاؤں بھی اجازت و خلافت کی نعمت سے سرفراز ہوئے۔

شریعت و طریقت کا امتزاج علامہ اعظمی نے شریعت و طریقت اور ظاہر و باطن کے رشتے کو کبھی اپنی ذات سے جدا نہیں ہونے دیا، لیکن ان کے ہاں ان دونوں کے باہمی رشتے میں بھی ایک خاص توازن پایا جاتا تھا، چنانچہ ان کے نزدیک تصوف کبھی علم پر غالب نہیں آنے پایا۔ علم اور علم کے راستے سے خدمت دین ہمیشہ اولیت اور فوقیت کی حامل رہی ۔ درس و مطالعہ ان کے نزدیک ہمیشہ پہلے مقام پر رہا، جیسا کہ ۱۸ر ذی قعدہ والے خط میں حضرت تھانویؒ کو لکھتے ہیں:

> "حضرت والا! پڑھنے پڑھانے، مطالعہ اور لکھنے کی وجہ سے وظائف کی پابندی احقر سے نہیں ہوتی..."

اسی وجہ سے بیعت و خلافت اور مجلس و حلقہ سازی سے عمر کے کسی بھی حصے میں آپ کو کوئی خاص مناسبت نہیں رہی، اور یہی وجہ ہے کہ اس ناحیہ سے آپ کو کچھ خاص شہرت نہیں ہوئی، باوجودیکہ آپ کے دست مبارک پر خاصی تعداد میں لوگوں نے بیعت کی، لیکن اس راہ کے سالک کی حیثیت سے آپ زیادہ معروف نہیں ہوئے۔

علامہ اعظمی کے نزدیک تصوف وہی معتبر تھا جو مشکوٰۃ نبوت سے ماخوذ ہو، یا شریعت سے موافقت رکھتا ہو، یا کم از کم اس سے متعارض اور متصادم نہ ہو، وہ تصوف جو قرآن و سنت یا شریعت مطہرہ سے تعارض رکھتا ہو ،ان کے نزدیک قطعاً نامعتبر تھا، اور ایسی صوفیت کی دعوت و تبلیغ کرنے والے ان کی نگاہ میں قطعاً ناقابل التفات تھے، یہی وجہ ہے کہ آپ کی بارگاہ میں شطحیات وغیرہ کا بالکل گذر نہیں ہوتا تھا۔

آپ کے یہاں تصوف ذوقی کے ساتھ ساتھ کتابی بھی تھا، اس فن کی کتابوں کا آپ نے وسیع مطالعہ کیا تھا، اور ایک علم اور فن کی حیثیت سے آپ نے تصوف کی کتابوں

کی خوب شناوری کی تھی ، چنانچہ آپ کے ذاتی کتب خانے میں تصوف اور تزکیہ و تربیت نفس سے متعلق عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں خاصی تعداد میں کتابیں موجود ہیں۔

تصوف کی نسبت سے آپ نے دو حصوں میں ایک چھوٹی سی کتاب "اہل دل کی دلآویز باتیں" بھی تصنیف فرمائی ہے۔ جو صوفیہ اور بزرگوں کے دلچسپ واقعات پر مشتمل ہے، یہ کتاب "بقامت کہتر بقیمت بہتر" کا نمونہ ہے،اس کی نسبت حضرت تھانویؒ نے فرمایا تھا:

> "رسالہ کی زیارت سے دل خوش ہوا، اللہ تعالیٰ طالبین علم و عمل کے لئے نافع فرمائے، و سیفعل ان شاء اللہ تعالیٰ۔ طالب علموں اور مبتدیان طریق کے لئے بہتر ہے۔"(۱)

علامہ اعظمی نے فرمایا:

عبادت اور نیکی وہی ہے جو رسول اللہ ﷺ کے حکم کے مطابق ہو، اور جو رسول اللہ ﷺ کے حکم کے مطابق نہیں تم ہزار دفعہ اس کو نیکی کہو وہ نیکی نہیں۔

المآثر ج ۲ ش ا ص ۸۲

---

(۱) اہل دل کی دلآویز باتیں ص ۲ حصہ دوم

نواں باب

مبشرات وکرامات

نواں باب
مبشرات وکرامات
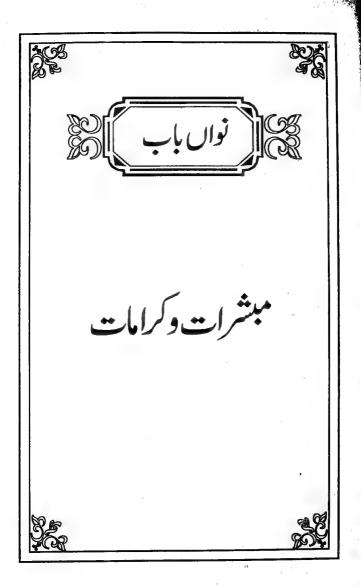
خواب کا تعلق بسااوقات آدمی کی زندگی سے بڑا گہرا ہوتا ہے، اکثر وبیشتر ہوتا یہ ہے کہ جو خیال وتصور دن کے وقت یا عالم بیداری میں انسان کے ذہن ودماغ پر غالب اور مسلط رہتا ہے، رات کے وقت یا سونے کے بعد وہی خیال مصور ہو کر دماغ کے پردے پر گردش کرتا رہتا ہے، خواب زیادہ تر اضغاث احلام کی قبیل سے ہوتے ہیں اور ان کا تعلق حقیقت وواقعہ کی دنیا سے بہت کم ہوتا ہے۔

مگر کچھ خواب ایسے بھی ہوتے ہیں جو واقعی اور سچے ہوتے ہیں، اور رائی (خواب دیکھنے والے) کے لئے یا جس کو خواب میں دیکھا گیا ہے اس کے لئے بشارت وخوشخبری رکھتے ہیں، یہ رویائے صالحہ ہوتے ہیں، جس کی نسبت حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی حجۃ اللہ البالغۃ (۲/۹۵) میں فرماتے ہیں:

"وأعنى بالرؤيا الصالحة رؤية النبى صلى الله عليه وسلم فى المنام ، أو رؤية الجنة والنار، أو رؤية الصالحين والأنبياء عليهم السلام ، أو رؤية المشاهد المتبركة كبيت الله ، أو رؤية الوقائع الآتية فتقع كما يرى ، أو الماضية على ما هى عليه ، أو رؤية ما ينبهه على تقصيره بأن يرى غضبه فى صورة كلب يعضه ، أو رؤية الانوار والطيبات من الرزق كشرب اللبن والعسل والسمن ،أورؤية الملائكة والله اعلم ."

(رویائے صالحہ سے میری مراد خواب میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھنا ہے، یا جنت وجہنم کو دیکھنا ہے، یا صالحین اور انبیاء علیہم السلام کو دیکھنا ہے، یا

مقامات متبرکہ مثلاً بیت اللہ کا دیکھنا، یا آنے والے واقعات کا دیکھنا کہ جس طرح دیکھا ہو اسی طرح وقوع پذیر ہو جائیں، یا گذرے ہوئے واقعات کو انھیں حالتوں پر دیکھنا، یا ایسی چیز کا دیکھنا جو اس کو اس کی کسی کوتاہی پر متنبہ کر سکے، جیسے اپنے غصے کو کسی کتے کی صورت میں اس کو کاٹتے ہوئے دیکھے، یا روشنی اور اچھا رزق دیکھنا مثلاً دودھ، شہد اور گھی پینا یا فرشتوں کو دیکھنا، واللہ اعلم)

حضرت شاہ صاحب اسی مقام پر لکھتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کو اس کا اس قدر اہتمام تھا کہ فجر کی نماز کے بعد خواب کی تعبیر بتانے کیلئے مجلس فرماتے اور اگر کوئی اپنا خواب بیان کرتا تو آپ اس کی تعبیر بتاتے۔

علامہ اعظمیؒ نے پوری زندگی علم و دین کی خدمت میں صرف کی، پورے اخلاص و للّٰہیت اور خاموشی کے ساتھ اس خدمت کی انجام دہی میں مصروف رہے، کوئی غلغلہ نہ ہنگامہ، مال و زر کی طلب نہ جاہ و شہرت کی خواہش، ستائش کی تمنا نہ صلہ کی پروا، بس احادیث رسول کی ترویج و اشاعت کی ایک دھن تھی، جس کے سامنے دنیا کی ہر چیز ان کے لئے ہیچ اور بے حقیقت تھی، علم و دین کی اس خدمت اور اخلاص و للّٰہیت کا اس دار العمل میں اثر یہ ظاہر ہوا اور عند اللہ مقبولیت کی علامت یہ نظر آئی، کہ خوابوں میں آپ کی مقبولیت کی بشارت دی گئی، وفات سے پہلے بھی اور وفات کے بعد بھی، مختلف لوگوں نے مختلف حالت و ہیئت میں آپ کو دیکھا، جس کی تعبیر اس کے سوا اور کیا کی جاسکتی ہے کہ آپ کا عمل بارگاہ خداوندی میں (انشاء اللہ) حسن قبول سے شرفیاب ہوا۔ ذیل میں ہم اسی قسم کے چند خوابوں اور بشارتوں کا ذکر کر رہے ہیں۔

خواب میں رسول اللہ ﷺ کی ضیافت کرنا مولانا حکیم سعد اللہ صاحب مرحوم شہر کے مشہور حکیم اور علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے شاگرد تھے(۱) ایک دفعہ انھوں نے خواب میں دیکھا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے ہوئے ہیں اور بہت سے

(۱) المآثر ج۲ ش۱ ص۵۸

لوگ آپ کی دودھ و بالائی سے ضیافت فرمارہے ہیں، لیکن ان کی ضیافت کرنے والوں میں علامہ اعظمی پیش پیش ہیں، بلکہ اس مجلس میں وہی آنحضرت ﷺ کے خادم خاص ہیں، حکیم صاحب نے اپنے خواب کی پوری تفصیل لکھ کر مصلح الامۃ مولانا شاہ وصی اللہ صاحب کے پاس بھیجی، شاہ صاحب نے اس کی تعبیر یہ لکھی:

”مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اور آپ کے لئے اور دیگر مسلمانان کے لئے دین اور علم دین حقیقی ملنے کی بشارت ہے فطوبیٰ لکم و بشریٰ لکم“

حکیم سعد اللہ صاحب کا خط اور شاہ صاحب کا اس پر جواب خود حکیم صاحب کی تحریر میں علامہ اعظمی کے کاغذات میں محفوظ ہے اور اس پر تاریخ ۲۲ ذی الحجہ ۱۳۷۷ھ مندرج ہے، اس خواب کا ذکر خود علامہ اعظمی نے بھی بطور تحدیث نعمت کے کبھی کسی موقع پر کیا تھا، چنانچہ ڈاکٹر عبدالمعید صاحب، مولانا انظر صاحب (استاذ مدرسہ مرقاۃ العلوم مئو) کے حوالہ سے اس کو ذکر کر کے لکھتے ہیں:

”حضرت محدث کبیر اس خواب کو بیان کر کے آبدیدہ ہو گئے اور فرمایا کہ خواب کی تعبیر ظاہر ہے کہ میں نے دنیا نہیں کمائی ہے اور یہ بھی فرمایا کہ اتنی عمر اس فن (حدیث شریف) میں لگانے کے بعد اتنا بھی نصیب نہ ہوتا تو میں یہ سمجھتا کہ میں نے سب کچھ گنوادیا اور کچھ نہ پایا۔“(۱)

رسول اللہ ﷺ کا خواب میں علامہ اعظمی کو سلام کہلوانا

مجھے یاد آتا ہے کہ انتقال سے تقریباً آٹھ دس سال قبل علامہ اعظمی ایک دفعہ گورکھپور تشریف لے گئے اور آنے کے بعد جمعہ کے دن نماز جمعہ کے بعد تقریر فرمائی، اور اس تقریر میں ایک بزرگ مولانا صوفی نصرت علی صاحب کا ایک خواب بیان فرمایا، کہ انھوں نے صوفی صاحب کے ساتھ ایک جگہ رات کا کھانا کھایا اور کھانے کے بعد دونوں اپنی اپنی قیامگاہ پر واپس تشریف

(۱) المآثر ج ۲ ش ۱ ص ۵۸

لے گئے، اسی رات یکایک صوفی صاحب کی طبیعت خراب ہوئی اور آناً فاناً روح پرواز کر گئی صوفی صاحب نے انتقال سے پہلے آنحضرت ﷺ کو خواب میں دیکھا، پھر اس خواب کو حاضرین سے بیان فرمایا، اس خواب کو بیان کرتے وقت علامہ اعظمی کی کیفیت کچھ ایسی ہوئی کہ ان پر گریہ طاری ہو گیا، اور دیر تک روتے رہے۔

اس دن کے خطاب میں علامہ اعظمی نے صوفی صاحب کا یہ خواب بیان فرمایا، لیکن اپنے غایت درجہ تواضع کی وجہ سے اس خواب کا ایک حصہ محذوف فرما دیا، جس کا تعلق خود ان کی اپنی ذات سے تھا، اس پورے خواب کا تذکرہ ڈاکٹر عبدالمعید صاحب نے اپنے ایک مضمون میں کیا ہے، لکھتے ہیں:

"حضرت مولانا صوفی نصرت علی صاحبؒ جو سلسلۂ تھانوی کے ایک بزرگ تھے، ٹانڈہ میں رہتے تھے ایک بار وہ اور حضرت محدث کبیرؒ گورکھپور میں تشریف رکھتے تھے، صوفی صاحبؒ کے داماد کے یہاں حضرت محدث کبیرؒ کی دعوت تھی، بعد نماز عشاء کھانے سے فارغ ہونے کے بعد دونوں بزرگ اپنی اپنی قیام گاہ پر چلے گئے، رات میں اچانک مولانا نصرت علیؒ صاحب کی طبیعت خراب ہو گئی، ڈاکٹر آئے دوا دی گئی، اسی اثناء میں آپ کو نیند آگئی، جب بیدار ہوئے تو حاضرین سے فرمایا کہ:

"ابھی میں نے خواب میں آنحضرت ﷺ کی زیارت کی ہے، حضور ﷺ نے فرمایا کہ: "حبیب الرحمٰن سے میرا سلام کہہ دیجئے اور کہہ دیجئے کہ جس کام میں لگے ہیں لگے رہیں" اس کے بعد مولانا نصرت علی صاحب نے فرمایا کہ "اگر میرا انتقال ہو جائے تو مولانا اعظمی سے کہہ دیجئے گا کہ میری نماز جنازہ پڑھا دیں گے۔"

چنانچہ اسی رات مولانا نصرت علی صاحب کا انتقال ہو گیا، صبح کو لوگ حضرت محدث کبیرؒ کے پاس آئے اور آپ سے رات کا پورا واقعہ بیان کیا، صوفی

صاحب کی آخری خواہش کے مطابق حضرت محدث کبیرؒ نے ہی آپ کی نماز جنازہ پڑھائی، اس واقعہ کے وقت مئو کے مولوی عبدالرزاق صاحب محلہ علاء الدین پورہ بھی وہاں موجود تھے۔

مندرجہ بالا واقعہ راقم السطور کا خود محدث کبیرؒ سے سنا اور تحقیق کیا ہوا ہے۔"(۱)

علامہ اعظمی ایک مشہور محدث کی مسند پر مالیگاؤں کے ایک مولوی سراج صاحب ہیں انھوں نے ایک خواب دیکھا جس کو تحریر کر کے ۸ ربیع الاول ۱۴۱۲ھ مطابق ۱۸ ستمبر ۱۹۹۱ء کو ایک خط میں لکھا:

"ہم لوگ مولانا عبدالستار صاحب (سابق شیخ الحدیث ندوۃ العلماء لکھنؤ) کے پاس بخاری شریف پڑھ رہے تھے، راویوں پر بحث کے دوران ابوالیمان حمصی کا تذکرہ آیا جو امام بخاری کے استاذ اور بڑے عالی مرتبت شخص ہیں، اسی دوران مولانا سراج صاحب نے خواب دیکھا کہ کوئی کہہ رہا ہے کہ حدثنا ابوالیمان اور مذکورہ راوی اپنے گھر کے دروازے پر نظر آنے لگے، ڈاڑھی ٹھڈی پر تھی، بھر کلہ نہیں تھی، سر کے بال آگے نہیں تھے، سر کے پچھلے حصہ میں نصف دائرہ میں تھے، جیسا کہ ذہین لوگوں کا ہوتا ہے، انھوں نے دیکھا کہ آپ تشریف فرما ہیں، معاً بعد دیکھا کہ ان کی جگہ محدث کبیر ابوالمآثر مولانا حبیب الرحمٰن صاحب الاعظمی تشریف فرما ہیں، تعبیر بتلانے والے مولوی صاحب نے کہا کہ ابوالیمان امام بخاری کے استاذ ہیں، اور فی زمانناوہی مرتبہ حضرت موصوف کا ہے، اس سے ان کی جلالت شان کا پتہ چلتا ہے۔"(۲)

(۱) المآثر ج۲ ش۱ ص۴۴

(۲) ایضاً ص۵۹-۵۸

xxxxxx

کرامات اولیاء اللہ کی کرامات برحق ہوتی ہیں، اللہ کے بعض نیک بندوں کے ذریعہ کبھی کبھی ایسے خوارق عادات امور ظاہر ہوتے ہیں، جن کا ظاہری اسباب سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، عہد صحابہ بلکہ اس سے پہلے سے لے کر آخر کے ادوار تک اس قسم کے خوارق عادات امور کی مثالیں بکثرت ملیں گی: حضرت مریم علیہا السلام کے پاس بغیر موسم کے تروتازہ میوے ان کے حجرۂ مبارکہ میں آتے رہتے تھے۔ حضرت عمر فاروقؓ کے ایک سپہ سالار حضرت ساریہؓ مدینہ سے سینکڑوں میل کے فاصلے پر اپنی فوج کے ساتھ میدان جہاد میں صف بستہ تھے، حضرت فاروقؓ کے سامنے اسکرین کی طرح پورا میدان جہاد آگیا، انھوں نے مدینہ سے یہ ہدایت دی یاساریۃ الجبل الجبل! حضرت ساریہ نے آواز سنی اور حکم کی تعمیل کی۔ حضرت خالد بن ولیدؓ زہر کا پیالہ پی گئے، مگر زہر نے اثر نہیں کیا۔ حضرت عقبہ بن عامرؓ قیروان پہنچے تو ان کے ایک حکم پر جانوروں نے پورا جنگل خالی کردیا۔ دو صحابی رسولؐ ایک تیرہ و تار رات میں ساتھ ساتھ جارہے تھے ایک کا عصا روشن ہوکر دونوں بزرگوں کے لئے اجالا بکھیر رہا تھا، ایک موڑ پر دونوں صحابیؓ ایک دوسرے سے جدا ہوئے، اب دونوں کے عصا الگ الگ روشن ہوکر مشعل راہ بن گئے۔ عہد صحابہ کے بعد تابعین، تبع تابعین اور اس کے بعد کے بزرگوں کے ہوا میں اڑنے، پانی پر چلنے، بے موسم کے رزق اور اس جیسے بہت سے واقعات کتابوں کے صفحات پر مذکور ملتے ہیں، اور ان باتوں سے صرف نظر، محدثین وفقہاء وعلماء وائمہ ہدیٰ وغیرہم نے جو زبردست علمی و دینی کارنامے انجام دیئے ہیں ان پر ہم غور کریں تو کیا وہ کسی کرامت سے کم ہیں۔

یہاں اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ نہ ہر خارق عادت امر کرامت ہوتا ہے، اور نہ ہر وہ شخص جس کے ذریعہ اس قسم کے امور ظہور پذیر ہوں ولی ہوسکتا ہے۔ اگر کسی خارق عادت امر کا تعلق نبی کی ذات سے ہو اور نبی کے ہاتھوں ظہور میں آئے تو وہ معجزہ ہوگا، اور اگر کسی ایسے آدمی کے ہاتھوں ظہور میں آئے جو اللہ کا نیک بندہ ہو، پابند شریعت ہو، خدا اور سول کا فرمانبردار ہو تو وہ اس کی کرامت ہوگی، لیکن یہی امر کوئی ایسا شخص دکھاتا ہے،

جو احکام شریعت کا پابند نہیں، خدا اور سول کا مطیع و فرمانبردار نہیں، اسلام اور تعلیمات اسلام سے اس کو دور کا بھی واسطہ نہیں تو وہ محض اس کی شعبدہ بازی اور شیطانی حرکت ہوگی۔

علامہ اعظمیؒ کی زندگی میں بہت سے ایسے امور ظاہر ہوئے جو ان کی ولایت کی شہادت دیتے ہیں، اور جن کو ان کی کرامت سے تعبیر کیا جاسکتا ہے ،ایک دور افتادہ بستی میں بہت سی ذہنی الجھنوں، گھریلو پریشانیوں، خانگی بکھیڑوں طرح طرح کے نفسیاتی دباؤ اور گونا گوں امراض کا شکار رہتے ہوئے جو بیش بہا اور عظیم الشان علمی و تحقیقی کارنامے انجام دیئے ہیں، میرے نزدیک ان کی سب سے بڑی کرامت یہی ہے ، تاہم کچھ ایسے واقعات بھی ان سے ظاہر ہوئے ہیں جو بے شبہہ ان کی ولایت کے شاہد ہیں، کچھ واقعات زبانی روایتوں سے بھی ہم نے سنے ہیں، لیکن میں احتیاطاً ان کا ذکر نہیں کرتا، صرف انھیں واقعوں کو درج کرتا ہوں جو تحریری طور پر مذکور ہیں، اور یہ صرف تین واقعے ہیں جن کا ذکر مولانا عطاء الرحمٰن صاحب بھاگلپوری نے اپنے ایک مضمون میں کیا ہے، اور لکھا ہے کہ یہ واقعات خود ان کے مشاہدے میں آئے ہیں۔

سخت دھوپ اور گرمی میں بارش مولانا عطاء الرحمٰن صاحب لکھتے ہیں:

"غالباً ۸۱ء کا جون تھا، حضرت مخدوم (علامہ اعظمیؒ) اپنے اس خاک پا کی حقیر دعوت پر پورینی تشریف لائے، وہی چوہے اور اونٹ والی مثال تھی ، مگر اللہ رے شفقت، گرمی کی شدت کے باوجود خندہ جبینی لمحہ بھر کو رخصت نہ ہوئی ، ایک موقع پر برف طلب فرمایا، اس غلام نے ۱۲ر کلو میٹر دور ایک شخص کو برف کے لئے شہر بھیجا، ۹ر بجے کا گیا ہوا فرستادہ ایک بجے تک جب نہ لوٹا تو اس کمترین خادم کا ندامت سے جو حال ہوا کہ نہ پوچھئے۔ حضرت فرما رہے تھے کاش بارش ہو جائے، موسم ٹھنڈا ہو جائے۔ زمین جل رہی تھی ، آسمان آگ برسا رہا تھا، بادل کا کوئی ٹکڑا دور دور تک ناپید تھا ۔ واللہ اعلم پھر کہاں سے گھٹا اٹھی اور

چند سو گز کے دائرے میں ژالہ باری کر کے دوبارہ آسمان صاف کر گئی، مصنوعی برف لانے والا ناکام لوٹا، قدرتی برف کے اولے ڈش میں بھرے گئے، تلووں پر ملے گئے، موسم یوں معتدل گویا فروری مارچ کا مہینہ ہو، سارے لوگ انگشت بدنداں، عقل توجیہ سے قاصر، کیسے ہو گیا؟"(۱)

کھانے میں برکت | پورنی کے اسی سفر میں دوسری کرامت یہ ظاہر ہوئی:

"شام کو وعظ کا جلسہ تھا، لوگ توقع کے خلاف امنڈ آئے، بیرونی مہمانوں کی کثرت اور چاول صرف ۴۰؍ کلو، غلام نے حضرت سے صورتحال بیان کی، حکم ہوا کھانے پر چادر ڈال دو اور اللہ کا نام لے کر کھلانا شروع کر دو، میں نے متعلقہ افراد کو یہ پیغام دے کر لاؤڈ اسپیکر سے اعلان کرا دیا کہ بیرونی مہمان کھانا کھالیں، غلام تو یہ اعلان کر کے حضرت کی خدمت میں حاضر ہو گیا اور ذمہ داروں نے میزبانی کے فرائض سنبھال لئے، تقریباً دس بجے رات جب ذمہ داروں نے دوبارہ اعلان کی تاکید کی تو مجھے خیال آیا کہ چاول تو کم تھا، ذرا دیکھوں تو کیا حال ہے؟ تفتیش پر ایک ذمہ دار نے میرا ہاتھ پکڑا اور مطبخ لے گئے، وہاں ایک چٹائی پر نصف چٹائی بھر چاول ڈھکا ہوا تھا، اور تقریباً پندرہ کیلو چاول ابل رہا تھا، مجھے بتایا گیا کہ سات بجے شام سے ایک قطار میں ۶۰؍ افراد بیٹھ کر اب تک مسلسل تقریباً چار سو افراد کھا چکے ہیں، مزید دریافت پر میری حیرت یہ کہہ کر بڑھائی گئی کہ بچے ہوئے اور ابل رہے چاول انھیں چالیس کلو چاولوں کا بقیہ ہیں۔ بار بار کے اعلان پر جب کوئی کھانے والا نہ آیا تو ایک بجے رات کو کنڈیاں کھٹکھٹائی گئیں کہ بھائیو! یا تم چل کر کھالو، یا پھر کھانا لے آؤ، ورنہ گرمی سے پختہ چاول خراب ہو جائے گا، اس واقعے کے درجنوں شاہد یہاں موجود ہیں، جو اس کی شہادت دے سکتے ہیں۔"

---

(۱) اس سفر میں آپ کے پوتے مولوی ایمن سعید اعظمی ساتھ تھے، یہ واقعہ راقم السطور نے ان سے بھی سنا ہے۔

خلاف مرضی کام کی وجہ سے گاڑی کی خرابی تیسرا واقعہ مذکورہ بالا دونوں واقعوں کے تقریباً سات آٹھ سال بعد کا ہے، جس کو مولانا عطاء الرحمٰن بھاگلپوری نے درج ذیل الفاظ میں قلمبند فرمایا ہے:

"حضرت اقدس رحمۃ اللہ علیہ کا دوسرا سفر اس غلام کی دعوت پر تین سال پیشتر بھاگل پور کا ہوا، جہاں حضرت کا عظیم الشان بے مثال استقبال کیا گیا، تیسرے دن ایک مسجد کے افتتاح کیلئے تقریباً تیس کیلو میٹر دور جانا تھا، قریب کے ایک مدرسہ سے بھی دعوت آئی جسے حضرت نے قبول نہ فرمایا، مدرسے کے مہتمم نے بہت اصرار کیا تو اس غلام نے اپنی حماقت سے رائے دی کہ واپسی دوسرے راستے سے ہو، جس میں مذکورہ مدرسہ واقع ہے، اور رہبری کے لئے حضرت کے خادم سفر محمد قاسم صاحب کی جیپ آگے بڑھا دی گئی۔ حضرتؒ نے دیکھا، تبسم فرمایا اور فرمایا اچھا! تو قاسم میاں آگے چل رہے ہیں، واللہ العظیم دو تین منٹ ہوئے ہوں گے کہ قاسم بھائی کی جیپ کنارے ہو کر رک گئی، اور حضرت کی کار اپنے راستہ پر بڑھ گئی، اس ناکارہ غلام کی بے چینی کا جو عالم تھا اسے خدا ہی بہتر جانتا ہے، آدھ گھنٹہ بعد جیپ آتی دکھائی دی، قاسم بھائی منزل پر پہونچتے ہی دست بستہ معافی مانگنے لگے، میں حیران کہ معاملہ کیا ہے، حضرت نے مسکراتے ہوئے فرمایا، جاؤ معاف کیا۔ تب قاسم نے بتایا کہ اچانک گاڑی لڑکھڑانے لگی اور ایسا لگا کہ بس اب گیئر بکس ٹوٹ جائے گا، مجبوراً گاڑی کنارے کر دینی پڑی، اور جب حضرت کی کار آگے بڑھ گئی تو چند منٹوں میں گاڑی بالکل ٹھیک ہو گئی، جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو، قاسم بھائی سرگذشت سنا رہے تھے اور میں ندامت سے پسینے پسینے کہ یا اللہ میں نے یہ کیا حماقت کر ڈالی۔"

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

دسواں باب

علامہ اعظمی اہل علم کی نظر میں

دسواں باب
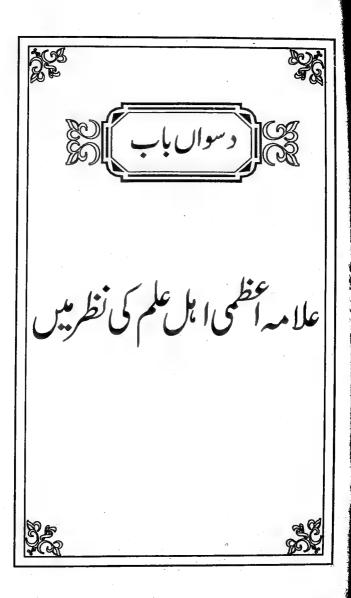
علامہ اعظمی اہل علم کی نظر میں

علامہ اعظمی کی جلالت شان، علو مرتبت، رفعت قدر، فہم و فراست اور عظمت و عبقریت کی داد تقریباً تمام معاصر اہل علم اور بہت سے اکابر ملت نے دی ہے، اسی طرح ان کے زہد و تقوی اور علم و عمل کو ایک دنیا نے جانا، مانا اور تسلیم کیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ان کے معاصرین نے ان کی امامت و عبقریت کا جس طرح اعتراف کیا ہے شاید ہی کسی کا کیا گیا ہو، عجم کے لالہ زاروں سے لے کر عرب کے ریگ زاروں تک ان کے مداحوں اور ثناخوانوں کی ایک قطار نظر آتی ہے۔ جس کو بھی علم و فن سے کچھ تعلق یا لگاؤ ہے وہ ان کے کمال و تفوق کا بلا تامل و تردد اور سچے دل سے قائل ہے، جو ان سے ملا ہے ان کا گرویدہ ہے، اور جس نے ان کی تحریر، ان کی تحقیق اور ان کے علمی کام کو دیکھا ہے وہ ان کا شیفتہ و دلدادہ ہے، اللہ جل شانہ نے اپنے اس "حبیب" کو عجیب و غریب مقبولیت عطا فرمائی تھی، جس کی ایک مثال سر دست مولانا افضال الحق جوہر قاسمی کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیں، لکھتے ہیں:

"مکہ مکرمہ کا نوخیز عالم مجھ سے دہلی میں ملا اور حضرت مولانا کے بارے میں پوچھنے لگا، تو میں نے اس سے پوچھا کہ "تو اعظم گڈھ کے ہیں تم مکہ کے لوگ انھیں کیسے جانتے ہو؟ اس مکی عالم نے کہا کہ ہم ان کو اس طرح جانتے ہیں کہ جیسے اپنے باپ دادا کو جانتے ہیں۔ پھر اس نے کہا کہ میں مئو جاکر حضرت علامہ سے حدیث پڑھنا چاہتا ہوں، ضرور جاؤں گا۔" (۱)

عرب علماء کے نزدیک علامہ اعظمی کی قدر و منزلت کتنی تھی؟ ان کے دلوں

(۱) ترجمان الاسلام ش ۱۱۔ ۱۲ ص ۱۶۶

میں آپ کی کیسی عزت و حرمت تھی؟ اس کو بیان کرنے کے لئے الفاظ کا قافیہ تنگ نظر آتا ہے، میں یہاں اپنی بات کی تائید کے لئے صرف دو عینی شاہدوں کے بیان نقل کروں گا، مولانا قاضی اطہر صاحب مرحوم فرماتے ہیں:

"ہم نے متعدد بار یہ منظر دیکھا کہ مولانا ایام حج میں حرم شریف کے سامنے مدرسہ فخریہ کے چھوٹے سے دفتر میں تشریف رکھتے تھے اور مصر و شام، حجاز اور افریقہ وغیرہ کے اہل علم مولانا کی خدمت میں نیاز مندانہ انداز میں حاضر ہو کر استفادہ کرتے تھے اور قدماء کے طریقہ پر ان سے حدیث کی روایت کی سند لیتے تھے، واقعہ یہ ہے کہ مولانا ہندوستان میں علم حدیث کے آخری سالار قافلہ تھے۔"(۱)

اور پروفیسر محمد اجتباء ندوی سابق صدر شعبہ عربی الہ آباد یونیورسٹی تحریر فرماتے ہیں:

"عالم عربی میں جن علماء، محدثین اور محققین سے ملاقاتیں ہوئیں، انھوں نے حضرت اعظمی کا تذکرہ بڑے بلند الفاظ میں کیا۔"(۲)

حقیقت یہ ہے کہ ان کی شخصیت حیرت انگیز اور اعجوبۂ روزگار تھی، بلکہ بقول پروفیسر عبدالرحمٰن مومن "وہ اس دور میں اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی تھے" اور اس نشانی کی تعریف و توصیف میں ان کے اساتذہ و شیوخ اور اکابر و اصاغر سبھی رطب اللسان نظر آتے ہیں۔

حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی۔ اعلی اللہ منزلتہ۔ کے کمال علم کے ساتھ ان کے مرتبۂ رشد و ہدایت سے کون واقف نہیں ہوگا، اس عہد میں اللہ تعالیٰ نے خدمت علم کے ساتھ اصلاح امت اور تجدید دین کا جو کام ان سے لیا ہے، وہ بے مثال اور رشک ملائک ہے، آپ کی نظر کرم اور نگاہ التفات سے نہ جانے کتنے تاریک سینوں میں ایمان اور صلاح و فلاح کا نور جاگا، آپ کے دربار فقیری میں پہنچ کر کتنے بے آبرو با آبرو ہو گئے، اور کتنے لوگ ثریٰ سے اٹھ کر ثریا پر پہنچ گئے، اور بہت

(۱) ترجمان الاسلام ش ۱۲۔۱۱ ص ۷۴ (۲) ترجمان الاسلام ش ۱۳ ص ۱۰۶

سے ایسے تھے جن کے فضل و کمال میں کوئی کمی نہیں تھی، جن کا دامن بے داغ تھا مگر ان کی توجہ اور عنایت سے تپ کر کندن اور در صدف بن گئے، ان کے انھیں اسیران محبت میں مولانا محمد صابر صاحبؒ اور ان کے فرزند دلبند علامہ اعظمیؒ تھے، چنانچہ حضرت تھانوی والد وولد دونوں کے پیر طریقت اور شیخ ومرشد تھے۔

مولانا تھانوی حد درجہ محتاط اور اپنے اصول کے نہایت پابند تھے، ان کی احتیاط میں یہ بات بھی تھی کہ کسی کتاب پر اس وقت تک تقریظ نہیں لکھتے تھے ،جب تک اس کو پڑھ نہیں لیتے تھے، مگر اس احتیاط کے باوجود علامہ اعظمی کی جس طرح توصیف وستائش فرمائی ہے وہ علامہ اعظمی کی عظمت کے لئے طغرائے امتیاز ہے، ان ہی مواقع کیلئے کہا جاتا ہے "قدر جوہر شاہ داند یا بداند جوہری"۔ چنانچہ جب خواجہ عبدالحی پروفیسر جامعہ ملیہ اسلامیہ کی کتاب "التفسیر الجدید" پر علامہ اعظمی کی ناقدانہ کتاب "التنقید السدید علی التفسیر الجدید" شائع ہوئی، تو اس کو ملاحظہ فرمانے کے بعد مولانا تھانوی علیہ الرحمۃ نے ۲۴ر صفر ۱۳۴۹ھ کو علامہ اعظمی کے پاس یہ خط لکھا:

"احقر اشرف علی عفی عنہ نے اس تنقیدی مضمون کو غایت شوق سے حرفاً حرفاً دیکھا اور اس حدیث کا مصداق پایا: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم يحمل هذ العلم من كل خلف عدوله ، ينفون عنه تحريف الغالين وانتحال المبطلين وتاويل الجاهلين . (مشكوٰة عن البيهقى) ماشاء اللہ قوت استدلال، حسن ادا، دفع شبہات۔ لین کلام غرض ہر پہلو سے بے تکلف اس شعر کا نمونہ ہے۔

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

بارك الله تعالىٰ فى افادات المصنف وإفاضاته

۲۴ر صفر ۱۳۴۹ھ تھانہ بھون، وقاه الله عن الفتن ."

اسی طرح انکار حدیث کے رد میں علامہ اعظمی کی شہرۂ آفاق تصنیف "نصرة الحدیث" کو انعام تحسین پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"میں اپنے ضعف اور عذر سے خود شرمندہ ہوں اور ہدیہ بسر و چشم قبول کرتا ہوں اور دعائے نافعیت کرتا ہوں، جس جس جگہ سے رسالہ نظر پڑا، بس اتنا کہہ سکتا ہوں کہ میں ایسا جامع اور محقق نہیں لکھ سکتا" (۱)

حضرت تھانویؒ کو علامہ اعظمی کے علم پر بہت وثوق و اعتماد تھا، جس کی وجہ سے وہ ان کے حلقۂ مریدین اور زمرۂ خلفاء میں بھی حد درجہ مقبول و محترم تھے، مولانا تھانویؒ کے اعتماد کا یہ حال تھا کہ ایک دفعہ علامہ اعظمی تھانہ بھون میں مقیم تھے، دوران قیام ایک دن بعد نماز عصر مولانا حبیب اللہ صاحب مئوی خلیفۂ حضرت تھانوی کے ہمراہ بیٹھے کسی چائے خانے میں چائے پی رہے تھے، اسی اثناء میں خواجہ عزیز الحسن صاحب آگئے، اور مولانا حبیب اللہ صاحب کو مخاطب کر کے پوچھا کہ مولوی حبیب الرحمٰن کون ہیں؟ مولانا حبیب اللہ صاحب ہنسے اور کہا کہ یہی ہیں، تب خواجہ صاحب نے کہا کہ حضرت (تھانوی) سے طلاق کے بارے میں مسئلہ پوچھا تو حضرت نے فرمایا کہ اس مسئلہ میں آپ مولوی حبیب الرحمٰن صاحب سے رجوع کریں۔

اسی طرح ماسٹر قبول احمد صاحبؒ (وابستہ دامن حضرت تھانوی) ہیڈ ماسٹر سیتاپور گورنمنٹ کالج نے ایک دفعہ حضرت تھانوی سے طلاق کے متعلق مسئلہ دریافت کیا، تو حضرت مولانا تھانویؒ نے ان کو بھی مولانا اعظمی سے رجوع کرنے کا مشورہ دیا، چنانچہ انھوں نے اس کے بعد خطوط کے ذریعہ استفسار و استفادہ کیا۔ (۲)

امام العصر علامہ انور شاہ کشمیریؒ فخر المتأخرین امام العصر علامہ انور شاہ کشمیریؒ کی نسبت کچھ عرض کرنا، سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہوگا، وہ چمنستان قاسمی کے وہ گل سرسبد تھے، جن کی عبقریت اور امامت کو اپنوں اور غیروں نے یکساں طور پر تسلیم کیا ہے، علامہ اعظمی اپنے اساتذہ میں ان سے بہت زیادہ متاثر تھے، بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ علامہ اعظمی ان کے پرتو اور علم میں ان کے جانشین تھے، علامہ اعظمی کی شخصیت ایک ایسا آئینہ تھی جس میں شاہ صاحبؒ کا عکس واضح طور پر دیکھا جا سکتا تھا، اور خود شاہ صاحب بھی ان

---

(۱) ترجمان الاسلام ش ۱۱، ۱۲ ص ۱۵۶ (۲) ڈاکٹر عبدالمعید صاحب نے اس کو خود حضرت علامہ اعظمیؒ کی زبان سے سنا ہے۔

کے علم کے قائل اور معترف تھے، چنانچہ علامہ اعظمی نے خود لکھا ہے کہ جب انھوں نے شاہ صاحبؒ کو اپنی تصنیف " الحاوی لرجال الطحاوی " دکھائی تو اس کے مصادر و مراجع اور حوالہ جات کے بارے میں دریافت فرماتے رہے، اور علامہ اعظمی کی درخواست پر نہایت خوشدلی کے ساتھ اس پر نظر ثانی کے لئے آمادہ ہو گئے، اور بالآخر فرمایا کہ جب میں ڈابھیل جاؤں تو کتاب میرے پاس بھیج دیجئے، مگر شاہ صاحب کے ڈابھیل پہنچنے سے پہلے ان کے پاس پیام اجل آپہنچا۔ ع

آں قدح بشکست و آں ساقی نماند

یہ شاہ صاحبؒ کا آپ کے علم پر اعتماد اور آپ کے کمال کا اعتراف تھا کہ اس ملاقات میں شاہ صاحب نے آپ سے بہ تاکید فرمایا، بلکہ وصیت فرمائی کہ وہ حنفیت کا دفاع کرتے رہیں، شاہ صاحب کی بات کا اثر تھا، یا علامہ اعظمی کی دینی و مذہبی حمیت کہ عمر بھر نہ صرف حنفیت بلکہ مسلک اہل سنت کا پرزور دفاع فرماتے رہے۔

مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانویؒ تحریک آزادی کے مردان احرار میں سے تھے، ہندوستان کی آزادی کے نام پر اٹھنے والی ہر تحریک میں پیش پیش رہے، ان کا شمار سرزمین ہند کے ان عظیم رہنماؤں میں ہوتا ہے جو اپنے زور خطابت، گرمیٔ نفس اور جوش و ولولہ کی وجہ سے انگریزوں کے حلق کی پھانس بنے رہے، تحریک خلافت ہو، جمعیۃ علماء ہند ہو یا مجلس احرار وہ ہر پلیٹ فارم پر انگریزوں کے خلاف صف آرا ہو کر آزادی وطن کا نعرہ بلند کرتے رہے، دارالعلوم دیوبند کے فرزندوں میں تھے اور شاہ صاحب کے شاگرد، علامہ اعظمیؒ سے کوئی بہت زیادہ ربط و تعلق نہیں تھا، لیکن ان کے مقام و مرتبہ سے بخوبی واقف تھے، شاہ صاحب کا ذکر آیا تو مناسب معلوم ہوا کہ ان کا ایک خط نقل کر دیا جائے جس میں انھوں نے نہایت فراخدلی سے اپنے تاثرات کا اظہار فرمایا اور علامہ اعظمی کی عظمت و بلندی کو تسلیم کیا ہے، ۱۶؍ جنوری ۱۹۵۶ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں:

"۰۰۰ آپ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے جانشین ہیں، میرے دل

میں آپ کے تقویٰ، علم و پرہیزگاری کی وجہ سے بہت زیادہ عزت ہے۰۰۰"(۱)

ایک دوسرے مکتوب میں جو ۱۵ر فروری ۱۹۵۶ء کا تحریر کردہ ہے لکھتے ہیں:

"۰۰۰ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وجہ سے آپ سے ایک تعلق ہے، کیونکہ آپ اون کے علم کے وارث ہیں، اس لئے مجبور ہوں کہ آپ سے اپنا تعلق رکھوں۔"(۲)

مولانا محمد ایوب اعظمیؒ مفتاح العلوم کے واقعات میں آپ کا ذکر بار بار آچکا ہے، وہ اس کو ترقی دلانے والوں میں ثالث ثلثہ کی حیثیت رکھتے تھے، صاحب علم و فضل تھے اور منصب نظامت کے ساتھ دو ایک سبق بھی پڑھایا کرتے تھے۔ باوقار اور صاحب وجاہت بزرگ تھے، آپ کی ذات شریعت و طریقت کا بہترین امتزاج تھی، مفتاح العلوم میں نظامت اور صدارت کے علاوہ شیخ الحدیث کے منصب پر فائز رہ چکے تھے، دارالعلوم ندوہ اور مدرسہ تعلیم الدین ڈابھیل کی مسند حدیث کو رونق بخش چکے تھے، ڈابھیل میں تقریباً بیس سال تک بخاری و مسلم کا درس دیتے رہے، آپ علامہ اعظمی کے ہم درس و ہم عصر اور علامہ انور شاہ کشمیری کے شاگردوں میں تھے۔

آپ کے صاحبزادہ محترم مولانا حکیم عزیز الرحمٰن صاحب نے راقم سے فرمایا کہ والد صاحب فرمایا کرتے تھے:

"مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کا ذوق حدیث کے سلسلے میں شاہ صاحب کی طرح ہے، جس حدیث کے بارے میں وہ کہدیں کہ اس درجہ کی ہے وہ اسی درجہ کی نکلتی ہے۔"

علامہ شبیر احمد عثمانی دارالعلوم دیوبند کے مایہ ناز فرزندوں میں تھے، بلکہ ان افراد میں سے ایک تھے جن کی ذات اس امت کے لئے سرمایۂ فخر و امتیاز ہے، علامہ اعظمی کے استاذ تھے اور ان کے اساتذہ کے باب میں بالتفصیل ان کا ذکر آچکا ہے، استاذ و شاگرد میں

---

(۱)(۲) المآثر جلد ۶ شمارہ ۴ ص ۹۶

برسوں خط وکتابت رہی ہے، ان کو بھی اپنے شاگرد کے علم وعمل پر اعتماد اور فضل وکمال کا اعتراف تھا، چنانچہ مسلم شریف کا درس دیتے وقت حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی وہ حدیث آتی جسے حضرات غیر مقلدین ایک مجلس کی تین طلاقوں کو ایک طلاق ثابت کرنے کیلئے بطور دلیل پیش کرتے ہیں تو آپ اس وقت فرماتے:

"اس حدیث کی بہترین توضیح وتشریح کیلئے مولوی حبیب الرحمٰن اعظمی کی اعلام مرفوعہ دیکھو۔ اس سے بہتر توضیح کسی نے نہیں کی، یا یہ فرمایا کہ اس سے بہتر توضیح میں بھی نہیں کر سکتا۔"(۱)

یہ شاگرد کی ہمت افزائی تھی یا اسکے کمال کا اعتراف کہ جب علامہ اعظمی نے اپنی عظیم الشان تصنیف "الحاوی لرجال الطحاوی" مکمل فرمائی، اور مولانا عثمانیؒ کو اس کی نسبت پتہ چلا تو ایک خط میں لکھا:

"کاش (الحاوی) چھپ جاتی، تو ہم کو بھی اپنے کام میں مدد ملتی، حق تعالیٰ کوئی سامان فرمادیں، انشاء اللہ مناسب موقع پر کوئی کوشش ہو سکی تو دریغ نہ ہوگا"(۲)

شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ حضرت مولانا مدنیؒ کی ذات ستودہ صفات کے متعلق اپنی معروضات پیش کرنا "چھوٹا منہ بڑی بات" کا مصداق ہوگا، امت مرحومہ کے اندر آپ کا وجود اسلام کی حقانیت کی دلیل تھا، ایسا عظیم فرد جس کی پوری زندگی اور زندگی کا ہر نقش منہاج نبوت کی تعبیر پیش کرتا ہو، قرنوں اور صدیوں میں پیدا ہوتا ہے بقول شاعر:

مت سہل ہمیں جانو! پھرتا ہے فلک برسوں تب خاک کے ذرے سے انسان نکلتے ہیں

مولانا مدنیؒ ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے، درس وتدریس، تصنیف وتالیف، تعلیم وتبلیغ، دعوت وارشاد غرض متنوع اوصاف ومحاسن نے ان کی شخصیت کو بے نظیر بنادیا تھا، ان کی نسبت علامہ اعظمی فرماتے ہیں:

(۱) ترجمان الاسلام ش ۱۱۔ ۱۲۔ ص ۱۸۴، المآثر ج ۲ ش ۱ ص ۵۲

(۲) المآثر ج ۷ ش ۱ ص ۸۸

"... لیکن شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ اپنے جملہ اوصاف کے لحاظ سے بدیع الزماں، نادرۃ العصر اور یکتائے روزگار تھے، وہ اپنے متنوع علمی کمالات و باطنی مقامات، بیشمار محاسن اعمال اور بے انتہا بلند اخلاق و کردار کے لحاظ سے بالکل منفرد اور بے مثال تھے۔"(۱)

مولانا مدنیؒ کی شخصیت عجیب و غریب اور گوناگوں فضائل و کمالات کا مرقع تھی، بزم میں ہوتے تو مسند صدارت پر جلوہ افروز ہوتے اور رزم میں ہوتے تو زمام قیادت ان کے ہاتھ میں ہوتی، انکسار و تواضع ایسا کہ بڑے سے بڑے گستاخ کا جواب بھی عفو و درگذر اور خندہ روئی سے دیتے، رعب و جلال کا یہ عالم کہ عدالت کے کٹہرے میں کھڑے ہوئے تو جرأت حق سے برطانوی تاج و تخت لرزاٹھے، زاہد شب بیدار بھی تھے، مرد میدان بھی تھے اور مجاہد و شہ سوار بھی تھے۔

حضرت شیخ الاسلامؒ اور علامہ اعظمیؒ میں نہایت قوی اور استوار روابط تھے جو مدت دراز پر محیط تھے، اور تادم واپسیں برقرار رہے، دونوں بزرگوں کے تعلق کا کچھ اندازہ مولانا عثمان صاحب معروفی کی حسب ذیل تحریر سے ہوتا ہے:

"۱۳۷۲ھ ر ۱۹۵۲ء کے لگ بھگ عیدگاہ پورہ معروف کے پاس دو روزہ عظیم الشان اجلاس ہوا، جس میں حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی م ۱۳۷۷ھ ر ۱۹۵۷ء بھی تشریف لائے تھے، جن کے استقبال میں ایک عظیم مجمع تھا، حضرت مدنی نے نماز مغرب عیدگاہ میں ادا فرمائی، پھر منبر پر بیٹھ کر دیر تک استقبال کرنے والوں سے مصافحہ کیا، وہیں استقبال کرنے والوں میں محدث کبیر بھی محراب میں کھڑے رہے، سب کے آخر میں سامنے آکر مصافحہ فرمایا، اس وقت حضرت مدنیؒ نے فرمایا:

مرا اک کھیل خلقت نے بنایا — تماشے کو بھی لیکن تو نہ آیا

(۱) الجمعیۃ، شیخ الاسلام نمبر ص ۳۹

مگر آپ تو حاضر ہیں، پھر دونوں دیر تک معانق رہے…"(۱)

حضرت مدنیؒ بھی علامہ اعظمی کے فضل وکمال کے بہت زیادہ قائل تھے، چنانچہ ایک واقعہ کا علامہ اعظمی نے خود اپنے مضمون میں حضرت مدنی کی بے نفسی کے تذکرے میں ضمناً ذکر فرمایا ہے، جس سے مولانا مدنیؒ کے نزدیک علامہ اعظمی کی قدر ومنزلت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے، فرماتے ہیں:

"ایک دفعہ بلتھرا روڈ سے واپسی میں شاہ گنج جانے والی ٹرین پکڑنے کیلئے حضرت کو مئو کے سٹیشن پر سرشام سے اڑھائی بجے رات تک رکنا پڑا، مجھ کو کوئی اطلاع نہ تھی، اس لئے حضرت نے آدمی بھیج کر اطلاع کرائی، میں چلنے لگا تو خیال ہوا کہ کچھ ناشتہ اور چائے کا سامان بھی لے چلنا چاہئے، اس لئے اپنے لڑکے رشید احمد اور دو طالب علموں کو بھی ساتھ لے لیا، سٹیشن پہنچ کر سلام ومصافحہ کے بعد حضرت کے سامنے میں نے یہ کہتے ہوئے رشید احمد کو پیش کیا کہ یہ خادم زادہ ہے، حضرت نے اس کو بھی مصافحہ کا شرف بخشا، پھر اس کی تعلیم کے بارے میں کچھ سوالات کئے، تھوڑی دیر میں حضرت کے صاحبزادہ میاں اسعد سلمہ اللہ باہر سے ویٹنگ روم میں داخل ہوئے تو حضرت نے میری طرف اشارہ کر کے ان کو مصافحہ کرنے کے لئے کہا، جب وہ میری طرف بڑھے تو حضرت نے فرمایا یہ بھی خادم زادہ ہے، ان الفاظ کا جو اثر میرے قلب پر ہوا، میں اس کو آج تک نہیں بھولا ہوں، یہ واقعہ جب بھی یاد آتا ہے حضرت سعدیؒ کا یہ شعر بھی ضرور یاد آتا ہے ؎

بزرگاں نہ کردند بر خود نگاہ خدا بینی از خویشتن بیں نخواہ

اسی قبیل سے حضرت والا کا اس ظلوم وجہول کو بعض خطوط میں ایسے الفاظ سے یاد کرنا ہے جن کو نقل کرتے ہوئے بھی شرم آتی ہے۔"(۲)

اوپر گذر چکا ہے کہ مولانا مدنیؒ نے یہ تجویز پاس کی تھی کہ جمعیۃ کے اندر کسی بھی فقہی مسئلہ میں علامہ اعظمی سے استصواب کئے بغیر کوئی فیصلہ نہ کیا جائے۔

(۱) ترجمان دار العلوم اکتوبر ۱۹۹۶ء ص ۳۲-۳۴-۳۳ (۲) الجمعیۃ شیخ الاسلام نمبر ص ۲۱

علامہ سید سلیمان ندویؒ سید صاحب کی شخصیت تعارف کی محتاج نہیں۔ علمی، ادبی اور تحقیقی حلقوں میں آپ کی ذات جس احترام و تکریم کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے وہ بیان سے بالاتر ہے، دینی اور ادبی دونوں حلقوں میں آپ کے طرز تحریر اور اسلوب نگارش کو نہایت پسندیدگی اور قبولیت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، آپ کی تحریر میں قوت استدلال، زور بیان، سادگی و شستگی اور شوکت و قوت غرض انشاء پردازی کے جملہ اوصاف و خصائص بدرجۂ اتم موجود ہوتے ہیں، اس کے علاوہ تحقیق واستناد کے لحاظ سے اس پایہ کی ہوتی ہے کہ اپنے موضوع پر سند اور اتھارٹی سمجھی جاتی ہے، انشاء پردازی کے لحاظ سے اپنے معاصرین میں اعلیٰ اور بلند ترین مقام پر نظر آتے ہیں، اور جس موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں اسے تشنہ نہیں چھوڑتے۔

سید سلیمان ندویؒ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے کاروان اول اور اس کے مایہ ناز فرزندوں میں تھے، علامہ شبلی نعمانیؒ کے لائق ترین شاگرد، حقیقی جانشین اور ان کی تعلیم و تربیت کا سچا اور مکمل نمونہ تھے، زہد و تقویٰ قناعت و استغناء، سادگی و انکساری، عقل و بصیرت، فہم و فراست اور بہت سارے محاسن میں اپنی مثال آپ تھے، تصنیف و تالیف میں لاثانی اور زبان و قلم کے تو گویا بادشاہ تھے، ان کے استاذ علامہ شبلی نعمانیؒ نے سیرت نگاری کی جو نیو ڈالی تھی اس کی تکمیل جس شاندار طریقے پر کی وہ آپ ہی کا حصہ تھا، سید صاحب کے نمایاں ترین کاموں میں اہم کام یہ ہے کہ وہ دیوبند اور ندوہ کے درمیان فاصلہ کو کم کرنے اور ربط و تعلق پیدا کرنے کا بڑا وسیلہ بنے۔

سید صاحب اور علامہ اعظمی میں نہایت پر خلوص تعلقات تھے، بعض قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ دونوں بزرگوں میں تعلقات کی ابتداء ۱۹۲۶ء کے آغاز اور ۱۳۴۴ھ کے وسط میں ہوئی، یہ وہ زمانہ تھا کہ علامہ اعظمی کوچۂ تعلیم و تدریس اور میدان تصنیف و تالیف میں ابھی نووارد تھے، اور سید صاحب اس راہ کے پرانے رہرو، علامہ اعظمی نوآموز تھے اور سید صاحب آزمودہ کار و شہرت یافتہ، علامہ اعظمی کا ستارہ ابھی جھلمل کر رہا تھا جبکہ

سید صاحب شہرت کے نصف النہار پر تھے، لیکن سید صاحب جوہر شناس تھے اور جوہر شناسی کا بھرپور ملکہ رکھتے تھے، انھوں نے علامہ اعظمی کی پوشیدہ صلاحیتوں کا کچھ اس طرح مشاہدہ کیا کہ عمر بھر ان کے کمال و تفوق کا اعتراف کرتے رہے، یہاں تک کہ تقسیم وطن کے بعد جب سید صاحب پاکستان ہجرت فرما گئے تو وہاں سے مفتی ظفیر الدین صاحب کو ایک خط لکھا جس میں فرمایا:

"ہندوستان کے ان دوستوں میں سے جن کے جیتے جی چھوٹ جانے کا افسوس ہے، ایک مولانا مناظر احسن گیلانی ہیں، اور دوسرے آپ کے استاد مکرم مولانا حبیب الرحمٰن (اعظمی) ہیں، اللہ تعالیٰ ان دونوں سے ہندوستان کے مسلمانوں کو مستفید فرمائے"۔(۱)

علامہ اعظمی کو جب سید صاحب کے اس خط کا علم ہوا، تو آپ نے بھی سید صاحب کے ہندوستان چھوڑنے پر اپنی جس انفعالی کیفیت کا اظہار فرمایا وہ قابل ملاحظہ ہے، ۲۰/اگست ۱۹۵۱ء کو مفتی ظفیر صاحب کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

"...سید صاحب دام ظلہ کا تہہ دل سے ممنون ہوں کہ مجھ کو بھولے نہیں ہیں، مجھ کو بھی کسی کے پاکستان چلے جانے کا کوئی رنج نہیں، لیکن حضرت مولانا شبیر احمد (عثمانی) رحمۃ اللہ علیہ اور سید صاحب کے پاکستان منتقل ہو جانے کا صدمہ دل سے کبھی نہیں جا سکتا۔

پہلے جب کبھی جی گھبراتا تھا تو دن بھر کیلئے اعظم گڈھ چلا جاتا تھا، سید صاحب سے جی بھر کے باتیں ہوتی تھیں، اور سارا غم غلط ہو جاتا تھا، افسوس کہ اب یہ سہارا بھی نہیں رہا۔ شاید نومبر میں ایک آدھ گھنٹے کے لئے دارالمصنفین گیا تھا، پھر جب سے آج تک نوبت نہیں آئی..."(۲)

---

(۱) مشاہیر علماء ہند کے علمی مراسلے ص ۵۵

(۲) ایضاً ص ۱۶۰

سید صاحب کو علامہ اعظمی سے جو انس و تعلق تھا اس کا اظہار انھوں نے متعدد مواقع پر نہایت صاف دلی سے کیا ہے، انھوں نے مفتی ظفیر صاحب کو جو خطوط لکھے ہیں تو کئی ایک میں اس موانست کا ذکر ملتا ہے، ۱۶ر ستمبر ۱۹۴۷ء کو لکھتے ہیں:

"مولانا اعظمی کی خیریت سن کر خوشی ہوئی اور ان کی محبت سے دل کو متاثر پاتا ہوں۔"(۱)

۱۶ر ذی قعدہ ۱۳۶۷ھ کو لکھتے ہیں:

"محبی حبیب الرحمٰن (الاعظمی) کا تذکرہ تجدید محبت کا باعث ہوا، موصوف سے مجھے بڑی موانست اور محبت ہے"(۲)

۱۷ر مئی ۱۹۵۰ء کو کانپور سے لکھتے ہیں:

"میں آج شب کو اعظم گڈھ سے واپس آیا، تقریبا دس روز دارالمصنفین میں رہا، محبی مولوی حبیب الرحمٰن بھی اطلاع پا کر چند گھنٹوں کیلئے آگئے تھے مل کر دل خوش ہوا۰۰۰"(۳)

ایک فقرہ سید صاحب کی نگاہ عنایت سے متعلق بھی ملاحظہ فرمالیں، انھوں نے مفتی ظفیر صاحب کو اس وقت خط لکھا جب علامہ اعظمی نے بعض وجوہات کی بنیاد پر ۱۳۶۴ھ میں مفتاح العلوم میں کار تدریس چھوڑنا چاہا تھا، یکم رجب ۱۳۶۴ھ کو لکھتے ہیں:

"حالات سن کر افسوس ہوا، مولانا سے کہہ دینا کہ وہ ہر فیصلہ سے پہلے مجھے ضرور مطلع فرماتے رہیں۔"(۴)

---

(۱) مشاہیر علماء ہند کے علمی مراسلے ص ۳۵

(۲) ایضاً ص ۴۵

(۳) ایضاً ص ۵۴

(۴) ایضاً ص ۲۲

سید صاحب کے علامہ اعظمیؒ سے دیرینہ تعلقات کے بارے میں اگر تفصیل سے لکھا جائے تو ایک مستقل دفتر تیار کیا جا سکتا ہے، بطور مشتے نمونہ از خروارے چند باتیں ذکر کی جا رہی ہیں، شاہ معین الدین ندوی سید صاحب کے تعلقات کی نسبت تحریر فرماتے ہیں:

"علمی دائرے میں سید مناظر احسن گیلانی، مولانا ابو بکر شیث جونپوری، مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی اور مولانا ابوالکلام آزاد سے زیادہ تعلقات تھے۔"(۱)

اس کے بعد مزید فرماتے ہیں:

"مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی اگرچہ سید صاحب سے عمر میں بہت چھوٹے تھے، لیکن حدیث اور فقہ پر گہری نظر تھی، اس لئے سید صاحب ان کی بڑی قدر کرتے تھے، اور فقہی مسائل میں ان سے مشورہ کرتے تھے۔"(۲)

اوپر مولانا عبدالباری اثری کے کچھ خطوط ذکر کیے گئے ہیں، جن سے دونوں بزرگوں کے تعلق پر روشنی پڑتی ہے، یہاں ہم ان کے ایک مضمون کا اقتباس نقل کر رہے ہیں، جو ریاض الجنۃ (مارچ، اپریل ۱۹۸۹ء) کے شمارے میں ابو علی آصفی کے قلمی نام سے شائع ہوا ہے، اس میں رقم طراز ہیں:

"وہ (مولانا اعظمی) ایک زمانہ میں رجال پر عربی میں ایک کتاب بھی تالیف فرما رہے تھے، اسی سلسلہ میں مولانا سید سلیمان صاحب علیہ الرحمۃ کے زمانۂ قیام میں ان کا اکثر دارالمصنفین میں آنا جانا ہوتا تھا، وہ کتب خانہ میں رجال و طبقات و تراجم کی کتابوں کی الماریوں کے سامنے بیٹھ جاتے تھے، اور اپنے کام میں مشغول ہو جاتے تھے، معلوم نہیں وہ پایۂ تکمیل کو پہنچی یا نہیں، اس سلسلہ میں دارالمصنفین میں کئی کئی روز تک قیام ہو جاتا تھا اور اس ضمن میں دونوں باکمالوں میں خوب خوب راز و نیاز کی باتیں ہوتیں۔ رفتہ رفتہ دونوں ایک دوسرے کے

---

(۱) حیات سلیمان ص ۷۶۳، المآثر ج ۲ ش ۱ ص ۴۹

(۲) حیات سلیمان ص ۷۶۳، المآثر ج ۲ ش ۱ ص ۴۹

لہجہ کے قدرداں، گرویدہ اور شیفتہ ہوگئے، دونوں صاحب ہمہ وقت ایک ساتھ رہتے تھے، ایک ساتھ فجر کے بعد میلوں ٹہلتے تھے، آخر عمر میں تو سید صاحب ان کے علم وفضل اور تفقہ کے بہت زیادہ قائل اور معترف ہوگئے تھے، اور اپنی ہر تحریر پر نظر ثانی کیلئے ان کے پاس مئو بھیجتے تھے، اور ان کی توثیق کے بعد پریس میں دیتے تھے، وہ ان کو دارالمصنفین میں اپنا جانشین اور رفقاء مصنفین کا نگراں بھی بنانا چاہتے تھے، سید صاحب کے اعظم گڈھ کے پورے زمانۂ قیام میں ان کا کوئی دوست تھا تو یہی تھے، وہ جب اپنی ضرورت کے لئے دارالمصنفین آتے تھے تو ان کو دیکھ کر باغ باغ ہو جاتے تھے، اور لطف صحبت کے لئے ہفتوں ان کو روک لیتے تھے۔"(۱)

سید صاحب ۱۳ر رمضان المبارک ۱۳۵۷ھ کو علامہ اعظمی کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

"آپ ہوا کی طرح آتے ہیں اور بجلی کی طرح نکل جاتے ہیں، تو آپ کو سلطان بایزید کی طرح "یلدرم" کیوں نہ کہا جائے، اس کے معنی برق وباد کے ہیں، آندھی کی طرح ملکوں میں فتح کے لئے آتا تھا اور فتح کے بعد بجلی کی طرح غائب ہو جاتا تھا۔"

مولانا ابوالوفاء افغانی (۲) مولانا ابوالوفاء افغانی کا شمار اس دور کے محقق اور جید و باکمال اہل علم میں تھا، اصلاً افغانی تھے اور ۱۳۱۰ھ میں عید اضحی کے دن قندھار میں پیدا ہوئے تھے، نام سید محمود شاہ قادری حنفی بن مبارک شاہ قادری حنفی تھا، مگر ابوالوفاء افغانی کے نام سے شہرت پائی۔ زمانۂ طالب علمی میں ہندوستان آئے اور رامپور و گجرات میں تحصیل علم کے بعد ۱۳۳۰ھ میں حیدرآباد پہنچے، مدرسہ نظامیہ میں داخلہ لیا اور وہیں سے فارغ ہوئے۔ اور پھر حیدرآباد ہی کے ہو رہے، فراغت کے بعد مدرسہ نظامیہ میں

(۱) ریاض الجنۃ ص ۴۷

(۲) مولانا افغانی کا تذکرہ شیخ ابوغدہ کی کتاب "العلماء العزاب" سے مختصراً ماخوذ ہے۔

درس دینا شروع کیا، پھر " لجنة احیاء المعارف النعمانیة " کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا، جس سے بہت سی بیش قیمت اور نادر کتابیں شائع ہوئیں۔

مولانا افغانی کی شخصیت بہت سے ظاہری و باطنی اور علمی واخلاقی اوصاف و کمالات کا مجموعہ تھی، علم وفضل میں ان کا پایہ نہایت بلند تھا، ادب و تاریخ اور فقہ وحدیث میں سند کا درجہ حاصل تھا، بالخصوص فقہ حنفی کے ساتھ ان کا شغف مثالی تھا۔ علم کے لئے انھوں نے دنیا کو تج دیا تھا، عیش و آرام اور راحت و آسائش ان کے لئے متروکات سخن کے درجہ میں تھیں، شادی نہیں کی اور پوری عمر تجرد کی حالت میں گزار دی۔

متعدد بیش قیمت کتابیں ان کی تحقیق و تعلیق سے شائع ہوئیں، جن میں سے اکثر حنفی فقہ ومذہب سے تعلق اور نوادرات کی حیثیت رکھتی ہیں۔

مولانا افغانی کا علامہ اعظمی سے خاص تعلق تھا، ان کے سینکڑوں خطوط علامہ اعظمی کے ذخیرۂ مکاتیب میں اب بھی محفوظ ہیں، یہ زیادہ تر علمی گفتگو پر مشتمل ہیں، اپنے خطوط میں وہ علامہ اعظمی کو جن القاب سے مخاطب کرتے ہیں انھیں پڑھ کر حیرت ہوتی ہے، اس وقت ایک خط کا ٹکڑا ہیں نقل کروں گا، جو ربیع الاول ۱۳۸۲ھ کا مکتوب ہے لکھا ہے:

"... کرم نامہ نے عرصہ کے بعد اپنے ورود سے مسرور کیا، کاش بیماری کے وقت مطلع کیا جاتا تو بقیہ احباب کی دعاؤں کے ساتھ اس حقیر ناکارہ کی دعائیں بھی جاری رہتیں ... اللہ جل شانہ آپ کو تندرستی وصحت کاملہ عطا فرمائے آپ کی ہستی اس وقت اہل علم کیلئے رحمت ہے ..."

کتاب الزہد والرقائق جب علامہ اعظمی کی تحقیق و تعلیق سے چھپنے کو ہوئی، تو اس پر مولانا افغانی نے اپنے تاثرات کا اس طرح اظہار فرمایا:

"فقد اطلعت على كتاب الزهد للإمام ابن المبارك رحمه الله، الذى رتب أصوله و صححها وعلق عليه العلامة اللبيب الحبيب مولانا الشيخ حبيب الرحمن الاعظمى . لا زال ناصراً للسنة و قد قرظه

فوجدته ماهراً للعلوم حاويا بها أمينا لرواياته ، حل فى تعليقه مشكلات الكتاب و خرج أحاديثه وآثاره ، وقدمه بمقدمة ثمينة مفيدة تدل على سعة اطلاعه وطول باعه ، قل له نظير في علماء زماننا ۰۰۰ (۱)

(میں نے امام ابن مبارک رحمہ اللہ کی "کتاب الزھد والرقائق" دیکھی، جس کے اصول کی ترتیب اور تصحیح وتعلیق علامہ لبیب وحبیب مولانا شیخ حبیب الرحمٰن الاعظمی مدفیوضہ نے کی ہے، پس میں نے ان کو علوم کا ماہر وجامع اور روایات کا امین پایا، انھوں نے اپنی تعلیقات میں کتاب کے مشکل مقامات کو حل کیا، اس کی احادیث وآثار کی تخریج کی اور اس پر ایک قیمتی اور مفید مقدمہ لکھا، جس سے ان کی وسعت معلومات اور ید طولیٰ کا پتہ چلتا ہے، ہمارے زمانے کے علماء میں ان کی نظیر کم ملے گی۔"

مولانا مناظر احسن گیلانی کرشاتی قلم کے مالک مولانا مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ ان منتخب علماء روزگار میں سے تھے جنھوں نے اپنے قیمتی شاہکاروں کی بدولت اسلامی علوم وفنون اور مذہبی لٹریچر میں بیش بہا اضافہ کیا، اللہ رب العزت نے ان کے قلم میں حیرت انگیز قوت اور عجیب تاثیر بخشی تھی کہ انھوں نے متعدد موضوعات کو اپنے قلم کی جولانگاہ بنایا اور ہر ایک کے اندر قلم کی صناعی کا حیرت انگیز مظاہرہ کیا۔ ان کی شخصیت بڑی جامع الفنون تھی، تدریس وتعلیم ہو یا تصنیف وتالیف دونوں میں یکتائے دہر تھے، علم وفن میں حدیث وفقہ ہو یا ادب وفلسفہ ہر ایک پر مہارت تامہ اور قدرت کاملہ رکھتے تھے، آپ کی تحریروں میں اسلامی غیرت، مذہبی جوش، فکر کی گہرائی، زبان کی حلاوت اور بلاغت کا حسن ہر ایک کا فیضان اور تلاطم ہوتا ہے۔

دارالعلوم دیوبند کے نہایت باکمال فضلاء میں تھے اور تین ضخیم جلدوں میں "سوانح قاسمی" لکھ کر اپنی قاسمیت کا حق ادا کر دیا، معقول ومنقول کے علاوہ تقریر وخطابت

(۱) کتاب الزھد والرقائق ص ۶۴

اور سلوک و تصوف میں بھی نمایاں مقام حاصل تھا۔ بہار کی خاک سے اٹھے تھے، نشو ونما اور تعلیم وتربیت آبائی وطن گیلانی کے علاوہ ٹونک میں ہوئی، دار العلوم سے فراغت ہوئی اور وہیں سے فروغ بھی پایا۔ پھر حیدر آباد تشریف لے گئے جہاں تقریباً پچیس سال تک جامعہ عثمانیہ نظامیہ حیدر آباد میں تعلیمی خدمات انجام دیتے رہے، اور بالآخر شعبۂ دینیات کے صدر مقرر ہوئے اور اس طرح دین و دنیا دونوں کی وجاہت آپ کا مقدر بنی، تصانیف میں بیش قیمت کتاب "تدوین حدیث" ہے جس کو حجیت حدیث کے اثبات میں تصنیف فرمایا ہے۔

یہ نہایت عجیب بات ہے کہ علامہ اعظمی اور مولانا گیلانی کے درمیان ملاقات کی نوبت کبھی نہ آسکی، البتہ دونوں بزرگ ایک دوسرے کے فضل و کمال کے قائل اور معترف تھے، جب مولانا مناظر احسن گیلانی نے علامہ اعظمی کی کتاب "نصرۃ الحدیث" ملاحظہ فرمائی تو ۵/اپریل ۱۹۴۲ء کو حیدر آباد سے ایک خط لکھا جس میں علامہ اعظمی کے علم و فضل کا اعتراف یوں فرمایا:

"میں نے آپ کی کتاب نصرۃ الحدیث اول سے آخر تک پڑھی، ماشاء اللہ آپ نے کافی محنت اور مطالعہ فرمایا ہے، نئی چیزیں اس سلسلہ میں آپ نے پیش کی ہیں، خدا آپ کو جزائے خیر دے ... اس موضوع پر خاکسار نے بھی کچھ لکھا ہے ... اس لئے آپ کی محنت اور تلاش کی داد جیسا کہ چاہیئے میں ہی دے سکتا ہوں۔ اگر حکم ہو ... تو آپ کی کتاب پر مفصل ریویو لکھنا اپنی سعادت خیال کروں گا ... آپ جیسے دین کے مخلص خدام کا سرمایہ عز و شرف فی الدنیا والآخرۃ ہے۔"

مولانا محمد یوسف بنوریؒ امام العصر علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے ممتاز شاگرد اور ان کے علم کے شارح تھے، حدیث کے فہم و تفقہ میں کمال حاصل تھا، بلکہ وہ اس میدان میں نادرۂ روزگار اور نابغۂ عصر خیال کئے جاتے تھے، عربی زبان و ادب میں ید طولیٰ حاصل تھا، مزید برآں ایک بلند پایہ خطیب و مقرر بھی تھے، تقسیم وطن کے بعد پاکستان منتقل ہوگئے اور وہاں

کے مشہور شہر کراچی کے اندر ایک عظیم الشان مدرسہ قائم کیا، پاکستان جانے کے بعد قادیانیوں کے خلاف زندگی بھر سرگرم عمل رہے، اور جب تک زندہ رہے ان کے لئے پیام مرگ بنے رہے ، وہ ایک عظیم مصنف بھی تھے ، ان کی تصانیف میں نمایاں ترین ترمذی شریف کی شرح "معارف السنن" (عربی) اور "نفحة العنبر فی هدی الشیخ انور" (عربی) علامہ انور شاہ کی سوانح حیات ہے، ان کا انتقال پاکستان ہی میں ۱۳۹۷ھ کے اواخر میں ہوا، ان کی وفات کے بعد علامہ اعظمی نے لکھا:

> "اس دور قحط الرجال میں مولانا کا فقدان اتنا بڑا خسارہ ہے کہ اس کی تلافی کی کوئی صورت نظر نہیں آتی ، ایسا کامل مدتوں میں پیدا ہوتا ہے ، مولانا بہت سے کمالات علمی و عملی کا مجموعہ تھے اور بڑے عزم و ہمت کے آدمی تھے، ہمارے استاذ مرحوم کے شاگردوں میں ان کو ایک خاص امتیاز حاصل تھا، جو بات ان میں تھی وہ کسی دوسرے میں نہیں تھی۔" (۱)

کہتے ہیں کہ " بزرگاں را بزرگاں می شناسند " باوجودیکہ دونوں شخصیتوں میں معاصرت تھی، لیکن دونوں میں سے کوئی بھی دوسرے کی فضیلت و برتری کے اقرار میں بخل سے کام نہیں لیتا تھا، مولانا یوسف صاحب علامہ اعظمی سے حد درجہ محبت کا برتاؤ اور انس و تعلق کا اظہار فرماتے تھے، کراچی کا مدرسہ قائم کرنے کے بعد انھوں نے بہت کوشش کی کہ علامہ اعظمی پاکستان منتقل ہو جائیں اور اس مدرسہ سے وابستہ ہو جائیں اور دونوں حضرات ساتھ مل کر علم اور دین کی خدمت انجام دیں۔ اوپر آپ مولانا بنوری کے متعلق علامہ اعظمی کی تحریر پڑھ چکے ہیں، مولانا بنوریؒ کی نظر میں علامہ اعظمی کا کیا مرتبہ و مقام تھا اس کو بھی ملاحظہ فرمالیں، ایک بار مکہ مکرمہ میں شیخ سلیمان صنیع کے ہاں ایک دعوت میں مولانا بنوری نے شیخ موصوف سے علامہ اعظمی کا تعارف کرتے ہوئے فرمایا:

" هو من أكابر أصحاب شيخنا " (۲) (وہ ہمارے استاد کے عظیم ترین شاگردوں میں سے ہیں)

---

(۱) المآثر ج ۷ ش ۳ ص ۸۸ (۲) ایضاً ص ۸۹

۱۰/ جنوری ۱۹۷۸ء کو مولانا طاسین صاحب نے علامہ اعظمی کے پاس ایک خط میں لکھا:

"غائبانہ آپ کا ذکر خیر جن تعریفی الفاظ کے ساتھ فرمایا کرتے تھے ہم لوگ سن کر حیران رہ جاتے، وہ (مولانا بنوری) آپ کو اپنے وقت کا عظیم محدث فرمایا کرتے تھے۔(۱)

مولانا عبدالماجد دریابادی مفسر قرآن مولانا عبدالماجد دریابادی قدیم وجدید کا سنگم تھے، اردو زبان وادب کے صاحب طرز اور بے مثل ادیب وانشا پرداز، انگریزی زبان کے ماہر علوم عقلیہ اور ادب وفلسفہ کے عظیم شناور تھے، ایک مدت تک مغربی فلسفہ کے دام فریب کا شکار رہے، اس وقت قلب ودماغ پر مغربی افکار کا غلبہ تھا، اسی دھن میں یورپین فلاسفرز اور ادباء کی بے شمار کتابوں کا مطالعہ کر ڈالا، لیکن اس کی فریب کاری زیادہ دنوں تک پوشیدہ نہ رہ سکی اور اس کے بطلان کا جلد ہی ان کے اوپر انکشاف ہو گیا، یورپین فکر وفلسفہ کی طرف جس زور کا مد تھا، اس سے زیادہ تیزی اور شدت کیساتھ جزر ہوا، اب جو اس ظلمت کدے سے نکلے ہیں تو روشنی کی تلاش ہوئی، اور روحانیت ان کے اوپر اس طرح غالب آئی کہ خانقاہ امدادیہ اور آستانہ مدنی دونوں سے ربط وتعلق پیدا ہوا۔

مولانا عبدالماجد دریابادی کو زبان وادب پر زبردست قدرت حاصل تھی، قلم میں بلا کا زور تھا، تصنیف وتالیف کے علاوہ میدان صحافت میں بھی نمایاں کارنامے انجام دیئے، اور ایک مدت تک "سچ" اور "صدق جدید" نکال کر اس کی ادارت کے فرائض انجام دیتے رہے، اس طرح اردو زبان اور اسلامی فکر کی بھرپور خدمات انجام دیں۔

مولانا دریابادی نے چونکہ انگریزی زبان کا وسیع مطالعہ کیا تھا اور یورپ میں ہونے والے جدید انداز بحث وتحقیق سے بخوبی واقف تھے، اس لئے علامہ اعظمی کی تحقیقی کاوشوں کی قدر وقیمت کا بھی انھیں خوب اندازہ تھا، یہی وجہ ہے کہ ان کے تحقیقی کارناموں کو نہایت قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے، انھوں نے علامہ اعظمی کی علمی اور حدیثی خدمات کو

(۱) المآثر ج ۷ ش ۳ ص ۹۱

جن بلند آہنگ الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا ہے وہ ان کی روشن دماغی، کشادہ دلی اور قدر دانی کا بین ثبوت ہے۔

علامہ اعظمی کی شبانہ روز کدوکاوش اور تحقیق و تعلیق سے مسند حمیدی جب شائع ہوئی ہے تو اس کی جلد ثانی پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا دریابادی رقم طراز ہیں:

"اس نایاب کتاب کا پتہ لگانا بجائے خود ایک کارنامہ تھا، چہ جائیکہ اس کی پوری ترتیب و تہذیب، تصحیح و مقابلہ، تحشیہ اور متعدد فہرستوں اور اشاریہ دیباچہ وغیرہ کا اضافہ، یہ سعادت و کرامت ایک ہندوستانی محقق مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی کے حصہ میں آئی، جس پر انھیں علمی و دینی طبقہ کی طرف سے جتنی بھی مبارکباد دی جائے کم ہے۔"(۱)

اسی موقع پر پھر فرماتے ہیں:

"علمی تحقیق و تدقیق اب تک مستشرقین ہی کا حصہ سمجھی جاتی رہی ہے، مولانا اعظمی سلمہ اللہ نے عین اسی رنگ میں ڈوب کر ہندوستان کا نام سارے عالم اسلام میں بلند کر دیا ہے۔"(۲)

اسی طرح علامہ اعظمی کے ایک اور تحقیقی شاہکار کتاب الزہد والرقائق پر تبصرہ کرتے ہوئے "صدق جدید" ۲ر جون ۱۹۶۷ء میں محدث عصر کی خدمات حدیث کی یوں مدح سرائی کرتے ہیں:

"محدث وقت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی کی خدمات فن حدیث میں یوں بھی کچھ کم نہ تھیں، مستحق تہنیت و تبریک ہیں کہ اس نادر کتاب کی بھی تدوین کی سعادت انھیں کے حصہ میں آئی۔

کتاب اس قابل ہے کہ یورپ اور امریکہ جائے اور وہاں کے ماہرین

---

(۱) صدق جدید ۶ر مارچ ۵۴ء بحوالہ المآثر ج ۲ ش ۱ ص ۵۲

(۲) حوالہ بالا

اسلامیات دیکھیں کہ ہندوستان کے ایک قصبہ میں بیٹھ کر ایک گوشہ نشین نے وہ کام کر دیا، جو مستشرقین اپنے لامحدود ذرائع کے بعد ہی انجام دے پاتے ہیں۔"(۱)

علامہ اعظمی کے ایک اور قابل فخر علمی و تحقیقی کارنامے امام سعید بن منصور کی "کتاب السنن" کی تحقیق و اشاعت پر خراج تحسین پیش کرتے ہوئے "صدق جدید" (ص ۴) پر فرماتے ہیں:

"ہندوستان کے خادمان حدیث اور ماہرین علم حدیث کی اگر مختصر ترین فہرست ہی تیار کی جائے تو اس میں چوٹی کا نام مولانا حبیب الرحمٰن (مئو۔ ضلع اعظم گڈھ) کا ہوگا، مرتب و مدون مسند الحمیدی وغیرہ۔"(۲)

پھر آگے چل کر مزید فرماتے ہیں:

"کتاب کی تہذیب و تدوین اور تحشیہ وغیرہ کا کام مولانا اعظمی کا کیا ہوا ہے، اور حیرت ہوتی ہے ان میں اس کام کی اتنی سلیقہ مندی اور مہارت بغیر یورپ گئے ہوئے اور مستشرقین کی صحبت اٹھائے کیسے پیدا ہو گئی ہے۔"(۳)

مولانا عامر عثمانی | دیوبند سے شائع ہونے والے مشہور ماہنامہ "تجلی" کے ایڈیٹر تھے، زبان و قلم پر بلا کی قدرت حاصل تھی، نہایت شستہ اور شگفتہ تحریر تھی، زبان میں روانی ایسی جیسے دریا کا بہاؤ، زبردست نقاد جس کی نوک قلم سے بہت کم لوگ بچے، طنز و مزاح ہو یا واقعہ نگاری، دونوں کے اندر بھرپور طباعی کا مظاہرہ کیا ہے، آپ کی زیر ادارت شائع ہونے والا رسالہ "تجلی" ملک کے علمی و ادبی حلقوں میں بھرپور شہرت کا حامل ہوا ہے۔

مولانا عثمانی مرحوم نے علامہ اعظمی کے وفور علم، دقت نظر، براعت و مہارت، اور فضل و کمال کا بھرپور طریقے سے اعتراف کیا ہے، اور ان کے علمی کارناموں کی کھلے دل

---

(۱) المآثر ج ۲ ش ۱ ص ۵۳

(۲) صدق جدید ۲؍ اگست ۱۹۶۸ء (۳) ایضاً

سے داد دی ہے، علامہ اعظمی کی عظیم الشان تصنیف "رکعات تراویح" پر اپنے تبصرہ میں فرماتے ہیں:

"مولانا اعظمی فن حدیث میں قابل رشک براعت و مہارت کے سرمایہ دار ہیں، اور صرف ہندوپاک ہی کے نہیں دنیائے عرب کے ارباب نظر بھی ان کے کمال تجر کے معترف ہیں"(۱)

اسی مضمون میں آگے چل کر لکھتے ہیں:

"مولانا اعظمی کا خداداد کمال یہ ہے کہ انتہائی دقیق و نازک نکات فن کو بھی اس سلاست و بلاغت کے ساتھ سپرد قلم فرماتے ہیں کہ ابہام اور ژولیدگی کے بغیر بات آئینہ ہو جاتی ہے، ان کی قوت حافظہ کا تو ہمیں علم نہیں، لیکن ان کے رشحات قلم میں فراست کا جو نور، جو گیرائی، جو عبور اور جو کامل دسترس پائی جاتی ہے اس سے خاتم المحدثین علامہ انور شاہ صاحب کشمیریؒ کی یاد تازہ ہو جاتی ہے، وہی روشن دراست، وہی استحضار، وہی نگاہ کی جامعیت، وہی تجر اور وہی شان نقد۔"(۲)

رکعات تراویح کو حسب ذیل الفاظ میں خراج تحسین پیش کرتے ہیں:

"امام عصر مولانا اعظمی کی تالیف "رکعات تراویح" ایک بیش بہا کتاب ہے ... ٹھوس اور گہرا علم رکھنے والے بشرطیکہ علم کو سہارنے والا مضبوط دماغ بھی ان کے پاس ہو، انشاءاللہ یہی کہیں گے کہ مولانا اعظمی نے مسلک حنفی کے احقاق کا حق ادا کر دیا ہے۔"(۳)

مولانا عثمانی مرحوم سلسلۂ علمی کے اس طلائی حلقہ کے بعد واقع ہونے والے فراغ و خلا کو گویا اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے، اپنے اس احساس و شعور کا اظہار وہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

---

(۱) تجلی اکتوبر ۶۳ء ص ۵۵-۵۴ (۲) ایضاً ص ۵۵ (۳) ایضاً ص ۵۶

"کاش مولانا اعظمی قریب ہوتے تو ہم ان سے بہت کچھ سیکھتے، آس پاس اونچی دوکان والے تو بہت ہیں، مگر علم و تفقہ کی ایسی دُکانیں اب نایاب ہوتی جارہی ہیں جن کا پکوان پھیکا نہ ہو، ہمارا تو خیال یہ ہے کہ اب زمانہ ہم جیسے نام کے علامہ تو ضرور پیدا کرے گا، شمس العلماء، حکیم الاسلام، ارسطوئے دوراں اور مٹی کے بقراط بھی ضرور جنم لیتے ہی رہیں گے، لیکن انور شاہ، شبیر احمد عثمانی اور حبیب الرحمن الاعظمی... جیسے لوگوں کی مسند نہ جانے کب تک خالی رہے گی۔

کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگن عشق
ہے مکرر لبِ ساقی پہ صلا "ان کے بعد"(۱)

مولانا سعید احمد اکبر آبادی: بڑے صاحب فضل و کمال اور محقق عالم تھے، علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے ارشد تلامذہ میں تھے، نہ صرف ہندو پاک، بلکہ عالم اسلام کے علمی حلقوں میں عزت و توقیر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے، دین کے ساتھ دنیوی وجاہت کے حامل، ہمہ گیر اور ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے، طبقۂ علماء کے درمیان ان کا اپنا ایک مقام تو تھا ہی، ساتھ ساتھ ہندوستان کے مؤقر علمی اداروں اور تعلیمی مراکز کے اہم عہدوں اور باعزت مناصب پر بھی فائز رہ چکے تھے، ایک مدت تک مدرسہ عالیہ کلکتہ کے شعبۂ دینیات کے پرنسپل، علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ دینیات (faculty of Theology) کے ڈین، اور شیخ الہند اکیڈمی دیوبند کے ڈائرکٹر رہ چکے تھے، ماہنامہ "برہان" کے اڈیٹر اور بے شمار علمی و تحقیقی کتابوں کے مصنف تھے۔

مولانا سعید احمد اکبر آبادی مرحوم علامہ اعظمی کے شیفتہ و شیدا تھے، بلکہ سچ یہ ہے کہ وہ ہندوستان کے ان گنے چنے لوگوں میں ایک تھے جنھوں نے ان کا (علامہ اعظمی کا) مقام و مرتبہ پہچانا، یہاں تک کہ جب وہ اپنے ایک سفر پر مصر تشریف لے گئے تو وہاں کے ایک مشہور عالم و محقق ڈاکٹر رشاد عبدالمطلب کے سامنے نہایت فخر و ناز کے ساتھ

(۱) تجلی اکتوبر ۶۳ء ص ۵۷

علامہ اعظمی کی تحقیق سے شائع ہونے والی کتاب مسند حمیدی کا تذکرہ کیا، مولانا اکبر آبادی کی گرویدگی اور ان کا والہانہ پن اس وقت قابل دید ہوتا تھا جب مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند یا کسی دوسرے موقع پر ان کی ملاقات ہوتی تھی۔

علامہ اعظمی کے تئیں مولانا اکبر آبادی کے شدت جذبات اور ان کی توقیر و تعظیم کا اندازہ اس سے لگایئے جب انھوں اپنی مایہ ناز کتاب "صدیق اکبر" کے طبع اول کے بعد طبع دوم سے قبل اس پر نظر ثانی کرانی چاہی اور اس کے لئے ان کی نگاہ انڈوپاک میں صرف علامہ اعظمی پر پڑی، اس کا حال انھوں نے خود "صدیق اکبر" طبع دوم کے مقدمہ میں تحریر فرمایا ہے لکھتے ہیں:

"پھر میں نے مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی کو جن سے بڑھ کر فن حدیث واسماء الرجال کا محقق و مبصر میرے نزدیک آج انڈوپاک میں کوئی عالم نہیں ہے، دیرینہ نیازمندی کی بناء پر خط لکھا کہ:

"اگر آپ "صدیق اکبر" کو ایک مرتبہ ملاحظہ فرمالیں اور اس میں جو غلطیاں ہیں ان کی نشاندہی فرمادیں تو مجھے اطمنان ہوجائے"

مولانا نے از راہ شفقت بزرگانہ اس درخواست کو بڑی خوشی سے قبول فرمایا اور کتاب کا ایک ایک لفظ پڑھ کر غلطیوں سے مطلع فرمایا، میں نے نظر ثانی میں مولانا کے خط سے مکمل استفادہ کیا ہے اور اس غیر معمولی توجہ اور زحمت فرمائی کیلئے صمیم قلب سے شکر گذار ہوں۔"(۱)

علامہ اعظمی کی تحقیق سے جب "المطالب العالیہ" شائع ہوئی، تو اس پر اپنے مؤقر رسالے "برہان" میں تبصرہ کرتے ہوئے تحریر فرمایا:

"الشیخ الاستاد مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی ان محققین علماء میں سے ہیں

---

(۱) صدیق اکبر ص ۲۷

ہیں جو اگرچہ اپنے وطن میں "غریب شہر" ہیں، لیکن عرب ممالک میں ان کے علم و فضل اور شہرت و عظمت کا طوطی بولتا ہے اور اس شہرت و عظمت کی بنیاد حدیث کی نادر اور اہم کتابیں ہیں جن کے مخطوطات کو آپ نے تحقیق و ترتیب کے موجودہ علمی اصول کے مطابق ایڈٹ کر کے شائع کیا ہے۔"(۱)

علامہ اعظمی کے نام لکھے ہوئے مولانا اکبر آبادی کے بہت سے خطوط بحمد اللہ محفوظ ہیں، ان میں سے کچھ خطوط کی عبارتیں ذیل میں نقل کی جارہی ہیں، ۲۸ر اگست ۱۹۵۸ء کے خط میں لکھتے ہیں:

"آپ یقین مانئے ہندوپاک کے علمائے محققین میں آج کل میں صرف ایک تنہا آپ کی ذات کو مانتا ہوں جن سے علمی امور میں رجوع کرنا اپنا علمی فرض سمجھتا ہوں۔"

۲۴ر دسمبر ۱۹۶۷ء کے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

"میں نے کتاب الزھد والرقائق پوری پڑھ لی ہے، اگرچہ "چھوٹا منہ بڑی بات" ہے مگر واقعہ یہ ہے کہ آپ کا علم و فضل، بصیرت و دقت نظر اور وسعت نظر کی داد نہیں دی جاسکتی، ۰۰۰ اس کا افسوس تھا کہ برصغیر ہندوپاک میں قاہرہ کے ساعاتی، احمد محمد شاکر اور کوثری جیسے محقق علماء نظر نہیں آتے؛ لیکن الحمد للہ آپ نے نہ صرف تلافی کردی ہے، بلکہ ان حضرات سے بھی بعض چیزوں میں سبقت لے گئے ہیں، ابقاکم اللہ بالصحۃ والعافیۃ لخدمۃ العلم والدین علی ھذا المنوال المتین"

۲۰ر مارچ ۱۹۶۸ء کو سنن سعید بن منصور ملاحظہ فرمانے کے بعد لکھتے ہیں:

"پرسوں کتاب السنن لسعید بن منصور کا ایک نسخہ ملا، اور کل کسی طرح وقت نکال کر بہت کچھ پڑھ گیا۔ سبحان اللہ، صل علی، آپ اور ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے ـــــ

(۱) برہان اپریل ۱۹۷۲ء ص ۲۷۸

کیا عجیب و غریب کارنامہ انجام دیا ہے، دنیائے علم و تحقیق آپ دونوں حضرات کا جتنا بھی شکریہ ادا کرے اور احسانمند ہو کم ہے، آپ نے ادھر چند سالوں میں کیا کچھ کر دکھایا! جب اس کا خیال کرتا ہوں تو ہر بن مو سے آپ کے لئے دعائیں نکلتی ہیں"

۳/اگست ۱۹۶۸ء کو لکھتے ہیں:

"والا نامہ شرف صدور لایا، اس حوصلہ افزائی اور کرم گستری کے لئے ممنون ہوں، ورنہ در حقیقت میں اس لائق کہاں کہ آپ کی علمی رفعتوں کا سراغ لگا سکوں"

مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کے فرزند دلبند اور خلف الرشید تھے۔ دین و سیاست دونوں میدانوں میں صف اول کے لوگوں میں رہے، مسند درس وافتاء پر فائز رہنے کے علاوہ قومی وملی خدمات میں بھی پیش پیش رہا کرتے تھے، ان کا زندۂ جاوید کارنامہ دارالحکومت دہلی کے اندر "ندوۃ المصنفین" کا قیام تھا، جس کا خاکہ آپ کے ذہن کی اپج تھا، جس سے بعد میں مختلف موضوعات پر سیکڑوں کتابیں شائع ہوئیں، غرض آپ اپنے وقت میں بالغ نظر اور صائب الرائے اہل علم میں شمار کئے جاتے تھے۔

علامہ اعظمی کے علم و فضل کے بڑے معترف اور قائل تھے، اور آپ سے مکاتبت و مراسلت بھی رکھتے تھے، خطوط میں بڑے اکرام و احترام کے الفاظ سے مخاطب کرتے تھے، اپنے قیام کلکتہ کے دوران ایک خط میں لکھتے ہیں:

"آپ سے ملاقات کے لئے اب سے نہیں کئی سال سے دل چاہتا ہے، آپ کی علمی خدمات ہم سب کے لئے باعث افتخار اور مایۂ عزت ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے۔"

مولانا محمد منظور نعمانی رئیس المناظرین مولانا محمد منظور نعمانیؒ ہندوستان کے ان سر برآوردہ اہل علم میں تھے، جنھوں نے باطل کا عمر بھر ڈٹ کر مقابلہ کیا، زبان ہو یا قلم، تحریر

تقریر ہر ایک میں بے نظیر اور بے مثل قوت کے حامل تھے، ہندوستان میں اگنے اور نشوونما پانے والے مختلف فرقوں کے لئے آپ کا وجود برق و رعد سے کم نہیں تھا، بلکہ بعض باطل فرقے تو ایسے تھے کہ آپ کا نام سن کر سہم جاتے تھے، میدان مناظرہ میں چلے جاتے تو مد مقابل پہ خوف اور مرعوبیت طاری ہو جاتی۔

بعد میں مناظروں میں شرکت ترک کر چکے تھے، لیکن جہاد بالقلم میں عمر بھر مصروف رہے، فرق باطلہ کے رد کے علاوہ مختلف علمی موضوعات پر نہایت بیش قیمت کتابیں تصنیف فرمائیں، جن میں معروف تر "معارف الحدیث" ہے، اور اس کتاب پر علامہ اعظمیؒ سے ایک مقدمہ بھی لکھوایا جو چالیس صفحات پر مشتمل ہے؛ آپ کے اہم ترین کارناموں میں ماہنامہ "الفرقان" کا اجراء بھی ہے، جو پہلے بریلی اور بعد میں لکھنؤ سے علی التواتر شائع ہو رہا ہے۔

مولانا نعمانیؒ علامہ اعظمیؒ کے شاگرد تھے، دونوں بزرگوں کی عمر میں بہت کم تفاوت تھا، مگر اس کے باوجود مولانا نعمانی تا حیات اپنی اس شاگردی پر فخر کرتے رہے، اور اس کا برملا اور بلا تأمل اظہار فرماتے رہے، چنانچہ شوال ۱۴۰۷ھ مطابق جون ۱۹۸۷ء کے آخر میں خود راقم الحروف مولانا مرحوم کی خدمت مبارکہ میں حاضر ہوا تو مولانا مرحوم نے چند کتابوں کا نام لے کر فخر و مباہات کے انداز میں فرمایا کہ یہ کتابیں میں نے مولانا (علامہ اعظمی) سے پڑھی ہیں، پھر فرمانے لگے کہ میں نے مولانا سے اس وقت بھی پڑھا ہے جب کہ ابھی خود طالب علم تھے۔ اور فراغت نہیں ہوئی تھی، یہ فخر و اعتزاز آپ کی اس بات میں صاف طور پر نظر آتا ہے جو مفتی ظفیر الدین مفتاحی نے قلمبند فرمائی ہے کہ:

"ایک دن میرے کمرہ پر کسی ممبر کو ڈھونڈھتے ہوئے تشریف لے آئے اور داخل ہو کر دروازہ کھول کر کھڑے ہو گئے، اور فرمایا: مولوی ظفیر! میں مفتاحی تو نہیں ہوں مگر حبیبی تو ہوں، یعنی ہمارا رشتہ استاد بھائی ہونے کا ہے۔"(۱)

مفتی ظفیر الدین صاحب اس واقعہ کو نقل کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں:

(۱) المآثر ج ۶ ش ۳ ص ۵۰

"یہ واقعہ ہے کہ مولانا کو حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے والہانہ تعلق تھا، اور حضرت کشمیری کے بعد علم حدیث میں ان پر پورا اعتماد تھا، اور کوئی مسئلہ آتا تو آپ کی طرف رجوع فرماتے۔"(۱)

مفتی صاحب اپنے اسی مضمون میں ایک جگہ اور تحریر فرماتے ہیں:

"اپنی خاص مجلس میں کبھی کبھی فرمایا کرتے تھے کہ مولانا اعظمی اور مولانا عبداللطیف نعمانی اس دور کے جید الاستعداد علماء میں سے ہیں، حضرت الاستاذ مولانا کشمیری کے بعد ان ہی حضرات سے میں زیادہ متاثر رہا، یہ دونوں اساتذۂ کرام اپنے اپنے فن کے درس و تدریس میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔"(۲)

مولانا منظور نعمانیؒ کی نگاہ میں علامہ اعظمی کا کیا رتبہ و مقام تھا، اس کو جاننے کے لئے مولانا نعمانیؒ کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک خط پڑھئے جسے انھوں نے ۱۹؍رجب ۱۳۵۸ھ کو بریلی سے تحریر فرمایا تھا، اس میں لکھتے ہیں:

"گذشتہ ہفتہ میں دہلی گیا تھا، وہاں مولوی عتیق الرحمٰن صاحب ناظم "ندوۃ المصنفین" اور مولوی سعید احمد اکبر آبادی ایم۔اے وغیرہ سے کچھ آنمحترم کا ذکر آگیا، اس سلسلہ میں انھوں نے کہا تھا کہ اگر مولانا وقت نکال کر ترمذی پر ایک مبسوط حاشیہ (بطرز شرح مسلم نووی) تیار فرما سکیں جس میں وہ قرض بھی ادا ہو جائے جو "تحفۃ الاحوذی" کی اشاعت کے بعد حنفیوں پر عائد ہو گیا ہے تو "ندوۃ المصنفین" تحشیہ کا معاوضہ ادا کر کے اس کو خاص اہتمام سے چھپوا سکتا ہے، اور اس بارہ میں انھوں نے مجھ سے کہا تھا کہ تو مولانا کی مرضی دریافت کر کے لکھنا، میرا خیال تو یہ ہے کہ اگر اس کے لئے وقت نکل سکے تو علم اور دین کی بڑی خدمت ہو گی، اور وقت کی ایک بڑی ضرورت انشاء اللہ پوری ہو جائے گی، جسکو پورا کرنے والے شاید آئندہ پیدا ہی نہ ہوں۔؟"

(۱) المآثر ج۶ ش۳ ص۵۱۔۵۰ (۲) ایضاً ص۴۷

مولانا عبداللطیف نعمانیؒ اس دور کے باکمال افراد میں تھے، میدان مناظرہ ہو یا مجلس وعظ و تذکیر، وادیٔ سیاست ہو یا مسند درس و تدریس، آپ کی بے پناہ استعداد و صلاحیت اور کمال و عظمت کا ہر جگہ یکساں طور پر ظہور ہوا، ذہانت و فطانت، بداہت و استحضار، زیرکی و ہوشیاری میں آپ کے پایہ و رتبہ کو بہت کم لوگ پہنچ سکے۔ آپ کی زندگی جہد مسلسل اور عمل پیہم سے عبارت تھی، سیاست میں رہے تو بلدیہ کی صدارت سے لے کر مجلس قانون ساز کی رکنیت تک آپ کے حصہ میں آئی، اور دوسری طرف منصب شیخ الحدیث پر فائز رہنے کے علاوہ صدارت تدریس اورانتظام وانصرام کا کام بھی سنبھالا، الجھی ہوئی گتھیوں کو سلجھانے اور لاینحل عقدوں کے حل میں آپ کو ملکہ تامہ حاصل تھا۔

علامہ اعظمیؒ کے ہم درس بھی تھے، ہمدم دیرینہ بھی اور مفتاح العلوم کی نشأۃ ثانیہ کے بعد آپ کے ہم سفر اور ہم نفس بھی رہے، یہاں تک کہ دونوں حضرات کا یہ باہمی تعلق زندگی کے آخری لحات تک باقی رہا، اس یگانگت اور ہم آہنگی کے باوجود دونوں بزرگوں کے فکر میں کچھ اختلاف بھی تھا، لیکن اس سے مجال انکار نہیں کہ مولانا نعمانی نے علامہ اعظمی کی فکر کا ہمیشہ پاس رکھا۔

اس معاصرت اور ہم درسی و ہم عمری کے باوصف مولانا نعمانی مرحوم علامہ اعظمی کے حد درجہ قدردان تھے، اور غایت درجہ ان کا ادب واحترام کرتے تھے، وہ ان کے علمی مرتبہ ومقام سے واقف اور ان کی شخصیت کے سچے شناسا تھے اور قلمرو علم میں کسی کو ان کا مثیل و نظیر نہیں سمجھتے تھے، ترمذی کی شرح لکھنے کا ان کا بھی بہت اصرار تھا، جس کا اظہار انھوں نے ۱۹۶۳ء میں حج کے لئے جاتے وقت بمبئی سے لکھے ہوئے ایک خط میں کیا، جو ۱۲ راپریل کا تحریر کردہ ہے، اس میں لکھتے ہیں:

"حاشیہ ترمذی محدثین کے رنگ میں احناف پر قرض ہے اور میری نگاہ میں صرف آپ کی توجہ فرمائی سے یہ قرض اوتارا جاسکتا ہے۔"

اسی قسم کے ایک اور خط میں لکھتے ہیں:

"یہاں پہنچ کر یہ احساس پھر بشدت اختیار کر گیا ہے کہ ترمذی شریف پر آپ کا ایک مختصر حاشیہ ۰۰۰ بہت ضروری ہے ۰۰۰ آج اپنی جماعت کی علمی پوزیشن اتنی کمزور ہو گئی ہے کہ اگر اب اور آپ کے ہاتھوں یہ کام نہ ہوا تو شاید پھر نہ ہو سکے۔"

مولانا عبدالمجید حریریؒ جماعت اہل حدیث کے نہایت مقتدر اور عالم و فاضل فرد تھے، بہت ہی زیرک اور ذہین و فطین تھے، عربی ادب میں کمال حاصل تھا، مجلسی آدمی تھے، جب کسی محفل میں ہوتے تو اپنی پر کیف اور دلچسپ گفتگو سے اس کو زعفران زار بنا دیتے تھے، قسام ازل کی طرف سے انھیں علم وادب کے ساتھ مال و زر اور دنیوی وجاہت سے بھی حصۂ وافر ملا تھا، وہ اہم سرکاری عہدوں اور مناصب پر بھی فائز رہ چکے تھے۔

بنارس کے ایک دولتمند گھرانے کے چشم و چراغ تھے، سیاست میں بھی جم کر حصہ لیا اور ایک زمانے میں انڈین نیشنل کانگریس کے نہایت سرگرم رکن رہے، علامہ اعظمی سے ان کے بڑے مخلصانہ تعلقات تھے اور ان کے نام ان کے متعدد خطوط موجود ہیں، جو بیشتر سیاسی امور پر مشتمل ہیں، ان خطوط کے خوبصورت انداز تحریر سے ان کی سلیقہ مندی اور نفاست پسندی کا صاف پتہ چلتا ہے۔

علامہ اعظمی جب اپنے دوسرے سفر حج پر تشریف لے گئے تو موصوف اس وقت ریاض کے شاہی کتب خانہ کے نگراں تھے اور مکہ و مدینہ میں ان دونوں بزرگوں میں بہت ساری ملاقاتیں ہوئیں، علامہ اعظمی کے علم و فضل کے کس درجہ قدرداں اور معترف تھے، اس کا اندازہ ایک خط سے لگایا جا سکتا ہے، جو انھوں نے اسی موقع پر ۳۰؍ محرم الحرام ۱۳۷۷ھ کو مدینہ منورہ سے مکہ میں سکونت پذیر اپنے کسی عزیز کو لکھا ہے:

"حامل شقۂ ہذا مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی میرے بھائی اور بزرگ ہیں۔ آج کل تو وہ مدینہ منورہ میں ہیں مگر جلد ہی ان شاء اللہ جدہ کو روانہ

ہوں گے۔ میں نے ان سے درخواست کی ہے کہ واپسی کے سفر میں اگر مکہ مکرمہ میں کچھ قیام ہو تو وہ آپ لوگوں کے یہاں قیام فرمائیں۔

مجھ کو یقین ہے وہ آپ سے اور آپ ان سے مل کر خوش ہوں گے۔

مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اجلۂ علماء ہند میں ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کو باعمل علم اور ذوق سلیم و جمیل دونوں نعمتوں سے نوازا ہے۔"

ڈاکٹر حمید اللہ حیدر آبادی فرنساوی دنیائے علم و تحقیق کی نہایت مشہور و معروف اور نامور شخصیت ڈاکٹر حمید اللہ حیدر آباد میں تولد ہوئے اور وہیں پرورش و پرداخت ہوئی، خانوادۂ علم وادب کے چشم و چراغ تھے، لہذا تعلیم و تربیت کا آغاز بھی گھر کے علمی وادبی اور حیدر آباد کے نستعلیق ماحول میں ہوا، اور بچپن ہی سے علم وادب کا ایسا چسکا لگا کہ عمر بھر نہیں چھوٹا، حصول علم اور تحصیل تعلیم کی خاصی مدت حیدر آباد میں گذری، یہ ۱۹۳۰ء کی بات ہے اس وقت حیدر آباد کا نظامی نظام تعلیم تمام ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے مرکز توجہ بنا ہوا تھا، لیکن ڈاکٹر حمید اللہ کی عنقاء صفت طبیعت کی پیاس وہاں نہ بجھنے والی تھی، لہذا انھوں نے تکمیل تعلیم کے لئے ایک ایسے ملک اور ایسی درسگاہ کا انتخاب کیا جو عصر حاضر کے صنعتی انقلاب کے بعد جدید تمدن اور تہذیب و ثقافت کا عالمی مرکز خیال کیا جاتا تھا، اور وہ جگہ تھی فرانس کی سون بورن یونیورسٹی، واضح رہے کہ جس زمانے کی ہم گفتگو کر رہے ہیں، اس وقت فرانس کی یہ درسگاہ جدید تعلیم یافتہ طبقے کا کعبہ تھی یہی وہ جگہ ہے جہاں مصر کے مشہور ادیب ڈاکٹر طہٰ حسین نے اپنا تحقیقی مقالہ لکھا تھا اور "تاریخ الادب الجاهلی" نامی کتاب لکھ ادبی تاریخ میں تہلکہ برپا کر دیا تھا، تکمیل تعلیم کے لئے ڈاکٹر حمید اللہ کی نظر انتخاب بھی اس مشہور دانشگاہ پر پڑی اور اپنا پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھ کر وہیں سے انھوں نے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی، اس کے بعد حیدر آباد واپس لوٹے اور جامعہ عثمانیہ میں تدریسی خدمت انجام دینا شروع کر دی، تاکہ طویل تجربات کے بعد جو کچھ حاصل ہوا تھا اسے اپنے ہم وطنوں کی نذر کریں، لیکن زیادہ مدت نہیں گذرنے پائی

کہ حیدر آباد میں معرکۂ دار و گیر برپا ہوا اور وہاں کی دنیا زیر و زبر ہو کر رہ گئی، اس وقت انھوں نے ہندوستان چھوڑ دینے کا فیصلہ کیا، اور اپنی آئندہ کی علمی دینی اور تحقیقی سرگرمیوں کے لئے فرانس ہی کو جولانگاہ بنایا، پیرس میں سکونت اختیار کی، اور اس کو مستقر بنا کر سارے یورپ کے مستشرقین سے دست و گریبان ہیں اور ان سے مذہبی، علمی، تحقیقی اور ثقافتی جنگ کرتے رہتے ہیں، انھوں نے اسلام کی عظمت و برتری کو ثابت کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا، اور تہذیب نو کے اس صنم کدہ میں رہ کر اسلام کی تبلیغ اور نشر و اشاعت کی خدمت انجام دی جو بہت سے دینی اور اسلامی مراکز کے لئے باعث درس اور قابل رشک ہے۔

ڈاکٹر حمید اللہ شہید جستجو اور بحث و تحقیق کے بڑے شہسوار ہیں، کثیر المطالعہ اور وسیع الافق عالم و محقق ہیں، دنیائے مغرب اور عالم اسلام میں پائے جانے والے مخطوطات کے تئیں انھیں وسیع معلومات حاصل ہیں، بیشمار علمی، ادبی، تاریخی اور تحقیقی کتابیں ان کے علم و تحقیق، ذوق جستجو اور کثرت مطالعہ کا بین ثبوت ہیں۔

ڈاکٹر صاحب موصوف بایں ہمہ علم و فضل علامہ اعظمی کے حد درجہ قدر داں اور ثناخواں ہیں، انھوں نے عملاً بھی اور قولاً بھی علامہ اعظمی کے کمال و تفوق کا کھلے دل سے اعتراف کیا ہے، اسی اعتراف و قدر دانی کا نتیجہ تھا کہ جب انھیں سنن سعید بن منصور کا مخطوطہ ترکی کے ایک کتب خانے میں دستیاب ہوا تو انھوں نے اس کی تہذیب و ترتیب اور تحقیق و تعلیق کے لئے مجلس علمی کی معرفت علامہ اعظمی کے پاس بھیج دیا، اور علامہ اعظمی نے اس کتاب کی تحقیق و تعلیق کی خدمت انجام دی، اس وقت ڈاکٹر صاحب نے علامہ اعظمی کے فضل کا اظہار، مولانا ابراہیم میاں جوہانسبرگ کو ۳ ربیع الاول ۱۳۸۳ کو لکھتے ہوئے اپنے ایک خط میں یوں کیا:

"مولانا اعظمی کے علم و فضل کے کیا کہنے، سنن سعید بن منصور کو تیار کیا فرما رہے ہیں کہ اس میں چار چاند لگا رہے ہیں۔"

اسی طرح علامہ اعظمی مصنف عبدالرزاق کی طباعت کی نگرانی کے لئے جب بیروت تشریف لے گئے، اس وقت ڈاکٹر صاحب موصوف نے ان کے پاس ایک خط لکھا، جس میں تحریر فرمایا:

"شاہ ولی اللہ ثانی کی یہ خدمت حدیث عنداللہ ماجور، عندالناس مشکور ہوگی۔"

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ہندوستان اور ہندوستان سے باہر عالم اسلام میں بھی، عوام و خواص ہر طبقے میں عزت واحترام اور تعظیم و تکریم کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں، واقعہ یہ ہے کہ مولانا ندوی مدظلہ کو جو عالمگیر شہرت حاصل ہوئی ہے، وہ کم کسی کے حصہ میں آئی ہے ، اور اس تمام شہرت و ناموری کا سبب ہے آپ کا علم و فضل، وسعت مطالعہ، وفور علم، ادب و تاریخ پر دستگاہ کامل، عربی ادب میں بے نظیر مہارت، اور اصلاح و تبلیغ کے لئے سعی پیہم اور اس کے علاوہ دیگر بہت سے اوصاف و محاسن جن کا وصف وبیان مجھ جیسے ہیچمدان کے بس سے باہر ہے۔ متانت و سنجیدگی، سلیقہ مندی و سلیم الطبعی، سادگی و بے نفسی اور انکسار و تواضع ان کی شخصیت کے اجزائے ترکیبی ہیں اور ان کی انھیں خوبیوں نے انھیں باکمال بنادیا ہے۔ دین کا درد اور اشاعت اسلام کی فکر انھیں ہر آن و ہر لمحہ بے قرار و بے تاب کئے رہتی ہے، مسلم معاشرے کا انتشار وافتراق، مسلمانوں کا دینی تعلیمات سے انحراف اور ان کا تہذیبی و ثقافتی انحطاط وارتداد ان کو ہر پل بے چین اور بے کل کئے رہتا ہے، اور یہی فکر ان کو ہمہ دم متحرک اور پا بہ رکاب رکھتی ہے اور وہ سارے عالم کے مسلمانوں کو ان کا مقصد حیات اور " کنتم خیر أمة" ہونے کا احساس دلاتے پھرتے ہیں۔

مولانا ندوی مدظلہ نہایت دانشمند اور جہاندیدہ عالم ہیں، انھوں نے ایک دنیا دیکھی ہے اور تمام اطراف واکناف کا چکر لگایا ہے، ایک سے بڑھ کر ایک جہابذۂ وقت اور عباقرۂ زمانہ سے ملاقات، مجالست اور ہم نشینی کا انھیں شرف حاصل رہا ہے اور ان تمام تجربات و مشاہدات کے بعد انھوں نے اس بات کا کھلے دل سے اعتراف کیا کہ انھیں

علامہ اعظمی جیسی دوسری شخصیت نہیں نظر آئی، اور یہی وجہ ہے کہ وہ ہندوستانی اہل علم میں علامہ اعظمی کے حد درجہ قدردانوں میں رہے ہیں، وہ علامہ اعظمی کا اسی طرح ادب و احترام کرتے تھے جس طرح کوئی شاگرد اپنے استاذ کا کرتا ہے، ملاقات ہونے پر نشست و برخاست میں ان کا پاس و لحاظ کرتے، اور یہی نہیں بلکہ ایک دفعہ دارالعلوم ندوہ میں مولانا ندوی کی دست بوسی کی سعادت اس حقیر کو حاصل ہوئی تو اس وقت انھوں نے فرمایا کہ مولانا اگرچہ میرے استاد نہیں ہیں، لیکن میں ان کو استاد ہی کی طرح سمجھتا ہوں، اور میں نے ان سے بہت استفادہ کیا ہے۔

یہاں یہ بات ممکن ہے بہت سے قارئین کے لئے حیرت کا باعث ہو کہ مولانا ندوی مدظلہ ایک شاگرد کی طرح باقاعدہ علامہ اعظمی سے استفادہ کرنا چاہتے تھے، اور انھوں نے بارہا اپنی اس خواہش کا علامہ اعظمی کے سامنے اظہار بھی کیا تھا، یہانتک کہ ۱۳۷۵ھ میں دمشق کا ان کا ایک طویل دورہ ہوا، اس وقت انھوں نے ۲۱ر رمضان المبارک ۱۳۷۵ھ کو وہاں سے ایک خط لکھا جس میں علاوہ دیگر باتوں کے تحریر فرمایا:

”جو تمنا باصرار و تکرار ظاہر کی تھی اس کے متعلق ابھی تک کوئی واضح و قطعی جواب نہیں ملا، بڑی آرزو ہے کہ آپ سے استفادہ کی منظم و مستقل شکل پیدا ہو، اگر یہ خوش خبری میں سن لیتا تو بڑی مسرت کے ساتھ واپسی ہوتی، اگر کوئی رائے قائم ہو تو مطلع فرمایا جائے۔“

مولانا ندوی کی نظر میں علامہ اعظمی کا کیا مرتبہ و مقام تھا اس کا اظہار انھوں نے بیشمار خطوط میں کیا ہے، جن میں سے چند ایک کی خاص باتیں نمونہ کے طور پر نقل کی جارہی ہیں
۱۶ر رجب ۱۳۷۶ کو لکھنؤ سے لکھتے ہیں:

”اس وقت کے علماء میں میں نہیں سمجھتا کہ مجھے کسی سے اتنی مناسبت اور عقیدت ہے جتنی آپ سے، خصوصیت کے ساتھ مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا

مناظر احسن گیلانی اور مولانا شبیر احمد عثمانی کی وفات کے بعد مجھے اس جامعیت اور ذوق و "ثقافت" کا کوئی دوسرا عالم نظر نہیں آتا، یوں یکفنی علماء اور اپنے اپنے فن کے متبحر اور بھی ہوں گے، مگر میرے ذوق کی تشفی اور جگہ نہیں ہوتی۔"

یکم محرم ۱۳۸۴ھ مطابق ۱۴ر مئی ۱۹۶۴ء کے ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:

"میری یہ عجب بد قسمتی اور عجیب سوء اتفاق، کہ میں ایک طرف تو آپ سے ایسا گہرا نیاز مندانہ تعلق رکھتا ہوں اور آپ سے ایسی علمی عقیدت ہے جو کسی دوسری معاصر شخصیت سے نہیں نہ ہندوستان میں نہ ہندوستان سے باہر مصر و شام میں، اگرچہ یہ ایک تحسین ناشناس ہے اور میرا اعتراف کوئی اہمیت نہیں رکھتا، لیکن بہر حال واقعہ ہے..."

مولانا ندوی مدظلہ کو علامہ اعظمی سے کس قدر تعلق اور کتنا گہرا لگاؤ تھا، اس کو جاننے کے لیے حسب ذیل خط پڑھیے جو ۲۶ر جمادی الآخرۃ ۱۳۸۵ھ کا رائے بریلی سے تحریر کردہ ہے، اس میں فرماتے ہیں:

"مجھے آپ سے ملنے کا شوق بھی ہے اور ضرورت بھی، آج ہی رات خواب میں بہت دیر تک زیارت کرتا رہا..."

رائے بریلی ہی سے ایک خط میں لکھتے ہیں جس پر ۳ر شوال کی تاریخ پڑی ہے لیکن سنہ درج نہیں ہے:

"حدیث و سنت کی جیسی خدمت اللہ تعالیٰ آپ سے لے رہا ہے وہ موجب صد شکر و منت ہے، ذلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء۔"

مولانا مفتی نسیم احمد فریدیؒ امروہہ کے باشندہ تھے، وہیں ۱۳۲۹ھ میں پیدا ہوئے، اور امروہہ کی ہی جامع مسجد میں ابتدائی تعلیم حاصل کی، بعد ازاں دار العلوم دیوبند تشریف لے گئے۔ جہاں تکمیل علم و فن کی، اور مولانا سید حسین احمد مدنی، مولانا سید اصغر حسین

میاں دیوبندی اور مولانا اعزاز علی رحمھم اللہ کے ابلتے ہوئے علمی سرچشموں سے فیضیاب ہوئے۔

مفتی نسیم احمد فریدیؒ کا شمار ماضی قریب کی قد آور علمی شخصیتوں میں ہوتا ہے، عوام الناس میں ان کا چرچا زیادہ نہیں تھا کیونکہ وہ خالص علمی آدمی تھے، لیکن علمی حلقوں میں ان کی شخصیت تعریف و تعارف سے بالا تھی، بلکہ اعتبار واعتماد کا درجہ حاصل تھا، ان کی ذات گوناگوں صلاحیتوں اور مختلف الجہات حیثیتوں کی حامل تھی، کامیاب مدرس، دقیق النظر مفتی، زبردست صاحب قلم اور مقالہ نگار، اور عظیم مصنف تھے، آپ کی تحقیق وتدقیق اور دقت نظر کی یادگار بہت سی تصانیف ومقالات ہیں، ان تمام خوبیوں کے ساتھ وہ غایت درجہ خاکسار، متواضع اور خوش اخلاق تھے، اور مزید یہ کہ وہ صاحب نسبت بزرگ بھی تھے، پہلے مولانا مدنی کے دامن تربیت سے وابستہ ہوئے اور ان کے دست حق پرست پر بیعت وارادت سے مشرف ہوئے، بعد ازاں مولانا محمد زکریا صاحب کے ہاتھوں اجازت وخلافت سے سرفراز ہوئے۔

علامہ اعظمی سے خاص تعلق بلکہ عقیدت رکھتے تھے، تصنیف و تالیف کے لحاظ سے کسی قدر ہم مشرب بھی تھے، اس لئے ان کے مرتبہ ومقام سے بخوبی واقف تھے، اور وقتاً فوقتاً استفادہ اور مشکل مسائل میں رجوع بھی کرتے تھے، علامہ اعظمی کے نام ان کے خطوط تو متعدد ہیں لیکن اس وقت ہم ان کے ایک خط کا ٹکڑا نقل کررہے ہیں جو ۱۱ر ذی الحجہ ۱۳۹۴ھ مطابق ٢٦ر دسمبر ۱۹۷۴ء بروز پنجشنبہ، یعنی اس وقت کا مکتوب ہے جب مکتوب الیہ کے درس حدیث سے مفتاح العلوم مئو کے درودیوار گونجا کرتے تھے، اس خط میں مفتی صاحب نے منجملہ دیگر باتوں کے لکھا ہے:

"حضرت والا دو سال سے مئو میں بخاری شریف پڑھا رہے ہیں، امسال بھی پڑھا رہے ہوں گے، جی چاہتا ہے کہ ہفتہ عشرہ کے لئے درس مبارک میں حاضری نصیب ہو۔"

مولانا عبدالحمید سواتی | مغربی پاکستان کے مشہور شہر گوجرانوالہ کے مدرسہ نصرۃ العلوم نے دفاع حنفیت کے سلسلے میں عظیم الشان اور قابل قدر خدمات انجام دی ہیں، اس ادارے کے شعبہ نشرواشاعت سے متعدد قیمتی اور بیش بہا کتابیں شائع ہو کر مقبول خاص و عام ہوئیں اور اہل علم سے خراج تحسین وصول کر چکی ہیں، اس کے ناظم و مہتمم مولانا عبدالحمید سواتی ایک صاحب علم و تحقیق آدمی ہیں، انھوں نے شاہ رفیع الدین صاحب دہلویؒ (متوفی ۱۲۳۳ھ) کے رسائل کی نشرواشاعت کے ساتھ خصوصیت کے ساتھ اہتمام برتا، چنانچہ حضرت شاہ صاحبؒ کے کئی ایک رسالے ان کی تحقیق اور توجہ سے زیور طبع سے آراستہ ہو کر ہندوپاک کے علمی حلقوں میں شیوع پذیر ہوئے۔

شاہ صاحب کے بعض رسائل کی دریافت اور اس کی نقل و تصحیح میں علامہ اعظمی نے بھی بڑی کدوکاوش کی تھی، انھیں میں ایک رسالہ "تکمیل الاذہان" بھی ہے، جس کی دریافت اور تصحیح کے بعد علامہ اعظمی نے مولانا محمد طاسین صاحب ناظم مجلس علمی کراچی کے پاس بھیج دیا، ان سے وہ نسخہ مولانا عبدالحمید صاحب سواتی نے حاصل کیا، اور اس کا دوسرے نسخوں کے ساتھ مقابلہ کرنے کے بعد جب شائع کرنا چاہا تو اس پر ایک طویل اور مفصل مقدمہ لکھا جس میں علامہ اعظمی کا شکریہ ادا کرنے کے ساتھ بلند آہنگ الفاظ میں ان کے علم و فضل کا اعتراف بھی کیا، صفحہ ۱۶ پر لکھتے ہیں:

> "اس کے بعد تکمیل الاذہان کا نسبتاً ایک بہتر اور جامع قلمی نسخہ ہمیں مجلس علمی کراچی کے ناظم حضرت مولانا محمد طاسین صاحب مدظلہ سے حاصل ہوا، یہ بڑا صحیح اور مکمل نسخہ ہے۔ دراصل یہ نسخہ فخر المحدثین، سید الفقہاء و تاج العلماء حضرت مولانا حبیب الرحمن اعظمی دیوبندی دامت برکاتہم کے توسط سے حاصل کیا گیا ہے۔ اور آپ نے اس کی تصحیح بھی کی ہے۔"

اسی طرح شاہ رفیع الدین صاحب کا ایک دوسرا رسالہ جس کا نام "اسرار المحبۃ" ہے، یہ رسالہ بھی) مولانا عبدالحمید صاحب سواتی کے تصحیح و تقدمہ سے مدرسہ نصرۃ العلوم

گوجرانوالہ کے ادارۂ نشرواشاعت سے شائع ہوا ہے، اسکے صفحہ ۲۰ پر لکھتے ہیں:

''اور جہاں حاشیہ میں ''مولانا اعظمی'' ہوگا اس سے مراد سید الفقہاء و تاج العلماء، رئیس المحدثین و شیخ الحدیث، حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی دامت برکاتھم (فاضل دارالعلوم دیوبند و مہتمم و شیخ الحدیث مدرسہ مفتاح العلوم منو اعظم گڈھ یوپی انڈیا) کی ذات گرامی ہوگی۔''

علامہ زاہد کوثریؒ دفاع حنفیت میں عصر حاضر کے سر خیل، وسیع النظر عالم، دقیقہ رس فقیہ اور حدیث ورجال کے ماہر تھے، فقہ حنفی کے بہت بڑے مزاج شناس اور رمز آشنا تھے، مسلک حنفی کے دفاع میں تمام عمر قلمی وکلامی جنگ لڑتے رہے اور الحاد ودہریت اور اباحیت پسندی کے خلاف ہمیشہ آواز بلند کرتے رہے۔

ترکی کے مشہور شہر استنبول کے باشندہ تھے، اسلامی علوم وفنون بالخصوص حدیث و فقہ اور ان سے متعلقہ علوم کے اندر زبردست مہارت پیدا کی، عثمانی دور حکومت میں ترکی کے اہم ترین علمی ودینی مناصب آپ کو تفویض کئے گئے، لیکن یہ وہ دور تھا کہ خلافت عثمانیہ ضعف واضمحلال کا شکار ہو چکی تھی، یہاں تک کہ خود ترک ناداں نے خلافت کی قبا چاک بھی کردی، مصطفیٰ کمال پاشا کی زیر قیادت ترکی میں اسلامی علوم وفنون کا گلا گھونٹا گیا اور اس کے نتیجہ میں دین اسلام اور علماء دین پر جو قہر ڈھائے گئے اور جور وستم کے جو بادل برسائے گئے وہ تاریخ کی ایک المناک داستان ہے، اسلامی علوم وفنون اور تہذیب و تمدن کی جگہ مصطفیٰ کمال کے لائے ہوئے علوم جدیدہ، تہذیب نو اور تمدن جدید کے خلاف جن علماء حق نے آواز بلند کی ان میں پیش پیش علامہ زاہد کوثری تھے، جس کی پاداش میں وہ مصطفیٰ کمال کے عتاب کا شکار ہوئے، اور بالآخر ترکی چھوڑ کر مصر چلے گئے، اور وہیں سکونت اختیار کرلی، مصر میں ایک جہان نے آپ کے کوثر علمی سے فیض اٹھایا، انھیں فیض یافتگان میں محدث شہیر شیخ عبدالفتاح ابوغدہؒ بھی تھے۔

علامہ کوثری کو علماء ہند بالخصوص علماء دیوبند سے بہت انس و تعلق تھا، اسی انس و

تعلق کا نتیجہ تھا کہ علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کی "فتح الملہم" شرح صحیح مسلم جب شائع ہونے کو آئی تو اس پر بیش قیمت تقریظ تحریر فرمائی، علامہ کوثری جن علماء ہند سے بہت زیادہ متاثر تھے، ان میں علامہ اعظمی کی ذات گرامی بھی تھی، دونوں باکمالوں میں مکاتبت بھی تھی، شیخ زاہد اپنے خطوط میں علامہ اعظمیؒ کو نہایت تعظیم و تکریم کے الفاظ سے خطاب فرمایا کرتے تھے، کبھی لکھتے "حضرة مولانا العلامة الأوحد والنحرير المفرد" اور کبھی "الجهبذ الفريد" اور "العلامة الكبير" اور کبھی "العلامة النحرير الاستاذ الكبير" کے توقیر آمیز الفاظ سے یاد فرماتے۔

مجلس علمی ڈابھیل کی طرف سے جب "نصب الرایہ" شائع ہوئی تو اس کی چوتھی جلد کے شروع میں شیخ زاہد کوثریؒ نے علامہ قاسم بنؒ قطلوبغا کی تخریج ہدایہ "منیۃ الالمعی" کا اضافہ فرمایا، علامہ قاسم بن قطلوبغا کی تخریج کا کچھ حصہ حافظ ابن حجرؒ کی کتاب درایہ کے ایک قلمی نسخہ سے نوٹ کر کے علامہ اعظمی نے مئو سے روانہ کیا، جو اصل میں درایہ پر علامہ قاسم کا استدراک ہے، اس کو پانے کے بعد علامہ کوثری نے "منیۃ الالمعی" پر اپنے مقدمہ میں جو رمضان ۱۳۶۹ھ کا تحریر کردہ ہے علامہ اعظمی کا حسب ذیل الفاظ میں ذکر فرمایا:

"مولانا العلامة النحرير والجهبذ الخبير أبو المآثر حبيب الرحمن الأعظمي." (۱)

ایک اور مقام پر علامہ اعظمی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ارقام فرماتے ہیں:

"هذا وإني أشكر مولانا العلامة النحرير والجهبذ الخبير أبا المآثر حبيب الرحمن الأعظمي السالف الذكر على تفضله بكتابة التعليقات بخط يده المباركة ومبادرته بإرسالها إلى هذا العاجز مع ما له من الأشغال الكثيرة، فانه هو السبب الأوحد لنشر الاثنين معا". (۲)

(میں شکر گذار ہوں علامہ نحریر، جہبذ خبیر مولانا ابوالمآثر حبیب الرحمن الاعظمی کا، جن کا اوپر ذکر کیا گیا، ان کی اس کرمفرمائی کے لئے جو انھوں کثرت اشغال کے

(۱) منية الألمعي ص۵ (۲) ایضاً ص۸

باوجود ان تعلیقات کو اپنے مبارک ہاتھوں سے لکھ کر اور اس عاجز کے پاس ارسال فرماکر کیا ہے، دراصل دونوں کی ایک ساتھ اشاعت کا وہ تنہا ذریعہ بنے ہیں)

اور اسی عالم مسرت وانبساط میں علامہ اعظمی کو خوب دعا بھی دی ہے:

" فأدعو الله سبحانه أن يطيل بقاء الأستاذ الجليل المشار اليه في خير و عافية ويمتع المسلمين بعلومه النافعة ، و يكافئه مكافأة المحسنين إزاء هذا الفضل الجسيم ." (۱)

(میں اللہ پاک سے دعا گو ہوں کہ وہ استاذ جلیل کو خیر وعافیت کے ساتھ باقی رکھے اور مسلمانوں کو ان کے نفع بخش علوم سے فائدہ پہنچائے، اور اس کرم فرمائی کے لئے ان کو بہتر صلہ عطا فرمائے)

شیخ عبد الفتاح ابو غدہ علامہ شیخ ابو غدہؒ کی ذات محتاج تعارف اور ان کی علمی وحدیثی خدمات محتاج بیان نہیں، ایسی عبقری شخصیت صدیوں میں پیدا ہوتی ہے، اسلامی علوم وفنون پر ان کو جو دسترس بالخصوص علم حدیث پر جو عبور وکمال حاصل تھا، اس کی مثال شاذ ونادر ہی ملے گی، وسعت علم وکثرت مطالعہ میں طاق اور بحث وتحقیق اور تلاش وجستجو میں فرد فرید تھے، اللہ جل شانہ نے ان کو تصنیف وتالیف کا جو سلیقہ وملکہ اور لطیف وپاکیزہ ذوق عطا فرمایا تھا، اس میں کوئی ان کا ثانی نہیں تھا۔

شام کے قدیم اور تاریخی شہر حلب میں ولادت اور نشوونما ہوئی، مزید تعلیم کی غرض سے مصر تشریف لے گئے اور وہاں جامعہ ازہر میں داخل ہو گئے، لیکن اپنے ذوق و شوق کی آبیاری علامہ زاہد کوثری کے کوثر علمی سے کرتے رہے، علامہ کوثری کا وجود ان کیلئے پارس کا پتھر ثابت ہوا جس نے انھیں چمکا کر کندن بنادیا، علامہ کوثری کی چھاپ شیخ ابو غدہ کی شخصیت پر بہت گہری پڑی؛ اور وہ اپنے احساس وادارک، فکر وشعور اور مسلک ومشرب اور ذوق ومزاج ہر چیز میں اپنے استاذ سے حد درجہ متاثر ہوئے، اور یہی وہ چیز تھی جس نے شیخ ابو غدہؒ کو علماء ہند سے بہت زیادہ قریب کیا۔

(۱) منية الألمعي ص ٦

شیخ ابو غدہؒ یوں تو علی العموم علماء ہند کی علمی خدمات کے معترف وثناخوان تھے، لیکن علامہ اعظمی کی ذات سے جوان کو مودت و محبت اور شغف و شیفتگی تھی وہ ناقابل بیان ہے، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ عرب فضلاء اور اہل علم میں علامہ اعظمی کا کوئی اس درجہ شیفتہ اور گرویدہ نہیں تھا، جس قدر آپ تھے ۔ شیخ ابو غدہ کا ایک وصف خاص یہ تھا کہ ان کے اندر انکسار و تواضع انتہا درجے کا تھا، اور یہی سبب تھا کہ وہ جب علامہ اعظمی کے سامنے ہوتے، ان سے ملاقات کرتے تو اپنی ذات کو فراموش کردیتے تھے، اور علامہ اعظمی سے جی بھر کر استفادہ کرتے تھے، حتی کہ ایک دفعہ مئو آئے تو مولانا رشید احمد صاحب سے پوچھا کہ آپ لوگ کتنے بھائی ہیں، انھوں نے کہا ۲ ہیں، تو شیخ نے فرمایا کہ دو نہیں تین سمجھئے، تیسرا میں ہوں۔

شیخ ابو غدہؒ علامہ اعظمی کے پاس خطوط لکھتے تھے تو بڑے عظیم الشان القاب و آداب کے ساتھ ان کو خطاب فرماتے، کبھی لکھتے" العلامة المحقق الجليل " کبھی لکھتے:"سماحة شيخنا العلامه المحدث الجليل والناقد الفقيه النبيل "کبھی لکھتے:"الأستاذ الجليل والمحدث الفقيه النبيل شيخنا وبركتنا وبركة العصر العلامة الشيخ"اور کبھی "العلامة الأجل والمحدث الأنبل" جیسے الفاظ سے مخاطب فرماتے، غرض لن لی باتیں "وللناس فيما يعشقون مذاهب "کی آئینہ دار ہوتیں۔

شیخ ابو غدہؒ اپنی کتابوں اور مضامین میں بھی علامہ اعظمی کا ذکر بڑے اجلال واکرام کے ساتھ کرتے، مسند حمیدی کی پہلی جلد جب علامہ اعظمی کی تحقیق سے شائع ہوئی تو شیخ ابو غدہ نے اس پر بڑا قیمتی تبصرہ تحریر فرمایا، جس میں علامہ اعظمی کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

"وقد صدر منه الجزء الاول محققاً عن أربع نسخ مخطوطة، في طباعة جيدة متقنة، و بتحقيق وتعليق العلامة الكبير المحقق المحدث مولانا الشيخ حبيب الرحمن الأعظمي ، الذى عرفه علماء بلادالشام ومصر والمغرب وغيرها من تحقيقاته واستدراكاته النادرة الغالية على العلامة الشيخ أحمد محمد شاكر رحمه الله تعالىٰ في تحقيقه لكتاب " مسند أحمد"(۱)

(۱)مجلة المجمع العلمي العربي اكتوبر ۱۹۶۳ جمادى الأولىٰ ۱۳۸۳ ص ۹۸۸

(ان کی (مسند حمیدی کی) پہلی جلد چار قلمی نسخوں کے مقابلہ کے بعد محقق طور پر نہایت عمدہ چھپائی کے ساتھ شائع ہوئی ہے اور جس کی تحقیق و تعلیق علامہ کبیر، محقق محدث مولانا شیخ حبیب الرحمٰن الاعظمی نے کی ہے، جن کو شام و مصر اور مغرب وغیرہ کے علماء مسند احمد پر علامہ شیخ احمد محمد شاکر رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق پر ان کے بیش قیمت اور نادر تحقیقات اور استدراکات کی وجہ سے جانتے ہیں)

مولانا عبدالحی فرنگی محلیؒ کی علم حدیث پر مشہور کتاب "الرفع والتکمیل" کی شیخ ابو غدہؒ نے تحقیق فرمائی ہے، جس کے کئی شاندار ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں، اس کی تحقیق میں ایک سبقت قلم پر علامہ اعظمی کی تصویب کے بعد شیخ ابو غدہؒ اس انداز میں ان کا شکریہ ادا کرتے ہیں:

"صوبه لي من الهند شيخنا العلامة المحدث الجليل الناقد حبيب الرحمن الأعظمي جزاه الله خيراً ."(۱)

(میرے لئے اس کی تصویب ہندوستان سے ہمارے شیخ علامہ محدث جلیل وناقد حبیب الرحمٰن الاعظمی نے کی، اللہ ان کو جزائے خیر دیں)

اسی قسم کی ایک اور جگہ پر تحریر فرماتے ہیں:

"فنبهني اليه مشكورا شيخنا العلامة المحدث الكبير مولانا حبيب الرحمن الأعظمي من الهند ."(۲)

(اس پر مجھے ہمارے شیخ محدث کبیر علامہ مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی نے ہندوستان سے متنبہ کیا جن کا میں شکر گذار ہوں)

اور "فقه أهل العراق وحديثهم" میں شیخ ابو غدہؒ علامہ اعظمیؒ کا تذکرہ حسب ذیل طریقے پر فرماتے ہیں:

"العلامة المحدث البارع الفقيه الشيخ حبيب الرحمن الاعظمي

(۱) الرفع والتکمیل ص ۲۴۸، ط ۳ — المآثر ج ۶ ش ۴ ص ۴۰

(۲) الرفع والتکمیل (ط ۲) ص ۲۱۴ و (ط ۳) ۳۵۰۔ المآثر ص ۴۴

صاحب التعليقات البديعة، والتحقيقات النادرة، العالم بالرجال والعلل، و تعليقاته وتحقيقاته السنية على "سنن سعيد بن منصور" و" الزهد" لابن المبارك و " مسندالحميدى" و(استدراكاته) على الشيخ أحمد شاكر فى تعليقه على " مسند أحمد" ثم (تعليقاته الحافلة) على " مصنف عبدالرزاق" الذى يطبع الآن بعون الله، كلها تنطق بسمو فضله و بسطة يديه فى هذاالعلم الشريف "(۱)

(محدث ماہر وفقیہ علامہ شیخ حبیب الرحمٰن الاعظمی، انوکھی تعلیقات اور عجیب وغریب تحقیقات کے مالک، علل اور علم اسماء الرجال کے عالم، سنن سعید بن منصور، مسند حمیدی اور (عبداللہ) ابن مبارک کی کتاب الزہد پر ان کی بیش قیمت تعلیقات اور مسند احمد پر شیخ احمد محمد شاکر کی تعلیقات پر ان کے استدراکات، پھر زیر طباعت مصنف عبدالرزاق پر ان کے بھرپور حواشی، سب کے سب ان کی بلندی، ان کے فضل اور اس پاکیزہ علم پر ان کی دستگاہ کی شہادت دیتے ہیں۔)

شیخ ابوغدہؒ کے ذکر پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ چلتے چلاتے پروفیسر محمد اجتباء ندوی سابق صدر شعبۂ عربی وفارسی الہ آباد یونیورسٹی کا ایک بیان نقل کردوں، وہ فرماتے ہیں:

"مجھے شیخ عبدالفتاح ابوغدہ صاحب سے ۱۹۵۶ء میں حلب (شام) میں نیاز حاصل ہوا۔۔۔۔ ریاض (سعودی عرب) میں کئی برس ایک ہی یونیورسٹی میں شرف رفاقت بھی حاصل ہوا، تقریباً روز ہی ملاقات ہوتی اور مختلف مسائل وشخصیات کے بارے میں گفتگو ہوتی، علماء ہند کے تذکرہ کے وقت حضرت محدث اعظمیؒ کا ذکر ضرور آتا، ان کا نام آتے ہی آنکھیں اشکبار ہو جاتیں، شیخ ابوغدہ مدظلہ حضرت اعظمیؒ کے بے حد مداح، فریفتہ اور گرویدہ وقدرداں ہیں۔"(۲)

(۱) فقه أهل العراق و حديثهم: ص ۸۲۔ المآثر ج ۲ ش ۱ ص ۱۳ (۲) ترجمان الاسلام ش ۱۳ ص ۱۰۶

ڈاکٹر عبدالحلیم محمودؒ سابق شیخ الازہر نہایت عالم وفاضل اور باکمال شخص تھے، جامع ازہر کی مشیخت پر فائز ہونا ہی آپ کی عظمت وتفرد کی دلیل ہے، علم وفضل اور نبوغ وکمال کے ساتھ ساتھ طریقت ومعرفت کے لذت آشنا اور راہ سلوک کے سالک بھی تھے، جو شیوخ ازہر میں آپ کا طرۂ امتیاز تھا، طبیعت ومزاج میں حددرجہ تواضع اور بے نفسی تھی۔

علامہ اعظمی کے بڑے قائل اور معترف تھے، آپ کے علم وفضل کا اعتراف وہ کس طرح فرماتے تھے، اس کے لئے مولانا اقبال احمد اعظمی کے خط کی حسب ذیل عبارت پڑھئے، یہ خط ۲؍اکتوبر ۱۹۸۶ء کا لندن سے مکتوب ہے، لکھتے ہیں:

"میں نے شیخ الازہر ڈاکٹر عبدالحلیم محمود رحمۃ اللہ علیہ (یہ وہ شیخ الازہر گذرے ہیں، جن کے بارے میں اتفاق ہے کہ صدیوں میں ایسے بلند پایہ شخص مصر کے امام ہوئے ہیں) انھوں نے مکہ مکرمہ، فندق عرفات میں حضرت مولانا مدظلہ کے بارے میں فرمایا، حاضرین میں مولانا منظور نعمانی اور مولانا علی میاں بھی تھے، بلکہ غالباً انھیں کو خاص طور سے مخاطب کرکے فرمایا تھا کہ "میں شہادت دیتا ہوں کہ اگر سارے عالم میں کوئی "محدث اعظم" کے خطاب کا مستحق ہے تو یہ شخص ہیں۔"(۱)

اوپر گذرچکا ہے کہ ڈابھیل کے جلسہ عام میں تقریر کرتے ہوئے جب مصر کے وزیر اوقاف شیخ محمد حسین ذہبی نے علامہ اعظمی کی نسبت فرمایا کہ وہ ہندوستان کے سب سے بڑے محدث ہیں تو شیخ الازہر رحمۃ اللہ علیہ نے ان کو ٹوکتے ہوئے فرمایا: "بل إنه أكبر علماء العالم الإسلامي" (بلکہ وہ عالم اسلام کے سب سے بڑے عالم ہیں)

شیخ احمد محمد شاکر جلیل القدر محدث، مشہور محقق اور نامور ادیب تھے، مصر میں پیدا ہوئے، وہیں نشوونما، ساخت وپرداخت اور تعلیم وتربیت ہوئی، اہم علمی تعلیمی اور سرکاری مناصب پر فائز رہے، مصر کے عہدۂ قضا پر بھی مامور رہے، علوم اسلامیہ بالخصوص

(۱) اس واقعے کو مولانا اقبال احمد اعظمی نے The Sunnah in Islam کے مقدمہ میں بھی نقل کیا ہے۔

فن حدیث میں زبردست مہارت ودسترس حاصل تھی، اس میدان میں نمایاں کارنامے انجام دیئے، اور اپنی بیش بہا تالیفات وتحقیقات کے ذریعہ عالم اسلام کے علمی حلقوں میں شہرت وناموری حاصل کی، اور بجاطور پر "محدث الدیار المصریة" کے لقب سے ملقب کیے گئے۔

شیخ احمد شاکرؒ کا سب سے اہم اور قابل قدر کارنامہ "مسند امام احمد بن حنبل" کی تحقیق وتعلیق ہے، چنانچہ یہ کتاب نہایت اہتمام کیساتھ ۱۶ راجزاء میں شائع ہوئی ہے، اس کتاب کی تحقیق واشاعت کے دوران اس کی تیسری جلد میں شوال ۱۳۶۶ھ میں ساری دنیا کے اہل علم کے نام ایک اعلان شائع کیا کہ اس میں اگر ان کا کوئی تعقیب واستدراک یا ان کے کوئی ملاحظات ہوں تو وہ ان کو ان کے پاس روانہ کردیں، وہ ان کی بحث وتمحیص کے بعد آئندہ اجزاء میں انہیں شائع کردیں گے۔

شیخ احمد محمد شاکر یہ اعلان شائع کرنے کے بعد ایک مدت تک اس قسم کی جانب سے ملاحظات کا انتظار کرتے رہے، لیکن آٹھ نو سال کا عرصہ گذر گیا اور ان کی سماعت تک کہیں سے کوئی آواز نہیں پہنچی، بالآخر ۹ ربرس کے بعد مصر بلکہ عالم عرب سے سیکڑوں میل دور ایک دور دراز بستی سے ان کے پاس ایک خط پہنچا، جس کے ساتھ مسند احمد پر مکتوب نگار کے ملاحظات بھی تھے۔ شیخ احمد محمد شاکر اسے پاکر بہت خوش ہوئے، وہ خط اور اس سے منسلک وہ ملاحظات کس شخصیت کے تھے خود شیخ احمد شاکرؒ کی زبان سے سنئے:

"ثم جاء نی کتاب من أخ عالم کریم، ولم یکن لی شرف معرفته من قبل. وقد عرفت من کتابه فضله وعلمه وتحققه بالبحث الدقیق. وکتابه هذا مؤرخ ۲۶/ ذی القعدة ۱۳۷۵ھ وطواه علی استدراکات وتعقبات دقیقة، من الجزء الاول الی الجزء الثامن وهذا الأخ العلامة: هو الأستاذ حبیب الرحمن الأعظمی ..." (۱)

(۱) مسند الإمام احمد بن حنبل ۱۵: ۲۵۱

(پھر میرے پاس ایک کریم عالم بھائی کا خط آیا، جن سے اب سے قبل مجھے شناسائی کا شرف نہیں حاصل تھا، میں ان کے مکتوب سے ان کے علم و فضل اور بارک بینی کے ساتھ بحث و تفحص سے واقف ہوا، ان کا یہ مکتوب ۲۶؍ ذی قعدہ ۱۳۷۵ھ کا نوشتہ ہے، جو پہلے حصے سے آٹھویں حصے تک وقت آمیز استدراکات و تعقبات پر مشتمل ہے، اور یہ عظیم عالم استاذ حبیب الرحمٰن الاعظمی ہیں)

شیخ احمد محمد شاکر نے علامہ اعظمی کے ان استدراکارت کو مسند احمد کی پندرہویں جلد میں بعینہ شائع کیا، جو پچاس صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں، اور اسی کے ساتھ یہ بھی خیال رہے کہ یہ استدراکات مسند احمد کی صرف آٹھ جلدوں پر تھے، وہ علامہ اعظمی کی اس بحث و تحقیق اور علمی کارنامہ سے کس قدر متاثر ہوئے اس کا اندازہ ایک خط سے لگایا جا سکتا ہے، جسے شیخ احمد محمد شاکر نے علامہ اعظمی کے پاس ان کے استدراکات کو ملاحظہ فرمانے کے بعد لکھا:

"حضرة الأخ العلامة الكبير المحقق الأستاذ حبيب الرحمن الأعظمى ... جاء نى كتابكم الأول النفيس ... أما استدراكاتكم فكلها نفيسة عالية، ولا أقول هذا مجاملة ... وأشكركم خالص الشكر على هذه العناية الجيدة، وأرجو أن تزيدونى من إشاراتكم وإرشاداتكم خدمة للسنة النبوية المطهرة ، وأنتم ـ كما رأيت،من عملكم ـ من أعظم العلماء بها فى هذاالعصر فالحمدلله على توفيقكم ... ثم أكرر الرجاء أن لا تحرمونى من آرائكم النيرة و تحقيقاتكم النفيسة ، حفظكم الله و بارك فيكم ."

(آپ کا نفیس گرامی نامہ ملا، آپ کے تمام استدراکات نہایت عمدہ اور بلندرتبہ ہیں، میں یہ بات محض خوشامد کے لئے نہیں کہہ رہا ہوں، اس عظیم توجہ فرمائی پر خلوص دل کے ساتھ آپ کا شکر گذار ہوں اور مجھے امید ہے کہ آپ

سنت نبویہ مطہرہ کی خدمت کے جذبہ سے مجھے مزید مشوروں اور رہنمائیوں سے نوازیں گے، اور جہاں تک میں نے آپ کے اس کام کو دیکھ کر سمجھا ہے، میرا خیال ہے کہ آپ اس زمانہ میں سنت نبویہ کے عظیم ترعلماء میں سے ایک ہیں۔)(۱)

علامہ اعظمی کے حق میں شیخ احمد محمد شاکر کی یہ شہادت نہایت کھری اور معتبر شہادت ہے، وہ خود ایک بڑے ماہر فن اور عالم و محقق تھے، اور علم و فن کی قدر کرنا جانتے تھے، علم حدیث کے اندر ان کا پایہ کتنا بلند تھا، اس کا اندازہ اس سے لگایئے کہ زرکلی نے ان کے بارے میں لکھا ہے:

"لم یخلف بعدہ مثلہ" (انھوں نے اپنے بعد اپنا ہم مثل نہیں چھوڑا)

لیکن علامہ اعظمی کے یہ استدراکات اس قدر وقیع، ٹھوس اور جاندار تھے کہ شیخ احمد شاکر نے انھیں صمیم قلب سے قبول کیا اور وہ تمام عالم اسلام میں یکایک علامہ اعظمی کی شہرت کا سبب بن گئے۔

شیخ محمود محمد شاکرؒ: انھیں علامہ احمد شاکر کے، جن کے بارے میں زرکلی نے لم یخلف بعدہ مثلہ لکھا ہے، چھوٹے بھائی تھے، یہ بھی بڑے محقق و ادیب اور فاضل و یگانہ تھے، بالخصوص ادب و تاریخ کی کتابوں کی تحقیق میں قابل قدر کارنامے انجام دیئے ہیں، اور متعدد بیش قیمت قدیم مخطوطات ان کی تحقیق و تعلیق سے شائع و ذائع ہوئے ہیں، بڑے بھائی کی ان کی نگاہ میں کیا قدر و منزلت رہی ہوگی ظاہر ہے، لیکن ان کی نظر میں علامہ اعظمی کا کیا مرتبہ و مقام تھا، اس کے متعلق ڈاکٹر محمد اسمٰعیل مدراسی ندوی مصر سے ایک خط میں فرماتے ہیں:

"یہاں (مصر) کے مشہور فاضل محمود شاکر صاحب مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی کی بڑی تعریف کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ (مولانا اعظمی) بعض اعتبار سے ان کے بھائی مشہور محدث احمد شاکر مرحوم سے بھی بڑھے ہوئے ہیں۔"(۲)

---

(۱) المآثر ج ۲ ش ۱ ص ۳۸

(۲) المآثر ص ۳۸ بحوالہ صدق جدید ۔ مورخہ یکم جولائی ۱۹۶۰ء

مولانا عبداللہ زمزمی مکیؒ | عالم باعمل اور خدامست بزرگ تھے، اصلاً لاہوری تھے، لیکن حرم مکی کے جوار میں سکونت پذیر تھے، اور خانۂ خدا کے زیر سایہ ساری عمر گذار دی۔ بہت ہی عجیب وغریب اور صاحب حال شخص تھے، علم و عمل کا پیکر تھے، ان کے بارے میں ڈاکٹر عبدالمعید صاحب لکھتے ہیں:

"ایک بار راقم سطور نے ان کے بارے میں حضرت محدث کبیرؒ سے دریافت کیا تو فرمایا کہ اصلاً یہ لوگ لاہور کے رہنے والے تھے، ان کے والد کا نام غلام محمد تھا، باب ام ہانی پر ان کا کمرہ تھا، کچھ لوگ کہتے ہیں کہ وہ حضرت ام ہانی ہی کا کمرہ تھا۔"(۱)

اور علامہ اعظمیؒ خود ان کی نسبت اپنی یادداشت میں ارقام فرماتے ہیں:

"الشيخ مولانا عبدالله بن غلام محمد الزمزمي ، أصله من لاهور فيما أعلم ، قدم أبوه مكة في صغره و تولاه بعض أهل مكة فأقام هناك ، وتأهل فأنجب صديقنا هذاالصالح العالم الزاهد الجواد المفضال عبدالله ."

(حضرت مولانا عبداللہ بن غلام محمد زمزمی، میرے علم کے مطابق اصلاً لاہور کے تھے، ان کے والد بچپن میں مکہ آئے اور مکہ کے کسی باشندہ نے ان کو اپنے پاس رکھ لیا تو وہ وہیں رہ پڑے اور شادی کرلی، جن سے ہمارے یہ نیک عالم و پارسا، سخی اور کرمفرما دوست عبداللہ پیدا ہوئے)

مولانا زمزمی صاحبِ معرفت اور خداشناس تو تھے ہی، جوہر شناس بھی تھے، علامہ اعظمی سے بڑی والہانہ محبت رکھتے تھے، جو عشق کی حد کو پہنچی ہوئی تھی، علامہ اعظمی اپنی یادداشت میں فرماتے ہیں:

"وكان رحمه الله يبالغ في إكرامي ، ولا أعلم أحداً من الغرباء أحبني مثل حبه ، يشهد بذلك كل من رآني معه"

(۱) المآثر ج ۲ ش ا ص ۴۲

(مرحوم مبالغہ آمیز حد تک میرا اکرام کرتے تھے، پردیسیوں میں کوئی ایسا شخص میرے علم میں نہیں، جس نے ان کے جیسی مجھ سے محبت کی ہو، ان کی شہادت ہر وہ شخص دے سکتا ہے جس نے مجھے ان کے ساتھ دیکھا ہو۔)

مولانا عبداللطیف صاحب نعمانی ۱۳۸۲ھ مطابق ۱۹۶۳ء میں جب حج کے لئے تشریف لے گئے اور سفر مبارک میں مولانا نزمی سے ان کی ملاقات ہوئی، تو علامہ اعظمی کو ایک خط میں لکھا جو ۲۰ ذی الحجہ ۱۳۸۲ھ مطابق یکم مئی ۱۹۶۳ء کا مکتوب ہے:

"مولانا نزمی آپ کا ذکر خیر بہت کرتے ہیں، دو روز ناچیز کی قیام گاہ پر تشریف لاچکے ہیں، بہت عجیب وغریب بزرگ ہیں۔"

علامہ اعظمی کی مولانا نزمی سے اول بار ملاقات ۱۳۶۹ھ مطابق ۱۹۵۰ء کے موسم حج میں یعنی علامہ اعظمی کے پہلے سفر حج کے موقع پر ہوئی، لیکن دونوں بزرگوں میں خط وکتابت پہلے سے تھی۔ مولانا نزمی کو علامہ اعظمی سے جو عشق ومحبت تھی اور جو دلی لگاؤ تھا اس کا اظہار مختلف طریقوں اور مختلف انداز سے ہوتا رہتا تھا، جس کی شہادت ان کے مکاتیب دیتے ہیں، علامہ اعظمی کے نام خطوط کا جو انبار ہے اس میں مولانا نزمی کے خطوط کی بھی خاصی تعداد ہے، جن کا ایک ایک جملہ اور ایک ایک لفظ محبت وخلوص میں ڈوبا ہوا ہے، سنیچر ۲؍رمضان ۱۳۶۹ھ کے خط میں فرماتے ہیں:

" صاحب الفضيلة سيدى الجليل مولانا حبيب الرحمن الأعظمى أيده الله تعالىٰ آمين.

السلام عليكم ورحمة الله وبركاته، وصل كتابكم الكريم وفى شدة السرور وضعته على رأسى و عينى، فلله الحمد والشكر والمنة والثناء الجميل، ووفقك وأعانك، إن يوما نجتمع بك فيه لهو يوم الحياة الخالد وجبينها وغرة أيامنا، إن يوما نراك فيه لهو يوم السعادة والهناء

(فضیلت مآب آقائے بزرگوار! مولانا حبیب الرحمن الاعظمی ایدہ اللہ تعالیٰ (۱)

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، آپ کا مکتوب مبارک پہنچا، شدت مسرت میں میں نے اس کو سر پر رکھا اور آنکھوں سے لگایا، اللہ کی حمد اور اس کا شکر و احسان اور بہترین تعریف ہے، آپ کو توفیق عطا فرمائے اور اعانت فرمائے، بلاشبہ وہ دن جس میں ہماری آپ سے ملاقات ہوگی، وہ زندگی کا یادگار اور شاندار دن ہوگا، وہ دن جب ہم آپ کو دیکھیں گے نہایت خوشی اور خوش بختی کا دن ہوگا)

جمعہ ۹/ جمادی الاولی ۱۳۰۷ھ کے ایک خط میں لکھتے ہیں:

" وإني كلما تذكرتكم هاجت عاطفتي وثارت ذكريات الفرح الذي كان أيام اجتماعنا، وإني قد قصرت في خدمتكم تقصيراً عظيما لضعفي و مرضي، ولكني تشرفت برؤياك التي طالما كنت أتمناها . "

(میں نے جب جب آپ کو یاد کیا میرے جذبات بھڑک اٹھے، اور ہماری ملاقات کے دنوں کی جو خوشی تھی اس کی یادیں موج مارنے لگیں، میں نے اپنی بیماری اور کمزوری کی وجہ سے آپ کی خدمت میں بڑی کوتاہی کی، لیکن میں آپ کی دید سے مشرف ہوا جس کی مجھے بڑی آرزو تھی)

جمعرات ۲۷/ ذی الحجہ ۱۳۰۷ھ کے ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:

" وصل كتابكم الكريم فاغرورقت عيني بالدموع وتعجبت غاية التعجب لأننا نحن أيضا هنا في الخلوة في اليوم السادس من ذي الحجة كنا نذكركم ونتحدث بأن في هذااليوم كان اجتماعنا بمولانا حبيب الرحمن ومضى اليوم بأجمعه في ذكراكم وكلنا يشتعل اشتياقا لرؤياكم فجاء كتابكم الكريم وكأنه يصور حالة خلوتنا في اليوم السادس وحقيق أن القلوب على بعضها لشواهد، أسأله من بيده مقاليد السموٰت والارض أن يجمعنا مرة ثانيه وأدعوه في الملتزم أن يشرفنا برؤياك مرة ثانيه إنه مجيب الدعاء ، سيدي !إن ذكراك بلساني ومنظرك

بعيني، وجلالك بقلبي ، أسأله جلت قدرته وتعالت عظمته أن يحفظك و يرعاك و يديمك ويجمعنا بك . "

(آپ کا گرامی نامہ موصول ہوا (خوشی کی وجہ سے) میری آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں، مجھے اس بات پر نہایت تعجب ہوا کہ ۶/ ذی الحجہ کو ہم لوگ بھی یہاں خلوہ کے اندر آپ کا ذکر کر رہے تھے، کہ اسی دن ہماری مولانا حبیب الرحمٰن سے ملاقات ہوئی تھی، اور سارا دن آپ کی یاد میں اس حالت میں گذر گیا کہ ہم سب آپ کی دید کے سراپا مشتاق تھے، کہ آپ کا مکتوب گرامی پہنچ گیا، گویا کہ ۶/ ذی الحجہ کے ہمارے خلوہ کی حالت کی تصویر تھا، اور صحیح یہ ہے کہ قلوب ایک دوسرے کی شہادت دیتے ہیں، اللہ جل شانہ سے میری التجا ہے کہ ہماری دوبارہ ملاقات ہو، اس سے میں ملتزم میں دعا کرتا ہوں کہ آپ کی دوبارہ زیارت سے ہمیں شرفیاب فرمائے، بیشک وہ دعا کو قبول کرنے والا ہے، میرے آقا! آپ کا ذکر میری زبان پر، آپ کا سراپا میری نگاہوں میں اور آپ کی بزرگی میرے دل میں ہے، میں خدائے بزرگ و برتر سے دعا کرتا ہوں کہ آپ کی حفاظت فرمائے، آپ کی نگہبانی فرمائے، آپ کے سائے کو تادیر باقی رکھے، اور ہماری آپ سے ملاقات کرائے۔)

چند خطوط کے یہ اقتباسات میں نے بطور نمونہ نقل کر دیئے ہیں، ورنہ علامہ اعظمی کے ذخیرۂ علمی میں بہت سارے خطوط مولانا نزی کے ہیں اور وہ تمام کے تمام اسی والہانہ انداز اور محبت و عقیدت کے ان ہی جذبات کے ساتھ لکھے گئے ہیں۔ سب کا ذکر طوالت سے خالی نہیں ہوگا، تاہم جی چاہتا ہے کہ ایک اور خط کا کچھ حصہ ذکر کر دوں، جس میں مولانا نزی نے علامہ اعظمی کی کتاب "اعیان الحجاج" دیکھنے کے بعد اپنے تاثرات کا اظہار فرمایا ہے، لکھا ہے:

" ياصاحب الفضيلة قال في كشف الظنون عن كتاب الفوائد لابن رجب : إنها من عجائب الدهر ، وإن كتابكم أيضا من عجائب

الدهر فی بابه وأسلوبه ومحتویاته ، وابتداؤكم فیه بأشرف المخلوقات جعله من أعجب العجائب إلهاما من الله سبحانه و تعالیٰ

هذا أول كتاب من نوعه ، فجزاكم الله عن الأمة الاسلامیة خیر الجزاء ، وهو من الفنون التی یمیل الیها قلبی ودائما أبحث فیها فكأنه صنف لی ، لقد اهتز قلبی له وفرح فؤادی به ، وانشرح صدری منه ، فجزاكم الله عنی خیرالجزاء وأثابكم علی عملكم وبارك لنا فیكم ونفعنا بعلومكم ، وكثیراً ما كنت أراجع كتب الطبقات لهذه الغایه فأغنانی الله بكتابكم هذا. بارك الله فی تصانیفكم ، وبارك الله فی حیاتكم ، وبارك الله فی أعمالكم . "

(مولانا زمزمی فرماتے ہیں کہ کشف الظنون میں علامہ ابن رجب کی کتاب الفوائد کی نسبت لکھا ہے کہ وہ عجائبات زمانہ میں ہے۔ آپ کی یہ کتاب بھی اپنے موضوع ، اپنے اسلوب اور مضامین کے لحاظ سے عجائبات زمانہ میں سے ہے ، اور اشرف المخلوقات (ﷺ) کے ذریعہ اس کتاب کے آغاز نے اس کو اعجب العجائب بنادیاہے، جو اللہ پاک کی طرف سے الہام ہے۔

یہ اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے ۔اللہ تعالیٰ آپ کو امت مسلمہ کی جانب سے بہتر جزاء عطا فرمائیں،وہ ان فنون میں سے ہے جس کی طرف میرا دل مائل رہتاہے اور ہمیشہ میں جس کی تلاش میں رہتاہوں، تو گویاکہ وہ میرے ہی لئے لکھی گئی ہے ، میرے دل و جان اس سے خوش ہو گئے اور طبیعت منشرح ہو گئی، پس اللہ تعالیٰ میری طرف سے آپ کو بہترین بدلہ عطا فرمائیں، آپ کو آپ کے عمل کا انعام اور عمر میں برکت عطافرمائیں،اور آپ کے علوم سے نفع پہنچائیں، اکثر و بیشتر اس مقصد کے لئے میں طبقات کی کتابوں کا مراجعہ کیا کرتا تھا،لہذا اللہ نے آپ کی اس کتاب کے ذریعہ مجھے اس سے بے نیاز کر دیا، اللہ تعالیٰ آپ کی تصانیف میں

آپ کی عمر میں اور آپ کے کام میں برکت عطا فرمائیں۔)

مولانا نازمی کے کمال گرویدگی کا اندازہ اس ایک واقعہ سے لگایئے، جسے ڈاکٹر عبدالمعید صاحب نے قلمبند فرمایا ہے، لکھا ہے:

"بابا خلیل صاحب مئوی راوی ہیں کہ ایک بار میں مولانا نازمیؒ صاحب کے پاس ملاقات کے لئے گیا، میرے ہاتھ میں مولانا (حبیب الرحمن صاحب اعظمی) کی کتاب رہبر حجاج تھی، انھوں نے پوچھا کون سی کتاب ہے؟ میں نے کہا مولانا اعظمی کی رہبر حجاج ہے۔ کتاب لے کر کھڑے ہو گئے اور سر پر رکھ لیا اور کئی بار فرمایا کہ مولانا تو رہبر عالم ہیں، مولانا تو رہبر عالم ہیں۔" (۱)

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ علامہ اعظمیؒ ہی کے ایک قول کو منقول کر کے آپ کے ذکر کو ختم کر دیا جائے، تاکہ مسک الختام ہو جائے، علامہ اعظمی نے فرمایا:

"مجھ سے بے پناہ محبت فرماتے تھے، جب بھی حجاز جانا ہوتا تو کمرہ کی کنجی میرے حوالے کر دیتے تھے، اس زمانہ میں آج کل کی طرح آسانیاں نہیں تھیں، میں ان کا بہت ہی ممنون اور مشکور ہوں۔" (۲)

اور یہ بھی فرمایا کہ

"کوئی میرے بارے میں ان سے پوچھتا تو فرماتے کہ وہ میرے شیخ ہیں۔ ایک بار حجاز جانا ہوا تو ان سے کسی نے بتا دیا کہ میں آیا ہوں تو ملاقات کے لئے دو بجے رات تک سڑک پر لیٹے رہے۔" (۳)

شیخ مصطفیٰ احمد الزرقاء | شیخ مصطفیٰ الزرقاء حلب کے ایک علمی و دینی خانوادے سے تعلق رکھتے تھے، ان کے والد ماجد احمد الزرقاء اور ان کے جد امجد محمد الزرقاء اپنے وقت کے بڑے اہل علم و فضل میں شمار ہوتے تھے۔ شیخ مصطفیٰ زرقاء اس مبارک گھرانے میں ۱۹۰۷ء

---

(۱) المآثر ج ۲ ش ا ص ۴۳ (۲) ایضا ص ۴۲ (۳) ایضا ص [illegible]

میں پیدا ہوئے، ان کے والد محترم چونکہ فقہ میں دستگاہ رکھتے تھے، اس لئے ان کو بھی فطری طور پر فقہ سے زیادہ مناسبت ہوئی، اپنے والد کی علمی و فقہی مجلسوں میں شریک ہوتے تھے، ان سے فقہ کی متعدد کتابیں پڑھیں، اس کے علاوہ عربی ادب سے لگاؤ تھا، گھریلو تعلیم و تربیت کے علاوہ حلب اور دمشق کے مختلف مدرسوں اور کالجوں میں تعلیم حاصل کی، اس کے بعد فرانس جاکر تکمیل کی اور قانون (Law) میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری لے کر لوٹے۔

شیخ مصطفیٰ زرقاء کا شمار موجودہ دور کے جید علماء اور باکمال شخصیات میں ہوتا تھا، وہ جدید وقدیم کا سنگم تھے، اور ان لوگوں میں تھے، جنھوں نے اپنی زندگی علم ودین کے لئے وقف کررکھی تھی، فقہ ان کا میدان تھا، اور اس میں انھوں نے مہتم بالشان کارنامے انجام دیئے ہیں، وہ شام واردن وغیرہ کی یونیورسٹیوں میں لیکچرر وپروفیسر اور اہم مناصب پر فائز رہ چکے تھے، اور با ایں ہمہ علم و فضل بہت سادگی پسند اور متواضع تھے۔ چند دنوں پہلے البعث الاسلامی نے ان کے انتقال کر جانے کی خبر دی ہے، سعودی دار الحکومت ریاض میں ۴ر جولائی ۱۹۹۹ء کو ان کی وفات واقع ہوگئی۔ اناللہ وانا الیہ راجعون!

شیخ مصطفیٰ زرقاء علامہ اعظمی کے علم و فضل اور بالخصوص ان کے تفقہ کے بڑے قائل اور معترف تھے، چنانچہ جب حکومت کویت نے چھٹی دہائی کے اواخر میں فقہی انسائیکلوپیڈیا کی مہم ان کے سپرد کی، تو انھوں نے اس کی کمیٹی کے لئے علامہ اعظمی کا نام بھی تجویز کیا اور اس سلسلے میں انھوں نے آپ کو کویت میں قیام اور انسائیکلوپیڈیا کی ترتیب کے لئے دعوت دی، اور اس کے لئے برابر اصرار کرتے رہے، مگر علامہ اعظمی اپنی تحقیقی مصروفیات کے پیش نظر اس دعوت کو قبول نہیں کرسکے اور زرقاء صاحب کے شدید اصرار کے بعد بالآخر ایک مقالہ لکھ کر گھر سے روانہ کردیا۔

شیخ مصطفیٰ زرقاءؒ کی ایک مشہور کتاب ہے "**المدخل الفقهي العام**" انھوں نے یہ کتاب علامہ اعظمی کو ہدیہ کی تو اس پر یہ عبارت تحریر فرمائی:

"هدية المؤلف إلى أخيه الكريم صاحب الفضيلة الأستاذ الجليل العلامة المحقق الشيخ حبيب الرحمن الأعظمي حفظه الله تعالىٰ وأدام نفعه.

الكويت في ۲۰/ من شوال ۱۳۸۹ھ

۲۸/ ۱۲/ ۱۹۶۹م"

(مصنف کا ہدیہ اس کے برادر کریم، استاذ جلیل، علامہ محقق، فضیلت مآب شیخ حبیب الرحمٰن الاعظمی کی خدمت میں، اللہ تعالیٰ ان کی حفاظت فرمائیں اور ان کے نفع کو باقی رکھیں۔)

کویت ۲۰/ شوال ۱۳۸۹ھ

۲۸/ ۱۲/ ۱۹۶۹ء

شیخ عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز! سعودی عرب کے مفتیٔ اعظم اور بڑے عالم دین ہیں (۱) حدیث و فقہ و فتاوی میں نہایت بلند مقام رکھتے ہیں، نابینا ہیں لیکن علم و فقہ میں بیناؤں کے لئے قابل رشک ہیں، جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے اولین شیخ الجامعہ رہ چکے ہیں، سعودی حکومت کے نزدیک بہت معزز و مقرب ہیں، جس کی وجہ سے آپ کی ہر بات اور ہر قول حکومت کے نزدیک مقبول و مسموع ہوتا ہے، اسی طرح سعودی عوام کے نزدیک بھی آپ کی مقبولیت و مرجعیت مبالغہ آمیز حد تک ہے، طہارت و تقویٰ اور زہد و استغناء میں بھی بے مثل خیال کئے جاتے ہیں۔

علامہ اعظمی کے بڑے قدر شناش ہیں، سلفیت کا غلبہ ہونے کی وجہ سے ہر چند کہ بعض امور و مسائل میں نقطۂ نگاہ کا اختلاف ہے، لیکن اس کے باوجود کھلے دل سے ان کے علم و فضل کا اقرار و اعتراف کرتے ہیں، جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے کہ انھوں نے اپنی ریاست جامعہ کے زمانہ میں علامہ اعظمی کو جامعہ آنے کی دعوت بھی دی تھی، اسی طرح علامہ

(۱) یہ سطریں جس وقت لکھی گئی تھیں اس وقت شیخ باحیات تھے اب وہ وفات پاچکے ہیں۔

اعظمی بھی ان کے مرتبہ شناس تھے، اور سفر حج وغیرہ کے دوران موقع ملنے پر ان سے ملاقات کرتے اور ان کو اپنی کتابیں بھی ہدیۃً بھیجتے، چنانچہ ۱۳۸۳ھ مطابق ۱۹۶۳ء میں مولانا عبداللطیف صاحب نعمانی جب حج کے لئے جارہے تھے، تو ان کے ذریعے علامہ اعظمی نے شیخ ابن باز کے لئے مسند حمیدی کا ایک نسخہ بھیجا، کتاب کو دیکھ کر شیخ نے جس مسرت اور تاثر کا اظہار فرمایا، اس کو مولانا عبداللطیف صاحب نعمانی نے اپنے ۷ر ذی الحجہ والے خط میں یوں تحریر فرمایا ہے:

"ابن باز صاحب نے مسند دیکھ کر بڑی مسرت ظاہر کی اور بار بار "کتاب غریب" کہتے رہے"

علامہ اعظمی کی شیخ ابن باز سے ایک ملاقات کا واقعہ مولانا افضال الحق جوہر قاسمی نے حسب ذیل تحریر فرمایا ہے:

"حضرت مولانا ایک مرتبہ حج کے لئے تشریف لے گئے، مولانا اسعد صاحب بھی وہاں موجود تھے، انھوں نے شیخ عرب علامہ ابن باز کی زیارت کا وقت مانگا اور وہ مقرر ہو گیا، جانے لگے تو حضرت مولانا کے پاس آئے اور علامہ کے پاس چلنے کے لئے کہا، حضرت مولانا تیار ہو گئے، وہاں پہونچے تو حسب معمول ہر شخص نے اپنا اپنا تعارف پیش کیا، کیونکہ ابن باز نابینا محدث ہیں، ان کے یہاں ہر شخص کو اپنا نام اور مختصر تعارف کرانا ہوتا ہے، جب کئی آدمی اپنا اپنا تعارف کرا چکے تو آخری نمبر حضرت مولانا کا تھا، مولانا نے فرمایا: "أنا حبیب الرحمن الأعظمی من الھند" تو شیخ عرب اٹھ کر کھڑے ہو گئے، حضرت مولانا سے معانقہ فرمایا اور معذرت کی کہ آپ نے یہاں آکر مجھے شرمندہ کیا، مجھے معلوم ہوتا تو میں خود آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا، پھر اپنی مسند پر مولانا کو بٹھا کر انھوں نے سکون پایا"(۱)

---

(۱) ترجمان الاسلام مولانا اعظمی نمبر ص ۱۶۶۔۱۶۷

شیخ ناصر الدین البانی ان کا شمار اس زمانہ کے ممتاز علماء اہلحدیث میں ہوتا ہے، بسیار نویس اور کثیر التصانیف عالم ہیں، جماعت اہل حدیث کے درمیان مشرق و مغرب ہر جگہ انھیں قبول عام حاصل ہے، کچھ عرصہ قبل تک عرب ممالک میں وہ حدیث دانی اور تفقہ میں لا ثانی تصور کئے جاتے تھے اور ان کے فقہی نظریات و افکار کو نا قابل تردید بلکہ "پتھر کی لکیر" سمجھ کر مانا اور تسلیم کیا جاتا تھا، لیکن البانی صاحب کے قلم کی کاٹ اس قدر تیز تھی کہ اس کی زد سے عام علماء و فقہاء اور اسلاف تو درکنار ائمہ متبوعین بلکہ بسا اوقات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین تک محفوظ نہ رہے ع

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں

چنانچہ البانی صاحب کے اس تشدد اور غلو کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی ذات جس طرح مقبول تھی اسی قدر مختلف فیہ اور متنازع بن گئی، اور اس وقت صورت حال یہ ہے کہ عالم عرب میں جہاں ان کی امامت کا سکہ چلتا تھا، ان کے ان ہی تفردات و تحکمات کی بنا پر بہت سے عرب اہل علم ان کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے، اور ان کے فقہی مسلک اور حدیثی اصول و نظریات کے رد میں آئے دن کتابیں، مقالات اور مضامین شائع کئے جارہے ہیں، وللہ فی عبادہ شئون!

انھیں علمی بنیادوں پر علامہ اعظمی اور شیخ البانی کے درمیان شدید نظریاتی اختلافات رہے ہیں، مگر اس کے باوجود البانی صاحب کو علامہ اعظمی کے علم و فضل اور علو مرتبت کے اعتراف پر مجبور ہونا پڑا ہے، "صحیح الترغیب والترهیب" کے مقدمہ میں فرماتے ہیں:

"واعلم أن مما شجعني على نشرهما أنني رأيت الكتاب المطبوع تحت عنوان ... وعلق عليه العالم الشهير الجليل الشيخ حبيب الرحمن الأعظمي .. (۱)

(۱) المآثر ج ۲ ش ۱ ص ۲۰، بحوالہ الترغیب والترهیب ص ۶۳

آگے مزید فرماتے ہیں:

"وما زادني رغبة في الإقبال عليه أن محققه الفاضل الشيخ حبيب الرحمن الأعظمي قد صرّح . . ."

نقطۂ نظر کے اختلاف کے باوجود آخر تک علامہ اعظمی کے فضل و کمال کے کس قدر معترف رہے اس کا اندازہ اس ایک واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے، جسے ڈاکٹر عبدالمعید صاحب نے تحریر فرمایا ہے:

"انتقال سے ایک ہفتہ قبل دو عرب شیخ حضرت محدث کبیر سے ملاقات کے لئے مئو تشریف لائے، حضرت محدث کبیر علالت کے باعث اس وقت بات چیت نہیں کے برابر کرتے تھے، پھر بھی ان لوگوں سے گفتگو فرمائی، ان عرب شیوخ نے علامہ بن باز، شیخ ناصر الدین البانی اور ایک بڑے سعودی عالم کا حضرت محدث کبیر کو سلام عرض کیا اور یہ فرمایا کہ وہ لوگ آپ کے حالات جاننے کے مشتاق ہیں، حضرت محدث کبیر نے فرمایا کہ ان لوگوں کو میرا بھی سلام عرض کر دیں اور دعا فرمائیں کہ پھر ملاقات ہو، اس پر ان عرب شیوخ نے فرمایا اب انشاء اللہ آخرت میں ملاقات ہوگی۔"(۱)

الشیخ السید یوسف ہاشم الرفاعی کویت کے جید عالم دین اور سابق وزیر مواصلات ہیں(۲)، ابھی البانی صاحب کا ذکر گذرا ہے، ان کے نظریات کے رد میں علامہ اعظمی نے چار اجزاء پر مشتمل ایک کتاب تالیف فرمائی تھی، جس کا نام " الألباني شذوذه وأخطاؤه " ہے، یہ کتاب علمی دنیا میں حد درجہ مقبولیت کی حامل ہوئی، شیخ یوسف ہاشم رفاعی نے اس کتاب کی خوبصورت اور شاندار کتابت و طباعت کے بعد بڑے پیمانے پر نشر و اشاعت کی خدمت انجام دی، اور اس پر ایک بیش قیمت مقدمہ لکھ کر کتاب اور اس کے مؤلف کا بلند آہنگ الفاظ میں تعارف کرایا، لکھتے ہیں:

(۱) المآثر ج ۲ ش ۱ ص ۴۱-۴۰ (۲) ایضاً ص ۳۲

"إنه امام كبير ، ومحقق جليل ، ومحدث نبيل شهير ، وهو العلامة الشيخ حبيب الرحمن الأعظمي الهندى خادم السنة النبوية بحق وعلم وأدب وورع وتقوى الله سبحانه ، وهو يقوم بتحقيق كتب السنة النبوية ونشرها ، دون جعجعة و طنطنة ، أو دعايات و ادعاءات فارغة خرقاء . . . "(۱)

(وہ امام کبیر، محقق جلیل اور محدث نبیل وشہیر حضرت علامہ حبیب الرحمٰن الاعظمی الھندی ہیں، علم وادب اور زہد وتقویٰ کے ساتھ حدیث نبوی کی حقیقی خدمت انجام دے رہے ہیں، اور کتب حدیث کی تحقیق واشاعت کا کام بغیر کسی شور وغوغا یا خالی اور احمقانہ پروپیگنڈوں اور دعووں کے انجام دے رہے ہیں۔)

اور آخر میں تمام عالم اسلام میں آپ کی مقبولیت و ہر دلعزیزی کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"فان اسم الشيخ حبيب الرحمن الأعظمي مقرون عند كل عارفيه فى المشرق والمغرب بالفضل والتقدير والإجلال والمحبة ، والخضوع لعلمه ومعرفته بالسنة النبوية، و كبير خدمته لها وعظيم أدبه مع العلماء و الأئمة الأجلاء "(۲)

(حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی کا نام سارے عالم میں ان کے شناساؤں کے نزدیک عزت وعظمت اور اجلال ومحبت کے ساتھ لیا جاتا ہے، حدیث نبوی۔ علی صاحبہ الصلوٰۃ والسلام۔ کے ان کے علم ومعرفت اور ان کی اس سلسلے میں عظیم الشان خدمات، علماء کرام اور ائمہ اعلام کے حق میں ان کے غایت ادب کی وجہ سے ان کے سامنے گردنیں جھکی ہوتی ہیں۔)

---

(۱) الالبانی شذوذه وأخطاؤه ص۶ مطبوعہ کویت
(۲) الالبانی شذوذه وأخطاؤه ص۸ مطبوعہ کویت

شیخ شعیب الارناؤط عصر حاضر کے بلند پایہ عالم اور نامور محقق ہیں، میدان تحقیق کے بہت ہی تیز رفتار شہسوار ہیں، آپ کی تحقیق سے حدیث ورجال اور تاریخ کی متعدد ضخیم اور کثیر المجلدات کتابیں شائع ہو کر مقبول خاص وعام ہو چکی ہیں، انھیں کتابوں میں علی بن بلبان (المتوفی ۷۳۹ھ) کی "الاحسان فی تقریب صحیح ابن حبان" ہے جو ۱۸ جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔

علم جرح وتعدیل کے اندر امام بخاریؒ ایک اصطلاح "فیہ نظر" استعمال کرتے ہیں، اس لفظ کے بارے میں امام ذہبی، امام عراقی اور دوسرے علماء جرح وتعدیل یہ کہتے چلے آئے ہیں کہ امام بخاری یہ اصطلاح متہم اور متروک وغیرہ راویوں کے لئے استعمال کرتے ہیں، لیکن علامہ اعظمی نے نہایت ثاقب نظری اور باریک بینی سے رجال کی کتابوں کے تتبع واستقصاء کے بعد اس کا دوسرا محمل تلاش کیا ہے۔ جسے شیخ ابو غدہؒ نے اپنی کتاب "الرفع والتکمیل" اور "قواعد فی علوم الحدیث" وغیرہ کے اندر بالتفصیل نقل کیا ہے، شیخ شعیب ارناؤط نے علامہ اعظمی کی اس اجتہادی رائے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے علامہ اعظمی کی امامت اور وسعت مطالعہ کی پوری وسیع النظرفی اور کھلے دل سے داد دی ہے، چنانچہ لکھتے ہیں:

"قلت: وهذه فائدة نفيسة تنبئ عن إمامة هذاالشيخ۔ حفظه الله و نفع به ۔ بعلم الجرح والتعديل، و دراية واسعة بقضاياه "(۱)

(میں کہتا ہوں (کہنے والے شعیب ارناؤط ہیں) یہ ایک عمدہ فائدہ کی بات ہے، جس سے شیخ کی علم جرح وتعدیل کے اندر امامت اور اس کے مشکلات ومسائل کے مکمل ادراک کا پتہ چلتا ہے، اللہ ان کو اپنی حفاظت میں رکھے اور ان سے نفع پہنچائے)

(۱) الإحسان فی تقریب صحیح ابن حبان ۴: ۲۹۳۔۲۹۲

شیخ عابد الفاسی الفہری | فاس (مراکش) کی مشہور لائبریری خزانة جامعة القرويين کے محافظ و نگراں اور عالم و فاضل شخص ہیں، مصنف عبدالرزاق علامہ اعظمی کی تحقیق سے شائع ہونے کے بعد جب ان کے پاس پہنچی ہے، تو انھوں نے ۳۰؍جولائی ۱۹۷۳ء کو مکتب اسلامی بیروت کے پتہ پر ایک خط لکھا، جس کو بیروت والوں نے علامہ اعظمی کی خدمت میں روانہ کر دیا، اس خط کے آغاز میں شیخ عابد فاسی نے کتاب کی وصولیابی کی اطلاع دیتے ہوئے لکھا ہے:

"فقد تشرفنا بوصول كتاب المصنف للحافظ الكبير أبى بكر عبدالرزاق بن همام الصنعانى الذى عنى بتحقيق نصوصه و تخريج أحاديثه الشيخ الإمام العلامة المحدث السيد حبيب الرحمن الأعظمى."

(ہم حافظ ابو بکر عبدالرزاق بن ہمام صنعانی کی کتاب المصنف سے شرفیاب ہوئے، جس کی احادیث کی تحقیق و تخریج امام و علامہ و محدث حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی نے کی ہے۔)

اسی خط میں آگے چند سطروں کے بعد علامہ اعظمی کے مرتبہ و مقام اور ان کی جلالت علمی کے متعلق فرماتے ہیں:

"إن الشيخ حبيب الرحمن الأعظمي هذا أجدر الناس بتحقيق كتب السنة والتعليق عليها، فهو أحد أفراد هذاالعصر الذى هيأ نفسه وهيأه الله تعالىٰ لتجديد هذاالدين تصديقاً لقول النبى عليه السلام إن الله يبعث على رأس كل مائة من يجدد لهذه الأمة أمر دينها . . ."

(شیخ حبیب الرحمٰن اعظمی موصوف کتب حدیث کی تحقیق و تعلیق کے سب سے زیادہ حقدار ہیں، وہ ایسے یکتائے زمانہ ہیں جنھوں نے خود کو تیار کیا اور اللہ نے ان کو اس دین کی تجدید کے لئے مہیا فرمایا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث کے مصداق جس میں انھوں نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ہر سو سال پر ایک ایسا

شخص پیدا کرے گا جو اس امت کے لئے دین کی تجدید کرے گا)

شیخ عابد فاسی کے دل میں علامہ اعظمی کی قدر و منزلت کس قدر تھی، اس کا اندازہ ایک اور خط سے لگایا جا سکتا ہے جو غالبا کسی ایسے خط کے جواب میں ہے جس میں علامہ اعظمی نے مغرب کے سفر کے ارادہ کا اظہار فرمایا تھا، یہ خط ۹ر رمضان ۱۳۹۳ھ مطابق ۷ر اگست ۱۹۷۳ء کا تحریر کردہ ہے، خط طویل ہے، ہم اس کا ایک ٹکڑا نقل کر رہے ہیں:

" فضيلة الأستاذ العلامة المحدث الكبير مولانا حبيب الرحمن الأعظمي ... وإنه ليوم سعيد ذلك اليوم الذى تشرق فيه شمسكم المنيرة على هذه الأرجاء، وسيكون منزلى الخاص مركزاً لاقامتكم أثناء تجوالكم العلمى بهذه الديار فلتعزموا على بركة الله . "

(وہ دن نہایت مبارک ہوگا جس دن آپ کا مہر درخشاں ان اطراف میں طلوع ہوگا، اس وقت میرا اپنا مکان آپ کے اس دیار کے علمی سفر کے دوران آپ کی قیام گاہ ہوگا، لہذا آپ اللہ کی برکت کے بھروسے ارادہ فرمالیجئے۔)

شیخ علوی بن عباس مالکیؒ مکہ مکرمہ کے نہایت جید اور بلند پایہ عالم تھے، حرم شریف کے اندر حلقۂ درس قائم کیا کرتے تھے، حرم پاک میں جب آپ کی مجلس درس وافادہ سجتی تو اس وقت اطراف و آفاق سے آنے والے اہل علم بھی آپ کے چشمۂ علمی سے سیراب ہوتے، استدلال واحتجاج کی قوت، پرزور بیان، فصاحت وبلاغت، وفور علم اور وسعت مطالعہ آپ کے درس کی نمایاں خصوصیات ہوا کرتی تھیں، علم وفن میں مہارت کے ساتھ بڑے صاحب صلاح و تقویٰ بزرگ تھے، علامہ اعظمی نے ان کی نسبت اپنی یادداشت میں لکھا ہے:

"كان رحمه الله من المروءة والوفاء بمكان، بشوشا، دائم البشر، عالما مكينا، يحب العلم وأهله يتزيا بزى أهل الصلاح ويسلك مسلك أهل التقوىٰ . "

(مرحوم انسانیت اور وفا شعاری میں بلند مقام کے حامل تھے، ہشاش بشاش، خندہ رو اور زبردست عالم تھے، علم اور اہل علم سے محبت رکھتے تھے، نیکو کاروں کا لباس پہنتے اور متقیوں کی راہ پر چلتے تھے۔)

شیخ علوی مالکی سے تعارف ان کے ساتھ ملاقات اور ربط و تعلق کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

" استمعت لدرسه ولم أجلس في الحلقة ، فوجدته ذا عارضة قوية ومنطق فصيح في أول قدمة قدمتها مكة ثم زرته في بيته في سنة ١٩٦٥م فأكرمني وأتحفني ببعض تاليفاته، ثم زرته ثانيا في سنة ١٩٧١م وزارني في تلك السنة في بيت الشيخ النمنكاني بالمدينة المنورة مع الشيخ حسن المشاط وولده محمد فبالغ في إكرامي وقبّل جبيني وحثني على إنجاز طبع المصنف لعبدالرزاق وكنت إذ ذاك أشرف على طبعه وأصحح ملازمه في بيروت. "

(میں جب پہلی بار مکہ آیا تو حلقۂ درس میں بیٹھے بغیر ان کا درس سنا تھا تو میں نے ان کو پرزور بیان اور فصیح گفتگو والا پایا تھا، پھر ۱۹۶۵ء میں ان کے مکان پر میں نے ان سے ملاقات کی تو انھوں نے میرا اکرام کیا اور اپنی کچھ کتابیں مجھے ہدیہ کیں، پھر میں نے ان سے دوبارہ ملاقات ۱۹۷۱ء میں کی اور اس سال انھوں نے بھی مجھ سے مدینہ منورہ میں شیخ نمنکانی کے گھر پر حسن مشاط اور اپنے صاحبزادے محمد علوی کے ساتھ ملاقات کی، اس وقت انھوں نے میرا مبالغہ آمیز حد تک اکرام کیا اور میری پیشانی کو بوسہ دیا اور مصنف عبدالرزاق کی طباعت کی تکمیل کے لئے میری حوصلہ افزائی فرمائی، حالانکہ اس وقت میں اس کی طباعت کی نگرانی اور بیروت میں اس کے فرموں کی تصحیح کا کام انجام دے رہا تھا۔)

حضرت علامہ اعظمیؒ نے شیخ علویؒ کے ساتھ اپنی آخری ملاقات اور اکرام واحترام

کا جو اشارہ کیا ہے، اس وقت علامہ اعظمی کے ہمراہ ان کے شاگرد مولانا اقبال احمد اعظمی مقیم لندن ملاقات کے وقت موجود تھے، انھوں نے اپنے مکتوب میں مزید وضاحت کی ہے لکھتے ہیں:

"شیخ علوی عباس مالکی رحمۃ اللہ علیہ کو بڑے علماء جانتے ہیں، وہ شیخ حسن مشاطؒ اور شیخ ابراہیم کردیؒ، کہنا چاہیئے کہ حرم پاک کے بلند پایہ علماء و محدثین کی آخری تین یادگاریں تھیں، ان تینوں کو حضرت مولانا (حبیب الرحمٰن صاحب الاعظمی) مدظلہ کی معیت میں ہی دیکھنے کی اس ناچیز کو بھی سعادت حاصل ہوئی ہے۔ شیخ علوی جو "سید" بھی تھے مولانا سے لپٹے ہوئے ہیں اور بلک بلک کر رو رہے ہیں، اور کہتے جاتے ہیں:

"میں یقین دلاتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ سے راضی ہیں۔"

شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحبؒ برصغیر ہندوپاک میں کون ایسا ہوگا جو حضرت مولانا زکریا صاحب نور اللہ ضریحہ کی شخصیت ان کے نام اور کام سے واقف نہ ہوگا، آپ کے علم و فضل، فضائل و کمالات، زہد و پارسائی، تقویٰ و طہارت، مرتبۂ ارشاد و ہدایت سے ایک دنیا واقف ہے، مذکورہ بالا اوصاف میں سے حضرتؒ کا ہر وصف ایسا ہے جو پورے پورے باب کا موضوع ہے۔ شرح حدیث اور اس کی تصنیف و تالیف کے تو گویا آپ خاتمۃ الباب تھے۔

علامہ اعظمی کا آپ سے بڑا گہرا ربط و تعلق تھا، اور دونوں بزرگ ایک دوسرے کے قدرداں اور رتبہ شناس تھے، اوپر شیخ علوی مالکی کا جو واقعہ ذکر کیا گیا ہے اسی سے مشابہ ایک واقعہ حضرت مولانا زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا بھی ہے، کہ مکہ مکرمہ میں علامہ اعظمی کی ان سے ملاقات ہوئی تو حضرت شیخ علامہ اعظمیؒ سے لپٹ کر رونے لگے اور دیر تک لپٹے ہوئے فرماتے رہے کہ آپ نے بہت بڑا کام انجام دیا اور اسلاف کا قرض اتار دیا۔

xxxxxxxxxx
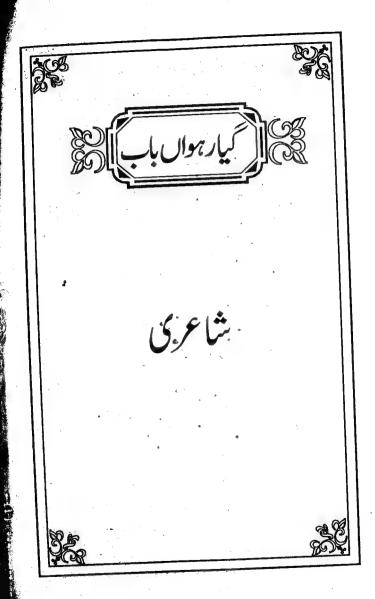
گیارہواں باب

شاعری

گیارہواں باب

شاعری

انسان کی طبیعت کے مختلف رنگ ہوتے ہیں، اور یہ رنگا رنگی ہر آدمی کے اندر کم وبیش پائی جاتی ہے، اس میں بڑے چھوٹے، عالم و جاہل اور شاہ و گدا کی تفریق نہیں کی جاسکتی۔ زندگی کے مختلف مراحل و ادوار ہوتے ہیں اور ہر دور کے الگ الگ تقاضے اور جداگانہ مطالبات، بڑے سے بڑا انسان ہو یا چھوٹے سے چھوٹا شخص اس کی زندگی کا رنگ ہمیشہ یکساں نہیں ہوتا، زمانے کی نیرنگی و بوقلمونی اس کی طبیعت و مزاج کو بہت کم ایک رنگ اور ڈھنگ پر رہنے دیتی ہے، گردش لیل و نہار کے ساتھ اس کے حالات و کیفیات میں تغیر و تبدل ہوتا رہتا ہے، جذبات و احساسات میں انقلاب آتا رہتا ہے، زندگی کے معیار، زاویۂ نگاہ اور انداز فکر میں فرق آجاتا ہے۔ آج ایک چیز میں معنویت ہی معنویت نظر آتی ہے کل وہی چیز بے معنی بن جاتی ہے، ایک شے آج دلفریب نظر آتی ہے، وہی شے کل فریب نظر معلوم ہونے لگتی ہے، ایک فلسفہ آج سچا اور حقیقی قرار پاتا ہے، مگر کل وہی فلسفہ نقش بر آب ثابت ہوتا ہے ۔ غرض اس اتار چڑھاؤ، نشیب و فراز اور دھوپ چھاؤں کا سلسلہ صبح و شام جاری رہتا ہے، آدمی کا ذہن اس تغیر و تبدل اور کشاکش حیات سے متاثر ہوتا ہے، اور اس قبولیت اثر کے بعد اپنے جذبات و احساسات اور انفعالات کے اظہار کے لئے مختلف ذرائع اپناتا ہے، جن میں ایک بڑا ذریعہ شاعری ہوتی ہے۔

اور کبھی اس کے برعکس ہوتا ہے کہ انسان زندگی کی یکسانیت اور یکرنگی سے اکتا جاتا ہے، زندگی کی یکساں رفتار اسے کھلنے لگتی ہے، ہمہ وقتی مشغولیت، اور ہجوم اشغال و

کثرت کار اس کے اوپر شاق گذرنے لگتی ہے، ایسے میں ترویح نفس کے لئے شاعری کا سہارا لیتا ہے، اس کی مثال اس مسافر کی سی ہوتی ہے جو چلچلاتی دھوپ میں راستہ چلتے کسی درخت کے سائے میں سانس لینے کے لئے تھوڑی دیر ٹھہر جاتا ہے، سانس برابر ہوئی نہیں کہ پھر اپنے راستہ پر گامزن ہو جاتا ہے۔

علامہ اعظمی کی شاعری میں نہیں سمجھتا کہ محض شعر گوئی کے واسطے رہی ہو، میرا یقین ہے کہ انھوں نے اشعار کچھ ایسے ہی حالات سے دوچار ہو کر کہے ہوں گے، مگر ساتھ ہی اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ طبیعت نہایت موزوں پائی تھی، کہ اگر سخن سنجی میں بھی کچھ زیادہ طبع آزمائی کی ہوتی تو بہت ممکن تھا کہ اس میں بھی کمال پیدا کر کے نام آور ہوتے۔

علامہ اعظمی کا جو منظوم کلام دستبرد زمانہ سے محفوظ رہ گیا ہے، جب ہم اس پر نگاہ ڈالتے ہیں تو یہ واضح ہوتا ہے کہ انھوں نے اردو، فارسی اور عربی تینوں زبانوں میں اشعار نظم کئے اور متعدد صنف سخن پر طبع آزمائی کی۔ اسی کے ساتھ یہ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ شاعری کا شوق ان کے اندر کم عمری ہی سے پلتا اور پروان چڑھتا نظر آتا ہے۔ سخن سنجی اور سخن فہمی دونوں آپ کے اندر بدرجہ کمال موجود تھیں، چنانچہ مذکورہ بالا تینوں زبانوں کے بے شمار منتخب اور چیدہ اشعار حافظہ میں محفوظ تھے، کسی اور کا کیا ذکر! خود ہمارا مشاہدہ ہے کہ دیوان حماسہ پڑھاتے وقت جب کہ آپ کا سن پچاسی برس تھا، حماسہ کے اشعار یوں پڑھتے جیسے پوری کتاب حفظ ہو، اور شاید ہی کبھی ایسا ہوا ہو کہ کوئی شعر پڑھتے وقت کسی حرف بلکہ زیر زبر کا فرق پڑا ہو۔

یوں تو شعر گوئی کا ذوق و ملکہ طبعی اور فطری تھا، مگر آپ نے اس صلاحیت سے نہ بہت زیادہ کام لیا اور نہ ہی اس کو فروغ دینے کی کوئی خاص کوشش کی، کبھی کسی موقع سے طبیعت کچھ ہموار اور موزوں ہوئی اور کچھ اشعار ذہن میں آگئے تو کاغذ کے کسی ٹکڑے پر نقل کر دیا، ورنہ وہ اہتمام بھی نہیں، اور نقل و تحریر کے بعد بھی حفاظت کی کچھ خاص فکر نہیں، رہ گیا تو رہ گیا ورنہ حوادث دہر کی نذر ہو گیا۔ بہر حال ان کے پریشان اوراق میں کچھ

بکھرے ہوئے ٹکڑے ہاتھ آگئے، جن کو مرتب کرنے کے بعد ایک مختصر سا مجموعہ ”کلام ترتیب پاجاتا ہے، جو اختصار کے باوجود ہمارے لئے نہایت بیش قیمت شے ہے، کہ اس سے علامہ اعظمی کی شخصیت ایک نئے انداز اور نئی سج دھج کے ساتھ ہمارے سامنے آتی ہے، اور ان کے کمال و ہنر کے ایک اور اہم عنصر سے پردہ اٹھتا ہے۔ لیکن یہاں آپ کے کلام کا استقصا مقصود نہیں ہے، صرف نمونہ دکھلا دینا ضروری ہے۔

فن شاعری اور اس کے عیب و ہنر سے واقف اور ردیف و قوافی کے اسرار و رموز سے پوری طرح آگاہ تھے، اوزان و بحور کی پوری معرفت حاصل تھی، اور اپنے اشعار میں اس کی خصوصی رعایت برتتے تھے۔ سید سلیمان ندویؒ کے انتقال کے بعد اس حادثہ سے متاثر ہو کر چند اشعار نظم کئے، جسے اشاعت کے لئے قاضی اطہر صاحب مرحوم کے پاس بمبئی بھیجا، قاضی صاحب اس وقت انقلاب کے مدیر تھے، وہ نظم جب قاضی صاحب نے دیکھی تو غالباً اسے وزن سے ساقط سمجھ کر اس میں تصرف کر کے شائع کیا، علامہ اعظمی نے جب اس کو چھپی ہوئی صورت میں دیکھا ہوگا تو عجب نہیں کہ سخت دھچکا لگا ہو، چنانچہ انھوں نے قاضی صاحب کے پاس تحریر فرمایا:

”آپ کے ”تصرفات“ کی نسبت گذارش ہے کہ اصلاح اگر موجہ ہو تو میں صرف خوش نہیں بلکہ شکر گذار بھی ہوتا ہوں، مگر آپ نے اپنے تصرفات کی کوئی وجہ نہیں لکھی، میں نے یہ وجہ سمجھی ہے کہ آپ نے اس نظم کو مثنوی مولانا روم کے وزن پر پر بحر رمل مسدس محذوف میں خیال کیا، اس لئے جو مصرعے وزن سے گرتے تھے، آپ نے اس وزن پر بناڈالا، حالانکہ یہ صحیح نہیں ہے، میری نظم قران السعدین، مخزن اسرار، مطلع الانوار اور سبحۃ الابرار کے وزن پر بحر سریع مطوی موقوف سے ہے، جس کا عروض و ضرب مختلف یعنی ایک مطوی مکسوف (فاعلن) اور دوسرا مطوی موقوف فاعلان ہو سکتا ہے، اس بحر میں یہ بات ہوئی ہے، اس کے بعض شعر یا مصرعے بحر رمل بھی پڑھے جا سکتے ہیں، جیسے

مولانا جامیؒ کے یہ اشعار

(۱) زفتن او جستن تیر از کماں — جستن او جحت طے مکاں

(۲) توبہ دہ از سر کشی ایام را — باز خراز ماخوشی اسلام را

(۳) دیدۂ عالم بتوروشن شود — گلخنِ گیتی بتو گلشن شود

(۴) ظلمت بدعت ہمہ عالم گرفت — بلکہ جہاں جامۂ ماتم گرفت

مصرعہ اولی بحر رمل میں پڑھا جا سکتا ہے۔

(۵) چوں نہ بزرگست وشرعش تخن — منبر او برسراو خورد کن

اس میں صرف مصرعہ ثانیہ بحر رمل مین پڑھا جا سکتا ہے ، حالانکہ سبحۃ الابرار جامی بحر سریع میں ہے اور اس کا پہلا مصرعہ "ہست صلائے بر خوان کریم" ہے اور اسی مثنوی کا یہ مشہور شعر ہے ۔

اے مبرا پردۂ یثرب بخواب — خیز کہ شد مشرق و مغرب خراب"(۱)

اس بحث کے بعد اسی مکتوب میں قاضی اطہر صاحب کی ایک عربی نظم میں کچھ اصلاحات فرمائی ہیں، قاضی صاحب خود بھی سخن فہم و سخن سنج تھے، انھوں نے علامہ اعظمی کی اس اس خالص فنی تنقید کو قدر کی نگاہ سے دیکھا اور ۳۰ ر دسمبر ۱۹۵۳ء کے "انقلاب" میں "ایک علمی اور ادبی مکتوب گرامی، بحر سریع اور بحر رمل کی ناقدانہ تشریح" کے عنوان سے شائع کیا، یہ نظم ناظرین صفحہ ۶۲۳ پر ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔

اوپر عرض کر چکا ہوں کہ شاعری کا جوہر متعدد اصناف میں دکھایا ہے، لیکن غزل، مرثیہ اور نعت کو نمایاں حیثیت حاصل ہے، اسی طرح مادۂ تاریخ کے استخراج پر بھی قدرت حاصل تھی، اور بہت سی اہم شخصیات کی وفات اور بعض اہم واقعات کی تاریخ نکالی ہے، کلام کا کچھ حصہ ایسا بھی ملتا ہے جس میں دوسرے شعراء کی زمینوں کو استعمال کیا ہے، اور ان میں اپنی قوت تخیل اور زور بیان سے خاصہ اضافہ کیا ہے۔

(۱) روزنامہ انقلاب ۳۰ ر دسمبر ۱۹۵۳ء

شاعری کا سب سے بڑا اور اہم عنصر جذبات واحساسات ہوتے ہیں۔ شاعر کے جذبات میں جس قدر قوت، شدت اور تیزی ہوگی، اس کے اشعار اتنے ہی پر اثر، چست اور دل کو چھو لینے والے ہوں گے۔ علامہ اعظمی کے جذبات واحساسات چونکہ ان کے عقل و ادارک سے مغلوب رہا کرتے تھے، اس لئے ممکن ہے کہ ان کی شاعری میں تاثیر کی وہ شدت نہ ہو جو تند و تیز جذبات کی پیداوار ہوتی ہے، اس لئے ہم نہیں کہہ سکتے کہ ان کی شاعری فن کی بلندی کو چھو لینے والی ہوگی، مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ بعض چیزیں انھوں نے لاجواب کہی ہیں۔

رہا سوال تخلص کا؟ تو انھوں نے مختلف اوقات میں متعدد تخلص استعمال کئے، ابتداءً انھوں نے اپنے تاریخی نام کا جزء اول "اختر" کا لفظ استعمال کیا۔ اس کے بعد اپنا تخلص "شوق" چنا، اور اس نام سے نہ صرف نظمیں اور غزلیں بلکہ متعدد مضامین بھی لکھے، اور آخر عمر میں جو چند نعتیں کہیں ان میں اپنے نام "حبیب" کا استعمال کیا۔

نعتیہ شاعری

جس طرح توحید کے ساتھ رسالت پر ایمان لائے بغیر آدمی مومن نہیں ہو سکتا اسی طرح کمال ایمان کے لئے حب نبیؐ بھی شرط ہے، اور یہ محبت ایسی ہو کہ تمام دنیوی علائق اور محبتوں پر فائق ہو، بحکم ارشاد نبوی " لا يؤمن أحدكم حتى أكون أحب اليه من والده وولده والناس أجمعين " (تم میں سے کوئی اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا، جب تک کہ میں اس کے نزدیک اس کے والد، اس کے لڑکے اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں)

حب نبی مومن کے لئے توشۂ آخرت ہے، بشرطیکہ یہ محبت شریعت کی قائم کردہ حدود تک محدود ہو، اور اس میں غلو اور افراط سے کام نہ لیا جائے کہ نبوت و رسالت کے درجہ سے اٹھا کر مقام الوہیت تک پہنچا دیا جائے، جس کے لئے کہا جاتا ہے کہ ع

با خدا دیوانہ باش و با محمد ہوشیار

علامہ اعظمیؒ کو احادیث نبویہ کے ساتھ جو غیر معمولی شغف و شیفتگی اور ذات رسالتمآب علیہ الصلاۃ والسلام کے ساتھ جو والہانہ محبت تھی وہ نہ مخفی ہے نہ محتاج بیان۔ یہ وفور عشق اور کمال محبت تھا کہ تقریباً تین چوتھائی صدی حدیث نبوی کی خدمت، اس کی اشاعت اور اثبات حجیت میں گذار دیئے، اپنی اس محبت اور والہانہ پن کا اظہار متعدد نعتوں میں بھی کیا ہے، جن میں سے ایک جو زمانۂ آغاز کی ہے، درج ذیل ہے:

نعت میں رطب اللساں ہے احمد مختار کی — دھوم ہو کیونکر نہ میرے خامۂ دربار کی

ہو غلامی کا مجھے تمغہ عطا روحی فداک — عزت افزائی ہو اتنی شاعر دربار کی

کھاتی تھی موج ضلالت کے تھپیڑے دمبدم — آپ نے آکر سنبھالا اور کشتی پار کی

جس نے دیکھا ہو گیا وہ کشتۂ تیغ ادا — کیا ضرورت آپ کو خنجر کی اور تلوار کی

اک نگاہ لطف سے دیکھا جہاں سرکار نے — بھر گئی جیب مراد اس اختر نادار کی

ایک اور نعت پاک میں اپنی فداکاری اور جاں سپاری کا تذکرہ کیا ہے، جس کا پیرایۂ بیان بھی اوپر ذکر کی گئی نعت ہی کی طرح سادہ اور سہل ہے، وہ یہ ہے:

مرے ماں باپ مری جان رسول عربی ترے صدقہ ترے قربان رسول عربی
ہر ادا پر تری اور سنت بیضا پہ تری میں ہوں جان سے قربان رسول عربی
آرزوئے دل بیتاب ہے مدت سے یہی بنوں میں آپ کا مہمان رسول عربی
صرف اک تیری غلامی و محبت کے سوا مغفرت کا نہیں سامان رسول عربی
مدعا ہے کہ رہے آپ کا ذکر محمود ورد ہر لحظہ و ہر آن رسول عربی
شوقؔ پر اک نظر لطف و کرم ہو شاہا! آپ کا ہے یہ ثنا خوان رسول عربی

یہ دونوں بالکل ابتدائی دور کی ہیں جو نمونہ کے طور پر ذکر کر دی گئی ہیں، بعد میں آپ نے جو نعتیں کہیں ان میں درج ذیل نعت میں غزوۂ بدر و فتح کے آثار و نتائج میں فرق، سر تاج انبیاء اور دیگر انبیاء کرام علیہم الصلاۃ والسلام کے مقامات کے تفاوت اور حدیث نبوی کے جانفزا، روح پرور اور سکون بخش ہونے کو کس خوبی، صفائی اور بلیغ انداز میں ثابت کیا ہے:

وہ جہاں کا رمز وجود ہے، وہ مدارِ کارِ نظام ہے
■ خدا کی شانِ جمال کا بخدا کہ مظہر تام ہے
کرو یاد معرکہ بدر کا، پڑھو فتح مکہ کا واقعہ
■ خدا کا قہر و جلال تھا یہ نبی کی رحمت عام ہے
سبھی انبیاء کرام کا ہے مقام سب سے بلند تر
■ ہلال چرخ کمال تھے مرا شاہ بدرِ تمام ہے
جو غذائے روح و سکونِ دل ہے انھیں کی پاک حدیث ہے
جو مریض دل کے لئے شفا ہے انھیں کا پاک کلام ہے
جو مجھے ملا وہ ملا انھیں کی نگاہِ لطف و کرم سے ہے
قلم و زبان حبیب کیا ہے انھیں کا فیض دوام ہے

علامہ اعظمی کی نعت گوئی کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ بعض تاریخی واقعات کا کہیں اشارے کنائے میں اور کہیں بتصریح نہایت صفائی اور عمدگی کے ساتھ ذکر کرتے ہیں، اس کی ایک مثال اوپر غزوۂ بدر اور فتح مکہ کے ذکر میں دیکھ چکے ہیں، ایک اور نعت میں مشہور صحابیٔ رسول حضرت عبداللہ بن سلامؓ جو ایک بڑے یہودی عالم تھے، کے قبول اسلام کے واقعے کو بہترین پیرایہ میں موزوں کیا ہے، اور عشق رسولؐ کے ساتھ خلفاء راشدین اور جملہ صحابہ کرامؓ کی محبت و عقیدت پر ایمان و تصدیق کی مہر ثبت کی ہے، اور اہل بیت کے لفظ کے مصداق کو واضح کیا ہے، جس سے شیعوں کے عقائد پر تعریض اور ان کا بلیغ رد بھی ہے، اس کے اندر اپنے اسفار کے محرک اور مقصد پر بھی روشنی ڈالی ہے جو بہت بصیرت افروز ہے:

میں والہ و شیدا ہوں نبی عربیؐ کا ۔۔۔ مکی ، مدنی ، ہاشمی و مطلبی کا

ایماں ہے مرا زمزمہ خواں صدر خلافت ۔۔۔ صدیقؓ، عمرؓ، حضرت عثمانؓ و علیؓ کا

ہیں بیت کا مصداق نساء اقدم و اول ۔۔۔ اور ثانوی ہے اہل عبائے نبوی کا

جو آنکھیں تھیں انوار نبوت سے منور ۔۔۔ خاکِ کفِ پا ہوں میں ہر اک شیخ و صبی کا

بیروت و کویت اور حلب میں نہ کشش تھی ۔۔۔ یہ جاذبہ تھا حبِ حدیثِ نبوی کا

ہے خُلق بنیٔ خاصۂ ختم رسالت ۔۔۔ دنیا میں علم لے کے اٹھو خُلق نبیؐ کا

کتنی اثر انگیز تھی ہجرت کی وہ تاریخ ۔۔۔ بس تین ہی فقرے کا تھا یہ خطبہ نبیؐ کا

تھے ابن سلامؓ اک بڑے ذی علم یہودی ۔۔۔ موجب ہوا اسلام کا یہ خطبہ نبیؐ کا

آمد کی صدا کانوں میں اک نخل پہ آئی ۔۔۔ بے خوف و خطر کو دے سنا کلمہ نبیؐ کا

کھلواؤ مساکین کو پھیلاؤ سلام آپ ۔۔۔ اٹھ جاؤ کہ جب غلبہ ہو خواب سحری کا

چہرے پہ نظر پڑتے ہی بے ساختہ بولے ۔۔۔ ممکن نہیں یہ چہرہ ہو کذاب شقی کا

اس انس و تعلق کی بنا پر ہوں پر امید
دیوانہ ہوں مدت سے حدیث نبوی کا

مذکورہ بالا نعت اس وقت کہی گئی تھی جب آپ پر دل کا شدید ترین دورہ پڑا تھا، اس وقت موت وزیست کی کیفیت سے دوچار اور سخت ترین اذیت میں مبتلا تھے، اس وجہ سے اس کا ہر شعر اور ہر مصرعہ ان کے دل کی آواز اور قلب کی گہرائیوں سے نکلا ہوا ہے۔

محرم ۱۴۰۰ھ میں آخری سفر حج کے موقع پر فرائض حج سے فراغت کے بعد آپ مدینہ منورہ پہنچے، وہاں سے جب روانگی کا وقت قریب آیا اور واپسی کے لئے سواری پر سوار ہوئے تو بے ساختہ آپ کی نگاہ روضۂ اطہر (علی صاحبہا الصلاۃ والسلام) کی طرف اٹھ گئی پھر اس طرح جمی کہ ٹکٹکی بندھ گئی، جدائی کی شدت غم سے آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب امڈ پڑا، آنکھوں سے وہ قطرے بکھر رہے تھے جو عقیق و مروارید سے زیادہ قیمتی تھے، اس کیفیت میں ایک قطعہ اور ایک فارسی نعت موزوں ہوئی، جس میں کسی فارسی شاعر کی زمین استعمال کی گئی ہے، وہ قطعہ اور نعت شریف دونوں حاضر ہیں:

قطعہ

شکرانۂ مولائے نِعَم پہلے ضروری تھا　　مقصود سفر ورنہ یہ بقعۂ نوری تھا
صد شکر کہ حاصل ہوا اب قرب حضوری　　اب دل میں نہیں بالکل جو شکوۂ دوری تھا

نعت شریف

زآستانت باسر اشک غم بیادت می روم　　بادل صد چاک وباصد یاس وحسرت می روم
گر توانستم نمی بودم زپائے تو جدا　　می روم لیکن بقصد وعزم عودت می روم
می روم سوئے وطن وز درد دل بے اختیار　　نالہ دارم کہ می گوئی بہ غربت می روم
یا رسول الله جئنا إذ ظلمنا فلنجد　　ربنا با ہر دو وصف ختم آیت می روم

أنعِشَنْ إیاہ یا مولی الحبیب الاعظمی
خستہ افتادہ نماید چوں زکویت می روم

نعت گوئی کا ذکر چل پڑا، تو مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس ضمن میں علامہ اعظمی کی قادر الکلامی کا ایک اور نمونہ ذکر کر دیا جائے، جس کو آپ نے اقبال سہیل کی شہرۂ آفاق نعت "موج کوثر" سے متاثر ہو کر نظم فرمایا ہے، جو نعتیہ مضمون کے سوا اقبال سہیل کو ان

کے اس شاہکار پر خراج تحسین بھی ہے، اس میں وہی بحر اور ردیف و قافیہ استعمال ہوا ہے، جو "موج کوثر" کا ہے اور اسی جیسی صفائی و ستھرائی اور سلاست و روانی ہے، اس پر آپ نے ایک مختصر سا نوٹ بھی لکھا تھا جو بعینہ پیش خدمت ہے، لکھا ہے:

"مدرسہ مفتاح العلوم۔ مئو

۲۸/ فروری ۱۹۴۴ء

مکرم! السلام علیکم، آپ کی تازہ نعت نبوی اتفاقیہ ایک صاحب سے مل گئی، اس کو پڑھ کر میں اتنا محظوظ ہوا کہ بے ساختہ چند شعر موزوں ہوگئے، اب میں نہ شاعر ہوں نہ یہ شاعری ہے، بلکہ میرے تاثرات ہیں جو موزوں ہوگئے ہیں۔

اے اقبال! اے شاعر ملت! نازش قوم اور فخر جماعت!
مدح نگار مرسلِ خاتم، صلی اللہ علیہ وسلم

لکھی تو نے کتنی سچی، کتنی بلند اور کتنی پیاری
نعت حضرتِ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم

اس نے روحوں کو گرمایا، جوشِ عقیدت اس نے بڑھایا
سب کی زبانوں پر ہے پیہم صلی اللہ علیہ وسلم

تجھ کو مبارک مدح نگاری، تجھ پر سایۂ رحمت باری
تجھ سے راضی ہادیِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم

إنك إن تقرءه عليه يوم المحشر حين تراه
أرجو منه أن يتبسم صلى الله عليه وسلم

اس آخری شعر میں اقبال سہیل کو جس انداز سے داد تحسین دی گئی ہے، ان کی اس کاوش فکر کے لئے اس سے بہتر داد نہیں ہو سکتی، اس شعر کا مطلب یہ ہے کہ اگر تم اس کو حشر کے دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پڑھو گے، تو مجھے امید ہے کہ اس کو سن کر آپ بھی مسکرا دیں گے۔

غزلیات

علامہ اعظمی کے اندر شاعری کا ذوق و ملکہ چونکہ فطری تھا، اور طبیعت بھی موزوں پائی تھی، اس لئے اس کا چسکا بھی آغاز شباب بلکہ کم سنی ہی سے لگ چکا تھا، اور مختلف اصناف سخن پر طبع آزمائی کرنے لگ گئے تھے، ابتدائی دور کی آپ کی شاعری کو دیکھ کر گمان ہوتا ہے کہ اگر اپنی توجہ پوری طرح علمی کاموں کی طرف صرف نہ کردی ہوتی، اور تھوڑا بہت تعلق شعر گوئی سے بھی رکھتے تو کچھ عجب نہ تھا کہ ایک بڑے اور استاد شاعر کی حیثیت سے نام پیدا کرتے، لیکن قدرت کو چونکہ اپنے دین اور علم حدیث کی عظیم الشان خدمت لینا مقصود تھا، اس لئے اس کی طرف سے آپ کی توجہ قدرتی طور سے دور ہوتی گئی، یہاں تک کہ ایک شاعر کی حیثیت سے آپ بالکل غیر معروف رہے، اور اس راہ سے آپ کا کچھ تعارف ہوا بھی تو صرف نعت گو کے طور پر جب کہ عہد شباب میں آپ نے بہت سی غزلیں بھی کہیں ہیں۔ یہ سب ابتدائی دور کی ہیں، جن کو ہم نمبروار اور جن کی تاریخ معلوم ہے ان کی تاریخ کے ذکر کے ساتھ قارئین کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں۔

(۱)

یہ غزل اس وقت کی ہے جب ابھی آپ طالب علمی کے عہد میں تھے، اور مظہر العلوم بنارس میں مولانا عبدالغفار صاحب عراقی مئوی کے دامن تربیت سے وابستہ تھے، جیسا کہ تاریخ خود آپ نے درج فرمائی ہے۔

بنارس یکم مئی ۱۹۱۹ء ۲۹/ ذی قعدہ ۱۳۳۶ھ

کسی کا چہرۂ تاباں ہے مطلع انوار — ہے بڑھ کے چرخ چہارم سے آستانۂ یار
کچھ ایسی چھیڑ رہی مجھ سے چرخ ظالم کو — کہ باغ حسن کی اک پل نہ دیکھنے دی بہار
ہوا اثر ہے یہ جادوئے چشم فتاں کا — رہے نہ قابو میں ہوش و حواس و صبر و قرار

کسی کی زلف کی پھیلی ہوئی ہے یہ خوشبو
کہ ہو گیا ہے بنارس بھی خطۂ تاتار

جو بت کہ ہو ادب آموز ہندو کالج میں
بھلا وہ جام شرارت سے کیوں نہ ہو سرشار

جو وہ ہے شوخی میں یکتائے روزگار اختر
تو اس سے شوخی میں کچھ کم نہیں مرے اشعار

(۲)

بنارس یکم ستمبر ۱۹۱۹ء مطابق ۱۳۳۷ھ

کیسی اس نام میں واللہ درخشانی ہے
روشن اس سے ہی مسی کی بھی ذیشانی ہے

لوگ تو کہتے ہیں ثانی کنعانی ہے
پر میں کہتا ہوں کہ یوسف لاثانی ہے

آپ کے گیسوئے شبگوں کا ہے سودا وہ شے
جس کے ہاتھوں ہوئی ایک خلق ہی دیوانی ہے

آب کیا چہرہ پہ ہے اس بت شعلہ رو کے
معجزہ ہے کہ جہاں آگ وہیں پانی ہے

دیکھ کر تابش دندان صفا خیز تری
غرق دریائے خجالت دُر عمانی ہے

قدرداں بول اٹھے سن کے کلام اختر
کوئی اعجاز ہے یا طرز سخن دانی ہے

(۳)

جمادی الاولیٰ ۱۳۳۸ھ — جنوری ۱۹۲۰ء

نہ دو رقیب کو بوسہ مجھے دکھا کر کے
ملے گا کیا کسی بے کس کا جی کڑھا کر کے

کیے کی اپنے سزا پائی دل لگا کر کے
جنوں نے مجھ کو پھرایا برہنہ پا کر کے

اڑائے اپنے گریباں کی دھجیاں گل بھی
جو نکلو سیر کو زیب بدن قبا کر کے

کلیجہ بلبل شیدا کا پھٹ پڑے نہ کہیں
چمن میں آؤ نہ بند قبا کو وا کر کے

گلے میں ڈال دیں باہیں جو شوق میں آکر
تو بولے دیکھنا صاحب ذرا بچا کر کے

مرید پیر مغاں خود بھی ہو گئے جا کر
گئے تھے شیخ جی کیا کرنے، آئے کیا کر کے

(۴)

۱۸ ردسمبر ۱۹۱۹ء

بزم طرب میں یکسو چھڑا تار ساز تھا — شمعوں پہ ایک عالم سوز و گداز تھا
موجوں کی زد سے ماہ عرب نے ہٹا لیا — جب معرضِ خطر میں ہمارا جہاز تھا
ہم کو بھی اک زمانے میں اے شیخ معتکف! — مسجد سے انس دل میں فراق نماز تھا
حوریں بھی سیر عالم بالا میں دیکھ لیں — نہ یہ ادا، نہ غمزہ، نہ عشوہ، نہ ناز تھا
ہم کیا دکھائیں جودتِ طبعِ رسا کی حیف — اب وہ دماغ ہی نہ رہا جس پہ ناز تھا
بہر جنازہ ٹوٹ پڑے ہیں ملائکہ — اختر بھی کوئی متقی پاکباز تھا

(۵)

راز دل کا نہیں رہ سکتا ہے پنہاں کوئی — رہے ہر وقت جب انگشت بدنداں کوئی
زلف کافر کے تطاول کا یہی حال ہے جب — کہیں ڈھونڈھے سے ملے گا نہ مسلماں کوئی
میں نے مانا کہ تو مردوں کو جلاتا ہے مسیح — ہے ترے پاس مرے درد کا درماں کوئی
حسن کو ان کے مرے عشق نے چمکایا ہے — بھولے ہرگز نہ میرے عشق کا احساں کوئی
قیس عامر ہو کہ فرہاد ہو یا اور کوئی — نہیں اختر کی طرح سوختہ ساماں کوئی

(۶)

ملتا نہیں تم سا حسیں یار ہمیشہ — ملتے نہیں ہم سے وفادار ہمیشہ
کرتا ہوں جو دندان صفا خیز کی تعریف — رہتا ہے قلم میرا گہر بار ہمیشہ
اے دل! نہ کہا تھا نہ اٹھانا غم الفت — آرام میں رہتے ہیں سبکسار ہمیشہ
دنیا میں ملال اور خوشی دونوں ہیں توأم — ہے باغ میں ہم پہلوئے گل خار ہمیشہ
واعظ نے کہا پی کے جب آیا وہ مزے میں — آباد رہے خانۂ خمار ہمیشہ
کہتا ہوں کہ کب تک یہ ستم ڈھاؤ گے صاحب — کہتا ہے خفا ہو کے جفاکار ہمیشہ

(٧)

بچائے حق ترے تیر نظر سے — کہ دل کو توڑ کر گزرا جگر سے
بچائے دل بت جادو نظر سے — ہے باہر حد امکان بشر سے
نہ کیوں خالی ہو آہ اپنی اثر سے — شروع عشق ہے ماہ صفر سے
جگادے مے کے چھینٹوں سے کہ ساقی — صبوحی کش پڑے ہیں بے خبر سے
اگر ساقی اٹھائے آنکھ مستو! — شراب ناب بھی گردوں سے برسے
نہیں معلوم کیا گذری الٰہی — ابھی لوٹا نہیں قاصد ادھر سے
یہاں رہتے ہو کیوں کر قبر والو! — نہیں ہوتی ہے وحشت اس کھنڈر سے
درِ میخانہ پر اے حضرت شیخ! — بتائیں آپ آتے ہیں کدھر سے
جمال یار دیکھا تم نے موسیٰ — پڑے ہو جلوہ گہہ میں بے خبر سے
نسیم صبح تنکے چن رہی ہے — کوئی آنے کو ہے اس رہ گذر سے
قضا کی تیغ ہے تیغ ادا بھی — نہیں رکتا ہے وار اس کا سپر سے
خلش نوک مژہ کی ہے قیامت — بہت بے چین ہوں دردِ جگر سے
قیامت ہے رہیں ہم سے کشیدہ — رقیبوں سے ملیں شیر و شکر سے
نمونہ حشر کا مقتل ہے اے ترک — صدائے الاماں و الحذر سے
ہوئی شام جوانی زلف. لیکن — گیا اس زلف کا سودا نہ سر سے
در مضموں پروئے تو نے اختر — ترے اشعار ہیں سلک گہر سے

(٨)

مصرح طرح :۔ بہت بے چین ہوں درد جگر سے

مجھے وحشت ہوئی دیوار و در سے — گیا صحرا کو میں دیوانہ گھر سے
نکل آیا ہے طفل اشک گھر سے — نہیں واقف ہے تکلیف سفر سے

میں صحرا میں ہوں گھر پر میری حسرت — لپٹ کر روتی ہے دیوار و در سے
مری وحشت یہی کہتی ہے مجھ سے — کہ جا کر توڑ سر اس سنگ در سے
چمن میں دامن گل پارہ پارہ — ہے دست اندازیٔ باد سحر سے
پہونچ جائے گا اڑ کر نامۂ شوق — وہاں پہلے ہی مرغ نامہ بر سے
ہے نخل بارور نخل قد یار — نہ دو تشبیہ سروِ بے ثمر سے
بتوں کے رخ پہ آب و تاب ہے کیا — یہ منھ دھوتے ہیں کیا آب گہر سے
گئی ہیں آتشیں آہیں فلک پر — نہ کیوں پانی کے بدلے آگ برسے
فرنگن کافروں کی زلف گویا — یدِ قدرت نے دھوئی آب زر سے
صدائے مرغ سن کر وصل کی شب — جگر میں ٹیس اٹھی پچھلے پہر سے
سن کر ہو گئے بیتاب اے دل! — نہیں خالی ترے نالے اثر سے
حباب آسا ہیں بحر عشق میں ہم — خدا ہی ہے جو بچ جائیں بھنور سے
ہیں اس میں کشتۂ ناز بتاں دفن — یہ ظاہر ہے مری لوح حجر سے
جمال و حسن میں اختر وہ عارض — کہیں بڑھ کر ہیں خورشید و قمر سے

۹

باقی نہیں نشاں بھی میرے جسم زار کا — کیا خاک مجھ کو ڈر ہو لحد کے فشار کا
روشن ہے ایک داغ دل داغدار کا — جلتا نہیں چراغ ہمارے مزار کا
اب آسمان ٹوٹے گا کس پر کہ اے بتو! — باقی نہیں نشان ہمارے مزار کا
اتنی کڑی تھی ہو گئی مدت پئے ہوئے — ساقی ہے آج تک وہی عالم خمار کا
کالی بلا کوئی کہ شب غم ہے اے خدا! — یا ماتمی لباس کسی سوگوار کا
آتی ہے بو شراب کی خاک مزار سے — بیشک مزار ہے یہ کسی مے گسار کا

یوں بھیڑ عاشقوں کی ہے در پر ترے صنم — میلا لگا ہو جیسے کوئی ہر دوار کا
ششدر ہوئے ہیں آکے نکیرین قبر میں — ملتا نہیں نشان مرے جسم زار کا
اختر گنا کیا ہوں میں تاروں کو صبح تک — اچھا یہ مشغلہ تھا شب انتظار کا

(۱۰)

لا ادھر ساقی یہ کیوں رکھی ہے پیمانوں میں — چھا گیا ابر، بہار آئی گلستانوں میں
اس قدر جوشِ جنوں ہے ترے دیوانوں میں — گھر میں ایک پاؤں ہے، اک پاؤں بیابانوں میں
ہے مرے قصۂ درد میں جو سوز و گداز — نہیں کوہ کن و قیس کے افسانوں میں
رنج و غم میں نہیں اب کوئی کسی کا پرساں — ام کو بھی نہیں انسانیت انسانوں میں
پاسدار ان کا ہے دل کہنے کو ہے پاس مرے — سمجھوں اپنوں میں کہ سمجھوں اسے بیگانوں میں
محو ہیں لذت آزار میں آزار پسند — نہیں جانتے کیا لطف ہے احسانوں میں
کیا ترا وحشیوں نے چاک گریباں دیکھا — ایک دھجی نہیں اب ان کے گریبانوں میں
ہوں وہ محروم ازل سوختہ اختر یا رب — شمعیں داغوں کی جلاتا ہوں شبستانوں میں
کیا مئے تند ہے میخانۂ مینائی کی — میں ہوں اختر اسی خمخانے کے مستانوں میں

(۱۱)

مدتوں سے نہیں دیکھا رخ زیبا تیرا — مگر آنکھوں کے تلے پھرتا ہے نقشہ تیرا
گرچہ دنیا میں حسینوں کی ہے تعداد بہت — مگر ان سب میں مجھے حسن ہے بھایا تیرا
چاہے کچھ رحم مرے حال پر کھایا کہ سنا — اختر زار کو تو ہو چکا سودا تیرا

(۱۲)

انتہا ہوگئی تغافل کی — مر گئے ہم تجھے خبر نہ ہوئی
ہے تو لیکن نظر نہیں آتی — یہ معما ہوئی کمر نہ ہوئی
اب لگے دیکھنے بچا کے نظر — نہ ہوئی آہ بے اثر نہ ہوئی
متحمل تمہارے جلووں کی — نہ ہوئی اف میری نظر نہ ہوئی

(۱۳)

بنارس ۱۹۱۸ء مصرع طرح: "یہ دل شیدا ہے محبوب خدا کا"

میں قائل ہوں تعشق کے مزہ کا پر اس میں سامنا بھی ہے قضا کا
شب وعدہ تھی لیکن وہ نہ آئے بہانہ مل گیا ان کو حنا کا
اڑا لے جاتی گر مجھ کو وہاں تک بہت احسان تھا باد صبا کا
جو آئے ہو تو کچھ منہ سے تو بولو ہے کیا یہ بھی کوئی موقعہ حیا کا
خدا حافظ ہے اس ظلمت کدہ میں گدائے کوچۂ زلف دوتا کا
وہ بالی عمر وہ بھولی سی صورت غضب اس پر کھلی رہنا قبا کا
مری باتوں پہ اب آنے لگے وہ اثر شاید ہوا آہ و بکا کا
بتوں کا عشق اوروں کو مبارک "یہ دل شیدا ہے محبوب خدا کا"
وہ بیٹھے رہ گئے مہندی لگا کر نکالا خوب حیلہ دست وپا کا
مصور نے ہزاروں کوششیں کیں نہ نقشہ کھینچ سکا نازوادا کا
وہ بجلی کے تڑپنے کی گھڑی تھی کہ عالم خندۂ دنداں نما کا
ہوئے اشعار کیا پر نور اختر پڑا تجھ پر بھی کیا پرتو ضیا کا

مذکورہ بالا غزلوں میں کئی ایک پر اس کے نظم کرنے کی تاریخ بھی مذکور ہے، اس سے قارئین اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں کہ یہ کلام ابتدائے عہد شباب یا زیادہ سے زیادہ بیس پچیس برس کی عمر تک کا ہے، اور یہی زمانہ میرے خیال میں علامہ اعظمی کی غزل گوئی کا زمانہ بھی ہے، اور زیادہ تر غزلیں اسی سن کی کہی ہوئی ہیں۔ اوپر جو غزلیں ہم نے ذکر کی ہیں ان کے علاوہ بھی آپ کے کاغذات میں متعدد غزلیں اور کچھ متفرق اشعار ملتے ہیں، چنانچہ ذی الحجہ ۱۳۳۷ھ مطابق نومبر ۱۹۱۹ء میں دیوبند میں ایک غزل کہی تھی، جس کے چند قابل ذکر اشعار پیش خدمت ہیں:

(۱۴)

نہ بھولی ہے نہ کبھی دل سے آہ بھولے گی ادا کسی کے دبے پاؤں چپکے آنے کی

بجھی نہ گرمیٔ شوق ان کی سرد مہری سے — ہزار کوششیں گو اس نے کیں بجھانے کی
صبا کی چھیڑ پہ جھلا کے بول اٹھا غنچہ — یہ بار بار بری لت ہے گدگدانے کی
سمجھ سکیگا وہی میرے دل کی حسرت کو — جو تکتا رہتا ہو راہیں قضا کے آنے کی
ہے عشق بھی کوئی کمبخت لاعلاج مرض — اثر دعا نے نہ تاثیر کچھ دوا نے کی
کہاں میں اور کہاں دیوبند اے اختر — کشش نے کھینچ کے پہنچایا آب ودانے کی

کئی ایک غزل میں آپ نے دیکھا ہوگا کہ کسی مصرع طرح پر تضمین کر کے غزل کہی ہے، اسی طرح کی کوئی غزل غازی آباد کے کسی مشاعرہ کے لئے دسمبر ۱۹۱۹ء میں کہی تھی جس کا مطلع تھا:

نہ ہو تا غیر، ہم، تم اور چمن کی گلز میں ہوتی — گھٹا چھائی ہوئی حاضر شراب آتشیں ہوتی

اس غزل کے بھی کچھ اشعار قارئین کے ملاحظہ کے لئے ذکر کر دینا مناسب سمجھتا ہوں

کسی مسجد میں ہم بھی بیٹھ کر ذکر خدا کرتے — جو تیری بات زاہد در خور صدق ویقیں ہوتی
تپ غم میں ترے بیمار کو ہے تشنگی از بس — پئے جاتا ہے خون دل مگر سیری نہیں ہوتی
مسیحا گر علاج درد دل کرنا ہے کر دیکھو — مگر تدبیر اس میں کارگر کوئی نہیں ہوتی
جو آجاتا بت عیار میرے دم دلاسے میں — تو پھر ساری خدائی اپنی ہی زیر نگیں ہوتی
اگر گلشن میں ہوتا جاکے میں نکتہ سرا اختر — گل سوسن سے پیدا اک صدائے آفریں ہوتی

درج ذیل غزل ۱۰ ر رجب ۱۳۴۲ھ کی کہی ہوئی ہے، یہ بھی ایک مصرع طرح پر تضمین ہے، مصرع تھا: "اپنا دامن گل مقصود سے بھر جاتے ہیں":

جانب قتل گہ ناز اگر جاتے ہیں — تیرے جانباز لئے ہاتھ میں سر جاتے ہیں
آتے ہی محفل عشرت سے نہ اٹھوا ہم کو — دیکھ لینے دے ہمیں ایک نظر جاتے ہیں
ہوش اڑا دیتے ہیں عشاق کے اے رشک پری — ترے گیسو جو کبھی رخ پہ بکھر جاتے ہیں
دیکھئے مدرسۂ عشق کا اعجاز اے شیخ! — جتنے بگڑے ہوئے آتے ہیں سنور جاتے ہیں
بے کئے وعدے وفا کرتے ہیں اکثر اے دل — بارہا کر کے وہ اقرار مکر جاتے ہیں

دل سے جاتے ہوئے کہتا ہے خیال جاناں
تجھ کو اے درد مبارک ہو یہ گھر جاتے ہیں

دیر کا قصد تھا وحشت میں چلے سوئے حرم
ہم کو جانا تھا کدھر اور کدھر جاتے ہیں

شیخ کعبہ کو چلے جب تو کسی نے پھبتی
یہ کہی خوب کہ اللہ کے گھر جاتے ہیں

یہ ادا دیکھ کے کیونکر نہ کوئی مر جائے
لاش پر غیر کی کھولے ہوئے سر جاتے ہیں

آپ قائل ہی نہ تھے تیر نظر کے اے شیخ!
ہاتھ سے تھامے ہوئے آپ جگر جاتے ہیں

کون آتا ہے تری آنکھ کا شیدا اے شوخ!
پیشوائی کے لئے تیر نظر جاتے ہیں

ساتھ ہو لیتی ہے باد سحری اے اختر
ٹھنڈے ٹھنڈے ▪ مرے گھر سے اگر جاتے ہیں

اور حسب ذیل غزل پر ۸؍ رمضان ۱۳۴۰ھ کی تاریخ پڑی ہوئی ہے، اس میں کہیں کہیں ایک لفظ چھوڑ کر وہاں نقطے دئے ہوئے ہیں، ہم بھی انھیں نقطوں کے ساتھ اس کو نقل کر رہے ہیں، جو باذوق ہوں گے ان کی جگہ کو پر کر کے ان اشعار سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں:

بیتاب ہوں بیحد میں یارب مجھے دکھلا دے
۰۰۰ کا ▪ چہرہ جو چاند کو شرما دے

بیتاب تمنا ہوں، مشتاق زیارت ہوں
معشوق کے قدموں تک یارب مجھے پہنچا دے

بیکار زر و دولت بے قدر شہنشاہی
۰۰۰ کی الفت دے، ہاں عشق کا سودا دے

۰۰۰ ہوں پہلو میں ارمان نکلتے ہوں
وہ روز مبارک بھی آقا مجھے دکھلا دے

دل شوق میں بے چیں ہے، آنکھیں بھی ترستی ہیں
اے کاش کوئی کانوں تک ان کے یہ پہنچا دے

ہے حسن دیا ان کو، اور ناز و کرشمہ بھی
یہ دین اسی کی ہے چاہے جسے داتا دے

غزل اور نعت کے علاوہ اور بھی متعدد چیزوں کو آپ نے اپنی نظموں کا عنوان بنا کر اپنے جوہر کا مظاہرہ کیا، آپ کے اوراق میں ایک نظم "سہرا" کے عنوان سے ملی، جس پر تاریخ ۳؍ جمادی الاولیٰ ۱۳۳۸ھ مئو درج ہے۔

تازہ پھولوں کا مبارک رخ انور سہرا
رہے اقبال کا نوشہ ترے سر سہرا

رفتہ رفتہ ہے نوشہ کے چڑھا سر سہرا ایسی قسمت تری یہ تیرا مقدر سہرا
ہوں مبارک مرے نوشہ کو یہ تینوں چیزیں حبذا شادی، ودید رخ دلبر، سہرا
اللہ اللہ یہ شرف اور یہ اوج اقبال آسماں کرتا ہے تاروں کا نچھاور سہرا
مارے خوشبو کے مہک اٹھی ہے ساری محفل کہیں کیونکر نہ کہ ہے روکش عنبر سہرا
ہے یہ اختر کی دعا بارگہ باری میں لطف و رحمت کا پہنائے تجھے داور سہرا
رقیمہ ۳/ جمادی الاولی ۸۳ھ مئو"

ایک نظم میں مسلمانوں کی پستی، ان کے تخلف وادبار، غفلت ولاپرواہی، علم و عمل سے دوری اور بہت ساری دینی واخلاقی خامیوں پر خون کے آنسو بہاتے ہیں اور ان کو خواب گراں سے بیدار ہونے اور سعی وعمل کی نصیحت کرتے ہیں:

ارے او ننگ ہستی تجھ پہ یہ خواب گراں کب تک
نگاہ صاعقاں کی زد میں تیرا آشیاں کب تک
نشاں ہوشیاریوں کے تجھ میں پائے کیوں نہیں جاتے
رہیں گی باعث تخریب تیری سستیاں کب تک
پسند اتنا کیا ہے کس لئے قعر مذلت کو
رہے گا اس طرح گم کردہ نام و نشاں کب تک
ترے ہر کام کو کیوں اختلاف اتنا ہے کوشش سے
بھلا یہ تیری جدوجہد سے ناچاقیاں کب تک
تری راہ عمل سے دوری و بیگانگی کتنی
ترقی کی تگ و دو میں پس ہر کاروان کب تک
جمود اتنا تری ہستی میں برف آسا بھلا کیوں ہے
خمود آمیز بالآخر تری سرگرمیاں کب تک
کرے گا عقل کو رہبر نہ کب تک اپنے کاموں میں
رہے گا طفل مکتب بن کے وقف این و آں کب تک

نہیں ہوتی تجھے کیوں فکر اپنے آشیانے کی
ترقی کے نئے گلشن میں تو بے خانماں کب تک
ترے اس ضعف قومیت کی آخر کوئی حد بھی ہے
رقیبوں کی نظر میں تو پس ہر کارواں کب تک
بھلا علم و عمل سے مشورہ تو کیوں نہیں کرتا
جہالت کو بنا رکھے گا اپنا رازداں کب تک
کہاں تک تجھ کو نفرت درسگاہ علم و حکمت سے
کریگا ہوٹلوں میں بیٹھ کر خوش گپیاں کب تک
سمجھ رکھا ہے تونے تھیٹروں کو وعظ کی محفل
تجھے دھوکے میں رکھیں گی تری کج فہمیاں کب تک
ذرا بیدار ہوجا اب بھی وقت کار باقی ہے
علاج درد کچھ کر تن میں جانِ زار باقی ہے

عربی غزلیں! اردو زبان تو خیر مادری زبان تھی، اس کے آغوش میں پلے بڑھے اور جوان ہوئے، لیکن حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہتی جب ہم دیکھتے ہیں کہ اسی زمانۂ طالب علمی میں عربی زبان میں شاعری شروع کردی، اور کئی ایک غزلیں اس زبان میں اسی عہد اور سن میں کہہ ڈالیں، جب پہلی دفعہ دیوبند تعلیم حاصل کرنے گئے، اس وقت ۷؍ محرم الحرام ۱۳۳۸ھ کو اپنے رفیق و ہم درس مولانا فیض الحسن فیض مئوی کو، جو کہ خود بھی ایک اچھے شاعر تھے، ایک خط عربی میں لکھا اور اس میں یہ ۳؍ اشعار ذکر فرمائے:

فليت لأيام اللقاء معادة　　　علیّ وألفيت الأحبة فی جنبی

کاش ملاقات کے دن میرے اوپر پھر لوٹ کر آتے اور پیاروں کو میں اپنے پہلو میں پاتا

و لا سیّ أیاما ألاقی بها حبا　　　براءً سوی نقض العهود من الذنب

اور خاص کر وہ ایام جن میں میری ایسے محبوب سے ملاقات ہوتی جس کا عہد شکنی کے سوا کوئی گناہ نہیں۔

حدیث حبیبی فی الفوادله برد و رویته عن حلو عیشتنا تنبی

میرے محبوب کی گفتگو دل کی ٹھنڈک کا سامان ہوتی ہے۔ اور اس کی دید بہتر زندگی کی خبر دیتی ہے۔

یہ اشعار اس وقت کے ہیں جب آپ کی عمر انیس سال تھی، اسی وقت ایک اور نظم لکھی تھی، جس کا عنوان "تھنئۃ العید" ہے جو ممکن ہے کہ درج بالا اشعار سے بھی پہلے کے ہوں، اس نظم کے خاتمہ پر لکھا ہے" کتبته الی صدیقی المولوی فیض الحسن وأنا إذ ذاك متعلم فی دارلعلوم الدیوبندیة وسنی تسع عشرة سنة. "یعنی یہ نظم میں نے اپنے دوست مولوی فیض الحسن کو اس وقت لکھی جب میں دارالعلوم دیوبند میں متعلم تھا اور میرا سن ١٩ برس تھا۔ "وہ تہنیتی نظم یہ ہے:

هنیئاً لکم عید أظل علیکم هنیئا نجوم السعد إذ ذاك طلع

تم کو عید کی آمد مبارک ہو! تم کو سعد کے طلوع ہونے والے ستارے مبارک ہوں!

فجاء بأفراح و بهجة أنفس یفرج عن حبی الهموم ویقلع

عید اپنے ساتھ خوشی اور نفس کی تازگی لائی، جو میرے محبوب سے غموں کو دور کرتی ہے۔

وإنی وإن وافانی العید لم أزل کئیبا شجی البال والعین تدمع

عید اگرچہ میری بھی ہوئی لیکن میں برابر غمگین، متفکر اور گریاں رہا۔

یهیج فؤادی منزل و تشوقنی دیار عهدت الحب فیها و أربع

میرے دل کو گھر کی یاد برانگیختہ کرتی ہے، اور وہ دیار و مقامات میری آتش شوق کو ہوا دیتے ہیں جن میں میں نے محبوب کے ساتھ عہد بتایا

ویلتاع قلبی حین أذکر رفقة أحبة صدق لی ، بهم أنا مولع

میرا دل جلتا ہے جب میں اپنے ان ساتھیوں اور سچے دوستوں کو یاد کرتا ہوں جن پر میں فریفتہ ہوں۔

فدعنی علی حالی و عش أنت سالما و غیم هموم عن فؤادك مقشع

مجھے میرے حال پر چھوڑ دو اور تم سلامت رہو، اور غموں کا بادل تمہارے دل سے دور رہے

ودمت حبیبی فی نعیم و نعمة   ولا زلت بالعیش الرغید تمتع

میرے دوست! تم ہمیشہ ناز و نعمت میں رہو اور خوشحالی کی زندگی سے لطف اندوز ہوتے رہو۔

ایک اور عربی غزل جس پہ تاریخ اگرچہ تحریر نہیں ہے، لیکن کاغذ کی بوسیدگی اور طرز تحریر سے صاف سمجھ میں آتا ہے کہ یہ بھی اسی زمانۂ طالب علمی کی کہی ہوئی ہے یہ چھ اشعار پر مشتمل ہے:

ألا یا لوعة الحب المبرح أقصری   کانك قد أوقدت ناراً بمجمر

اے دریا محبت کی سوزش! تو رک جا گویا کہ تو نے انگیٹھی میں آگ جلا رکھی ہے۔

حریق بنار الهجر قلبی وأضلعی   فیا عین رشیها بماء ك و اقرر

فراق کی آگ میں میرا دل اور پہلو جل رہا ہے، پس اے آنکھ! تو ان پر اپنے پانی کا چھینٹا ڈال کر اسے ٹھنڈا کر دے۔

غداة غدت لیلی تأهب ظعنها   و شدت لها العیسا لأمر مقدر

جس صبح کو لیلی اپنے کجاوے کو تیار کر کے چلی اور اس چیز (جدائی) کے لئے جو مقدر ہو چکی اپنی سواری کسی

رمتنی بعینیها فخلت کأنما   رمتنی بسهم فوق قوس موتر

میرے اوپر نگاہ ڈالی تو مجھے ایسا لگا کہ کمان سے میرے اوپر تیر چلایا ہے۔

بقلبی جروح من أسنة جفنها   فما هی أنکی من أسنة سمهر

میرے دل میں اس کی آنکھوں کے نیزوں کے زخم ہیں، جو سمہر کے بنے ہوئے نیزوں سے زیادہ کاری ہیں۔

غدت بفؤادی ثم صبری بفجأة   فما قول وعاظ یقولون لی اصبر

میرا دل چھینا پھر یکلخت میرا صبر و قرار چھینا، ایسے میں واعظوں کی صبر کی تلقین کیا فائدہ دے گی۔

مراثی و تواریخ

علامہ اعظمیؒ کی شاعری کا بہترین نمونہ ان کے وہ مرثیے ہیں جو انھوں نے اپنے اساتذہ اور دیگر اصحاب فضل و کمال کی وفات پر کہے ہیں، اس میدان میں انھوں نے خاصا زور طبع صرف کیا ہے، اور مختلف اہل علم و فضل کی وفات سے پہنچنے والے رنج و غم اور درد والم کا اظہار اکثر و بیشتر اسی شاعری کے ذریعہ کیا ہے، یہ مرثیے قلبی واردات اور دلی تاثرات ہیں جو تصنع اور تکلف سے پاک اور دل کی گہرائی سے نکل کر کاغذ کی سطح پر ابھر آئے ہیں۔ مذکورہ بالا دیگر اصناف سخن کی طرح اس پر بھی زمانۂ طالبعلمی سے ہی طباعی کا مظاہرہ شروع کر دیا تھا، اور اس صنف میں بھی نہ صرف اردو بلکہ اس سے زیادہ عربی اور کچھ فارسی میں بھی اپنی قادر الکلامی کا جوہر دکھایا، اس لئے اس جگہ اردو اور عربی مرثیوں کو بجائے الگ الگ ذکر کرنے کے تاریخ وار ساتھ ساتھ ہم ذکر کریں گے، تاکہ واقعات کا ربط باقی رہے۔

جہاں تک میرا اندازہ ہے آپ کے کلام کا پورا مجموعہ ہمارے سامنے نہیں آیا، اور کچھ نہ کچھ زمانے کی دست درازیوں کا ضرور شکار ہوا ہے، اور کچھ ایسے بھی ہیں جو ہمارے سامنے موجود ہیں، لیکن کاغذ کی قدامت اور بوسیدگی اور روشنائی کے ہلکے پن کی وجہ سے صاف طور سے پڑھے نہیں جا رہے ہیں، اس لئے مجبوراً انہیں ان کو قلم انداز کرنا پڑتا ہے، انھیں میں شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی کا مرثیہ بھی ہے، جس کو کوشش بسیار کے باوجود میں پڑھنے سے قاصر رہا، جس میں بڑا دخل خود میری بے بضاعتی اور کوتاہ بینی کا ہے۔

اسی ضمن میں وہ قطعات بھی آتے ہیں جن میں آپ نے مادۂ تاریخ نکالا ہے، اس فن میں بھی آپ کو بڑا کمال حاصل تھا، اور اس کے متعدد نمونے آپ کے کلام میں

موجود ہیں۔

مولانا قادر بخش سہسرامی کا مرثیہ مولانا قادر بخش سہسرامی اپنے وقت کے متبحر اور باکمال عالم و فقیہ، بے مثل واعظ و مقرر، زاہد و متقی اور صاحب تصنیف بزرگ تھے، علامہ اعظمی نے ان کا تذکرہ دستکار اہل شرف میں کیا ہے، اور لکھا ہے کہ میں نے ان کے وعظ بنارس میں بہت سنے ہیں، ۱۲۷۳ھ میں سہسرام میں پیدا ہوئے تھے، اور رجب ۱۳۳۷ھ میں وفات پائی تھی۔ ان کی وفات پر علامہ اعظمی نے بڑا پر درد مرثیہ لکھا تھا جو پیش خدمت ہے:

کیسی حسرت برس رہی ہے آج — کبھی عالم کا یہ نہ تھا آئیں
جس کو دیکھو ہے آج خاک بسر — جس کو سنیے وہ آج ہے غمگیں
اس چمن کے ہیں غنچے مرجھائے — جس سے آتی تھی بوئے عطر آگیں
ہائے اب نغمۂ طرب انگیز — بلبل خستہ کی زباں پہ نہیں
رنگ پھیکا پڑا ہے ہر اک کا — خال مشکیں ہو یا لب لعلیں
چھوڑ دی ہے عروس دہر نے بھی — اسی ماتم میں آج کل تزئیں
حافظ و حاج، عالم کامل — مرشد و مقتدائے اہل زمیں
فاضل بے مثال قادر بخش — چل دیئے آہ سوئے خلد بریں
ایسے لوگوں کا ہائے اٹھ جانا — وقف جو ہوں پئے حمایت دیں
آج ■ صدمہ دین کو پہنچا — عرض کی جس کے مجھ کو تاب نہیں
ایسے ارکان منہدم ہو جائیں — پھر بھی محکم رہے اساس دیں
■ قیامت بپا کی رحلت نے — ہل گیا سارا عالم زیریں
سنتے ہی یہ جگر شگاف خبر — ....
بادل زار و باسر حسرت — بول اٹھے گل ہوا چراغ دیں
اب یہی ہے دعائے اخترزار — ربنا اغفر لہ ولی آمین

قطعۂ تاریخ وفات مولانا عبداللہ ٹونکی | مولانا مفتی عبداللہ ٹونکی نہایت عالم وفاضل اور فرزانہ شخص تھے، ٹونک میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو ونما پائی تھی، مختلف مقامات کا سفر کرکے علم کی تحصیل و تکمیل کی، اس کے بعد پوری زندگی درس و تدریس کا فریضہ انجام دیتے رہے۔ دلی، لاہور، لکھنؤ اور کلکتہ جیسے اہم مرکزی مقامات پر درس وافادہ کی مسند بچھائی، بالآخر جاذبۂ توفیق نے بھوپال پہنچایا، جہاں ۱۳۳۹ھ میں وفات واقع ہوئی۔

ان کی وفات پر علامہ اعظمی نے فارسی میں ایک مرثیہ یا قطعۂ تاریخ وفات کہا جو حسب ذیل ہے۔

بردہ گوئے سبق زہم عصراں ۔۔۔ در علوم و حکم و عزت وجاہ
آں عدیم المثال علامہ ۔۔۔ حیف کش آمدہ اجل ناگاہ
نذر تعلیم کردہ جانِ عزیز ۔۔۔ بود صرف افاضہ شام وپگاہ
بود شمعے کہ کشتہ شد اینک ۔۔۔ گمرہاں را چوں مشعلے در راہ
چوں رسیدم بگوش ایں آواز ۔۔۔ نالہ سر کردم و کشیدم آہ!
گوئی ہنگامہ زحشر بپا ۔۔۔ در مدارس شوروواویلاہ
شورے افتادہ در مجالسِ علم ۔۔۔ چوں رسید ایں مصیبتِ جانکاہ

بے دل بشاد گفتمش تاریخ
فاضل دہر حیف عبداللہ

مولانا عبداللہ ٹونکی کا سن وفات ۱۳۳۹ھ ہے، لہذا اس قطعہ کے آخری مصرعہ سے اگر تاریخ نکالی جائے تو اس کے اعداد ۱۳۳۰ ہی ہوں گے، البتہ اگر لفظ "فاضل" کے آخر میں "ی" کا اضافہ کردیا جائے، جو نحوی لحاظ سے شاید گوارا نہ ہو لیکن قواعد عروض کی رو سے غالباً روا ہو سکتا ہے، تو اس کے اعداد قریب قریب پہنچ جائیں گے، مگر پھر بھی ایک عدد کا فرق رہ جائے گا۔

مولانا اسد اللہ صاحب مرحوم کا قطعۂ تاریخ وفات مولانا اسد اللہ کوپاگنجیؒ کو فن طب میں مہارت ودستگاہ حاصل تھی، علوم دینیہ سے بھی بہرہ ور تھے، اور پیشہ طبابت کے ساتھ درس وتدریس کا مشغلہ بھی جاری رکھا تھا، مرزاپور وغیرہ میں اقامت گزیں رہ چکے تھے، ۱۳۴۰ھ میں وفات پائی تھی۔

ان کی وفات پر علامہ اعظمی کا ایک قطعہ "زجر المداہنین" مؤلفہ مولوی محمد شمس الدین صاحب نائب سکریٹری خلافت کوپاگنج میں مذکور ہے:

در جوار رحمت غفار چوں نازل بشد	خیر مقدم گفت رضوان ودر جنت کشاد
غوطہا در لجۂ تاریخ چوں اختر نبرد	داد غواصی دُرِ تاریخ او مغفور باد

۱۳۴۰ھ

استاذ الاساتذہ مولانا عبد الغفار عراقی مئویؒ کا مرثیہ مولانا عبد الغفار صاحب عراقیؒ کی نسبت علامہ اعظمی کے اساتذہ کے ذکر میں لکھا جاچکا ہے، کہ ان کے دامن تربیت سے وابستہ ہونے کے بعد ان کے خرمن علم سے کس طرح جی بھر کے خوشہ چینی کی تھی، مولانا عراقی مرحومؒ کی رحلت ۱۳۴۱ھ میں ہوئی تھی، اپنے مشفق ومحسن استاد کی رحلت پر علامہ اعظمی کے دل پر کیا گذری ہوگی، اس کو انھوں نے ہی سمجھا ہوگا، اپنے رنج وغم کا اظہار دو مرثیوں میں کیا، ایک اردو میں اور دوسرا عربی میں، بالترتیب دونوں پیش خدمت ہیں:

شیخ واستاذ مرے مولوی عبد الغفار	ناشر علم نبی ماحیٔ شرک وبدعت
ان کا ہر فعل تھا نقش قدم فعل سلف	ان کا ہر قول مؤید بکتاب وسنت
ہمہ دم مشغلۂ سیر کتب میں مصروف	درس وتصنیف تھی آٹھ پہر محویت

....

وسعت علم سے ان کی علماء تھے حیران — جودت ذہن وذکا سے فضلاء کو حیرت
ادبا کے تھے وہ سرتاج، محدث بھی فقیہ — ناظم و ناثر وہم شاعر عالی ہمت
آہ وہ ذات کہ مجموعۂ اوصاف تھی وہ! — آہ وہ دبدبہ علم وہ شان و شوکت!
آہ وہ نکتہ رس فقہ ▪ علامہ دہر! — آہ ▪ ناقد اخبار نبی رحمت!
آہ وہ واقف اسرار ورموز قرآں! — آہ ▪ جامع انواع فنون حکمت!
آہ وہ عالم ہر نکتۂ باریک بدیع! — تھے معانی وبیاں جن کے رہین قسمت!
ان کی ہی ذات سے رونق بازار علوم — ان کے ہی دم سے گروہ علماء کو عزت
جامعیت ہمہ گیری تھی انھیں پر بس ختم — حجۃ اللہ تھے وہ اور حکیم الامت
آہ کس منھ سے کہوں آج کہ خامۂ بدہن — ان فضائل کا وہ مجموعہ ہے زیر تربت

فکر تھی از پئے تاریخ وفات اختر کو
غیب سے آئی ندا ان پہ خدا کی رحمت
۱۳۴۱

اورایک پردرد مرثیہ عربی میں لکھا جو اردو ترجمہ کے ساتھ پیش کیا جارہا ہے:

علیك سلام الله یا ثاوی القبر — ورحمته أعطیت من أوفر الأجر

اے قبر والے تجھ پر اللہ کی سلامتی اور رحمت ہو اور بھرپور تجھ کو اجر دیا جاوے

لقد كنت أيم الله سلوى لنا عن الـ — ـــغطارفة الماضين في سالف العصر

قسم خدا کی تم اگلے زمانے کے اصحاب فضل وکمال کی طرف سے تسلی کا باعث تھے۔

فكنت وكانت حين غبت تغيبت — فنحن إذاً يا شيخنا فاقدوا الصبر

تیرے رہنے سے وہ لوگ تھے، جب تو غائب ہوا تو وہ لوگ بھی نگاہ سے اوجھل ہوگئے، پس اس وقت ہم بہت بے قرار ہیں۔

رزايا عظام فاجعات كثيرة — مصاب أبي الأنوار علامة الدهر

علامہ دہر ابوالانوار (مولانا عبدالغفار) کی موت بڑے مصائب اور بہت سے سانحوں کا سبب ہے۔

محط رحال المستفیدین ملجا الـــــأماثل مأوی کل أشعث مغبر

ان کی ذات طالبین علم کا مرکز توجہ، فضلاء کا مرجع اور مسافر کی پناہ گاہ تھی۔

فقیہ دیار الشرق مسند وقته ومرجع أعلام الهدی رحلة العصر

علاقہ پورب کے فقیہ، وقت کے مسند، ارباب ہدایت کا مرجع اور زمانے کے سیاح تھے۔

إلیه جزاه الله خیرا قد انتهت ریاسة أصحاب الإمام بهذا القطر

اللہ ان کو جزائے خیر دے، اس خطے میں حنفیوں کی ریاست ان پر ختم ہوتی تھی۔

أدیب أریب ینثر الدر نطقه وفی الشعر یأتی بالحلال من السحر

وہ ایسا ادیب واریب تھا جس کی بات سے موتی جھڑتے تھے، اور ان کی شاعری سحر حلال ہوتی تھی۔

وفیه خلال لو ذهبت أعدها وجدت نطاق القول ضاق عن الحصر

ان کے ایسے اخلاق وعادات تھے کہ اگر میں ان کو شمار کرنے لگوں تو گفتگو کا پیمانہ تنگ پڑ جائے گا۔

قد ابتلی أسقاماً فما زال حامداً لمولاه فیها واستقام الی القبر

■ بیماریوں میں مبتلا رہا اور اپنے مالک کی حمد کرتا رہا، اور قبر تک استقامت پر رہا۔

ثوی فی خیام الحمد أرّخت ملهما إذا رمت علم الفوت والألم بالصدر

"ثوی فی خیام الحمد" (خیام الحمد میں ان کا ٹھکانہ ہوا) میرے دل میں ان کی تاریخ وفات ڈالی گئی، جب میں نے تاریخ وفات معلوم کرنی چاہی اور حال یہ ہے کہ سینہ رنجیدہ وغمگین ہے۔

قطعۂ تاریخ بروفات حافظ ضمیر احمد اعظمی | حافظ ضمیر احمد اعظمی کی وفات ۱۴ر شعبان ۱۳۴۲ھ کو واقع ہوئی تھی، ان کی وفات پر حسب ذیل قطعہ لکھا تھا:

ضمیر احمد جوان نیک و حافظ — غنیمت دائم او قاتش شمردہ
بصبح چاردہ از ماہ شعباں — بخلاق جہاں جانش سپردہ
ملک چوں از تن او جاں بر آورد — شکیب از دل، دل از پہلو بردہ
تبہ حالم چناں از شدت وجد — کہ ہستم نیم مردہ دل فسردہ
کن تاریخ او ہاتف چنیں گفت — بمن اختر ضمیر ما بمردہ

۱۳۴۲ھ

امام العصر علامہ انور شاہ کشمیریؒ کا مرثیہ

حضرت شاہ صاحبؒ سے کسب فیض کی مدت علامہ اعظمیؒ کو اگرچہ بہت کم نصیب ہوئی، لیکن اس مختصر سی مدت میں جو نقش قائم ہوا وہ نقش کالحجر تھا، جس میں عمر کے کسی بھی حصے میں کبھی دھندلاپن نہیں آیا، حضرت شاہ صاحب کا ذکر اوپر گذر چکا ہے، ان کی وفات صفر ۱۳۵۲ھ میں ہوئی تھی، وفات پر ان کے شاگرد اور مملکت علم کے ان کے جانشین علامہ اعظمی نے یہ مرثیہ لکھا:

وارث علم نبی، حضرت استاذ جلیل — وائے بر ما کہ ہوا آج جہاں سے رخصت
وہ کہ تھا اپنے زمانہ میں بخاری کا مثیل — وہ کہ تھا ابن معیں پایہ و سفیاں شوکت
وہ کہ تھا فقہ میں بویوسف قاضی کی نظیر — وہ کہ تفسیر میں اس وقت تھا حبر الامت
ماتریدیِ زماں، اشعریِ وقت تھا وہ — وہ کہ فارابیِ دوراں تھا بفن حکمت
جس سے تازہ ہوئی یاد ذہبی و مزی — ابن تیمیہ کی زندہ ہوئی جس سے سیرت
وہ کہ آئینہ پیکر میں تھے جس کے بخدا — جلوہ گر زیلعی وابن حجر کی صورت
وہ کہ تھی منبر ارشاد کو جس پر نازش — وہ کہ تھی مسند تدریس کو جس سے زینت
جس پہ نازاں عرب و مصر و عجم شام و عراق — ہند کی خاک کو تھی جس کے قدم سے عزت
وہ کہ تھا لخت دل قاسم خیرات علوم — وہ کہ تھا مردمک چشم رشید الملت

آہ صد آہ ہوا نیر انور روپوش حیف بر حیف کہ عالم میں ہے پھیلی ظلمت

قہر ہے بزم معارف ہوئی درہم برہم اور سونی ہے پڑی مجلس درس حکمت

حضرت شاہ صاحب علیہ الرحمۃ کی وفات پر علامہ اعظمی کا کہا ہوا ایک نامکمل مرثیہ عربی میں بھی ہے، چونکہ وہ نامکمل ہے اور صرف چند ہی اشعار اس کے محفوظ ہیں، اس لئے ہم اس کو نظر انداز کرتے ہیں۔

علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کا مرثیہ آپ کا تذکرہ علامہ اعظمی کے اساتذہ کے ذکر میں آچکا ہے، علامہ اعظمیؒ کو ان سے غایت درجہ تعلق تھا، ۱۹۴۹ء میں جب انھوں نے وفات پائی تو شاگرد رشید (علامہ اعظمی) نے ۳۷/اشعار پر مشتمل عربی زبان میں بڑا پر درد اور دلگداز مرثیہ لکھا تھا، جو برہان (مارچ ۱۹۵۰) میں "البشریا شبیر بلطف ربک" کے عنوان سے شائع ہوا تھا، ہم اس کو برہان سے مستعار لے کر ذیل میں پیش کر رہے ہیں:

أراني و- قلبي دائما يتوجع ولست أرى دمعي عن العين يقلع

میں اپنے آپ کو اور اپنے دل کو برابر رنجیدہ دیکھتا ہوں، اور اپنے آنسو کو آنکھ سے رکتا ہوا نہیں دیکھتا۔

يفجعني دهري فلا يكتفي بوا حدٍ بل بحبر بعد آخر يفجع

زمانہ مجھے غم دیتا ہے پس وہ کسی ایک پر بس نہیں کرتا، بلکہ ایک کے بعد دوسرے عالم کے صدمہ سے دوچار کرتا ہے۔

خليل(۱)، ومحمود(۲)، عزيز(۳)، وأنور(۴) وأشرف(۵) كانوا بيننا ثم أقشعوا

(۱) حضرت مولانا خلیل احمد صاحب امیٹھوی سہارنپوریؒ متوفی ۱۳۴۶ھ مراد ہیں

(۲) شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحب دیوبندیؒ متوفی ۱۳۳۹ھ مراد ہیں

(۳) مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب عثمانی دیوبندیؒ متوفی ۱۳۴۷ھ مراد ہیں

(۴) امام العصر حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ متوفی ۱۳۵۲ھ مراد ہیں

(۵) حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ متوفی ۱۳۶۲ھ مراد ہیں

مولانا خلیل احمد، مولانا محمود حسن، مولانا عزیز الرحمن، مولانا انور اور مولانا اشرف علی صاحب، ہمارے درمیان تھے پھر ہم سے جدا ہو گئے۔

ومن بعدهم مولای شبیر أحمد　　الإمام الهمام القرم أمسى يودع

اور ان سب کے بعد بزرگ و سردار امام مولانا شبیر احمد (عثمانی) نے الوداع کہا۔

شيوخ تقضوا واحدا بعد واحد　　فأصبح علم الدين مغناه بلقع

یہ تمام شیوخ ایک ایک کر کے گذر گئے جس سے علم دین کی بزم سونی ہو گئی

وهذي رزايا فادحات وإننا　　الى يومنا هذا لها متفجع

یہ بڑے اندوہناک مصائب ہیں، جن کی وجہ سے ہم آج تک غم واندوہ کی حالت میں ہیں

ولكنما الرزء الأخير رزية　　لعمرك أنكى للقلوب وأوجع

لیکن آخری مصیبت ایسی مصیبت ہے جو ان سب سے زیادہ دلگداز اور روح فرسا ہے۔

فقد كان سلوانا لنا و بقية　　لأسلافنا كنا به نتمتع

ان کی ذات ہمارے لئے باعث تسلی اور ہمارے اسلاف کی نشانی تھی، جن سے ہم استفادہ کیا کرتے تھے۔

منار الهدى، طود العلى، قدوة الورى　　به يوتسىٰ شيخ له القوم خضع

آپ کی ذات ہدایت کا مینار، عظمت کا پہاڑ اور خلق خدا کے لئے اسوہ و نمونہ تھی، ان کے سامنے گردنیں جھکی رہتی تھیں۔

أفاد طلاب العلم درسا و خطبة　　وخطا و تصنيفا له الفضل أجمع

طلبگاران علم کو درس و تقریر اور تصنیف و تالیف کے ذریعہ فائدہ پہنچایا، آپ کی ذات فضائل و کمالات کا مجموعہ تھی۔

اليه انتهى فهم الكتاب فهذه　　فوائده تملى و تتلى و تسمع

آپ کی ذات پر فہم قرآن ختم ہوتا تھا، چنانچہ آپ کے افادات لکھے جاتے ہیں اور پڑھے اور سنے جاتے ہیں۔

ودرس احادیث النبی و شرحها بوجه لنا فیه شفاء و مقنع

احادیث نبوی کا درس اور ان کی شرح ہمارے سامنے اس طرح پیش کرتے ہیں جس سے تشفی اور اطمئنان حاصل ہوتا ہے۔

یخلد ذکراہ لنا شرح مسلم کتاب جلیل مستطاب ممتع

ان کی یاد کو ہمارے لئے شرح مسلم نے دائمی بنادیا، وہ ایک عظیم، پسندیدہ اور نفع بخش کتاب ہے۔

مناقبه جلت عن الحصر کثرة مآثره تروی مدی الدهر تسمع

ان کے مناقب کثرت کی وجہ سے شمار سے باہر ہیں، اور ان کے کارنامے قیامت تک بیان کئے اور سنے جائیں گے۔

فطین ذکی ثاقب الذهن نافذا البصیرة ذو رأی متین مروّع

فہیم و ذکی، ذہین و ژرف نگاہ، صاحب رائے اور باہیبت تھے۔

فقیه ونظار کذا متکلم یقوّم زیغ الزائغین فیقمع

فقیہ، مناظر اور متکلم تھے، گمراہوں کی کجی سیدھی اور دور کرتے تھے۔

مفسر تنزیل الکتاب محدث ورتبته فی ذین أعلی و أرفع

مفسر قرآن اور محدث تھے، ان کا رتبہ ان دونوں میں نہایت بلند و بالا تھا۔

أدیب بعید الصیت والذکر، منشئی بلیغ، خطیب، بالغ النطق مصقع

مشہور و معروف ادیب، بلیغ انشاء پرداز اور زبان آور خطیب و مقرر تھے۔

فمن کل نوع حظه متکامل وفی کل ضرب فضله لیس یدفع

ہر فن میں ان کو کمال حاصل تھا، اور ان کی برتری تمام امور میں ناقابل انکار تھی۔

نقی، تقی، ناسك ثم دین نموذج أخیار مضوا متورع

پاکدامن، پاکباز، عبادت گذار اور دین دار و خداترس تھے، ان نیکوکاروں کا نمونہ تھے جو گذر چکے۔

شبیه بهم فی سمتهم ثم دلّهم وقور، حلیم، خاشع، متخشع

عادات و اطوار میں ان سے مشابہ تھے، باوقار، بردبار، متواضع اور فروتن تھے۔

قضی العمر فی بث العلوم و نشرها خطابا ً و تذکیراً یفید و ینفع
تقریر وتذکیر کے ذریعہ علم کے نشرواشاعت میں عمر گذار دی، اور ہمیشہ فیض وافادہ کرتے رہے۔

محط رحال المستفیدین بیته ومجلسه روض من العلم ممرع
ان کا گھر مستفیدین کا مرکز تھا، اور ان کی مجلس علم کا سرسبز باغ تھا

فأکرم به من عالم عامل بعلـــــــــمه جالباً نفعا إلیه و ینفع
وہ کتنے صاحب کرم اور عالم باعمل تھے، جو علم حاصل کرتے اور اس سے نفع پہنچاتے تھے۔

یذب عن الاسلام طول حیاته ویحمی عن الدین المتین و یمنع
عمر بھر اسلام کا دفاع کرتے رہے، اور دین متین کی حفاظت وحمایت کرتے رہے۔

ویدأب فی التصنیف والدرس یومه ولیس من الأوقات شیئا یضیع
دن کی روشنی میں تصنیف وتدریس میں مصروف رہتے تھے، اور اپنے وقت کا کوئی حصہ ضائع نہیں کرتے تھے

وکان إذا ما الدیك صاح بسحرة یقوم فیدعو الله والناس هجّع
سحر کے وقت جب مرغ بانگ دیتا تھا، آپ خدا کی عبادت کے لئے اٹھ کھڑے ہوتے حالانکہ لوگ ابھی سوئے رہتے تھے۔

رزئنا به علما ً کبیراً وحکمة وهذ الرزء خرقه لیس یرقع
ان کی وفات سے ہمارے لئے بڑے علم و حکمت کو صدمہ پہنچا، اور یہ ایسا نقصان ہے جس کا خلاء پر نہیں ہو سکتا۔

فأفئدة الأصحاب کلمی لفقده وأکبادهم حری و کادت تصدع
ان کی جدائی سے شاگردوں کے دل زخمی اور ان کے جگر پرسوز ہیں اور قریب تھا کہ وہ پھٹ جاتے۔

وأعينهم عبرى تسيل شئونها　　وأحشاء هم مما دهوا يتقطع

ان کی آنکھیں اشکبار ہیں، اوران کے دل غم والم سے ٹکڑے ہو رہے ہیں۔

بكى فقده مصر، وشام وأعولت　　مدائن باكستان والهند أجمع

ان کی رحلت سے مصروشام رو پڑے، اور ہندوستان وپاکستان کے تمام شہروں میں چیخ وپکار مچ گئی۔

بنفسك فارفق أيها المرء واستفق　　فحتى متى تبكي عليه و تجزع

اب اپنی ذات پر تو رحم کراور رونے سے باز آ، کب تک تم ان کے لئے گریہ وماتم کرتے رہو گے۔

(فكل نعيم لا محالة زائل)　　وكلّ سبيلَ الهالكين سيتبع

ہر نعمت یقینی طور پر زائل ہونے والی ہے، اور سب کو مرنے والوں کی راہ پر چلنا ہے (موت کا سامنا کرنا ہے)

وفي الوارث الباقي عزاء من الذي　　مضى وإليه كل حي سيرجع

اور باقی رہنے والی ذات میں جانے والے کے عوض صبر وتسلی کا سامان ہے اور اسی کی طرف ہرایک کو لوٹ کر جانا ہے۔

نرجّي له الحسنى و مرضاة ربه　　فما عنده خير لعبد مضيع

ہم ان کے لئے بھلائی اور رب کی خوشنودی کی امید کرتے ہیں، اس کے نزدیک کسی بندے کی نیکی رائگاں نہیں ہوتی۔

فأكرم إله الخلق في الخلد نزله　　وأفضل وأجزل ان فضلك أوسع

الہ العالمین! جنت میں ان کا بہترین ٹھکانہ بنا، اور ان کے اوپر خوب خوب فضل فرما، بیشک تیرا فضل بے پایاں ہے۔

أقول ضريح فيه نور مؤرخا　　لقبر ثوى فيه الإمام السميدع

۱ ۳ ۶ ۹

"ضریح فیہ نور" (قبر جس میں روشنی ہے) میں نے تاریخ وفات نکالی، ایسی قبر کی جس میں سرداری کا حامل امام مدفون ہے۔

علامہ سید سلیمان ندویؒ کی وفات پر علامہ اعظمی کا علامہ سید سلیمان ندویؒ سے جو دیرینہ تعلق تھا، اس کے متعلق اوپر عرض کیا جاچکا ہے، اس دیرینہ تعلق اور قلبی لگاؤ کی وجہ سے سید صاحب کی وفات پر علامہ اعظمی کو جو صدمہ اور درد و کرب ہوا ہوگا اس کو کچھ ان کے دل ہی نے محسوس کیا ہوگا، چنانچہ آپ نے قاضی اطہر مبارکپوریؒ کو ایک خط میں تحریر فرمایا:

"علامہ سید سلیمان ندوی کے فراق سے آنکھیں پرنم ہیں اور دل پر غم، میرے ان کے درمیان ۲۰۔۳۰ برس سے پرخلوص روابط مودت تھے، ان کی جدائی سے جو صدمہ مجھے ہوا ہے وہ ناقابل بیان ہے۔ یہ تو طبعی تاثر ہے اس سے قطع نظر کرتے ہوئے بھی سید صاحب کا سانحہ وفات تمام عالم اسلام کے لئے ایک فاجعہ کبریٰ، ہندوستان کے علاوہ حجاز، مصر، شام اور بلاد یورپ میں بھی ان کے فضل و کمال کا چرچا تھا، انھوں نے اپنی محققانہ تصنیفات کے ذریعے علم اور دین کی جو خدمتیں انجام دی ہیں ان کو کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا اور کچھ شبہ نہیں کہ اس آخری دور میں دقت نظر، تبحر علمی اور جامعیت میں ان کی شخصیت ایک بے نظیر شخصیت تھی، افسوس ہے کہ ان کی وفات سے علمی دنیا میں ایک ایسا خلا پیدا ہوگیا ہے جس کا پر ہونا بظاہر ناممکن ہے۔ اللہ ان پر اپنی رحمتوں کے پھول برسائے اور ان کے مراتب بلند کرے آمین۔ حبیب الرحمٰن الاعظمی"(۱)

سید صاحب کی وفات پر علامہ اعظمی نے ایک پرسوز قطعہ تاریخ وفات بھی قلمبند کیا تھا، جس کی طرف اس باب کے شروع میں اشارہ کیا جاچکا ہے اور جو بعینہ روزنامہ "انقلاب" بمبئی میں ۳۰/دسمبر ۱۹۵۳ء کی اشاعت میں شائع ہوا تھا، اور اسے ہم وہیں سے نقل کر رہے ہیں:

فاضل علامہ سلیمان آج — ہو گئے افسوس کہ ہم سے جدا
آہ کہ اب ہند میں کوئی نہیں — فاضل و علامہ سلیمان سا
ماہر تاریخ و حدیث و سیر — واقف اسرار کتاب خدا

(۱) روزنامہ انقلاب ۱۵/دسمبر ۱۹۵۳ء

اردو تو اردو عربیت میں بھی ان کو بہت دخل بڑا درک تھا
کیا نظر آتا ہے کہیں وہ کمال ان کو جو انشاء و کتابت میں تھا
حیف یہ گنجینہ علم وادب دفن تہ خاک کراچی ہوا
فقرہ تاریخ کا جویا تھا میں دل نے کہا، فاضل یکتا گیا
۱۳۷۳

مولانا سید حسین احمد مدنی کا مرثیہ علامہ اعظمی کے کاغذات میں ایک عربی مرثیہ ملتا ہے جو بظاہر نامکمل ہے، اور اس پر کوئی صراحت بھی نہیں ہے کہ یہ کس کی شان میں کہا گیا ہے، تاہم اس کے مضمون سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ اس سے مراد شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنیؒ ہیں، جن کی وفات ۱۳۷۷ھ مطابق ۱۹۵۷ء میں واقع ہوئی تھی۔

رزء عظیم دها الإسلام و أكربا شيخ الحديث و قطب العصر قد ذهبا
ایک بڑی مصیبت نے اسلام کو صدمہ پہنچایا اور بے چین کر دیا، کہ شیخ الحدیث اور قطب وقت اس دنیا سے چلا گیا۔

ولست أحسب إلا أن ناعيه نعي المكارم والأخلاق و الأدبا
میں سمجھتا ہوں کہ ان کی موت کی خبر دینے والے نے شرافت، اخلاق اور ادب کی موت کی خبر سنائی۔

قد كان مجتمعا فيه الفضائل من علم وحلم وعرفان ولا عجبا
کچھ تعجب نہیں کہ ان کے اندر علم و معرفت اور بردباری جیسی بہت سی خوبیاں جمع ہوگئی تھیں۔

فانه قد تربى عند سيدنا رشيد أحمد يسعى عنده دأبا
انھوں نے مولانا رشید احمد (گنگوہی) کی خدمت میں مسلسل ریاضت کر کے ان کے سائے میں تربیت پائی۔

وعند مرشد أهل العصر قاطبة کانوا هم العجم أو کانوا هم العربا
شیخ المشائخ إمداد الاله وقد قضی سنین طوالاً حینما صحبا

اور انھوں نے تربیت پائی عرب و عجم کے مرشد شیخ المشائخ حضرت امداد اللہ (مہاجر مکی) کی خدمت میں، جن کے زیر سایہ انھوں نے لمبا عرصہ گذارا۔

مولانا ابوالکلام آزادؒ کا قطعہ تاریخ وفات | مولانا ابوالکلام آزاد اس دور کی نادر الوجود شخصیتوں میں سے ایک تھے، وہ ایک بڑے عالم، بلند پایہ ادیب، صاحب طرز انشا پرداز، قادر الکلام اور زبان آور خطیب و مقرر، مادر وطن کے جانثار مجاہد، اور عظیم رہنما و مفکر تھے، اپنی شخصیت کے لحاظ سے وہ نہ صرف باکمال اور منفرد تھے بلکہ اعجوبۂ روزگار تھے، جد وجہد آزادی کی ہر مہم میں نہ صرف شریک بلکہ اکثر سے بڑھ کر رہے، اور جب وطن آزاد ہوا تو آزاد ہند کے سب سے پہلے وزیر تعلیم ہوئے، ۱۳۷۷ھ مطابق ۱۹۵۸ء میں وفات پائی۔

ان کی وفات پر علامہ اعظمی نے یہ قطعۂ تاریخ وفات کہا:

وزیر دولت جمہوریٔ ہند زعیم انقلاب ہند آزاد
نہ گفتارش کہ گوہرہائے تاباں نہ تحریرش کہ یاد از سحر می داد
دریغا زیں جہاں رخت سفر بست براو صد رحمت و رضوانِ حق باد
اگر تاریخ او خواہی نوشتن بگوسہ بار اختر موت آزاد

علامہ اعظمی نے دوسرے شعر کے پہلے مصرع کو "گوہرہائے تاباں" اور گوہرہائے شہوار" دونوں طریقوں پر لکھا ہے، اسی طرح آخری شعر کا پہلا مصرع اس طرح بھی لکھا ہے "اگر پرسد کسے سال وفاتش" "موت آزاد کی گنتی ۴۵۹ آتی ہے اگر اس کو تین سے ضرب کریں "بگوسہ بار اختر" سے جس کی طرف اشارہ ہے، تو مجموعی اعداد ۱۳۷۷ آئیں گے۔

مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی کی وفات پر | مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ علم و عمل کا پیکر تھے، تصنیف و تالیف اور تقریر و تحریر پر بلا کی قدرت رکھتے تھے، جنگ آزادی کے عظیم مرد مجاہد تھے اپنی جرأت رندانہ اور حق گوئی و بے باکی میں اپنی مثال آپ تھے۔

زور خطابت اور شعلہ نفسی میں بہت کم لوگ ان کا مقابلہ کر سکتے تھے، دور غلامی میں انگریزوں کے خلاف ہر محاذ پر شجاعانہ لڑتے رہے، اور آزادی وطن کے بعد مسلمانوں پر نکبت وادبار کا نیا دور شروع ہوا تو ان کے حقوق کے لئے سینہ سپر ہوگئے، ایک طرف نہایت جرأت وبے باکی کے ساتھ پارلیمنٹ تک ان کی ہر آواز پہنچاتے رہے، تو دوسری طرف مسلمانوں کو بیدار کرنے اور قعر مذلت سے نکالنے کی انتھک کوشش کرتے رہے، اور اس وقت تک قرار نہیں پایا جب تک جان جان آفریں کے سپرد نہ کردی۔ ۱۳۸۲ھ مطابق ۱۹۶۲ء میں ان کی وفات سے ملت کا وہ خسارہ ہوا جس کی اب تک تلافی نہ ہو سکی۔

ان کی رحلت کا علامہ اعظمی کو شدید صدمہ ہوا، اور عربی زبان میں چند اشعار کا یہ پُردرد مرثیہ لکھا:

كان الفقيد أخونا حفظ رحمن شهما نبيلا عظيم القدر والشان

ہمارا گم شدہ بھائی حفظ الرحمٰن بہادر، شریف، بلند مرتبہ اور عظیم الشان شخص تھا۔

عاش الفقيد نقي العرض عن دنس فما له عائب فينا و لا شاني

مرحوم پاکدامن، باآبرو تھے، ان کا کوئی عیب جو اور دشمن نہیں تھا۔

وليس يوم رزئنا فيه صاحبنا بيوم حزن ولكن يوم أحزان

جس دن ہمارے ساتھی کی وفات کا صدمہ پہنچا، کسی ایک غم کا دن نہیں تھا، بلکہ بہت سارے غموں کا دن تھا۔

فمن لمجلس شورئ ديوبند ومن لمسلمي الهند من قاص ومن دان

دیوبند کی مجلس شوریٰ اور ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے دور نزدیک کہاں سے ایسا شخص آسکتا ہے؟

يحمي حقوقهم بالانتصار لهم في البرلمان بتصريح و إعلان

کون ایسا شخص ہے جو پارلیمنٹ کے اندر کھلم کھلا اور علی الاعلان مسلمانوں کی حمایت کے ذریعہ ان کی حقوق کی حفاظت کرسکے۔

کاغذ کے جس ٹکڑے پر یہ اشعار مکتوب ہیں، اسی پر دوسری طرف دو شعر کا ایک قطعہ بھی لکھا ہوا ہے، جس کے انداز سے پتہ چلتا ہے کہ اسی موقع پر اس کو بھی کہا تھا، لکھا ہے:

لو انهمرت عيني دما، و تقطعت أسى كبدي، والقلب مني تفطرا
لكان حقيقا، إنَّ رزءاً أصابني بدهلي غداة الأمس أعظم ما جرى

اگر میری آنکھ خون کے آنسو بہاتی، اور میرا جگر مارے غم کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا، اور میرا دل پھٹ جاتا، تو یہ سب کچھ سزاوار تھا، اس لئے کہ دہلی کے حادثہ کا وہ صدمہ جو کل مجھے پیش آیا، سب سے بڑا حادثہ تھا۔

مولانا عبد القادر رائے پوری کا قطعۂ تاریخ وفات | مولانا عبد القادر رائے پوری اپنے وقت کے مشہور شیخ طریقت اور عارف کامل تھے، علم و فضل میں باکمال اور رشد و ہدایت، بیعت و ارشاد میں مرجع خلائق تھے، ان کا وصال بھی ۱۹۶۲ء میں ہوا تھا، ان کے انتقال پر علامہ اعظمی نے مادۂ تاریخ اس قطعہ سے نکالا تھا۔

قضى الشيخ عبدالقادر اليوم نحبه • وكان أجلَّ العارفين و أكرما
بكيت و ما يغنى البكاء فقيل لي ومن ذا رزئتم، قلت شيخا معظما

۱۹۶۲ء

شیخ عبد القادرؒ نے اپنی جان اس حال میں دی کہ وہ عارفوں میں سب سے بزرگ و برتر تھے، میں رو پڑا جب کہ رونا بے سود ہے، مجھ سے کہا گیا کہ تمہیں کس کی وفات کا صدمہ ہے، میں نے کہا: ایک بڑے شیخ کی۔

مولانا عبد اللطیف نعمانی کا قطعۂ تاریخ وفات | مولانا عبد اللطیف نعمانیؒ اور علامہ اعظمیؒ زمانۂ طالب علمی سے لے کر تادم واپسیں ساتھ ساتھ رہے، دونوں ہم سبق، ہم عصر اور ہم مشرب تھے، ہر ایک نے دوسرے کو خوب سمجھا اور پرکھا تھا۔

مولانا نعمانیؒ بھی اپنی جگہ بڑے صاحب فضل اور باکمال تھے، اور بہت سے علوم و فنون میں استادانہ مہارت اور ماہرانہ دستگاہ رکھتے تھے، علامہ اعظمی کے بعد اس طرف کسی کا سکہ چلتا تھا تو انھیں کا۔ ساتھ ہی سیاسی بصیرت بھی حد درجہ رکھتے تھے، اور سیاسی رہنمائی

حیثیت سے جانے اور پہچانے جاتے تھے۔ ۱۳۹۲ھ میں وفات پائی تھی، علامہ اعظمی نے مادۂ تاریخ اس قطعہ سے نکالا تھا:

صاحبی عبداللطیف الألمعی نال فی الفردوس أعلی منزله

قال تلمیذ له أرّخ لنا موته، قلت: اکتب المغفور له

۱۳۹۲ھ

میرے ذہین دوست عبداللطیف جنۃ الفردوس میں اعلیٰ مقام پائیں، ان کے ایک شاگرد نے مجھ سے تاریخ وفات نکالنے کے لئے کہا، تو میں نے کہا المغفور لہ سے ان کی تاریخ نکالو۔

مولانا ابو بکر شیث جونپوریؒ کی تاریخ وفات مولانا ابو بکر شیث جونپوریؒ دینیات کے ماہر عالم و فاضل شخص تھے، علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ دینیات کے صدر رہ چکے تھے، عزوجاہ کے حامل تھے، اور علمی و دینی حلقوں میں عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے، ۱۳۵۹ھ میں ان کا انتقال ہوا، علامہ اعظمی نے اس قطعہ سے تاریخ وفات نکالی:

بو بکر شیث، کش ہمی دادیم جا بدل امروز بہر مدفن او گور کا فتیم

می خواستیم سال وفاتش رقم زنیم بو بکر شیث رحمہ اللہ، یافتیم

۱۳۵۹ھ

واقعہ نگاری علامہ اعظمی کا یہ کمال صرف اہل علم کی تاریخ وفات تک محدود نہیں تھا، بلکہ یہ ذوق اس حد تک تھا کہ اگر طبیعت موزوں اور ہموار ہوتی تو کبھی کبھی کسی خاص واقعے کو نظم کر دیا کرتے۔ چنانچہ ایک نامکمل نظم آپ کے کاغذات میں دیکھنے کو ملی، یہ غالباً اس وقت کی ہے جب دارالعلوم مئو سے آپ کی فراغت کے ایک سال بعد مولانا عبداللطیف صاحب وغیرہ فارغ ہوئے، یہ لوگ شاید سات ساتھی تھے، میرا خیال ہے کہ یہ نظم اسی موقع کی کہی ہوئی ہے، جو اگرچہ نامکمل ہے۔ لیکن دلچسپی کی چیز ہے، اور ملاحظہ کے لئے پیش خدمت ہے:

کروں کیا شکر میں مولیٰ کے فضل بے نہایت کا

لکھوں کیا وصف اس کے لطف و احسان وعنایت کا

ہوئی دستار بندی آج ان کی فضل مولیٰ سے
بندھا ہے آج ان ساتوں کے سر سہرا فضیلت کا

لٹائے مال و زر اہل مئو نے اور دیئے چندے
دکھایا اپنی ہمت کا نمونہ اور سخاوت کا

خصوصاً اہل ہمت . بالعموم اہل مئو دیکھیں
ملا کیا بیش قیمت ان کو ثمرہ اپنی محنت کا

الٰہی سبعہ سیارہ ہوں یہ چرخ ملت کے
بنا اک اک کو سورج آسمان علم وحکمت کا

اسی صورت پھر ہر سال اعلام ہدی نکلیں
چمک جائے ستارہ پھر دوبارہ اپنی قسمت کا

اسی طرح ایک عربی نظم دار العلوم یا مفتاح العلوم مئو کے کسی ایسے جلسے کے موقع پر کہی ہوئی ہے، جس میں مشاہیر اہل علم کو شرکت کی دعوت دی گئی تھی وہ نظم یہ ہے:

لك الحمد اللهم رب البرية فإنك أهل الحمد من غير شركة

اے پروردگار! تیرے ہی لئے تمام تعریف ہے، بیشک تو تنہا تعریف کا مستحق ہے۔

فأنت الذى يقضى لنا كل حاجة وأنت الذى ندعوه عند المصيبة

تو ہی ہے جو ہماری ضرورت پوری فرماتا ہے، اور تو ہی ہے جس سے ہم مصیبت کے وقت فریاد کرتے ہیں۔

تتابعت النعماء حتى تجاوزت عن الحصر والإحصا وعمت وطمت

تیری نعمتیں پیہم ہیں، یہاں تک کہ وہ بے اندازہ، بے شمار اور بے حد وحساب ہوگئیں

فأعجزت الآلاء يا رب أن نفى بشكر لما قد دق منها وأعيت

خداوندا! تیری نعمتوں نے اس بات سے عاجز و درماندہ کر دیا ہے کہ ہم چھوٹی سی نعمت کا بھی شکریہ ادا کر سکیں۔

فكيف بما قد جل منها وإنما جلائلها مما عن الوصف جلت

توکیسے ہم ان نعمتوں کا شکریہ ادا کر سکتے ہیں جو بڑی ہیں اور بڑی نعمتیں تو بیان سے بالاتر ہیں

وصلّ علی قطب الوجود محمد أبی القاسم المبعوث فی ارض مكة

خداوندا! تو رحمت نازل فرما، سرزمین مکہ میں پیدا ہونے والے مرکز کائنات ابوالقاسم محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر۔

أرانا الهدى بعدالضلالة والعمى و أخرجنا من ظلمة أىّ ظلمة

جس نے ہم کو ضلالت وگمراہی کے بعد ہدایت کا راستہ دکھایا اور گھٹاٹوپ تاریکی سے باہر نکالا۔

وأصحابه الغر الكرام و آله ذوى الهمة العليا كرام السجية

اور اس کے روشن جبین کریم ساتھیوں اور اہل بیت پر جو بلند ہمت اور شریف طبیعت والے تھے۔

و بعد فهذى حفلة سنوية دعونا لها الأعلام من كل وجهة

پس یہ ایک سالانہ جلسہ ہے جس کے لئے ہم نے ہر سمت سے بڑے بڑے لوگوں کو بلا رکھا ہے۔

فمنهم رئيس ۰۰۰مرتضى حسن هو البطل المقدام ليث الزريبة

ان میں سردار مولانا مرتضی حسن ہیں جو آگے بڑھنے والے بہادر شیر ہیں۔

وعبدالشكور القرم قامع فتنة الـــــــروافض والبدعية الرضوية

اور شیعوں اور رضا خانی بدعتیوں کے فتنوں کا استیصال کرنے والے مولانا عبدالشکور ہیں۔

يذب عن القرآن ثم يذب عن صحابة خير الخلق هاد البرية

قرآن اور صحابۂ کرام کا جو خدا کی بہترین مخلوق اور مخلوق کے رہنما ہیں، دفاع کرتے ہیں۔

وآخر یدعی باسمه من بلیدة تسمی بمرزافور قرب کنتت،

اور ایک اور انھیں کے ہم نام جو کنتت کے قریب مرزاپور سے آئے ہیں۔

سلیمان ملك العلم سید أهله خلیفة شبلی مؤلف سیرة

سید سلیمان (ندوی) ہیں جو دنیائے علم کے تاجدار اور اہل علم کے سر تاج ہیں، علامہ شبلی کے جانشین اور سیرت کے مصنف ہیں۔

وأستاذنا شبیر أحمد حائز المعالی وأنواع المزایا السنیة

اور ہمارے استاد مولانا شبیر احمد ہیں، جو بلندیوں کے مالک اور بہت سی بلند خوبیوں کے حامل ہیں۔

وأحمد سعید الدهلوی المقلد النظامة للجمعیة المرکزیة

اور مولانا احمد سعید دہلوی ہیں جو مرکزی جمعیۃ العلماء کی نظامت کے عہدہ دار ہیں۔

شیخ ابو غدہ کی آمد پر مشہور عالم اور عالم اسلام کے نامور محدث شیخ عبدالفتاح ابو غدہ جب ۱۹۷۹ء میں مئو تشریف لائے تو اس مناسبت سے شیخ کی شان میں یہ قطعہ کہا:

أهلا بمقد ملك الهنئی و مرحبا یا عالم الشهباء إمام الشام

لم یحو علم الفقه والآثار شامی کجمعك بعد ذاك الشامی

اے شام کے عالم اور امام تیرا آنا مبارک ہو علامہ شامی کے بعد حدیث اور فقہ کے علم کو تیری طرح کسی دوسرے شامی نے جمع نہیں کیا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

☆☆☆☆☆☆☆

ہم نفسان رفتہ
وفیات الاعیان

وفیات الاعیان
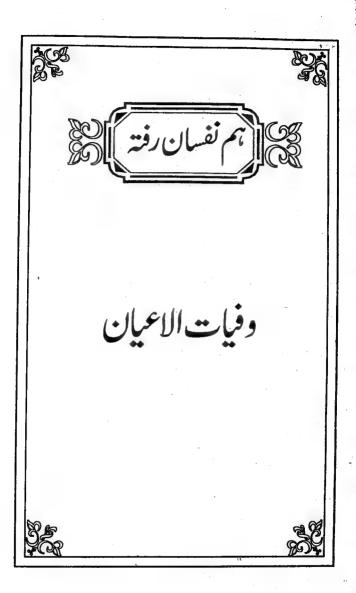
اس باب میں ہم علامہ اعظمیؒ کی بیاض سے ان کی ان تحریروں کو نقل کریں گے جن کو انھوں نے بہت سے اہل علم، اعیان وافاضل اور متعلقین کی وفات پر قلمبند فرمایا ہے، اس کے ذریعہ بہت سے لوگوں کی نسبت ان کے خیالات، تاثرات اور ان کے ذاتی تعلقات کا پتہ لگایا جاسکے گا، مختلف افراد کی وفات پر مختلف قسم کے تاثرات ہیں، اگر متوفی سے ان کا کسی قسم کا ربط و تعلق رہا ہے، تو اس تعلق کی نوعیت کی طرف بھی اکثر وبیشتر اشارہ ہے، اس میں مرحومین کا مختصر سا خاکہ بھی ہے، اور دل کی گہرائیوں سے نکلے ہوئے جذبات و تاثرات بھی، جس میں نہ کوئی تکلف و تصنع ہے، نہ کسی خارجی اثر کی آمیزش، بس جذبات و خیالات کو چند سطروں میں سمودیا گیا ہے، جس میں مخاطب بھی ان کی اپنی ذات ہے، باہر کی دنیا سے اس کا تعلق برائے نام ہے، اسی طرح ان "وفیات" کے ذریعہ علامہ اعظمی کی نگاہ میں بہت سے لوگوں کے مقام ومرتبہ سے بھی واقفیت ہوسکے گی۔

اس سلسلے میں ایک بات اور عرض کردینا مناسب ہوگا، کہ اس بیاض کو دیکھنے سے صاف طور پر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس کا ان کو خاص اہتمام تھا، چنانچہ اس میں بہت سے ایسے لوگوں کی بابت بھی مرقوم ہے، جن سے ان کا دور ونزدیک کا کوئی تعلق نہیں تھا، ایسے مواقع پر صرف ان کی تاریخ وفات لکھی اور اپنے خیالات قلمبند فرمادیئے، لیکن اس کی ایسی سخت پابندی بھی نہ تھی کہ اس میں ذرا تخلف نہ ہو، اسی وجہ سے اس کے تتبع سے یہ بھی ظاہر ہوا کہ متعدد ایسی شخصیتیں جن سے ان کا رابطہ نہایت قوی تھا، ان کے ذکر سے یہ بیاض بالکل خالی اور خاموش ہے۔

اسی طرح اس میں بہت زیادہ دخل طبیعت ومزاج کی موزونیت کا بھی ہے، کہ متعدد

ایسے حضرات جن سے آپ کی خاصی راہ ورسم تھی، لیکن ان کی نسبت چند کلمات سے زیادہ نہیں لکھے، اس موزونیت ہی کا ایک کرشمہ یہ بھی ہے کہ اس میں اردو، فارسی عربی تینوں زبانوں کا استعمال کیا گیا ہے، بلکہ بہت سے تذکرے ایسے بھی ہیں، جن میں عربی وفارسی کا بہترین امتزاج ہے۔

اس بیاض سے علامہ اعظمی کے کئی ایک محاسن وکمالات پر بیک وقت روشنی پڑتی ہے، ایجاز (اختصار) کے ساتھ کسی بات کو بیان کر دینا، بلاغت کے اہم ارکان اور انشاء پردازی کے اہم عناصر میں سے ایک ہے، اس میں آپ نے صرف ایجاز ہی سے کام نہیں لیا ہے، بلکہ دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے، اکثر لوگوں کا ذکر مختصر ہونے کے ساتھ اتنا جامع ہے کہ اس میں متوفی کی شخصیت کا پورا عکس آگیا ہے۔ دوسری بات اس میں جو خاص طور سے قابل توجہ ہے، وہ ہے آپ کی وسعت ظرفی اور کشادہ دلی، نہ صرف معاصرین بلکہ خوردوں کے وصف وکمال کو بھی آپ نے پوری فراخدلی سے قلمبند کیا ہے۔

جس بیاض کے متعلق ہم گفتگو کر رہے ہیں، یوں تو اس کے اندر بہت سے لوگوں کی تاریخ وفات ذکر کی ہے، لیکن اس وقت ہم صرف انھیں لوگوں کا ذکر کریں گے، جن سے کسی قسم کا تعلق ظاہر کیا ہے، یا ان کی ذات سے متعلق اپنے کسی تاثر کا اظہار کیا ہے۔

راقم الحروف نے کوشش یہ کی ہے کہ جن لوگوں کا تذکرہ عربی اور فارسی میں ہے اس کا ترجمہ اس طرح آجائے کہ آپ کی تحریر کی روح متاثر نہ ہو، اور جو صفتِ اختصار ہے وہ علی حالہ باقی رہے۔

(الف)

انور شاہ | شیخی العلامة لم أر مثله ولا سمعت بنظیر له فی هذا العصر ، توفی فی صفر ۱۳۵۲ھ بدیوبند.

مرے استاد علامہ انور شاہ (کشمیری) میں نے اس دور میں ان کا مثل نہ دیکھا نہ سنا، صفر ۱۳۵۲ھ میں دیوبند میں وفات پائی۔

مولانا الیاس (بستی نظام الدین دہلی) | مصلح میوات ویکتا دلدادۂ تبلیغ، توفی ۱۳۶۳ھ فی رجب ، تشرفت بزیارته فی دهلی و تضیفت عنده .

مولانا الیاس (بستی نظام الدین دہلی) میوات کے مصلح، یکتا اور تبلیغ کے دلدادہ تھے، رجب ۱۳۶۳ھ میں وفات پائی، مجھے ان سے دہلی میں ملاقات کا شرف حاصل ہوا اور میں ان کا مہمان رہا۔

مولانا اصغر حسین پرنسپل شمس الہدیٰ کالج پٹنہ | نہایت جید عالم اور دار العلوم دیوبند کے بہت ہی ممتاز فضلاء میں تھے، مولانا محمد سہول صاحب کے بعد ایک صاحب پرنسپل مقرر ہوئے، اس کے بعد مدرسہ شمس الہدیٰ کے پرنسپل مولانا ہی تھے، میری ان کی ملاقات وہیں ہوئی تھی، انھوں نے اپنی تصنیفات ہدیۃً عنایت کیں، اور میرا بہت اکرام کیا، جزاہ اللہ تعالیٰ، ۱۳۶۷ھ میں بہار میں وفات پائی، خاص بہار کے رہنے والے تھے۔

مولوی امجد علی ساکن گھوسی | مصنف بہار شریعت، بریلویان اور اصدر الشریعہ می خوانند، بارے زیر صدارت ایں فقیر در بنارس تقریر کردہ بود، بارادۂ حج بمبئی رسیدہ بود کہ اجلش در رسید، و ذلک فی سنة ۱۳۶۷ھ

مولوی امجد علی باشندہ گھوسی بہار شریعت کے مصنف، بریلوی لوگ ان کو صدر الشریعہ کے خطاب سے یاد کرتے ہیں، ایک دفعہ انھوں نے اس فقیر کی صدارت میں بنارس میں تقریر کی تھی، حج کے ارادہ سے بمبئی پہنچے تھے کہ داعیٔ اجل آپہنچا، اور یہ ۱۳۶۷ھ کی بات ہے۔

الشیخ ابو السمح عبد الظاهر إمام و خطيب المسجد الحرام توفي في القاهرة ۱۳۷۰ عن سبعين عاماً ، قضى معظمها في خدمة العلم و التدريس في المسجد الحرام و دارالحديث (بمكة) مع قيامه بالامامة و الخطابة في الحرم المكي ، رأيته في سنة ۱۳۶۹ و صليت خلفه .

شیخ ابوالسمح عبدالظاہر مسجد حرام کے امام و خطیب، قاہرہ میں ۱۳۷۰ھ میں ۷۰ سال کی عمر میں وفات پائی، زندگی کا بڑا حصہ خدمت علم اور مسجد حرام اور مکہ کے دارالحدیث میں درس دیتے ہوئے گذارا، ساتھ ہی حرم میں امامت و خطابت کے فرائض انجام دیتے تھے، میں نے ان کو ۱۳۶۹ھ میں دیکھا اور ان کے پیچھے نماز پڑھی ہے۔

السلطان ابن سعود ملك الحجاز ونجد، توفي سنة ۱۳۷۳ في صفر، وكان ملك الحجاز سنة ۱۳۲۵، حججت في ولايته مرتين وخلفه ولده سعود بن عبدالعزيز وقد رأيته يطوف الكعبة سنة ۱۳۷۱ .

سلطان ابن سعود، حجاز و نجد کے بادشاہ، صفر ۱۳۷۳ھ میں فوت ہوئے، اور ۱۳۲۵ھ میں حجاز کے حکمراں ہوئے تھے، ان کے عہد حکومت میں دو دفعہ میں نے حج کیا، ان کے جانشین ان کے لڑکے سعود بن عبدالعزیز ہوئے، ۱۳۷۱ھ میں میں نے ان کو طواف کعبہ کرتے ہوئے دیکھا ہے۔

مولانا اعزاز علی مدرس دارالعلوم دیوبند يلقب بشيخ الأدب و الفقه، شهرته تغني عن الاطناب ، رأيته وشافهته مراراً، وسمعته يفسر للطلبة المقامات

للحریری، توفی فی رجب سنة ١٣٧٤.

مولانا اعزاز علی مدرس دار العلوم دیوبند، شیخ الادب والفقہ سے ملقب تھے، ان کی شہرت تطویل سے بے نیاز ہے، میں نے ان کو بارہا دیکھا اور ان سے ملاقات کی ہے، اور ان کو طلبہ کے سامنے مقامات حریری کی تشریح کرتے ہوئے سنا ہے، رجب ۱۳۷۴ھ میں وفات پائی۔

ابوالکلام آزاد | منشئی مجلة الهلال والبلاغ و مصنف تذكره أولاً، ووزير معارف حكومت مركزيه هند آزاد آخراً، ولا شك أنه كان نابغة جيد الحافظة، قوى الفكر، ذا بلاغة رائعة، كاتبا قديرا! ابتدع اسلوباجديداً فى الإنشاء الأردوى. رأيته مراراً وسمعت خطباته، وكان من أركان مجلس العمل لجمعية علماء الهند المركزية وأنا من أعضائه أيضاً. فجالسته فى ذلك المجلس عدة مرات، أصيب بالفالج وتوفى فى اوائل شوال سنة ١٣٧٧.

ابوالکلام آزاد اولا الہلال اور البلاغ کے بانی اور تذکرہ کے مصنف، اور آخر میں آزاد ہندوستان کی مرکزی حکومت کے وزیر تعلیم تھے، وہ بلا شبہ جودت حافظہ، قوت تفکیر اور حیرت انگیز زور بیان میں نابغۂ روزگار اور زور آور انشاء پرداز تھے، اردو انشاء پردازی میں انھوں نے نیا طرز ایجاد کیا، میں نے ان کو بارہا دیکھا اور ان کی تقریریں سنی ہیں، وہ مرکزی جمعیۃ علماء ہند کی مجلس عاملہ کے رکن تھے اور اس وقت میں بھی اس کا ممبر تھا، لہذا مجلس میں بارہا میں ان کا ہم نشین رہا، فالج کا حملہ ہوا اور شوال ۱۳۷۷ھ کے اوائل میں رحلت فرما گئے۔

الشيخ أحمد محمد شاكر | عضوالمحكمة الشرعية العليا بمصر، وشارح الترمذى ومسند أحمدوكبير علماء مصر فى عصره، خدم مسند

مسند أحمد شرحاً وتحقيقاً وتبويباً و غير ذلك أكثر من عشرين عاما ،وأعاد طبعه فابرزه في حلة قشيبة ، وجاء قدر ثلثه في خمسة عشر مجلداً ثم فاجأه الموت في ذى القعده سنة ١٣٧٧ ووقف الطبع. وكان رحمه الله منصفا محبا للتحقيق ، علامة بحاثة ، أرسلت اليه ما تعقبته على شرح المسند ، فشكر لي ذلك و قبله مني إلا النزر اليسير ، وطبعه في آخر المجلد الخامس عشر، فرحمه الله . وله أخ يسمى محمود محمد شاكر عالم محقق لم يجر بيني وبينه مكاتبة ولكنه يعرفني وأعرفه .

شیخ احمد محمد شاکر، مصر کی اعلی شرعی عدالت کے ممبر، ترمذی اور مسند احمد کے شارح، اور اپنے وقت میں مصر کے بڑے عالم تھے، بیس سال سے زیادہ مسند احمد کی تشریح و تحقیق اور تبویب وغیرہ میں صرف کئے، اور نئے سرے سے اس کو زیور طبع سے آراستہ کیا، تقریباً ایک تہائی کتاب پندرہ جلدوں میں شائع ہوئی، پھر ذی قعدہ ۱۳۷۷ھ میں اچانک ان کی موت واقع ہو گئی اور اس کی طباعت موقوف ہو گئی، مرحوم انصاف پسند، تحقیق کے دلدادہ اور زبردست محقق عالم تھے، مسند کی شرح پر جو میں نے تعاقب کیا تھا، ان کے پاس بھیجا تو انھوں نے میرا شکریہ ادا کیا اور تھوڑے سے حصہ کو چھوڑ کر اسے قبول کیا اور پندرہویں جلد کے آخر میں اس کو شائع کیا، اللہ ان پر رحم فرمائیں۔ ان کے ایک بھائی محمود محمد شاکر بھی محقق عالم ہیں، ہمارے درمیان کبھی خط و کتابت نہیں رہی، لیکن ہم دونوں ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ (۱)

---

(۱) علامہ اعظمی جب قاہرہ سیرت کانفرنس میں تشریف لے گئے، تو شیخ محمود شاکر نے اپنے دولتکدہ پر دعوت دی اور زبردست اکرام کیا اور اپنی لائبریری بڑے اہتمام سے دکھائی، چونکہ اس سے پہلے علامہ اعظمیؒ نے ان کی کتاب نسب قریش پر نقد فرمایا تھا، اس کی خلش تو تھی ہی اسلئے گفتگو کے دوران انھوں نے کہا کہ آپ سے بھی ایک زبردست غلطی ہوئی ہے، علامہ اعظمی کے دریافت کرنے پر انھوں نے بتایا کہ آپ نے جامع معمر کو جامع عبدالرزاق سمجھ لیا ہے، جو خلاف واقعہ ہے، علامہ اعظمی نے فرمایا کہ آپ نے اس کے بارے میں میرا مقالہ جو البعث الاسلامی لکھنو میں شائع ہو چکا ہے، پڑھا ہے یا نہیں، تو انھوں نے نفی میں جواب دیا۔ اس پر فرمایا کہ پہلے آپ اس کو پڑھ لیجئے، میں ہندوستان پہونچ کر البعث کے اس مقالہ کی زیراکس کاپی بھجواؤں گا، چنانچہ یہاں سے رجسٹری کے ذریعہ ان کے پاس بھیجا گیا، مگر کوئی جواب نہیں آیا

المفتی اسماعیل بسم اللہ | مدیر جامعة ڈابھیل (سملك) فی مدیریة سورت ، كانت بيني وبينه مكاتبات ، ولم يتيسر لي لقاءه توفى سنة ١٣٧٨ھ

مفتی اسماعیل بسم اللہ جامعہ (اسلامیہ) ڈابھیل (سملک) ضلع سورت کے مدیر تھے، میری ان سے خط وکتابت تھی، لیکن ملاقات کبھی میسر نہ ہوئی، ۱۳۷۸ھ میں وفات پائی۔

الحافظ أحمد سعيد الدهلوى | ناظم جمعية علماء الهند المركزية سابقاً ورئيسها حالا ، نقل ترجمة القرآن للشاه عبدالقادر من الأردوية القديمة التي المستعملة فى هذا العهد وألّف رسائل عديدة ، كان خطيبا بارعا عذب البيان ، تولىٰ رئاسة الجمعية بعد الشيخ حسين أحمد المدنى عامين ، وتوفى فى جمادى الأخرى سنة ١٣٧٩ (ديسمبر سنة ١٩٥٩)

حافظ احمد سعید دہلوی مرکزی جمعیۃ علماء ہند کے سابق ناظم اور موجودہ صدر تھے، شاہ عبدالقادر کے ترجمۂ قرآن کو قدیم اردو سے اس زمانے میں استعمال کی جانے والی اردو میں منتقل کیا اور متعدد رسائل تصنیف کئے، ماہر اور شیریں بیان مقرر تھے، شیخ حسین احمد مدنی کے (انتقال کے) بعد دو سال تک جمعیۃ کے صدر رہے، جمادی الاخری ۱۳۷۹ھ (دسمبر ۱۹۵۹ء) میں وفات پائی۔

مولانا احمد علی مفسر | امیر انجمن خدام الدین (لاہور) تلمیذ رشید مولانا عبیداللہ سندھی و داماد او بود، بسلسلۂ تحریر ہندوستان بارہا اسیر فرنگ شدہ، وازیں جہت مدتے در کابل اقامت کرد، بتفسیر قرآن پاک شغفے عظیم داشت، دائماً بایں کار اشتغال می داشت، یکبار اورا در جون پور زیارت کردہ ام، بتاریخ ۱۷ رمضان ۱۳۸۱ یوم جمعہ (۲۳ فروری ۱۹۶۲ء) در لاہور وفات یافت۔

مولانا احمد علی مفسر، امیر انجمن خدام الدین لاہور، مولانا عبید اللہ سندھی کے شاگرد رشید اور داماد تھے، آزادی ہندوستان کے سلسلہ میں بارہا انگریزوں کے اسیر ہوئے، اور اس حیثیت سے ایک مدت تک کابل میں مقیم رہے، قرآن پاک کی تفسیر کے ساتھ بڑا

شغف رکھتے تھے اور ہمیشہ اس خدمت میں مشغول رہتے، ایک بار میں نے ان کی جون پور میں زیارت کی ہے، ۷ار رمضان ۱۳۸۱ھ (۲۳ر فروری ۱۹۶۲ء) جمعہ کے دن لاہور میں وفات پائی۔

مولوی ابراہیم بنارسی تلمیذ مولانا امان اللہ مئوی مدرس مظہر العلوم (بنارس) مفتیٔ بنارس وامام جامع گیان بانی بود، حریر فروشی می کرد، وبغایت علم دوست بود، میان من واو سلسلۂ وداد وصداقت از زمان تدریس من بمظہر العلوم تا انقضائے حیات وے استوار بود، پسرش مولوی اسحاق نسبت تلمذ بمن دارد وبرادر اسحاق مولوی عبد السلام نیز۔ یقال اصابته السموم فکانت سبب موته وذلك فی قیظ ۱۳۸۶ھ۔

مولوی ابراہیم بنارسی، مولانا امان اللہ مئوی مدرس مظہر العلوم بنارس کے شاگرد، مفتی بنارس اور جامع مسجد گیان بانی کے امام تھے، ریشم کی تجارت کرتے تھے اور نہایت علم دوست تھے، میرے اور ان کے درمیان محبت ودوستی کا تعلق مظہر العلوم میں میرے زمانۂ تدریس سے لے کر ان کی زندگی کے آخر تک قائم رہا، ان کے لڑکے مولوی اسحاق اور مولوی عبد السلام میرے شاگرد تھے، کہا جاتا ہے کہ ۱۳۸۶ھ میں شدید گرمی میں ان کو گرم ہوا لگی جو ان کی موت کا سبب بن گئی۔

مولوی اویس نگرامی پسر مولوی انیس بن مولانا ادریس نگرامی، در اوائل رفیقے بود از رفقائے دار المصنفین زیر تربیت علمی سید سلیمان ندوی، باز در دار العلوم (ندوۃ العلماء) مدرس تفسیر شد، در سالے کہ او حج کرد، من نیز در حجاز بودم، من واو برائے زیارت مسجد قبا و مساجد دیگر، وجامعہ اسلامیہ مدینہ ہمراہ بودیم، توفی ۱۳(۱)

مولوی اویس بن مولوی انیس بن مولانا ادریس نگرامی، شروع میں سید سلیمان ندوی کی زیر تربیت دار المصنفین کے رفیق تھے، پھر دار العلوم (ندوۃ العلماء) میں تفسیر کے مدرس ہوئے، جس سال انھوں نے حج کیا میں بھی حجاز میں تھا، میں اور وہ مسجد قبا اور دیگر مساجد اور جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کی زیارت کے لیے ساتھ گئے، ۱۳ (۱) میں وفات پائی۔

(۱) بیاض میں بس اسی قدر مذکور ہے اور سال وفات کا ذکر نہیں ہے، آپ کی وفات ۲۹ر شعبان ۱۳۹۶ھ ۲۱ر اگست ۱۹۷۶ء کو واقع ہوئی۔

مولانا اسعد اللہ ناظم مظاہر علوم (سہارن پور) عالم مستعد وصوفی صافی بود، از مولانا اشرف علی تھانوی اجازت یاب بود، ازیں جہت کہ خواجہ تاش من بود در میان من واو رابطۂ استوار بود، توفی فی رجب ۱۳۹۹ھ۔

مولانا اسعد اللہ مظاہر علوم (سہارن پور) کے ناظم، صاحب استعداد عالم اور صوفی صافی آدمی تھے، مولانا اشرف علی تھانوی سے اجازت حاصل تھی، میرے خواجہ تاش ہونے کی حیثیت سے میرا اور ان کا اچھا تعلق تھا، رجب ۱۳۹۹ھ میں وفات پائی۔

مولوی انعام کریم دیوبندی ثم المدنی ناظم کتب خانۂ مدرسۂ علوم شرعیہ مدینہ منورہ، درمیان من واو رشتۂ مودت وحب فی اللہ استوار بود، در زیار تہائے متعددہ شرف مہمانی اویافتہ ام، ودر ۱۳۹۸ھ در غرفۂ اقامت داشتم ودر غرفہ کہ بجنب او بود، مولانا اسعد مدنی صباحگاہ مجلس چائے نوشی برپای کرد، وزیر آں حضرت مولانا زکریا کاندھلوی مقیم بود۔

بتاریخ ۲۱؍رجب ۱۳۹۹ھ اخبار الجمعیہ آگاہی داد کہ بواسطۂ تلفون خبر مرگ مولوی انعام کریم رسیدہ است، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مولوی انعام کریم دیوبندی مدنی مدرسۂ علوم شرعیہ۔ مدینہ منورہ کے ناظم کتب خانہ، میرے اور ان کے درمیان دوستی اور حب فی اللہ کا تعلق قائم تھا، مجھے متعدد زیارتوں میں ان کی مہمانی کا شرف حاصل رہا ہے، ۱۳۹۸ھ (کے موسم حج) میں ایک کمرے میں میرا قیام تھا اور اس کے بغل میں جو کمرہ تھا اس میں مولانا اسعد مدنی۔ چائے کی مجلس رچاتے تھے، اور اس کے نیچے حضرت مولانا زکریا کاندھلوی مقیم تھے۔

۲۱؍رجب ۱۳۹۹ھ کو اخبار "الجمعیۃ" نے اطلاع دی کہ ٹیلیفون کے ذریعہ مولوی انعام کریم کی موت کی خبر موصول ہوئی ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی ابو الأعلى المودودي، كان كاتبا بليغا، وله اطلاع واسع وتفكير قوي، وله تصانيف كثيرة في مختلف الموضوعات، أجاد في بعضها وأصاب، وأخطأ في بعضها فزاغ عن منهج الصواب،

ونجمت فتنة في الاسلام لبعض آرائه الشاذة ، توفي في سبتمبر سنة ١٩٧٩ في أمريكا ، ونقلت جثته الى باكستان ودفن هناك ، ويا ليتهم لو استنوا بسنة الاسلام في التجهيز والتكفين . (١)

ابوالاعلیٰ مودودی زور آور انشاء پرداز تھے، وسیع معلومات اور قوی تفکیر کے حامل تھے، مختلف موضوعات پر ان کی بہت سی تصنیفات ہیں جن میں سے بعض اچھی اور صحیح ہیں، لیکن بعض دیگر میں انھوں نے غلطیاں کیں اور صحیح راستے سے ہٹ گئے، ان کے چند شاذ خیالات کی وجہ سے اسلام میں ایک فتنہ پیدا ہو گیا، ستمبر ۱۹۷۹ء میں امریکا میں وفات پائی اور ان کی لاش پاکستان لائی گئی اور وہیں مدفون ہوئے، کاش کہ تجہیز و تدفین میں اسلام کے طریقے کی پابندی کی ہوتی۔ (۱)

(ب)

مولانا الشاه بدر عالم الميرتهي ثم المدني خريج مظاهر علوم، بعد الفراغ منها حضر دروس شيخنا السيد أنور شاه الكشميري في ديوبند في السنة التي كنت أسمع عليه الجامع للترمذي، وهو يسمع معنا، وقد خرج مع شيخنا الى ڈابهيل ، ثم انتقل بعد تقسيم الهند الى باكستان الغربية، ثم هاجر منها الى المدينة المنورة ، وقد اجتمعت به في المدينة ثلاث مرار، زرته في داره المرة الخيرة في أواخر ذى الحجة سنة أربع و ثمانين وثلاثمائةو ألف، فتحدث معي برهة طويلة، وأهدى لي الجزء الثالث من تاليفه ، وكان بي حفيا ،

(۱) یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ یہ مولانا مودودی کی وفات پر علامہ اعظمی کا تاثر ہے، جہاں تک مولانا مودودی کے فکر یا ان کی تحریک کا تعلق ہے تو علامہ اعظمی ان سے کبھی متاثر نہیں ہوئے، جیسا کہ آپ نے خود ایک جگہ تحریر فرمایا ہے کہ: "میں نے مودودی صاحب کو کبھی اتنی اہمیت نہیں دی کہ ان کو موضوع بحث بناؤں۔"

توفی الی رحمة الله فی رجب سنة ١٣٨٥ ودفن فی المدینة ، من تالیفاته ترجمان السنة فی أربع مجلدات ولم یکمل ، وهو الذی جمع أمالی شیخنا فی درس البخاری وسماه فیض الباری وقد طبع فی أربع مجلدات .

مولانا شاہ بدر عالم میرٹھی مدنی، مظاہر علوم کے فارغ التحصیل تھے ، وہاں سے فراغت پانے کے بعد دیوبند میں ہمارے استاد حضرت انور شاہ کشمیری کے درس میں اس سال شریک ہوئے جس سال میں جامع ترمذی کی سماعت کر رہا تھا، اور ہمارے ساتھ وہ بھی سماعت کر رہے تھے، پھر ہمارے شیخ (شاہ صاحب) کے ساتھ ہی ڈابھیل گئے، تقسیم ہند کے بعد مغربی پاکستان چلے گئے، اور وہاں سے مدینہ منورہ ہجرت کر گئے، مدینہ میں میری ان سے تین دفعہ ملاقات ہوئی ہے، آخری دفعہ میں ان کے گھر میں ذی الحجہ ١٣٨٤ھ کے اواخر میں ملا، وہ مجھ سے دیر تک گفتگو کرتے رہے، اور اپنی کتاب کی تیسری جلد مجھ کو ہدیہ کی، وہ میرے اوپر بڑے مہربان تھے، رجب ١٣٨٥ھ میں اپنے رب کے جوار رحمت میں پہنچ گئے اور مدینہ منورہ میں مدفون ہوئے، ان کی تصانیف میں ترجمان السنہ چار جلدوں میں۔ جو مکمل نہ ہو سکی، انھوں نے ہی بخاری پر ہمارے استاد کے امالی کو بھی جمع کیا، اور اس کا نام فیض الباری رکھا جو چار جلدوں میں چھپی ہے۔

الشیخ بهجة البیطار الدمشقی حملت الینا الجرائد العربیة نعیه فی یولیه سنة ١٩٧٦ (رجب ١٣٩٦) وکان من أماثل العلماء وأصحاب التصنیف المبرزین ، زرته فی فندق شبرا (بمکة المکرمة) وأهدیت له نسخة من مسند الحمیدی ، ولم أتمکن من زیارته فی دمشق لقلة الوقت.

شیخ بہجۃ البیطار دمشقی، عربی اخبارات نے جولائی ١٩٧٦ء (رجب ١٣٩٦ھ) میں ان کی موت کی خبر سنائی، بڑے علماء اور ممتاز مصنفین میں تھے، مکہ مکرمہ کے شبرا ہوٹل میں ایک دفعہ میں نے ان سے ملاقات کی، اور مسند حمیدی کا ایک نسخہ ان کو ہدیہ کیا، وقت کی کمی کی وجہ سے دمشق میں میں ان کی زیارت نہ کر سکا۔

(ت)

الشیخ ترکی بن النجدی رأیته فی مدرسة العلوم الشرعیة بالمدینة المنورة یقریٔ سنن أبی داؤد، وکانت له معرفة بالحدیث، وهذا فی سنة ١٣٧١، ثم لما قدمت المدینة فی سنة ١٣٨٠ وجدته قد مات قبل مقدمی بسنتین أوسنوات.

شیخ ترکی بن نجدی، میں نے ان کو مدرسۃ العلوم الشرعیہ مدینہ منورہ میں ابوداؤد پڑھاتے ہوئے دیکھا تھا، اور ان کو حدیث کا علم رکھنے والا پایا تھا، یہ ١٣٧١ھ کی بات ہے، پھر جب ١٣٨٠ھ میں، میں مدینہ منورہ پہنچا تو اس سے دو تین سال قبل وہ وفات پاچکے تھے۔

(ج)

جگر مراد آبادی سکندر علی جگر مراد آبادی اشہر واشعر شعرائے عصر بود، بارہا مرا اتفاق صحبت وسماع غزلیات او افتادہ، در گونڈہ رخت اقامت انداخت، ومدتے دراز کہ بیش از سی سال باشد ہمانجا ماند، وبالآخر ہمانجا پیوند خاک شد، ٩ر ستمبر ١٩٦٠ء (١٦ر ربیع الاول ١٣٨٠ھ) روز جمعہ بود کہ ازیں جہاں درگذشت، من ابیاتہ المستحسنہ قولہ:

مرگ عاشق تو کچھ نہیں لیکن اک مسیحا نفس کی بات گئی

جگر مراد آبادی، سکندر علی جگر اپنے زمانے کے سب سے مشہور اور بڑے شاعر تھے، بارہا مجھے ان کی صحبت اور غزل سننے کا اتفاق ہوا ہے، گونڈہ میں رخت اقامت ڈالا، اور عرصۂ دراز یعنی ٣٠ر سال سے زیادہ وہاں فروکش رہے، اور بالآخر وہیں پیوند خاک ہوئے، ٩ر ستمبر ١٩٦٠ء (١٦ر ربیع الاول ١٣٨٠ھ) جمعہ کے دن سفر آخرت اختیار کیا، ان کے پسندیدہ اشعار میں یہ شعر ہے:

مرگ عاشق تو کچھ نہیں لیکن اک مسیحا نفس کی بات گئی

(ح)

شیخ الحدیث مولانا حسین احمد مدنی | صدر المدرسین دار العلوم دیوبند وصدر جمعیۃ علماء، وجانشین شیخ الہند مولانا محمود حسن، دریغا کہ بتاریخ ۱۲۔ جمادی الاولی ۱۳۷۷ھ بعارضۂ قلب در دیوبند وفات یافتند۔ وكان رحمه الله مسند وقته وشيخ عصره في الطريقة الجشتية، وزعيما كبيرا من زعماء الانقلاب السياسى، وبطلا من أبطال النهضة الهندية، الذين قاوموا الدولة الانكليزية في الهند، حتى استخلصوها من أيديهم، وهو رحمه الله وإن لم يكن من مشايخي كنت أجلّه إجلالهم، وكانت بيني وبينه محبة اكيدة، وسافر مرة من ديوبند الى مئو لاغاية له سوى أن ياخذني معه ويذهب الى دارالعلوم (بديوبند) لكي أتولى الإفتاء بها، وكان رحمه الله من العلم والتقوى والجهاد والعبادة ومكارم الأخلاق بمكان۔

شیخ الحدیث مولانا حسین احمد مدنی، دار العلوم دیوبند کے صدر المدرسین، جمعیۃ علماء ہند کے صدر، اور شیخ الہند مولانا محمود حسن کے جانشین، افسوس کہ ۱۲ر جمادی الاولی ۱۳۷۷ھ کو دل کی بیماری میں دیوبند میں وفات پاگئے، مرحوم مُسند وقت اور طریقۂ چشتیہ میں شیخ زمانہ تھے۔ وہ سیاسی انقلاب کے بڑے رہنماؤں اور ہندوستان کی آزادی کے ان بہادروں میں ایک تھے جنھوں نے ہندوستان میں قائم انگریزی حکومت کے خلاف جد وجہد کی تا آنکہ اس کو انگریزوں کے ہاتھ سے آزاد کرایا، مرحوم اگرچہ میرے اساتذہ میں نہیں تھے، لیکن میں ان کا اپنے اساتذہ ہی کی طرح اکرام کرتا تھا، ہمارے درمیان شدید محبت تھی، ایک دفعہ دیوبند سے مئو تک کا صرف اسی لئے سفر فرمایا کہ مجھے اپنے ساتھ دار العلوم دیوبند لے جائیں تاکہ میرے سپرد افتاء کا منصب فرمائیں، مرحوم علم وتقوی، جہاد وعبادت اور خوش اخلاقی کے بلند مقام پر تھے۔

الشيخ حسن المشاط من أكابر علماء مكة وأفاضلهم ، لقيته اولاً فى مجلسه بالحرم المكى ، وزارنى ثانياً فى بيت الشيخ النمنكانى بالمدينة المنورة كما ذكرته فى ترجمة الشيخ علوى، كان عالماً قوى المشاركة فى الحديث والفقه ، طالعت من تصانيفه رسالة له فى المصطلح، وأخرى فى مناسك الحج ، كان رحمه الله يحبنى ، وكان بشوشا، متواضعاً عليه سيماء التقوى والخشية ، صوفيا صافيا ، إنتقل إلى رحمة الله فى أحد شهور سنة ۱۳۷۹، قبل موسم الحج .

شیخ حسن مشاط اکابر وافاضل علماء مکہ میں تھے، میں ان سے پہلی بار حرم مکہ کی ان کی مجلس میں ملا، اور دوبارہ انھوں نے مدینہ منورہ میں شیخ نمنکانی کے گھر پر مجھ سے ملاقات کی جیساکہ میں شیخ علوی کے تذکرہ میں ذکر کر چکا ہوں، عالم تھے اور حدیث وفقہ میں دستگاہ رکھتے تھے، ان کی تصانیف میں ایک رسالہ اصطلاح پر اور دوسرا جو مناسک حج پر ہے، میں نے مطالعہ کیا ہے، مرحوم مجھ سے محبت کرتے تھے، ہنس مکھ اور متواضع تھے، ان کے اوپر تقوی اور خشیت الٰہی کی کیفیت طاری رہتی تھی، صوفی صافی تھے، ۱۳۷۹ھ کے کسی مہینے میں حج سے پہلے انتقال کیا۔

مولوی حبیب اللہ مئوی خلیفۂ مولانا تھانویؒ مدتے در الہ آباد و بنارس وغیرہ در مدرسہائے سرکاری تعلیم زبان فارسی می داد، ایں حقیر را بسیار عزیز میداشت، در ماہ ذی قعدہ ۱۳۷۹ھ ازیں جہاں درگذشت، در آخرہا بسکھر سندھ (پاکستان) منتقل شدہ بود، ہمانجا پیوند خاک شدہ۔

مولانا تھانویؒ کے خلیفہ مولوی حبیب اللہ مئوی نے ایک مدت تک الہ آباد و بنارس وغیرہ کے سرکاری اسکولوں میں فارسی زبان کی تعلیم دی، اس حقیر کو بہت عزیز رکھتے تھے ، بماہ ذی قعدہ ۱۳۷۹ میں اس دنیا سے سفر فرمایا ، آخر عمر میں سکھر سندھ (پاکستان) منتقل ہوگئے تھے، اور وہیں پیوند خاک ہوئے۔

المفتی محمد حسن الأمرتسری | أحد خلفاء الشیخ أشرف علی التهانوی ، کان عالماً جلیلا ، له مدرسة فی لاهور ، زرته مرة فی تهانه بهون ، بلغنی خبر وفاته فی ذی الحجة سنة ۱۳۸۰، وأنا بمکة ، وکان قد قدمها ولداه حاجین فی ذلك العام.

مفتی محمد حسن امرتسری مولانا اشرف علی تھانوی کے خلفاء میں سے ایک تھے، بڑے عالم تھے، لاہور میں ان کا مدرسہ تھا، تھانہ بھون میں ایک دفعہ میں نے ان سے ملاقات کی ہے، ان کی وفات کی خبر ذی الحجہ ۱۳۸۰ھ میں مجھے مکہ میں ملی، اس سال ان کے دو لڑکے بھی حج کیلئے آئے تھے۔

مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی | ناظم جمعیۃ علماء ہند دہلی، وممبر پارلیمنٹ ہند، ومصنف قصص القرآن واسلام کا اقتصادی نظام وغیرہ، قوم وملت کے بہترین خادم اور فرزندان دارالعلوم دیوبند میں ان کی شخصیت بہت اونچی تھی؛ وشهرته تغنی عن الاطناب فی وصفه ۱۳۸۲ھ میں دہلی میں وفات پائی، اور شاہ ولی اللہ صاحب کے جوار میں مدفون ہوئے، برہان، معارف اور دارالعلوم دیوبند کے شذرات سے مزید حالات معلوم ہو سکتے ہیں۔

مولانا سید حمید الدین بن بشیر الدین الفیض آبادی | کان عالماجلیل القدر ، له مشارکة فی الفقه والحدیث وغیرهما ، من أرشد تلامذة الشیخ محمد أنور الکشمیری، رفیقا للشیخ محمد یوسف البنوری فی الطلب ، وکان فی الرعیل الأول من خریجی الجامعة الاسلامیة بڈابهیل ، بایع علی ید الشیخ حسین أحمد المدنی ، ودرس فی بیر جهنڈا(من السند) أیاماً ، ثم فی نورالعلوم (ببهرائج) أعواماً، وفی دارالعلوم التابعة لندوة العلماء یسیراً وانتقل الی کلکتا أخیراً وتولی درس الحدیث فی المدرسة العالیة مدة طویلة وکان من أعضاء مجلس شوری دارالعلوم الدیوبندیة ، خرج من دهلی یرید دیوبند

فی سیارۃ ومعه أھله فاصطدمت سیارته بأخری بقرب مظفر نگر ، فانتقل إلی رحمة اللہ لوقته ، وکان ذلك فی شعبان من سنة ١٣٨٨ (١٥ ـ من نوفمبر سنة ١٩٦٩) وکان رحمه اللہ یحبنی حبا یفوق الوصف ، ویجلنی إجلال شیوخه، و عھدته منذ عرفته ورعا دینا ، محبا للعلم وأھله .

مولانا سید حمید الدین بن بشیر الدین فیض آبادی جلیل القدر عالم تھے، فقہ و حدیث وغیرہ میں درک حاصل تھا، مولانا انور شاہ کشمیری کے ارشد تلامذہ میں تھے، مولانا محمد یوسف بنوری کے ہم درس اور جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل کے اولین فضلاء میں تھے، مولانا حسین احمد مدنی سے بیعت تھے، پیر جھنڈا (سندھ) میں کچھ دنوں درس دیا، پھر نور العلوم بہرائچ میں کئی سال تک پڑھاتے رہے، تھوڑے دنوں تک دار العلوم ندوۃ العلماء میں بھی پڑھایا، اور کلکتہ منتقل ہوگئے، وہاں مدرسہ عالیہ میں ایک مدت تک حدیث کا درس دیا، دار العلوم دیوبند کی مجلس شوری کے ممبر بھی تھے، اپنے اہل و عیال کے ساتھ دیوبند کے قصد سے دہلی سے ایک کار میں روانہ ہوئے، کہ مظفر نگر میں آپ کی کار ایک دوسری کار سے ٹکرا گئی، اور اسی وقت جوار رحمت میں پہنچ گئے، یہ واقعہ شعبان ١٣٨٨ھ (١٥ر نومبر ١٩٦٩ء) کا ہے، مرحوم مجھ سے نا قابل بیان حد تک محبت کرتے تھے، اور اپنے اساتذہ کی طرح میرا اکرام کرتے تھے، میں نے جب سے ان کو جانا ہے پرہیز گار و دین دار اور علم و علماء سے محبت کرنے والا پایا ہے۔

(خ)

مولانا خلیل احمد انبیٹھوی محدث | **توفی فی المدینة المنورۃ سنة ١٣٤٦، صاحب بذل المجھود فی شرح أبی داؤد ، تلمیذ رشید حضرت گنگوھی وصدر مدرسین مظاھر علوم ، تشرفت برویته وزیارته فی دیوبند.**

مولانا خلیل احمد انبیٹھوی محدث نے ١٣٤٦ھ میں مدینہ منورہ میں وفات پائی۔

بذل المجہود فی شرح ابی داؤد کے مصنف، حضرت گنگوہی کے شاگرد رشید اور مظاہر علوم کے صدر مدرس تھے، مجھے دیوبند میں ان کو دیکھنے اور ملاقات کرنے کا شرف حاصل ہوا ہے۔

(ز)

الشیخ زاهد الکوثری صاحب التصانیف الکثیرة الطیبة، البحر الخضم علماً، ومن أکابر علماء عصره، وظنی أنه کان عند وفاته أوحد أوانه، لی معه مکاتبات ودیة و أجاز باستدعائی ابنی رشید أحمد، توفی فی ذی الحجة سنة ۱۳۷۱ وأنا إذ ذاك بمکة المکرمة، کتب الی بوفاته ابنی رشید أحمد، وذاك فی حجتی الثانیة، وکان الله قد من علیّ بالوصول الی بیته قبل ذلك بسنتین سنة ۱۳۶۹ فالحمدلله، وأتحفنی الشیخ بکثیر من رسائله التی ألفها وذکرنی فی مقدمة منیة الألمعی.

شیخ زاہد کوثری، بہت سی عمدہ کتابوں کے مصنف، علم کے بڑے سمندر، اور اپنے زمانہ کے اکابر علماء میں تھے، میں سمجھتا ہوں کہ وفات کے وقت وہ یکتائے روزگار تھے، میری ان سے دوستانہ مراسلت تھی، اور میری درخواست پر میرے لڑکے رشید احمد کو انھوں نے اجازت بھی دی تھی، ذی الحجہ ۱۳۷۱ھ میں جس وقت کہ میں مکہ مکرمہ میں تھا وفات واقع ہوئی، ان کی وفات کی خبر مجھے میرے لڑکے رشید احمد نے دی اور وہ میرا دوسرا حج تھا، اور اس سے دو سال پہلے ۱۳۶۹ھ میں بھی اللہ نے اپنے گھر تک رسائی کا میرے اوپر انعام فرمایا تھا، فالحمد للہ، شیخ نے اپنے تصنیف کردہ بہت سے رسائل مجھے ہدیہ کیے، اور منیۃ الالمعی کے مقدمہ میں میرا ذکر بھی کیا۔

ابو زهرة کان الشیخ من کبار علماء مصر وفقهائها، له تآلیف جیدة منها: أبو حنیفة، ومالك، والشافعی، وأحمد وغیر ذلك وکان خطیبا مصقعا، والأسف أنه لم یتفق لی زیارته، وافانا خبر وفاته ونحن بالهند فی مایو سنة ۱۹۷۴

شیخ ابو زہرہ مصر کے بڑے علماء وفقہاء میں تھے، ان کی بہت سی اچھی تصنیفات ہیں، جن میں ابو حنیفہ، مالک، شافعی اور احمد وغیرہ ہیں، زبان آور مقرر تھے، افسوس کہ ان سے میری ملاقات نہ ہوسکی، ان کی وفات کی خبر ہمیں مئی ۱۹۷۴ء میں ہندوستان میں ملی۔

(س)

شاہ سلیمان پھلواروی ولد سنة ۱۲۷٦ھ ، توفی سنة ۱۳٥٤ھ زرته فی فلواری .

شاہ سلیمان پھلواروی ۱۲۷۶ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۳۵۴ھ میں وفات پائی، میں نے پھلواری میں ان سے ملاقات کی ہے۔

السلطان سعود بن عبدالعزیز ملك الحجاز ونجد وملحقاتها، تولی السلطنة عام ۰۰۰ ووسع الحرم المدنی، وشرع فی توسعة المسجد الحرام ، ثم انسحب عن السلطنة فی حق أخیه فیصل بن عبدالعزیز ، وقد رأیته حین کان ولی عهد أبیه زار الهند ،أقام بعد انعزاله فی الیونان وتوفی هناك فی اواخر سنة ۱۳۸۸ .

سلطان عبدالعزیز، حجاز ونجد اور اس کے ملحقات کے بادشاہ، سنہ ۰۰۰ میں حکومت سنبھالی، حرم مدنی کی توسیع کی، اور مسجد حرام کی توسیع شروع کی، پھر اپنے بھائی فیصل بن عبدالعزیز کے حق میں حکومت سے دستبردار ہوگئے، میں نے ان کو اس وقت دیکھا تھا جب وہ اپنے والد کے ولی عہد تھے اور ہندوستان کا دورہ کیا تھا، حکومت سے اپنی کنارہ کشی کے بعد یونان میں مقیم ہوگئے تھے اور وہیں ۱۳۸۸ھ کے آخر میں وفات پائی۔

سعید انجینئر (بمبئی) میرے محب مخلص اور بڑے کرم فرما تھے، بعارضۂ ذیابیطس ۲ر مئی ۱۹۶۹ء م ۱۴ر صفر ۱۳۸۹ھ کو جی ٹی ہسپتال بمبئی میں وفات پائی۔

الشیخ سعدی یاسین خطیب مسجد أبی بکر فی بیروت، اجتمعت به مراراً، وصلیت خلفه، ورافقته الی قلمون فی عزاء الشیخ عبدالرحمٰن (أخی صاحب المنار)، حملت الینا نبأوفاته جریدة أخبار العالم الإسلامی (مکة) فی جمادی الأخری سنة ١٣٩٦.

شیخ سعدی یاسین، مسجد ابوبکر بیروت کے خطیب، ان سے بارہا میری ملاقات ہوئی، ان کے پیچھے میں نے نماز پڑھی اور شیخ عبدالرحمٰن (علامہ رشید رضا صاحب المنار کے بھائی) کی تعزیت کے لئے ان کے ساتھ قلمون گیا، مکہ کے اخبار العالم الاسلامی نے جمادی الاخریٰ ١٣٩٦ھ میں ان کی وفات کی خبر سنائی۔

مولانا سراج الحق مچھلی شہری کان سنیا قحا، کتب رسائل عدیدة یدافع عن أهل السنة ویدحض کید الشیعة، کان یجلنی ویتودد الی، ویعتقد فیّ، ویعتمد علیّ فی العلم، توفی سنة ١٣٩٧ھ، کتب الی بذلک ولده۔

مولانا سراج الحق مچھلی شہری خالص سنی تھے، اہل سنت کے دفاع اور شیعوں کے فریب کے ابطال میں متعدد رسائل لکھے، میری عزت اور مجھ سے محبت کرتے تھے، میرے اوپر یقین اور میرے علم پر اعتماد کرتے تھے، ١٣٩٧ھ میں وفات پائی، اس کی اطلاع مجھے ان کے لڑکے نے خط لکھ کر دی۔

(ش)

مولانا شکر اللہ مبارکپوری أخی فی الله عالم جید توفی سنة ١٣٦١.

مولانا شکر اللہ مبارکپوری میرے اللہ واسطے بھائی تھے، جید عالم تھے ١٣٦١ھ میں وفات پائی۔

مولانا شکر اللہ صاحب کی نسبت علامہ اعظمی ایک دوسرے موقع پر لکھتے ہیں:

مولانا شکر اللہ صاحب مبارکپوری، مبارکپور ضلع اعظم گڑھ کے رہنے والے تھے،

جید عالم تھے، مدرسہ احیاء العلوم نے انھیں کے زمانے میں ترقی کی، مقرر بھی تھے، درس بھی دیتے تھے، مذہبی، سیاسی اور جماعتی خدمتیں خوب انجام دیں ۱۳۶۱ھ میں وفات ہوئی۔

علامہ شبیر احمد دیوبندی | شارح مسلم وصاحب فوائد قرآنیہ، قرأت علیه نبذاً من صحیح مسلم توفی ۱۳۶۹ھ ودفن فی کراچی، رثیته بقصیدة طبعت فی برہان (مارچ ۵۰ء)

علامہ شبیر احمد دیوبندی صحیح مسلم کے شارح اور فوائد قرآنیہ کے مصنف، میں نے ان کے پاس صحیح مسلم کا کچھ حصہ پڑھا ہے، ۱۳۶۹ھ میں وفات پائی اور کراچی میں مدفون ہوئے، ایک قصیدہ میں ان کا میں نے مرثیہ لکھا ہے، جو مارچ ۱۹۵۰ء کے برہان میں چھپا ہے۔

مولوی شمس الدین (کیاری ٹولہ) | در بعض کتب ہم سبق من بود، وبعد فراغ من بیک سال از دار العلوم مئو فراغ یافت، چندے در جیون رام ہائی اسکول بہ تعلیم زبان پارسی پرداخت، پس ازاں در ادارۂ مفتاح العلوم رفاقت ایں حقیر اختیار کرد، از سالہائے دراز مبتلائے ضیق النفس بود، در اواخر جمادی الاولی ۱۳۹۲ھ ازیں جہاں در گذشت، غفر اللہ لہ۔

مولوی شمس الدین کیاری ٹولہ، بعض کتابوں میں میرے ہم سبق تھے، میری فراغت کے ایک سال بعد دار العلوم مئو سے فراغت پائی، جیون رام ہائی اسکول میں کچھ دنوں فارسی زبان کی تعلیم دی، اس کے بعد مفتاح العلوم کی ادارت میں اس حقیر کی رفاقت اختیار کی، کئی سال سے ضیق النفس کی بیماری میں مبتلا تھے، جمادی الاولیٰ ۱۳۹۲ھ کے آخر میں اس دنیا سے سفر کیا، اللہ ان کی مغفرت فرمائے۔

المفتی شفیع الدیوبندی | خریج دارالعلوم الدیوبندیة ثم مفتیها، وقد انتقل بعد التقسیم الی کراتشی وأسس هناك مدرسة قام بادارتها، والتدریس والإفتاء فیها ، له تصانیف، وکان ممن أجاز له شیخنا التهانوی ، کنت أعرفه و یعرفنی من حین اقامتی بدارالعلوم متعلما، ثم لقیته بالحرم المکی فی إحدی

حجاتي، وبالحرم المدني في أخرى، ورأيته ثالثة في ديوبند كان قدمها في زيارة من الباكستان، توفي في سنة ١٣٨٦.

مفتی شفیع دیوبندی، دارالعلوم دیوبند کے فارغ التحصیل اور مفتی، تقسیم ہند کے بعد کراچی منتقل ہو گئے اور وہاں ایک مدرسہ قائم کیا جس کے وہ ناظم تھے، اور درس وافتاء کا کام دیکھتے تھے، صاحب تصنیف تھے، اور ان کو ہمارے حضرت تھانوی سے اجازت بھی حاصل تھی، دارالعلوم دیوبند میں طالب علمی کے میرے زمانۂ قیام سے ہم ایک دوسرے کو پہچانتے تھے، پھر میری ان سے ملاقات ایک حج میں حرم مکہ میں ہوئی، پھر ایک دوسرے حج میں حرم مدینہ میں ہوئی، تیسری دفعہ میں نے ان کو دیوبند میں دیکھا جب وہ پاکستان سے سفر کر کے آئے ہوئے تھے، ۱۳۸۶ھ میں وفات پائی۔

علامہ اعظمی کو جب یہ خبر موصول ہوئی تو انھوں نے مذکورہ بالا سطریں تحریر فرما دیں، لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ یہ خبر غلط تھی، بلکہ مفتی شفیع صاحب ہی کے ایک دوسرے ہم نام بزرگ مفتی محمد شفیع سرگودھوی کا انتقال اس وقت ہوا تھا، چنانچہ آپ نے اسی جگہ اس کے بعد لکھا ہے:

"کسی نے غلط خبر دی اور میں نے یہ نوٹ لکھدیا، مفتی صاحب ابھی زندہ ہیں، ۱۱ر ج ۲/۱۳۸۶ھ۔ صحیح بات یہ ہے کہ اس سال مفتی محمد شفیع سرگودھوی کا انتقال ہوا۔"

پھر اس کے دس برس بعد ۱۳۹۶ھ میں مفتی شفیع صاحب کا انتقال ہوا تو آپ نے مذکورہ جملہ کے فوراً بعد لکھا:

"اور مفتی شفیع دیوبندی کی وفات ۱۳۹۶ھ میں ہوئی۔ معارف و برہان و دارالعلوم میں ان کی وفات و حالات کا ذکر ہے۔"

مذکورہ بالا سطروں کے علاوہ ایک چھوٹے سے کاغذ پر مفتی صاحب کی وفات پر اپنا تاثر یوں لکھا ہے:

"مفتی صاحب کی وفات کے وقت سے اب تک کا زمانہ میرے لئے عام الحزن

ہے، اس مدت میں کئی ایک عالم و فاضل اور مصلح و مربی شخصیتوں کی جدائی کا غم مجھے برداشت کرنا پڑا ہے، مثلاً مولانا محمد اویس نگرامی، اور مولانا عبدالماجد دریابادی، مگر مفتی صاحب کا فقدان بہت بڑا سانحہ ہے، ان کے اٹھ جانے سے علم و فضل کی بزم سونی ہوگئی ہے، ان کے نہ ہونے سے فقہاء کی مجلس میں جو خلا پیدا ہوا ہے، اس کا پر ہونا مشکل ہے، وہ اپنے وقت کے نابغہ اور عبقری تھے۔"

المولوی شریف الحسن الدیوبندی و توفی فی تلک السنة (۱) (سنة ۱۳۹۷) المولوی شریف الحسن الدیوبندی، کان یتولی التدریس بدارالعلوم (دیوبند)، فوض الیه باشارتی ، و درّس البخاری أخیراً.

اور اسی سال (۱۳۹۷ھ میں) مولوی شرف الحسن دیوبندی نے وفات پائی، دارالعلوم دیوبند میں تدریسی خدمت انجام دیتے تھے، ان کو میرے ہی مشورہ پر رکھا گیا تھا، آخر میں بخاری بھی پڑھائی۔

(ص)

مولوی حکیم محمد صابر (۲) پسر حافظ عثمان تلمیذ استاذی مولانا عبدالغفار ساکن الہ داد پورہ مئو۔ کان یحبنی ویجلنی، توفی ۶۔ج۲/ ۱۳۶۳ھ۔

مولوی حکیم محمد صابر، حافظ عثمان کے لڑکے، میرے استاذ مولانا عبدالغفار کے شاگرد الہ داد پورہ کے رہنے والے تھے، مجھ سے محبت اور میرا اکرام کرتے تھے، ۶/ جمادی الثانیہ ۱۳۶۳ھ کو فوت ہوئے۔

حضرت مولوی محمد صابر بن عنایۃ اللہ پدر بزرگوار وولی نعمت ایں فقیر، عالم

(۱) علامہ اعظمی کی بیاض میں ان کا ذکر مولانا سراج الحق مچھلی شہری کے ذکر کے بعد ہے، اس لئے تعبیر فی تلک السنة سے کی ہے۔

(۲) مفتاح العلوم کے ابتدائی دور میں جن حکیم محمد صابر الہ دادپورہ کا ذکر ہے وہ یہی ہیں۔

باسند و تلمیذ مولانا عبدالغفار و اُخویہ و در طریق چشتیہ مرید مولانا اشرف علی تھانوی، بغایت متشرع و متقی و زاہد و تہجد گذار و مہمان نواز و بے نفس و خوش اخلاق بود، وکان أواها تلاءً للقرآن، توفي بذات الرية في الساعة الثانية نهاراً يوم السبت في إحدى و عشرين من ذي الحجة سنة ١٣٦٥، وكان ابن خمس وسبعين أو ثلث و سبعين۔ از وفات او آنچہ بر من گذشت از حد بیان بیرون است۔

حضرت مولوی محمد صابر بن عنایۃ اللہ، اس فقیر کے والد بزرگوار اور ولی نعمت، سند یافتہ عالم اور مولانا عبدالغفار اور ان کے دونوں بھائیوں کے شاگرد اور چشتی سلسلے میں مولانا اشرف علی تھانوی کے مرید، نہایت پابند شریعت، صاحب زہد و تقویٰ اور تہجد گذار و مہمان نواز و بے نفس و خوش اخلاق تھے، بہت زیادہ گریہ وزاری اور قرآن کی تلاوت کرنے والے تھے، ۲۱ر ذی الحجہ ۱۳۶۵ھ کو سنیچر کے دن دو بجے دن میں پھیپھڑے کی بیماری میں انتقال فرمایا، وفات کے وقت عمر ۷۵ یا ۷۳ برس تھی، ان کی وفات سے مجھ پر جو گذری ہے وہ بیان سے باہر ہے۔

مولوی محمد صابر بن حافظ اسمٰعیل (بلاقی پورہ مئو) شاگرد مولانا احمد حسن کانپوری و مرید شاہ وارث حسن، و استاد ایں فقیر بود، بدار العلوم مئو و مظہر العلوم بنارس درس داد، بعارضۂ وجع قلب در اواخر ذی الحجہ ۱۳۶۷ھ وفات یافت۔ اولئك لهم الخيرات۔

مولوی محمد صابر بن حافظ اسمٰعیل (بلاقی پورہ مئو) مولانا احمد حسن کانپوری کے شاگرد، شاہ وارث حسن کے مرید اور اس فقیر کے استاد تھے، دار العلوم مئو اور مظہر العلوم بنارس میں درس دیا، دل کی بیماری میں ذی الحجہ ۱۳۶۷ھ کے آخر میں وفات پائی، اولئك لهم الخيرات سے تاریخ نکلتی ہے۔

المولوی صبغۃ اللہ الفرنجی محلی الملقب بشہید كان واعظا عذب البيان يتكلم على السيرة النبوية ، كان زميلا لي في احدى رحلاتي الى مكة المكرمة، كان يتردد الي ، وقد دعاني مرة الى بيته في حين اقامتي بلكهنؤ، توفي في كلكتة

لسبع عشرة من شعبان سنة ١٣٨٤ ودفن في لكهنؤ.

مولوی صبغۃ اللہ فرنگی محلی ملقب بہ شہید شیریں بیان واعظ تھے، سیرت نبوی پر تقریر کرتے تھے، مکہ مکرمہ کے ایک سفر میں میرے ہم سفر تھے، مجھ سے محبت کا برتاؤ کرتے تھے، لکھنؤ کے میرے زمانۂ قیام میں ایک دفعہ مجھے اپنے گھر دعوت بھی دی، ۱۷ ار شعبان ۱۳۸۴ھ کو کلکتہ میں وفات پائی، اور لکھنؤ میں دفن کئے گئے۔

قاری محمد صدیق لکھنوی از مدرسہ فرقانیہ لکھنؤ سند فراغ حاصل کرد، ودر صحبت حضرت مولانا عبدالشکور کاکوروی مدیر النجم مدتہا ماند و فیوض فراواں درر بود، واکتساب علم ظاہر واستفاضہ فیض باطن کرد، مقرر بلیغ ومدرس جید الاستعداد بود، در مناظرہ با اہل تشیع و اہل بدعت مہارت عظیم داشت، بااین فقیر اخلاص ومودت بے پایاں داشت، توفی في اوائل جمادى الثانيه من سنة ١٣٩٢

قاری محمد صدیق لکھنوی، مدرسہ فرقانیہ لکھنؤ سے سند فراغ حاصل کی، اور مدتوں (امام اہلسنت) حضرت مولانا عبدالشکور کاکوروی مدیر النجم کی صحبت میں رہے اور خوب خوب فیض حاصل کیا، اور علم ظاہر اور فیض باطن سے بہرہ مند ہوئے، بلیغ مقرر اور جید الاستعداد مدرس تھے، شیعوں اور بدعتیوں سے مناظرہ میں بڑی مہارت حاصل تھی، اس فقیر کے ساتھ بے پناہ اخلاص و محبت رکھتے تھے، ۱۳۹۲ھ میں جمادی الثانیہ کے شروع میں وفات پائی۔

(ظ)

مولانا ظفر احمد التهانوى توفي في ذى قعده من سنة ١٣٩٤ (ديسمبر ١٩٧٤) في الباكستان، وهو ابن اخت شيخنا العالم الكبير حكيم الأمة الشيخ أشرف على التهانوى، تخرج من مظاهر علوم وتدرب عند خاله وتسلك، درس في رنگون مدة، وألف إعلاء السنن وكان له اليد الطولى في علوم الحديث وفقهه، آثر القيام بالباكستان عند تقسيم الهند، وأسس هناك

مدرسة فی (بهول پور) ولزمها الی آخر حیاته وكان قبل ذلك فی ڈھاكه يدرس ويفيد ، كانت بينی و بينه معرفة، وكان يثنی علی تاليفی نصرة الحديث رحمه الله رحمة واسعة .

مولانا ظفر احمد تھانوی نے ذی قعدہ ۱۳۹۴ھ (دسمبر ۱۹۷۴) میں پاکستان میں وفات پائی، وہ ہمارے شیخ عالم کبیر حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی کے بھانجے تھے، مظاہر علوم سے فارغ ہوئے اور اپنے ماموں کے پاس مشق کی اور سلوک سیکھا، ایک مدت تک رنگون میں درس دیا، اور اعلاء السنن تصنیف کی، حدیث کے علم اور اس کے فقہ میں ید طولیٰ حاصل تھا، تقسیم ہند کے بعد پاکستان میں قیام کو ترجیح دی اور وہاں ایک مدرسہ کی بنیاد رکھی اور اخیر عمر تک اس سے وابستہ رہے، اس سے پہلے ڈھاکہ میں بھی درس و تدریس کی خدمت انجام دے چکے تھے، ہم دونوں ایک دوسرے کو جانتے تھے، اور وہ میری کتاب نصرۃ الحدیث کی تعریف کرتے تھے، اللہ تعالیٰ ان کے اوپر اپنی بے پایاں رحمت فرمائے۔

ظهير أحسن (شوق) النيموی المحدث الحنفی مصنف آثار السنن ، كان طويل الباع فی العلوم النقلية ، كثير الاطلاع فی فنون الحديث، دافع عن مذهب أبی حنيفة أحسن مدافعة ، تلمذ علی مولانا عبدالحي اللكنوی، وأجاز له مولانا عبدالحق الاله آبادی المهاجر المكی بجميع مروياته سنة ۱۳۱۸ مكاتبة، وأجاز له أيضا الشاه فضل رحمن المرادآبادي بالرواية وأخذ البيعة، مدحه شيخنا العلامة انور الكشميری بقصيدة ، وكان مشاركا له فی تصنيف آثار السنن توفی المترجم له سنة ۱۳۲۲ كما فی أحسن الكلام.

ظہیر احسن (شوق) نیموی، محدث حنفی، آثار السنن کے مصنف، علوم نقلیہ میں دسترس اور فنون حدیث میں بڑی مہارت حاصل تھی، امام ابو حنیفہ کے مذہب کی بہترین مدافعت کی، مولانا عبدالحی لکھنوی کے شاگرد تھے، اور ان کو مولانا عبدالحق الہ آبادی مہاجر مکی نے ۱۳۱۸ھ میں بذریعہ خط اپنی تمام مرویات کی اجازت دی، اور ان کو شاہ فضل رحمٰن

مراد آبادی نے روایت اور بیعت لینے کی اجازت دی، ہمارے استاذ علامہ انور کشمیری نے ایک قصیدہ میں ان کی مدح کی، اور آثار السنن کی تصنیف میں وہ ان کے شریک کار بھی رہے، مولانا نیموی نے ۱۳۲۲ھ میں وفات پائی، جیسا کہ احسن الکلام میں مذکور ہے۔

(ع)

مولانا عبدالرحمٰن البوفالی | حافظ قرآن وعالم جید، وواعظ خوش بیان بود، در سلسلہ قادریہ از بعض مشائخ بغداد اجازت داشت، له مریدون کثیرون فی منو، وأجاز لی بروایة جمیع ما تصح له روایته عن الشیخ عبدالقیوم البوفالی عن الشاه اسحاق رحمهم الله تعالیٰ، توفی فی سنة ۱۳۵۷۔

مولانا عبدالرحمٰن بھوپالی، حافظ قرآن، جید عالم اور خوش بیان واعظ تھے، سلسلۂ قادریہ میں بغداد کے بعض مشائخ سے ان کو اجازت حاصل تھی، مئو میں ان کے بہت سے مریدین ہیں، اور مجھے ان تمام روایتوں کی اجازت دی جن کی ان کے شیخ عبدالقیوم بھوپالی اور ان کو شاہ اسحٰق صاحب رحمھم اللہ سے اجازت حاصل ہے، ۱۳۵۷ھ میں وفات پائی۔

مولانا شاه محمد عمر بن | كان ممن رأى و بايع الشاه فضل رحمن الگنج مرادآبادی، كان يحبني محبة الولد، و يشكرني إذا حضرته، و يدعو لي من صميم القلب، كان سنه في ۱۳۵۷ھ ۷۳ عاماً، ولد سنة ۱۲۸۵، وتوفي سنة ۱۳۵۸ في ربيع الاول.

مولانا شاہ محمد عمر بن ... ، شاہ فضل رحمٰن گنج مراد آبادی کو دیکھا اور ان سے بیعت کی تھی، مجھ سے اولاد کی طرح محبت کرتے تھے، اور جب میں ان کے پاس حاضر ہوتا تو میرے شکر گذار ہوتے تھے، اور صدق دل سے مجھے دعا دیتے تھے، ۱۳۵۷ھ میں ان کی عمر ۷۳ برس تھی، ۱۲۸۵ھ میں پیدا ہوئے اور ربیع الاول ۱۳۵۸ھ میں وفات پائی۔

مولانا عبدالحق مدنی | كان رفيقي في حجتي الاولى ۔ و كانت بيني و

بينه صداقة، كان أديبا وواعظا ، توفى سنة ١٣٧٤

مولانا عبدالحق مدنی میرے پہلے حج میں میرے ساتھ تھے، میرے اور ان کے درمیان دوستی تھی، ادیب اور واعظ تھے، ۱۳۷۴ھ میں وفات پائی۔

مولوی عبدالرحیم لکھنوی | برادر خورد مولانا عبدالشکور مدیر النجم ابن مولوی ناظر علی، كان صديقا لى ، وهو من تلامذة المولوى عبدالوحيد السنبلى والمولوى حفيظ الله البندوى، وكان من طلبة مظاهر علوم وخريجيها ، وكان الشيخ خليل احمد يحبه محبة الوالد لولده ، وكان يحفظ ألوفا من الاشعار الفارسية والاردوية، وله معرفة بالعلوم العقلية والنحو، وكان لوعظه تاثير فى القلوب ، توفى سنة ١٣٧٦ فى لكهنو ، صليت عليه و حضرت دفنه .

مولوی عبدالرحیم ، مولانا عبدالشکور مدیر النجم کے چھوٹے بھائی اور مولوی ناظر علی کے لڑکے، میرے دوست تھے، وہ مولوی عبدالوحید سنبھلی اور مولوی حفیظ اللہ بندوی کے شاگردوں میں تھے۔ اور مظاہر علوم (سہارنپور) کے طلباء اور فضلاء میں تھے، مولانا خلیل احمد ان سے بیٹے کی طرح محبت کرتے تھے، اردو اور فارسی کے ہزاروں اشعار ان کو زبانی یاد تھے ، معقولات اور نحو میں دستگاہ حاصل تھی ، ان کے وعظ دل میں تاثیر پیدا کرتے تھے، ۱۳۷۶ھ میں لکھنؤ میں وفات پائی، میں نے ان کی نماز جنازہ پڑھی اور تدفین میں شریک ہوا۔

عبدالرزاق المليح آبادى | منشئ مجلات عديدة فى كلكته ، وصديق أبى الكلام آزاد ، ومنشئ ثقافة الهند فى دهلى أخيراً، زار مصر وصحب الاستاذ رشيد رضا المصرى منشئ المنار، وترجم كتبا عديدة ، منها : العلم والعلماء، صادفته فى دهلى وغيرها مرات، فلم يعجبنى حبه للتجدد وانحرافه عن مسلك الصالحين من العلماء ، كان يحلق لحيته وشاربه ، توفى فى ٢٢/ جون (يونيه) سنة ١٩٥٩ ، ١٥/ ذى الحجة سنة ١٣٧٨ فى بومباى، وكان

مقيما هناك يتداوى من مرض السرطان .

عبدالرزاق ملیح آبادی، کلکتہ میں مختلف پرچوں کے بانی، ابوالکلام آزاد کے دوست، اور آخر میں دہلی میں ثقافۃ الہند کے بانی، مصر کا سفر کیا اور المنار کے بانی استاذ رشید رضا مصری کی صحبت پائی، متعدد کتابوں کا ترجمہ کیا، جن میں سے ایک "العلم والعلماء" ہے، دہلی وغیرہ میں بارہا مجھے ان سے ملنے کا اتفاق ہوا، مگر ان کی تجدد پسندی اور علماء صالحین کے مسلک سے ان کا انحراف مجھے پسند نہیں آیا، وہ ڈاڑھی مونچھ منڈواتے تھے۔ ۲۳؍جون ۱۹۵۹ء ۱۵؍ذی الحجہ ۱۳۷۸ھ کو بمبئی میں وفات پائی، وہاں وہ کینسر کے علاج کے لئے مقیم تھے۔

المفتي عبدالقادر الفرنجي محلي العالم الفاضل الورع، بقية علماء فرنجي محل ، كانت اليه الفتوى في عهده ، وكان يدرس ايضا في المدرسة النظامية بفرنجي محل، وكان من معارفي ، حضرت عنده مرات لمطالعة بعض الكتب الخطية الموجودة في مكتبة النظامية ، توفي رحمه الله في صفر سنة ١٣٧٩.

مفتی عبدالقادر فرنگی محلی، عالم وفاضل و پرہیزگار، فرنگی محل کے علماء کا بقیہ، ان کے عہد میں فتویٰ کا کام ان ہی کے ذمہ تھا، فرنگی محل کے مدرسہ نظامیہ میں درس بھی دیتے تھے، میرے جاننے والوں میں تھے، نظامیہ کے کتب خانہ میں موجود بعض مخطوطات کے مطالعہ کے لئے بارہا میں ان کے پاس حاضر ہوا، مرحوم نے صفر ۱۳۷۹ھ میں وفات پائی۔

الشيخ عمر البوى المدرس بمدرسة العلوم الشرعية بالمدينة المنورة ، لقيته هناك في سنة ١٣٧٢ھ وسمعته يقرئ صحيح البخاري، وتحدثت معه في بيت الشيخ محمود أخي مولانا حسين أحمد، ثم لما قدمت المدينة سنة ١٣٨٠ أخبروني أنه قد مات .

شیخ عمر البوی، مدرسۃ العلوم الشرعیہ مدینہ منورہ کے مدرس، میں نے ان سے وہیں ۱۳۷۲ھ میں ملاقات کی اور ان کو صحیح بخاری پڑھاتے ہوئے سنا، اور مولانا حسین احمد (مدنی)

کے بھائی شیخ محمود کے گھر میں ان سے گفتگو کی، پھر ۱۳۸۰ھ میں جب میں مدینہ پہنچا تو لوگوں نے بتایا کہ وہ انتقال کر چکے ہیں۔

مولانا عبد الرحیم دربھنگوی مہتمم مدرسہ امدادیہ حالاً و صدر المدرسین سابقاً، از ارشد تلامذۂ شیخ الہند بود، قدم مئو مرات و کان یحبنی و أحبه، مدتہا در امدادیہ درس داد، بسا فاضل بود، توفی فی ۱۳۸۰ھ۔

مولانا عبد الرحیم دربھنگوی مدرسہ امدادیہ کے موجودہ مہتمم اور سابق صدر مدرس، شیخ الہند کے ارشد تلامذہ میں تھے، مئو بارہا آئے، وہ مجھ سے اور میں ان سے محبت کرتا تھا، مدتوں مدرسہ امدادیہ میں درس دیا، بہت فاضل آدمی تھے، ۱۳۸۰ھ میں وفات پائی۔

مولانا الدکتور عبدالعلی بن عبدالحی ناظم ندوة العلماء بلکھنؤ کان هو ناظمها (مدیرها) بعد أبیه، وهو أخو العالم الصالح ابی الحسن علی الندوی، کان رحمه الله من الأتقیاء الأبرار، قرأ الحدیث فی دیوبند علی الشیخ محمود الحسن، ثم تمهّر فی الانکلیزیة وحصل شهادة الدکتوراه فی الطب، کانت بینی و بینه مودة، بلغنی خبر وفاته وأنا بمکة فی ذی الحجة سنة ۱۳۸۰

مولانا ڈاکٹر عبد العلی بن عبد الحی ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ، اپنے والد کے بعد ندوہ کے ناظم ہوئے، اور وہ عالم صالح ابو الحسن علی ندوی کے بھائی ہیں، مرحوم نیک و متقی لوگوں میں تھے، دیوبند میں مولانا محمود الحسن کے پاس حدیث پڑھی، پھر انگریزی میں مہارت پیدا کی اور ڈاکٹری کی ڈگری حاصل کی، ہم دونوں کے درمیان محبت کا تعلق تھا، ان کی وفات کی خبر مجھے ذی الحجہ ۱۳۸۰ھ میں اس حال میں ملی کہ میں مکہ میں تھا۔

عطاء الله شاه البخاری کان خطیبا مصقعا، رئیسا لمجلس الاحرار، سمعت خطبته وتحدثت معه، توفی بملتان (من الباکستان) فی ربیع الاول سنة ۱۳۸۱، وله اثنتان وسبعون سنة.

عطاء اللہ شاہ بخاری، زبان آور خطیب اور مجلس احرار کے صدر تھے، میں نے ان کی تقریر سنی اور ان سے گفتگو کی ہے، ملتان (پاکستان) میں ربیع الاول ۱۳۸۱ھ میں وفات پائی، وفات کے وقت ان کی عمر ۷۲ برس تھی۔

العلامة العارف بالله الشيخ عبدالشكور ابن ناظر على الكاكوروى ثم اللكنوى منشئى مجلة النجم الشهيرة، غيظ الروافض ومبتدعة الهند كان فى عصره حجةالاسلام حقا،الذى قام فى وجوه كفار الهنود، والقاديانية، والروافض وأهل البدعة من البريلويين بكفاح مجيد، وفاق فى ذلك أهل عصره، خليفة الشيخ أبى أحمد البوفالى فى الطريقة الأحمدية المجددية. (۱)

عارف باللہ حضرت علامہ عبدالشکور بن ناظر علی کاکوروی لکھنوی، مشہور رسالہ النجم کے بانی، ہندوستان کے شیعوں اور بدعتیوں کے لئے سراپا غیظ و غضب، اپنے وقت میں درحقیقت حجۃ الاسلام تھے، جنھوں نے ہندوستان کے کافروں، قادیانیوں، شیعوں اور بدعتیوں کے مقابلہ میں شاندار کارنامے انجام دیئے، اور اس میدان میں اپنے تمام معاصرین پر فائق رہے، مجددی احمدی سلسلے میں شیخ ابو احمد بھوپالی کے خلیفہ تھے۔

الشيخ العارف بالله الزاهد المنقطع الى الآخرة بالكلية الشاه عبدالقادر الرائفورى خليفة الشاه عبدالرحيم من أجل خلفاء الشيخ رشيد أحمد ، تشرفت بصحبته اول مرة فى المدينة المنورة سنة ۱۳۷۰، ثم حضرت مجلسه فى سهارن فور مراراً .كان مرجعا لأهل العلم و الفضل فى عصره ، لم يخلف بعده مثله ، توفى فى ربيع الاول سنة ۱۳۸۲ .

حضرت عارف باللہ، آخرت کی طرف پورے طور پر متوجہ، دنیا بیزار، شاہ عبدالقادر رائے پوری، شاہ عبدالرحیم، جو مولانا رشید احمد گنگوہی کے اجل خلفاء میں تھے، کے خلیفہ، ان کی

(۱) حضرت مولانا عبدالشکور لکھنوی کی تاریخ وفات ۱۷ ذی قعدہ ۱۳۸۱ھ (مطابق ۲۳ اپریل ۱۹۶۲ء) ہے، (دیکھئے پرانے چراغ ۲؍۲۲۴)۔

صحبت سے میں پہلی دفعہ مدینہ منورہ میں ۱۳۷۰ھ میں مشرف ہوا، پھر سہارن پور میں بارہا ان کی مجلس میں حاضر ہوا، اپنے زمانہ میں علماء و فضلاء کا مرجع تھے، اپنے بعد اپنا ہم مثل نہیں چھوڑا، ربیع الاول ۱۳۸۲ھ میں وفات پائی۔

الشيخ المسلّك الزاهد مولانا الشاه عبدالغني الأعظمي من كبار خلفاء الشيخ الكبير مولانا أشرف على التهانوى، مؤسس مدرسة بيت العلوم بسرائے مير- انتقل في آخر أمره إلى كراتشي وهناك توفى في اواخر ربيع الاول سنة ١٣٨٣، كانت بيني و بينه معرفة و إخاء.

راہ سلوک دکھانے والے زاہد حضرت مولانا شاہ عبدالغنی اعظمی، شیخ کبیر مولانا اشرف علی تھانوی کے بڑے خلفاء میں سے تھے، مدرسہ بیت العلوم سرائے میر کے بانی تھے، آخر میں کراچی منتقل ہو گئے تھے، اور وہیں ربیع الاول ۱۳۸۳ھ کے آخر میں وفات پائی، میرے اور ان کے درمیان شناسائی اور بھائی چارہ تھا۔

الشيخ عبدالرحمن بن يحيى المُعلمي اليماني امين مكتبة الحرم المكى حالاً، والمصحح بدائرة المعارف العثمانية (بحيدرآباد) سابقاً، كان أوحد عصره في أسماء الرجال، وسيع المعرفة بالمخطوطات في ذلك الفن وما يناسبه، جالسته بمكة مراراً في حجتين، وكان يرحب بي و يكرمني ويتحفني ببعض الكتب التى طبعت بتحقيقه، وقد قرظ لي على مسندالحميدى، كتب الىّ بوفاته صديقى الدكتور عبدالمعيد خان ناظم الدائرة في ربيع الثاني سنة ١٣٨٦، ولم أملك عيني حين وصلني ذلك الخبر المحزن.

شیخ عبدالرحمن بن یحییٰ معلّمی یمانی، حرم مکہ کے کتب خانہ کے موجودہ امین، اور دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدر آباد کے سابق مصحح، علم اسماء الرجال میں یکتائے زمانہ تھے، فن

رجال اور اس سے متعلق مخطوطات کا وسیع علم رکھتے تھے، میرے دو حج میں مکہ میں بارہا میری ان سے ہم نشینی رہی، مجھے خوش آمدید کہتے، میرا اکرام کرتے اور اپنی تحقیق سے چھپی ہوئی کچھ کتابیں ہدیہ کرتے، مسند حمیدی کی میری تحقیق پر انھوں نے تقریظ بھی لکھی، ان کی وفات کے بارے میں میرے دوست ڈاکٹر عبدالمعید خان ناظم دائرۃ المعارف نے ربیع الثانی ۱۳۶۸ھ میں خط لکھا، جب مجھے یہ رنج دہ خبر ملی تو میں اپنے آنسو نہ روک سکا۔

مولانا عبدالرحمن کاملپوری (کیمل پوری) تولی صدارة التدريس في مظاهر علوم سنين ، و بايع على يد شيخنا الشيخ أشرف على التهانوى وأجاز له الشيخ ، وأقام بعد التقسيم في الباكستان و توفى هناك فى سنة ١٣٨٦ ، وكان رحمه الله شيخا نير الشيبة، وطيئا وعالما متواضعا ، أطبق الناس على صلاحه و تقواه ، زرته مرة في سهارن فور.

مولانا عبدالرحمن کاملپوری (کیمل پوری) کئی سال مظاہر علوم (سہارنپور) میں صدارت تدریس کے منصب پر فائز رہے، ہمارے شیخ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کے مجاز بیعت تھے، تقسیم ہند کے بعد پاکستان میں مقیم ہو گئے تھے، اور وہیں ۱۳۸۶ھ میں وفات پائی، مرحوم روشن چہرہ ، خوبصورت اور متواضع عالم تھے، ان کی نیکی اور پرہیزگاری پر لوگوں کا اتفاق ہے، سہارن پور میں ایک دفعہ میری ان سے ملاقات ہوئی ہے۔

الشيخ مولانا عبدالله بن غلام محمد الزمزمي أصله من لاهور فيما أعلم ، قدم ابوه مكة في صغر سنه وتولاه بعض اهل مكة فاقام هناك، وتأهل فأنجب صديقنا هذاالصالح العالم الزاهد الجواد المفضال عبدالله ، أول زيارتي له في موسم سنة ١٣٦٩ ، وآخرها في موسم ١٣٨٤ ، كان يسكن أولا في خلوة من رباط أبي نمي بالقرب من باب إبراهيم ، وكان يدخل المسجد الحرام من باب العمرة ، وكانت خلوته الصغيرة مرجعاً للحجاج من أهل مئو وماليگاؤں وغيرهما، وكان العلماء الكبار من أمثال مولانامحمد طيب الديوبندى ، ومولانا

محمد یوسف البنوری ونحوهما یعتقدون فیه الصلاح و یزورونه فی خلوته، وکان کل من رآه أحبه و لازمه، واعتقد فیه الخیر، وکان رحمه الله یبالغ فی إکرامی ولا أعلم أحداً من الغرباء أحبنی مثل حبه، یشهد بذلك کل من رآنی معه، ولما بدئ بتوسیع المسجد الحرام فی زمن الملك سعود بن عبدالعزیز وهدم رباط أبی نمی انتقل إلی شارع المنصور، وبنی له محبوه هناك بیتین من الخشب، ذهب بی هناك مرة، وأضافنی وأصحابالی فی سنة ۱۳۸٤. وقد کان رحمه الله أمر بعض أصحابه أن یکتب الیّ یستدعی منی أن أحج فی موسم سنة ۱۳۸٦، فلم یمکننی حتی کتب الیّ السید حبیب الرحمن الغزنوی من أحمد آباد أنه توفی فی ثامن شوال (برویة اهل الهند) وعاشر شوال بحساب اهل الحجاز یوم الجمعة سنة ۱۳۸٦، طیب الله ثراه وجعل الجنة مثواه۔

حضرت مولانا عبداللہ بن غلام محمد زمزمی، میرے علم کے مطابق ان کا وطن اصلی لاہور تھا، ان کے والد اپنے بچپن میں مکہ چلے گئے تھے، جہاں مکہ کے کسی شخص نے ان کو اپنی نگرانی میں رکھ لیا اور وہ وہیں رہ پڑے اور شادی کرلی، جن سے ہمارے یہ نیکوکار و عالم و زاہد اور سخی و سیر چشم دوست عبداللہ پیدا ہوئے، میری ان سے پہلی ملاقات ۱۳۶۹ھ میں موسم حج میں ہوئی، اور آخری ملاقات ۱۳۸۴ھ کے موسم حج میں ہوئی، پہلے وہ باب ابراہیم کے قریب خانقاہ ابی نمی کے ایک خلوہ میں رہا کرتے تھے، اور مسجد حرام میں باب العمرۃ سے داخل ہوتے تھے، ان کا چھوٹا سا خلوہ مئو اور مالیگاؤں وغیرہ کے حاجیوں کا مرجع تھا، مولانا محمد طیب دیوبندی اور مولانا یوسف بنوری جیسے ہندوستان کے بڑے علماء ان کی پارسائی کے معتقد تھے، اور زیارت کے لئے ان کے خلوہ میں جایا کرتے تھے، جو شخص ان کو دیکھتا ان سے محبت کرتا، ان سے وابستہ ہو جاتا اور ان کی نیکی کا یقین کرتا، مرحوم میرا اکرام مبالغہ آمیز حد تک کرتے تھے، وطن سے باہر کے لوگوں میں میں نہیں سمجھتا کہ ان کے جیسی کسی نے مجھ سے محبت کی ہوگی، جس کی گواہی ہر وہ شخص دے گا جس نے مجھے ان کے ساتھ دیکھا ہوگا۔

شاہ سعود کے زمانے میں جب مسجد حرام کی توسیع شروع ہوئی اور خانقاہ ابی نمی کو منہدم کردیا گیا، تو مولانا نازمی شارع المنصور منتقل ہو گئے، جہاں ان کے عقید تمندوں نے لکڑی کے دو مکان تعمیر کئے، مجھے ایک دفعہ ۱۳۸۴ھ میں وہاں لے گئے اور میری اور میرے ساتھیوں کی ضیافت کی، مرحوم نے اپنے ایک ساتھی کو حکم دیا کہ وہ میرے پاس ۱۳۸۶ھ میں حج کرنے کے لئے خط لکھیں، لیکن یہ سفر میرے لئے ممکن نہ ہو سکا، یہاں تک کہ سید حبیب الرحمٰن غزنوی نے احمد آباد سے مجھے یہ خط لکھا کہ اہل ہند کی رویت سے آٹھ شوال اور اہل حجاز کی رویت سے ۱۰ر شوال ۱۳۸۶ھ کو جمعہ کے دن مولانا نازمی انتقال فرما گئے، اللہ ان کی قبر کو معطر فرمائے اور جنت کو ان کا ٹھکانہ بنائے۔

مولانا عبدالحليم الصديقي البوفالي ثم المليح آبادي من أعيان أعضاء جمعية العلماء المركزية، ومن الذين تفانوا في سبيل تحرير الهند، كان خطيبا مصقعا، وشاعراً مجيدا في العربية والأردوية، حافظا لكلام الله جيد الحفظ كأن القرآن على طرف لسانه، تولى التدريس في دارالعلوم (ندوة العلماء) والمدرسة العالية بكلكتا ، كان بيني و بينه صداقة أكيدة، توفي بمليح آباد مصابا بالفالج في ذي القعده سنة ۱۳۸۸

مولانا عبدالحلیم صدیقی بھوپالی ملیح آبادی، مرکزی جمعیۃ علماء کے بڑے ممبروں اور ان لوگوں میں تھے جو ہندوستان کی آزادی کی راہ میں فنا ہو گئے، فصیح و بلیغ مقرر اور عربی و اردو کے بہترین شاعر تھے، کلام اللہ کے اچھے حافظ تھے، قرآن کریم گویا ان کی نوک زبان پر رہتا تھا، دارالعلوم (ندوۃ العلماء) اور مدرسہ عالیہ کلکتہ میں تدریسی خدمت انجام دی، میرے اور ان کے درمیان گہری دوستی تھی، ذی قعدہ ۱۳۸۸ھ میں ملیح آباد میں فالج لگنے سے انتقال فرماگئے۔

مولانا عبدالحفیظ بن مولوی عبدالرحمٰن رسڑاوی از فضلائے دارالعلوم دیوبند بود، بایں حقیر اخلاص تمام داشت، مدتے در مصباح العلوم (بریلی) وزائد از بست سال در

دار العلوم (ندوہ) خدمت تدریس ادب عربی و صحیح مسلم وغیرہ انجام داد، از تصنیفات او مصباح اللغات (ترجمہ المنجد) در طلباء و مدرسین شہرت تمام دارد، بتاریخ ۲۳ر جمادی الآخرۃ ۱۳۹۱ بعارضہ فالج ازیں جہاں در گذشت در رسڑا سپرد خاک شدہ، من برائے تعزیت وزیارت قبر او رفتہ بودم، یکبار در حج رفیق من بود۔

مولانا عبد الحفیظ بن مولوی عبد الرحمٰن رسڑاوی (بلیاوی) دار العلوم دیوبند کے فاضل تھے، اس حقیر سے پورا اخلاص رکھتے تھے، ایک مدت تک مصباح العلوم (بریلی) اور بیس سال سے زیادہ دار العلوم ندوہ میں ادب عربی اور صحیح مسلم وغیرہ کی تدریس کی خدمت انجام دی، ان کی تصنیفات میں مصباح اللغات (ترجمہ المنجد) طلباء و مدرسین میں بڑی شہرت رکھتی ہے، ۲۳ر جمادی الآخرہ ۱۳۹۱ھ کو فالج کے مرض میں اس دنیا سے رخصت ہوئے، اور رسڑا میں سپرد خاک ہوئے، میں ان کی تعزیت اور قبر کی زیارت کے لئے گیا تھا، ایک بار حج میں میرے رفیق سفر تھے۔

الشيخ علوى بن عباس المالكي المدرس بالحرم الشريف المكي ،

استمعت لدرسه ولم أجلس في الحلقة، فوجدته ذا عارضة قوية، ومنطق فصيح في أول قدمة قدمتها مكة، ثم زرته في بيته في سنة ١٩٦٥م فأكرمني وأتحفني ببعض تاليفاته، ثم زرته ثانيا في سنة ١٩٧١م وزارني في تلك السنة في بيت الشيخ النمنكاني بالمدينة المنورة مع الشيخ حسن المشاط وولده محمد ، فبالغ في إكرامي و قبل جبيني و حثني على إنجاز طبع المصنف لعبدالرزاق، وكنت اذ ذاك أشرف على طبعه ، وأصحح ملازمه في بيروت.

وبينما كنت أتهيأ للخروج إلى بيروت ثانيا إذ وصل الي عن طريق الجرائد نبأ وفاته في أحد شهور سنة ١٣٩١ھ فرحمه الله وغفر له ،

وكان رحمه الله من المروءة والوفاء بمكان ، بشوشا، دائم البشر، عالماً مكينا ، يحب العلم و أهله ، يتزيا بزى أهل الصلاح ويسلك مسلك أهل

التقوى ، خلفه ولده محمد فى التدريس بالحرم، وقد استجاز منى فأجزته حين اجتمع بى فى بومباى.

شیخ علوی بن عباس مالکی، حرم مکہ میں مدرس، پہلی بار جب میں مکہ حاضر ہوا تو ان کے حلقۂ درس میں بیٹھے بغیر ان کا درس سنا، تو میں نے ان کو قوت بیان اور فصیح گفتگو والا پایا، پھر ۱۹۶۵ء میں ان کے گھر پر میں نے ان سے ملاقات کی تو انھوں نے میرا اکرام کیا اور اپنی بعض کتابیں مجھے ہدیہ کیں، پھر ۱۹۷۱ء میں دوبارہ ان سے ملا، اور اسی سال مدینہ منورہ میں شیخ نمنکانی کے گھر پر شیخ حسن مشاط اور اپنے صاحبزادہ محمد کے ساتھ انھوں نے مجھ سے ملاقات کی، اس وقت انھوں نے مبالغہ آمیز حد تک میرا اکرام کیا اور میری پیشانی کو بوسہ دیا، اور مصنف عبدالرزاق کی طباعت کی تکمیل پر مجھے ابھارا، حالانکہ اس وقت میں بیروت میں اس کی طباعت کی نگرانی اور اس کے فرسوں کی تصحیح کر رہا تھا۔

جس وقت میں بیروت کے دوسرے سفر کی تیاری کر رہا تھا کہ اخبارات کے ذریعہ ۱۳۹۱ھ کے کسی مہینہ میں ان کی وفات کی مجھے خبر ملی، اللہ ان کے اوپر اپنی رحمت و مغفرت فرمائے۔

مرحوم مروءت ووفاداری کے بلند مقام پر فائز تھے۔ ہنس مکھ، کشادہ رو اور ٹھوس علم کے حامل تھے، علم واہل علم سے محبت کرتے تھے، اہل صلاح کا لباس زیب تن کرتے اور اہل تقویٰ کے راستے پر گامزن تھے۔ حرم میں تدریس کے اندر ان کے لڑکے محمد ان کے جانشین ہوئے، جس وقت وہ بمبئی میں مجھ سے ملے تو انھوں نے مجھ سے اجازت طلب کی تو میں نے ان کو اجازت دے دی۔

مولانا عبداللطیف نعمانی امام گنجی كان رفيقى فى أيام الطلب، و زميلى فى تدريس العلوم ،وصاحبى فى السفر والحضر، و عضدى فى الذب عن الحنفية، و شريكى فى الرد على أهل البدعة، وكان مجدا فى الإفادة جامعا للمعقول والمنقول ، له مشاركة حسنة فى عدة فنون ، وقد تدخل فى السياسة العصرية،

وانتخب ركنا لمجلس التشريع النيابي، وتصدر في بلدية مئو مرتين ، درس في سنبل شهرين ، وقضى سائر أيامه في مئو، درس أولا في دارالعلوم ، ثم درس الى آخر حياته في مفتاح العلوم ، وجمع له الصدارة والنظامة حين لم يبق في المدرسة إلا هو ، ومات فجأة في آخر ذی القعدة من سنة ۱۳۹۲ھ في غرفته التي كان يبيت بها في المدرسة، ودفن من الغد في ناحية منها ، وقد صلى عليه الجم الغفير، قلما يتفق مثله إلا للواحد بعدالواحد ، وكنت إذ ذاك في كلكتا ، فتلفنوا الىّ ، وقد انقضى ميعاد الطائرة المسافرة الى بنارس ، فلم أصل إلا في ثاني يوم من دفنه۔

مولانا عبداللطیف نعمانی امام گنجی، زمانہ طالب علمی میں میرے دوست، درس وتدریس میں میرے ہمدم، سفر وحضر میں میرے ساتھی، حنفیت کے دفاع میں میرے دست وبازو اور اہل بدعت کے رد میں میرے ساتھ شریک رہے ہیں، نفع رسانی میں کوشاں اور معقولات ومنقولات کے جامع تھے، مختلف فنون میں انھیں دستگاہ حاصل تھی، سیاست میں بھی دخیل تھے ۔ اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے اور دو دفعہ مئو میونسپلٹی کے چیئرمین ہوئے، سنبھل میں دو مہینے خدمت تدریس انجام دی، اور اس کے علاوہ باقی پوری زندگی مئو میں گذاری، آغاز میں دارالعلوم مئو میں پڑھایا، پھر آخر عمر تک مفتاح العلوم میں درس دیتے رہے ،ان کے حصے میں مدرسہ کی صدارت ونظامت دونوں عہدے اس وقت جمع ہوئے جب اس کے اندر ان کے علاوہ اور کوئی نہیں رہ گیا تھا، ذی قعدہ ۱۳۹۲ھ کی آخری تاریخ کو اچانک مدرسہ کے اپنے اس کمرہ میں انتقال کر گئے جس میں رات کو رہا کرتے تھے، اور اگلے دن اسی کے ایک گوشے میں دفن کیے گئے، ان کے جنازہ کی نماز اتنے بڑے مجمع نے ادا کی جو خال خال ہی کسی کی نماز جنازہ میں ہوتا ہے، اس وقت میں کلکتہ میں تھا، لوگوں نے مجھے ٹیلیفون کیا، لیکن بنارس جانے والے جہاز کا وقت گذر چکا تھا اس لئے ان کے دفن کے دوسرے دن سے پہلے میں مئو نہ پہنچ سکا۔

مولانا عبدالصمد رحمانی خلیفہ مولانا محمد علی مونگیری، و تلمیذ مولانا محمد سجاد امیر شریعت بہار، بماہ ربیع الآخر ۱۳۹۳ھ رہگرائے عالم جاودانی شد، درمیان ماواو رابطۂ مودت قوی بود۔

مولانا عبدالصمد رحمانی، مولانا محمد علی مونگیری کے خلیفہ اور مولانا محمد سجاد امیر شریعت بہار کے شاگرد ماہ ربیع الآخر ۱۳۹۳ھ میں عالم جاودانی کو سدھارے، میرے اور ان کے درمیان دوستی کا تعلق مضبوط تھا۔

مولانا عبدالسلام لکھنوی خلف ارشد مولانا عبدالشکور فاروقی مدیر النجم، نخستیں بار کہ من اورا دیدہ بودم درامروہہ پیش والد بزرگوار خود (غالباً) قطبی میخواند، باز چوں نسبت اخلاص و عقیدت باپدر اواستوار کردم، واوازمدرسہ دیوبند فارغ التحصیل شد، اکثر درمسائل علمیہ بامن مذاکرہ می کرد، وبغایت اکرام می نمود، وقتیکہ من رکن مجلس قانون ساز بودم، در دارالمبلغین طرح اقامت انداختہ بودم لاجرم ہر صبح وشام اتفاق صحبت می افتاد، بر مسائل اختلافیہ شیعہ وسنت اورا عبور تام حاصل بود، چندے در گورکھپور باز تادم آخر در دارالمبلغین بہ درس وتدریس پرداخت، او وقاری محمد صدیق مرحوم در نصرۃ اہل سنت کفرسی رہان بودند، درشب پانزدہم رجب (۱۳۹۳ھ) ازیں جہاں درگذشت، مولوی منظور نعمانی غسل داد، در لکھنؤ بہ پہلوئے والد بزرگوار خود جایافت، رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ۔

مولانا عبدالسلام لکھنوی، مولانا عبدالشکور فاروقی مدیر النجم کے خلف ارشد، پہلی بار جب میں نے ان کو دیکھا تھا تو وہ امروہہ میں اپنے والد بزرگوار کے پاس (غالباً) قطبی پڑھ رہے تھے، پھر جب ان کے والد بزرگوار کے ساتھ میں نے اخلاص و عقیدت کی نسبت قائم کی، اور وہ دارالعلوم دیوبند سے فارغ التحصیل ہوئے، تو اکثر علمی مسائل میں میرے ساتھ مذاکرہ کرتے رہتے، اور حد درجہ اکرام کرتے تھے، جس وقت میں مجلس قانون ساز کا رکن تھا، اور دارالمبلغین میں طرح اقامت ڈالے ہوئے تھا، تو بے شبہ ہر صبح وشام ملاقات کا اتفاق ہوتا، شیعہ وسنت کے اختلافی مسائل پر ان کو پورا عبور حاصل تھا، کچھ دنوں گورکھپور میں

پھر آخر وقت تک دارالمبلغین میں درس وتدریس کی خدمت انجام دی، وہ اور قاری محمد صدیق مرحوم اہل سنت کی نصرت وحمایت کے میدان کے شہسوار تھے پندرہ رجب (۱۳۹۳ھ) کی شب میں اس جہاں سے رخصت ہوئے، مولوی منظور نعمانی نے غسل دیا اور لکھنؤ میں اپنے والد بزرگوار کے پہلو میں جگہ پائی، اللہ تعالیٰ ان پر اپنی بے پایاں رحمت نازل فرمائے۔

علال فاسی نعت لنا الجرائد المحلية نبأ وفاة العالم الكبير الشيخ علال الفاسي، وكان من أعضاء المجلس التاسيسي لرابطة العالم الاسلامي، وقد استمعت الى محاضرته فى مقر الرابطة فى موسم الحج عام ۱۳۹۳، ووافانا نعيه فى جمادى الاولىٰ سنة ۱۳۹۴.

علال فاسی، مقامی اخبارات نے عالم کبیر شیخ علال فاسی کی موت کی خبر سنائی، مرحوم رابطہ عالم اسلامی کی فاؤنڈیشن کمیٹی کے ارکان میں سے تھے، ۱۳۹۳ھ کے موسم حج میں رابطہ کے دفتر میں میں نے ان کا لیکچر سنا تھا، اور جمادی الاولیٰ ۱۳۹۴ھ میں ہمیں ان کی وفات کی خبر ملی۔

مولوی عبداللہ شائق پسر اسماعیل (میر صاحب) ساکن قاسم پورہ مئو تلمیذ مولانا حافظ عبداللہ غازی پوری، و مولانا احمد پسر مولانا حسام الدین مئوی بود، مدتے در مدرسہ فیض عام مئو خدمت تدریس انجام داد، باز بسبب اختلاف فیما بین او و مولوی احمد بن عبدالغنی ناظم مدرسہ علاحدگی اختیار نمود، و مدرسۂ دیگر بنام دارالحدیث در محلہ باغیچہ بنیاد نہاد، در آخرہا بسبب امراض ترک اشتغال نمود، از مدت دو سال صاحب فراش بود، بروز جمعہ ۱۳؍ دسمبر ۱۹۷۴ء (۲۸؍ ذی قعدہ ۱۳۹۴ھ) ازیں جہاں در گذشت، من بسفر بودم، چوں بوطن مالوف باز آمدم ایں خبر وحشت اثر شنیدم، او رد رسالہ اعلام مرفوعہ (تالیف حقیر) نوشتہ بنام آثار متبوعہ موسوم کردہ بود، من بجواب او ازہار مربوعہ نوشتہ شائع کردم۔

مولوی عبداللہ پسر اسماعیل (میر صاحب) ساکن قاسم پورہ مئو، مولانا حافظ

عبداللہ غازی پوری اور مولانا احمد پسر مولانا حسام الدین مئوی کے شاگرد، ایک مدت تک مدرسہ فیض عام مئو میں تدریسی خدمت انجام دی، پھر ان کے اور ناظم مدرسہ مولوی احمد بن عبدالغنی کے درمیان اختلاف کی وجہ سے علیحدگی اختیار کرلی، اور دارالحدیث کے نام سے محلہ باغیچہ میں ایک دوسرے مدرسہ کی بنیاد رکھی، آخر عمر میں امراض کے سبب تدریسی مشغلہ چھوڑ دیا تھا، دو سال سے صاحب فراش تھے، ۱۳؍ دسمبر ۱۹۷۴ء (۲۸؍ ذی قعدہ ۱۳۹۴ھ) کو جمعہ کے دن اس جہاں سے کوچ کیا، میں سفر میں تھا، جب واپس وطن پہنچا تو یہ وحشت اثر خبر سننے میں آئی، انھوں نے میرے رسالہ اعلام مرفوعہ کا رد آثار متبوعہ کے نام سے لکھا تھا، میں نے اس کا جواب ازہار مربوعہ کے نام سے لکھ کر شائع کیا۔

(ف)

مولانا فخر الدین احمد مراد آبادی شیخ الحدیث دار العلوم دیوبند، وصدر جمعیۃ علمائے ہند، از مشاہیر علماء ہندوستان بود، نسبت تلمذ با شیخ الہند مولانا محمود حسن و حضرت شاہ انور کشمیری می داشت، مدتہا در مراد آباد و باز در دیوبند درس حدیث داد، بار اول کہ حج کردم ما واو در باخرہ ہم سفر بودیم، در ۱۳۹۲ھ بمراد آباد ازیں جہاں در گذشت، رحمہ اللہ۔

مولانا فخر الدین احمد مراد آبادی دار العلوم دیوبند کے شیخ الحدیث اور جمعیۃ علماء ہند کے صدر ہندوستان کے مشہور علماء میں تھے، شیخ الہند مولانا محمود حسن اور حضرت شاہ انور کشمیری کے شاگرد تھے، مدتوں مراد آباد میں اور پھر دیوبند میں حدیث کا درس دیا، پہلی بار میں نے حج کیا تو میں اور وہ جہاز میں ساتھ تھے، ۱۳۹۲ھ میں مراد آباد میں سفر آخرت فرمایا، اللہ ان پر رحمت کا سایہ فرمائے۔

مولانا محمد تقی بن مولانا ناظر حسن الدیوبندی تخرج من دار العلوم (بدیوبند) واشتغل بالتدریس فی بیت العلوم بمالیگاؤں زماناً، وفی مدرسۃ ڈابھیل یسیراً، وفی آخر عمرہ شغل منصب الإدارۃ (النظامۃ) فی مدرسۃ شاہی بمرادآباد،

وفی اثناء ذلك انتقل الی رحمة الله ، وکان جیدالاستعداد، وجیها، ملازما للتقوی، وکان من زملائی فی الحج سنة ۱۳۷۱، توفی فی ربیع الآخر سنة ۱۳۶۱ (۱) ودفن فی دیوبند.

مولانا محمد نقی بن مولانا ناظر حسن دیوبندی، دارالعلوم دیوبند سے فارغ ہوئے اور ایک زمانہ تک مالیگاؤں میں اور کچھ عرصہ تک ڈابھیل میں تدریسی خدمت انجام دی، آخر عمر میں مدرسہ شاہی مراد آباد کا عہدۂ نظامت سنبھالا، اور اسی منصب پر برقرار رہتے ہوئے انتقال بھی کیا، جید الاستعداد، صاحب وجاہت اور پرہیزگار تھے، ۱۳۷۱ھ کے حج میں میرے ساتھ تھے، ربیع الآخر ۱۳۶۱ (۱) میں وفات پائی، اور دیوبند میں مدفون ہوئے۔

مولانا مناظر احسن الگیلانی (گیلانی من قری بهار) کان من افاضل خریجی دارالعلوم (بدیوبند) ومن مشاهیر الکتاب والمصنفین ، آخر تصانیفه " سوانح قاسمی " أقام أکثر من عشرین عاماً أستاذا فی الجامعة العثمانیة (بحیدر آباد الدکن) ثم غادر إلی وطنه ولم یلبث أن مرض ، ودام مرضه أعواماً حتی توفی سنة ۱۳۷۵ فی ۲۵ شوال . کنت أعرفه وکان یعرفنی ولکن لم یتفق لی زیارته.

مولانا مناظر احسن گیلانی (گیلانی بہار کا ایک گاؤں ہے) دارالعلوم دیوبند کے بڑے صاحب فضل فضلاء اور مشہور انشاء پردازوں اور مصنفوں میں تھے، ان کی آخری کتاب "سوانح قاسمی" ہے، بیس برس سے زیادہ عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد میں استاد کی حیثیت سے رہے، پھر اپنے وطن چلے گئے، اور جلد ہی بیمار پڑ گئے، بیماری کا سلسلہ کئی سال تک رہا، یہاں تک کہ ۲۵ر شوال ۱۳۷۵ھ کو وفات پاگئے، ہم دونوں ایک دوسرے کو جانتے تھے، لیکن میری ان سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔

---

(۱) بیاض میں اسی طرح ہے، سبقت قلم ہونا ظاہر ہے۔ آپ کی وفات ۱۳۸۱ھ مطابق ۱۸ ستمبر ۱۹۶۱ء کو ہوئی۔

مولانا الحاج محمد بن موسی میاں السملکی الإفریقی تلمذ على الشيخ أنور الكشميری وتخرج عنده ولازمه مدة، واهتدی بهديه، أسس المجلس العلمي بڈابهيل ، الذی انتقل بعد التقسيم الی کراتشی، وأنفق أموالا طائلة لطبع نصب الراية، وفيض الباری، ورسائل شيخه الكشميری، ومسند الحميدی، وعزم على نشر مصنف عبدالرزاق ، والمجلد الثالث من سنن سعيد بن منصور، وکان يبر کثيراً من العلماء ،وله صدقات جارية.

توفی فی جوهانسبرك من افريقيا الجنوبية، فی ۲۱/ ذی القعده سنة ۱۳۸۲ (۱٦- ابريل سنة ۱۹٦٤) (۱) کانت بينی و بينه مودة أکيدة

مولانا الحاج محمد بن موسیٰ میاں سملکی افریقی، حضرت انور شاہ کشمیری کے شاگرد تھے، انھیں کے پاس فراغت پائی اور مدت تک ان سے وابستہ رہے، اور ان کے نقش قدم پر چلتے رہے، ڈابھیل میں مجلس علمی قائم کی، جو تقسیم کے بعد کراچی منتقل ہو گئی، نصب الرایہ فیض الباری، اپنے شیخ علامہ کشمیری کے رسائل اور مسند حمیدی کی طباعت میں کافی دولت خرچ کی، مصنف عبدالرزاق اور سنن سعید بن منصور کی تیسری جلد کی طباعت کا عزم کیا، بہت سے علماء کے ساتھ بھلائی کا برتاؤ کرتے تھے، یہ چیزیں ان کے لئے صدقۂ جاریہ ہیں۔

جنوبی افریقہ کے شہر جوہانسبرگ میں ۲۱/ ذی قعدہ ۱۳۸۲ھ (۱۶/ اپریل ۱۹۶۴) کو وفات پائی،[1] ہمارے درمیان بڑی گہری دوستی تھی۔

مولانا محفوظ الرحمن نامی الرسراوی ثم البهرائچی مکث عندی فی مئو يتعلم اعواما ، وتخرج من دارالعلوم (بديوبند)،أسس مدرسة بهرائچ سماها نور العلوم، وألف مؤلفات وبذل مجهوده فی نشر اللغة العربية و تيسير فهم القرآن ، أصيب بالفالج فلزم الفراش قريباً من ستة أعوام ،

(۱) ۱۹۶۴ء سبقت قلم ہے، صحیح ۱۹۶۳ء ہے، جیسا کہ علامہ اعظمیؒ کے خطوط سے پتہ چلتا ہے۔

ثم توفی فی رجب سنة ۱۳۸۳ .

مولانا محفوظ الرحمٰن نامی رسڑاوی بہرائچی، میرے پاس مئو میں کئی سال رہ کر تعلیم حاصل کرتے رہے، اور دارالعلوم دیوبند سے فارغ ہوئے۔ بہرائچ میں نورالعلوم کے نام سے ایک مدرسہ قائم کیا، کئی ایک کتابیں لکھیں اور عربی زبان کی اشاعت اور فہم قرآن کو آسان بنانے کے لئے کوشش صرف کی، ان کو فالج لگ گیا تھا جس کی وجہ سے ۶/سال کے قریب صاحب فراش رہے، پھر رجب ۱۳۸۳ھ میں وفات پاگئے۔

الشیخ محب الدین الخطیب المصری صاحب جریدة الفتح وناشرالعواصم و القواصم ومختصر منهاج السنة، وصاحب التعلیقات النفیسة علیها ، وکان سنیا قحا لم یتاثر بدسائس الروافض، توفی الی رحمة الله فی اوائل ذی القعده سنة ۱۳۸۹ .

شیخ محب الدین خطیب مصری، اخبار "الفتح" کے مالک، اور العواصم من القواصم اور مختصر منهاج السنة کے ناشر جن پر ان کی عمدہ تعلیقات بھی ہیں، خالص سنی تھے اور روافض کی دسیسہ کاریوں سے متاثر نہیں ہوئے۔ ذی قعدہ ۱۳۸۹ھ کے شروع میں اپنے رب کے حضور پہنچ گئے۔

محمد الحسنی بن الدکتور عبدالعلی صنو الشیخ ابی الحسن علی الندوی کان وحید أبیه ، وکان فیه خلف عن الشیخ ابی الحسن کاتب بلیغ ، غیور علی الاسلام ، ینبض بدم کله غیرة علی الاسلام ، وقلمه السیال یفیض بما فی قلبه، کان رحمه الله من خیرة الشباب، وکان یحبنی فی الله، توفی فی ۰۰۰ سنة ۱۳۷۹ (۱) فی لکهنؤ، ودفن بجوار آبائه فی رائے بریلی .

محمد حسنی مولانا ابوالحسن علی ندوی کے بھائی ڈاکٹر عبدالعلی کے لڑکے، اپنے باپ کے اکلوتے تھے، ان کے اندر مولانا ابوالحسن (علی میاں) کی جانشینی کی صلاحیت تھی، فصیح و

(۱) یہ سبقت قلم ہے، ان کا سال وفات ۱۹۷۹ء ۱۳/جون، مطابق ۱۳۹۹ھ ہے۔

بلیغ انشاء پرداز، اسلام کے تئیں غیرت مند، ان کا دل اسلام کے لئے سراپا غیرت تھا، اوران کا رواں دواں قلم ان کے دل کی ترجمانی کرتا تھا، مرحوم بہترین نوجوانوں میں تھے، اور مجھ سے اللہ کے لئے محبت کرتے تھے۔ ۱۹۷۹ء میں لکھنؤ میں وفات پائی، اور رائے بریلی میں اپنے آباء واجداد کے جوار میں دفن کئے گئے۔

(ن)

الشیخ محمد نصیف أحد العلماء المشهورين من أهل جدة ، كان بيته محط رحال الأفاضل، وكان مولعا بكتب السنة ونشرها، لا ينتمي الى أحد من الأئمة ويتدين بذلك ، وكان يغلو في ذلك غلو أشباهه من العصريين، عفا الله عنه وعنا، وكان يصطنع المعروف الى من يسلك مسلكه من السلفيين ، وقد زرته في بيته في شوال سنة ۱۳۹۰، وأتحفني بعدة كتب، وبالغ في إكرامي، انتقل الى رحمة الله في جمادى الآخرة سنة ۱۳۹۱، كتب اليّ بذلك ولدي من بومباى.

شیخ محمد نصیف جدہ کے مشہور علماء میں سے ایک تھے، ان کا گھر ارباب فضل کے لئے جائے قیام تھا، وہ کتب حدیث اوران کی نشرواشاعت کے دلدادہ تھے، کسی ایک امام کی طرف منسوب نہیں تھے اور نہ ہی کسی امام کے مسلک کے پیروکار تھے، اور اس سلسلے میں اپنے ہم مثل معاصرین کی طرح غلو برتتے تھے، اللہ تعالیٰ ان کو اور ہم سب کو معاف فرمائیں۔ سلفیوں میں جو ان کے مسلک پر چلتا تھا اس کے ساتھ بھلائی کا برتاؤ کرتے تھے، شوال ۱۳۹۰ھ میں میں نے ان کے دولت کدہ پر ان سے ملاقات کی، انھوں نے مجھے کئی کتابیں تحفہ میں دیں، اور میرا مبالغہ آمیز حد تک اکرام کیا، جمادی الآخرۃ ۱۳۹۱ھ میں انتقال فرماگئے، اس کی خبر مجھے میرے لڑکے نے بمبئی سے دی۔

☆☆☆☆

(و)

حضرت مولانا شاہ وصی اللہ فتحپوری از خلفائے حضرت مرشدنا حکیم الامت تھانوی بود، زاد بوم او فتحپور تال نرجا کہ از مئو ہشت یا نہ میل دوز جانب شمال واقع است، در ۱۳۳۷ھ از دارالعلوم دیوبند سند فراغ یافت، وبعد فراغ بدامن دولت پیر مرشد ناوابستہ گردید، مدتہا در خانقاہ امدادیہ اقامت کردو فیضہائے فراواں برد، باز بفتحپور آمدہ پائے عزلت شکست، ابتداءً بغایت عسرت زندگی بسر می برد، چندے در مبارک پور وسالہا در کانپور بتدریس قیام نمود، وآخرہا باز بخانۂ خود منزوی شدہ بارشاد طالبین واصلاح او شاں مشغول گشت، در چند سال چناں حسن قبول یافت کہ طالبین اصلاح از مسافتہائے دور دراز رخت سفر بسوئے فتحپور بستند وداخل حلقۂ او شدند، وازانجاکہ در مزاج شریف وے حدت بود بارے از اہل فتحپور چناں رنجید کہ تاب اقامت نداشت ودر کوپا گنج منتقل گردید، بارے دیگر در گورکھپور بخانۂ مولوی ثناء اللہ اقامت گزید، وبعد چندے ازانجا بالہ آباد منتقل شدہ، وہمانجا مستقلا طرح اقامت انداخت، حویلیٔ بزرگ ویک قطعہ زمین خرید کرد۔

باز برائے تبدیل آب وہوا بہ بمبئی رفت، وایں سفر او بسیار مبارک وسود مند افتاد، بسیارے از تجار بمبئی راہ ہدایت یافتند، در کرلا بخانۂ یکے از متمولان بمبئی اقامت می کرد، وہمانجا نیز یک قطعہ زمین خریدہ بود کہ دراں عمارت خانقاہ ومسجد خواہد کرد، در ۱۳۸۷ھ شوق زیارت حرمین غالب آمد، وبتاریخ نوزدہم شعبان ۱۳۸۷ھ باخرۂ مظفری روانۂ حجاز شد، ایں فقیر بہ تقریب مشایعت وتودیع او در جہاز باو ملاقات کرد ودو ساعت ہمانجا ماند ووقت رخصت تادیر معانقہ کرد، وحضرت شیخ از غایت محبت وشفقت سر ودست فقیر را بوسہ دادند، ویک شیشی عطر عود ہدیہ نمودند، فقیر ہماں روز از بمبئی روانہ شد وبروز جمعہ وارد مئو گردید، وبروز شنبہ بساعت ہشتم بعد مغرب ایں خبر رسید کہ مولانا در جہاز جان بجان آفریں سپردند، ایں خبر بذریعۂ ٹیلیگرام از بمبئی آمدہ بود، مپرس کہ ازیں خبر برمن چہ گذشت، بعد ازیں بذریعہ اخبارات معلوم شد کہ بسحر ۲۵؍ شعبان بعد از نماز تہجد بحق واصل شدند،

دوراں لحہ کسے دیگر حاضر نبود، چوں خادم چائے آورد، دید کہ روح از قفس عنصر پرواز کردہ است، رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ۔

پس بہ تحقیق رسید کہ بتاریخ ۲۴؍ شعبان بعد نماز مغرب بمرض فالج مبتلا شدند، ہیچ تدبیر وعلاج سودمند نیفتاد، ہماں شب بوقت ساعت دوازدہم روح از قفس عنصری پرواز نمود، خواستہ شدہ بود کہ در مکہ یا مدینہ تدفین سرانجام پذیرد لیکن نزدیک جدہ رسیدہ جثۂ مبارکہ وے سپرد آب دریائے شور کردہ شد۔

حضرت مولانا شاہ وصی اللہ فتحپوری، مرشدنا حکیم الامت حضرت تھانوی کے خلفاء میں سے تھے، ان کی جائے پیدائش فتحپور تال نرجا ہے جو کہ مئو سے آٹھ نو میل دور شمال کی طرف واقع ہے، ۱۳۴۳ھ میں دارالعلوم دیوبند سے سند فراغ پائی، فراغت کے بعد ہمارے پیرومرشد (حضرت تھانوی) کے دامن دولت سے وابستہ ہوگئے، مدتوں خانقاہ امدادیہ میں مقیم رہے اور خوب خوب فیض اٹھایا، پھر فتحپور آکر عزلت گزیں ہوگئے، شروع میں نہایت تنگی کی زندگی بسر کرتے تھے، کچھ عرصہ مبارکپور میں اور برسوں کانپور میں درس وتدریس کا کام کیا، اور بالآخر پھر اپنے گھر پر گوشہ نشین ہوکر طالبین ومریدین کے ارشاد واصلاح میں مشغول ہوگئے، چند سال میں اس قدر حسن قبول حاصل ہوا کہ اصلاح کے طالبوں نے دور دراز علاقوں سے فتحپور کے لیے رخت سفر باندھا، اور ان کے حلقے میں داخل ہوئے، چونکہ آپ کے مزاج شریف میں حدت تھی اس لئے ایک بار اہل فتحپور سے اس قدر رنجیدہ ہوئے کہ وہاں اقامت کی تاب نہ رہی اور کوپا گنج منتقل ہوگئے، دوسری بار گورکھپور میں مولوی ثناء اللہ کے گھر پر اقامت گزیں ہوئے، اور کچھ ہی مدت بعد وہاں سے الہ آباد منتقل ہوگئے اور وہاں مستقل طرح اقامت ڈالی اور ایک بڑی حویلی اور ایک قطعہ زمین خریدا۔

پھر آب وہوا کی تبدیلی کے لئے بمبئی گئے، آپ کا یہ سفر بہت مبارک اور سودمند ثابت ہوا، اور بمبئی کے بہت سے تاجروں نے راہ ہدایت پائی، کرلا میں بمبئی کے ایک

مالدار آدمی کے گھر قیام فرمایا، اور وہیں ایک قطعہ زمین خرید لیا کہ اس میں خانقاہ اور مسجد کی عمارت تعمیر کرنا چاہتے تھے، ۱۳۸۷ھ میں حرمین کی زیارت کا شوق غالب آیا، اور ۱۹؍ شعبان ۱۳۸۷ھ کو مظفری جہاز سے حجاز کے لئے روانہ ہوئے، یہ ناچیز ان کی مشایعت اور رخصت کرنے کی غرض سے جہاز میں ان سے ملاقات کرنے گیا، اور دو گھنٹے وہاں رہا، اور رخصت کے وقت دیر تک معانقہ کیا، حضرت شیخ نے اپنی حد درجہ محبت و شفقت کی وجہ سے ناچیز کے سر اور ہاتھ کا بوسہ دیا، اور عطر عود کی ایک شیشی ہدیہ کی، ناچیز اسی دن بمبئی سے روانہ ہوا، اور جمعہ کے دن مئو وارد ہوا، سنیچر کے دن مغرب کے بعد آٹھ بجے یہ خبر پہنچی کہ مولانا نے جہاز میں جان جان آفریں کے سپرد کر دی، یہ خبر بمبئی سے بذریعہ ٹیلی گرام موصول ہوئی تھی، مت پوچھو کہ اس خبر سے مجھ پر کیا گذری، اس کے بعد اخبارات سے معلوم ہوا کہ ۲۵؍ شعبان کو سحر کے وقت نماز تہجد سے فراغت کے بعد واصل بحق ہوئے، اس وقت کوئی دوسرا شخص حاضر خدمت نہیں تھا، جب خادم چائے لایا تو دیکھا کہ روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی ہے اللہ تعالیٰ ان پر اپنی بے پایاں رحمت کا سایہ فرمائیں۔

پھر تحقیق سے یہ خبر ملی کہ ۲۴؍ شعبان کو نماز مغرب کے بعد فالج کے مرض میں مبتلا ہوئے، کوئی تدبیر و علاج سود مند نہیں ہوا، اور اسی رات بارہ بجے روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی، یہ چاہا گیا کہ مکہ یا مدینہ میں تدفین انجام پائے، لیکن جدہ کے قریب پہنچ کر جسد مبارک سمندر کے سپرد کر دیا گیا۔

(ی)

العالم الكبير الشيخ محمد يوسف البنوري من أرشد تلامذة شيخنا محمد أنور الكشميري، صاحب معارف السنن في ستة أجزاء، ونفحة العنبر في هدى الشيخ أنور، وغير ذلك، كان نابغة عصره في فقه الحديث، ولما انتقل من الهند (بهارت) الى باكستان الغربي أسس في كراتشي مدرسة

هائلة ، كان يكثر من الحج والزيارة لا يفوته ذلك إلا نادراً ،و لا تفوته زيارتي إذا شهدت الموسم ، إما في مكة ، وإما في المدينة، وقد رافقته مرة من المدينة الى مكة ، وكان يحبني من صميم قلبه ويلحّ عليّ أن أنتقل في مدرسته ، كتب اليّ طالب من ديوبند في أول ذي قعده سنة ١٣٩٧ أن الشيخ يوسف جاء نعيه في ديوبند اليوم .

عالم کبیر شیخ محمد یوسف بنوری، ہمارے استاذ حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیری کے ارشد شاگردوں میں سے ایک، معارف السنن ۶/ جلد اور نفحۃ العنبر فی ہدی الشیخ انور وغیرہ کتابوں کے مصنف، فقہ حدیث میں یکتائے زمانہ تھے۔جب ہندوستان سے مغربی پاکستان ہجرت کر گئے تو کراچی میں ایک زبردست مدرسہ قائم کیا، حج وزیارت کثرت سے کرتے تھے،اور شاذونادر ہی کبھی فوت ہوتا تھا،اور جب میں حج میں حاضر ہوتا تو ایسا نہ ہوتا کہ مکہ یا مدینہ میں کہیں مجھ سے ملاقات نہ ہو،ایک دفعہ مدینہ سے مکہ تک میرا ان کا ساتھ بھی رہا، مجھ سے دل کی گہرائی سے محبت کرتے تھے،اور اپنے مدرسے میں منتقل ہوجانے کے لئے مجھ سے اصرار کرتے، دیوبند سے ایک طالب علم نے یکم ذی قعدہ ۱۳۹۷ھ کو میرے پاس ایک خط لکھا کہ شیخ یوسف کی موت کی خبر آج دیوبند پہنچی۔

علامہ اعظمی نے فرمایا:

تعلیمات اسلام سے مسلمانوں کی بے خبری کا یہ منظر بھی کس قدر روح فرسا ہے، کہ ان کے سامنے جو کوئی بھی اہل علم کا بھیس بدل کر آجائے،اور تعلیمات اسلام کو وہ جتنا بھی بدنما بنا کر مسخ شدہ صورت میں چاہے پیش کرے،ان کو خبر نہیں ہوسکتی.....۔

المآثر ج ا ش ۲ ص ۱۴

آثارِ قلم
مضامین و مقالات، کتب و رسائل
اور تحقیقات و تعلیقات
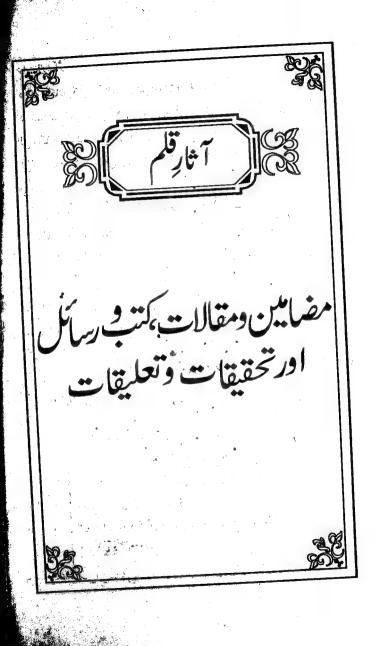
آثار قلم

کسی صاحب علم و تصنیف کے لئے بہت بڑا سانحہ یہ ہوتا ہے کہ اس کا علمی یا تصنیفی سرمایہ کسی حادثہ کا شکار اور اس کا بیش قیمت اثاثہ ضائع ہو جائے۔ علامہ اعظمیؒ کو اپنی زندگی میں اس قسم کے دو شدید حادثوں سے دوچار ہونا پڑا تھا، آپ اپنے علمی ذخیرے، کتابوں اور مسودات و مخطوطات کی اپنے محدود وسائل کے لحاظ سے حفاظت کی بھرپور کوشش کیا کرتے تھے، لیکن کبھی یہ وسائل ان کی حفاظت کے لئے ناکافی ثابت ہوتے، چنانچہ محفوظ رکھنے کے لئے لکڑی کے ایک صندوق میں آپ نے بہت سی چیزیں اٹھا رکھی تھیں، مگر اس کے بعد بہت دنوں تک ان کی دیکھ بھال کی نوبت نہیں آئی، ایک مدت کے بعد جب اس کو کھول کر دیکھا تو اس میں جو کچھ تھا سب دیمک کی خوراک بن چکا تھا۔ دوسرا حادثہ یہ ہوا کہ ایک الماری میں کسی طرح چنگاری لگ گئی، جس سے بہت ساری چیزیں سلگ کر ختم ہو گئیں، انا للہ وانا الیہ راجعون! یہ دونوں حادثے آپ کے لئے نہایت تکلیف دہ تھے، اور اس کی وجہ سے کئی دنوں تک شدید درد و کرب میں مبتلا رہے۔ اس میں خدا جانے کیا کچھ ضائع ہوا ہوگا، قیاس یہ ہے کہ اس میں مسودات و مخطوطات کے علاوہ آپ کے فتووں کا ذخیرہ بھی تھا۔

دستبرد زمانہ کے ہاتھوں سے جو چیزیں محفوظ رہ گئیں، اپنی بساط کے بقدر ہم نے ان کی تلاش و جستجو کی تاکہ قارئین کے سامنے ان کی ایک فہرست پیش کر دی جائے، چنانچہ آپ کے مسودات اور مختلف رسائل و مجلات میں تلاش و تفتیش کے بعد آپ کے مضامین اور تصانیف و تحقیقات کی جو فہرست تیار ہوئی، الگ الگ ہدیۂ ناظرین ہے۔ ان میں سے جو مضامین یا کتابیں کسی رسالہ اور مجلہ میں ملیں، ان کے سامنے ان کا نام اور سن اشاعت ذکر کر دیا گیا ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ اس کا افسوس بھی ہے کہ ان رسالوں اور مجلوں کے دیگر

بہت سے شمارے ہمیں مل نہیں سکے، ورنہ ممکن ہے درج فہرست مضامین کے علاوہ بھی بہت کچھ ملا ہوتا۔

اس فہرست میں بہت سے مضامین ورسائل ایسے ہیں جن کا صرف نام ذکر ہے، اس کے علاوہ اور کچھ مذکور نہیں، ان میں کچھ تو ایسے ہیں جو آپ کے باقیات صالحات میں آج بھی موجود ہیں، لیکن ان کی اشاعت کے بارے میں ہم کو علم نہیں کہ کبھی وہ شائع ہوئے ہیں یا نہیں، اور دیگر وہ ہیں جن کا مسودہ موجود نہیں، لیکن آپ کے ہاتھ کی بنائی ہوئی کچھ تصنیفات یا مضامین کی فہرست میں ان کا نام مذکور ہے، جس کی بنیاد پر ان کو اس فہرست میں شامل کر دیا گیا ہے۔

اس سلسلے میں ایک اور ضروری عرض یہ ہے کہ مقالات ومضامین کبھی تو آپ اپنے مشہور نام (حبیب الرحمٰن الاعظمی) سے لکھتے، کبھی کسی دوسرے قلمی نام سے شائع کراتے مثلاً شوق اعظمی اور ابوالمآثر الاعظمی وغیرہ۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

مقالات ومضامین

۱۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی نہیں ہو سکتا۔

۲۔ ابراہیم بن ادہم (الفرقان اپریل ۱۹۷۹ء مطابق جمادی الاولیٰ ۱۳۹۹ھ میں "سیرت ابراہیم ابن ادہم اوران کے مدفن کی تحقیق" کے عنوان سے شائع ہوا ہے)

۳۔ ابو عبید کی غریب الحدیث (معارف اکتوبر ۱۹۶۷ء)

۴۔ احمدیوں کی ذلت وخواری پر محمدیوں کی بیقراری (العدل ۲۹/اپریل و۱۷/مئی ۱۹۲۷ء)

۵۔ اخبار محمدی کے بعض مضامین پر ریویو (الفقیہ ۲۸/اپریل ۱۹۲۵ء)

۶۔ ارسال الصحیفہ کارد

۷۔ استدراک بر فضل اللہ الصمد

۸۔ اسلام اور صنف نازک (المومن کلکتہ میں صفر، ربیع الثانی اور جمادی الاولیٰ ۱۳۴۳ھ میں شائع ہوا)

۹۔ اسلامی پرسنل لاء میں باب کفو (المآثر ج ۸ ش ا۔ محرم، صفر، ربیع الاول ۱۴۲۰ھ)

۱۰۔ امام اعظم اور خطیب بغدادی

۱۱۔ امام شافعی کے دوسفرنامے

۱۲۔ انتشارات انجمن ادبی سندھی

۱۳۔ انتقاد صحیح پر تجلی کا تبصرہ پڑھ کر

۱۴۔ اوزان ومثاقیل

۱۵۔ "اہل حدیث" اوراس کے ہمنواؤں کی خوش فہمی

۱۶۔ "اہل حدیث" کی چیرہ دستیاں

۱۷۔ ایڈیٹر اخبار "محمدی" کا شرانگیز مشغلہ، مذہب حنفی پر ناپاک حملہ (القاسم امرتسر میں ۳۱/جنوری و۲۸/فروری ۱۹۲۵ء کو شائع ہوا)

۱۸۔ ایڈیٹر "اہل حدیث" کی منطق دانی

۱۹۔ بحث اجماع

۲۰۔ بحث نسخ

۲۱۔ بحر رمل اور بحر سریع

۲۲۔ بسلسلہ "قافلۂ اہل دل" (الفرقان دسمبر ۱۹۷۴ء)

۲۳۔ (بیمہ) مولوی تقی امینی کے مضمون پر تبصرہ (المآثر ج ۳ ش ۲۔ ربیع الاول، جمادی الاولی، جمادی الاخری ۱۴۱۵ھ بعنوان "لائف انشورنس")

۲۴۔ پورب کی چند برگزیدہ ہستیاں (معارف اکتوبر و نومبر ۱۹۵۴ء)

۲۵۔ پیٹ پر پتھر باندھنے کی حدیث

۲۶۔ تاج التراجم فی تفسیر القرآن للاعاجم

۲۷۔ تاریخ اہل حدیث پر ایک نظر

۲۸۔ تبصرہ بر تصحیح الاغلاط الکتابیہ (الفرقان شعبان ۱۳۷۱ھ)

۲۹۔ تبصرہ بر حقیقت الفقہ

۳۰۔ تبصرہ بر زجاجۃ المصابیح (الفرقان محرم ۱۳۷۰ھ)

۳۱۔ تحقیق حکم الطلقات الثلاث

۳۲۔ تحقیقات مفیدہ (الفرقان سالنامہ ۱۳۵۵ھ)

۳۳۔ تخریج زیلعی (معارف جولائی ۱۹۴۰ء، الفرقان رجب ۱۳۵۹ھ، المآثر ج اش ۱ محرم، صفر، ربیع الاول ۱۴۱۳ھ)

۳۴۔ تردید اہل قرآن

۳۵۔ تردید سرسید

۳۶۔ تشبہ بالکفار سے نہی کی حکمت

۳۷۔ تصحیح واستدراک بسلسلۂ پورب کی چند برگزیدہ ہستیاں (معارف جنوری ۱۹۵۵ء، دارالعلوم مئی جون ۱۹۶۲ء)

۳۸۔ تطہیر المتجسین بجواب "تکفیر المبتدعین"

۳۹۔ تعاقب بر فتویٰ مفتی محمود حسن

۴۰۔ تقبیل ابہامین (المآثر ج۳ ش ۴۔ شوال، ذیقعدہ، ذی الحجہ ۱۴۱۵ء)
۴۱۔ تقلید اور غیر مقلدیت، ایک اہم بحث (المآثر ج۶ ش ۲۔ ربیع الآخر، جمادی الاولی، جمادی الاخری ۱۴۱۸ھ)
۴۲۔ جمع قرآن
۴۳۔ جواد ساباط (معارف اپریل ۱۹۲۸ء)
۴۴۔ چند مسائل فقہیہ پر شبہات اور ان کا ازالہ
۴۵۔ چہ دلاور ست دزدیکہ بکف چراغ دارد
۴۶۔ حجیت حدیث (القاسم ۱۱ر اپریل و ۱۰ر مئی ۱۹۲۴ء)
۴۷۔ حسن ادب اور اسکی اہمیت یا الہدیۃ السنیۃ لطلاب المدرسۃ الدینیۃ (دار العلوم شعبان ۱۳۷۱ھ، ذیقعدہ و ذی الحجہ ۱۴۱۰ھ، المآثر ج ۳ ش ۱۔ محرم، صفر، ربیع الاول ۱۴۱۵ھ)
۴۸۔ حضرت امام اہلسنت رحمۃ اللہ علیہ (المآثر ج ۷ ش ۳۔ رجب، شعبان، رمضان ۱۴۱۹ھ)
۴۹۔ حضرت معاویہ کی شان میں سوء ادبی اور اس کا جواب (النجم جمادی الاولی والآخرۃ ۱۳۴۹ھ۔ المآثر ا ش ۲ و ۴ بعنوان حضرت امیر معاویہؓ کا مرتبہ و مقام)
۵۰۔ حضرت معاویہ کے متعلق ایک سوال کا جواب
۵۱۔ حقیقۃ الفقہ کی ایک فصل
۵۲۔ حنفیہ کرام اور اتباع حدیث (القاسم ۱۰ر فروری و ۲۵ر فروری ۱۹۲۴ء)
۵۳۔ حیات شیخ عبد الحق محدث دہلوی (برہان مارچ و اپریل ۱۹۵۴ء)
۵۴۔ حیات مبارکہ کے تین دور (الجمعیۃ شیخ الاسلام نمبر)
۵۵۔ خدا نور ہے۔
۵۶۔ خطیب بغدادی کی شرف اصحاب الحدیث اور محمد جونا گڈھی
۵۷۔ الدرایۃ فی تخریج احادیث الہدایۃ کا نادر نسخہ (معارف اگست ۱۹۵۰ء)
۵۸۔ دفاع حنفیت

۵۹۔ دلائل فرضیت جمعہ
۶۰۔ دو متبرک اجازت نامے (معارف دسمبر ۱۹۳۷ء)
۶۱۔ دینور اور مشائخ دینور (معارف اکتوبر ۱۹۶۵ء)
۶۲۔ الذخائر والتحف کس کی تصنیف ہے؟ (معارف فروری ۱۹۶۱ء)
۶۳۔ "رجال بخاری" کا دندان شکن جواب (الداعی رجب و شعبان ۱۳۶۰ھ)
۶۴۔ رسالہ اثبات تقلید
۶۵۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تبلیغی زندگی
۶۶۔ رکعات التراویح
۶۷۔ رمضان میں تہجد باجماعت
۶۸۔ رویت ہلال
۶۹۔ زراعت و جاگیرداری
۷۰۔ سید الشہداء کی تحقیق (المآثر ج ۲ ش ۲۔ ربیع الآخر، جمادی الاولیٰ، جمادی الاخریٰ ۱۴۱۶ھ)
۷۱۔ سیرۃ النبی شبلی پر ایک نظر
۷۲۔ السیف الباتر
۷۳۔ سیف و قلم (دارالعلوم اپریل ۱۹۵۷ء)
۷۴۔ صحابہ کے مختصر تذکرے
۷۵۔ عباسی کا رد قاضی اطہر کے قلم سے
۷۶۔ عدد رکعات تراویح (القاسم ۲۵ مئی و ۱۰ جون ۱۹۲۴ء)
۷۷۔ عظمت صحابہ، خواجہ حسن نظامی کے باطل خیالات کی تردید (العدل ۸ اکتوبر ۱۹۲۸)
۷۸۔ علم رجال کی اہمیت
۷۹۔ علم و فضل میں خواتین کا حصہ

۸۰۔ "عہد زریں" پر تبصرہ
۸۱۔ غریب الحدیث (معارف فروری ۱۹۶۸ء)
۸۲۔ غیر مقلدوں کے اشتہار کا جواب
۸۳۔ فتوحات حضرت معاویہ تاریخ کی روشنی میں (دارالعلوم اپریل ۱۹۶۵ء)
۸۴۔ فقہ نبوی کے نوٹ
۸۵۔ فہرست مخطوطات عربیہ پنجاب یونیورسٹی لاہور (معارف اپریل ۱۹۷۹ء)
۸۶۔ فی التنفل بعد الوتر
۸۷۔ قادیانی مرتد کی سنگساری مولوی ثناء اللہ کی غمگساری (القاسم ۱۰ر نومبر ۱۹۲۴ء)
۸۸۔ قاضی اطہر مبارکپوری کی کتاب رجال السند والہند پر ایک نظر
۸۹۔ قتل مرتد
۹۰۔ قرون اولیٰ میں حفظ حدیث کا اہتمام (البلاغ جون ۱۹۵۴ء، دارالعلوم مارچ ۱۹۵۹ء)
۹۱۔ قیامت کے دن پہلا سوال
۹۲۔ کھلی چٹھی بنام ایڈیٹر محمدی (ارشاد ۱۵ر اکتوبر ۱۹۲۷ء)
۹۳۔ مبارق الازھار کس کی تصنیف ہے؟ (معارف جنوری ۱۹۵۴ء)
۹۴۔ مثالب ابی حنیفہ کی تنقید
۹۵۔ محدثین پر سلطنت کی ہواخواہی کا الزام (دارالعلوم محرم وصفر ۱۳۶۱ھ)
۹۶۔ مذہب حنفی کی عالمگیر مقبولیت (ارشاد یکم مئی ۱۹۲۷ء)
۹۷۔ مسافت قصر
۹۸۔ مسئلۂ اطاعت امیر اسوۂ حسین کی روشنی میں (ضیاء الاسلام ۲۲ر فروری ۱۹۳۹ء)
۹۹۔ مسئلۂ تفویض اور ایک وکیل کا دخل در معقولات (ضیاء الاسلام ۱۹۳۹ء ۶ قسطوں میں)
۱۰۰۔ مسئلہ طلاق پر شبہات اور ان کا ازالہ (القاسم ۲۵ر اپریل ۱۹۲۴ء)
۱۰۱۔ مسلم پرسنل لاء یا اسلامی شریعت (البلاغ مئی ۱۹۷۲ء)

۱۰۲۔ مصنف عبدالرزاق کی کتاب الجامع؟ یا جامع معمر؟ (الفرقان جون وجولائی ۱۹۸۳ء)

۱۰۳۔ مضمون خلفاء شاہ غلام علی پر کچھ اضافہ

۱۰۴۔ مقامات تصوف پر تبصرہ و تنقید

۱۰۵۔ مناقب اعظمیہ

۱۰۶۔ موضوعات القصاص (دار العلوم ربیع الاول ۱۳۶۱ھ)

۱۰۷۔ مولانا عبدالرحمٰن جامی اوران کا سفر حج (الفرقان اکتوبر و نومبر ۱۹۷۷ء، البلاغ جنوری ۱۹۷۸ء)

۱۰۸۔ مولوی سامرودی کے سوالات کا مسکت جواب

۱۰۹۔ نسخ کوئی معیوب چیز نہیں

۱۱۰۔ واعتصموا بحبل اللہ (القاسم ۲۵/اگست و ۱۰/ستمبر ۱۹۲۴ء)

۱۱۱۔ واقعہ قفال کی تردید

۱۱۲۔ وما أرسلناك إلا رحمة للعالمين یا شان رحمۃ للعالمین (ارشاد یکم مئی ۱۹۲۷ء، المآثر ج ۸ ش ا۔ محرم، صفر، ربیع الاول ۱۴۲۰ھ)

۱۱۳۔ ہندوستان میں علوم حدیث کی تالیفات (برہان فروری ۱۹۵۴ء)

۱۱۴۔ ہندوستان میں علم حدیث اور قاضی اطہر

۱۱۵۔ تذکرہ مشاہیر قوم (المومن شوال، ذیقعدہ اور ربیع الثانی ۱۳۴۳ھ میں شائع ہوا)

۱۱۶۔ رمضان کا چاند

۱۱۷۔ علمائے اہل کمال (المومن جمادی الاولیٰ والاخریٰ اور رجب ۱۳۴۳ھ میں شائع ہوا)

۱۱۸۔ معجزات و کرامات (الفیض امرتسر میں ربیع الاول، جمادی الاولیٰ، جمادی الثانیہ اور رجب ۱۳۴۳ھ میں شائع ہوا)

علامہ اعظمی نے فرمایا:

کیمونزم ہو یا کوئی دوسرا ازم اسلامی زندگی سے آنکھ ملانے کی تاب قیامت تک نہیں لا سکتا اس کا تار و پود کیا بکھیرے گا۔
المآثر ج ۳ ش ۲ ص ۱۳

کتب ورسائل

۱۔ ابطالِ عزاداری (الداعی۔ جمادی الآخرہ، رجب، شعبان ورمضان ۱۳۶۱ھ)

۲۔ احکام النذر لاولیاء اللہ و تفسیر ما اھل بہ لغیر اللہ (الفرقان۔ شوال وذیقعدہ ۱۳۵۸ھ)

۳۔ ارشاد الثقلین (الداعی۔ رمضان، شوال، ذیقعدہ وذی الحجہ ۱۳۵۹ھ)

۴۔ الازہار المربوعۃ (دوحصوں میں ہے، ایک حصہ بہت پہلے چھپا تھا)

۵۔ الاعلام المرفوعۃ فی حکم الطلقات المجموعہ (اس کا کچھ حصہ العدل جون وجولائی ۱۹۳۴ء کے چار شماروں میں بھی شائع ہوا)

۶۔ اعیان الحجاج۔ حصہ اول ۱۹۵۸ء، حصہ دوم ۱۳۹۶ھ

۷۔ انساب وکفاءت کی شرعی حیثیت۔ طبع اول ۱۹۹۹ء

۸۔ اہل دل کی دلآویز باتیں۔ ۱۳۶۰ھ معارف پریس اعظم گڈھ

۹۔ بناءِ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا

۱۰۔ تحقیق اہل حدیث۔ طبع اول اکبر پریس الہ آباد ۱۹۴۳ء، طبع دوم ۱۹۹۹ء

۱۱۔ تذکرۂ علماء (ناتمام)

۱۲۔ ترجمہ کتاب الترغیب والترھیب

۱۳۔ تعزیہ داری ودیگر مراسم عزاداری سنی نقطۂ نظر سے (الفرقان۔ ربیع الاول والآخر وجمادی الاولیٰ ۱۳۶۱ھ)

۱۴۔ التنقید السدید علی التفسیر الجدید یا ابراز الغی من تفسیر عبدالحی (النجم ذی قعدہ ۱۳۴۹ھ)

۱۵۔ تنبیہ الکاذبین بجواب تنبیہ الناصبین (النجم ج ۱۱ ش ۱، ۵ و۶۔ ۱۳۵۲ھ)

۱۶۔ الحجج القویہ علی حرمۃ سجدۃ التحیہ

۱۷۔ دار الاسلام و دار الحرب

۱۸۔ دست کار اہل شرف۔ ۱۴۰۶ھ مطابق ۱۹۸۵ء حسن پریس مئو اعظم گڈھ

۱۹۔ دفع الجادلہ۔ عمدۃ المطابع لکھنؤ

۲۰۔ دنیا میں پارچہ بافی کے مراکز

۲۱۔ دیوبندیوں سے چند سوالات کا جواب (العدل۔ ۲۴ اگست، ۲۸ راگست و ۷ ر ستمبر ۱۹۳۲ء)

۲۲۔ رد" رجال بخاری" (یہ کتاب المآثر میں قسط وار شائع ہوئی ہے)

۲۳۔ رکعات تراویح۔ طبع اول ۱۳۷۷ھ م ۱۹۵۷ء، طبع دوم ۱۳۸۲ھ ۱۹۶۳ء، طبع سوم ۱۳۸۳ھ م ۱۹۶۳ء، طبع چہارم ۱۴۰۸ھ م ۱۹۸۸ء

۲۴۔ رکعات تراویح ذیل ۱۳۷۹ھ مطابق ۱۹۶۰ء مطبوعہ تنویر پریس لکھنؤ

۲۵۔ الروض المجود فی تقدیم الرکبتین عند السجود

۲۶۔ رہبر حجاج۔ اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہوئے،

۲۷۔ السیر الحثیث الی تنقید تاریخ اہل الحدیث

۲۸۔ سیرۃ طحاوی

۲۹۔ شارع حقیقی (الفرقان۔ جمادی الاولی و الثانیہ، رجب، ذیقعدہ و ذی الحجہ ۱۳۵۷ھ)

۳۰۔ شہید کربلا کا رد

۳۱۔ عظمت صحابہ (المآثر میں قسط وار شائع ہو رہی ہے)

۳۲۔ قاضی نامہ بجواب جولاہہ نامہ

۳۳۔ کشف المعضلات (الفقیہ۔ ۲۰ فروری، ۵ مارچ، ۱۵ اپریل و ۲۰ اپریل ۱۹۲۴ء)

۳۴۔ لغات حدیث۔ اردو (ناتمام)

۳۵۔ مسئلۂ تقلید

۳۶۔ مفتاح النحو

۳۷۔ مقدمۂ معارف الحدیث۔ ۱۳۷۳ھ ۱۹۵۴ء

۳۸۔ مولوی ثناءاللہ اور بحث تقلید

۳۹۔ نصرۃ الحدیث۔ طبع اول ۱۳۵۳ھ م ۱۹۳۴ء، طبع دوم ۱۳۶۰ھ ۱۹۴۰ء، طبع سوم
(اس کی تین قسطیں العدل اگست و ستمبر ۱۹۳۴ء کے شماروں میں بھی شائع ہوئیں)

۴۰۔ ترجمہ موطا امام مالک

عربی تصنیفات

۱۔ الإتحافات السنية بذكر محدثی الحنفية

۲۔ الألبانی شذوذه وأخطاؤه
پہلی بار مالیگاؤں اور دوبارہ کویت سے ۱۴۰۴ھ مطابق ۱۹۸۴ء میں شائع ہوئی۔

۳۔ تجريد شواهد أوضح المسالك (عربی)

۴۔ تذكرة ادباء الهند

۵۔ التوصية بأسرار التسمية

۶۔ الجنائز (الموسوعة الفقهية)

۷۔ الحاوی لرجال الطحاوی

عربی

۱. الامام الربانی عبدالله بن المبارک (البعث الإسلامی شعبان رمضان شوال۱۳۸۶دیسمبر ۱۹۶۶)

۲. کتاب الجامع لعبدالرزاق الصنعانی (البعث رجب ۱۴۰۵ھ مارس اپریل۱۹۸۵)

۳. حجة لاینساها التاریخ (البعث رجب ۱۳۷۵ مارچ ۱۹۵۶)

۴. حول السنن الرواتب (دعوة الحق محرم ۱۳۸۷ مایو سنة ۱۹۶۷)

۵. الربانیة : اصل الدین و سمة المسلمین (البعث ذوالحجة ۱۳۸۶محرم ۱۳۸۷ھ اپریل مایو ۱۹۶۷م

۶. السید مرتضی الزبیدی هندی لا یحوم حوله شك (البعث ربیع الثانی۱۳۹۶ھ اپریل ۱۹۷۶

۷. فی المیزان (ما تمس الیه الحاجة) (البعث ذو الحجة ۱۳۷۵ء اغسطس ۱۹۵۶)

۸. مسندالإمام أحمد (البعث رجب ۱۳۷۸ینایر ۱۹۵۹)

۹. مسندالإمام الحمیدی (البعث رمضان ،شول ذوالقعده ۱۳۷۹ مارچ ، اپریل مایو ۱۹۶۰)

۱۰. کتاب نسب قریش للزبیر بن بکار (الحج جمادی الاولی ۱۳۸۳ھ اکتوبر ۱۹۶۳ البعث جمادی الاولی ۱۳۸۳ھ اکتوبر ۱۹۶۳م)

تحقیقات و تعلیقات

	کتاب	مصنف	طابع	ناشر
۱۔	انتقاء الترغیب والترهیب	ابن حجر العسقلانی متوفی ۸۵۲ھ	علمی پریس مالیگاؤں	مجلس احیاء المعارف مالیگاؤں ۱۳۸۰ھ ۱۹۶۰ء
۲۔	تلخیص خواتم جامع الأصول	محمد طاہر پٹنی	//	محمد نوروبی
۳۔	کتاب الثقات	عمر بن أحمد بن شاہین	غیر مطبوع	
۴۔	کتاب الزهد والرقائق	عبداللہ بن المبارک متوفی ۱۸۱ھ	علمی پریس مالیگاؤں	مجلس احیاء المعارف ۱۳۸۵ھ ۱۹۶۶ء
۵۔	کتاب السنن۔ ۲ جلدیں	سعید بن منصور متوفی ۲۲۷ھ	//	مجلس علمی ڈابھیل ۱۳۸۷ھ ۱۹۶۷ء
۶۔	فتح المغیث	شمس الدین سخاوی متوفی ۹۰۲ھ	اعظمی پریس مئو	محمد سلطان النمنکانی (مدینہ منورہ)
۷۔	کشف الأستار عن زوائد مسند البزار۔ ۴ جلدیں	نورالدین ہیثمی متوفی ۸۰۷ھ	موسسة الرسالة دمشق	۱۳۹۹ھ ۱۹۷۹ء
۸۔	مجمع بحار الأنوار۔ ۵ جلدیں	محمد طاہر پٹنی	مطبعة مجلس دائرة المعارف النعمانية	۱۳۸۶ھ تا ۱۳۹۵ھ
۹۔	مسند الحمیدی۔ ۲ جلدیں	ابو بکر عبداللہ بن الزبیر الحمیدی متوفی ۲۱۹ھ	مطبعة لجنة نشر العلوم الاسلامية۔ حیدرآباد	مجلس علمی ڈابھیل ۱۳۸۲ھ ۱۹۶۳ء
۱۰۔	المصنف۔ ۱۱ جلدیں	عبدالرزاق الصنعانی متوفی ۲۱۱ھ	دارالقلم۔ بیروت	مجلس علمی ڈابھیل ۱۳۹۰ھ ۱۹۷۰ء
۱۱۔	المصنف [1] ۱۵ جلدیں	ابو بکر بن ابی شیبہ متوفی ۲۳۵ھ	مطابع الرشید مدینہ منورہ	المکتبة الإمدادیة مکة المکرمة ۱۴۰۳ھ ۱۹۸۳ء

(۱) علامہ اعظمی نے اس کتاب کی تقریباً بارہ جلدوں پر کام کیا ہے، لیکن ابھی تک چار ہی جلدیں چھپ سکی ہیں۔

۱۲۔ المطالب العالیۃ بزوائد المسانید الثمانیۃ ۔ ۴ جلدیں	ابن حجر العسقلانی متوفی ۸۵۲ھ	المطبعۃ العصریۃ کویت ۱۳۹۰ھ ۱۹۷۰ء	وزارۃ الاوقاف و الشئون الاسلامیۃ۔ کویت
۱۳۔ التذئیل العجیب علی نہایۃ الغریب	جلال الدین السیوطی	غیر مطبوع	
۱۴۔ مسند اسحاق بن راھویہ	اسحاق بن راھویہ	غیر مطبوع	
۱۵۔ مسند الامام ابی محمد الحارث بن ابی اسامۃ	حارث بن ابی اسامہ	غیر مطبوع	
۱۶۔ نزھۃ الالباب فی الالقاب	ابن حجر عسقلانی	غیر مطبوع	

مندرجہ بالا تحقیقات کے علاوہ اور بھی بہت سی کتابوں کی تحقیق و اشاعت آپ کی کاوشوں کی مرہون منت رہی ہے، جن کی ایک اجمالی فہرست یہ ہے:

۱۷۔ استدراک بر شرح مسند احمد

مسند امام احمد بن حنبل کی پندرہویں جلد میں پچاس صفحات میں بکھرے ہوئے ہیں۔

۱۸۔ اسرار المحبۃ شاہ رفیع الدین دہلوی متوفی ۱۲۳۳ھ اشرف پریس لاہور۔ ادارہ نشرواشاعت مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ ۱۳۳۸ھ

۱۹۔ تکمیل الاذھان " "

۲۰۔ تعلیقات الحافظ قاسم بن قطلوبغا علی الدرایۃ۔

منیۃ الالمعی کے ساتھ ۱۳۶۹ھ مطابق ۱۹۵۰ء میں مصر سے شائع ہوئی۔

۲۱۔ جزء عمرات النبی صلی اللہ علیہ وسلم

حضرت مولانا زکریا صاحبؒ کی تصنیف "حجۃ الوداع و عمرات النبی ﷺ" چھپی تو اس میں حجۃ الوداع کا خطبہ شامل نہیں تھا، علامہ اعظمی کی توجہ سے یہ بعد کے ایڈیشن میں شائع ہوا۔

۲۲۔ حواشی بر مقدمہ ابن الصلاح (۱)

۲۳۔ حیاۃ الصحابہ (عربی) حضرت مولانا محمد یوسف کاندھلوی۔

مولانا محمد الیاس بارہ بنکوی نے اس کی تحقیق کی ہے، اور علامہ اعظمی نے اس پر نظر ثانی فرمائی ہے، لیکن آپ کی تصحیحات و تحقیقات اس کثرت سے ہیں کہ مستقل تحقیق کا درجہ رکھتی ہے۔ مطبعہ ملت دودھ پور علی گڈھ سے چھپ چکی ہے۔

۲۴۔ دمغ الباطل شاہ رفیع الدین دہلوی نفیس پرنٹرز لاہور مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ ۱۹۷۶ء

۲۵۔ رسالۃ الاوائل شیخ محمد سعید بن سنبل

علامہ اعظمی کی نظر ثانی اور تصحیح کے بعد اعظمی پریس مئو سے شائع ہوا۔

(۱) مقدمہ ابن الصلاح پر انتہائی مختصر حواشی شیخ عبدالشکور عبدالفتاح فدا کی طلب پر تحریر فرمائے تھے، لیکن افسوس کہ وہ اب تک شائع نہ ہو سکے۔

☆☆☆

علامہ اعظمی نے فرمایا:

مولانا! تقلیداً نہیں، بلکہ اپنی بساط کے مطابق از روئے تحقیق میرا یہ عقیدہ ہے کہ پہلی اور دوسری صدی سے لے کر گیارہویں اور بارہویں صدی تک کے فقہائے اسلام نے اسلامی تعلیمات و مسائل کے جو مقاصد و مناحی سمجھے ہیں، وہی صحیح ہیں، ظاہر ہے کہ میں اسی تحقیق کی روشنی میں مشورے دے سکتا ہوں، اس کے خلاف جو کوئی مجھے کچھ سمجھانا چاہے، تو حق تعالیٰ کے فضل و کرم اور آپ بزرگوں کی دعا سے اس ہیچمداں کے پاس ایسے مواد موجود ہیں، کہ میں ان حضرات کا بہت مبسوط رد کر سکتا ہوں، والحمد للہ۔۔۔

(مکتوب علامہ اعظمی بنام مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مورخہ ۱۹ مئی ۱۹۶۴ء)

اشکِ غم

ماتم یہ زمانے میں بپا تیرے لئے ہے
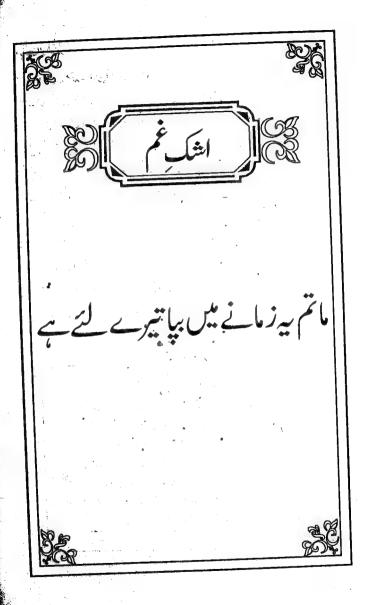
بہ یاد عالم بے بدل، محدث جلیل
علامہ حبیب الرحمٰن الاعظمی نور اللہ مرقدہ

پروفیسر حفیظ بنارسی

علم حدیث پاک کا دیوانہ چل بسا
جس کا ہر اک سخن تھا حکیمانہ چل بسا
محفل میں اب وہ گرمیٔ محفل نہیں رہی
نازاں تھی جس پہ شمع وہ پروانہ چل بسا
دشت عجم سے تا بہ عرب جس کی دھوم تھی
اعتبار گلشن و ویرانہ چل بسا
عرفان و آگہی کا پیاسی نہیں رہا
رقصاں تھا جس سے علم کا پیمانہ چل بسا
جس کی ہر اک نظر میں بھری تھی مئے طہور
واحسرتا! پیر قدح خانہ چل بسا
شاہنشہ علوم ، فقیہ گہر فشاں
دنیا کی انجمن سے فقیرانہ چل بسا
ساغر اداس اداس ہیں پیمانے سرنگوں
وجہ فروغ محفل رندانہ چل بسا

تھا افتخار عالم اسلام جو حفیظ
سوئے جناں وہ دین کا دیوانہ چل بسا

سرشک غم

بیاد مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی نور اللہ مرقدہ

مولانا مجیب الغفار صاحب اسعد اعظمی
شیخ الحدیث مدرسہ مظہر العلوم بنارس

بزم آثار و سنن کے آہ صدر الصدور
حضرت اقدس، محدث، صاحب طبع غیور

آہ استاذی حبیب الاعظمی بالغ نظر
بوالمآثر وہ امام ناقدان ذی شعور

ان کی رحلت سے ہوئے ہیں سب یتیم و بے نوا
ہے سبھی کا شیشۂ دل صدمۂ فرقت سے چور

صدمۂ جانکاہ سے ہے سارا عالم سوگوار
مکتبے گریاں، کتابیں، حاشیے، بین السطور

غم کی تاریکی میں ہے سارا جہاں ڈوبا ہوا!
ہر نظر کے سامنے ہے ظلمتِ غم کا وفور

ماہر علم حدیثِ مصطفیٰ رخصت ہوئے
تشنگان علم جائیں یاخدا کس کے حضور

یوں ہزاروں میکدے ہیں پر کہاں پائیں گے ہم
ساقیا تیری شراب کہنہ کا کیف وسرور

مل سکا ان کا کوئی ثانی نہ شان علم میں
لوگ دوڑاتے رہے اپنی نگاہیں دوردور

وہ بخاریٔ زمن تھے، وقت کے ابن حجر
فن اسماء پر انھیں لاریب تھا کامل عبور

اللہ اللہ ان کے رخ کی تازگی مرنے کے بعد
زندگی سے بھی فزوں تھا ان کی پیشانی کا نور

زندۂ جاوید ہیں وہ اپنی تصنیفات میں
گرچہ ظاہر میں ہوئے ہیں آج من اھل القبور

اے خدا ٹھنڈی رہے تربت ہمارے شیخ کی
جنت الفردوس میں ان کو ملیں حور وقصور

عمر اقدس ہے "مجاہد" اسعد محزون لکھ
۹۳

ابتدا "اختر حسن" ہے خاتمہ "وصل غفور"
۱۳۱۹ ۱۴۱۲

پایگاہ شیخ حبیب اعظمی

مولانا مجیب الغفار اسعد اعظمی

وہ مصر و شام و ہند کے محدث جلیل تھے
علوم مصطفیٰ کی ▪ جہاں میں سلسبیل تھے
وہ "مظہر العلوم" کی نظر کے نور، لخت دل
بجائے خود تھے اک سند، بذات خود دلیل تھے

وہ گلستان فقہ کی بہار بے نظیر تھے
جہان رنگ و بو کے ▪ مؤرخ شہیر تھے
یہ ان کا وصف خاص تھا، یہ ان کا امتیاز تھا
جواہرات علم کے وہ ناقد بصیر تھے

جو خدمت حدیث کا ہے قافلہ رواں دواں
تھے اس کے قائد عظیم، اس کے میر کارواں
سنہری ان کی زندگی سنہری کارکردگی
نہ کیوں ہم آج آب زر سے لکھیں ان کی داستاں

▪ آسمان علم کے تھے ماہتاب ضو فشاں
ادب سے ان کے سامنے تھی فرش راہ کہکشاں
"مصنف یمانی" پر محققانہ کاوشیں
رہیں گی ان کی، عظمتوں کا تا ابد حسیں نشاں

وہ منکر حدیث کے لئے تھے سیف بے نیام
وہ اس جہاد پاک کے مجاہدوں کے تھے امام
حمایت حدیث میں لکھی ہے "نصرۃ الحدیث"
ملا ہے اہل علم ۔۔ میں جسے بلند تر مقام

خود ایک انجمن تھے وہ، بلند ان کی ہمتیں
نظر پہ واشگاف تھیں نہفتہ تر حقیقتیں
سجی ہوئی تھیں ان کے ذہن و فکر کی بساط پر
نصوص کی عبارتیں ،بلاغتیں ،صراحتیں

اک آسمان تھا کہ جسے کھا گئی زمیں

امیرالاعظمی

وہ امیر ہند ،علم دین کا روشن چراغ
وہ چراغ راہ ہستی، ▪ فقیہ روزگار
کشورِدانش، دیارِ آگہی کا شہریار
وہ خطیب عصر، اقلیم سخن کا تاجدار
قبر کی آغوش میں وہ کون محو خواب ہے
آسمان علم کا اک مہرِ عالمتاب ہے
اس کے قدموں پر نچھاور وقت کے شاہوں کا تاج
اس نے پایا دشمنوں سے بھی عقیدت کا خراج
شان و شوکت کا ہے اس کی معترف سارا جہاں
کیا مسلماں اور ہندو، رو کے سب کہتے ہیں آج
تاجدار علم و فن بے سیم وزر رخصت ہوا
آہ وہ عیسیٰ نفس، ▪ چارہ گر رخصت ہوا
ساقی دیرینہ میخانۂ قال الرسول
زمزمہ سنج حدیث و نکتہ آرائے اصول
گلشن اسلام کا وہ عندلیب خوش نوا
جس کے منہ سے موعظت کے ہر نفس جھڑتے تھے پھول

کھو گیا وہ گوہر نایاب، مردِ بے مثال
ختم جس کی ذات پر ہے فن اسماء الرجال

ہمدمِ سینہ فگاراں ، ہمنوائے بسملاں
چارہ ساز دردمنداں، مرہم خستہ دلاں

ہادم ایوان باطل، پاسبان قصر حق
سربراہ اہلِ عرفاں، سرگروہ عاقلاں

اسوۂ اسلاف، فقہِ بوحنیفہ کا امیں
حق تو ہے کہیے اسے احناف کا حسن حسیں

تھا وہ یکتائے جہاں تاریخ میں تفسیر میں
اس کا ثانی تھا نہ کوئی وعظ میں تقریر میں

قابل صد آفریں تھا اس کا کلکِ زرنگار
تھا ■ مشہور زمانہ خوبیٔ تحریر مین

برگِ آوارہ کو چن چن کے گلستاں کردیا
گوہر الفاظ سے کاغذ کا دامن بھر گیا

اس کی تالیفات ہیں موسوم کتنے نام سے
کر چکیں حاصل خراج داد خاص وعام سے

عبدرزاق، المطالب اور شیبہ درکنار
حق کو واضح کردیا رکعات اور اعلام سے

اس نے جو کچھ لکھ دیا وہ حرفِ آخر ہو گیا
زندۂ جاوید نامِ بوالمآثر ہو گیا

ذات سے اس کی دوبالا ہوگئی شان عجم
اس کی عظمت کے عرب والوں نے چومے ہیں قدم

اپنی آنکھوں میں جگہ دی ہے سلیماں نے جسے
تھا نگاہ تھانوی میں جو عزیز و محترم

ہے دعاگو اس کے حق میں یہ امیرؔ خاکسار
اس کے مرقد پر ہو نازل رحمت پروردگار

صاحب فضل وکمال

بر وفات

محدث جلیل حضرت مولانا اعظمی نور اللہ مرقدہٗ

قاضی کوثرؔ اعظمی

کیوں نہ ہوں ارباب عالم اس کے غم میں سوگوار
وہ فقیہِ عصر وہ فخر زماں جاتا رہا

کارواں والے بحسرت دیکھتے ہی رہ گئے
کارواں سے اٹھ کے میر کارواں جاتا رہا

وہ محدث ▪ مفکر ▪ امیر الہند آہ!
دار فانی چھوڑ کر سوئے جناں جاتا رہا

جس کی پرواز تخیل چھو رہی تھی آسماں
وہ شہیر صاحب طرز بیاں جاتا رہا

مطلع علم نبوت، واقف اسرار دیں
قصر علم و معرفت کا رازداں جاتا رہا

اے فقیہ بے بدل اے صاحب فضل و کمال
اے کلیم طور ملت تو کہاں جاتا رہا

گونج اٹھی تھی جس کے نغمات حقائق سے فضا
باغ سے ▪ عندلیب گلستاں جاتا رہا

مخزن علم نبوت، ماہر علم حدیث
ایک مرد باصفا اک حق نشاں جاتا رہا

کون سلجھائے گا گتھی اب حدیثِ پاک کی
اس زمینِ علم کا اُف آسماں جاتا رہا
یا خدا کردے عطا اس کا کوئی نعم البدل
آبروئے علم دیں کا پاسباں جاتا رہا
اک زمانہ ہورہا تھا جس سے کل تک فیضیاب
آج کوثرؔ بزم سے وہ ضو فشاں جاتا رہا

مولانا عطاء الرحمٰن عطاء بھاگلپوری

نبی کے پیارے حبیب داور، حبیب رحمٰن اعظمی تھے
حقیقتاً وارث پیمبر، حبیب رحمٰن اعظمی تھے

امام فن حدیث و قرآں حدیقۂ مصطفیٰ کے نگراں
سراپا حقانیت کے پیکر، حبیب رحمٰن اعظمی تھے

حدیث رگ رگ میں جن کی پنہاں، حدیث ہی جن کا دین وایماں
حدیث ہی جن کا تکیہ بستر، حبیب رحمٰن اعظمی تھے

درود ہر دم لبوں پہ جاری، اسی میں گذری ہے عمر ساری
فدائے ذات رسول انورؐ، حبیب رحمٰن اعظمی تھے

غزالی و بیہقی دوراں، تھے باغ نعمان کے نگہباں
کہ بحر تحقیق کے شناور، حبیب رحمٰن اعظمی تھے

عقیدتوں کا خراج دے کر گئے ہیں خود جن کو شیخ ازہر
ائمۂ فن کے ایسے محور حبیب رحمٰن اعظمی تھے

یہ شیخ بو غدہ شیخ ایمن یہ بادہ نوشان حکمت وفن
گئے ہیں جن کے یہاں سے پی کر حبیب رحمٰن اعظمی تھے

وہ ساقیٔ جامِ مصطفیٰ تھے، وہ چشمۂ فیض باخدا تھے
ہجوم پیاسوں کا جن کے در پر، حبیب رحمٰن اعظمی تھے

وہ بزم رشد وہدیٰ کی زینت، وہ شیخ کامل شہ طریقت
کہ رہبرانِ ہدیٰ کے رہبر، حبیب رحمٰن اعظمی تھے

کتاب زہد ومصنفین ومطالب ومسند حمیدی
ہے جن کی تعلیق ان کتب پر، حبیب رحمٰن اعظمی تھے

سعید منصور کی سنن ہو، یا کشف استار علم و فن ہو
بکھیرے ہیں جس نے ان پہ گوہر، حبیب رحمٰن اعظمی تھے

لکھی گئیں شرحیں بر طحاوی، ہے آپ کی شرح سب پہ حاوی
نگار علمی کے آئینہ گر، حبیب رحمٰن اعظمی تھے

ادائے فقر ان کو ایسی بھائی، نہ سوئے دولت نظر اٹھائی
غنا وصبر ورضا کے خوگر، حبیب رحمٰن اعظمی تھے

محقق بے مثال کہیے، محدث باکمال کہیے
مفسر وحی رب اکبر، حبیب رحمٰن اعظمی تھے

نہ پوچھیے بس مقام ان کا، عطا ہے ادنیٰ غلام ان کا
سپہر عظمت کے مہر انور، حبیب رحمٰن اعظمی تھے

برمزار شیخ الاعظمی رحمۃ اللہ علیہ

گمان انصاری

علم و عمل کی شمع فروزاں کہیں جسے
حسن یقیں کا نیر تاباں کہیں جسے
اقبالؔ والا مردِ مسلماں کہیں جسے
یعنی نشانِ عالم امکاں کہیں جسے

تہذیبی ارتقاء تیرے قدموں کی دھول ہے
ہر داستانِ خدمتِ دیں کتنی طول ہے
اس دور میں تو سب سے بڑا با اصول ہے
ہاں فخر امتیازِ امام الرسول ہے

نا آشنائے شہرت بے جا تھی تیری ذات
نا واقفِ فریب تمنا تھی تیری ذات
نا سازگار دہر میں تنہا تھی تیری ذات
کیا لکھوں کوئی کھیل تماشا تھی تیری ذات؟

اک پیکر خلوص و مروّت کہوں گا میں
آئینۂ عروسِ صداقت کہوں گا میں
عقدہ کشائے گیسوئے ملت کہوں گا میں
تجھ کو امینِ راز شریعت کہوں گا میں

اک بار دیکھ لے نگہِ التفات سے
آسودہ کردے مجھ کو شعورِ حیات سے
خلوت میں جا نماز سے جلوت میں نعت سے
نسبت ہے تجھ کو سید مدنیؐ کی ذات سے

رونق فروزِ مسندِ بزمِ مناظرہ
اے موجبِ ظہور کرامت تجھے سلام
رسوا نہ ہو سکا کبھی تیرا شعورِ عشق
اے پیرِ خانقاہِ طریقت تجھے سلام
تو زندگی کی قید سے آزاد ہو گیا
اے طائرِ دریچۂ رحمت تجھے سلام
ہر ہر نفس ہے سلسلۂ فاتحہ گمان
ہر ہر قدم بہ نازِ عقیدت تجھے سلام

خراجِ عقیدت

صابر حبیب الاعظمی

وجہِ توقیر عجم، فخر عرب تھی تیری ذات
عصر حاضر میں یقیناً منتخب تھی تیری ذات
اس خراب آباد میں، محبوب رب تھی تیری ذات

تیری رحلت کی خبر سے کانپ اٹھا سارا جہاں
دم بخود ہے یہ زمیں، گریہ کناں ہے آسماں

اے جبالِ علم و دانش، دین کے روشن منار
یعنی دنیائے حدیث و فقہ کے اے شہر یار
ذرہ ذرہ آپ کے غم میں ہے پیہم اشکبار

ذات تیری کس قدر مقبولِ خاص و عام تھی
سر نگوں قدموں میں تیرے، گردشِ ایام تھی

تھا ازل سے واقفِ سرچشمۂ رشد وہدیٰ
گلشن علمی کا بے شک تو گل سر سبد تھا
آج تو رو پوش ہم سے ہو گیا وا حسرتا

علمی اشکالات لیکر اب کہاں جائیں گے ہم
تشنگیٔ علم دیں کیسے بجھا پائیں گے ہم

تیرے اطراف و جوانب تھا ہجوم قدسیاں
سر بہ خم ہوتے تھے تیری بزم میں ہر انس وجاں
تیری عظمت کا قصیدہ پڑھتے تھے کر وبیاں

تو نے کب کی آرزوئے جاہ و حشمت سیدی
فقر پر تیرے تصدق تھا مقام خسروی

اے "محدث اعظمیؒ" اے علم و فن کے تاجور
اے "غزالیؒ" زماں، اے وقت کے "ابن حجرؒ"
یعنی اے نکتہ رسِ آیات، اے بالغ نظر

تیرے دم سے علم و فن کا میکدہ آباد تھا
"بے ستونِ" علم کا لاریب تو فرہاد تھا

"اے حبیبِ باصفا" اے عاشقِ خیر الوریٰ
گنج علم و فن سے تجھ کو حصہ وافر ملا
تجھ کو قدرت نے "ہمالہ" کی بلندی کی عطا

عمر بھر کرتے رہے تم آبیاری علم کی
زلف سو انداز سے تم نے سنواری علم کی

اے "محدث اعظمیؒ" شاہنشہِ لوح و قلم
رو برو تیرے لرز جاتے تھے علماء کے قدم
کیوں نہ چومیں اہل علم و فن، ترا زریں قلم

تیرے علم و فضل کا ہے معترف سارا جہاں
صرف اہل "ہند" ہی کیا ہیں "عرب" بھی مدح خواں

اے خدائے لم یزل، اے خالق ارض و سما
صابر نمناک کی اتنی سی ہے بس التجا
درگزر کر، حضرت مرحوم کی اک اک خطا

اے خدا "شیخ الحدیث الاعظمی" کی قبر پر
بارش انوار و رحمت، روز و شب، شام و سحر

صابر حبیب الاعظمی

الوداع! اے حضرت شیخ الحدیث الاعظمی
الوداع! اے عصر حاضر کے "امام بیہقی"

الوداع! اے پیکر رشد وہدایت، الوداع!
الوداع! اے شہریار علم وحکمت، الوداع!

الوداع! اے عہد حاضر کے اماموں کے امام
الوداع! اے اسوۂ حسنہ کے مصداق تمام

الوداع! اے حکمت و دانش کے بحر بیکراں
الوداع! اے علم و فن کے آفتاب ضو فشاں

وائے حسرت! تیری رحلت سے "اے شیخ الاعظمی"
مسند "علم حدیث وفقہ" سونی ہو گئی

آپ کی ذات گرامی انجمن در انجمن
ناز فرما تجھ پہ خود تھا علم دیں کا بانکپن

تشنہ کامانِ علومِ دین کی ساقی گری
تا دم آخر رہا، ملحوظ فرضِ منصبی

بزمِ "آثار وسنن" میں شورِ ماتم ہے بپا
آرہی ہے دمبدم کانوں میں آواز بکاء

اے علوم عقلی و نقلی کے دُرِّآب دار
تیری فرقت میں "کتاب و حاشیے" ہیں بیقرار

آہ! اے علم حدیث و فقہ کے رمز آشنا
بزمِ امکاں کو جگا کر، تو اکیلا سو گیا

اے علمبردارِ قومی، اے نقیب اتحاد
ذات تھی تیری یقیناً نامرادوں کی مراد

بادشاہِ وقت ہو یا بے سروساماں گدا
ہر کس وناکس کے حق میں تو سراپا عجز تھا

اے روایات کہن کے پاسدارو پاسباں
رہنمائے قوم و ملت، اے "امیر کارواں"

نیم جاں ہے ہر کوئی اس صدمہٗ جانکاہ سے
یہ دعائے صابر محزون ہے اللہ سے
تیری تربت نور سے بھردے الہ العٰلمین
دوڑ کر آئے قدم بوسی کو فردوس بریں

☆☆☆☆☆☆☆

شاھنامہ نذرانہ عقیدت

۱۹۹۲ء

فردوس مکان مولانا حبیب الرحمن الاعظمی

۱۹۹۲ء

حبیب رحمن ادیب ذیشان خطیب دوراں نقیب خوباں
امیر ہند اور رکن دارالعلوم و رکن جمعیۃ علماء
بہت سے گذرے جہاں میں خوباں بہت سے پیدا ہوئے ہیں کتباں
اویس قرنی حسن زبصرہ کبھی ہوئے بایزید پیدا
تو اک امیر المفسریں تھا تو اک رئیس المحدثیں تھا
مصنف اور اک عظیم ناقد رجال کے فن کا ایک ماہر
کوئی مفسر کوئی محدث کوئی مصنف، کوئی مناظر
مصنف ومسند حمیدی کتاب زہد ورقائق ایسی
تری تصانیف اور تعلیق اور تحقیق سب بلند ہیں
نقط تعلم تھا اور تعلیم اور تصنیف شغل تیرا
تری چٹائی کی ہے وہ رفعت کہ تخت طاؤس بھی خجل ہے
ترے تفقہ ترے تعمق پہ خود ہیں شاہد تری کتابیں
حریم قدوسیاں کے رونق فزا کبھی دیکھ ادھر پلٹ کر
خلا ہوا تجھ سے ایسا پیدا جو پُر بظاہر نہ ہوسکے گا
نہیں اترتا ہے کوئی دل میں نگاہ جمتی نہیں کسی پر
یقین آیا یہ تیری رحلت سے موت عالم ہے موت عالم
ہے مارچ سولہ، سنہ ہے انیس سو بانوے عیسوی میں رحلت
ولادت "اختر حسن" تراشد، وفات "نعمان اختر" آمد

عظیم اک انجمن تھا تنہا عجیب اک دیدہ ور تھا انساں
جلالت علم کا تھا دارالعلوم خود آپ کا ثناخواں
مگر ادا تھی تری نرالی ہر ایک سے تھی دگر تری شاں
بہت سے قرنوں کے بعد ہوتا ہے کوئی پیدا حبیب رحمن
امیر ہند اور تاج علماتو ایک تھا نکتہ سنج عرفاں
معلم وواعظ ومناظر عظیم مفتی فقیہ دوراں
کوئی ہے مفتی کوئی ہے واعظ تو جامع کل ہے شاہ خوباں
حدیث کی اور بھی کتابیں ہیں تیری تعلیق سے درخشاں
ہیں ثمن درجن سے بھی زیادہ تری تصانیف گوہر افشاں
رواں تھا ستر برس سے تیرا عظیم درس حدیث و قرآں
بکھیرے جس پر حدیث وقرآن کے جواہر بحد امکاں
تو ایسا علامہ زماں تھا عرب ثناخواں عجم ہے نازاں
فراق میں تیرے قلب گریاں نگاہیں کتنی ہیں خون افشاں
کہ رفع علماء نے حق تعالیٰ کرے گا یوں رفع علم و عرفاں
کہیں بھی ثانی ترا ہے کوئی بتا ذرا تو ہی چرخ دوراں
لحد منور تری ہو جس پر ہو رحمت حق مدام باراں
سنہ وہ ہجری ہے چودہ سو بارہ وقت مغرب ہے دسویں رمضان
گذشت عمر تو در "محامد" بیاں محاسن کند چہ عثماں

۱۳۱۹ھ ۱۴۱۲ھ ۹۳

بقلم عاجز محمد عثمان معروفی

۱۴۱۲ھ

قطعۂ تواریخی

۱۴۱۲ھ

مولانا محمد عثمان معروفی

امیر الہند ہم کو چھوڑ کر خلد بریں پہونچا
مسائل اپنے ہم پیچیدہ حل کرنے کہاں جائیں

حدیث و فقہ کا اک وہ امام عصر تھا بیشک
ہم اسرار و رموز دیں سمجھنے اب کہاں جائیں

امام فن اسماء الرجال اک تھا زمانہ میں
روایات و سند کی گتھی سلجھانے کہاں جائیں

حبیب ما نقیب ما ادیب ما خطیب ما
ترا ثانی بتادے ڈھونڈھنے اب ہم کہاں جائیں

یقیناً ذات اقدس تیری ایک شمع فروزاں تھی
بتادے اب اندھیرے میں یہ پروانے کہاں جائیں

غم و رنج والم کی چھاگئیں تاریکیاں ہر سو
جگر کے داغ دل کے زخم دکھلانے کہاں جائیں

تری رحلت یقیناً موت عالم موت عالم ہے
بہر سو قلب گریاں چشم پر نم ہیں کہاں جائیں

شروع جوں ہی ہوا ہے مغفرت کا عشرۂ رمضاں
تری روح مبارک نے کہا خلد مکاں جائیں

گیارہ ماہ رمضان المبارک چودہ سو بارہ
جنازہ زیب دوش عشق ہے، عاشق کہاں جائیں

سنہ انیس سو اور بانوے ہے مارچ سترہ کو
سپرد خاک تجھ کو کرکے حیراں ہیں کہاں جائیں

جنازہ میں مئو دولاکھ روزہ دار امنڈ آئے
وہ نورانی مناظر دیکھنے عثماں کہاں جائیں

امیر الہند جنت میں، عجب اعزاز روز افزوں
فرشتے ڈھونڈھنے حسن عمل تجھ سا کہاں جائیں

۱۴۱۲ھ ۱۹۹۲ء

ولادت ہے تری اختر حسن (۱۳۱۹)، رحلت ظفر پیکر (۱۴۱۲)
محامد (۹۳) میں تری کل عمر تابندہ عیاں پائیں

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
چمن میں دیدہ ور تجھ سا کوئی پانے کہاں جائیں

مواعظ دل نشیں کانوں میں اب تک گونجتے ہیں وہ
تری تقریر پر تاثیر سننے اب کہاں جائیں

مؤلف اور مدرس تو، مبلغ اور واعظ تو
بتادے تجھ سا شیخ عصر ہے کوئی کہاں جائیں

محدث اور مفسر تو، مصنف اور مناظر تو
ترے اوصاف اعلی دیکھنے اب ہم کہاں جائیں

ہماری عید کا بھی خون رحلت نے کیا تیری
ہلال عید کی تصدیق کرنے اب کہاں جائیں

صنعت مربع باامیر الہند امام دیں مولانا حبیب الرحمٰن صاحب

۱۹۹۲ء

	۱۹۹۲	۱۹۹۲	۱۹۹۲	۱۹۹۲	۱۹۹۲	۱۹۹۲	۱۹۹۲	۱۹۹۲	
۱۹۹۲	رہبر	لائق	سرور	فائق	سلطاں	صادق	عارف	کامل	۱۹۹۲
۱۹۹۲	لائق	سرور	فائق	سلطاں	صادق	عارف	کامل	رہبر	۱۹۹۲
۱۹۹۲	سرور	فائق	سلطاں	صادق	عارف	کامل	رہبر	لائق	۱۹۹۲
۱۹۹۲	فائق	سلطاں	صادق	عارف	کامل	رہبر	لائق	سرور	۱۹۹۲
۱۹۹۲	سلطاں	صادق	عارف	کامل	رہبر	لائق	سرور	فائق	۱۹۹۲
۱۹۹۲	صادق	عارف	کامل	رہبر	لائق	سرور	فائق	سلطاں	۱۹۹۲
۱۹۹۲	عارف	کامل	رہبر	لائق	سرور	فائق	سلطاں	صادق	۱۹۹۲
۱۹۹۲	کامل	رہبر	لائق	سرور	فائق	سلطاں	صادق	عارف	۱۹۹۲
	۱۹۹۲	۱۹۹۲	۱۹۹۲	۱۹۹۲	۱۹۹۲	۱۹۹۲	۱۹۹۲	۱۹۹۲	

بقلم راست محمد عثمان معروفی

۱۹۹۲ء

یہ مصرعہ چاروں طرف سے پڑھا جاسکتا ہے، اور ہر طرف سے سال رحلت ۱۹۹۲ء بر آمد کیا جاسکتا ہے۔

نمونہ لوح تواریخ

۱۴۱۲ھ

نحمد الواحد الجلیل العظیم و نصلی علی النبی الکریم

۱۹۹۲ء

بیادگار عزیز جہاں مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی

۱۹۹۲ء

تذکرہ ایزد آگاہ حقائق و معارف

۱۹۹۲ء

ادب آگاہ فکر و نظر عالی معارف

۱۹۹۲ء

مدیح ابوالمآثر مولانا اعظمی

۱۹۹۲ء

آہ محدث جلیل مولانا حبیب الرحمٰن رحمہ الحی

۱۴۱۲ھ

آہ مرجع علما مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی

۱۹۹۲ء

امیر الہند محدث کبیر حبیب دارین مولانا حبیب الرحمٰن صاحب

۱۹۹۲ء

ایزد آگاہ امیر الہند مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی

۱۹۹۲ء

رکن بے باک مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند

۱۴۱۲ھ

عالی نگاہ امیر الہند و رکن رکین جمعیۃ علماء ہند

۱۴۱۲ھ

حق گو مہتمم و صدر المدرسین و بانی مرقاۃ العلوم مئو

۱۹۹۲ء

واحد سلطان عصر شیخ الحدیث

۱۹۹۲ء

زیبا معلم غریب

۱۴۱۲ھ

نور مرقدہ القادر العظیم

۱۹۹۲ء

غفرلہ الوکیل

۱۴۱۲ھ

برد مضجعہ المحصی الحکیم

۱۴۱۲ھ

اعوذ باللہ السمیع المنان من الشیطن الرجیم

۱۹۹۲ء

بسم اللہ الوھاب المقیت الرحمٰن الرحیم

۱۴۱۲ھ

قال القدوس الوالی، فھو فی عیشۃ راضیۃ

۱۹۹۲ء

ھو اھل التقویٰ و اھل المغفرۃ

۱۹۹۲ء

قال الباسط، سقاھم ربھم شرابا طھورا

۱۴۱۲ھ

قال الجلیل الجامع، سلام علیکم ادخلوا الجنۃ

۱۴۱۲ھ

آوازہ، ادخلوا الجنۃ انتم وازواجکم تحبرون

۱۹۹۲ء

المطلوب، ان المتقین فی ظلل وعیون

۱۹۹۲ء

قال حبیب اللہ الولی الحمید، الموت جسر یوصل الحبیب الی الحبیب

۱۴۱۲ھ

ان العزیز العلیم یرفع العلم برفع العلماء

۱۴۱۲ھ

موت عالم المسکون موت العالم

۱۴۱۲ھ

لماکان قیس ھلکہ ھلک واحد ولکنہ جدران قوم تھدما

۱۴۱۲ھ

آہ بزم علم وفضل کی شمع فروزاں سوگئی

۱۹۹۲ء

ہائے غم بحر علوم، مشغول الہ، ظفر پیکر

۱۴۱۲ھ ۱۴۱۲ھ ۱۴۱۲ھ

آہ راہ حق کا سابق راہنما جاتا رہا

۱۹۹۲ء

کارواں بیدم، امیر قافلہ جاتا رہا

۱۹۹۲ء

روئے گل سیر ندیدیم کہ آخر بہار شد

۱۹۹۲ء

بر خاک پاک اودوام ابر سلامتی شود

۱۹۹۲ء

از فکر پاکیزہ محمد عثمان معروفی

۱۴۱۲ھ

بار او محمد عثمان اعظمی

۱۹۹۲ء

فہرستِ مراجع

فہرست مراجع

	کتاب	مصنف	طابع وناشر
۱۔	ابطال عزاداری	مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمیؒ	ماہنامہ الداعی۔ جمادی الآخرہ تا رمضان ۱۳۶۱ھ
۲۔	اثر انصاری فکر وفن کے آئینے میں	ایم نسیم اعظمی	نکھار پبلیکیشنز مئو ۱۹۸۸ء
۳۔	أثر الحدیث فی اختلاف الفقہاء والمحدثین	الشیخ محمد عوامہ	دار السلام، القاہرۃ۔ ۱۴۰۷ھ ۱۹۸۷ء طبع دوم
۴۔	الاحسان فی تقریب صحیح ابن حبان	علی بن بلبان الفارسی، تحقیق: شعیب الارنؤوط	موسسۃ الرسالہ ۱۴۱۸ھ ۱۹۹۷ء طبع سوم
۵۔	احکام النذر لاولیاء اللہ	مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمیؒ	ماہنامہ الفرقان شوال وذیقعدہ ۱۳۵۸ھ
۶۔	ارشاد الثقلین	مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمیؒ	الداعی ۔ رمضان تا ذی الحجہ ۱۳۵۹ھ
۷۔	الازہار المربوعہ	مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمیؒ	
۸۔	اسرار المحبۃ	شاہ رفیع الدین دہلوی تقدیم: مولانا عبدالحمید سواتی	مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ، طبع اول
۹۔	الاصابۃ	حافظ ابن حجر عسقلانی	مطبعۃ السعادۃ، مصر۔ ۱۳۲۸ھ طبع اول
۱۰۔	الاعلام المرفوعہ فی حکم الطلقات المجموعہ	مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمیؒ	
۱۱۔	اعیان الحجاج	مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی	مکتبہ اعظمی مئو (اعظم گڈھ)
۱۲۔	أغالیط المؤرخین	الدکتور محمد ابوالیسر عابدین	دمشق ۱۳۹۱ھ م ۱۹۷۲ء
۱۳۔	اقبال سہیل، حیات اور شاعری	ڈاکٹر منور انجم	۱۹۹۵ء

۱۴۔	الالبانی شذوذہ واخطاؤہ	مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی	دار العروبۃ، کویت۔ ۱۴۰۴ھ م ۱۹۸۴ء
۱۵۔	الامام الربانی الزاہد عبد اللہ بن المبارک	الدکتور عبد الحلیم محمود	دار التراث العربی، القاہرہ
۱۶۔	امداد الفتاح باسانید ومرویات الشیخ عبد الفتاح	محمد بن عبد اللہ آل رشید	مکتبۃ الامام الشافعی، الریاض۔ ۱۴۱۹ھ ۱۹۹۹ء
۱۷۔	انتقاء الترغیب والترہیب	حافظ ابن حجر عسقلانی، تحقیق: مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی	احیاء المعارف، مالیگاؤں ۱۳۸۰ھ ۱۹۶۰ء
۱۸۔	اہل دل کی دلآویز باتیں	مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی	معارف پریس، اعظم گڈھ ۱۳۶۰ھ
۱۹۔	پرانے چراغ	مولانا ابوالحسن علی ندوی	مکتبۂ فردوس لکھنؤ
۲۰۔	تاریخ جامعہ تعلیم الدین ڈابھیل	مولانا فضل الرحمٰن اعظمی	جامعہ اسلامیہ ڈابھیل ۱۴۰۵ھ
۲۱۔	تاریخ دار العلوم دیوبند	سید محبوب رضوی	دار العلوم دیوبند ۱۴۱۴ھ ۱۹۹۳ء طبع دوم
۲۲۔	تاریخ ندوۃ العلماء	مولوی اسحاق جلیس ندوی، مولوی شمس تبریز خان	ندوۃ العلماء، لکھنؤ۔ ۱۴۰۳ھ ۱۹۸۳ء طبع اول
۲۳۔	تحقیق اہل حدیث	مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی	
۲۴۔	تذکرۂ علماء اعظم گڈھ	مولانا حبیب الرحمٰن قاسمی	جامعہ اسلامیہ بنارس ۱۳۹۶ھ ۱۹۷۶ء
۲۵۔	تذکرۂ علماء حال	مولانا محمد ادریس نگرامی	منشی نولکشور، لکھنؤ۔ ۱۸۹۷ء
۲۶۔	تذکرۂ مصلح الامت	مولانا محمد قمر الزماں	دائرۃ المعارف، الہ آباد۔ ۱۹۸۴ء طبع اول
۲۷۔	تذکرۂ مولانا عبد اللطیف نعمانی	ترتیب: مفتی محمد ظفیر الدین مفتاحی	مفتاح العلوم مئو (اعظم گڈھ) ۱۳۹۳ھ ۱۹۷۴ء

۲۸۔	تعزیہ داری و دیگر مراسم عزاداری سنی نقطۂ نظر سے	مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی	الفرقان۔ ربیع الاول تا جمادی الاولیٰ ۱۳۶۱ھ
۲۹۔	تکمیل الاذہان	شاہ رفیع الدین دہلوی تقدیم: مولانا عبدالحمید سواتی	مدرسہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ
۳۰۔	تلخیص خواتم جامع الاصول	شیخ محمد طاہر پٹنی، تحقیق: مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمیؒ	علمی پریس مالیگاؤں
۳۱۔	تنبیہ الکاذبین	مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی	النجم ۱۳۵۲ھ
۳۲۔	التنقید السدید علی التفسیر الجدید	مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی	النجم ۱۳۴۹ھ
۳۳۔	الحاوی لرجال الطحاوی	مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی	غیر مطبوعہ
۳۴۔	حجۃ اللہ البالغۃ	شاہ ولی اللہ محدث دہلوی	کتب خانہ رشیدیہ۔ دہلی
۳۵۔	الحماسۃ البصریۃ	احمد بن عبدالسلام الجراوی۔ تحقیق: الدکتور محمد رضوان الدایۃ	دارالفکر المعاصر، بیروت۔ ۱۴۱۱ھ ۱۹۹۱ء طبع اول
۳۶۔	حیات سلیمان	شاہ معین الدین احمد ندویؒ	دارالمصنفین اعظم گڈھ ۱۳۹۳ھ ۱۹۷۳ء
۳۷۔	حیات شبلی	سید سلیمان ندوی	دارالمصنفین اعظم گڈھ
۳۸۔	دستکار اہل شرف	مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمیؒ	مکتبۂ اعظمی، مئو۔ ۱۴۰۶ھ ۱۹۸۵ء
۳۹۔	دفع المجادلہ	مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی	عمدۃ المطابع، لکھنؤ
۴۰۔	دمغ الباطل	شاہ رفیع الدین دہلوی	مدرسہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ ۱۹۷۶ء
۴۱۔	ذکریات	شیخ علی طنطاوی	دارالمنارۃ، جدہ۔ ۱۴۰۵ھ ۱۹۸۵ء طبع اول
۴۲۔	رحلۃ ابن بطوطہ	ابن بطوطہ	المطبعۃ الازہریۃ، مصر ۱۳۴۶ھ ۱۹۲۸ء طبع اول
۴۳۔	رکعات تراویح	مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی	

۴۴۔	الرفع والتکمیل	مولانا عبد الحی فرنگی محلی، تحقیق: الشیخ عبدالفتاح ابو غدہ	بیروت طبع دوم ۱۳۸۸ھ ۱۹۶۸ء طبع سوم ۱۴۰۷ھ ۱۹۸۷ء
۴۵۔	رکعات تراویح مذیل برد انوار مصابیح	مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی	تنویر پریس لکھنؤ ۱۳۷۹ء م ۱۹۶۰ء
۴۶۔	روداد مدرسہ دار العلوم مئو		
۴۷۔	روداد مدرسہ مفتاح العلوم مئو		
۴۸۔	رہبر حجاج	مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی	
۴۹۔	کتاب الزھد والرقائق	عبداللہ بن المبارک، تحقیق: مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی	مجلس احیاء المعارف، مالیگاؤں ۱۳۸۵ھ ۱۹۶۶ء
۵۰	کتاب السنن	سعید بن منصور، تحقیق: مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی	مجلس علمی، ڈابھیل۔ ۱۳۸۷ھ ۱۹۶۷ء
۵۱	شارع حقیقی	مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمیؒ	الفرقان، جمادی الاولیٰ تا ذی الحجہ ۱۳۵۷ھ
۵۲۔	الشہید فی الاسلام	شیخ حسن خالد	دار العلم، بیروت ۱۹۷۱ء طبع اول
۵۳۔	صدیق اکبر	مولانا سعید احمد اکبر آبادی	ندوۃ المصنفین، دہلی ۱۳۸۱ھ ۱۹۶۱ء طبع دوم
۵۴۔	عثمان ذو النورین	مولانا سعید احمد اکبر آبادی	ندوۃ المصنفین، دہلی ۱۴۰۴ھ ۱۹۸۳ء طبع اول
۵۵۔	العلماء العزاب	الشیخ عبدالفتاح ابو غدہ	حلب ۱۴۰۲ھ، ۱۹۸۲ء طبع اول
۵۶۔	فتح المغیث	شمس الدین سخاوی: تحقیق مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی	مکتبۃ الاعظمی، مئو (اعظم گڈھ)
۵۷۔	فقہ اھل العراق وحدیثھم	العلامہ محمد زاہد الکوثری۔ تحقیق: الشیخ عبدالفتاح ابو غدہ	بیروت ۱۳۹۰ھ ۱۹۷۰ء طبع اول

۵۸۔	کاروان رفتہ	مولانا نظام الدین اسیر ادروی	دارالعلوم، حیدر آباد ۱۴۱۵ھ ۱۹۹۴ء
۵۹۔	کشف الاستار	نورالدین الھیثمی، تحقیق: مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی	موسسۃ الرسالۃ، دمشق۔ ۱۳۹۹ھ ۱۹۷۹ء
۶۰	مجمع بحار الانوار	علامہ محمد طاہر پٹنی، تحقیق: مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی	مجلس دائرۃ المعارف العثمانیہ، حیدر آباد
۶۱۔	مسند الامام أحمد بن حنبل	شرح احمد محمد شاکر	دار المعارف، مصر۔ ۱۹۷۴ء
۶۲۔	مسند الحمیدی	عبداللہ بن الزبیر الحمیدی، تحقیق: مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی	مجلس علمی ڈابھیل۔ ۱۳۸۲ھ، ۱۹۶۳ء
۶۳۔	مشاہیر پورہ معروف	مولانا محمد عثمان معروفی	نیشنل آرٹ پریس۔ الہ آباد
۶۴۔	مشاہیر علماء ہند کے علمی مراسلے	مفتی محمد ظفیر الدین مفتاحی	قاضی پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرز، نئی دہلی۔ ۱۹۹۷ء
۶۵۔	المصنف	ابو بکر بن ابی شیبہ، تحقیق: مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی	المکتبۃ الامدادیہ، مکہ مکرمہ ۱۴۰۳ھ ۱۹۸۳ء
۶۶۔	المطالب العالیہ	حافظ ابن حجر عسقلانی، تحقیق: مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی	وزارۃ الاوقاف، کویت۔ ۱۳۹۰ھ ۱۹۷۰ء
۶۷۔	معرفۃ الصحابۃ	ابو نعیم الاصبہانی، تحقیق: عادل بن یوسف العزازی	دار الوطن، الریاض۔ ۱۴۱۹ھ ۱۹۹۸ء طبع اول۔
۶۸۔	مفتاحی ڈائری		
۶۹	مکتوبات سلیمانی	عبدالماجد دریابادی	صدق جدید بک ایجنسی لکھنؤ ۱۹۶۱ء
۷۰۔	منیۃ الالمعی	علامہ قاسم بن قطلوبغا، تحقیق: محمد زاہد الکوثری	مطبعۃ السعادۃ، مصر۔ ۱۳۵۹ھ م ۱۹۵۰ء
۷۱۔	مولانا رشید احمد گنگوہی، حیات اور کارنامے	مولانا نظام الدین اسیر ادروی	شیخ الہند اکیڈمی، دیوبند۔ ۱۴۱۸ھ ۱۹۹۷ء طبع اول
۷۲	مولانا محمد قاسم نانوتوی حیات اور کارنامے	مولانا نظام الدین اسیر ادروی	″ ″ ″ ۱۴۱۶ھ ۱۹۹۵ء ″

رسائل و مجلات

۱۔ ارشاد	(پندرہ روزہ)	امرتسر
۲۔ الاضواء		مالیگاؤں
۳۔ انقلاب	(روزنامہ)	بمبئی
۴۔ برہان	(ماہنامہ)	دہلی
۵۔ البعث الاسلامی	(ماہنامہ)	لکھنؤ
۶۔ البلاغ	(ماہنامہ)	بمبئی
۷۔ ترجمان الاسلام	(سہ ماہی)	بنارس
۸۔ ترجمان دارالعلوم	(ماہنامہ)	دہلی
۹۔ تجلی	(ماہنامہ)	دیوبند
۱۰۔ الجمعیۃ		دہلی
۱۱۔ جمہوریت	(روزنامہ)	بمبئی
۱۲۔ الحج	(ماہنامہ)	مکہ مکرمہ
۱۳۔ دارالعلوم	(ماہنامہ)	دیوبند
۱۴۔ الداعی	(ماہنامہ)	لکھنؤ
۱۵۔ دعوۃ الحق	(سہ ماہی)	دیوبند
۱۶۔ ریاض الجنۃ	(ماہنامہ)	جونپور
۱۷۔ صدق جدید	(ہفت روزہ)	لکھنؤ
۱۸۔ ضیاء الاسلام	(پندرہ روزہ)	امرتسر
۱۹۔ العدل	(ہفت روزہ)	گوجرانوالہ

۲۰۔ الفرقان	(ماہنامہ)	بریلی۔ لکھنؤ
۲۱۔ الفقیہ	(ہفت روزہ)	امرتسر
۲۲۔ الفیض	(")	امرتسر
۲۳۔ القاسم	(پندرہ روزہ)	امرتسر
۲۴۔ المآثر	(سہ ماہی)	مئو
۲۵۔ مجلۃ المجمع العلمی العربی	(سہ ماہی)	دمشق
۲۶۔ المسلمون	(ماہنامہ)	جنیوا (سوئٹزرلینڈ)
۲۷۔ معارف	(ماہنامہ)	اعظم گڈھ
۲۸۔ المومن	(ماہنامہ)	کلکتہ
۲۹۔ النجم	(ماہنامہ)	لکھنؤ

علامہ اعظمی نے فرمایا

مولانا! اگر یہ صحیح ہے کہ "فوری طور پر کوئی اجتماعی قدم نہ اٹھایا گیا تو سمجھ دار (ہر نئی رو میں بہنے والا؟) طبقہ مذہب سے مایوس ہو جائے گا" تو اسی کے ساتھ اس کا خطرہ بھی کچھ کم نہیں ہے کہ اجتماعی قدم اٹھانے کے جو نمونے سامنے آ رہے ہیں، وہ یقین دلا رہے ہیں کہ شریعت حقہ کا کوئی جز بھی اپنی اصلی حالت پر باقی نہ رہے گا، حتی کہ محرمات قطعیہ کو بھی الضرورات تبیح المحظورات کے اصول پر مباح بنانے کی گنجائش نکالی جائے گی، کیا آپ کو اس کا اندیشہ نہیں ہے؟

المآثر ج ۳ ش ۲ ص ۱۲۔۱۱